قرۃ العین حیدر

گردشِ رنگِ چمن

دانیال

محمد عارف

گردشِ رنگِ چمن

نورُالعین، شہناز اور ناہید کے نام

دانیال

سالِ اشاعت : جولائی ۱۹۸۷ء

قیمت : ۲ سو روپے

طابع : شکیل پرنٹنگ پریس کراچی

سرورق : خلیق ٹونکی

ڈاکٹر امینہ نورالدین احمد

کتابت : سید محمد احمد ہاشمی

ناشر : ملک نورانی

حوری نورانی

مکتبہ دانیال : وکٹوریہ چیمبرز ۲

عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ع گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب
غالبؔ

خطاطی از ڈاکٹر امینہ بیگم

ناول کی تصاویر مصنفہ نے بنائی ہیں۔

ص ۲۴۴ : دیوانِ ملکہ جان کا سرورق بشکریہ اردو سیکشن، برٹش لائبریری لندن۔

ص ۶۰۴ کی آبی تصویر ایک انگلش لتھوگراف پر مبنی ہے۔

تزئین : پپیہا رائے چودھری۔

فہرست ابواب

(۱)

جل بہار

"واہ۔ بڑی نفاست بازچمن بندی ہے صاحب۔" ڈاکٹر منصور کاشغری نے گلِ عجائب کے نیچے سے گذرتے ہوئے داد دی۔

"تسلیم۔ آپ نے آج نوٹس ____" ڈاکٹر عنبرین بیگ نے روش پر جھکی شاخ ہٹائی۔

"پچھلی بار جب ہم آئے موسلا دھار بارش۔ ہاتھی ڈباؤ گھاس ___ کیا پتہ چلتا ___" منصور نے ٹھٹھک کر کوٹھی پر نظر ڈالی "۔ مکان بھی تم نے معقول خریدا۔ ایک برساتی اور بنوالو تو بے چارے شوچاؤلی کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائے ۔"

"یہ کون صاحب ہیں ؟"

"اماں وہی چینی شاعر ___ "

"میں کسی چینی شاعر کو نہیں جانتی ۔"

"کوئی مضائقہ نہیں ۔"

".. نہ جاپانی نہ کورین ۔"

" تو وہ کہنے لگا ___ "

"کب ؟ اچھا ابھی جب تم چین گئے تھے ؟ "

"سوا دو ہزار سال پہلے ۔ "

"تم سوا دو ہزار سال پہلے چین گئے تھے اور اب لوٹے ہو۔ "

"وہ کہہ رہا تھا ۔" منصور نے جنگلے سے ٹک کر ڈھال کے نیچے بہتی گومتی کا جائزہ لیا ۔" ایک شام وہ بے چارہ اسی طرح اپنے گھر کے پھاٹک پر کھڑا تھا۔ سامنے زرد دریا پر زرد سورج ___ "

"کیا وہ یرقان کا مریض تھا ؟ "

"اچھا خیر۔ سرخ سورج زرد دریا میں ڈوب رہا تھا۔ تب اس نے اپنا رباب اٹھا کر یوں گایا:

میں نے آدمیوں کی بستی میں گھر بنایا ہے۔
اگر تم اس کی وجہ پوچھو تو میں کہوں۔
میرا دل کہیں بہت دور رہتا ہے۔
اور خود ہی اپنا ساتھی ہے۔
مشرقی جنگلے کے پاس کھڑا میں کاہلی سے گل داؤدی توڑا کرتا ہوں،
سکون کے ساتھ میں جنوبی پہاڑوں کو تکتا ہوں۔
ڈوبتی روشنی میں پہاڑی ہوا خوش گوار ہے،
آوارہ پرندوں کے جوڑے اڑے جا رہے ہیں،
ان باتوں میں کچھ گہرے معنی موجود ہیں۔
میں اس کا اظہار کرنا چاہتا ہوں
مگر اچانک وہ الفاظ بھول گیا۔

منصور خاموش ہو گیا۔ ہوا میں خنکی تیز رہی تھی۔ گومتی پر دور دور تک روشنیاں جل اٹھیں پرندوں کے جوڑے بسیرا لینے درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

"باغ میں آؤ عنبرین"
"باغ ہی میں تو ہوں۔ تم واپس آؤ ڈاکٹر منصور جہاں کہیں بھی ہو۔"
"مجھے ایک وکٹورین نظم یاد آ گئی تھی "COME INTO THE GARDEN, MAUD !"

وہ مکان کی طرف لوٹے۔
"تمہیں اتنی ساری چیزیں کیسے یاد رہتی ہیں۔"
"یاد رہتی ہیں۔ بس وہ لفظ بھول گیا۔"

"مجھے بھی وہ الفاظ نہیں آتے۔"

"مگر تم وہ برساتی ضرور بنوالو۔"

"اجی ہاں اتنا آسان ہے۔ آجکل کے زمانے میں۔ ابھی ماشا میں ایک باتھ روم جو ADD' کرنا ہے۔ وہ شار دا نے میرے کھاتے میں ڈال دیا۔"

"تو چینی شاعر اپنے دوستوں کی گاڑیاں کہاں کھڑی کرے گا؟"

"چینی شاعر یہاں کہاں سے آگیا —؟" گارڈن روم کا سلائیڈنگ پٹ کھسکا کر برفیلے سفید بالوں اور شربتی آنکھوں والی ایک خاتون نے دریافت کیا۔

"ایک اچھا شاعر ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ ہر زمانے میں۔ گڈ ایوننگ مسز بیگ —"

"جیتے رہو۔" انھوں نے جواب دیا اور نہایت مصروفیت کے ساتھ سنہری زنجیر سے آویزاں عینک لگا کر گلرنگ آسمان کے مطالعے میں منہمک ہوگئیں۔

"میں نے وہاں وہ دیکھیں۔" منصور نے دریچے کے قریب پہنچ کر بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں کیا۔" عنبرین نے کھرپی بجری پر گرا دی۔

"سنکیانگ کے ایک غار میں۔ تصویریں۔ وہ تصویریں باقی ہیں۔ ترچھی آنکھوں والی منگول شہزادیاں۔ ریشمیں قبائیں۔ بند ریشمیں جوتے۔ ہاتھوں میں لانبے ڈنٹھلوں والے پھول دو ہزار سال سے منجمد اور منتظر۔"

"تم کو کیا معلوم کہ وہ شہزادیاں تھیں یا غریب مصیبت زدہ عورتیں جنہیں اچھے کپڑے پہنا کر تصویر بنانے کے لئے کھڑا کر دیا گیا تھا؟" مسز بیگ نے دریچے میں سے پوچھا

منصور نے پلٹ کر کہا۔" MA'AM آپ کے گلاب بہت کامیاب رہے۔ آؤٹ سائز! کاغذی۔ خوشبو سے عاری۔ دوغلے — پرانے اصل گلاب وہ رہے۔ بے چارے مغلوں کے لائے ہوئے۔ خوشبودار۔"

"تمہارے ہاں ٹی روز ہے ؟"

"ہاں . تاکہ انگلش کنٹری سایئڈ کی یاد دلاتا رہے ۔"

"تمہاری امی جب فلاور شوبیں اپنے گلاب بھیجیں تو انھیں چاہیئے کہ کارڈ پر محض گل عندلیب لکھدیں۔ اپنے نام کے بجائے ۔"

"واہ گل عنبرین کیوں نہ لکھیں ؟"

"کیونکہ عندلیب بانو بیگم انکا نام ہے اور HYBRID گلاب اُگانا انکا مشغلہ۔ تم اپنے کچن گارڈن کے پھول کو بھی ود بھی بھیج دینا گل عنبرین کے نام سے ۔"

"تھینک یو" عنبرین نے ہونٹ پچکائے ۔

"تم نے اس کوٹھی کا نام تو اب تک سوچا ہی نہیں ۔"

"گلشنِ ناآفریدہ" عنبرین نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔

"کیوں بھئی ۔ بالکل آفریدہ ۔ گومتی کی مناسبت سے اس کو توجل بہار کرلو۔ نرسنگ ہوم کا نام ماشاماشا اللہ تم نے اچھا رکھا کہ منصور۔ شاردا ۔ عنبرین=MASHA- میں نے عرض کیا تھا۔ شاردا منصور عنبرین SHAMA بہتر رہے گا اہل ہنود اسے شاما سمجھیں گے ۔ مسلمان شمع۔ قومی یکجہتی بھی ہوتی رہے گی ۔"

"شمع ! نرسنگ ہوم ہے یا فلمی رسالہ ۔۔ ؟"

"باغ عدن میں ۔۔" دریچے سے آواز آئی " آدم و حوا چیزوں کے نام تجویز کر رہے ہیں لیکن بے چاری حوا کی رائے کس نے لی تھی ۔ تمہارے اللہ میاں نے نام بھی آدم ہی سے ۔۔ "

"تمہاری امی WOMEN'S LIBBER بھی ہیں ؟"

"زبردست ۔"

منصور نے نظر اٹھائی ۔ پرندوں کی ڈاریں ارغوانی بادلوں کے نیچے نیچے سلوموشن پر گذرتی جا رہی تھیں ۔ عنبر گارڈن روم کی طرف چلی گئی ۔

"یہ سارس" عندلیب بیگ نے کھڑکی میں سے اطلاع دی " سائبیریا سے آئے ہیں ۔"

"پرسوں نرسوں میں نے ایک کارٹون دیکھا ــــ" منصور نے بنچ کے ہتھے پر کہنی ٹیک کر بزرگ خاتون کو مخاطب کیا "کہ کرۂ ارض ہے۔ اس پر قطب شمالی کی جگہ بمبی اور اس کے اوپر سے پرندوں کی تکون نما ڈاریں گذر رہی ہیں۔ دو چڑیاں اس فلائیٹ فورمیشن میں سے ذرا ہٹ گئی ہیں ان کا لیڈر ڈانٹتا ہے ــ خیال رکھو۔ نیچے سالم علی رہتے ہیں"۔

" لو لی ــــ" مسز بیگ نے قہقہہ لگایا "میرے نانا کبوتروں اور بٹیروں کی حد تک گلی شاہ تارا دلی کے سالم علی تھے"۔

" ان کا کبوتر آسمان پر پہنچ کر تارا ہو جاتا تھا؟"

" ٹھہرو۔ میں ذرا قطب تارا تلاش کر لوں" مسز بیگ نے پھر عینک لگائی۔

" ابھی پہلے روز" منصور نے عنبرین کو مخاطب کیا "جب میں تمہارے ہاں آیا اور گیسٹ روم کے غسلخانے کا رستہ دریافت کیا، تم نے کہا، ادھر سے چلے جائیے جدھر امّی کا اسٹوڈیو ہے۔ تو مجھے بہت عجیب سا لگا۔ زیادہ تر امّی لوگ کے لئے کہا جاتا ادھر سے جائیے جہاں امّی کی نماز کا تخت بچھا ہے۔"

" امّی نماز نہیں پڑھتیں"۔

" میں نے بہت کم امّیاں ایسی دیکھی ہیں جو نماز نہ پڑھتی ہوں"۔

" وہ دیکھو ایک قاز جا رہی ہے۔" مسز بیگ نے آواز دی۔

" بلوچی لوگ قازوں کو حاجی کہتے ہیں۔" منصور نے انہیں بتلایا " ہر سال عرب ستان کی سمت پرواز! حاجی لقلق ــ !"

" قطب ستارہ تو بادلوں میں دکھلائی نہیں پڑتا۔ پر زہرہ ــــ زہرہ بہت تیزی سے چمک رہی ہے" مسز بیگ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا اور غائب ہو گئیں۔ گلوریا سوان سن کے لرزاں کلوز اپ کی طرح۔

" سن سیٹ بولوار ــــ"

" کیا ــ ؟"

" تمہاری والدہ اس وقت بالکل گلوریا سوانسن معلوم ہوئیں ۔ بے حد حسین رہی ہوں گی۔"

" ہوں ۔"

" اب بھی ہیں ؟"

" ہوں ۔ ہیں تو سہی ۔"

" زہرہ بھی غائب ـــ" مسز بیگ نے پھر دریچے میں سے جھانک کر اطلاع دی ۔

" میم ـــ کیا آپ شاماً نی ہیں ؟ آپ کے اجداد تو تھے ستارہ پرست جب وہ سائبیریا سے چلے ۔ اور میرے بھی ـــ"

" نہ شاماً نی نہ ٹامانی ۔ اے منصور بیٹیا ۔ اب تم سدھارو ۔ بارش گھری کھڑی ہے ۔"

" بس میَم ۔"

مسز بیگ پھر غائب ۔

" سنو ۔" عنبرین نے سوچتے ہوئے پوچھا ـــ" تم نے بھی لامارٹینیرؔ میں پڑھا ہے ؟"

" لامارٹینیرؔ ـــ ؟ " وہ ہنس پڑا ۔" مدرسہ فتحپوری بھئی ۔ انٹر سائنس کے لئے علی گڑھ جانے سے پہلے انگریزی کپڑے نہیں پہنے تھے ۔ تھے ہی نہیں کھڑاؤں اور اٹنگا پاجامہ اور سر پر گول ٹوپی یہ جو تم ہندوستان میں ہر جگہ دینی مدارس کے غریب طالبِ علموں کا حُلیہ دیکھتی ہو ہمارا بھی ایسا ہی تھا ـــ"

" پھر تم ایسے سوفسٹی کیٹڈ کیوں کر بنے ـــ ؟"

" لمبا قصہ ہے بائیس ۲۲ سال کی عمر سے برٹش اور امریکن اپر کلاس والوں کی صحبت ۔ دس سال BOSTON BRAHMINS کا علاج معالجہ ۔ لیکن تمہیں ایک بات بتاؤں ؟ اپنے اوریجن کو نہیں بھولا ۔"

" اوریجن یاد رکھنا ضروری ہے ؟"

" بالکل نہیں ۔ اپنی اپنی طبیعت پر منحصر ہے ۔"

" تم ڈاکٹر نہ بنتے تو کیا بنتے ؟"

" ابّا زندہ رہ گئے ہوتے تو مولوی ۔ باقاعدہ ندوی یا دیوبندی مولانا ۔ مگر وہ کیا ہے ـــ

خارا کا پیشہ آذر تراشی ـــ ارے بھئی وہ کیا ہے ـــ کارِ مغیلاں ـ خارا کا پیشہ ـــ نہیں ۔ ارے اس پر یاد آیا ـــ" منصور نے اطمنان سے دوسرا سگریٹ سلگایا ۔" ابھی بمبئی میں ایک صاحب ملے پیشہ انکا تکیہ کلام ہے ۔ پیشہ ۔ پیشہ ڈاکٹر صاحب ہر مرض کی دوا ہے پیشہ ۔ سارا کھیل ہے پیشے کا ـــ دراصل مجھے اسوقت انہی کی والدہ کو دیکھنے جانا ہے ۔ وہاں سے ایک اور مہا پونجی پتی کے ہاں جاؤں گا ۔ ان کی بڑی بہن علیل ہیں ۔ سنو عنبر ۔ وہ خاتون ابتک پورے چونتیس ناول لکھ چکی ہیں پینتیسواں زیرِ تصنیف ہے ۔ پچھلے ناول کا نام تھا آرسی مصحف اس سے پچھلا زمرد کا گلوبند۔"

اچانک ندی اور آسمان آتش بازی سے چمک اُٹھے ۔

" آج شب برات تو نہیں ہے ؟" منصور نے چونک کر پوچھا ۔

" نہیں تو ۔ یہ گورنمنٹ نے لکھنؤ فیسٹول کیلئے شاہی کی جل بہار اور بسنت کا میلہ ری وائیو کیا ہے ۔ آتشبازی ۔ کنکوے بازی اور بیراکی کے مقابلے ۔"

" آہا ۔ میں تو لکھنؤ بہت برسوں کے بعد آیا ہوں ۔ یہاں ایک مذہبی جل بہار کی رسم بھی قدیم سے چلی آتی ہے ۔ گومتی کی کشتیوں پر آتشبازی شب برات کی شام ۔ لوگ باگ سجے ہوئے بجروں پر بیٹھ کر بارھویں امام کے نام عریضے گومتی میں بہا دیتے ہیں ۔ کورے کاغذ پر زعفران سے لکھ کر ۔"

" اگر تم عریضہ ڈالو گومتی میں تو اس پر کیا لکھو ؟"

اں ـــ یہی کہ ماشا خوب چلے ۔"

" بس ـــ ؟"

"اور کیا ۔ وہی تو آجکل ہمارا مسلہ ہے لیکن میں اس قسم کے توہمات سے سروکار نہیں رکھتا ۔"

" وہابی ـــ !"

" جو سمجھو ۔ انسان کو صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے اور اپنے دماغ اور حوصلے پر ۔ اچھا بھئی اب بھاگتے ہیں ۔" وہ بنچ سے اٹھا ۔" راستے میں ذرا جل بہار ملاحظہ کرتے جائیں گے ـــ"

" ہاہا ـــ گومتی کی جل بہار دیکھو ۔ بارہ من کی دھوبن دیکھو ـــ "

"CYNICAL عنبرین ! گڈ نائٹ —"

وہ قریب کھڑی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

باغ میں جگنو چمک رہے تھے۔ آسمان پر تارے اور آتش بازی کی روشنیاں۔ عنبرین کھڑکی اٹھا کر دریچے کے پاس گئی۔ "امی جان —"

"یس ڈیر — !"

"امی آپ بالکل پنچ اینڈ جوڈی شو کی طرح کھڑکی میں آجاتی ہیں !"

"ہاہا — پنچ اینڈ جوڈی شو —"

"امی۔ ہم گومتی میں عریضہ — نہیں — وہ — ای ہم برساتی بنوالیں ؟ چینی شاعر —"

"ارے بیٹا — چینیوں کے مکان تو میں نے سنگاپور میں دیکھے تھے ۱۹۲۶ء میں ایک سے ایک فینسی پینٹنگ — سرخ نقش و نگار — سرخ فریم والے گول دروازے —"

"امی یہ لکھنؤ کا گول دروازہ بھی چینیوں نے —"

موٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ تیز روشنی

"— چینیوں نے بنایا تھا ؟ ارے تم۔ خیریت ؟"

آلہ مقیاس الدبا وا لخون بھول گیا تھا — ثابت ہوا ڈاکٹری میں میرا دل نہیں لگتا —"

"تو میرا کون سا لگتا ہے — !"

"آدھی آدھی عمر بس اپنی پردیس میں خدائی خوار پھر کر پیشہ کماؤ۔ وہ سارا اٹھا کر ماتشا میں جھونک دو۔ پھر کہو ڈاکٹری میں دل نہیں لگتا۔ شاباش۔ بہت کامیاب بزنس پارٹنر ثابت ہو رہے ہو تم دونوں —" مسز بیگ سنجیدگی سے بولیں۔

"کم اَون اولڈ گرل — آج شام یہ تھوڑا سا پیشہ نہیں کمائے گا تو کیا غضب ہو جائے گا۔ منصور اندر جا کر فون کر وان دونوں ما بدولت ایبر زادیوں کو۔ کل صبح کلینک میں حاضر ہوں ۔"

"شیور — اس کے بعد ایک عدد PIZZA ۔"

"چلے گا ——" عنبرین دوڑتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی —— وہ اسے بھیگے درختوں میں اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔

دریچے میں کھڑی عندلیب بیگ آہستہ سے بولیں۔

"پھول گوبھی کوگل عنبرین پکارنے والا مذاق آئندہ نہ کرنا۔ اسے کومپلیکس اسی بات کا ہے کہ وہ ایک PLAIN JANE ہے۔"

"آئی ایم سوری میم —— میں نے تو محض تفریحاً —— اوہ آئی ایم سوری —— مجھے بہت زیادہ بولنے کی عادت ہے۔ بیوقوفی کی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ آئندہ خیال رکھوں گا اور عنبر PLAIN JANE کہاں ہے —— مجھے تو بہت اچھی لگتی ہے۔"

"واقعی —— ؟"

"بالکل —— یقیناً۔"

"آئی ایم گلیڈ ——" مسز بیگ نے مطمئن سی سانس لی۔ "پانی گرنے لگا اندر آجاؤ۔"

"میم —— یہیں کھڑکی میں سے کودی ماروں ؟"

"WHAT'S THAT —— ؟"

"سوری —— میں بمبئی کی زبان بول رہا تھا —— یعنی کود جاؤں۔ دیکھئے یہاں سے برآمدے تک ایکدم کتنی کیچڑ ہو گئی ہے۔"

"ڈونٹ بی سِلی۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

"لوگ یہاں کون ہیں ؟"

"اسی وقت کوئی آن پہنچا عنبرین کا پشبنٹ اور وہ کیا دیکھتا ہے کہ مشہور و معروف ڈاکٹر کاشغری مشہور و معروف ڈاکٹر بیگ کے گھر میں رات کے وقت کھڑکی کے راستے ——"

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اچانک وہ سیٹی بجاتی کھڑکی میں سے غائب ہو گئیں۔ منصور نے ذرا متعجب ہو کر کان لگائے سیٹی کی دھن مانوس سی تھی اب مسز بیگ نے اسی دھن کو نیچے سُروں میں الاپنا شروع کیا —— "شام ڈھلے کھڑکی تلے تم سیٹی بجانا چھوڑ دو۔ شام ——"

وہ بھونچکا سا سر جھکائے پتلون کے پائینچے اُچکا کر برآمدے کی طرف روانہ ہوا۔ عجیب چبلی بڑی بی ہیں۔ لڑکی اتنی متین اور بُردبار اور والدہ سیٹیاں بجا رہی ہیں۔

صدر دروازے کی چٹخنی کھلی۔

ڈائیننگ روم میں داخل ہو کر ڈاکٹر منصور نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ میز پر بڑھیا بلجین لیس کی چادر۔ ڈل سلور۔ وسط میں روپہلا شمعدان۔ دیواروں پر یورپین شہروں کے مناظر۔ مسز بیگ کی بتائی ہوئی کرسی پر بیٹھا نیپکن اٹھایا۔ عنبرین گرما گرم PIZZA لے کر داخل ہوئی۔ بلّے کی ایسی نرنجی آنکھوں والا نیپالی ملازم قابوں سے بھری کشتی اُٹھائے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

کھانا شروع ہوا۔ ڈاکٹر منصور کا شعری نہایت مطمئن اور ہنکی ڈوری معلوم ہو رہا تھا۔ مسز بیگ کے غیر متوقع فلمی گیت سے جو وقتی حیرت طاری ہوئی تھی زائل ہو چکی۔ مانوس امریکن اسٹائیل کینڈل لائیٹ ڈنر۔ شائستہ، ذہین، باذوق شگفتہ مزاج میزبان خواتین۔ بیحد مزیدار کھانا۔ دنیا میں انسان کو اور کیا چاہیئے۔

عنبریں — ''پیزا کا ٹکڑا کاٹتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔ ''تم کوان مالیخولیائی مصنّفہ کا دولت کدہ دیکھنا چاہیئے۔ تم بھی جب امیر کبیر ہو جاؤ اپنا مکان اسی طرح سجاؤ۔ ساٹن بروکیڈ کے پردے۔ اور صوفے۔ سنہری مچھلیوں سے بھرا ٹینک۔ باپ رے۔ ایل۔ ایم۔ سی ٹیسٹ میں حرف آخر۔''

''ایل۔ ایم۔ سی۔ ٹیسٹ کیا ہوتا ہے؟'' مسز بیگ نے دریافت کیا۔

''لیجلسٹو محمڈن کونسل —؟'' عنبریں نے سوچ کر پوچھا۔

"LOWER-MIDDLE-CLASS TASTE" منصور نے جواب دیا۔

"DON'T BE SUCH A SNOB"

"ان کا گھر دیکھو گی تو سمجھ میں آئے گا کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ ایل۔ ایم۔ سی ٹیسٹ سارے ملک میں پھیل گیا ہے۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟ اپ اسٹارٹس؟"

"نہیں۔ پرانے جاگیر دار۔ مگر عصری بد مذاقی کا شکار۔ بالکل یُو۔ کے۔ پی۔"

"یُو۔ کے۔ پی۔ کیا مطلب؟" عنبر نے پوچھا "یونائیٹڈ کِنگ ڈم اف——"

"نہیں۔"

"یونین کیرآلا پروڈکٹس——؟"

"نہیں۔ اور سوچو۔"

"یُو۔ کے۔ پی۔ یُو۔ کے۔ پی۔ نہیں۔ تم بتلاؤ۔"

"اُلّو کے پٹھے——وہ——لال باغ سے جو سڑک حضرت گنج جاتی ہے۔ وہاں ایک زمانے میں لال بیبیاں رہا کرتی تھیں۔"

"لو صاحب ایک اور معمّہ حل کرو۔" عنبر نے مصنوعی اُلجھن کا اظہار کیا۔

مسز بیگ غور سے سُننے لگیں۔

"لال بیبیاں کون ہوتی تھیں؟" عنبر ین نے پوچھا۔

"ان کی وضاحت کا یہ وقت نہیں۔ بات سنو۔ تو ان میں سے ایک لال بی بی جس کی سب سے بڑی کوٹھی تھی وہ پاکستان چلی گئی وہ کوٹھی سرکاری نیلام میں ایک پنجابی شرنارتھی نے خریدلی ایمرجنسی لاگو ہوتے ہی وہ حضرت انکم ٹیکس کے گول مال سے بچنے کے لیے راتوں رات کینیڈا بھاگ گئے کوٹھی ان سابق زمینداروں کے ہاتھ بیچتے گئے۔

"کمپنی اسٹائل بنگلہ تھا۔ اسے گرا کر ان لوگوں نے BAD-TASTE MODERN سہ منزلہ مکان——پری محل——دخترِ بلند اختر کے نام پر——"

"تم نے وہ پرانا بنگلہ دیکھا تھا؟"

"ہاں بھئی۔ اس پنجابی بزنس مین کا لڑکا میرے ساتھ——"

"لال بیبیاں کون چیز تھیں؟" عنبر ین نے بے صبری سے دہرایا۔

"پھر بتاؤں گا ۔۔ اس دفعہ وہاں اس طرح پہنچا کہ ناول نگار خاتون کی ہمشیرہ خورد کا
ن آیا۔ سُنا ہے چین سے ایکوپنکچر سیکھ کر آئے ہیں۔ باجی جان کو ARTHIRITIS —
" عرض کیا بندہ نیورولوجسٹ ہے ایکوپنکچر تو تفریحاً سیکھ لیا تھا۔ بہرحال۔ ساڑھے
پانچ بجے شام وقت مقرر ہوا۔ یہ پچھلے مہینے کی چار تاریخ کا واقعہ ہے۔"
"کب کہاں۔ کیوں اور۔ کیسے ۔" عنبرین بولی "تم جرنلسٹ کیوں نہ بنے"
"ہاں ہر بات ہر معاملہ بالکل صحیح، بلاکم وکاست اور پکا ہونا چاہئے"، مسز بیگ نے صاد کیا۔
"منصور تم کیا ہر وقت لیبورٹری میں بیٹھے رہتے ہو؟" عنبرین نے پوچھا۔
"ایک حد تک ۔"
"کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دے ——"
"اس میں خطرہ ہے"
"منصور میاں میں تمہاری ہم خیال ہوں۔ انسان کو بالکل منطقی ہونا چاہئے اور واضح جو ہم
ایشیائی ہیں ہی نہیں۔ ہمیں فرانسیسیوں کی طرح ہونا چاہئے۔ منطقی ——"
"امّی — بات لالٰی بی بی کی کوٹھی کی ہو رہی تھی ——"
"سنو تو سہی۔ ابھی عقل کو تنہا چھوڑنے کا وقت بھی آیا چاہتا ہے —— میں کوٹھی کے پھاٹک
میں داخل ہوا۔ چھوٹا سا احاطہ۔ چند درخت۔ کنکریٹ اور شیشے کی پہاڑی جیسا مکان اور
چاروں طرف سناٹا۔ میں نے عمارت کا چکر لگایا۔ ایک طرف ایک بڑے میاں تہمد باندھے اُچک
اُچک کر لگی کے ذریعے امرود توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اشارہ کیا کہ ایک امرود
جو بہت اوپر لگا ہوا تھا توڑ دوں۔ میں نے درخت کے گرد گھوم کر مطلوبہ امرود کا جائزہ لیا۔ انسان
اچانک غیر متوقع حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔ دوسرے لمحے میں تنے پر پاؤں ٹکا کر شاخ پر موجود! نیچے
سے بڑے میاں ہشکار رہے ہیں ۔ بیٹا بندر کود۔
"لے کے ہَر کا نام آگے بڑھ کر کود۔
"مسخرے پن کی سچویشن تھی۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ وہ امرود توڑ کر ہی دم لونگا۔
چنانچہ جوتے موزے اتار کر شاخ پر پیر جمائے۔

"درحقیقت میں اسوقت اپنے بچپن میں پہنچ گیا تھا۔ دنیا میں اس گھڑی میں تھا اور وہ خبطی بڑے میاں — اور امرود کا پیڑ۔ اور میں ساری فکروں سے آزاد۔

"امرود توڑ کر نیچے اترا تو کیا دیکھتا ہوں وہ بزرگ میرے موزے پہن کر بگٹٹ بھاگے چلے جارہے ہیں — حیران پریشان درخت کے نیچے کھڑا رہا۔ تب مجھے صورت حال کے بے تکے پن کا احساس ہوا۔ اتنے میں ایک خاتون پچھلے برآمدے میں نمودار ہوئیں ۔"

"ہیروئین کا اسٹیج پر داخلہ ۔ کیا پہنے تھی ؟"

"نیلی مخمل کا جمپ سوٹ۔"

"صورت شکل ؟"

"بس ٹھیک تھی ۔"

"عمر —— ؟"

"وہ کل پیدا نہیں ہوئی تھیں ۔ بعد تسلیمات دریافت کیا آپ ڈاکٹر منصور تو نہیں ؟ میرے پیروں پر نظر ڈالی ۔ میں نے کہا آداب بجا لاتا ہوں ۔ میرے موزے —— ندامت سے بولی —— معاف فرمائیے گا یہ ہمارے منشی جی ہیں ۔ ہماری مرحوم ریاست کے پرانے منیجر ۔ سینائیل ہو چکے ہیں ۔ ہم لوگ ان کا بڑا خیال رکھتے ہیں ۔ کچھ نہیں کہتے ۔"

"منشی جی احاطے کی دیوار پر چڑھ چکے تھے وہاں سے نعرہ لگایا ۔ عوج بن عنق زندہ باد۔"

"پاگلوں کا گھرانہ نہیں تو —" عندلیب بیگ نے اظہار رائے کیا۔ "مگر کوئی بہت ہی وضعدار خاندانی لوگ ہیں ۔ پرانے کارندے کی اتنی دلداری ——"

"جی ۔ چنانچہ وہ ذرا شرمندہ سی موزے اتروا کر لائی ۔ اب ان کو کیا پہنتا لپک کر اندر گئی اور بڑھیا مخملیں ٹرکش سلیپر لے آئی ۔"

"جوتے کیا ہوئے ؟" عنبر نے پوچھا۔

"قبلائی بہادر لے بھاگا تھا ۔ وہ بھی بہت مدمّغ اور شاندار تھا ۔ اصل افغان ہاؤنڈ۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ سڑکوں کے آوارہ کتّوں کتیوں کی شکلوں پر کیسی مسکینی عاجزی اور عزبت

برستی ہے۔ ان کے ایکسپریشن بھی وہی ہوتے ہیں مفلس لاچار انسان جیسے۔ اور اعلیٰ پالتو——"

"منصور۔ ٹریک پر واپس آؤ——"

"اچھا تو میں وہ سلیپر پہن کر خاتون کے ساتھ اندر گیا۔ ان کی بڑی بہن ایک گلابی دیواروں والے کمرے میں شیز لونگ پر نیم دراز مصروف تصنیف و تالیف تھیں۔ وہ بھی خاصی —— یعنی وہ بھی کل پیدا نہیں ہوئی تھیں بلکہ پرسوں بھی پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ سمجھو زمانے کا سرد و گرم سہے ہوئے تھیں۔"

"لباس —— ؟"

"آں —— شاید کاسنی غرارے کا جوڑا۔"

"اللہ کے بندے اتنا لمبا قصہ بے تکان سنا گیا۔ ان دونوں بہنوں کے نام تو بتا——" عندلیب بیگ نے پوچھا۔

"ایملی اور شارلٹ!" عنبر نے شگفتگی سے کہا۔

"میں سمجھا آپ واقف ہونگی۔ مشہور ناولسٹ ہیں۔"

"اے مشہور ناولسٹ تو بہتیری ہیں۔"

"ارے صاحب۔ وہی۔ نگار خانم۔"

"ہاں یہ نام تو دیکھا ہے۔ ریلوے بک اسٹالز کے PAPERBACKS پر —— سمجھتی تھی فرضی نام ہے"

"قلمی نام ہے جناب۔" منصور نے جواب دیا۔ "اس پر یاد آیا۔ ایک صاحب کہنے لگے قلمی اسم تو سُنتے تھے ——"

"یہ کون صاحب ہیں اسقدر جوکیلے جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں ——" عنبر بولی۔

"نگار خانم —— واقعی ایسے نام یا فرضی ناولسٹوں کے ہوتے ہیں مثلاً اصلیت میں عبدالواحد طبا طبائی۔ فرضی نام نگار خانم۔ یا پاکستانی ایکٹرسوں اور گانے والیوں کے —— صبیحہ خانم —— فریدہ خانم ——" عندلیب بانو نے کہا۔ "عنبر تمہیں یاد ہے جب ہم لوگ اسکاٹلینڈ جا رہے تھے جہاز پر وہ اینگلو عورت ملی تھی۔ نورما ڈریک —— نورماہ خانم کے نام سے

پاکستانی فلموں میں ناچتی تھی۔ بتا رہی تھی لکھنؤ ہی سے لاہور گئی تھی۔ وہاں سینما میں ناچنے کے لئے نوہماہ خانم بن گئی ــــ"

" آپ لوگ بھی بات کو کم سائیڈ ٹریک نہیں کرتیں!" منصور نے یاد دلایا۔

" اچھا نگار خانم کا قصہ ختم کرو۔"

" ختم؟ ابھی تو شروع ہی ہوا ہے۔ آواز دی بسنتی ڈاکٹر صاحب کے موزے دھو کر انکی گاڑی میں رکھ دو ــــ میں نے عرض کی میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ بیحد متعجب ہوئیں۔ آپ اتنے برسوں امریکہ میں رہے وہاں سے کار نہیں لائے؟ میں نے کہا لایا تھا نرسنگ ہوم کھولنے میں پیسہ کی کمی پڑ رہی تھی اس وجہ سے بیچ دی۔ پوچھا امریکہ میں تو آپ نے بہت پیسہ کمایا ہوگا۔ چلیئے صاحب یہاں بھی وہی پیشہ پیشہ کی گردان شروع ہوگئی۔ میں نے جواب دیا جی ہاں بہت کمایا تھا مگر جوئے کی لت کی وجہ سے جمع نہیں کر پایا۔

" جوئے کے لفظ پر وہ چپ ہوگئیں۔ پھر گویا سُنی ان سُنی کر کے بولیں، عجیب بات ہے یہاں سے ڈاکٹر بھاگ بھاگ کر امریکہ جاتے ہیں آپ وہاں سیٹل ہوئے ہوائے واپس آگئے۔ کہاں بوسٹن کہاں لکھنؤ۔ یہاں بھلا آپ کا کیا دل لگتا ہوگا۔ میں نے جواب دیا مجبوراً آنا پڑا وہاں کچھ کھپلے ہو گئے تھے۔ اچھا ــــ کیسے کھپلے؟ ــــ میں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا اب تفصیل کیا بتاؤں کچھ قانونی کیس ہو گئے تھے میرے خلاف۔ دو ایک لڑکیاں بھی عدالت میں پہنچنے پر تُلی ہوئی تھیں چنانچہ بھاگ آیا۔

" میں نے محسوس کیا سچویشن خاصی FARCE میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ نگار خانم پھر چند منٹ کے لئے خاموش ہوگئیں کچھ سوچنے کے بعد دریافت کیا۔ اب تو آپ جُوا نہیں کھیلتے؟ میں نے جواب دیا بُری عادتیں کہاں چھُٹتی ہیں۔ آپ تو خود اتنی بڑی نبّاض فطرتِ انسانی ہیں ــــ بہت خوش ہوئیں۔ فوراً پوچھا آپ نے میرے ناول پڑھے ہیں؟ میں نے مُبہم سا سر ہلا دیا۔ فرمایا آپ کو یاد ہوگا میرے ناول محبت کے چندن ہار میں غزالہ جو دردِ سر کی مریضہ ہے۔ نینی تال بوٹ کلب میں ایک یونانی دیوتا جیسے حسین ڈاکٹر سے اتفاقیہ ــــ

"میں فوراً دماغ سوئچ آف کر کے سوچتا رہا کہ ان کی بہن میرے بوٹ تلاش کرنے گئی ہے یا نئے جوتوں کا آرڈر دینے۔ اتنے میں ملازم کافی دانی لے کر آیا۔ مہری جوتے۔"

"چاندی کی کشتی میں رکھ کر لائی ہوگی۔ نواب لوگ جو ٹھہرے۔ چھوٹی بہن کا کیا نام ہے؟" عنبریں نے سوال کیا۔

"صاحبزادی شہوار خانم۔ شوقیہ گڑیاں بناتی ہیں۔ جاپانی فلاور ڈیکوریشن وغیرہ امیرزادیوں کے مشاغل۔ گفتگو سے اخذ کیا کہ والدین حیات نہیں۔ آبا حضور ۵۲ء سے قبل جنوبی یوپی کے بڑے جاگیردار تھے۔ وہ علاقہ اب مدھیہ پردیش میں شامل ہو چکا ہے۔ جانے کون سا ضلع بتایا تھا۔ اس وقت میں نے اپنا دماغ سوئچ آف کر رکھا تھا۔ تین بھائی ہیں۔ پندرہ بیس سال قبل انھوں نے یہاں شمال میں آ کر ہلدوانی نینی تال وغیرہ میں ٹمبر کی تجارت شروع کی۔ بقول ان کے ایک فیکٹری ڈالی۔ ہم لوگ گوشت بھی ایکسپورٹ کر رہے ہیں مڈل ایسٹ۔ پچھلے سال ایک کروڑ کا ٹرن اوور رہا۔ نگار خانم نے فرفر بتایا۔ سیاسی عزائم بھی رکھتی ہیں کہنے لگیں "ڈاکٹر صاحب شکر ہے کہ اب ہندوستانی مسلمان سرکاری ملازمتوں کے بھروسے پر نہیں بیٹھے رہتے کاروبار میں لگ گئے ہیں ان میں سکت اور توانائی آ رہی ہے۔ میرے خیرخواہ مُصر ہیں کہ اسمبلی الیکشن کے لئے کھڑی ہوں۔ کہتے ہیں کہ آپ ایک روز یو۔پی کی چیف منسٹر بھی بن سکتی ہیں آخر آسام کی چیف منسٹر بیگم انوآرہ تیمور تھیں کہ نہیں۔ دلّی اور یو۔پی میں بھی کتنی بیگمات نامور لیڈر ہیں۔ مگر میرا اصل میدان ادب ہے ـــ ابھی مجھے اُردو ناول کو بہت بلندی پر لے جانا ہے۔ تاکہ وہ ڈینس روبنز اور باربرا کارٹلینڈ کے ناولوں کا مقابلہ کر سکے ـــ ڈائجسٹ بھی میرے ناول قسط وار شائع کرتے ہیں۔' انھوں نے کچھ ڈائجسٹوں کے نام بھی بتائے ـــ کنواری بالی۔ بہو بیگم۔ بیوہ۔ خوش دامن ـــ"

"اے ہٹو۔ یہ ڈائجسٹوں کے نام ہیں؟" عندلیب بیگ نے کہا۔

"اسی قسم کے بتائے تھے۔ پھر کہنے لگیں اب میں تنقید بھی لکھ رہی ہوں

"میں دم بخود۔ گھڑی دیکھی۔ شہوار سے کہا کتّا بند ھوا دیں تاکہ باہر جا سکوں یا مجھے خود پھاٹک تک پہنچائیں۔"

"میں دیکھتی ہوں صاحبزادی شہوار WHATEVER سے خلوص بڑھتا جارہا ہے"
عنبریں ذرا رکھائی سے بولی۔

"جی دیکھیے جائیے۔ شہوار خانم بالکل میموں کی طرح کوبلاتی بہادر کو بلائی بہادر چلاتی باہر گئیں۔ میں نے باہر آکر موٹر بائیک سنبھالی۔ پھاٹک کی طرف بڑھا۔ ایک کوٹھری نظر آئی۔ اندر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ میں سمجھا چوکیدار ہے آواز دی کہ کتا بندھوادے۔ جواب ندارد۔ روشنی اس پر پڑی تو ایک ادھیڑ عمر کا شخص۔ جھبرے کھچڑی بال جھاڑ جھنکاڑ کھڑ بڑی داڑھی۔ سُرخ متوحش آنکھیں۔ زنجیر سے بندھا زمین پر بیٹھا دکھلائی دیا جیسے اندھیرے غار میں چھپا PRIMITIVE انسان ــــــ"

"پریمیٹو انسان زنجیروں سے کہاں بندھتا تھا۔" عنبریں نے ٹوکا۔

کھانے کے بعد وہ تینوں ڈرائینگ روم میں واپس آئے۔

"جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا انٹر سائنس میں۔ میرس روڈ پر ایک کوٹھی تھی بڑی پُراسراری۔ کمپاؤنڈ میں گھنا جنگل۔ بہت اندر جاکر ایک قدیم بنگلہ۔ ایک پرانی فلم ایکٹریس اس میں رہا کرتی تھی" صوفے پر بیٹھتے ہوئے منصور نے کہا۔

عندلیب بانو نے سر ہلایا۔ "جانتی ہوں۔ میں نے انکی آخری فلم سنہ چالیس میں دیکھی تھی کلکتے میں۔ عنبریں کی سالگرہ تھی۔ پارٹی کے بعد میں اور ممّا اور فلومینا سکنڈ شو۔"

"امّی جان آپ کو میرا سنہ ولادت اس طرح نشر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نیور مائینڈ یار WHO CARES ہاں تو میاں منصور۔ تم پٹری سے اُتر کر علی گڑھ جاپہنچے"

"بالکل صحیح ٹریک پر تھا۔ نگار خانم پر وہ علیگڈھ والی کوٹھی یاد آئی ہمیں لگتا تھا جیسے اس کے اندر مس ہیویشم رہتی ہوں چارلس ڈکنز والی۔ جن کے گھر کے سارے کلاک اور گھڑیاں بند ہو چکیں۔ وہ پاگل مجھے گھورے جائے۔ اتنے میں شہوار بی بی دوڑی ہوئی آئیں اور کہا۔ کوبلاتی بہادر کو بندھوا دیا ہے۔

"میں نے دل میں سوچا ابتک تو ان کا شین قاف درست تھا کُتّے کے سلسلے میں کسی بڑھیا بیم کی روح ان میں حلول کر جاتی ہے۔

"آپ نے تو ایک انسان بھی یہاں بندھوا رکھا ہے۔ اسے پاگل خانے کیوں نہیں بھیجتیں؟ میں نے برہم ہو کر پوچھا۔

"کہنے لگیں ۔ کیا بتایا جائے وہی ہمارے باؤلے منشی جو ہیں جن سے آپ کا سابقہ پڑا۔ ان ہی کا بیٹا ہے ماں باپ نہیں چاہتے کہ نگاہوں سے اوجھل رہے۔ ورنہ کیا بات ہے ہم ان کا بہترین علاج امریکہ بھیج کر کرواسکتے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے۔ مگر ہمیں منشی جی کی دلداری منظور ہے وہ ہماری سابق ریاست کے وفادار منیجر رہ چکے ہیں

"کب سے ان کا دماغ خراب ہوا ہے؟ میں نے پوچھا۔ بولیں پیدائشی سمجھیئے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جنون بڑھتا جا رہا ہے "۔

"انسان کا بھی تو عمر کے ساتھ جنون بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے اس نے نیوکلیر بم کہاں بنائے تھے "عندلیب بانو بولیں۔ "اب وہ غار میں واپس جا کر خود ساختہ زنجیروں میں جکڑ گیا ہے"۔

"مسز بیگ! باتیں تو آپ اتنی عمدہ کرتی ہیں اور وہ سطحی نگار خانم بطور رائٹر مشہور ہیں جو ڈینس روبنز کو انگریزی کا بہترین ناولسٹ ـــــ"

"خیر انصاف کرو بے چاری کے ساتھ۔ ڈینس روبنز بھی اپنے فن کا اُستاد ہے ـــ" عندلیب بانو نے فراخدلی سے کہا۔ "تم خاصے اینٹی نگار خانم ہو رہے ہو۔ فرسٹ امپریشنز پر کبھی نہیں جانا چاہیئے "۔

"بہرحال ۔ تو میں نے کہا امریکہ چھوڑ اس غریب کو رانچی ہی بھجوا دیجیئے بولیں خطرناک نہیں۔

"تو زنجیروں سے کیوں بندھوا رکھا ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ کہنے لگیں۔ دراصل کچھ مجذوب سے ہیں دورہ پڑتا ہے لوگوں کو مارنے دوڑتے ہیں۔ چنانچہ زنجیروں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ آج شام پھر حالت غیر ہوئی تھی۔ پڑوس کے لوگ اور نوکر چاکر ان کو باباجی پکارتے ہیں۔

"میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور بھاگا۔ ایک مہینے کے بعد آج شہوار نے پھر رنگ کیا ہے کہ ان کی باجی کو دیکھ جاؤں۔"

"موسٹ انٹرسٹنگ۔"

نیپالی ملازم کافی کی ٹرے لے کر حاضر ہوا۔

"مگر اس خاندان کے لواحقین میں ایک چھوڑ دو دو پاگل۔ ممکن ہے یہ ان کے غریب رشتے دار ہوں۔ منشی جی اور ان کے بیٹے باباجی۔ دراصل پاگل پن بھی ڈیکیڈنس کی ایک علامت ہے۔" عندلیب بانو نے کافی بناتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں اکثر پرانے زمیندار گھرانوں میں اور راجوں نوابوں کے ہاں ایک آدھ فاترالعقل ضرور مل جائے گا یا پیدائشی ایڈیٹ۔ بمبئی کے قدیم پارسی خاندانوں کے پاگل تو مشہور ہیں میں جب بریچ کینڈی ہاسپٹل میں۔۔۔۔"

"وہ فلم ہم نے برسلز میں دیکھی تھی۔" عندلیب بانو نے بات کاٹی۔ "ایک بریزیلین قدیم خاندان دکھایا تھا وہ اپنی RANCH پر رہتے تھے خوب بڑا سا گھر۔ اُداس سا۔۔ آدھے لوگ دیوانے۔۔ اور جو دیوانے نہیں وہ پرورٹ۔۔ مرد عورت سب۔ اپنے بھیانک رازوں کی دوسرا تھ میں اس سنّاٹے کے اندر اپنی زندگیاں گزار رہے تھے۔"

"شاید اسی فلم میں تو تھا آنتی جان کہ انھوں نے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو بڑے بڑے پنجروں میں بند کر کے درختوں سے لٹکا رکھا تھا۔ وہیں کھانا بھجوا دیتے تھے۔ ایک مخبوط الحواس بچے کو کتّے کے KENNEL میں رکھ چھوڑا تھا۔ ہوریبل۔۔۔"

"یہ لوگ تو مجھے ایسے خوفناک معلوم نہیں ہوتے۔ بڑی بہن خاصی AMBITIOUS اور ذہینٹ ہیں۔ چھوٹی ڈالی بھولی سی ہے۔ بس میم بننے کا شوق بہت ہے۔۔ کو بلائی کھان! کو بلائی کھان!" منصور نے باریک آواز میں نقل اتاری۔

"شہوار اچھا نام ہے۔" عندلیب بانو سوچ کر بولیں۔ "یہ لوگ مغل ہیں یا پٹھان؟"

"مجھے تو خالص دیسی معلوم ہوئے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص مغل یا پٹھان ہو۔؟"

"نہیں مگر ہر نسل کے کچھ لاشعوری تقاضے اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ تم نے اپنا نام اتنے فخر سے کاشغری کیوں رکھا ہے جو ہندی میں کاس گھری لکھا اور پڑھا جاتا ہے ــــ؟"

"میم دراصل ایسا ہوا کہ ہمارے پردادا تجاری تھے جب وہ روسیوں نے سمرقند بخارا وغیرہ پر قبضہ کیا تو بہت سے مولوی مُلّا وہاں سے بھاگ آئے ہندوستان۔ براہ پشاور۔ ہمارے پردادا بھی بھاگ آئے۔ بمبئی کی مسجدوں میں نمازیوں کے جوتوں کی دیکھ بھال کرنے والے اور پیش امام کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے سب بے چارے مسکین لوگ بخاری کہلاتے ہیں میں نے وجہ پوچھی معلوم ہوا ان کے باپ دادا کچھ زار روس کے قبضے کے وقت بھاگ آئے تھے کچھ اکتوبر انقلاب کے بعد ـــ یہاں آکر مسجدوں میں پیش امام یا بانگی بن گئے ــــ"

"اگر وہیں رہ گئے ہوتے تو ان میں آج کوئی سائنٹسٹ ہوتا کوئی خلاباز ـــ" عندلیب بانو نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میرے پردادا دلی کی ایک مسجد میں موذن ہو گئے تھے۔ پیش امام صاحب نے اپنی لڑکی سے اُن کا نکاح پڑھا دیا۔ میرے دادا اور والد بھی ساری عمر موذّن اور پیش امام ہی رہے مجھے یاد ہے مغرب کے وقت حسبِ دستور محلّے کے ہر دروازے پر جا کر کنڈی کھڑکھڑاتے میں ساتھ ساتھ چلتا اور گھر کی بی بی دروازے کی اوٹ سے ایک روٹی اور ذرا سا سالن یا دال پیالے میں ڈال دیتی۔ ایسی مفلسی میں میرا بچپن گزرا۔"

"مائی گوڈ ـــ" عنبرین نے آنکھیں پھیلا کر بیحد افسردگی سے اسے دیکھا۔

"آپ پر رومانی کرب کی کیفیت طاری ہو گئی! سنتی جائیے۔ اسکول سے لے کر ایم۔ ڈی۔ بی ایس تک وظیفے لے کر اور ٹیوشن کر کے پڑھا۔ والدین میرے بچپن میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ میں اکلوتی اولاد تھا امریکہ میں پڑھائی بھی میرٹ اسکالرشپ پر کی۔ اسی وجہ سے جب نگار شہوار جیسے چوبٹ لوگوں سے ملتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ جس وقت میں وہاں سے چل رہا تھا اور شہوار بیگم کو بلائی بہادر کو بلائی بہادر جلّائی افغان کے پیچھے دوڑی تھیں ایک غریب مسکین بوڑھا پھاٹک پر کھڑا تھا اس نے بڑی لجاحت کے ساتھ ان سے کچھ کہا۔ انھوں

نے زور سے جھڑک دیا گویا وہ بزرگ ان کے کو بلائی کھان سے بھی کمتر مخلوق تھے۔"
"قبلائی ـــــ تو بڑی برتر مخلوق ہے بھئی جو ان کو انگریزی آواز اور لب ولہجہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے" عنبرین نے کہا۔
" ہاں اور اس وقت مجھے تعجب ہوا کہ ایسے لوگ ہمارے معاشرے کے لیڈر ہیں۔ سطحی بیحس۔ نمائش پسند، اقتدار پرست۔"
" میاں تم سیلف میڈ ہو" عندلیب بانو نے کہا۔" لیکن اپنے مزاج اور تجربات کی بنا پر درمند۔ بہت سے سیلف میڈ لوگ اپنے مزاج اور تجربات کی بنا پر خود غرض اور سخت دل ہو جاتے ہیں رہین نگارا اور شہوار تو بیہ اس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں ـــــ دوسروں کی محنت کا پھل اس سے چھین کر خود کھانا اس کا تاریخی رول رہا ہے۔ مجھے یاد ہے آج سے پچاس سال قبل لندن کے کسی اخبار میں چھپا تھا کہ ایک اوسط درجے کا راجہ نواب اپنی ذات پر دو سو سے چار سو پاؤنڈ روزانہ خرچ کرتا تھا جب کہ اس کی پرجا کی آمدنی چند پینس یومیہ پر مشتمل تھی۔
" دوسری بات یہ ہے کہ بھئی ممکن ہے ان دونوں بہنوں کے اندر بھی کوئی نیکی اور گہرائی موجود ہو پہلی ملاقات میں تم نے ان کا ایک ہی رُخ دیکھا۔ انسانوں کے متعلق فیصلے کرنے میں جلد بازی نہیں برتنا چاہیئے۔"
" بس ہاؤس کو مؤدبانہ یاد دلانا چاہوں گی" عنبرین نے کہا۔" موضوع زیر بحث یہ تھا کہ ڈاکٹر منصور بخاری سے کاشغری کیسے بنے۔"
" وہ۔ ہاں تو والدین کا انتقال ہو چکا تھا مدرسہ فتحپوری میں مرزا منصور احمد لکھوایا گیا تھا وہاں سے نکل کر میں نے بخاری کے بجائے کاشغری کا اضافہ کر لیا۔ بخاری بہت COMMON نام تھا۔"
" تو اس طرح آپ گویا رُوسی کے بجائے چینی نژاد ہو گئے۔"
" جی ہاں۔ اس وقت ہندی چینی بھائی بھائی بھی تھے۔"
" میرا جوتا ہے جاپانی میرا کوٹ انگلستانی سر پہ لال ٹوپی روسی پر دل ہے ہندوستانی" عندلیب بانو پھر الاپنے لگیں۔

منصور کو "شام ڈھلے کھڑکی تلے ۔" یاد آیا ۔ بے اختیار ہنس پڑا ۔ "پہلے سوچا یار قندی لکھواؤں ۔ لیکن یار لوگ اسے شکر قندی کر دیتے ۔ خصوصاً علیگڈھ میں ۔۔۔ سوچا کاشغری ہی ٹھیک ہے ۔"

"نہایت رومینٹک نام ہے ۔" عنبریں بولی ۔

"ہُم ۔ کانوں میں سِلک روڈ پر سے گزرتے کاروانوں کی گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں ۔" عندلیب بانو نے صاد کیا ۔

"آپ کو ادیب یا شاعر ہونا چاہیئے تھا ۔"

"ارے مورے بجوا ۔ ہونا تو جانے کیا کیا چاہیئے تھا ۔"

"ابھی جب میں چین گیا تو وہ لوگ سنکیانگ وغیرہ بھی گھُمانے لے گئے ۔ کاشغر میں چینی مولوی مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوئے ۔"

"چینی مولوی بے حد کیوٹ لگتے ہیں ۔" عنبریں نے کہا ۔ "مگر تم چین کیسے گئے ؟ ہم ہندوستانیوں کا بوجہ اقصائے چین چین ماچین جانا ذرا ۔"

"بمبئی میں وہ ڈاکٹر سارد لبائی ہیں نا ۔۔۔ ایکوپنکچر والے ۔۔۔ ان کے ذریعے ۔"

"چنانچہ آپ کا سَس گھری بھائی پنکچر والا بن گئے ۔۔۔" عنبریں نے کہا ۔

" آداب عرض کرتا ہوں ۔ اور صاحب نام کی بات تو یوں ہے کہ جب پیکنگ سے بمبئی لوٹا اور معلوم ہوا ایک لیڈی ڈاکٹر لیبیا سے لکھنؤ تشریف لائی ہیں اور پارٹنر شپ میں کلینک اور نرسنگ ہوم قائم کرنا چاہتی ہیں ۔ سوچا قسمت آزمائی کر لو ۔ آپ کا اسم گرامی بتایا گیا ۔ ڈاکٹر اے ۔ بیگ ۔ آپ کا SURNAME مغربی فیشن ہے ۔ اُصولاً بھی غلط ۔ آپ عنبریں بیگم ہیں ۔"

"درست ۔ ڈاکٹر مسعودہ خان کو مسعودہ خانم ہونا چاہیئے ۔" عندلیب بانو نے کہا ۔

"مگر جب بیبیاں خود کو خانم کہلاتی ہوں تو آپ فرماتی ہیں کہ یہ پاکستانی ایکٹرسوں اور گانے والیوں کا سا نام لگتا ہے ۔ دراصل الفاظ سب پامال ہو چکے ہیں ۔" منصور نے جواب دیا ۔

"کلکتہ کے اسکول اور کالج میں اس کا نام عنبریں بیگم ہی لکھا یا گیا تھا۔ یہاں انڈیا میں تو مس بیگم چل جاتا ہے۔ مگر اڈنبرا میڈیکل کالج والے بیگم باپ کا نام سمجھے۔ لہٰذا بیگ کرنا پڑا ہاں تم ٹھیک کہتے ہو الفاظ ——— نام ——— سب پامال ہو چکے ہیں۔ لوگ بولتے بولتے تھک گئے۔ کم از کم دس ہزار سال سے تو باقاعدہ اور متواتر بولے جا رہے ہیں۔ اسی لئے وہ شخص جو نگار خانم کے سرونٹ کوارٹر میں زنجیروں سے بندھا چھپکا بیٹھا ہے وہ کتنا محفوظ ہے۔"

"بیگم صاحبہ فرض کیجئے ہم سب کے ناموں کے بجائے نمبر ہوتے۔ نمبر تین۔ نمبر بارہ نمبر سات۔ بمبئی کے ہسپتالوں میں وارڈ بوائے اطلاع دیتے ہیں صاحب گیارہ نمبر خلاص ہونا مانگتا ——— یعنی گیارہ نمبر بیڈ کا مریض مرنے والا ہے۔"

"خلاص ہونا مانگتا ———" عندلیب بانو نے جھرجھری لے کر دہرایا۔

منصور نے موضوع تبدیل کیا "عندلیب آپ کا تخلص ہے؟"

وہ خاموش رہیں۔

"معاف کیجئے میں بھی نگار خانم کی طرح ذاتی سوالات کرنے لگا۔ ہم ہندوستانی مغرب میں کتنا ہی رہ لیں خصلت تھوڑا ہی بدلتی ہے۔"

"نہیں بھئی" انھوں نے چونک کر جواب دیا۔ "تخلص نہیں ہے۔ والدہ نے مجھے عندلیب بانو بیگم پکارا۔ خود ان کے دادا نے ان کا نام گلرخ بانو بیگم رکھا تھا۔"

"گلرخ بانو بیگم! لگتا ہے گویا ہمایوں نامہ کھل گیا۔" منصور نے بے ساختہ داد دی۔

عندلیب بیگم تلخی سے مسکرائیں۔

"ٹایم جنٹلمن ———" عنبریں نے کلوکلاک پر نظر ڈال کر اعلان کیا۔

"کیا مطلب ——— ؟" منصور نے پوچھا۔

"ارے کیا تمہارے امریکہ میں یہ رواج نہیں؟ ہمارے برطانیہ کے PUBS میں تو بار میڈلس یہ دو الفاظ کہہ دیتی ہے۔"

"بھئی ہم امریکہ کی بارز ہی میں بہت کم جاتے تھے۔"

"تو جوئے میں ہارنے کے بعد جیل جانے سے قبل غم غلط کرنے کے لئے کیا کرتے تھے؟"

"بس پیاز کھاتے تھے۔"
"ڈاکٹر کاس گھری گھڑی گھڑی دیکھنے کے بجائے اب بھاگیے۔"
"ڈاکٹر کاس گھری ۔۔!" منصور نے دہرایا۔ "اور جب لکھنؤ پہنچ کر ڈائریکٹری میں آپکا فون نمبر دیکھ رہا تھا ایک صاحب بولے ۔۔۔ یار یہ عنبرین کون شے ہے۔ ہمدرد کی کسی دوا کا نام؟"
"ہا ہا ہا ۔۔۔ پی۔ جے۔"
"پی۔ جے؟"
"پھلیٹ جوک ۔۔۔!"
"بھیّا اب واقعی سدھارو۔" عندلیب بانو نے تردد سے کہا۔ "ہم لوگ یہاں نئے نئے آتے ہیں۔ پڑوسیوں کو معلوم ہے کہ تم عنبر کے کولیگ ہو مگر یہ چھوٹا شہر ہے۔"
"آپ کو اس کی اتنی فکر کیوں ۔۔۔؟ عنبر انڈیپنڈنٹ ڈاکٹر ہے۔ پندرہ سال برطانیہ دس مڈل ایسٹ میں گذار کر آرہی ہے۔ اور آپ ہیں کہ کنویں کے مینڈکوں سے ڈرتی ہیں۔"
وہ جھنجھلا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"اب آدھی رات کو تمہاری موٹر بائیک یہاں سے جائیگی سارے محلّے پر الم نشرح کہ امریکہ والے ڈاکٹر صاحب انگلینڈ والی ڈاکٹرنی کے ہاں ڈنر کھا کر جا رہے ہیں۔ تم کو کیا پتہ یہاں کی گھریلو بیویوں کے پاس کتنی فرصت ہے۔ یہ تمہارا بمبئی تھوڑا ہی ہے۔ یا بوسٹن۔"
"تب تو نگار خانم ٹھیک ہی کہتی تھیں میں وہاں سے کیوں لوٹ آیا۔"
"اچھا کل ان کے ہاں جاؤ تو آکر ساری رپورٹ دینا۔" عندلیب بانو نے دلچسپی سے کہا۔
"امّی آپ کو بھی GOSSIP میں مزا آتا ہے۔ ابھی پڑوسنوں کی اس عادت کی شاکی تھیں۔"
"گوسپ کیا ہے؟۔ مشاہدہ حیات! اگر اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے ۔۔۔" عندلیب بانو نے فرانسیسی انداز میں کندھے اُچکا کر ونک کیا۔

(۲)

جو جھکوں تو شاخِ گلاب ہوں

"بسنت کی پھوار اور سنہری دھوپ! یاد ہے امّی ایسے میں گریٔنی کہا کرتی تھیں اے لو بیوی اللہ میاں ہنس رہے ہیں! امّی جان۔ بعض دفعہ ننّا کا مسکراتا چہرہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ہیرے کی لونگ۔ ابرق سے دمکتا لہریا دوپٹّہ ——— کتنی مشّاقی سے دوپٹّے چُنتی تھیں ننّا ——"

بارش کی تیز ترچھی پھوار نے شیشے دھندلا دیے۔ سودا سلف کی ٹوکریوں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے حسین بخش نے جھاڑن نکالا۔" بیٹا ذرا ٹھیے۔"

" ٹھیک ہے حسین بخش —— چلئے چلیے —— گریٔنی کی ٹکسالی اردو! ساون کی رم جھم۔ بھادوں کے جھالے۔ ماگھ کی مہاوٹیں —— کہتی تھیں تمہاری نگوڑی انگلش میں سب کے لئے وہی ایک اللہ ماری 'رین'! ایکدفعہ بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی بولیں - ہماری بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں ساون بھادوں بہن بھائی ہیں جو گلے مل کر رو رہے ہیں۔ بہن کی رخصتی پر بھائی رونا ہے - کیسی خوبصورت بات —— ڈیم"

بریک۔ ایک بے نیاز کالا بجار سامنے سے گذر گیا۔

"—— امی جان! —— وہ بتاتی تھیں کہ ساون میں وہ سب پردے دار بہار کس میں ٹھُس کر قطب صاحب جاتی تھیں۔ سارا گھر —— وہاں بڑی چل پوں مچتی۔ وہ جھولے پر بیٹھ کر الاپتیں۔ اماں میرے بھیّا کو بھیجو ری کہ ساون آیا"

" تمہاری گریٔنی کا نہ کوئی بھیّا تھا جو انہیں ساون میں بلاتا نہ میکہ۔ اب کوئی اور بات کرو۔"

" امّی جان۔ اینگلو سیکسن لوگوں نے جذبات کو جرم کیوں سمجھ لیا ہے؟ میرا خیال ہے

ب آپ بھی اپنے اس انگریز مزاج کو بدلیے۔ کیونکہ آپ اینگلو سیکسن نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں کبھی کبھار تھوڑے سے آنسو اعصاب کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ مائی گوش —— گرینی بیچاری کتنا روتی تھیں۔ برآمدے میں بیٹھی ہیں۔ سامنے مینہہ برس رہا ہے۔ ادھر انکی آنکھوں سے آنسو —— ساتھ ساتھ گانے کی کوشش —— راجہ کوڑیا کھو ورس کی بوندیں پڑیں۔ مجھے پکارتیں —— اری او لونڈیا —— امیر خسرو کی پہیلی بوجھ —— سموسہ کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا —— گلا نہ تھا —— !میں چہک کر جواب دیتی۔ ان پہیلیوں کے جواب انہوں ہی نے سکھلائے تھے پھر میں کہتی۔ ننا تم بھی تو بے سُری ہو۔"

"تمہاری ننا کو ساری عمر آنسو بہانے سے بہت فائدے ہوئے؟ بکواس مت کرو۔"

"او۔ کے۔ او۔ کے۔ مُوم —— ایسی عمدہ موسم بہار کی بارش ہورہی ہے۔ کوئی چیرفل سَونگ ہوجائے —— مثال کے طور پر بہار کا خیال ——"

"بنگال بہار کا خیال چھوڑو۔ موٹر چلاؤ دھیان سے۔"

"ہا ہا ہا —— ویری گُڈ —— !انہیں امی۔ پلیز۔"

"ہُوں —— ہُوں —— پھولوں والی کنٹھ مَیں کا بسنت گروا —— پھولوں والی ——"

"جولی گُڈ —— ذرا وَلیوم اونچی کیجیے۔"

"حسین بخش۔"

"اونچا سُنتے ہیں۔ اطمنان سے گایئے —— دیکھیے اس وقت کار کیا پُروائی کے جھونکے سمان جارہی ہے —— کم اَون اولڈ گرل —— اچھا جانِ عالم کی کوئی چیز —— موقعے کی مناسبت سے۔ بقول منصور —— کیا ہے کہ —— یہ لکھنؤ ہے اور رِت بسنت!"

"ہُوں —— ہُوں —— ہُوں —— اچھا نواب صاحب رامپور کی ایک بندش سنوگی —— نواب رضا علی خان کی —— تلنگ میں۔"

"شیور۔"

"ہُوں —— ہُوں —— کبھی انکو نہ مرے ہاتھ کا بھایا پانی —— جب دیا میں نے بُرا ہوگیا اچھا پانی۔"

پھر خاموش۔
" بھئی امی پلیز۔"
" او گھٹا کالی گھٹا تھم کے کہیں سانس بھی لے   ہوا جاتا ہے میرے ڈیل سے اونچا پانی "

چھینٹیں اڑاتی موٹریں۔ اسکوٹر۔ رکشائیں۔ خوش باش زرد پوش سیلانی۔

" جی لہو روتا ہے میرا تو اچنبھا کیا ہے   دکھ تو کر دیتا ہے پتھر کا کلیجہ پانی "

موپڈ سوار لڑکیاں۔ خود پہنے موٹر بائیک پہ فرّاٹے بھرتا

" ارے منصور ——! عنبر گاڑی روکو —— اے بیٹا —— منصور ——"

وہ چھتر منزل کی سمت بارش کی لطیف دھند میں سے نمودار ہوتا ہے۔
پیہو بہار گائے جا   ابر بہار چھا گیا   شہید مینار کے سامنے گرجتا
گھڑ گھڑاتا کلوزاپ کول گیٹ مسکراہٹ   بسنت رت کی بجلی

" ہائے عنبر۔ گڈ آفٹر نون مسز بیگ —— سلام حسین بخش !!   اتوار منانے
نکلی ہو۔ ڈاکٹر صاحب اور میں تمہاری طرف آ رہا تھا۔"
" اتوار نہیں کچھ اور —— ایک پیشنٹ کا فون آیا تھا۔ اسے دیکھنے فرنگی محل
جا رہی تھی۔ شاہ میناؒ صاحب کے نزدیک پتہ چلا کہ سیاپا سنی ہو گیا ——
پاٹے نالے پہ کرفیو لگا ہے۔ گھر لوٹی۔ امی نے کہا۔ ماتا بدل پنساری ——"
" عجیب اُول جلوُل نام ہے۔ یار نہیں ماتائیں بدلی جا سکتی ہیں !!"
" بس تو امین آباد سے واپس آ رہے ہیں۔ تم بتاؤ شہوار بیگم سے مل آئے؟"

FLASH GORDON FLASHES A SMILE

واٹ اے ہینڈ سم فیلو ــــ گوپالا آلا رے ــــ آلا ۔ ذرا موٹر سنبھال برج بالا۔
ٹاور برج اٹھا ۔ مور پنکھا بجرا چلا آتا ہے مچھلیوں کا پھریرا اڑاتا
ہُگلی ــ کلائیڈ ــ ڈی ــ ٹیمز ــ زائندہ رود ۔ نوسر ۔ یس سر ــ
وہ تو گومتی کے تٹ پر ــ بھیگے گل مہر کے سائے میں موٹر بائیک پر بیٹھا
گوپالا آسمان کو دیکھتا ہے

"بارش تھمی اور کنکوّے موجود ۔ عنبرین چلو ہم بھی بیلی گارد میں جمگھٹ[1] "

چونہہ اور رُت رنگی ہے جو گیندے کے رنگ کی ــــ سرسوں کے پھول من
پہ گھٹا بن کے چھا گئے ــــ اچھا ہوا کہ ایسے سمے تم بھی آگئے ــــ کرتی نہیں
بسنت کا درشن تو رے بنا ۔

"عنبر ری لیکس ــ جلد تمہیں ان فسادوں کی عادت ہو جائے گی "
" یس ۔ اف کورس "

تختۂ گل کے کنارے ایک ہری بنچ ۔
حسین بخش مودّب ، مہذّب ، افیونی باورچی
امّی جب پچپن برس قبل لکھنؤ آئی تھیں افیونی داستان گو چوک میں مثنوی
زہر عشق سناتے تھے پچپن اور جوڑ دو تو سرشار کا لکھنؤ ۔
مزید ستّر پچھتّر عہد نواب سعادت علیخان وزیر ہند ــــ ۱۸۰۱ء
میں اپنی تسبیح روز و شب کا

---

[1] لکھنؤ میں پتنگ بازی کا میلہ ۔

: پچپن سال پہلے والی امّی ابھی موجود ہیں — بیلی گارد کی طرح شکستہ۔ وقت کی گولہ باری جھیلے — بیلی گارد کے کاسل غدر میں گولوں سے چھلنی ہو گئے۔ کھنڈر سامنے موجود۔ جی لہو روتا ہے میرا تو اچنبھا کیا ہے — دکھ تو کر دیتا ہے پتھر کا کلیجہ پانی۔ چار سُو ہریالی۔ اور شادابی۔ تناور درخت۔ گلاب کے تختے۔

" عنبر — کل رات ندوۃ العلماء کے سامنے زبردست آتش بازی ہو رہی تھی۔ جل بہار دیکھتا گھر پہنچا تو ٹورزم والے شریش چندر صاحب کا فون۔"

" نہایت نفیس آدمی ہیں۔"

" فرمارہے تھے لکھنؤ فیسٹول شروع ہو چکا۔ آپ ابتک تشریف نہیں لائے۔"

" ضرور تشریف لے جاؤ۔ تم تو بڑے زبردست CULTURE-VULTURE ہو — شہوار بیگم کو بھی ساتھ لے جانا مینا بازار۔"

" ہلو — عنبر — کیا بات ہے؟"

" اِن پرڈپریشن کے دورے اسی طرح پڑا کرتے ہیں۔ کل رات سے ان کا یہی عالم ہے —" امّی کی شکایت۔

" ہائیں! ملک عنبر!! — یہ کیا سُن رہا ہوں؟ تم بھی تو اس افسانوی ساحل پہ رہتی ہو۔ بسنت رُت میں چھتر منزل اور فرح بخش کے جھروکوں سے بیگمات گومتی کے میلے کا نظارہ کرتی تھیں — بادشاہ اور خواص وعام سب زرد پوش۔ مور وماہی نما بجروں پہ سوار۔ میر انشا مہنت کا بھیس بدل کر اسی کنارے پر — واللہ وہ دیکھو لکھنؤ کی وضعداری۔ ایک بزرگ لڑکھڑاتے چلے آرہے ہیں۔ ہاتھ میں بسنتی رومال!"

ایک نحیف الجثہ بڑے میاں آہستہ آہستہ چلتے آن کر خالی بنچ کے قریب رکتے ہیں۔ سفید جھاگ ایسی دوپلّی۔ سفید انگرکھا۔ سفید مونچھیں۔ بارعب چہرہ۔ حسین بخش لپک کر انھیں سلام کرتے ہیں۔ جھاڑن سے بنچ پونچھ اپنی اینٹ پر واپس پڑے

میاں یا علیؑ کہہ کر بنچ پر فروکش۔ چھڑی کی مُوٹھ پر دونوں ہاتھ دھرے انگرکھے میں ملبوس ایک پیر بڈ کردار۔ مُڑ کر دیکھا ایک دو بار جیب سے کوئی چیز بند مٹھّی میں نکالی۔ بسنتی رومال کی اوٹ کر کے مُٹھّی منہ تک لے گئے۔ نجانے کس چیز سے شغل کر رہے ہیں۔ شاید یہ بھی افیم کھاتے ہوں۔ انگلیوں میں عقیق اور فیروزے کی نقرئی انگشتریاں۔ اب دوسری جیب سے خاکِ شفا کی تسبیح۔ شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔

" میم —— یہ صاحب یقیناً ایک تباہ حال وثیقہ دار ہیں —— " منصور کی امّی سے سرگوشی۔ " حُسین بخش نے بھی انکو بڑے ادب سے سلام کیا "

حُسین بخش بینک میں۔ بھلا بتاؤ اس شہر کے ڈیکیڈنس کی کوئی حد ہے۔ ایک پھٹے حال نواب صاحب۔ ایک افیمی باورچی —— کارخِ سعادت علیخاں کے باغ میں دونوں سرنگوں —— یرقان زدہ موسم —— اللہ اللہ۔

" عنبر —— ! چیئر پ ! "

" بن غازی میں شاردانے جان کھالی۔ لکھنؤ چلو وہاں میرا سارا خاندان ڈاکٹر ہے نرسنگ ہوم کے لیے تمام سہولتیں مل جائیں گی۔ توبہ توبہ۔ مجھے سیدھے کلکتہ واپس جانا چاہیئے تھا۔ مزے سے رپن اسٹریٹ میں پریکٹس کرتی۔ افوہ ذرا اس طرف جا کے دیکھو۔ ہزاروں ہزار RIOT POLICE "

" ایسا تو اور کہیں نہیں ہوتا بیٹا لکھنؤ کے بھی چند محلّے ہیں جن کے لیڈروں کے لیے حضور یہ روزی روٹی کا سوال ہے۔ جب بڑی بہیا آتی ہے — "

" سنہ اٹھارہ حُسین بخش ؟ "

" ایسا ہی رہا ہوگا بھیّا۔ ہمارے ابّا بتلاتے تھے۔ حضور پہلے شیعہ اور سنّت جماعت دونوں کے تعزیے ایک ساتھ تال کٹورہ پھول کٹورہ کی کربلاؤں میں

جاتے تھے۔ بڑی بھیا سے دس بارہ سال پہلے کی بات ہے ایک بڑے مولانا صاحب نے فرمایا سُنّی ڈھول تاشے بجاتے ہماری ان کربلاؤں میں آتے ہیں ہماری سوگواری میں خلل پڑتا ہے۔"

"مگر وہ تو ماتمی نقّارے ہوتے ہیں حسین بخش۔"

"جی بھیا۔ تو سنّت جماعت اپنے تعزیے ماہ نگر لے جانے لگے۔ پھر وہ چاریاری جھنڈا کھڑا ہوا۔"

"سرانیٹنی مکڈونل کی دو کرامات۔ پہلی اردو ھندی۔ دوسری شیعہ سُنّی۔"

"ایک اور فرنگی SCAPEGOAT۔"

"ڈوکومنٹری پروف موجود ہے بھئی۔ دستاویزی شہادتیں۔ ثبوت۔ لفٹننٹ گورنر یو۔ پی سرانیٹنی مکڈونل کے رول کے —— باقی یہ کہ فرنگی کی حرکتیں تو اودھ میں ڈیڑھ سو سال سے اسی قسم کی تھیں۔ یہ سلطنت ہی انھوں نے کھڑی کی تھی مغل دلی کے مقابلے پر۔ اودھ پر اصل حکومت اِس ریذیڈنسی سے کی جارہی تھی۔"

"یہ معاملہ تو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ ایرانی پارٹی۔ تورانی پارٹی۔ جانسٹھ کس نے تاراج کیا؟"

"مسز بیگ۔ کمپنی نے لکھنؤ میں شیعہ مہرہ آگے بڑھایا۔ دلی کے سُنّی مہرے کے مقابل میں اور اسے مذہبی غلو اور عیاشی ——"

"سُنّی مہرہ پہلے ہی پٹ چکا تھا۔ اس غریب کو شہ دینے کی اب کیا ضرورت تھی اور بے چارے مغل بادشاہ تو بالکل اینٹی شیعہ نہیں تھے سوائے ——"

"اگر موصوف نے دکن کی سلطنتوں کو ملیا میٹ نہ کیا ہوتا تو نہ شِواجی مرہٹہ زور پکڑتے نہ مغل ایمپائر ٹوٹتی۔"

"تم کیا ہو ——؟"

"کیا مطلب کیا ہوں۔ آدمی ہوں۔"

"نہیں اسوقت کچھ شیعہ سے لگ رہے ہو۔"

"سبحان اللہ! کل تم مجھے وہابی سمجھی تھیں! انسان کے خیالات پر سائن بورڈ لگائے جاؤ۔ شاباش۔ بندہ حنفی المذہب تورانی پیدا ہو لیکن معاملات کو انکے صحیح تناظر میں دیکھنے کا قائل۔"

"اضافیت کی ایک حقیقت یہ ہے کہ فریم اف ریفرنس مختلف ہوتے ہیں۔"

"بنیادی حقایق ہر پرسپکٹیو سے یکساں ہیں۔ انفرادی مشاہدہ اپنے پرسپکٹیو کے لحاظ سے مختلف۔ لیکن SPACE-TIME CONTINUUM ——"

"یہ تم لوگ کس گڑبڑ جھالے میں لگ گئے۔"

"سنو عنبرین! کمپنی کی حکومت نے انگریز لڑکیاں شاہی حرم میں پہنچائیں اور کنگ نصیر الدین حیدر کو محرم کی مصروفیات میں لگا دیا۔"

"اینگلو امریکن پارٹی سے تو بٹیا تم بھی فیضیاب ہوئے۔ بلکہ بوسٹن ٹی پارٹی سے —! ورنہ کسی گلی محلے میں پڑے طبابت کر رہے ہوتے حکیم منن صاحب! لیکن لکھنؤ میں تم نے فرنچ پارٹی والے کے اسکول میں پڑھا اور اسکے بعد ——"

"میم میں نے ——"

"امی ژنرال کلاد مارتین کو بہت ایڈمایئر کرتی ہیں۔"

"فیسی نیٹنگ مین —— کیوں نہ کروں۔"

"میم وہ ایک سولجر اف فورچون تھا اور اس نے ہندوستان میں رہنے والی یورپین قوم کی تعلیم کے لیے دولت چھوڑی، جو اس نے اودھ میں بٹوری تھی ——"

"تمہارے فوجی سرداروں نے کتنے اسکول کالج قایم کیے؟ خواہ مخواہ کی قوم پرستی مت کرو۔"

دور سڑک پر نعروں کی آوازیں۔

"عنبر۔ یہ بلوائی نہیں معلوم ہوتے۔ ٹھیرو میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

"میم ــــــ ایک نیتا امریکہ کا دورہ کر کے لوٹے ہیں۔ جلوس ایرپورٹ سے آرہا ہے۔"
"یہ کون سی پارٹی ہے؟"
"پتہ نہیں لیکن پروسشن بہت لمبا ہے۔ کچھ امیر الامراء۔ چند چکلے دار۔ باقی سو لجز اف فورچون۔"
وہ بنچ پر بیٹھ گیا۔ "جی۔ تو جنرل کلاڈ مارٹین ــــــ"
"ہمارے لوریٹو ہاؤس میں ایک مرتبہ لیوں اور کیل کٹا لا مارٹینیر سے ــــــ"

اب جا کر انکے ولائیتی پن کی وجہ سمجھ میں آئی۔ "قطع کلام معاف مسز بیگ لیکن آپکے والد بیحد روشن خیال رہے ہونگے جو آپکو اُس زمانے میں انگلش اسکول ــــــ"
"بالکل ولائیتی ــــــ"
"آج تم مسلمان لوگ کا بڑا دن ہے؟ والے ٹا ئیپ؟"
"قطعی۔"
"واہ بیگم صاحب WOGS کا ہماری سوسائیٹی کو موڈرنائیز کرنے میں بڑا کونٹری بیوشن رہا اور میں سمجھتا ہوں سعادت علیخان نواب وزیر اودھ ہندوستان کے پہلے WOG تھے۔ ایک طرف بسنت کا میلہ شروع کرواتے ہیں دوسری طرف انگریزیت۔
"اور یہ ریذیڈنسی ہے۔ ماسک بال۔ گرینڈ ڈنر۔ یوبرزمیل جیسے بانکے وگ لگائے وہ سامنے والی سیڑھیاں اتر کر کوچ پہ سوار ہو رہے ہیں۔
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کوچ پہ نازکی جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن۔"

"بیٹا تمہیں میر انشا خوب یاد آئے۔"
"بیلی گارد کبھی انکی یاد نہ دلائے؟"

"معاف فرمائیے گا حضرت ـــــ" نزدیک کی بنچ سے آواز آئی " سید انشا کے اشعار اسطرح ہیں ؎

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کرسی ناز پہ جلوے کی دکھائے گا پھبن
نسترن بھی نئی صورت کے دکھائے گا رنگ
کوچ پہ ناز کی جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن
کس قیامت کا سبک سیر ہے اسکار اکب
حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن "

" بہت بہت شکریہ ۔ عنایت " منصور نے کہا ۔ بڑے میاں نے جھک کر تسلیم عرض کی ۔ منصور اٹھ کر ان کے پاس گیا ۔ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرکے اپنا تعارف کرایا ۔ " ناچیز کو مرزا منصور احمد کہتے ہیں ۔ جناب کی تعریف ؟"
" ننگ اسلاف کا نام پوچھ کر کیا کیجئے گا ۔ غریب خانہ وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہے ۔ واپس جا رہے تھے ۔ کرفیو پاس پاس نہ تھا ۔ دو گھڑی ستانے کے لئے ادھر آ نکلے ـــــ آپ صاحبان کی بصیرت افروز گفتگو کان میں پڑی ـــــ "
" یہ چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا ـــــ ! " عندلیب بیگم نے کہا ۔
" ماشا اللہ ـــــ ماشا اللہ ـــــ !! "
" تسلیم "
" نواب صاحب فی الحال تو بلبلیں نالہ زن ہیں " منصور انکے پاس جا بیٹھا ۔
" آج کی وجہ سمجھ میں نہ آئی ۔ نہ محرّم نہ شبیں نہ بارہ وفات "
" ہیہات " گمنام نواب نے آہ سرد کھینچی " ہاتف بگفت آہ شدہ لکھنؤ خراب ! جب ادبار آتا ہے عقلوں پہ پتھر پڑ جاتے ہیں ۔ وہ پتھر اہل اسلام ایکدوسرے کو مار رہے ہیں ۔ حاکم شام کے متعلق چار الفاظ پر مشتمل ایک فارسی فقرہ

پاٹے نالے پر ہمیشہ آفت ڈھاتا ہے۔ آج صبح کسی لڑکے نے وہ دہرایا۔"

"پریذیڈنٹ اسد کا پاٹے نالے سے کیا تعلق؟"

"بیگم صاحبہ نے بہت نوک کی لی! ماشاءاللہ !!" عندلیب بانو کے تجاہل عارفانہ پر موضوع تبدیل کیا۔ "جنرل کلاڈ مارٹن بہترین مرغ باز بھی تھے"۔ پان کی ڈبیا نکالی۔ بولے ——" یورپین سیاحوں کو لکھنؤ میں ماسکو اور ڈریسڈن کی جھلک نظر آئی۔"

درختوں کے سائے طویل ہوئے۔ اور سلسلہ گفتگو ——

آغا میر۔ انشا — مصحفی — میر تقی میر۔ کرنل ولیم گارڈنر ——

منصور نے کہا — "انگریز کے اقبال کی ایسی ہی ہے رسّی —— آویختہ ہے اسمیں فرانسیس کی ٹوپی —— اُردو داں فرنگی اسکی سوسائٹی میں شامل تھے اور وہ بیدھڑک لکھتا تھا۔ یاں وقت سلام اترے ہے ابلیس کی ٹوپی"

"البیلے لوگ تھے"۔

"کون —؟ انگریز۔؟"

"نہیں صاحب۔ لاحول ولاقوۃ۔ سنا ہے ایک زمانے میں پیرس یوروپ کا لکھنؤ کہلاتا تھا"

"ماشاءاللہ۔ یہ ہے اصل وطن پرستی۔ سُن لیجئے۔ مسز بیگ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ لکھنؤ پر فرنچ کلچر کی چھاپ بھی مقرّر پڑی۔ فرانسیس کی ٹوپی!۔ فرانسیس کی ٹوپی ——" منصور نے مفکّرانہ انداز میں ناک کھجائی۔ "اس پر یاد آیا کیسے پتے کی بات ——"

"جوگندر نے کل کہی ——" مسز بیگ بولیں۔

"اودھ اور لکھنؤ میں اتنی جاذبیت تھی کہ فرات ہے تو وہ گومتی۔ سین اور ٹیمز ہیں تو وہ گومتی۔ فرانسیسی، انگریز۔ یورشین۔ سب نوابوں کے تمدّن میں مدغم۔ بقول ننھے سرشار نے ڈینیوب کے اُس پار بھی لکھنؤ آباد کر دیا۔ دیکھنے میں چھوٹی سی ندی۔ مگر نیل کا حکم رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر مسز بیگ دو پلے اور نپولین کی بوٹ شیپ والی ہیٹ کو گومتی میں غوطہ دیا گیا تو وہ بصورت کشتی نما لکھنوی ٹوپی نمودار ہوئی۔"

"سبحان اللہ۔"

"ہمارے ایک دوست کا ارشاد ہے کہ اہلِ فرانس جب نگارستان لکھنؤ میں محافلِ رقص وسرود بپا کرتے تھے تو خوشدلی سے اپنے ٹوپ مجرے والیوں کے سروں پہ رکھدیتے کبھی ٹھمکی لگا کر وہ بانکی ٹوپیاں ارباب نشاط خود اوڑھ لیتیں۔ اسطرح وہ کارچوب سے سج کر انکی پوشاک میں شامل ہوگئیں۔ ایک بار موسیو کے باغ میں ـــ"

عندلیب بانو نے تعجّب اور دلچسپی کے ساتھ بات کاٹی "تمہارا مطلب ہے منصور ـــ کہ ناچ گرلز کی کشتی نما ٹوپیاں فرنچ اوریجن کی تھیں؟"

"وی۔ مادام۔ اور آپکو وہ واقعہ تو معلوم ہوگا کسطرح نواب حامد علیخان والئ رامپور کی مخملیں مرصّع ٹوپی کی وضع پر مہاتما گاندھی نے کھادی کیپ رائج کی!"

"خیاط فلک اس کی ٹوپی اسکے سر پہ رکھتا جاتا ہے"۔ نواب نے ایک اور آہ بھری۔

دو پوربین ہپّی سبزے پر اکڑوں بیٹھ کر چلم پینے لگے۔

عندلیب بیگ ہنس پڑیں "ہمارے بانکے دنیا کے اوّلیں ہپّی تھے۔ چرسیے۔ مدکیے۔ ہمارے بادشاہ اور شہزادے ـــ"

"آپ بھی آخری شاہانِ مغلیہ اور تاجدارانِ اودھ کے متعلق وہی رویّہ رکھتی ہیں۔ عیاش۔ نکمّے۔ واہیات۔ زحمت نہ ہو تو ذری انکی مجبوریوں پر غور کیجئے۔ نواب صاحب نے فرمایا" غلام قادر روہیلہ ـــ"

"مسلمانوں نے مسلمانوں پر کم ظلم ڈھائے ہیں؟" مسز بیگ بخشنے والی نہیں۔

"روہیلوں سے جان بچا کر شہزادہ سلیمان شکوہ مملکت اودھ میں پناہ لیتے ہیں۔ شاہ عالم کے فرزند۔ اکبر شاہ ثانی کے برادر خورد۔ نواب آصف الدولہ چھ ہزار ماہانہ انکا وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں وہ اپنا دربار آراستہ ـــ"

"مچا رکھی ہے سلاطینوں نے وہ توبہ دھاڑ ـــ کوئی تو گھر سے نکل آتے ہیں گریباں پھاڑ!" عندلیب بیگ نے سودا کی گواہی دی اور سلیمان شکوہ کے متعلق نواب صاحب کو یاد دلایا

"لکھنؤ میں اپنی عیّاشیوں کی بدولت رستوگیوں کے مقروض۔"

بیگم صاحبہ ایک دیمک لگے شاہ بلوط کو متواتر ٹھونگیں مارتی کھٹ کھٹ بڑھیا سی لگیں۔ منصور نے گمنام بزرگ کو معذرت طلب نگاہ سے دیکھا۔

"سلیمان شکوہ سے قبل انکے بڑے بھائی تشریف لائے تھے دلّی سے۔ مرزا جہاندار۔ نواب وزیر نے انکو بڑی تکریم سے مارٹن کوٹھی میں ٹھہرایا انھوں نے فوراً لہو لعب فسق و فجور۔ چھوٹتے ہی وزیرِ ہند میزبان کی منظورِ نظر رقاصہ بھگیہ پر عاشق۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز سے درخواست کی ہمیں بھگیہ دلوا دیجئے۔ اس فرمائش پر ہیسٹنگز بھی جھینپ گیا۔"

"جی بیگم صاحبہ۔ انہیں نواب جہان آبادی خطاب عنایت کیا شاہزادے نے۔ نادرِ گرامی شہزادہ عالی قدر—" گمنام بزرگ نے ملائمت سے کہا۔ "وہ سب بنارس میں۔"

"پھر سلیمان شکوہ کے بھتیجے دلّی سے وارد ہوتے۔ مرزا جہانگیر۔ وہ شراب میں دُھت لکھنؤ کی گلیوں میں گھوڑا دوڑاتے ہُلّڑ مچاتے چوک کے کوٹھے سے دمڑی کو بھگالے گئے۔ یہ تو آپ لوگوں کی حالت تھی۔ انگریز آپ کا ملک آپ سے کیوں نہ چھینتا۔"

"جن دنوں طوائف الملوکی چالو تھی طوائفوں سے ملوک کا بہت رابطہ رہا! یار عنبر۔" منصور نے آہستہ سے کہا۔ "تمہاری والدہ لوریٹو ہاؤس کے بعد کیل کٹا یونیورسٹی؟"

"شوق بہت تھا مگر شادی ہوگئی۔ یونیورسٹی نہ جاسکیں۔ البتہ ایک فیملی فرینڈ تھے — کاسیتھ۔ میٹا برج سے تعلق رکھتے تھے۔ انکی لائبریری گویا اِنکے قبضے میں تھی تم خواتین کلکتہ کی علمی روایات سے واقف نہیں ہوا ورنہ تم بھی عجیب سے ڈاکٹر ہو۔ اسکیمو یوئیٹری—"

"ہا۔ ہا۔ ویری فنی! ڈاکٹر اور سائنٹسٹ ہی تو اکثر لٹریچر اور آرٹ میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ تم کو اپنے مکان کی آرٹسٹک سیٹنگ کی اتنی فکر کیوں ہے؟"

خاموشی۔ نکہت بادِ بہاری کی اٹکھیلیاں۔ آم کے پیڑ میں چھُپی ایک شاما گانے لگی گویا ابتک اپنے کیوُ کی منتظر تھی۔ بوندا باندی شروع ہوئی۔ اچانک بجلی کڑکی۔

"یہ نہیں برق اک فرنگی ہے ۔" منصور سیّد انشا پر لوٹا

"رعد و باراں خشونِ جنگی ہے"۔ پرنس نے پھر بات شروع کی۔

"سلطنت خدا داد میسور کو انہوں نے خاک کیا۔ دلّی پہ وہ چھاتے۔ مرہٹوں کا انہوں نے زور گھٹایا۔ سعادت علیخاں کی خوش انتظامی۔ اودھ پر سُن برسا دیا۔ ع چاندنی چاندی کا پتّر دھوپ سونے کا ورق! —— مگر جان کمپنی کی لُوٹ۔"

چھینٹا پڑا۔ پھر دھوپ نکل آئی چڑیاں بارش میں خوب نہالیں۔ اب چونچیں پروں سے صاف کرنے میں مصروف تھیں۔

"سنا ہے نواب وزیر جان بیلی کو مستقل DEFY کیا کیے۔ لائق اور بیخوف حکمراں تھے —— انکا جامہ وار کا فرغل ایک میوزیم میں اسطرح رکھا ہے جیسے انہوں نے ابھی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا ہو۔ ہم نے سوچا ہم اسے پہن لیں تو کیسے لگیں۔"

"آپ وہ فرغل نہیں پہن سکتے مرزا صاحب آپ بالکل مختلف انسان ہیں۔ وقت کے ارتقاء کا تقاضا ہے۔ آپکی شخصیت مختلف ہو چکی ہے۔"

"سنا ہے بیلی نے زہر دلوایا۔"

"انکی علالت کی اطلاع بیلی گارد بھیجی گئی فوراً ڈاکٹر ولسن کو لیکر پہنچا۔"

ریذیڈنسی کے موڈل میں ایک DR. JUDAH'S HOUSE موجود ہے۔ وہ کون سے ریذیڈنٹ کے فزیشین تھے۔

میں عنبرین JUDAS TREE کے نیچے بیٹھی ہوں۔ جوڈز نے رومن سپاہیوں سے کہا تھا۔ میں یسوع کو چُوموں گا۔ تم سمجھ

ڈِرپ۔ ڈِرپ۔ ڈِرپ۔ بیلی گارد کے درختوں سے خُون

"کہتے ہیں ڈاکٹر نے انجکشن کے بہانے گلے میں فیتہ باندھ کر سعادت علیخان وزیر ہند کا کام تمام کیا۔"

تختۂ گل پہ تتلیاں اڑتی پھر رہی ہیں - درختوں پر بیٹھی چڑیاں چہچہائیں۔

"جان بیلی عمدہ بیگم پہ جان دیتا تھا۔"
"کون عمدہ بیگم؟ جن کی بہن فیروز پور جھرکہ کے نواب شمس الدین ــ"
"محترمہ آپ نے ہمیں اچنبھے میں ڈال دیا۔ جا نسٹھ سے چلیں تو فیروز پور جھرکہ جا پہنچیں! یہ وہ عمدہ بیگم نہیں ایک حسین لاوارث لڑکی تھی کلاڈ مارٹن والی سیلی بیگم نے پالا تھا - جوان مری۔ جا نہار کا جان بیلی نے مقبرہ بنوایا۔ روز بالیں پہ جاتا۔ اسکے بالوں کی ایک لٹ لاکٹ میں لٹکائے رکھتا۔ نو سال لکھنؤ میں رہا۔ کمپنی کی جڑیں مضبوط کر گیا۔ نایاب مخطوطات سمیٹ چلتا بنا۔"
"انڈیا آفس میں محفوظ ہوگا وہ ذخیرہ۔ یہاں برباد ہو جاتا۔"
"جی ــ بیگم صاحبہ" وہ کانپ سے گئے۔ بسنتی رومال سے چہرہ پونچھا۔ جیب سے گول گھڑی نکالی۔
"آپ ہی آپ ہے پکار اٹھتا دل بھی جیسے گھڑی فرنگی ہے" منصور نے آہستہ سے کہا۔

"بیگم صاحبہ۔ نہ شیعہ مہرہ تھا نہ سنّی۔ جلی رسّی کا بل نکالنا مقصد تھا۔ اکبر شاہ ثانی نے لارڈ ما یرا گورنر جنرل کو دربار میں کھڑا رکھا - دلّی کا ریذیڈنٹ بادشاہ کا موروثی لقب چھیننے کو کہہ رہا تھا۔ لاٹ صاحب نے اسی پر اکتفا کیا کہ ان غریب کو نیچا دکھانے کیلئے مرحوم وزیر ہند سعادت علیخان کے بیٹے نواب وزیر غازی الدین حیدر کو لندن سے ہز میجسٹی دی کنگ کا خطاب دلوا دیا۔
"لکھنؤ کے ریذیڈنٹ نے سلیمان شکوہ کو حکم دیا اب آپ فرمانروائے اودھ سے نذر قبول کرنے کے بجائے ان سے برابری سے ملا کیجئے۔ اب وہ آپ کے خاندان کے وزیر نہیں خود بادشاہ ہیں۔"
"جب ہم یہاں پڑھتے تھے" منصور نے کہا۔" شاہ نجف کے چراغاں کی تمام

ساتویں آٹھویں محرّم کو برقی قمقموں سے امام باڑے کے پھاٹک پر ایک نام انگریزی حروف میں جگمگاتا تھا HIS MAJESTY KING GHAZIUDDIN HYDER
اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کی خوشی اور THRILL محسوس ہوتی تھی حالانکہ نہ وہ بادشاہ باقی تھے۔ نہ انکی سلطنت۔"

"نواب آصف الدولہ کی مانند نصیر الدین حیدر سائنس اور انجینئرنگ کے شائق تھے لکھنؤ کا ہر فرد و بشر مسلح تھا۔ بچّے تیر و کمان سے کھیلتے تھے۔ آپکے نزدیک اہلِ لکھنؤ نازک مزاج مرغ باز ہی رہے۔

"آخری مغل بادشاہ اور اودھ کے فرمانروا اگر عیش پرست ظالم اور لغو تھے، محمد شاہ محض رنگیلے، واجد علیشاہ صرف ناچا گایا کرتے تھے، تو سارے ھندوستان میں دولت اور تجارت کی یہ فراوانی کیسے رہی؟ سلطان عالم جب مٹیا برج لے جائے گئے ہیں اودھ کا بچّہ بچّہ اشکبار تھا۔ بھلا کوئی جابر اور نکمّے بادشاہوں کے لیے روتا ہے؟

"وزیر اعظم حکیم مہدی منتظم الدولہ نے انگریزی اسکول کھولا۔ یتیم خانہ کا چھاپہ خانہ۔ ہسپتال۔ آپکے خیال میں بس یہاں یا امراؤ جان آدا تھیں یا بٹیریں اور کبوتر۔

"ایسی ثقہ، پر تکلّف آزاد خیال سوسائٹی کا دراصل آج آپ تصوّر نہیں کر سکتیں۔ آپکے پیمانے مختلف ہیں۔ فری مسن لاج کے ممبر انگریزی داں مسلمان امراء آئے دن ولایت جاتے تھے۔"

"نواب صاحب۔ چند امیروں وزیروں کے لندن ہو آنے سے پوری سوسائٹی موڈرن نہیں ہو جاتی۔ ورنہ سرسیّد کو اتنی جدوجہد نہ کرنی پڑتی۔"

"غدر نے اس پورے معاشرے کو نیست و نابود کر دیا۔ اب ہم آپکو کیا بتلائیں۔"

"معاف فرمائیے گا نواب صاحب۔ یہ بادشاہ اور شہزادے لوگ آپکے اجداد تھے لیکن میری والدہ مرحومہ کی ایک جِن بی سے ملاقات تھی۔ جنھوں نے اپنے منہ بولے ماموں سے

آپکے اس عصر طلائی، اس جہانِ افسانہا کی تفصیلات سنی تھیں۔ وہ بزرگ اس زمانے کے لکھنؤ میں موجود تھے۔"

"گویا آپکا راوی بھی ضعیف نہیں!"

نواب مخدرہ علیا دختر میجر والٹرز۔ ملکہ نصیر الدین حیدر۔ مادام پمپادور ثانی۔ سوتیلے پپا انکے علی بخش میراثی راستے سے لڑکیاں اٹھواتے تھے۔ رہیں قمر چہر گارڈنر ——"

ایسے دل گرفتہ، تباہ حال نرم مزاج سے اجنبی کے لیے اس قسم کا جارحانہ انداز بھی ویمنز لب میں شامل ہے؟ اس بوڑھے آدمی کا سارا سرمایہ اسکا ماضی ہے۔ جسکا منافع بقدر اشک بلبل اسے ہر ماہ ملتا ہوگا۔ بطور وثیقہ۔ نہ یہ کرکٹ ہے نہ کروکٹ بلکہ بیلٹ کے نیچے گھونسہ۔ اسکا پاسٹ اسے مطمئن، متفخر کرتا ہے اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ اسے بھی رن ڈاؤن کیے جا رہی ہیں "آج کے مورلز مختلف ہیں؟" منصور نے پوچھا۔

ہوا چلی —— دور دور تک پھولوں کی کیاریوں میں رنگ برنگی لہریں پیدا ہوئیں۔ نواب صاحب نے ارشاد کیا ؎

" اپنے گیلاس شگوفے بھی کرینگے حاضر
آکے جب غنچۂ گل کھولینگے بوتل کے دہن
پتّے بل بل کے بجاوینگے فرنگی طنبور
خود نسیم سحر آویگی بجانے ارگن
حوض صندوق فرنگی سے مشابہ ہونگے
اسمیں ہووینگے پریزاد بھی سب عکس فگن "

منصور آگے کو جھکا بغور سن رہا تھا —— نواب صاحب۔ ارے بھئی عنبر یہ صندوقِ فرنگی انشا اللہ خاں نے CAMERA OBSCURA کو تو نہیں کہا تھا

جو دانیانِ فرنگ ایجاد کر چکے تھے؟ کیا عجب ہے جان بیلی صاحب نے ایک عدد ولایت سے منگوالیا ہو۔"

" وہ کون چیز جناب والا ؟"

" کیمرے کی ابتدائی صورت قبلہ۔ یہ شعر یقیناً اسی کے متعلق ہے ——
صندوقِ فرنگی اور اسمیں پریزادِ عکس فگن۔

"— برسٹل میں اسکا موڈل دیکھا ہے۔ سمجھیئے کمرے کے برابر گنبد۔ اسکی چوٹی پر ایک عدد گھومنے والا لینس۔ نیچے فرش پر دودھیا شیشے تماشائیوں کے لیے چوگرد گیلری۔ تیز دھوپ میں گنبد کے باہر کا منظر اور چلتے پھرتے لوگ اس LENSE پر REFLECT ہوتے تھے۔ اور اس کا الٹا عکس دودھیا شیشے پر۔"

" لیجیے صاحب میر انشاء کا شعر آئینہ ہو گیا ! کیا عجب ہے کہ بیلی گارد میں محصور انگریزوں نے اسی شے کے ذریعے ہماری افواج کی نقل و حرکت کا معائنہ۔ واللہ مرزا صاحب۔ آپ نے کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ اب جا کے صندوق فرنگی کے جوہر کھلے۔"

"جوہری محلّے[۱] میں نواب صاحب —" منصور نے چرخی فساد زدہ شہر کے رخ گھمائی۔
"میر انشا توجھوائی ٹولے کے نزدیک رہتے تھے۔" نواب نے پھر کنّی کاٹی۔
حسین بخش بولے —" میر انشا جس مکان میں آکر رہے تھے وہ ماشاء اللہ سے اب بھی آباد ہے۔ مرزا محمد عسکری کا دولت خانہ۔"

" مرزا عسکری غالب والے مرزا خانی کوتوالِ دِلّی کے پوتے — دادا انکے مرزا انور بیگ فوج آصفی میں افسر تھے۔ انھوں نے یہ مکان ایک ٹیلے پر بنوایا تھا۔ جھوائی ٹولے کے نزدیک۔ میر انشاء دِلّی سے آن کر وہیں ٹھہرے تھے اور مصحفی۔"

" وہ کمرہ بھی میر انشا والا اسیطرح موجود ہے نواب صاحب۔ ہمارے بڑے

---

[۱] لکھنؤ کے شیعہ علماء کا محلّہ۔

ابّا مرزا محمد عسکری صاحب کے ہاں کھانا پکاتے تھے۔"

" وہ بھی پیسے کی دال پر اشرفی کا بگھار لگاتے ہونگے!"

"نواب صاحب- ایک مرتبہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا- اس کی ایک ضیافت میں سروجنی نایڈو بھی شریک تھیں- کہنے لگیں اور کچھ ہو نہ ہو آپ لوگ کپڑے بہت اچھے پہنتے ہیں کھانا بہت اچھا کھاتے ہیں- سر رضا علی نے بلبل ہند کو جواب دیا— سلطنت تو کھو چکے- کھانا بھی اچھا نہ کھائیں؟!!"

" اسی چٹور پن کی وجہ سے تو سلطنت کھوئی۔" مسز بیگ نے لقمہ دیا۔

"شاہی سا لکھنؤ وینس جیسا شہر تھا- دریا کے دونوں طرف محلات اور حویلیاں- — حویلی علی نقی خاں بہادر کی!" منصور نے ندی کی سمت اشارہ کیا۔

"جی ہاں بیلی گارد کے پھاٹک سے ریذیڈنٹ اپنے بجرے پر سوار ہوتا اور برطانوی جھنڈا لہراتا یہیں سے بنگال نکل جاتا- گومتی جونپور کے آگے گنگا سے ملتی ہے- وہاں سے سیدھا کلکتے— اس کنارے پر قلعہ مچھی بھون سے لیکر لامارٹینیر کالج تک محلات اور باغات کا سلسلہ— گومتی کے دونوں کناروں پر آبادی کیوجہ سے ریذیڈنسی کا دفاع مشکل تھا- اس وجہ سے ایام غدر میں انگریزوں نے یہ ساری عمارتیں کھدوا ڈالیں- صرف چھوٹی بڑی چھتر منزل باقی بچیں- حضرت محل والدہ برجیس قدر نے تعلقہ داروں سے کمک حاصل کی- مردانہ لباس پہن کر خود ہاتھی پر بیٹھیں انکی زنانہ فوج بھی بے جگری سے لڑی—..

" سن لیجئے مسز بیگ- زنانہ فوج!" منصور نے کہا- " ملکہ حضرت محل کی۔

" جون سنہ ستاون کے پہلے ہفتے میں ہماری فوجوں نے اودھ پر برطانوی حکومت کا خاتمہ کر دیا - ریذیڈنسی کے اندر پانچ ہزار فرنگی مع جن بچہ پناہ گزیں تھا- ۳۰ جون کے روز بیگم حضرت محل کے لشکر نے بیلی گارد کا محاصرہ کر لیا۔ ستاسی ۸۷ دن تک انگریزوں کو یہاں محصور رکھا ہم لوگوں نے! مسلسل گولہ باری۔

درو دیوار چھلنی ہو گئے - برجیس قدر کو لال بارہ دری میں تخت پر بیٹھایا گیا۔ ان کے ایک پوتے کلکتہ میں رہتے ہیں۔ ایک لندن۔ ایک علیگڈھ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ ایک پڑپوتی کلکتے میں ایڈوکیٹ ہیں"

" نواب صاحب ابھی تو بیلی گارد کا محاصرہ ہی جاری ہے۔" منصور نے ادب سے یاد دلایا۔

" جی ـــــ تو خورشید منزل کے سامنے تین جنرل آکر ملے اور اپنی فوجیں لیکر برطانوی ریذیڈنسی کی طرف بڑھے۔

" یہی بسنت رت - نوروز - ۲۱ مارچ ۱۸۵۸ء ـــــ جب سر کولن کیمپ بل کا فاتح لشکر لکھنؤ میں داخل ہوا۔ اکبری دروازے سے لیکر دلکشا تک یہ بیمثال شہر کھدوا ڈالا۔ اسکے ملبے سے سڑکیں بنوائیں۔ قیصر باغ میں ایک بارہ دری تھی جس میں واجد علیشاہ جشن مہتاب کے لئے رونق افروز ہوتے تھے۔ اسے کھدوا ڈالا کیونکہ اختر پیا کے کلکتے سدھارنے کے بعد عوام وہاں جمع ہو کر زار و قطار روتے تھے۔

" حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی نے فرمایا تھا ـــــ شب کو سوئینگے ایک سلطنت میں صبح کو اٹھیں گے دوسری سلطنت میں ـــــ روشنی اور پانی سب انکے قبضے میں ہوگا۔ جب چاہیں گے بند کر دینگے۔ لوگ قبروں پر جاکر کہیں گے تم لوگ امن میں ہو کاش ہم بھی تم میں ہوتے ـــــ قہر کا سرپوش ھندوستان پر ڈھانپ دیا گیا ہے لوگ مثل پھلیندوں کے بکھرینگے۔

" حضرت مولانا نے غدر کے بعد کبھی برف نہیں کھایا۔ انگریزی کاغذ پر نہیں لکھا۔ ولائتی شکر استعمال نہیں کی۔ انگریزی بوٹ نہیں پہنے۔ ریل پر سفر نہیں کیا۔ درست اس سے فرق اس وقت کچھ نہیں پڑا۔ گاندھی جی نے مدتوں بعد یہی سب کیا۔ فرق پڑا۔ غدر کے بعد حضرت مولانا نے کسی مشرک کی صورت نہیں دیکھی انھوں نے ایک اور پیش گوئی کی تھی کہ انگریز بکریوں کی طرح بھاگیں گے۔ بھاگے۔ یہ بھی

فرمایا تھا ٹوپی والے جائیں گے۔ پگڑی والے آئیں گے ــــ آئے ــــ اور اب۔ نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو ــ "

" نواب صاحب ۔ کوئی تاریخی شہر ہمیشہ یکساں حالت میں نہیں رہا۔ جمنا کنارے اسوقت آٹھویں دلّی آباد ہے ــ یا شاید نویں ــــ غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دوچار بیٹھے ہیں۔"

پولس فایَر نگ کی مدّھم آواز پر نواب صاحب کراہے" میرے بزرگ تو محرّم کی ایک "مشترکہ تہذیب بنا گئے تھے۔" انہوں نے بسنتی رومال سے آنکھیں خشک کیں۔

" دونوں کی تہذیب۔" والدہ عنبریں نے زیرِ لب کہا اور آہستہ سے منصور کو مخاطب کیا۔" تمہیں مُوک ٹرٹل یاد ہے ؟ جو مستقل آہیں بھرتا اپنی المناک کہانی سناتا اشک بہاتا رہتا تھا۔ میں بھی بہت جلد ایلس کی طرح آنسوؤں کی جھیل میں پیرنے لگوں گی یہ گراف دیکھو۔ عہدِ آصفی میں تیرہ دن۔ پھر چالیس۔ زارینہ کیتھرین ثانی کے دور میں سوا دو مہینے ــ "

" زارینہ کون ــ ؟ یہاں مسز بیگ آپ نے ہمیں بھی گڑبڑا دیا۔"

" بادشاہ بیگم۔ ملکہ غازی الدین حیدر۔"

" اوہ ۔ وہ زارینہ۔ لیکن دولت اور فرصت کی فراوانی بوسٹوی کل ٹورے کو جنم دیتی ہے لکھنؤ کی اسنوبال کرتی رسوم اعزاداری کتنی غریب پرور ثابت ہوئیں اور انکا فال آؤٹ آجتک سارے ہندوستان کی شیعہ سُنّی اعزاداری میں نظر آتا ہے صاحب۔ آج کا ذاکر اور سوز خواں ہر سال لکھنؤ جونپور اور امروہے سے نکلتا ہے تو سیدھا لندن اور ٹورانٹو۔ میر انیسؔ آج موجود ہوتے تو جب قطع کی مسافت شب رائل البرٹ ہال میں پڑھا کرتے۔"

جھکّی ۔ لفّاظ۔ مسز بیگ نے سوچا۔ بزرگ نہایت ممنویت کے ساتھ منصور کی تقریر سماعت فرما رہے تھے۔

" اعلیٰ شاعری ، خطابت ، فلسفہ کائنات ، آداب مجلس ، فنکاری ، صناعی ،

پیجنٹری ، یونیم دی تھنگ ـــــ پیور میوزک ، پیور ڈرامہ ۔ مرثیوں کی گریگورین گونج ۔
ویسٹرن اسٹیج پر گریک کورس آپکو متاثر کرتا ہے ۔ یہاں گھر گھر بال بکھرائے سیاہ پوش
نوحہ خواں عورتیں ہاتھ میں شمعیں اٹھائے ننگے پاؤں چلتی کسی یونانی ٹریجڈی کی نقل نہیں
کر رہیں لیکن پام سنڈے ، ایش ونیس ڈے کورپس کرسٹی کے جلوس درست محرم غلط ۔
" اور بطور کلائمکس نالہ و بکا ۔ چھریاں ۔ زنجیریں ـــــ HIGH CULTURE ـــــ
بولشوئی کل ٹورے ۔"

" جی ہاں ۔ یہ البتہ ۔" وہ منہ لٹکا کر خاموش ہو گیا ۔ پھر ایک پوائنٹ یاد آیا " پچھلے سال
میں نے یہاں ایک کائستھ ہائی کورٹ جج کو نہایت نفیس مجلس پڑھتے سنا ۔ اور
کشن لال فیض آبادی کی انجمن نوحہ خوانی ـــــ اعلیٰ تہذیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ
دوسرے بھی اسے اختیار کر لیتے ہیں ۔ جیسے ہم نے برطانوی تمدن اپنایا ۔ شاہی کی کلچر کا
فال آؤٹ ـــــ اودھ کے اکثر دیہات میں سنی عوام جم کے ماتم کرتے ہیں ـــــ "
" جی ہاں بھیا ۔ اور ہمارے کے ہاں دیہات میں ہندو عورتیں دھتے روتی ہیں ۔
اور انڈیا بھر میں سنت جماعت کے تعزیے سب سے زیادہ شاندار سبلیں ۔ پٹے بازی ۔
خلیفاؤں کے اکھاڑے ۔"

روربنک روڈ پر پھر نعرے " خلیفہ منصور دیکھ کے آؤ کس پہلوان کا اکھاڑہ نکل رہا ہے ۔"

" تمہیں یقین نہیں آئے گا عنبر ۔ یہ خلیفہ کیوبا سے واپس آئے ہیں ۔ مشیران باتدبیر
منتظم الدولہ نے دونوں کے ماہی مراتب کا بندوبست ایک ہی دن کیا ۔ فرگٹ اِٹ ۔
حسین بخش ۔ کوئی دوہا سناتیے ۔"
" آج کتلوا کی رات ـــــ اماں کھلا دیں دودھ بتاسہ ـــــ پیاسے گئے حسن
حسین ـــــ رن ما چلی تر ور یارے ـــــ "
" تضادات کی سرزمین ۔ ہندوستان ۔" عنبریں نے سوچتے ہوئے کہا ۔

"ہم لوگ ——" منصور نے جواب دیا" عرصہ دراز مغرب میں گذار کر لوٹے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ تضادات عجیب لگتے ہیں۔ اجمیر شریف میں بے شمار تلک دھاری آر۔ ایس۔ ایس ورکر جلوس سے نکل درگاہ پر حاضری دیتا ہے"

"CRAZY COUNTRY یار"

"ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد لکھنؤ میں تعمیر کی جا رہی ہے۔ شہر کے تاریخی مقابر اور مساجد کھنڈر ہو گئیں۔ امام باڑوں کے لیے شاہان اودھ کے ٹرسٹ موجود ہیں لیکن حسین آباد اور شاہ نجف والوں نے انکے بیرونی حصّے سستے کرائے اور پگڑی پر اٹھا دیے۔ اب وہ باہر سے سلم معلوم ہوتے ہیں سارے ہندوستان کے اوقاف کی مالیت ایک کھرب ہے۔ کروڑوں سالانہ کی آمدنی متولّی خورد برد ——"

"اوقاف کے معاملات ——" نواب صاحب نے مسکرا کر کہا" ہمیشہ سے دگرگوں چلے آتے ہیں۔ حافظ جی فرما گئے ہیں۔ ع کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است!"

"حافظ جی کا الیکشن جب ہوا ہم بجنور میں تھے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ہاں ملازم تھے۔ انکا انتقال ہوا تو حافظ محمد ابراہیم صاحب کے پاس چلے گئے۔ کانگریس سرکار بنی۔ ہم بٹلر پیلیس لکھنؤ۔ حافظ جی کے ایک چپڑاسی سے ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا"

"واہ میاں حسین بخش۔ خوب فلور کروس کی۔ دل بدلی!"

"بھیّا۔ یہ بڑے آدمیوں کے معاملے ہیں۔ ہم غریبوں کو جہاں دو روٹی کا سہارا — بٹلر پیلیس کے مطبخ میں ہمارے خالو موجود تھے ہمیں مشالچیوں میں بھرتی کروا دیا"

"بٹلر پیلیس!" پیر مرد نے ایک اور آہ بھری۔

"ابّا جب ٹھاکر نواب علی کے ہاں کام کرتے تھے لاٹ صاحب بٹلر کو بہت دفعے چاء پانی مہاراجہ علی محمد خاں کے وہ پکّے دوست تھے تبھی اپنے پیلس کا نام ——"

"جان کمپنی کے انگریز نوابوں کی ٹریڈیشن کا اس صدی میں آخری نواب ——" گمنام بزرگ نے گویا فٹ نوٹ لگایا۔

"بجنور میں کانگریس کی چہل پہل دیکھی یہاں ٹیلر پیلیس لیگ کا ہیڈ کوارٹر بن گیا"
"جہاں امرائے شرقیہ اور عمائدین بنگالہ نے" نواب نے کہنا شروع کیا۔
"ایک بار پھر۔ سنہ سینتیس میں۔"
"بس ذرا جغرافیہ میں گڑبڑ ہو گئی" کھٹ کھٹ بڑھیا نے ٹھونگ ماری۔
"دیوبندی مولانا لوگ کانگریس کے ساتھ تھے" حسین بخش بولا کیے۔
"دیوبندی اور فرنگی محلی" منصور نے جذبے سے کہا "ایک بار مولانا آزاد نے گاندھی جی سے فرمایا تھا یہ بوریہ نشین علماء جو آپکے سامنے بیٹھے ہیں مسلمانوں میں ان سے زیادہ انقلابی جماعت اور کوئی نہیں"
گولیاں چلنے کی آواز آئی۔
"امیر احمد خان راجہ محمود آباد اور راجہ صاحب سلیم پور لیگ کے دونوں بڑے لیڈر شیعہ مگر لیگ میں حضور شیعہ سنّی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سب مسلمان ایک۔ پھر ایک سنّی لیڈر کانگریس سے لیگ میں آ گئے ایک شیعہ لیڈر لیگ سے کانگریس میں گئے ــــ"
ایک غبی سی دھوبن چڑیا گھاس پر بیٹھی بڑے غور سے یہ گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"جب وہ ادھر سے ادھر آتے اور یہ ادھر سے ادھر گئے ـ ـ"
"اوفوہ میرا تو سر گھوم رہا ہے" عنبریں نے فریاد کی۔
"سیر بڈ ون لو ــ ٹن ــــ" ریڈیو کی اشتہاری آواز میں منصور۔
"تو بیٹا ان دونوں کا آپس میں جھگڑا تھا۔ پھر حضور وہ تبرا مدح صحابہ ایجی ٹیشن۔ فرنگی محل کے مولانا لوگ اس ٹنٹے میں نہ ادھر نہ ادھر۔ شیعہ سنّی دونوں انکی عزت ــــ"

"فرنگی محل کا مدرسہ نظامیہ ــــ" نواب صاحب نے پھر بات کی۔
"شہنشاہ اورنگ زیب نے قائم کیا تھا۔ اور اسمیں ہمارے زمانے تک شیعہ سنّی طالبعلم ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ریاستوں کے خاتمے تک شیعہ

والیانِ ریاست اسے گرانٹ دیا کئے۔صاحب! انیٹی مک ڈونل اور جیمز سٹن کیا کرپاتے اگر خود ملّت بیضا عقل سے معرّیٰ نہ ہوتی۔"

"عنبرین بیگم لکھنؤ کا شاہی کا کیریکٹر تو مسلمانوں نے آزادی کے بعد یہ شیعہ سنّی جھگڑے بڑھا کر خود اپنے ہاتھوں سے ختم کیا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کا آلہ کار بن کر" منصور نے افسردگی سے کہا۔ — "۸ ربیع الاوّل کا چُپ تعزیہ — کیا منفرد لرزہ خیز نظارہ تھا۔ سیاہ رنگ کا پہاڑ کا پہاڑ — آہستہ آہستہ متحرک۔ ہزاروں کا جلوس۔ سب خاموش ہندو مسلمان سب ننگے پاؤں۔ اور وہ حضرت قاسم کی شادی CELEBRATE کرنے کے لیے تینوں شاہی امام باڑوں کا زبردست چراغاں — آصفی۔ شاہ نجف۔ حسین آباد۔ ذوالجناح اور اور مہندی اور سونے چاندی کی ضریحوں اور عَلموں کے پروسشن — شاہی کے زمانے کی وردیاں پہنے پنجشاخے اٹھائے امام باڑوں کے اہلکار۔

"ہر تعزیے پر لکھنؤ کے کاریگروں کی صنّاعی ختم تھی منیہار چوڑیوں سے تعزیہ بناتے تھے۔ مالی گھاس سے۔ دُھنیے روئی سے۔ کمہار مٹّی سے۔ مصری سے بنتے تھے تعزیے۔ آزادی کے برسوں بعد تک یہ نظارے موجو میں فیض آباد روڈ پر مقیم تھا۔ عاشور کی صبح سویرے سے ماہ نگر کی سُنّی کربلا کی طرف تعزیے جانا شروع ہوتے — ایک سے ایک شاندار۔ غریبوں کے معمولی۔ سب ماتمی تاشے کے ساتھ۔ تانتا بندھا رہتا — "اجاڑ سہ پہر تک تعزیوں کی تعداد میں کمی آجاتی۔
"مجھے یاد ہے آخری سال جب میں نے اپنے برآمدے سے وہ منظر دیکھا ویران راستے پر چھوٹا سا سبز رنگ کا نہایت HUMBLE کاغذی تعزیہ۔
" — چند غریب مسکین تہمد پوش سُنّی اسے لیے جارہے تھے۔ اس شام میں

امریکہ روانہ ہو رہا تھا۔ وہ منظر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ خزاں آلود پتّوں پر سے گزرتا سنسان سڑک پر آخری تعزیہ"۔ منصور نے ایک گہری سانس لی اور سگریٹ جلایا۔
"تجارت اور گلف کی کمائی سے مسلمان ذرا پنپے تھے کہ پھر گھمسان کا رن پڑا"
"نیا سرمایہ دار سُنّی ہے۔ کاریگر مفلس شیعہ" مسز بیگ نے یاد دلایا۔
"ابھی بہار میں بریلوی اور دیوبندی مولوی ایکدوسرے سے دھواں دھار مناظرے کرتے دکھلائی دیے۔ ویسٹ میں کیا ہائی چرچ اور لو چرچ والے لڑتے ہیں؟"
"ہم لوگ بباربرین ہیں۔ اس سب کونٹیننٹ کے تمام باشندے۔ انگریز ہمیں ٹھیک پہچانا تھا"
"کم آون امّی"
"یہ میں نہیں کہہ رہی، سرسیّد لکھ گئے ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں"
دھوبن چڑیا قریب آ بیٹھی۔ "سُنّیوں کے تعزیے۔ درگاہوں اور ضریحوں کے سامنے ہندوؤں کی بھیڑ۔ ماشاءاللہ۔ لیکن اس خوشگوار رقّت خیز منظر نامے کے باوجود کسی ایک قسم کا فرقہ وارانہ فساد آج تک رکا ہے؟" مسز بیگ نے سر ہلایا۔

"ہر قسم کے پائیدار بلوے مناسب اجرت پر ہمارے ہاں سے کروائیے۔ ٹُن"

ایک مجہول سے پرند نے غنڈوں جیسی سیٹی بجائی۔
ایک سیانا کوّا آم کی ٹہنی جھُلا کر حاضرین کو صریحاً ڈِنک کرتا ہوا اڑ گیا۔
"یہ لوگ کتنے مزے سے بسنت منا رہے ہیں۔ سینٹ سالم علی کی اُمّت"
عنادلِ چمن کا یہ لب حوض چہچہا رہا تھا۔ آسمان کی سمت سر نہوڑا کر ایک ایک گھونٹ پر گویا اپنے خالق کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ ننھی چڑیاں پانی پینے میں جٹ گئیں۔

"اے دشمنوں۔ میں نبیؐ نوں فرزند چھوں۔ میں تین دن نو پیاسو چھوں۔ تمارا سے

ایک پانی نو گھونٹ مانگوں چھوں۔ اے حسینؑ عجب آپ اوپر ہمارا پستاؤ چھے۔
اے سیّد الشہدا۔

" زینبؑ پکاری رہیا چھے اے مارا ماں جایا بھائی انے ضحیٰ نا سورج انے پونم
نا چاند۔۔۔ سکینہ کہے چھے۔۔۔ اے باواجی صاحب کہاں چھو۔۔۔ اے باواجی صاحب۔
اوٹھو۔ اوٹھو۔ مارا اوپر ظلم تھتی رہیو چھے۔ اے حسینؑ۔ عجب۔۔۔
" اے حسینؑ۔ کربلا سے شام نی طرف گرم ریت نی زمین پر چلی رہیا چھے۔ نہ پاؤں
میں جوتی چھے نا موزہ چھے۔۔۔ اے حسین عجب آپ اوپر ہمارا پستاؤ چھے۔۔۔ اے
سیّد الشہدا۔"

عنبریں زار زار رو رہی تھی۔

مَیں جُوڈ ز کے درخت تلے بیٹھی ہوں۔ اور میرے پیروں کے نیچے دشتِ ماریہ کی
تپتی ریت ہے۔ موسم بہار کی ایک سہ پہر ندی کنارے سبزے پر موجود ایلس کے مانند
میں کہاں کہاں۔۔۔ ہر گلستان صحرا۔ ہر دریا نہر علقمہ۔۔۔

منصور بڑبڑا گیا "سوری عنبریں ایک گجراتی۔۔۔"

عندلیب بیگ دھیمی آواز میں بیٹی کو ڈانٹ رہی تھیں "اپنی نانی کی روتی نواسی۔
انکی رقیق القلبی کا انجام بھول گئیں؟ یہ آدمی شواؤف ہے۔ بھگیتا۔ ہمیشہ انٹلکچوئیل
نوٹنکی کرتا ہے" منصور کو پکارا "سنی۔ مجھے یقین ہے تم کو بنگالی ٹامل ملیلام نوحے مرثیے
بھی آتے ہونگے۔ مگر اب اینسیئن گورنج سے نکلا جائے۔ کافی ہوئی۔ چلو ذرا ریذیڈنسی کی
شیکسپیرین ایکوسٹن آئیں۔"

سیڑھیاں چڑھ کر وہ ایک وسیع ایوان میں داخل ہوئے۔ نواب صاحب نے

اوپر آسمان کو دیکھا۔ "چھتیں گر جاتی ہیں تاکہ فلک حقہ باز صاف نظر آئے۔"
میوزیم میں سیلانی بکھرے ہوئے تھے۔ ایک گائیڈ آگے بڑھا۔
"ارے یہ ہمیں کیا بتلائیں گے" نواب صاحب نے اداسی سے کہا۔ منصور نے دس کا نوٹ نکال کر اسکے حوالے کیا۔ وہ سلام کر کے پیچھے ہٹا۔ مسز بیگ نے طویل سنہری زنجیر میں آویزاں چشمہ لگایا۔ دیواروں پر سجی تصاویر دیکھنے میں منہمک ہوئیں۔

"لکھنؤ ریذیڈنسی کا محاصرہ — "عنبریں نے کہا" انگلینڈ نے اسکی ایک عظیم الشان قومی لیجنڈ تیار کر ڈالی۔ ناول۔ تصویریں۔ نظمیں۔ برطانوی بہادری کی حکایات۔ اور ہم نے کیا بنایا ہے؟ ۱۹۵۷ء میں گومتی کے کنارے ایک عدد بھدا مینار۔ حضرت محل کے جانبازوں کی یاد میں بھونڈا بھدا۔ اب ہم محض KITSCH کے استاد ہیں"
کالج کے چند لڑکے منہ کھولے عنبر کے گرد جمع ہو گئے۔ انکی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہہ رہی ہے۔
"میڈم کیچ کیا — ؟" سیاہ فریم اور موٹے شیشوں کی عینک لگائے ایک پڑھاکو لڑکے نے گردن بڑھا کر سوال کیا۔
چوڑی دار پاجامہ اور لمبی قمیصیں پہنے کالج کی لڑکیاں ہنستی ہوئی اندر آئیں۔
"قبلہ آپ نے غور فرمایا۔ مغلیہ تہذیب کس طرح اپنے آپ کو RE-ASSERT کر رہی ہے؟ سارے ہندوستان کی لڑکیاں ہماری نانیوں دادیوں والا لباس پہن رہی ہیں۔ انکے ماں باپ ہوٹلوں میں "مغلئی" کھانا کھاتے ہیں اور غزلوں پر سر دھنتے ہیں" وہ ٹہلتے ہوئے دوسرے ایوان میں گئے۔
"بس اتنی سی بات پہ خوش ہوتے رہو کہ مجلیں جاٹو ہو گئیں۔"
"عنبر بیچ میں مت بولا کرو —— نواب صاحب ہندوستان کے اثر سے

مغرب کے نوجوانوں کے ہاں ایک ملبوساتی انقلاب آچکا ہے خود ہندوستان میں اس ریولیوشن کا ذمے دار کون ہے؟ — مسلم سوشل پکچرز!"

"مسلم سوشل پکچرز۔" عندلیب بیگ نے استہزا سے دہرایا" مجرا۔ مشاعرہ۔ قوالی اور برقعہ۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں۔ ہندی مسلمانوں کا امیج کیا ہے؟ ایک قدامت پرست بیک ورڈ جاہل کمیونٹی۔"

"جب تک مُلاّ حاوی ہے یہ IMAGE برقرار رہے گا۔"

"بس۔ مولوی کے پیچھے پڑے رہو۔ ازرائیل میں ایک کٹر مذہبی یورپین یہودیوں کا فرقہ ہے۔ جب ازرائیلی فوج کی لڑکیاں مارچ پاسٹ کرتی نکلتی ہیں وہ انکی طرف سے پیٹھ موڑ کر دیوار کی طرف منہ کر لیتے ہیں۔ کیونکہ انکے نزدیک عورتوں کی یہ آزادی شریعت موسوئی کے خلاف ہے۔"

"درست۔ لیکن میرے مُلاّ تعداد میں کچھ زیادہ ہیں۔ میں خود مُلاّ کا بیٹا ہوں۔ مان لو میری بات — عنبرین بیگم!"

"بات میرانشار سے شروع ہوئی تھی!"، نواب صاحب محظوظ ہوتے۔

"لیکن قبلہ ملاحظہ فرمائیے۔ مغلیہ کلچر اپنے آپ کو نہایت نامعلوم طور پر۔"

"مرزا صاحب۔ خاقانی ہند خواجہ عزیز لکھنوی کی پڑپوتی عزیز بانو وفا کا ایک شعر ملاحظہ کیجئے ؎ میں جمال فطرتِ حسن ہوں مری ہر ادا ہے حسین تر"

"میں جمالِ فطرت حسن ہوں مری ہر ادا ہے حسین تر۔" منصور نے دہرایا۔

"جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں جو اٹھوں تو ابر بہار ہوں!"

"سبحان اللہ — سبحان اللہ — اُف غضب کر دیا۔" ڈاکٹر نے بیساختہ داد دی۔

"واہ جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں —"

"ستیہ جیت رے"، عنبر نے کہا" عزیز بانو کی خاندانی محلسرا کی تصویریں لے گئے — پکچر کے سیٹ بنانے — چیزوں کی فطری اور تاریخی سیٹنگ —"

وہ چاروں چند شکستہ ستونوں پر بیٹھ گئے۔ حسین بخش ہاتھ باندھے ایک طرف کو کھڑے رہے۔ غالباً انکے پرکھ اسیطرح دست بستہ اسی جگہ کرنل سلیمن کی ڈنر ٹیبل پر ڈیوٹی بجا لاتے ہوں گے۔

" بیگم صاحب ہم لپک کے بھیاؔ کے لیے بالائی خرید لاویں چوک سے ـــــ کرفیو تو فرنگی محل کی طرف لگا ہے۔"

" بیٹھئے آرام سے۔ خود بالائی کو جی چاہ رہا ہے۔ بھیاؔ کے لیے لے آویں"۔

" فرنگی محل میں کرفیو لگا ہے۔ پہلے میلہ لگتا تھا۔ مرزا صاحب آپکو وہ ـــــ آتش کا شعر یاد ہے ؎ ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام
چھانے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام

" نواب صاحب معاف کیجئے گا۔ یہ ہمارے معاشرے کا زوال تھا ـــــ علمائے دین کا گڑھ اور انکے مکانوں سے سٹے ہوئے بالاخانے ـ"

" بھیاؔ فرنگی محل میں حیدر جان جو تھیں جنکا امام باڑہ ہے۔ ایک بار ایک راجہ نے ان سے کہا بی صاحب ایسا ملہار گائیے کہ بارش ہونے لگے۔ انہیں نے دعا مانگی جناب امیرؑ سے۔ مولا میری لاج رکھ لیجئے ـــــ پھر جو میگھ ملہار گایا انہیں نے۔ جھما جھم پانی گرنے لگا۔ راجہ نے انعام میں ہاتھی دیا۔ وہ انکی ڈیوڑھی پر بندھا رہتا تھا اور حضور جلی خورشید کو تو ہم نے بھی دیکھا ہے۔"

" جلی خورشید!" مسز بیگ نے دہرایا۔

" بیگم صاحب آپ نے بھی انکا نام سنا ہے؟ کلکتے تک انکی شہرت تھی۔ بہترین شہسوار تھیں۔ اور کنکوے بازی کی استاد۔ ہر سال میڈیکل کالج کے پیچھے جناتوں کی مسجد کے پاس جو میدان تھا ـــــ گومتی کنارے۔ وہاں کے اوپر

پتنگ بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ شہر کے عالی مقام لوگ ان سے کنکوے لڑانا فخر سمجھتے تھے۔"

"ہمارے ایک دوست ہیں۔ پروفیسر سریو استوا۔ ہندوستان کے نامی گرامی ریاضی دان۔ سرائے معالی خاں کے باشندے۔"

"وہ بھی پتنگ باز ہیں؟" عنبریں نے پوچھا۔

"تھے لڑکپن میں۔ جلی خورشید کے کمالات کنکوے بازی کا بڑے ذوق وشوق سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔"

"جی بھیا۔ جلی خورشید کے کنکوّے میں سَو کا نوٹ باندھ دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں سَو کا نوٹ! وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ میدان میں آتی تھیں۔ سب سے آخر میں۔ کوئی ان سے جیت نہ پاتا تھا۔ لوگ پتنگیں لُوٹنے بارہ بنکی تک دوڑے جاتے تھے۔"

"۳۶ء کے الیکشن کی سرگرمیوں میں لکھنؤ کی نامی طوائفوں نے حصّہ لیا تھا۔ جلوسوں میں وہ شامل ہوئیں۔ قومی نظمیں وہ پڑھتیں۔

"ارباب نشاط میں فیلو ٹریولرز تک تو پیدا کیں اس شہر نے۔ سُنا ہے آزادی سے سات آٹھ سال پہلے ایک کامریڈ حسنی کہلاتی تھیں۔ بہت سے نامور کامریڈ لوگ انکے ہاں جمع ہو کر اپنے جلسے کرتے تھے۔ اچھا۔ تو جلی خورشید۔"

"ارے بھئی منصور۔ اب بخشو جلی خورشید کو" عندلیب بیگ جھنجھلا ئیں

وہ گمنام بزرگ کی طرف متوجہ ہوا۔ جو پھر تسبیح پھیرنے لگے تھے۔

انھوں نے جیب سے بادام اور پستے نکال کر دوستوں کو پیش کیے۔

چھڑی کے سہارے ذرا دقّت سے کھڑے ہوئے۔

"اب اجازت۔ جان صاحب کا اللہ بیلی!" کھنڈر کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

عنبر نے کہا" آپکو کار پہ پہنچا دیتی ہوں۔ لیکن کرفیو۔۔۔ جب تک ہمارے ہاں تشریف لے چلیے"۔

" عنایت۔ ابھی ہم ذرا ٹہلتے ہوئے بریگیڈیر نقوی کے ہاں جاویں گے۔"

" ہم لوگ بھی قریب ہی رہتے ہیں۔ تشریف لائیے۔ خاصہ تناول کیجئے"۔
مسز بیگ یکلخت بیحد ثقہ ہو گئیں۔ منصور انکی شخصیّت کی رنگا رنگی کو دھیان سے نوٹس کر رہا تھا۔

" عنایت۔ پھر کبھی حاضر ہونگے"۔

جُھک کر تسلیمات بجا لانے کے بعد سر نیہوڑائے بیلی گارد کے پھاٹک کی سمت روانہ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ چلتے۔ کمر خمیدہ۔ بے نام و نشاں۔

بارش کی ایک بوند ٹپ سے منصور کے ہاتھ پر گری۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا" مجھے لگتا ہے ان بے چارے کو حال ہی میں کہیں دیکھا ہے۔ کہاں یاد نہیں جھلک سی دیکھی تھی۔"

" کلِنک میں آئے ہوں گے "

" بٹیا ہم تو نواب صاحب کو پہچان گئے تھے۔ ظاہر نہیں کیا۔ انکے باپ نے جلی خورشید کی خاطر اپنی بہت بڑی جائیداد بیچ ڈالی تھی"۔

" جائیداد کیا چیز ہے حسن بخش ہم وہ لوگ ہیں جو موسم بہار کو بھی رہن رکھ دیتے ہیں ۔۔۔۔ زمینداری ابولیشن میں باغات بچ گئے۔ چنانچہ آجکل آم کی فصلیں دو دو تین تین سال کے لیے گروی رکھ کر ایک بار پھر گلچھرّے یا مقدمے۔ مسلمان زمینداروں کی خاندانی مقدمہ بازیوں نے پنڈت موتی لعل نہرو اور سر تیج بہادر کو مالا مال کر دیا تھا"۔

" بھیّا۔ کانپور میں آغا میر کے پڑپوتوں نے سَو سَو کے نوٹ جلا کر ایک لاٹ صاحب کے لیے چائے بنائی تھی۔ اب یہ عرب اربوں روپیہ عیّاشی میں پھونک رہے ہیں"۔

عنبر بی ہمارے اندر یہ بنیادی کمزوریاں کس وجہ سے ہیں؟"

"کمزوریاں؟ یا اللہ پہ توکل ـــ"

"اوہو! مگر آپ تو بارے عاقبت اندیشی کے ابھی سے چنوں پر اکتفا کر رہی ہیں!"

"چنے؟ نہیں تو ۔!"

"ابھی میں نے چند چنے چُنے ۔ ارے یہاں تو نواب صاحب بیٹھے ہوئے تھے ۔ مائی گوڈ. دوسروں کو پیش کرنے کے لیے بادام ایک جیب میں ۔ پیٹ بھرنے کی خاطر چنے دوسری میں ۔ اسمیں سوراخ رہا ہوگا۔"

"دوپہر جب یہ باغ میں آن کر بیٹھے اس بنچ پر جیب سے مٹھی میں کچھ نکالا اور رومال کی اوٹ میں نوش کرنے لگے ۔ میں ایم سمجھی ۔ مجھے دیکھتے پا کر فوراً تسبیح سنبھالی۔"

ڈاکٹر نے ایک چنا اٹھا کر ہتھیلی پر رکھا اور اسے بغور دیکھا ۔ گویا کائنات صغریٰ ۔ شام ہو رہی تھی ۔ بیلی گارد سنسان ہو چلی ۔

"محمد علی شاہ بادشاہ" منصور کی آواز گونجی "نصیر الدین حیدر ۔ غازی الدین حیدر ۔ سعادت علیخان ۔ اس نے چاروں طرف دیکھا "کچھ نہیں ۔!! میں ذرا ابدیت کے ساؤنڈ افیکٹ سننا چاہتا تھا" وہ ہنس پڑا ۔

تین چار ابابیلیں پر پھڑپھڑاتی دریا کی طرف اڑ گئیں ۔

"فرض کر دیہ ایک رومن تھیٹر ہے ۔ چہروں پر ماسک لگانے چند سیاہ پوش طویل القامت بادشاہ یہاں سے اٹھ کر گئے ہیں ـــــ للہ آؤ ہم زمین پر بیٹھ کر شاہوں کی موت اور معزولی کی غمگین کہانیاں سنائیں ـــ

FOR GOD'S SAKE, LET US SIT UPON THE GROUND AND TELL SAD STORIES OF THE DEATH OF KINGS, HOW SOME HAVE BEEN DEPOSED; SOME SLAIN IN

WAR SOME POISONED BY THEIR WIVES:
SOME SLEEPING KILLED; ALL
MURDER'D : FOR WITHIN THE
HOLLOW CROWN THAT ROUNDS THE
MORTAL TEMPLES OF A KING KEEPS
DEATH HIS COURT AND THERE THE
ANTIC SITS SCOFFING HIS STATE AND
GRINNING AT HIS POMP ALLOWING
HIM A BREATH, A LITTLE SCENE TO
MONARCHISE, BE FEARED AND
KILLED WITH LOOKS, INFUSING HIM
WITH SELF AND VAIN CONCEIT, AS IF
THIS FLESH WHICH WALLS ABOUT
OUR LIFE, WERE BRASS IMPREGNABLE,
AND HUMOR'D THUS COMES AT THE
LAST AND WITH A LITTLE PIN BORES
THROUGH HIS CASTLE WALL, AND
FAREWELL, KING!

"میم ـــــ بوسٹن کے ایک پرائیویٹ کلکشن میں ایک تصویر دیکھی تھی کمپنی اسٹائل۔
لکھنوی مصوّر نے اون دی اسپوٹ بنائی تھی۔ کہ جانِ عالم تخت پر راجہ اندر کی کوسیٹوم۔
سامنے مصنوعی پَر لگائے ایکٹرسیں۔ مقام: بارہ دری قیصر باغ۔ ہینڈسم آدمی تھے۔
ایک اور تصویر اسی آرٹسٹ کی ـــــ جانِ عالم انگریزی شاہی پوشاک"

پہنے گھوڑے پہ سوار قلعہ مچھی بھون کے سامنے اپنی فوج کا معائینہ کر رہے ہیں۔"

"کومک اوپیرا کا سین۔"

"گرینڈ اوپیرا ___ فلک شگاف ٹریجڈی سے گونجتا ___"

"بھیّا ___ جان عالم کے بول سماعت فرمائیے۔ کبھی بولے چھن۔ کبھی بولے چھن۔ کبھی بولے چھن ترے گھونگرو۔ ہے یہ شوم پن کہ صدا کی بِن نہیں کرتے پُن تیر ے گھونگرو۔!"

کھنڈر خاموش رہا۔

"چنانچہ یہ چنا۔ جوان بادشاہوں نے جان کمپنی کو ادھار دیا۔" اس پار خانہ بدوشوں کی خیمہ گاہ میں لالٹینیں ٹمٹمانے لگیں۔ منصور نے اسطرف دیکھا۔ "گو وہ تھے لکھّی بنجارے اور کھیپ بھی انکی بھاری تھی ___"

"انشاءؔ اور شیکسپیر کے علاوہ مجھے یقین ہے تمہیں سارا نظیرؔ بھی ازبر ہوگا پر اب گھر ___"

"بیگماتؔ اودھ کا خزانہ اور شاہانِ اودھ نے جو کروڑوں روپیہ کمپنی کو اسکی جنگوں کی خاطر قرض دیا ___"

"کمپنی اپنے مہربانوں کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ مگر وہ منڈوہ کب کا لُوٹ چکا۔ چلو اٹھو۔"

"اودھ لونؔ۔ جو وہ لکھوا گئے اپنی اولاد در لواحقین کی آئیندہ پیڑھیوں کے لیے بطور وثیقہ ابدیؔ۔ اب تلک کہیں ہزاروں کہیں بوجہ افزائش نسل بقدر اشکِ ___ لیکن چونکہ معاملہ وراثت کا ہے مسٹر بیگ ___"

"وراثت کا معاملہ میں خوب جانتی ہوں۔ زیادہ بور مت کرو۔"

"___ کمپنیؔ وایٹ ہال ساؤتھ بلاک نئی دہلی۔ قرضدار اور قرضخواہ دونوں سلامت۔ لہٰذا قرضخواہ اپنے بوسیدہ دوشالے اوڑھ کر ہر ماہ وثیقہ آفس ___ سلطان عالم کی پولیٹکل پنشن البتہ محض انکے پڑپوتوں تک جاری رہے گی۔" اس نے ساکت گومتی پر نگاہ دوڑائی۔ "جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا۔ میاں حسینی۔ اخترؔ پیا کا کوئی ___"

"گیا دل بھی چِھن جونہی بولے چھُن ___ یہ لگی لگن کوئی ڈالے گن تو میں مانوں گن۔"

"نہیں کچھ اور ___"

"برائے سیر مجھ سا رند میخانے میں گر آئے۔ گرے ساغر۔ لنڈھے شیشہ۔ ہنسے ساقی۔ بہے دریا۔ ہمارے ابا مرحوم کے لڑکپن تک شاہی کی رعیت زندہ تھی۔ جو سلطان عالم کی یاد میں گاؤں گاؤں رہس اور اندر سبھا کرتی روتی پھرتی تھی۔" بوڑھے خانساماں کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملائیں۔

انہوں نے بھی ماسک لگا رکھا ہے۔ کومک اوپیرا — نہیں — گرینڈ اوپیرا کے آخری مُغنّی۔ نجانے یہ کون ہیں۔ اور گمنام نواب۔ اور منصور کا شغری۔ میں عنبرین اس اندھیرے میں موجود سارے وجود سے خوفزدہ ہوں۔ جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا۔ نانی اماں، تاریخ کا قرضخواہ وثیقہ دار۔ حسینی دی کک۔ سب ٹکسالی۔ گمشدہ سکّوں کی طرح تاریکی میں چمکتے۔ اس عجیب گردی میں انگنت اور رنگین تصویریں مٹ گئیں۔ جھومر ٹیکے لگا۔ ئے امّی حضور، ابا حضور، ہائے اللہ کہتی ایکٹرسیں، مضحکہ خیز "نواب"، "ایفیوتی ملازم"، فلم اور ٹیلی ویژن کے اسٹاک کردار ٹکنولوجی کی بدولت باقی رہیں گے۔ مستقبل کو دیے ہوئے ادھ لوّن کی جعلی نقلیں۔

"بھیّا شہری زمینیں سونے کے بھاؤ بک رہی ہیں۔ بہت سے وثیقہ داروں کی حالت بھی سُدھر گئی۔"

"بیشک۔ اس روز ایک اغنٰ صاحب کو دیکھنے گیا۔ کرٹرہ ابو تراب۔ محلسرا انکی آدھی گر چکی۔ اس سے ملحق اپنے نئے ایرکنڈیشنڈ مکان میں صاحب فراش مولانا ترابی کے کیسیٹ سماعت فرما رہے تھے۔ باہر نکلا تو پرانے مکان کی شکستہ چھت میں جڑے مٹکے نظر آئے۔ صحیح و سالم۔ اگلے وقتوں کے ایرکنڈیشنر۔ کیا انجینرنگ تھی ڈیڑھ سو سال میں دوسری منزل کے بوجھ تلے نہ وہ چٹخے نہ ٹوٹے۔ آج تک موجود۔ گذشتہ سے پیوستہ۔"

"ارے مورے بھیا۔ وہ مٹکے لکھنؤ کے کمہاروں ہی نے گھڑے ہمیں تو اللہ میاں نے ڈھالا۔ ہم باقی نہ رہیں گے؟ آزادی کے بعد گئی یک بیک جو ہوا پلٹ۔ کتنے رئیسوں

نے اپنی املاک رستوگیوں کے ہاتھ بیچ دیں مگران بیچ دارکوچوں کے اندر تشریف لے جائیے اب بھی کتنے قدیم کُنبے اسطرح آباد ہیں۔ ماشاءاللہ۔ خدا کی شان ہے۔"

"بیحد خدا کی شان ہے واقعی۔ ان اوراقِ مصوّر گلیوں میں اُبلتی خلقت۔ بھینسوں کے طویلے۔ اوپن ایئر بم پولس، اس پر یاد آیا عنبر کہ تمہیں اس لفظ کی وجہ تسمیہ معلوم ہے؟ ٹامیوں نے ——"

"افوہ بھئی۔ اب اس مضمون پر ریسرچ مت شروع کرو۔"

وہ دونوں ہنستے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگے۔

"بیگم صاحب۔ بھیّا کی بات پر ہمیں ٹھاکر صاحب دھان پور کا دھیان آگیا۔ وہ مرحوم اللہ جنّت نصیب کرے جہاں کوئی انوکھا لفظ سُنا ہمیں پکارے حسینی ذرا لغت تولانا۔ آزادی ملتے ہی بٹلر پیلیس والے تو روانہ ہوئے۔ ہم ٹھاکر صاحب کے پاس جاپلنگ روڈ آگئے۔ انکے اکلوتے بھتیجے دلّن میاں انکے وارث تھے۔ بلا کے ذہین۔ اور شریر۔ اپنے تایا کی طرح کتابیں پڑھنے کے وہ بھی شوقین۔ مگر مجال ہے جو انورسٹی کے امتحان کی تیاری کبھی کی ہو، اور غضب کے کھلاڑی۔

"ایک باری بیگم صاحب۔ ایک مس صاحب امریکہ سے آئیں۔ انگریز چلے گئے تھے اور امریکن اور رُوسی آنے لگے تھے۔ تو یہ مس صاحب کارلٹن میں ٹھہریں۔ دلّن بھیّا انکے ساتھ ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ انکی ہوئی برتھ ڈے پارٹی۔ دلّن بھیّا کے ایک جوڑی دار تھے —— کنور سینڈی۔ ان سے ایک شرط بدی۔ پھر جاکر مِسیا سے بولے۔ ہم آپکے جنم دن پر آپکو سب سے بھاری تحفہ دینگے۔ ساون کا مہینہ۔ برستی بارش میں رات کو جاکر بنارسی باغ سے ایک ہاتھی چرایا۔"

"پورا ہاتھی چُرالیا۔ اور پکڑے نہ گئے؟"

"کالج کے زمانے کی شرارتیں بیگم صاحب۔ کنور صاحب سے شرط جیت لی۔ راتوں رات گج راج اپنے ٹھکانے پر واپس!"

"ادھر ٹھاکر صاحب مرے - ادھر زمینداری گئی - ایک لاکھ کی مالیت پر چھ ہزار معاوضہ - وہ بھی چالیس اور بیس سال کی قسطوں میں - بڑے بڑے لوگ راتوں رات کنگال ہو گئے - سچ مچ انکے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - گذر بسر کے لیے ساہوکاروں کے ہاتھ بانڈ پیکشت بیچ ڈالے - پھر زیور بکے - اسکے بعد گرتے مکانوں کی اینٹوں کڑیوں کی نوبت آئی - بہت جگہ ایسا ہوا بیگم صاحب جیسے چار بھائی تھے دو بھائی ملبے میں اپنے حصّے کی اینٹوں دروازوں کی قیمت پیشگی وصول کر کے ہجرت کر گئے -

"ہمارے دلّن بھیّا کے کوئی آگے نہ پیچھے - راجہ صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی کھُل کھیلے : بانڈ، کوٹھیاں موٹریں، کتابیں بیچ بیچ رنگ رلیاں منایا کیے - ہم سے کہتے حُسینی ذرا آج فلاں چیز کے دام لگا آنا - نخاسِ مصر کا بازار بنا ہوا تھا - کیسے کیسے نام و نشان وہاں کوڑیوں کے مول بکے - دلّن بھیّا کے پاس جب کچھ نہ بچا ایک روز لاہور سدھارے -

"انکے جانے کے بعد ہمیں اپنی مرضی کا کام نہ ملا - بی بی مر گئیں - ہم نے امین آباد میں سیخ کباب کا خونچہ لگا لیا - اسی فٹ پاتھ پر ایک پنجابی شرنارتھی پوری کچوری بیچتا تھا - اس نے اتنا بچایا کہ جا کے لندن میں ریسٹورانٹ کھول لیا - ہم نے جتنا کمایا اس سے دوگنا خرچہ۔ اکلوتی بیٹی تھی - چہیتی - آنکھ کا تارا - اسکا بیاہ کیا - وہ خاوند کے ساتھ ڈھاکہ چلی گئی - برابر خط لکھا کرتی - دسمبر سنہ ستّر میں اسکا آخری کارڈ آیا کہ ابا مارا ماری یہاں بھی شروع ہو گئی ہے پھر اسکا کچھ پتہ نہ چلا - ہم نے بہت بھاگ دوڑ کی - کس سے فریاد کریں ؟

"لڑکے آوارہ نکل گئے - بہت کوشش کی تھی کہ لکھ پڑھ جاویں - منصور بھیّا ٹھیک کہتے ہیں - امیر غریب سب - ہم لوگوں کی آنکھیں ہی نہیں کھُلتیں - ہمارا کیا حشر ہو گا ؟ ہم تو خیر لب گور بیٹھے ہیں مگر یہ آٹھ دس کروڑ ؟"

"وہ سب کے سب نہ آپکے دلّن بھیّا جیسے ہیں نہ آپکے لڑکوں جیسے - چلیے گھر چل کر ڈنر تیار کیجیے ۔"

"ہماری کیا اوقات بیگم صاحب کہ ان معاملوں میں زبان کھولیں مگر ووٹ بھی تو ہمیں سے مانگنے آتے ہیں - کسے ووٹ دیں ؟ ان لڑنے لڑوانے والوں کو ؟

——زمیندار بھی پرانے گئے۔ دوسرے بھیس میں نئے آگئے۔"

"آپکو ان پُرانوں سے اتنی اُلفت کیوں ہے؟"

"انکا نمک کھایا تھا۔"

"اتنی سمجھداری کی باتیں کرتے کرتے آپ پھر بیوقوفی پر اتر آتے ہیں۔ اصلیت میں انہوں نے آپکا نمک کھایا تھا۔"

"سُنیے بیگم صاحب۔ لال جھنڈے والوں نے بھی تو کچھ نہ کیا۔"

عنبر اور منصور گیٹ پر ملے۔ عندلیب بیگ سڑک پر جانے کے بجائے پھر باغ کی سمت مڑ گئیں۔ حسین بخش جو دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے تیز تیز چلتے آرہے تھے رو ربنک روڈ کی رونق اور ٹریفک پر نظر ڈال کر چند لمحوں کے سکوت کے بعد بولے ——"کتنا کچھ بگڑا۔ اور کتنا کچھ بنا۔ بیٹا۔ آزادی سے پہلے یہاں کچی سڑک تھی۔ ویران۔"

"بگڑا زیادہ۔ بنا کم۔ سب کچھ بگڑ کر از سرِ نو بننا چاہیئے۔"

"عنبر تم نکسلائیٹ تو نہیں؟ کلکیتہ۔"

"بنیاد پرست کہہ لو۔"

"آہا! تخریب یا تعاون کے بجائے تطہیر! مشکل یہ ہے کہ کچھ اور بنیاد پرست بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ مثلاً شاہ پیر محمد کا ٹیلہ دوبارہ لچھمن ٹیلہ کہلائے۔ شاہان اودھ ہم موڈرن لوگوں سے زیادہ ذہین تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب اور لکھن جی دونوں کو ایک چوکھٹے میں فٹ کر دیا تھا۔ انکی تخلیق کردہ رواداری اتنی دیرپا نکلی کہ لکھنؤ میں آج تک ہندو مسلم فساد نہیں ہوا۔ ایودھیا والی خانہ جنگی بھی واجد علی شاہ کو معزول کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے کروائی اور نہایت دوراندیشی سے مزید جھگڑے کا بیج بویا۔ مگر اس پلورلسٹ سوسائیٹی کے لیے بیشتر سلاطین ہند نے ہوشمندی ——"

حسین بخش کھنکارے ——

"——اور سیکولرزم کا ثبوت ——جی میاں حسینی آپ کچھ کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں بھیّا۔ ہم بیٹا کو بتلانے والے تھے ـــــ ادھر جنرل مارٹن کی ٹیڑھی کوٹھی تھی۔ جس میں شہزادہ سلیمان شکوہ دلّی سے آن کر رہے تھے۔ اسے گرا کر ٹرانسپورٹ آفس۔ آزادی کے بعد ـــ ست محلہ بھی گر گیا۔"

"ذرا قرطبہ کے کھنڈر جا کر دیکھو۔ حجازی امیروں کے کھنڈر جا کے دیکھو!"

"نواب کیواں جاہ والاقدر ـــ ٹھمریوں والے کدر پیا ان کا محل جو لکھی ـــ اب غلّے کا گودام۔ ارے اسے ہی محفوظ کر لیتے کہ جنگ میں بیگم حضرت محل کی آخری کمین گاہ تھی۔"

"اور ـــ"

"روشن الدولہ کی کچہری نیا کورٹ بنانے کی خاطر توڑ ڈالی مگر وہ اتنی مضبوط نکلی، کہ اسے گرانے ہی پر بہت لاگت آئی۔ بیگم کوٹھی بھی گئی۔ چھوٹی چھتر منزل ۱۸ء کی برسات میں گری۔ بارہ دری قیصر باغ۔ بادشاہ باغ۔ لال بارہ دری، سب برباد۔"

"اور ـــ"

"راجہ ٹکیت رائے کا محل۔ آصف الدولہ کے وزیر تھے۔"

"کلکتے میں گرینی مجھے جھجو جھونٹے دے کر کہتی تھیں بڑھیا اپنے برتن بھانڈے سمیٹ لے راجہ کا نیا محل بنتا ہے پرانا محل گرتا ہے اڑا اڑا دھم۔"

"نئے محل تو بیٹا بے حساب بن گئے۔ پر ہمیں بڑے بھاری جھونٹے لگے۔ سنا ہے افریقہ میں کوئی قبیلہ ہے جب آدمی بہت بوڑھا ہو جاتا ہے اسے مرنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ خود نہیں مارتے۔"

"کیمبرج یونیورسٹی کی روشوں میں جو بجری صدیوں پہلے جمائی گئی تھی اسے جواہرات کی سی احتیاط کے ساتھ صاف کیا جاتا ہے۔"

"بیٹا وکٹوریہ اسٹریٹ چوڑی کرنے کے لیے پرانا نخاس پھوڑ دیا سات آٹھ برس پہلے تک وہاں ہر اتوار کو لکھنؤ کی قدیمی شان دکھلائی دیتی تھی۔ دو پلّی ٹوپیاں انگرکھے چوڑے عرض کے پائجامے پہنے، پٹے رکھائے وضعدار شریف لوگ چڑیوں کی مارکیٹ میں آتے۔ طبیہ کالج کے گیٹ کے پاس پیپل کا درخت تھا۔ بوڑھے بہلیے، چڑیمار

اسلی عمر چار یا پانچ سو سال تبلاتے تھے۔ اسکی چھاؤں میں پرندوں کا بازار لگتا۔ کبابی، بریانی اور بالائی والے۔ کبوتر، بیٹریں۔ ہریل، اصیل مرغ، اور اسکا نام لیجیے بلبل۔ طوطے، مینائیں، لال، چرکوئے۔ کالے جادو کے لیے الّو تک تو وہاں مل جاتے تھے۔ بٹیر باز تیتے سیزن کے واسطے بیٹریں خرید تے۔ کبوترا ور مرغ باز ——"

"بقول امّی کبوترا ور بیٹریں ہی لکھنؤ کو چُگ گئیں۔ انہیں اس تذکرے سے چڑ ہے۔"

"عنبر تمہاری امّی چڑیوں سے چڑتی ہیں؟ وہ تو خود برڈ واچر —— اچھا۔ خیر دوسری بات یہ کہ ان کبوتر بازوں میں موڈرن تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل تھے۔ ہم خود اکثر انوار کے روز سیر کے لیے وہاں جاتے تھے، یہ تو اسپینش بُل فایٹ کی طرح اہل لکھنؤ کا گویا قومی مشغلہ تھا۔"

"پرانے نخّاس کے ساتھ وہ پیپل بھی گیا۔ اس درخت کے سوگ میں لوگوں کے گھروں میں دو دن تک چولہے نہیں سُلگے۔ کھانا نہیں پکا۔ وہ بازار سُونا ہو گیا۔"

"یعنی پارلیمنٹ آف برڈز لوٹ گئی۔ منطق اشرف المخلوقات! عنبر بیگم! یہ محض مرغبازی نہیں ایک پوری تہذیب کی موت تھی۔ افسوس ہم امریکہ میں تھے ورنہ بہت دُند مچاتے۔"

"پیپل کٹنے پر سر نہ کٹے؟"

"بیٹا لکھنؤ میں ہندو مسلم فساد سنہ سینتالیس تک۔ میں تو ہوا نہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ پیپل سرکار نے خود کاٹا تھا۔ اب سندھی پنجابی شرنارتھیوں کی اولاد کبوتر بیچتی ہے۔ انکا لب و لہجہ لکھنؤی ہو چکا ہے مگر وہ پرانا ماحول ختم ہو گیا۔ اور بھیا یہ ابھی سات آٹھ سال پہلے ہی کی تو بات ہے جب تاریخی عمارتیں گرائی جا رہی تھیں ہمارے شیعہ سُنّی اپنے بھیانک فسادوں میں جُٹے ہوئے تھے۔ مہینوں کرفیو لگا رہتا۔ شیعہ سُنّی اپنی پالیٹکس لڑاتے یا لکھنؤ بچانے کی کوشش۔ انہیں فرصت کہاں تھی؟"

"شیش محل والوں نے اس کا دروازہ سوختہ لکڑی کے بھاؤ بیچ دیا۔"

"عنبر تم نے تم تارے والی کوٹھی پہلے دیکھی تھی؟ سفید، جار جین محل۔ رصد گاہ

ب دیکھو تو تارے نظر آجائیں۔ کسی ایل۔ ایم۔ سی دیو کے بچے کا
ب دیواریں۔ برائٹ بلو دروازے کھڑکیاں۔ وہی ماسٹر پلان
ب ... رہ غ پیلی زنگی گئی۔ اس کا تو حلیہ بگڑ گیا۔ اب تمہارے گل خانے کا
نام تارے والی کوٹھی رکھے لیتے ہیں کسواسطے کہ تمہاری والدہ بھی اختر شناس ـــ امبر جی
ایک گل دسو۔ تمہاری بے بے جی ہمیشہ ایسی جلی کٹی باتیں کیوں کرتی ہیں؟"
"رنگ غلط تھے۔"
"سوری۔ کوئی ذاتی سوال میرا منشا نہ تھا۔ خیر۔ تو سا ؤ تھ میں میناکشی اما ٹمپل کا
کو پورم بھی نیلا پوت دیا گیا۔ اجنتا کی بلیک پرنسس مدھم پڑ چکی ہے۔ فریسکوز کے نیچے پکنک
منانے والے انگیٹھیاں سلگا کر کھانا پکاتے رہے ہیں۔"
"کیا ہم واقعی باربیرین ہیں؟"
"ہم چوہوں کی گلی سے نکلے ہیں جہاں مردوں نے اپنی ہڈیاں گنوادیں ـــ عنبر
ویسٹ لینڈ سنو گی؟"
"نہیں۔"

ایونیو کے موڑ پر عندلیب بانو راستے کے پنچھی ملاحظہ کرتی ملیں۔ بتلایا ـــ "سن برڈز!
آفتاب کی ہمراہی۔"
"آپ بھی تو ایمپائر کے ڈوبتے سورج کے پیچھے پیچھے ولایت گئی تھیں!"
"تھینک یو۔" انہوں نے ترشی سے عنبر کو جواب دیا۔
ماں بیٹیوں کی یہ کھٹ پٹ ڈاکٹر کو عجیب سی لگی بنفشئی روشنی میں چپ چاپ ٹہلتے
ہوئے وہ چاروں ریذیڈنسی کے انگلش قبرستان کی سمت نکل گئے۔
"بھیا ہم کلن کی لاٹ کے پاس سے ایک باری آدھی رات کو گذر رہے تھے ـــ"
"لارڈ کولنز کے بھوت نے آپ سے مکھن چینی مانگی! ہم بھی آدھی رات کو اسی
قبرستان کے پاس سے گذرتے ہیں کوئی پریت آج تک نہ ملا۔ بائی دی وے مسز بیگ

ابھی خیال آیا لکھنؤ کے عوام اسٹیٹ بنک کو اب بھی اسکے پرانے نام سے یاد کرتے ہیں ورنہ دراصل اب آپکا دولتخانہ تارے والی کوٹھی کہلانا چاہیئے۔ کیونکہ آپ علوم فلکیات ونجوم"۔
"بکومت"

ڈوبتے سورج کی روشنی میں ٹہلتے ہوئے وہ چاروں ریذیڈنسی کے مختصر انگریزی قبرستان کی سمت نکل گئے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ برگد کے نیچے پہنچ کر مسز بیگ نے مرمریں قبروں کا جائزہ لیا۔ پھر عینک لگائی اور کتبوں کے نام اور تاریخ وفات اناؤنس کرنے لگیں —— میڈلین انیز۔ ۱۸۸۷ —— ایما فنٹز جیرلڈ۔ ۱۸۶۵۔ لفٹنٹ جیمز گرہم۔ ۱۸۷۵۔ ولیم رٹلیج ۱۹۱۲۔ ایملیا جین ۱۹۱۲ ——
درختوں کے پتے بارش کی بوندوں کے ساتھ قبروں پر ٹپ ٹپ گرا گئے۔
"کرسچین عقیدہ ہے کہ قیامت ایسٹر کے روز آئے گی۔ ساری قبریں اپنے اپنے مُردے اُگل دیں گی"۔ مسز بیگ نے کہا۔
وہ تینوں ایملیا جین ۱۹۱۲ کے کنارے پر بیٹھ گئے۔
بھیگی ہوئی ہوا درختوں میں سرسرائی۔

ایسٹر مورننگ۔ روزِ قیامت۔ ایملیا جین مٹی جھاڑتی قبر سے برآمد ہوتی ہیں۔ سعید لیس کے گاؤن سے کیڑے مکوڑے جھٹکتی ہیں۔ افسوس کرتی ہیں۔ یہ گاؤن انھوں نے حضرت گنج سے خریدا تھا اور اسے پہن کر "یوروپینز اونلی" کے چھتر منزل کلب میں والٹس ناچا کرتی تھیں۔ نیلی گومتی کے کنارے بلوڈینیوب۔ قبر سے نکلیں تو کفن پوش نواب مریم سلطان بیگم دکھلائی پڑیں۔ ملکہ غازی الدین حیدر۔ ڈاکٹر جیمز شورٹ کی دختر بلند اختر۔ ایملیا جین نے بخوشی ان سے مصافحہ کیا۔ گو ایک نیٹو بادشاہ کی کوئین تھیں مگر اپنی وصیت کے مطابق

کیتھولک قبرستان میں دفن کی گئی تھیں۔ دونوں میدانِ حشر کی طرف چلیں۔

وہ انگریز نژاد صاحباتِ محل کہ کلمہ گو مریں اپنے اپنے مزاروں سے نکل کر اہلِ اسلام کے کیو میں لگ رہی ہیں۔

"قمر چہر اور عمدہ بیگم وغیرہ کا حشر عیسائیوں کے ساتھ ہوگا یا مسلمانوں کے؟" عنبر نے باآواز بلند ذرا تردّد سے دریافت کیا۔

"ہماری قیامت ایسٹر کے روز تھوڑا ہی آئے گی۔" منصور نے کہا۔ "یا کیا پتہ دونوں ایک ہی روز پڑیں چاند کے حساب سے!"

مسز بیگ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری "کلکتے میں بے چاری فلومینا کی قبر اسیطرح بھیگتی ہوگی۔"

"امّی جان چلیئے گھر چلیں۔ آپ کار لے جایئے۔ ہم لوگ پیدل آتے ہیں۔"

وہ امیلیا جین ۱۹۱۲ پر سے اٹھیں۔ سر جھکائے سڑک کی طرف روانہ ہوگئیں۔ حسین بخش چھتری لے کر انکے پیچھے پیچھے دوڑے۔

"فلومینا کون تھیں؟ کل شام بھی تمہاری والدہ نے انکا ذکر کیا تھا۔" منصور نے سگریٹ پھینک کر لفٹیننٹ جیمز گرھم ۱۸۷۵ پر سے اپنی ہلمیٹ اٹھائی۔

"ہماری GOAN آیا ــــــ امّی جب پیدا ہوئی تھیں تب سے اس نے انھیں پالا پوسا تھا۔ بے انتہا وفادار۔ پورے پچاس برس اس نے ہم لوگوں کی خدمت کی۔"

وہ دونوں برگد تلے سے نکل کر خاموش راستے پر آگئے کچھ فاصلے پر "اولڈ روز" رنگ کی ساڑی میں ملبوس ایک آہستہ خرام خاتون ردِ ربنک کوٹھی کے دو منزلہ سرکاری مکانات کی سمت جاتی دکھلائی دیں۔ ندی میں سورج اسی آہستگی سے ڈوب رہا تھا۔

"مسز جورڈن۔" عنبر نے رنجیدہ آواز میں کہا۔ "غروبِ آفتاب واحد وقت

ہے جب نئے اسکائی اسکریپرز سے دور لکھنؤ کی پرانی اسکائی لائن شفق اور گومتی کی اس سرخی میں ڈوب کر طامس ڈینیل کے فریم میں واپس چلی جاتی ہے۔ اسوقت مسز جورڈن چہل قدمی کر کے اپنے خاموش فلیٹ کی طرف آتی ہیں۔"

" مسز جورڈن! ——— کچھ گھنٹی سی بجی!" منصور نے کہا " رائیٹ ——— انکے شوہر کرسچین کالج میں پڑھاتے تھے۔ یہ آئی۔ ٹی میں۔ لاولد جوڑا تھا۔"

" مسٹر جورڈن کا انتقال ہو گیا۔ شارؔدا نے آئی۔ ٹی سے انٹر کیا تھا۔ وہ بتلا رہی تھی۔ دو دیورانی جٹھانی تھیں۔ یہ اکنومکس جورڈن تھیں دوسری میوزک جورڈن وہ پیانو سکھلاتی تھیں۔ اسوقت ہندوستانی استانیاں تین چار رہی تھیں۔ اب سارا اسٹاف INDIANISE کر لیا گیا ہے۔ لوریٹو کانونٹ سے بھی ساری یوروپین NUNS واپس گیئں۔ کیرالا کی آگئی ہیں۔ محض لا مارٹینئر میں ابھی گورے استاد باقی ہیں۔

" عنبر میرا خیال ہے ہم فرنگیوں کے جانے سے واقعی اداس ہیں۔ کم از کم نوسٹیلجیا کی حد تک تو ہیں۔ ورنہ ایک انڈین کرسچین تنہا پنشن یافتہ استانی کو ریذیڈنسی کے انگلش قبرستان کے پاس سے چپ چاپ گزرتے دیکھ کر تم غمگین کیوں ہوئیں ؟"

" ہم انگریزوں کے جانے سے اداس نہیں۔ مگر انڈو برٹش تمدن میں جو نفاستیں تھیں انکی جگہ پر جو گنوارپن ———"

" گنوارپن جمہوریت کی اولیں اسٹیجوں میں ناگزیر ہے ———"

" او کے۔ او۔ کے۔ میں تھوڑا ہی کہتی ہوں کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں پہلے زیادہ تر رئیسوں کے لڑکے پڑھتے تھے اسوجہ سے وہ بہت بڑھیا ہائی کلاس جگہ تھی۔ اب اسمیں کسانوں اور جولاہوں کی ہزاروں ہزار اولاد تعلیم حاصل کر رہی ہے اس وجہ سے ہمیں افسوس کرنا چاہیے۔ ڈیم اِٹ ———

THIS IS WHAT DEMOCRACY IS ALL ABOUT

" جی نہیں۔ بنیادی طور پر آپ بھی ELITIST ہیں۔"

" ابھی تو تم مجھے نکسلائیٹ بتا رہے تھے !"

" تم بھی مجھے کبھی وہابی سمجھتی ہو کبھی شیعہ —!! نہیں — تم زبردست اسنوب ہو۔ میں کہ ایک غریب مُلّا کا بیٹا ہوں۔ کسی گوآن آیا نے میری پرورش نہیں کی نہ میری والدہ نے لوریٹو ہاؤس کلکتہ میں پڑھا۔ میں SNOBBERY کے مختلف رنگ خوب پہچانتا ہوں "

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے۔

" اور سناؤ۔ نگار خانم کیسی ہیں؟ "

" مصر تھیں کہ شطرنج کے کھلاڑی دیکھوں کھانا کھاؤں۔ میں بھاگ آیا "

" شہوار بہت خوبصورت ہے ۔ تم کو کیسی لگتی ہے ؟ بتاؤ — بتاؤ نا۔"

" عنبر۔ خفقانی مت بنو —" منصور نے چڑ کر دوسرا سگریٹ جلایا " ڈاکٹر کے اعصاب مضبوط ہونے چاہئیں —"

" بس۔ تم لیبورٹری میں ڈٹے رہو — میں خفقانی ہوں ؟ ڈاکٹر انسان نہیں؟ پتھر کے بُت ہیں ؟ تم کیوں چین اسموکنگ کرتے ہو ؟"

وہ پھاٹک پر پہنچ گئے۔ منصور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔

" کہاں جا رہے ہو ؟"

" پہلے ذرا گھر پھر کلب " کول گیٹ مسکراہٹ مفقود " بمبئی کی ایک ٹرنک کال کا بھی انتظار ہے "

" امّی تو تمہارے لیے ہی سامان لینے ماتا بدل کے ہاں گئی تھیں "

" سوری ۔ اگلے ہفتے۔ آج تو اتنا وقت بیلی گارڈ دیں آپ ہی لوگوں کے

ساتھ گزار لیا۔ اگلا سنیچر۔ او۔ کے ؟ کھانا بھی۔ خدا حافظ۔"

فلَیش گورڈن —— رت بسنت کی بجلی کی طرح غائب۔

مسز بیگ کوٹھی کے پھاٹک پر منتظر تھیں۔

"ہلو اولڈ گرل" عنبر نے کھوکھلی آواز مصنوعی بشاشت سے ماں کو مخاطب کیا۔

"منصور ——؟"

"چلا گیا۔"

"کیوں ؟"

"پرسوں آپ ہی نے اس سے کہا تھا اس کا روز روز آنا اور گھنٹوں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

"یہ بات نہیں۔ تم نے اسے اپنی بحثوں سے جھنجھلا دیا۔ بات بے بات اس سے الجھتی کیوں ہو ؟ مرد ٹرّی جھگڑالو لڑکیاں پسند نہیں کرتے۔"

"میں لڑکی ہوں ؟ بُوڑھی پھُونس۔ خود ہی تو کہتی ہیں کہ عورتوں کو سکنڈ فِڈل نہیں بننا چاہیئے۔ ابھی ان بے چارے اتنے مہذّب مسکین بزرگ سے تکرار کرنے لگیں۔ چلیے اندر چلیں۔"

عندلیب بانو پھاٹک پر کہنیاں ٹیکے کھڑی رہیں۔

"امّی۔ اب کیا سوچ رہی ہیں بھئی ؟"

"حُسین بخش نے جلی خورشید کا قصّہ چھیڑ دیا۔"

"تو ——؟"

"مجھے حجّن بی کا خیال آگیا۔"

"چھوڑیے۔ اب حجّن بنا بی کو کہاں تک یاد رکھیئے گا ؟"

"مرتے دم تک۔ جیسے مما انھیں نہ بھول سکیں۔"

"بے چاری حجّن بی کا کیا قصور تھا امّی۔"

" سُنو۔ دوسرے کنارے پر مسلمان بنجاروں نے جھونپڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ انکی عورتیں بڑے شوخ خوبصورت رنگوں کے غرارے پہنتی ہیں۔

" انکی جھونپڑیوں کے مقابل آرٹ کالج اور ندوۃ العلماء۔ اوران دونوں دنیاؤں سے انکا کوئی تعلق نہیں۔

" میڈرڈ میں ـــــ جب میں ایک جپسی ڈانسر کا اسکیچ بنا رہی تھی تم سے کہا تھا۔ آٹھ سو سال پہلے اگر یہ خانہ بدوش انڈیا سے یوروپ نہ بھاگتے وہاں آج بھی ہبُوڑے اور ڈوم اور کنجر ہی کہلا رہے ہوتے۔

" آئین اکبری میں ہے کہ کنجر قبیلے کی عورتیں ناچتی گاتی ہیں اکبر نے انکو کنچنی پکارا۔

" مجھ بنجارن کے لیے یہ پڑاؤ بھی جان لیوا نکلا۔
" باورچی ٹولے کے حسین بخش کافی نہیں تھے
" جو آج وکٹوریہ اسٹریٹ کے وثیقے دار بھڑ گئے۔ بھوتوں کے رکھوالے۔"

" اندر چلیئے۔ بجروں کے چراغ بجھتے جاتے ہیں۔ ہوا اتنی تیز ہے"
" اس موسم کی ہوائیں آندھی بن کر آتی ہیں۔ سنو۔ عنبر۔ گمنام نواب صاحب نے عزیز بانو کا وہ کون سا شعر پڑھا تھا۔ جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں۔
" اسوقت سے پتہ ہے میں کیا سوچ رہی ہوں؟ میں سوچ رہی ہوں۔ میں شاخ گلاب کی طرح جھکی تو سہی ـــ ابر بہار کی طرح اٹھ کیوں نہ پائی "

(۳)

سُرخ پٹاری

"بیٹے۔ اس روز باہر سے باہر ہی چلے گئے۔"
"جی میں نے عنبر سے معذرت ——"
"اچھا ذرا کچن کا چکر لگاؤں۔"

ڈاکٹر کاشغری دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ شفق کی روشنی میں ہرا بھرا باغ بے حد دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔ نالیوں میں بہتا شفّاف پانی کبھی نقرئی نظر آتا کبھی ارغوانی۔ بڑی بڑی مینائیں گھاس پر چہل قدمی کر رہی تھیں۔ عنابی اور سفید ٹائیلوں کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتی، طوطے کے رنگ کی ساری میں ملبوس عنبریں بیگ کمرے میں داخل ہوئی۔

"ہلو منصور ——"

"ہائے طوطا پری! ——" اس نے امریکن انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ "یار وہ بنگالی بیرسٹر بڑا بے وقوف تھا جو ایسی خوبصورت کوٹھی اتنی سستی بیچ گیا!"

"وہ پانڈیچری آشرم جا رہا تھا سنیاس لے کر۔"

"عجیب لوگ ہوتے ہیں۔ آشرموں میں جا بیٹھتے ہیں۔"

"جب میں نے اسے خریدا اس پر بیحد ٹیگوریت چھائی ہوئی تھی —جھلملیوں والی کھڑکیاں اندھیرے اداس کمرے۔ ایکزوٹک باغ۔ میں نے کھڑکیوں میں سلائیڈنگ پٹ لگوائے۔ کمروں کو روشن اور ہوادار کیا۔ افوہ بڑا خرچہ بیٹھا۔ تم کہتے ہو برساتی بنوا لو ——"

"اب اس وکٹورین بنگالی ماحول کی جگہ تمہارے ہاں یوروپین کو لونیل پُچ آگیا ہے یہ بھی اچھا لگتا ہے۔"

"تم کولونیل؟"

"ٹروپیکل درخت اور کوٹھی کا اسٹائل۔ اسکے لئے تم کچھ کر نہیں سکتیں۔ نہ کرنا چاہیئے۔ شمالی افریقہ میں یوروپین کولونیل چھوڑ رومن ایمپائر تک کی جھلک موجود ہے۔ اور اندلس کی —— اور ——"

"یہی تو سارا پرابلم ہے۔ جھلکیاں بے شمار۔ آدمی ایک۔"

"سلیقے سے موزیک اور اسٹینڈ گلاس دریچے بھی تو بنائے جاتے ہیں۔"

" یہ کوٹھی اس ایریا کے لیجنڈری رومینٹک منظر میں شامل تھی۔ لال بارہ دری۔ چھتر منزل۔ روشن الدولہ کی کچہری۔ قیصر باغ۔ لیکن یہاں بد مذاقی کے بلڈوزر چل گئے۔

"اسکاٹ لینڈ میں میں اپنی بے ونڈ وییں بیٹھتی اکثر ایک آدمی بیگ پائپ بجاتا سنسان پہاڑی راستے پر سے گذرتا دور دھند لکے میں کھو جاتا تھا —— میں اس آواز کو دوبارہ سننا چاہتی ہوں۔ مگر ملکہ پکھراج کو بھی انکی اپنی سیٹنگ میں۔

" اڈنبرا اور بیگ پائپ۔ ہندوستان کی مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر زیر بانگوں کا سلسلہ —— فجر اور مغرب کی لرزہ خیز اذانیں —— ہردوار گئے ہو ؟"

"ہوں ہوں۔"

"گنگا دیوی کے مندر کی جل بہار۔ کیرالا کے سفید چرچ۔ رنگین چھتریاں لگائے پلوں پر سے گذرتے گریس فل لوگ۔ سروں پر رومال باندھے موپلا عورتیں۔

ہر چیز کا ایکدوسرے سے سمبندھ اور مناسبت ہے۔ لیکن یہاں کیا ہو رہا ہے؟ چھتر منزل کو ڈرگ ریسرچ انسٹیٹوٹ بنا کر برباد کردیا۔ روشن الدولہ کی کچہری گرائی جارہی ہے —— قیصر باغ کے پھاٹک تو کھنڈر ہو گئے اور رسٹیڈیم کے سامنے وہ نیلا پیلا سوراخوں والا پھاٹک تعمیر کیا گیا ہے بقول تمہارے MODERN BAD-TASTE ۔ دنیا کا گلوب بچوں کے پارک میں لگانا چاہیئے تھا۔ سعادت علیخاں اور خورشید زادی سے اسکی کیا ——"

"میرے انگنے میں تمہارا کیا کام ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر۔" عندلیب بانو نے اندر آتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھو شام کس تیزی سے گر رہی ہے۔" منصور چند کیسیٹ نکال کر دریچے میں واپس گیا۔ "یہ میں نے ڈسک از فالنگ کا ترجمہ کیا ہے۔"

"بُل ڈوزر۔" عنبرین نے دہرایا۔

"لندن برج از فالنگ ڈاؤن فالنگ ڈاؤن مائی فیئر لیڈی ـــــ" منصور نے کہا۔

"عنبر۔ تمہاری باتیں سنکر میرا چہرہ گر گیا۔ ایسے منفی بیانات جاری نہ کرو۔ تمہیں اپنے ڈپریشن کو شکست دینی چاہیے۔ اسی بات پر دل بہادر تھاپا سے کہو کافی لائے مع چوکولیٹ کیک ـــ"

"بہادر ـــ" عندلیب بانو نے پکارا۔ پھر عنبرین کی طرف متوجہ ہوئیں ـــ "تم روز بروز زیادہ ری ایکشنری ہوتی جا رہی ہو ـــ یہ بہادر سنگھ چیتھڑے لگائے نیپال کی گھاٹیوں میں پتھر ڈھوتا تھا اسوقت گویا اپنی سیٹنگ میں صحیح اور مناسب تھا ـــ ممکن ہے اسکی بہنیں فارس روڈ پر بیچ دی گئی ہوں بمبئی میں۔ منی اسکرٹ پہنے سرخ بتیوں کے نیچے کھڑی پنجروں کی سلاخوں سے جھانکتی اداس نیپالی لڑکیاں ـــ ان بچیوں کی یہی سیٹنگ ہونی چاہیئے؟"

"ہاں۔ جواب دو عنبرین!" منصور نے جوش سے مطالبہ کیا۔

والدہ پھر غائب۔ باہر کار اسٹارٹ ہوئی۔

"امی کے پاس بہت سے دقیانوسی ریکارڈ بھی موجود ہیں۔ کسی روز سُننا ـــ"

"مائی نیم مس گوہر جان آف کیل کٹا ـــ؟" منصور نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں۔ اسی ٹائپ کے۔ گوہر جان۔ سردار منصور مس کجن۔ دُلاری۔"

منصور نے ایک کیسیٹ لگایا "لو سنو ــــ تمہاری ملکہ پکھراج اپنی ٹرو ویٹنگ میں"

"ہر شاخ میں شگوفے انداز نو پھوٹے"
عنبر نے آواز اونچی کی۔
"ہوا بخت سبز۔ ملا رخت سبز"
"واہ ــــ واہ ــــ!" منصور نے داد دی۔
"چلے میگسار سوئے لالہ زار ــــ مے پردہ دار شیشے کے در سے جھانکی ــــ"
"ٹائم جینٹلمین ــــ!" عنبرین نے خوشدلی سے اعلان کیا۔

"صاحبزادی شہوار خانم کا فون"
"کہدیجئے حسین بخش ہم یہاں موجود نہیں ــــ سنو عنبر وہ جو سامنے والے آم کے درخت ہیں انکے ایٹ مو سفیر کو نہ چھیڑنا"
"ہرگز نہیں!"
وہ یکلخت بڑی بشاش نظر آئی۔ منصور نے شہوار کو اگنور کیا۔

"ہوا بخت سبز ــــ ملا رخت سبز ــــ آفت گئی خزاں کی ــــ"

"بالکل یہی جنگل کی SETTING رکھو ــــ جھٹ پٹے وقت بن دیوی اس جھرمٹ میں سے گذرا کرے گی۔ کبھی اپنی جھلک دکھلا کر اچانک غائب ہو جاتے گی۔ بن دیوی جو انسانوں سے ڈرتی ہے ــــ یہ ایک رگ وید شاعر نے کہا تھا۔ ڈھائی ہزار سال پہلے"
"باپ رے۔ تم کو اتنا انٹرنیشنل لٹریچر ازبر ہے! ڈھائی ہزار سال سے کم بات نہیں کرتے۔ واقعی نگار خانم تم کو بہت بھاؤ دینگی۔"

"وہ دیکھو — بن دیوی کی جھلک — پیلی ساری میں۔"

"وہ ہمارے مالی کی بیوی ہے۔"

"نیور مائینڈ۔ تمہاری مالن کا نسلی اور مابعد الطبعاتی تعلق اس رگ وید کی بن دیوی کے تصوّر سے بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔ اور سیٹنگ ایکدم پرفیکٹ۔ بور سے لدے آم کے درخت۔ گومتی کا کنارہ — گودھولے کا سمے۔ مالن کا نام امبیکا تو نہیں؟"

"نہ۔ رم کلیا —"

"خیر۔ رام کلی بھی چلے گا۔"

"سوال یہ ہے بارہ دری قیصر باغ ہلدی کے رنگ میں کیوں پوتی؟"

"چند سال قبل ایک محیر العقول کلر اسکیم بنائی گئی تھی۔ اسکے تحت؟"

"جب بٹ صاحب یوپی گورنمنٹ کے چیف سکرٹری تھے؟"

"ان نامحمود رنگوں سے موصوف کا کوئی تعلق نہیں۔ کوئی موڈرن آرٹ والا ٹاؤن پلانر — معاملات کچھ اندھا دھند میں کچھ پیچیدہ۔ وکٹوریہ پارک کا نام بیگم حضرت محل پارک رکھا گیا۔ بیگم کا مجسّمہ نصب کرنے والے تھے۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا ایک مسلم شخصیت کا بُت نہیں لگوانے دینگے۔ چنانچہ وکٹوریہ کی چھتری خالی پڑی ہے۔"

"امیر الدولہ لائبریری میں" مسز بیگ کی آواز آئی "کنگ غازی الدین حیدر کا مرمریں بُت تو مدتوں سے موجود ہے — جب میں لڑکپن میں یہاں آئی تھی تب بھی دیکھا تھا۔ اور نصیر الدین حیدر کا بھی۔"

"آپ —؟"

"برما بیکری گئی تھی۔ تمہارے لیے چوکولیٹ کیک۔ اور میاں سارے مسلم ملکوں میں تو مسلمان شخصیتوں ہی کے مجسّمے نصب کیے گئے ہیں —"

"اکثریت کی بُت پرستی کی وجہ سے ہندی مسلمان حد سے زیادہ محتاط ہے — امی ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے۔"

"ماں! تو سمجھتی کیوں نہیں ؟" منصور نے فلمی مکالمے کی نقل اتاری۔
مسز بیگ کھلکھلا کر ہنسیں۔ اسی انداز میں ایک اور پامال فلمی ڈائیلاگ دہرایا۔
"اچھا بیٹا جا ——— ! جلدی سے ہاتھ منہ دھو لے۔ میں تیرے لئے چائے لاتی ہوں ——— !"

ان دونوں میں کتنا زبردست RAPPORT قائم ہو گیا ہے۔ لوگ جنریشن گیپ کی بات کرتے ہیں! عنبر نے کیک کا ڈبہ ماں کے ہاتھ سے لیکر میز پر رکھا۔
بہادر ٹرے لے کر حاضر ہوا۔
"منصور تم کافی اینٹی مسلم بھی ہو۔" عنبر نے کافی بناتے ہوئے اظہار خیال کیا۔
"میں نے ابتک جو کچھ کہا اسمیں کوئی پوائینٹ غلط ثابت کرو۔ کر دغلط ثابت! حق بات کہتا ہوں۔ سچ ہمیشہ کڑوا لگتا ہے۔ کیا تم خود ہی پرسوں نہیں کہہ رہی تھیں شیعہ سنی فسادوں میں دونوں فریق ہندو منسٹروں کے پاس ایکدوسرے کی شکایتیں لیکر جاتے ہیں ان سے فیصلے کی درخواست کرتے ہیں ——— کتنی شرمناک صورت حال ہے۔ بنارس میں شیعہ فریق دو سنی قبروں کا معاملہ سپریم کورٹ تک لے گئے ہیں قبریں اس جگہ سے اکھیڑنے کا مطالبہ ———"

"جعلی ہیں وہ قبریں۔"
"اگر مزارا کھیڑنے کی قانونی مثال قائم ہو گئی تو بھیانک ممکنات کا ابھی سے اندازہ کر لو۔ پھر شکایت نہ کرنا۔"
"دس از ڈریڈ فُل ——— ویسٹرن آدمی چاند پر پہنچ گیا یہاں قبریں ——— "
عندلیب بیگ نے مایوسی سے ہاتھ پھیلائے۔
منصور بہت مضطرب انداز میں پیالی آتشدان پر رکھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔
افسوس کہ عنبر FUNDAMENTALIST نکل گئی۔
اور ایسی فری تھنکر ماں کی بیٹی۔
وہ کمرے کے اشیائے آرائش پر بے دھیانی سے نگاہ دوڑاتا رہا ——— ایسی

چیزیں جو عموماً ہر ولایت پلٹ کے گھر میں موجود ہوتی ہیں ایفل ٹاور وغیرہ۔ ایک کونے میں دھری ایک گول پٹاری نے متوجہ کیا۔ وہ قریب جاکر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ پچھلے چند ماہ میں وہ کتنی بار یہاں آچکا تھا لیکن لاکھ سے رنگی وضع قدیم کی اس پھولدار پٹاری کو نوٹس نہیں کیا جو ایک کشمیری اسکرین کی اوٹ میں رکھی ہوئی تھی۔

"دلّی میں ——" اس نے آہستہ سے کہا —— "میری دادی اماں کے پاس اسی طرح کا ایک پٹارا موجود تھا —— جامہ دانی۔ جانشین پر رکھی رہتی تھی۔ یہ پٹاری آپ نے نخّاس سے خریدی ہوگی؟ یا شیش محل —— میرعبداللہ۔"

"نہ نخّاس نہ میرعبداللہ۔"

"اس پر یاد آیا —— امراؤ جان میں میرعبداللہ کو دیکھا؟ ایک سین میں باقاعدہ نیلا چوغہ پہنے ——" منصور نے پھر پٹڑی بدلی۔

"یہ پٹاری بھی ANTIQUE ہے سَو سال سے زیادہ پرانی ——" عندلیب بانو اٹھ کر کشمیری اسکرین کے پاس آئیں۔ شکستہ پٹاری لاکر دیوان پر رکھی۔ گنبد نما ڈھکن احتیاط سے کھول کر کپڑے کی چند گڑیاں نکالیں۔

"یہ بھی سَو سال قبل بنائی گئی تھیں۔ یہ ان گڑیوں کی پٹاری ہے۔"

"نوکڈِ ٹنگ ——؟" منصور نے بڑے اشتیاق سے ایک گڑیا اٹھائی۔ شکرپارے کی آنکھیں۔ ناخنوں اور ہتھیلیوں پر سُرخ تُول کی کترنیں۔ کالے دھاگے سے بنی لانبی چوٹی گوٹے کا موباف۔ پوتھ کا چھوٹی گوٹ کا دلّی والا غرارہ۔ ریشمی شلوکہ اور دوپٹہ۔ زری کی جوتی۔ ناک میں چاندی کا بُلاق۔ گلے میں پوتھ۔ کلائیوں میں موتی کی چوڑیاں۔ اسے رکھ کر نوکیلی مونچھ چوگوشیہ ٹوپی اور گلدان کے چُغے والا ایک گڈا اٹھایا۔ عنبر فاتحانہ انداز سے بولی ——

"SEE THIS IS WHAT CIVILISATION IS ALL ABOUT.

یہ میری گرینی GRANNY کی پٹاری ہے۔ میری گریٹ گرینڈ مدر نے یہ گڑیاں میری کے لئے بنائی تھیں۔"

سنوار کر عندلیب بانو نے انکو دیوان پر ایک قطار میں بٹھال دیا۔ اور پٹاری میں ہاتھ ڈال کر ایک برقعہ نکالا۔ چھوٹا سا سوتی مشجّر کا برقعہ۔ بوسیدہ —— "میری والدہ مرحومہ کا برقعہ۔ اس زمانے میں نو دس سال کی لڑکی پردہ نشین ہوجاتی تھی"۔
۔نہایت احتیاط سے اسے جھاڑا۔ تخت پر بچھا کر اسکی شکنیں درست کیں۔
پلکیں ساری کے کونے سے چھوئیں گویا آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے اسے نکال رہی ہیں۔

برقعہ لپیٹ کر واپس رکھا اور ایک خالی عطر دان پٹاری سے برآمد کیا۔
"میرے گریٹ گرینڈ فادر نے یہ عطر خود کشید کیا تھا —"عنبر نے ایک خالی شیشی پیش کی۔ عطر کب کا اُڑ چکا تھا۔
"بہت ہی بڑھیا —" منصور کی سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا کہے۔ سو برس پرانے دیسی عطر کی خالی شیشی کی اسے پہچان نہ تھی۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ بالکل اتفاقیہ اور نادانستہ وہ ان ماں بیٹیوں کی نجی زندگیوں کے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اجنبیوں کا اپنی زندگی میں اسطرح جھانکنا انکو پسند نہ آئیگا۔ کسی کو پسند نہیں آسکتا۔ اس نے پیچھے ہٹنا چاہا اور قالین پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب لگے ہاتھوں گومتی کی جل بہار بھی دیکھ لو —— اڈنبرا میں وقت گذاری کے لئے ایک آرٹ اسکول جوائن کر لیا تھا۔ عنبر میڈیکل کالج میں AMBER کہلاتی تھی میں آرٹ اسکول میں ANDY ۔ الٹا حساب تھا۔ بیٹی اتنی کٹھن پڑھائی میں مصروف۔ والدہ شوق فضول میں مگن۔ ایک تجرباتی تھیٹر میں بھی کام کیا۔ اس زمانے میں لایعنیت کے تھیٹر کا بڑا زور تھا۔ پھر لوگ اس سے بھی بور ہوگئے۔"

ڈیم سبل تھورن ڈائیک کے سے وقار کے ساتھ اطاق گلشن سے گذرتی، دو سیڑھیاں اتر کر وہ اپنے مہمان کو ایک نیم تاریک کمرے میں لے گئیں۔ اتنے روشن اور پر فضا خالص

انگلش اسٹائل گارڈن روم کوانہوں نے اپنا اسٹوڈیو کیوں نہ بنایا۔ منصور نے ~~اچنبھے سے~~ سوچا، اور تصویرخانے کے دریچے وا کیے۔ یہیں سے جھانکتی وہ اس شام گلوریا سوانسن معلوم ہوئی تھیں۔

مسز بیگ نے ایزل پر سے پردہ سرکایا۔ "لو بھئی۔ جل بہار۔ چھتر منزل کے سامنے شاہی کے بجرے۔"

پیچھے سے عنبر کی آواز آئی۔ "منصور یہ قالین دیکھو میں نے طہران میں خریدا تھا۔"

وہ دیوار پر آویزاں کاشانی قالین کی طرف مڑا۔ بغیر آستینوں کے شلوکے اور گھیردار شلواروں میں ملبوس سروں پر رومال باندھے تین فربہ ایرانی عورتیں گاؤتکیوں کے سہارے بیٹھی قلیان، سگریٹ اور شربت سے شغل کر رہی تھیں۔ پس منظر میں گنبد اور محرابیں۔

"غالباً حرم سرا۔" عنبر نے کہا۔ "یہ والا مرا کو —"

مراقشی قالین پر ایک عرب شہسوار ایک حسینہ کو سامنے بٹھائے اڑا جا رہا تھا۔ تعاقب میں غنیم یا رقیب۔ اوپر تاروں بھرا آسمان۔ چاند مینار۔ کھجور کے درخت۔

"عورت کے متعلق اقوام مشرق کے رویے ان قالینوں سے عیاں ہیں۔ اب میں انکے سامنے ایک سوویٹ خلاباز لڑکی کی تصویر لگاؤں گی!" عندلیب بانو نے اعلان کیا۔

"آپکو WOMEN'S LIB کی قیادت کے لیے میدان میں آنا چاہیے!"

"میں لیڈر ٹائپ نہیں۔ حالانکہ خالی بیٹھے میرا جی گھبراتا ہے۔ باہر دسیوں مشغلے تھے۔ یہاں تصویریں کہاں تک بناتے جاؤں۔ پھر انکا کیا کروں۔"

"نمائش۔"

"نمائش —؟"

"جی۔ قاعدہ ہے کہ مصوّر تصویریں بناتا ہے پھر انکی نمائش کرتا ہے۔"

"میں بہت بے قاعدہ مصوّر ہوں۔"

"آپکی تخلیقات؟" منصور نے ذرا خایف ہو کر چند CERAMICS کی طرف اشارہ کیا۔

وہ اطاق پذیرائی میں واپس آئے۔

"لیبیا میں —" عندلیب بیگ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولیں: "میں نے چند ایک سر بھی بنائے تھے: تانبے میں۔ دکھلاؤں؟"

"امّی پھر کبھی۔"

آرٹسٹ اپنے بارے میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن عنبر منصور کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ مسز بیگ سے گفتگو میں لگا رہا۔

یہ دونوں میرے خلاف GANG UP کر رہے ہیں اس نے چڑ کر ایک رسالہ اٹھا لیا۔

"ادھر چودہ سو سال سے مسلمان بچّیاں گڑیاں کھیل رہی ہیں۔ اے بیٹا وہ بھی تو پتلے پتلیاں ہوئیں۔ بس یہی تو کہتی ہوں۔ NO LOGIC —— کیا تم بور ہو رہے ہو؟"

"نہیں تو ممیم۔"

"جب سے لکھنؤ آئی ہوں۔ گوشہ نشین۔ تارک الدنیا۔ اس دریچے میں کھڑے ہو کر دن میں پرندہ شناسی۔ رات کو اختر شماری۔ A LONELY OLD WOMAN۔ تم ایک ہمخیال مل گئے تو اتنی باتیں کر ڈالیں۔"

"امّی آپ کو گوشہ نشینی پہ کس نے مجبور کیا ہے؟ للت کلا اکیڈمی والے لال بارہ دری میں آپکی نمایش کرنا چاہتے تھے آپ نے انکار کیا۔ وہ کرن بھاٹیہ آئی۔ آپ نے اسے بھگا دیا۔"

"کرن بھاٹیہ کون ؟" منصور نے دلچسپی سے پوچھا۔
"— عنبر کی ایک پیشنٹ ہے۔ بمبئی کے ایک زنانہ انگریزی ویکلی کی کورسپونڈنٹ ایک روز میری تصویریں دیکھ کر بولی۔ میرا انٹرویو کر کے ایک تصویری فیچر چھاپے گی اس رسالے میں۔ دراصل اس پر اس چیز کا بہت رعب پڑا کہ میں نے پندرہ سال ولایت میں رہ کر تصویریں بنائیں۔ مضمون لکھ کر لائی۔ وہ شروع اسطرح ہوتا تھا —— شریمتی عندلیب بیگ جنکی تصاویر کی نمائش اڈنبرا، لندن، پیرس اور برسلز میں ہو چکی ہے۔
" بیٹا۔ میں نے یہ تم سے کب کہا تھا میری تصویروں کی نمائش آج تک کہیں نہیں ہوئی۔ میں محض سنڈے پینٹر ہوں۔ بولی چھوڑیں آنٹی جی۔ فرق کیا پڑتا ہے۔ پڑھنے والوں پر رعب پڑ جائیگا۔ کون لندن پیرس پوچھ تاچھ کرنے جا رہا ہے۔ میں نے کہا میں اس غلط بیانی کی اجازت نہیں دے سکتی۔ وہ چھوکری اڑی رہی۔ مجھے غصّہ آ گیا اسکا مضمون پھاڑ کے پھینک دیا۔"

گیلری میں فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ عنبر نے جا کر بات کی۔ منہ پھُلائے لوٹا۔
"پھر شہوار خانم! ہمارے شان کے خود بات نہیں کرتیں۔ پہلے انکی آیا تنی سوالات کرتی ہے۔ پھر خود تشریف لاتی ہیں۔ پوچھ رہی ہیں تم یہاں آ گئے ہو یا نہیں —— کیا جواب دوں ؟"
"ٹھہرو۔ میں نپٹتا ہوں۔"
چند منٹ بعد وہ واپس آیا۔
"کیا ہوا ؟ نگار خانم پھر علیل ہیں ؟"
"نہیں بھئی۔ کل شہوار کہہ رہی تھی THE MESSAGE کا کیسیٹ منگوایا ہے۔ وہ آ گیا۔ اب کل وَل جا کر دیکھ لوں گا۔ یوں تو پکچر دیکھنے کو ملے گی نہیں۔"
"کیوں ؟" مسز بیگ نے سوال کیا۔
"مسلمانوں نے اسے انڈیا میں BAN جو کروا رکھا ہے۔"

"اے بیٹا میں تو اسے دیکھ چکی ہوں بن غازی میں۔ آپ میں BAN کروانے کی کیا بات تھی؟ پہلی مرتبہ طلوع اسلام پر فلم بنی۔ ساری دنیا کو دکھانے کے لیے۔ اور اتنی لاجواب —— سچ ہے۔ سر سید احمد خان نے تو سو سال پہلے کہا تھا کہ مسلمان عقل کے دشمن ہیں۔ منصور بیٹے اسے دیکھ کر تو انگلینڈ میں بہت سے انگریزوں نے اسلام قبول کر لیا —— اور سنو تو۔ ایک پکے مسلمان ڈائریکٹر نے اسے بنایا۔ نہ اُنہیں تمہارے پروفٹ دکھلائے گئے۔ نہ انکے چاروں کیلف۔ آواز تک کی نمائندگی تو کی نہیں گئی پروفٹ محمدؐ کی۔ علمائے ازہر نے اس فلم کی تعریفیں ——"

"کی ہونگی۔ یہاں تو اس پکچر کو دیکھے بغیر اردو اخباروں نے اسکے خلاف جوشیلے اڈیٹوریل لکھے۔ نمائش سے پہلے ہی BAN کروادیا۔ اب ہم کس کس بات کے دکھڑے روئیں" منصور نے جواب دیا۔

"حضرت ابوطالبؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت بلالؓ کو تو دکھلایا ہے ——" عنبر نے اعتراض کیا۔ "اونٹنی تو دکھلائی ہے فلم میں۔ آنحضرتؐ کی۔"

"اونٹنی؟ مسلمان مصوّروں نے تو بُراق کی ان گنت تصویریں بنا ڈالیں۔"

عندلیب بانو فوراً اٹھ کر اسٹوڈیو میں گئیں وہاں چند منٹ کھٹر پٹر کیا کیں۔

اسلامک آرٹ پر دو ضخیم کتابیں اٹھائے واپس آئیں۔

طویل سنہری زنجیر والی عینک ناک پر جمائی۔ ورق گردانی شروع کی۔

"چھوڑیے امیّ۔ منصور میوزک سُننا چاہتا ہے۔"

"قصص الانبیاء، معراج نامہ، سب میں آدمؑ تا محمدؐ پیغمبروں کی باضابطہ صورت گری موجود۔ بغداد اسکول —— یہ دیکھو اور دیکھو —— خمسہ نظامی —— اور یہ رسولؐ اللہ بُراق پر سوار —— جنت کا منظر۔ جبرئیلؑ۔ شتر سوار حوریں ——" جوش کے ساتھ دوسرا ورق —— "یہ۔ شاہرخ مرزا کی فرمائش پر معراج نامہ مصوّر۔ یہ نوائی کی الجواہر میں رسولؐ اللہ مع صحابہ اور حضرت بلالؓ۔"

"اور یہ لو —— رشید الدین کی جامع التواریخ —— انبیاء اور رسول اللہ کے آٹھ پورٹریٹ مع حضرت ابوبکرؓ —— سلطان مراد دوئم کا زبدۃ التواریخ —— اور سلسلہ نامہ —— سولہویں صدی —— میوزیم اف ٹرکش آرٹ —— استانبول۔ صفویہ ایران میں اس قسم کی تصویریں بنائی گئیں تو تعجب نہیں —— ایران میں آج بھی گھر گھر رسولِ خدا اور حضرت علیؑ کی تصاویر نظر آتی ہیں۔ مگر عثمانیوں کا ترکی! نقاب پوشی کی روایت ترک مصوّروں نے شروع کی۔ سلطان احمد اوّل کا دور۔ فالنامہ۔ مصوّر قلندر۔ چھتیس تصاویر۔ "یہ دیکھو۔ رسولِ خدا اور حضرت خدیجہؓ کی پہلی ملاقات۔ درمیان میں حضرت جبرئیلؑ۔" مسز بیگ نے ٹرکش آرٹ کی ایک اور ضخیم کتاب کھولی —— "چودھویں صدی کے ایک نابینا ترک کی حیات نبویؐ —— سلطان مراد سوئم کے حکم سے مصوّر کی گئی۔ سُنّی اسلام کے روحانی پیشوا خلیفۃ المسلمین کے حکم سے۔"

"یعنی علمائے دین اس تصویر کشی کے مخالف نہ تھے۔" منصور نے کہا۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سیر النبیؐ کو ہر عثمانی سلطان کے عہد میں السٹریٹ کیا گیا —— مراد سوئم والی کتاب میں آٹھ سو چودہ تصویریں ہیں —— عمل احمد نور بن مصطفیٰ —— چھ جلدوں میں —— اب تم کو احمد نور کے دو بیحد خوبصورت MINIATURES دکھلاتی ہوں —— 'آغاز نبوّت' —— یہ دیکھو —— پروفٹ اف اسلام۔ دائیں طرف بی بی خدیجہؓ —— بائیں طرف نوعمر علیؑ۔"

"حضرت علیؑ کے روئے مبارک پر نقاب نہیں ہے۔" منصور نے ریمارک کیا۔

"ان تصویروں کے ڈیکور اور رنگوں کی اپنی سمبلزم ہے۔ یہ تینوں ہاتھ باندھے ایک صف میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ کیونکہ خدیجہؓ اور علیؑ اوّلین ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کا نیلا لباس پاکیزگی کی علامت۔"

"لباس تینوں کے ترکی حضرت علیؑ کا لبادہ سبز۔"

"لکھتے ہیں سبز رنگ اس چیز کا مظہر ہے کہ علیؑ بڑے ہو کے قرآن شریف کی MYSTICAL تفسیر کرنے والے ہیں۔ دریچے کے باہر سنہرے آسمان کے نیچے اژدہو کے

گلابی شگوفے عشق الٰہی کے آغاز کا سمبل۔ بادام کی سفید کلیاں حکمتِ قرآن کے KERNEL

"بہت باریک نکتہ ہے ــــــ" منصور نے کہا۔

"جنّت سے آئی ہوئی ندی باہر باغ سے گذر رہی ہے ــــ گویا رحمت خداوندی ــــ دیوار پہ تلوار کا نشان انسان کے دل کو اپنی محبّت سے گھائل کرنے والی سیف اللہ۔"

"سبحان اللہ!"

"گلابی قالین اور کاسنی دیوار پر ستاروں کے PATTERN مومنوں کی روحیں! ــــ لکھا ہے قرآن میں معرفت الٰہی کو روشن ستارے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

"اب ایک اداس منظر اور اسکی سمبلزم ــــ رسول خدا کی وفات ــــ

"سرہانے نقاب پوش فاطمہؑ ۔ سر پر شعلۂ نور۔ سرخ پوشاک انکے خونبار دل کی ترجمان ــــ آنکھوں پر رومال رکھے علیؑ گریہ فرمارہے ہیں۔ حسنؑ حسینؑ دوزانو بیٹھے رو رہے ہیں ــــــ درودیوار پر بنے آڑے ترچھے غیر واضح خطوط ماحول کے الم اور دلوں صدمے کے گہرے اثر کی علامت"

"گویا الیکٹرو کارڈیوگرام کی لکیریں ــــ کمال ہے۔" منصور نے متحیّر آواز میں کہا۔

"کمرے کے باہر دھندلا آسمان ۔ دریچے کے شیشوں پر بارش کی بوندیں آنسوؤں کی طرح بہہ رہی ہیں ــــــ" مسز بیگ نے کتاب بند کی۔ "سعدی اور جامی وغیرہ کو السٹریٹ کرنے کے لئے بھی بے شمار انبیاء کی تصویریں بنائی گئیں۔ ترک، ایرانی اور مغل مصوّروں نے مشہور صوفیاء کے پورٹریٹ ــــــ"

"امی اب مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے؟" عنبریں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مذہبی مصوّری اسلامک آرٹ کی غالب روایت نہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت اسکے خلاف ہے۔ تو بس ختم ہوئی بات۔ چھوڑیے اس قصّے کو۔ مسلمان بت شکنی کے لئے بدنام، مگر ایک بار آپ نے خود ہی بتلایا تھا کہ شروع کے عیسائیوں نے بُت شکنی کے جوش میں

یونان و روم کے بہترین مجسّمے توڑ ڈالے۔ بازنطیم کے پادریوں نے بہت لڑائی جھگڑے کے بعد فیصلہ کیا کہ ان پڑھ عوام کو جیزس کے متعلق سمجھانے کے لئے تصویریں بنائیں جائیں ___ مسلمان علماء نے اس قسم کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ چلیے اب کھانا کھائیں۔"

آماں PAGAN ۔بیٹی مولون۔

ڈنر کے بعد ڈرائینگ روم میں واپس آکر اپنے خود کی تلاش میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔"وہ رہا ۔ یوجین کی تحویل میں،" مسز بیگ نے بتایا۔

عنبر نے بک شیلف پر رکھے پورٹریٹ کے نزدیک سے ہلمیٹ اٹھائی۔

"میری ایک سہیلی تھی،" مسز بیگ قریب آکر بولیں۔

منصور نے نقرئی فریم والے دستخط شدہ پورٹریٹ پر نظر ڈالی۔

EUGENE PETERSON, CALCUTTA, 14-9-1928

اطلسی ایوننگ گاؤن ۔ نازک صراحی دار گردن میں موتیوں کی طویل دوہری مالا۔ تیز روشنی میں چمکتے مصنوعی لہروں والے بال۔ باریک پنسل سے بنائی ہوئی بھنویں۔

"ہُولی وُڈ ؟"

"ٹولی وُوڈ ! یعنی ٹالی گنج۔ کلکتہ !! سفید رُوسی۔ فلمی نام اندرآدیوی۔ بے چاری خود کو کسی روسی گرینڈ ڈیوک کی اولاد بتاتی تھی۔"

"ANASTASIA SYNDROME."

"پرتھوی راج اس کے ہیرو ہوا کرتے تھے۔"

"پرتھوی راج ___؟ راج کپور کے باپ ؟"

"بالکل وہی۔"

"آپ تو پٹاری سے ایک سے ایک عجائب وغرائب نکال رہی ہیں۔ اور بتائیے۔"

"بس۔ اتنا آج بھر کے لیے کافی ہے۔"

"منگ پلیٹ۔؟" منصور نے ٹھٹھک کر ایک قاب کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔ لیکن نقلی۔"

خود بہن کر منصور اب ایک مغل کیمیو دیکھنے لگا جو یوجین بیٹرسن کی تصویر اور منگ پلیٹ کے درمیان ایک نقلی یونانی مورتی کے سہارے رکھا تھا۔ عندلیب بانو نے بہادر کو پکارا۔ وہ اندر آکر کافی کے برتن سمیٹنے میں مصروف ہوگیا۔

"یہ تو اوریجنل معلوم ہوتا ہے ـــــ" منصور نے کیمیو کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل اصلی۔"

"امی نے آج اس گھر کا پورا کنڈ کنبڈ ٹور کرادیا۔"

"مس ہولسٹم کا گھر ہے مگر اسکی گھڑیاں ابھی بند نہیں ہوئیں۔" مسز سگب بولیں۔

"اسے اٹھا کر دیکھ سکتا ہوں؟"

"ضرور۔"

"عاج کی بیضوی سطح پر منقش کسی گمنام تیموریہ شہزادی کا مینا تور۔ منصور نے احتیاط سے اٹھایا۔

"اسے دیکھ کر تو وہ کشن گڈھ کی نبی ٹھنی یاد آتی ہے۔"

"آپ آرٹ کرٹک بھی ہیں!" عنبرین بے رواں تبصرہ کیا۔

"ہماری صحبت میں رہیئے گا ہمارے فضائل کا آپکو علم ہوگا۔ الیکن مسز سگب آمیں واقعی راجستھانی اسکول کا سانچ ہے۔"

"شاید کسی جے پوری مصور نے بنائی ہو۔"

"واہ واہ ـــــ سیاہ کاکلیں۔ آب رواں کا دوپٹہ ـــــ جانے کیا کیا زیور۔ آپ کو ان گہنوں کے نام معلوم ہیں؟ بیٹھی قلیان نوش کر رہی ہیں۔ واہ صاحب۔ بڑا نقشے باز نقاش تھا۔ بہت خوب اس قسم کے نوادر کی نقلیں آجکل فائیو اسٹار ہوٹلوں کے آرکیٹیکٹ ڈزیں

بھاری قیمتوں پر بکتی ہیں۔ یہ تو اصلی ہے بیحد بیش قیمت ہوگی۔"

"بڑی قیمتی تصویر ہے بیٹے۔ اسمیں کوئی شک نہیں۔ بہادر یہ ڈبہ لیتے جاؤ۔ کاغذ سمیٹو۔"

بہادر کیک کا خالی ڈبہ اور برتنوں کی کشتی اٹھا کر باہر چلا گیا۔

"کہاں سے خریدی ——— ؟"

پردوں کی ڈوریاں کھینچتے ہوئے عندلیب بیگ نے سادگی سے جواب دیا" یہ میری والدہ مرحومہ کی تصویر ہے۔"

منصور چونک پڑا۔ آنکھیں پھاڑ کر ان بزرگ خاتون کو دیکھا جو دریچے کے پردے برابر کرنے کے بعد اب دیوان کے کُشن درست کر رہی تھیں۔ عنبر کافی ٹیبل پر بکھری اسلامک آرٹ کی کتابیں ترتیب سے رکھنے میں مشغول تھی۔ ایک لحظے کے لئے منصور کو یہ منظر ایک تابلو سا لگا۔ تو یہ دونوں شہزادیاں تھیں۔

اسے وہ بیگم صاحبہ یاد آئیں جنکو پنڈت نہرو نے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے وی۔ آئی۔ پی روم میں قیام کی اجازت دے دی تھی وہ تب سے اپنی اولاد، عملے اور سازوسامان کے ساتھ وہیں مقیم دوسرے مدعیان وراثت اور حکومت ہند سے مقدمہ لڑ رہی تھیں کہ خود کو واجد علیشاہ کی پڑپوتی بتاتی تھیں۔ امریکن اخباروں میں انکے انٹرویو چھپتے تھے۔

لیکن عندلیب بیگ کن غیر مرئی طاقتوں سے اپنا مقدمہ لڑ رہی ہیں ؟ دفعتاً وہ روسی گرینڈ ڈیوک کی اولاد یوجین پیٹرسن عرف اندرا دیوی کے مانند نہایت پراسرار نظر آئیں۔ اس روز بیلی گارڈ میں ان غربت زدہ وثیقہ دار نے غیرت کے مارے اپنا نام نشان بتانے سے احتراز کیا تھا۔ یہ ماں بیٹیاں دولتمند تھیں لیکن انہوں نے بھی آج تک اپنے رائل کنکشن وغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔ صاحبزادی شہوار کے برعکس جو اٹھتے بیٹھتے اپنی سابق جاگیر کے افسانے ——— اس نے کیمیو کی پشت پر لکھا نام پڑھا ——— نواب بیگم۔

یعنی نواب گُلرخ بانو بیگم۔

وہ دل میں مزید خائف اور نادم ہوا۔ اُس شام جب مسز بیگ نے اپنی والدہ کا نام گلرخ بانو بیگم بتایا اس نے مذاقاً کہا تھا ـــــ "گویا گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ کھُل گیا ـــــ" بدتمیزی کی بات۔ مہذّب ہیں۔ خاموش رہیں۔ تیسری چوتھی ملاقات میں انکے ساتھ یہ بے تکلّفی! میں ایک ایل۔ ایم۔ سی۔ مولوی کا بیٹا۔ یہ قدیم ارسٹوکریٹ ـــــ اسی وجہ سے عنبر اتنی بڑی SNOB ہے۔ وہ بھی اس روز والے گمنام نواب صاحب کی گمشدہ دنیا سے تعلق رکھتی ہے ـــــ

منصور نے کیمیو کو منگ تقاب کے نزدیک احتیاط سے واپس رکھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا خود سر پر جمایا۔ ماں بیٹیوں کو گڈنائٹ کہہ کر صدر دروازے کی طرف جاتے ہوتے ایک بار پھر مغل کیمیو پر نظر ڈالی ـــــ نواب بیگم صاحبہ بُک شیلف پر اپنی جگہ متمکّن تھیں۔ ملکہ حضرت محل کی طرح ـــــ پیچوان کی مہنال نزاکت سے سنبھالے ـــــ
یہ فلک کی حقّہ بازی۔

نازنین کج کلاہ کی شبیہ کو پھر غور سے دیکھا۔ اور چونکا۔ کشتی نُما کیپ جو دو پلے سے چلی تو لکھنؤ پہنچ کر ـــــ اسے پہلی گارد والی گفتگو یاد آئی اور وہ بہت حیران ہوا ـــــ کہ خیاطِ فلک کس کی ٹوپی کس کے سر پہ رکھتا جاتا ہے۔ سی دُو پلے ـــــ

(۴)

سرائے طغرل بیگ

دلنواز بیگم و ماہرو بانو بیگم دختران مرزا عثمان بیگ قلعہ معلی - حضرت شاہجہاں آباد۔

سرائے طغرل بیگ میں مشعلوں کا دھواں اور بارود کا دھواں۔ بھٹیارنوں اور باربرداری کے جانوروں کی دہشت زدہ چیخیں۔ ایک زخمی لنگڑا کتا اپنے مردہ آقا کے پاس بیٹھا پنجوں سے زمین کرید رہا ہے۔ شاید قبر کھودنا چاہتا ہے۔ دالان کے ایک گوشے میں ایک دوسرے سے بندھے مردہ مولوی مجاہدین۔ سرائے کے پچھواڑے بیئے کے گھونسلوں کی طرح درختوں سے لٹکتے مزید مقتول مجاہدین۔ رات جب جھکڑ چلا وہ لاشیں گول گول گھومنے لگیں۔ تلنگوں کی کمپنی ان کو بیتال سمجھ کر بہت ڈری۔

اندر سرائے میں سرِ شام بھیرونا چ گیا۔ پھر وہ اپنے بیل پر بیٹھ کر دوسرے شمشانوں کی سمت نکل گیا جن کے مُردوں کی راکھ اپنے انگ پر مل کر سمادھی لگائے گا۔ زبر لگا و تو شو۔ لاش۔ زیر لگا و تو شو۔ ابدی مسرت۔

دین! دین! چلا کر لڑنے والوں کو گورے خاکیوں نے جام شہادت پلایا۔ اب وہ گورے کسی MESS کی بار پر بیٹھے وکٹوریہ کا جام صحت نوش کر رہے ہیں جو اب کوئین ایمپریس اف انڈیا ہے ہونے والی ہے۔ تین شہزادوں کے بریدہ سر حضرت بادشاہ کو پیش کر چکا۔

سرائے طغرل بیگ میں صرف چند جاندار باقی ہیں۔ ایک وہ گھائل کتا جو مسلسل رو رہا ہے۔ ایک زخمی بھشتی جو کٹورا لیے کھسک کھسک کر نیم جاں مولویوں کو پانی پلا رہا تھا۔ (چند منٹ قبل وہ بھی مر گیا) اور ایک سرد تنور میں چھپی دو بچیاں۔ تنور کے گرد ان کا کنبہ لاشوں کی صورت میں موجود ہے۔ ماں باپ جوان بھائی۔ چچا۔ ماموں۔ سب۔

وہ خانم کے بازار سے نکل کر آگرے کی طرف بھاگ رہے تھے سرائے طغرل بیگ میں تلنگوں اور خاکیوں نے آلیا۔ جنگل میں چھپے مجاہدوں نے چار پانچ لال مُنہ والے ٹھنڈے کیے گوروں نے سب کو بھون ڈالا۔ دو بچیاں اس سرد تنور کے اندر چھپ گئی تھیں۔ وہ بلک بلک کر روتی، ماں باپ اور بھائیوں کے لاشے جھانک کر دیکھتیں اور پھر چیخیں مار کر سر اندر کر لیتیں۔ اونٹ بیل خچر سرائے سے بھاگ نکلے تھے۔ ایک روتا ہوا لنگڑا کتا باقی تھا اور دو لڑکیاں۔ حسین گوری چٹی مغل زادیاں۔

روتے روتے ہلکان ہوگئیں۔ بھوک ستانے لگی۔ بڑی نے چھوٹی سے کہا ——

"چپو تو — میں کچھ کھانے کے لئے ڈھونڈتی ہوں" تنور سے اُچکی۔ چاروں طرف مُردے۔ ہیبت زدہ ہو کر پھر سر چھپا لیا۔ چند منٹ بعد ہمت کر کے باہر کودی۔ سلاطینوں کا زاد راہ تلنگے لوٹ کرلے جا چکے تھے۔ بھٹیارنیں غائب۔ شاید ڈائنیں بن کر سامنے پیپلوں پر جا بیٹھیں۔ چولہے سرد۔ پونم کا چاند پھانسیوں والے درخت کے عین اوپر نحوست سے چمک رہا تھا۔ سائیں سائیں کرتا سناٹا۔

اچانک بیلوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹناہٹ۔ باہر ایک رتھ آن کر رکا۔ زنانہ ہنسی کی آواز جو اس ہولناک رات میں کسی چڑیل کا قہقہہ معلوم ہوئی۔ پھاٹک جھکڑ کی وجہ سے آپ سے آپ بند ہو گیا تھا۔ درزوں سے ہری کین لالٹینوں کی روشنی اندر آئی۔ عورت پھر ہنسی۔ بڑی لڑکی کی ذرا ہمت بندھی۔ "چل مہرو۔ چل کر دیکھیں" چھ سالہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے تنور سے باہر کھینچا۔ گود میں اٹھا کر لاشیں پھلانگتی پھاٹک کی طرف چلی۔ کواڑ ذرا سا کھول کر دیکھا ایک گوری دیسی عورت نظر آئی۔ کشمیری شال میں لپٹی۔ رتھ کا پردہ ہٹا کر ایک مونچھیل بلم بردار سے بات کر رہی تھی۔ پیچھے دو بیل گاڑیوں پر چھولداری اور نوکر چاکر۔

دیکھتے دیکھتے بیرونی چبوترے پر جھاڑو دی گئی۔ دسترخوان بچھا۔ کُشن چُنے گئے۔ سُنا ہے جس طرح حاضرات میں نظر آتا ہے —— پہلے بہشتی چھڑکاؤ کرتا ہے پھر شاہِ جنات کا تخت۔ ایک وردی پوش ملازم نے ٹفن باسکٹ کھولی۔ ٹین کے بند ڈبے۔ ڈبل روٹیاں۔

بوتلیں ۔ چھری ۔ چمچے ۔ ماچس سے انگیٹھی سلگائی گئی ۔ حقہ بھرا گیا ۔ چاند کی روشنی میں وہ حبیبہ رتھ سے اتری ۔ بھاری پشواز ۔ ناک میں بلاق ۔ ٹھمک ٹھمک چلتی ، آن کر گدیلے پر بیٹھ گئی ۔ کھانا شروع کیا ۔ پل کی پل میں بھیرو کا شمشان اندر کے اکھاڑے میں تبدیل ہوا ۔ نوعمر لڑکی بچی کو گود میں اٹھائے پھاٹک سے نکل کر ڈرمی ڈری چبوترے کے نیچے پہنچی ۔ اوپر دیکھا ۔ اور التجا کی ـــــ

" اللہ کے واسطے کچھ ہمیں بھی دو ۔ بڑی بھوک لگی ہے ۔"

حبیبہ نے ایک فرنگی ڈبہ اس کی طرف پھینک دیا ۔ بھگدڑ کا زمانہ ۔ ہر طرف بھکاریوں اور بھوکوں ننگوں کی بہتات تھی ۔

" اس میں کیا ہے ؟" لڑکی نے پوچھا ۔

" کھالے ۔ خنزیر نہیں ہے ۔ ہم بھی مسلمان لوگ ہیں ۔" ایک سرخ مونچھ والے آدمی نے جواب دیا ۔ اور غور سے لڑکی پر نظر ڈالی ۔ " اوپر آجا ۔ تو یہاں کیا کر رہی ہے ؟ تیرے ساتھ والے کہاں ہیں ؟"

" اندر سرائے میں ۔"

" یہ سرائے ہے یا بھوتوں کا ڈیرا ـــــ سناٹا پڑا ہے ۔"

" سب سنّا جو رہے ہیں ۔ گھوڑے بیچ کر ۔" لڑکی نے سر اٹھا کر جواب دیا ۔ رتھ پر لہراتے فرنگی بیرق پر نگاہ پڑی ۔ سُن سی رہ گئی ۔ چند گھنٹے قبل بالکل ایسا جھنڈا سنبھالے گوروں نے دھاوا بولا تھا ۔ وہ بچی کو اٹھاتے اٹھاتے پھر پھاٹک کی طرف مڑی ۔ بچی نے فرنگی ڈبہ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا ۔ " آپا ـــــ آپا ـــــ بھوک ۔ اس نے نحیف آواز میں فریاد کی ۔

بڑی بہن نے سرخ کوٹ اور اونچی سیاہ ٹوپیاں ڈانٹے تلنگوں کو اپنی طرف تاکتے پایا ۔ لڑکھڑا کر بچی سمیت چبوترے کی سیڑھی پر گر پڑی ۔

ایک کالا کتا زمین سونگھتا جنگل سے نمودار ہوا ۔ گھاس پہ بکھری مٹن چاپ کی ہڈیوں پر لپکا ۔ ایک اردلی نے اسے پتھر مارا ۔ وہ چیں چیں کرتا تاریکی میں غائب ہو گیا ۔

پورنیا رتھ بان چبوترے کے کنارے سہما بیٹھا تھا۔ وہ چلّایا۔ "دیا رے دیا۔ گجب کر دیہن کھان صاحب۔ کا جانیں بھیرو کا کتا ہو۔ اُدکا مار بھگائین۔"

"ابے نیبرے بھیرو جی تو تُو کہتا ہے بیل پہ سواری کرتے ہیں۔" سرخ مونچھوں والا چیچک رو آدمی بولا۔ وہ کتنا لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔

"چودھری۔ ای دوسرے بھیرو ہوں۔ سنکر بھگوان کے سیوک۔ جہاں انیا چار ہوا نیاتے ہوا اپنے کالے کتے پہ سوار ترنت ہُواں پہنچ جات ہیں۔"

"ابے گھامڑ اتنا انیا چار تو ہو چکا اب تلک کیوں نہ آئے ——" طویل القامت چودھری نے جواب دیا۔

"کو دن پورنیا نہیں تو ——" مہ جبیں پھر ہنسی۔

ہری کین لالٹین مدھم پڑ رہی تھی۔ مشعلیں روشن کی گئیں۔

دیوار کے نیچے ایک بجو نے آنکھیں چمکائیں۔ لڑکی نے سنبھل کر بچی کو گود سے اُتارا۔ وہ اس کے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔

اب ایک سپاہی حسینہ سے مخاطب ہوا۔ "راستے میں کپتان ٹنکر کے گوبندے نے خبر دی تھی کہ طغرل بیگ کی سرا کا مورچہ جیت لیا۔ سب کا صفایا ہو گیا —— تو یہ چھوکریاں کیا آسمان سے ٹپک پڑیں ؟"

"چڑیلیں ہیں گی۔" نندو نے اظہارِ خیال کیا: "چودھری جی ہاتھ جوڑیں۔ پڑاؤ کرنا ہے تو چلو اگلے گاؤں ——"

"چپ احمق بیٹھا ٹرائے جا رہا ہے۔ یہاں اب بھی باغی چھپے ہوتے ہیں تجھے چڑیلیں نظر آ رہی ہیں۔" ایک سپاہی نے بندوق کندھے سے اتارتے ہوئے جواب دیا۔ حسینہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو پیادے رَفل تان پھاٹک کی طرف بڑھے۔ ایک نے ہوا میں فائر کیا۔ چھوٹی بچی بہن سے لپٹ کر چیخی۔ بڑی کے مغل خون نے جوش مارا۔ خشمناک ہو کر گرجی —— "یہ مُردوں کی سرائے ہے مُردہ خورو —— اندر جا کر لاشوں پر گولیاں چلاؤ۔ کُتّو —— بزدل کے بیٹو ——"

سپاہی سرائے کا ایک چکر لگا کر ذرا نادم سے واپس آئے۔ پہرے پر کھڑے ہو گئے۔ سُرخ

مونچھ والا چبوترے کے کنارے بیٹھا زیرِ لب کچھ پڑھ رہا تھا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کر للکارا ——
"عقل کے دشمنو۔ سارے مورچے جیتے گئے۔ دلّی فتح ہو چکی۔ اب مُردوں سے لڑنے کا کیا فایدہ"
پھر اس نے حبیبہ کو ڈانٹا۔ "اری تو کیوں گھبرا گئی۔ مُنّی۔ آرام سے بیٹھ —— رب کا
شکر ادا کر کوئی قافلہ آئے کوئی جائے تو اپنے لیے مُرغ مسلّم لکھوا کر لائی ہے۔ ذرا اس لونڈیا کو
دیکھ۔ جنگل بیابان آدھی رات ہُو کا عالم اور یہ مصیبت کی ماری، لاشوں میں گھری تجھ سے
دو نوالوں کی بھیک مانگ رہی ہے۔ ساتھ ایک ننھی سی جان —— آجا بیٹی —— دونوں اوپر
آجاؤ —— شاباش"۔ اس نے ہاتھ کا سہارا دیکر دونوں بہنوں کو چبوترے پر کھینچ لیا۔ مُنّی
نے ایک پلیٹ اس کی طرف سرکا دی۔ سُرخ مونچھ پھر چبوترے کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور فلسفیانہ
انداز میں آہستہ آہستہ بولا —— "خوب کہا بہت خوب! مُردوں کی سرائے —— لاشوں کے
قافلے ایک دروازے سے آتے ہیں۔ دوسرے سے غائب۔ بیچ میں جو ہے سو نظر بندی
—— لیکن بھٹیارن کو دیکھو! کراتے کے لئے میّتوں سے جھگڑتی ہے۔" پھر اس نے بڑی
لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "بیٹی۔ ڈرمت۔ جب تلک میں زندہ ہوں تم دونوں کا بال بیکا نہیں
ہونے دونگا —— لو پانی پیو ——" اس نے فلاسک سے پانی انڈیلا۔ دونوں ہیبت زدہ
لڑکیاں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ مشعلوں کی روشنی میں وہ علاؤ الدین کے
چراغ سے نمودار ہونے والا جن سا لگ رہا تھا۔ سرخ مونچھیں سرخ چہرہ۔ کانوں میں مُندریاں
کشمشی رنگ کا بڑا سا پگڑ۔ پیازی اور سفید دھاری دار چوغہ۔ عمرو عیّار کی داستانوں والا جیسے
تورانی جن۔ ناک نقشہ مُنّی نامی اس پری چہرہ جیسا۔ گو چیچک نے صورت بگاڑ دی تھی۔ وہ جتنی
مغرور اور سجیں معلوم ہوتی تھی وہ اتنا ہی دردمند اور شفیق۔ عجیب سی باتیں کر رہا تھا۔ درویشوں
جیسی ——

چھوٹی بچّی نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ دونوں بھوک سے نڈھال تھیں۔ لیکن
بڑی بہن نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ کیا پتہ واقعی یہ پری رُو جناتنی ہو۔ اور یہ سرخ
فام شخص جنات۔ لیکن وہ تو بڑی نرمی سے کہہ رہا تھا —— "بسم اللہ کرو بیٹی۔ کھاؤ۔ کیا افتاد پڑی
یہاں کیسے آئے تم بدبخت لوگ —— ؟"

"کل رات شہر سے بھاگے اس سرا میں آن کر چھپے تھے مرزا بھورے کے ساتھ ——"

"مرزا بھورے کی کون ہو؟" چکن روسٹ کی ٹانگ چباتے ہوئے منّی نے پوچھا۔

"آکا انکے عرض بیگی تھے رانی صاحب۔"

'رانی صاحب' پر "منّی" مسکرائی۔ ننھی مہرو بڑی رغبت سے ڈبوں والی فرنگی نعمتیں چکھنے میں جٹ چکی تھی۔

دلنواز حیرت سے اس بدرمنیر کو دیکھا کی۔ لال حویلی میں جہاں بناہ ہولی دیوالی دسہرہ رکھشا بندھن مناتے تھے رجواڑوں کی رانیاں آرتی کی تھالیاں لیے چھم چھم کرتی دیوانِ خاص میں آتی تھیں۔ اس نے تو کنچنیوں کو بھی دور سے دیکھ رکھا تھا۔ جب قلعے میں مجرے ہوتے تھے اور آکا انکا ذکر کرتے تھے۔ جیسے یوسف چونے والی۔ مگر اس شاندار حسینہ کو کوئی چونے والی کہے گا؟ یہ قومِ اجنّہ سے بھی نہیں تھیں قطعی رانی تھیں۔ آدھی رات کو لاؤ لشکر سمیت سفر میں بے خطر مصروف۔

ورنہ حور۔ آسمان سے من و سلوا لیے اتر آئیں۔

"کھاؤ نا میری بچّی ——" سرخ مونچھ نے دوبارہ بڑی شفقت سے کہا "میرا نام چودھری فتح محمد ہے۔ یہ میری بہن ہے منّی ڈرومت۔"

ایک سیاہ فام تلنگا دلنواز کی ڈانٹ سے جلا بھنا کھڑا تھا۔ بندوق کی نالی اسکی طرف کر کے اسے تنگ کرنے کے لیے بولا۔ "تھو رجھٹ پٹ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

دلنواز مہرو کے اوپر جھک گئی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی "میری بہن کو نہ مارنا —— مجھے مار دے —— چل —— چلا گولی —— چلانا بکار۔" وہ ہیجانی آواز میں رونے چلّانے لگی۔ مہرو نے اسکا ساتھ دیا۔ چودھری نے اٹھ کر تلنگے کا گلا دبایا۔ "بدمعاش تیرا کورٹ مارشل نہ کروادوں تو میرا نام بدل دینا ——"

"چھوڑ دیو چودھری۔" رتھ بان نے التجا کی۔ "ای کالا پانی چڑھاتے ہن۔ کپتان ٹنکر کا سموچہ رسالہ ناچت رہا۔ اکی دلّی ہوجیت لیہن۔ انہیں کے سنگ ای ہو ہلّڑ مچاوت رہے۔"

دو اردلی تلنگے کو پکڑ دھکڑ کر پرے لیگئے۔ چودھری دسترخوان پر واپس آیا۔

"توبہ یہ چھوکریاں تو وبال جان ہو گئیں،" مُنّی نے مُنہ بنا کر کہا۔

"چُپ رہ مُنّی۔ سُن بیٹی۔ کیا نام ہے تیرا ——— ؟"

"دلنواز بانو بیگم ———"

"ماشا اللہ۔ ماشا اللہ۔ دلنواز بیٹی۔ تو بیاہی ہے گھر امت۔ کسی کی مجال نہیں جو تجھے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے۔ سُن۔ میں چودھری فتّے کہلاتا ہوں۔ چودھری فتح محمد۔ بڑے بڑے بدمعاش مجھ سے ڈرتے ہیں۔ میری امّاں اللہ بخشے چودھرائین کی گدّی سنبھال چکی تھیں مُنّی میری ہمشیرہ ہے۔ ہم لوگ کرنیل ہیرٹ کے ساتھ بھرت پور گئے ہوئے تھے۔ کرنیل صاحب مُنّی پر بہت مہربان ہیں۔ نہیں سمجھی ؟"

"جی نہیں۔"

"سُن لڑکی۔ یہ میدانِ حشر ہے۔ سارا ہندوستان میدانِ حشر ہے۔ جہاں سر چھپانے کو جگہ مل جائے غنیمت جان۔ ربّ کریم رنگا رنگ وسیلوں سے اپنے بندوں کو رزق پہنچاتا ہے ہمارے لئے بھی وسیلے اس نے مقرّر کر رکھے ہیں۔ ہم راضی برضا ہیں۔ اس زندگی کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کہاں جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دھاڑی اتارا۔ ہم سب کو اپنے اپنے لکھے پورے کرنے ہیں۔ دانے دانے پر مہر ہے۔"

دلنواز کے پلّے کچھ نہ پڑا۔

"ہمارا ٹبّر رنگیلے کے زمانے میں کشمیر سے دلّی آیا تھا۔ ہمارے لیے یہ کشت و خون انوکھی بات نہیں۔ کشمیر میں بھوک بہت تھی اور قتل و خون بھی۔ شاہجہاں آباد پہنچ کر پیٹ تو بھرے ارے تو اتنک بھوکی کیوں بیٹھی ہے ؟"

دلنواز نے ڈرتے ڈرتے ایک مٹن چاپ اٹھائی۔

"آرام سے کھا۔ ابھی فرنگیوں نے تیرے کنبے کو تہ تیغ کیا ابھی تو انکی دی ہوئی رزق۔"

دلنواز نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"ہاتھ کھینچنے سے کچھ نہ ہونے کا بچّی۔ فرنگی کا بخشا ہوا آب و دانہ اب ہم سب کا مقدّر ہے۔" چودھری نے ایک لقمہ بنا کر چھوٹی بچّی کے منہ میں دیا۔ اس نے جمائی لی پوٹ تڑسوا تو

مہر دکو فوراً نیند آگئی۔ چودھری نے بڑے اصرار سے دلنواز کو کھانا کھلایا۔" اچھا تو نے منوری کشمیرن کا نام تو سنا ہوگا۔ کتنی سلاطینوں سے منّی کی یاد اللہ تھی۔"

دلّی فتح ہو چکی۔ سلاطین بھی صیغہ ماضی میں شامل ہوئے۔ اس لفظ پر دلنواز پھر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔ مرزا بھورے، انکا خاندان، اپنا کنبہ آنکھوں میں پھر گیا۔ اور وہ سب چند قدم کے فاصلے پر اس وحشت سرا میں مرے پڑے تھے اور وہ اسی جگہ بیٹھی ولائیتی کھانا اڑا رہی تھی۔ اس نے ایک فلک شگاف چیخ بلند کی۔

چاند غروب ہو چکا تھا۔ زور سے ہوا چلی۔ پچھلے جنگل میں پیڑوں سے لٹکتے نیچے چرچراتے۔ گیدڑ بولے۔ چنڈول چلّاتے ہوئے اوپر سے گذرے۔ دونوں بہنیں منوری کشمیرن کے نزدیک گدیلے پر غافل سو رہی تھیں۔ صبح سویرے کوّا گوہار سے منوری کی آنکھ کھلی تو دیکھا روشن آسمان پر گدھ اور چیلیں اور کوّے منڈلا رہے ہیں دہل کر اپنے بڑے بھائی کو پکارا۔ چودھری ایک طرف کو بیٹھا وظائف میں مشغول تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے بھی اوپر دیکھا اور فوراً عملے کو آواز دی۔ "بندوبست —— ایکدم کوئیک مارچ —— !!"

نندو بیلوں کو چارہ کھلانے کے بعد اب خود چبینا کر رہا تھا۔ نوکر چاکر اور سپاہی گڑھیا کے کنارے مسواک میں مصروف تھے۔ فوجی حکم سنتے ہی جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگے چودھری فتح محمد نے بہن کے قریب آکر اسکے کان میں کہا —— "منّی دیکھنا بچیاں نہ جاگ جائیں۔ چیلوں اور گدھوں کو دیکھ کر انکا دم نکل جائے گا ——" انگلی کے اشارے سے عملے کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ کرنل ہیرٹ کے کمپاؤنڈ کے ملازم چودھری کو مذاقاً رسالدار صاحب پکارا کرتے تھے۔ کہنے والے یوں بھی کہتے تھے کہ چودھری فتح محمد نے اگر دھاڑی کا جنم نہ لیا ہوتا تو یقیناً کوئی بڑا آدمی بنتا۔ سپہ سالار طوائف الملوکی کے زمانے میں کسی ریاست کا بانی یا مدبّر وزیر یا صاحبِ علم و فضل لیکن قسمت میں بدا تھا کہ پہلے بہن کے پیچھے بیٹھ کر سارنگی بجائے اور اب چاوڑی والیوں کے معاملات کا تصفیہ کیا کرے۔ اسکی ماں اصغری کی لارڈ لیک کے انگریز افسروں سے راہ و رسم رہی تھی۔ بہن منوری عرف منّی

عرصے سے سفر و حضر میں کرنل جارج ہیرٹ کے ساتھ رہتی تھی اسکے بڑے بھائی کی حیثیت سے چودھری کو کرنل کا تقرب حاصل تھا۔ اس اعلیٰ افسر کا ذاتی اسٹاف اس سے ڈرتا تھا۔ لیکن چودھری بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ خدا ترس، باور دلیر ——— اماں اپنے بیٹے کی شادی دستور کے مطابق برادری کی ایک لڑکی سے کر گئی تھیں۔ وہ نیک بخت اپنی لڑکیوں سمیت طاعون کا شکار ہوئی۔

دعائیں مانگتا کہ پروردگارِ عالم منوّری کو ایک چاندسی بچی عنایت کرے تاکہ اس قدیم ڈیرے دار گھرانے کی نسل معدوم نہ ہو۔ مگر خدا کی مرضی کہ منوّری لاولد ہی رہیں۔

شاید یہ بھی اچھا ہوا۔ کرنل باپ ہوتا تو وہ لڑکے کو کرسٹان بنا کر کلکتے کے یوریشین یتیم خانے میں ڈال دیتا۔ وہ غریب دوسرے دوغلے چھوکروں کے ساتھ فوجی بینڈ بجاتے عمر گذار دیتا۔ لڑکی جان بازار کلکتہ کی یوریشین لال بی بی کہلاتی۔ خود کو میم سمجھتی ماں اور ماموں کو منہ نہ لگاتی۔

کوچ کے انتظامات کا جائزہ لیتا چودھری چھولداریوں کی بیل گاڑی کی طرف گیا۔ مینجیں گاڑنے اور چولہے کھودنے کے کدال اور پھاوڑے نکالے۔ دو آدمیوں کو حکم دیا فوراً سرائے کے عقبی جنگل میں گنجِ شہیداں تیار کریں۔ ایک لٹھ بند کو نزدیک کے گاؤں دوڑایا کہ چند کلمہ گو مدد کے لئے پکڑ لاتے۔ ایک ناشتہ دان بھرا اور بھاگتا ہوا بہن کے پاس واپس آیا۔ لڑکیاں اب بھی بے سُدھ سو رہی تھیں آہستہ سے بولا۔ "منّو تو اللہ کا نام لے کر گھر جا ——— میں شہیدوں کو دفن کر کے ہی دلّی پہنچوں گا ——— کوئی شکرم مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ پیدل ——— اگر زندہ سلامت نہیں پہنچا تو کہا سنا معاف کیجو اور ان دُکھیاری بچیوں کا زندگی بھر خیال رکھیو ——— فی امان اللہ"

منوّری کی مدد سے دونوں خوابیدہ لڑکیوں کو رتھ پر چڑھایا۔ منوّری کو میدانِ جنگ فتح و شکست کی خونریزی اور پُرخطر حالات میں فوجوں کے ہمراہ طویل فاصلے طے کرنے کی

عادت تھی۔ اس نے لڑکیوں کو رتھ کے غالیچے پر لٹایا۔ خود پشواز سمیٹ کر بیٹھی۔

نندو نے بم بھولا کا نعرہ لگا کر بیلوں کو چابک رسید کیا۔

چودھری فتے سر جھکاتے پگڑی کے شملے سے مونچھیں پونچھتا سرائے طغرل بیگ کی طرف لوٹا۔

قافلہ روانہ ہوا۔
آگے آگے کمپنی کا پرچم لہراتا رتھ۔ چڑھتے سورج کی کرنیں رتھ کے سنہرے کلس سے ٹکرائیں تو وہ جگمگا اٹھا۔ نندو نے رفتار تیز کی۔ برطانوی پرچم صبح کے خوشگوار جھونکوں میں پھٹپھٹانے لگا۔ گاہے بگاہے جلی ہوئی لاشوں کی سڑاند نسیم سحر میں مل جاتی۔

رتھ میں جتے سیاہ بیل، جیسے یم راج کے کالے بھینسے، چھن چھن کرتے خراب آبادِ دہلی کی سمت دوڑنے لگے۔

بیگمان کشمیر عرف کوہ قاف کی پری۔

(۵)

تختِ رواں

دارالسرور رام پور۔ بےنظیر کا میلہ ۱۸۸۱ء۔ حضرت امیر مینائی نے فرمایا۔

امیر جائیں گے ہم بے نظیر آج ضرور خبر ہے میلے میں اس مہ لقا کے آنے کی

منیر شکوہ آبادی اور جلال لکھنوی اس جشن جانفزا کے متعلق مثنویاں لکھ رہے ہیں۔

جان صاحب بولے بدر منیر پھر ہوا میلہ ہے جشن کا پھر بےنظیر باغ میں میلہ ہے جشن کا

نواب مرزا داغ دہلوی نے منی بائی حجاب کو کلکتہ اطلاع بھیجی۔

آ گیا بے نظیر کا میلہ دل پابند وضع کھل کھیلا

میلے والوں میں دھوم تھی میری خوش جمالوں میں دھوم تھی میری

اخبار صولت پرویزی مراد آباد کا اڈیٹر رقم طراز ہے۔

"خوش جمالوں کے پرے نہر پر جمع ہیں بجروں پر سیر کر رہے ہیں۔

ہر غیرت ناہید کی پری تانیں اندر کے اکھاڑے کا سماں باندھ رہی ہیں فسوں ساز آتشبازی سے منور باغات میں خیال کے انار ٹھمری کی پھلجھڑیاں دادرے کی ہوائی گلریز ہواؤں کے ہمدوش ہیں۔ جنت نگاہ یہ فردوس گوش ہے۔

حضور نواب کلب علی خاں بہادر دام اقبالہ کے مہمانان گرامی میں مہاراجہ ہولکر آف اندور، مہاراجہ ڈگ بجے سنگھ آف بلرام پور (اودھ) اور ہز ہائی نس نواب صاحب سہراب نگر رامپور میں ہنوز تشریف فرما ہیں۔

"کل رات یکتائے روزگار مود ھو طبلچی کی سنگت میں (قدر پیا) کی ایک بندش (ہٹو چھیڑ دو نہ موری نیندا اچٹ جات) دلی کی بی دلنواز اس شوخ و شیریں کار شہر آشوب نے اس ادائے دلبری سے ادا کی کہ دریادل نواب صاحب سہراب نگر نے مالا مروارید کی

اپنے گلوئے مُبارک سے اتار کر فی الفور بی صاحبہ کو عطا کی۔ دو شالہ مودھو طبلچی کو عنایت فرمایا۔ کیوں نہ ہو۔ ع ہے پکھاوج میں دھوم مودھو کی

"رامپور دربار کی جادو گری، جھُومن اور بی ممّی کلکتے کی بی ننھّی، لکھنؤ والی شاعرہ خوش نوا ہنگین جان، دلّی کی امیر جان میلے میں جلوہ آرا ہیں۔ مگر حق تو یہ ہے کہ امسال اس جشن دل افروز کی جان بی دلنواز ہی ہیں کہ بحیثیت جانشین منوّری کشمیرن اپنی خالہ کا نام منوّر کر رہی ہیں۔ میلے کے تھیٹر میں "کوہ قاف کی پَری" بنی ہیں۔"

گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے دلنواز بغور سُن رہی تھیں۔ چودھری فتّے ملّاح کے نزدیک بیٹھے پان بنانے میں مصروف تھے۔ کشتی نہر کے کنارے روشن گیس لیمپ کے نیچے رکی ہوئی تھی نیند کی ماتی مہرو نے اخبار ہاتھ سے رکھ کر جمائی لی "آگے چلو!" دلنواز نے ملّاح کو حکم دیا۔ بجرا چل پڑا۔ اگلے لیمپ کے نیچے پہنچ کر پھر رکا۔ مہرو نے اخبار اٹھایا۔

"ناظرین باتمکین۔ آج کی بات معلوم ہوتی ہے۔ غدر کو فرو ہوئے محض آٹھ سال ہوئے تھے نواب یوسف علی خاں ناظم نے دلّی کی پھول والوں کی سیر کی تقلید میں اس فرح بخش میلے کی بنا ڈالی۔ مرحوم دربار مُغلیہ کی شان و شوکت کو اپنے دربار گہر بار کے آداب و رسوم کے ذریعے دوبارہ زندہ کیا۔ جانِ عالم کے دورِ تعیّش کی تجدید فرمائی۔ دلّی اُجڑ چکی۔ لکھنؤ مٹ گیا۔ مگر خداوند تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آفتاب برطانیہ کی ضیا پاشی کی بدولت رامپور اور دیگر نیٹو ریاستوں کی رونق ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ فلاکت زدہ شعراء، علماء و فضلاء اہل صنعت و حرفت، باکمال گویّے اور رقاصائیں قدر شناس والیانِ ریاست کی سرپرستی اور جود و سخا سے فیض یاب ہو رہی ہیں۔ فی الوقت سات سَو نامی گرامی گویّے اور تنت کار رامپور دربار میں ملازم ہیں۔ ہمارا کارسپانڈنٹ مقیم رامپور کوسی ندی کے پار سے رقم طراز ہے کہ حضور نواب صاحب یوسف علی خان جنّت مکانی نے شاہانِ مغلیہ کی تقلید میں جو "محکمہ اربابِ نشاط" قائم کیا تھا وہ بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ نواب مرحوم کے عہد حکومت میں اس محکمے کی افسرِ اعلیٰ داروغہ محبوب جان خود ایک بلند پایہ

مغنیہ تھیں۔ تائب ہونے کے بعد نواب صاحب مرحوم کے ہمراہ حج کر آئی تھیں۔ شہر رامپور میں ایک وسیع مسجد انھوں نے تعمیر کروائی ــــ"

"منّی بھی چاہتی تھی کہ کوئی کارِ خیر کر جائے۔ افسوس۔ بے وقت موت نے مہلت نہ دی"۔

چودھری فتّے نے مضمون سنتے سنتے آہ سرد بھری۔ "آگے پڑھو بیٹی مہرو ـ "

"بس ماموں جی۔ اتنی کم روشنی میں سُجھائی نہیں دیتا سر میں درد ہونے لگا۔"

بجرا جگمگاتی نہر کا چکر لگاتا رہا۔ کچھ دیر بعد دلنواز نے کہا " ماموں جی ــــ یقین نہیں آتا ــــ انہی آنکھوں نے پھانسیوں کے کھڑکھڑاتے جنگل دیکھے "

"ان نینوں کے یہی پریکھ ــــ" چودھری نے جواب دیا۔

"دکھیارا بادشاہ رنگون میں بوریہ نشین رہا"

"چپ "

نواب کے مہمان انگریزوں میموں سے لدی ایک کشتی پاس سے گذر رہی تھی۔

دلنواز نے پرواہ نہ کی کہتی رہیں ــــ" فرزند دلبند دولت انگلشیہ مزے اُڑا رہے ہیں ــــ جانِ عالم کے دورِ تعیش کی تجدید ــــ !! "

"کہ عالم دوبارہ نیست۔" چودھری فتّے نے مختصراً کہا۔

"سبھی مزے کر رہے ہیں سوا ان کے جو کالے پانی میں قید ہیں یا جن کے عزیز دار پر لٹک گئے ہم بھی تو عیش کر رہے ہیں۔ اپنے پیاروں کو بے گور و کفن چھوڑ کر۔" مہرو بولی " اگر ماموں جی تے اپنی جان پہ کھیل کر انکی تدفین نہ کی ہوتی۔"

بجرا کنارے پر پہنچ گیا۔ نواب صاحب سہراب نگر کی معتمد خاص خان پری لیمپ کے نیچے منتظر تھی۔ دلنواز کلی دار پائجامے کے پائنچے سنبھال کر کنارے پر اتریں۔

" بی صاحبہ۔" خان پری نے قریب آن کر سرگوشی کی " سرکار کل صبح واپس تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ سے قطعی جواب طلب فرمایا ہے۔"

دلنواز چپکی کھڑی رہیں۔ پھر اثبات میں سر ہلایا۔

خان بری فوراً میلے کی بھیڑ میں غائب ہو گئی۔ دلنواز اور مہرو فٹنس میں بیٹھیں۔

"یہ کیا آپا — تم نے تو ہتھیلی پر سرسوں جمالی۔"

"نیک کام میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ مجھے تو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا۔ بائیس سال ذلت کی زندگی بسر کرنے کے بعد اللہ مجھے عزت بخش رہا ہے۔"

"اماں منوری زندہ ہوتیں کبھی یہ رائے نہ دیتیں۔ سُنا ہے کہ یہ نواب لوگ جس حرم سے خفا ہوتے ہیں اسے کوٹے مکھی بنا دیتے ہیں۔"

دلنواز نے باہر جھانکا چند والیانِ ریاست فٹنوں میں سوار ہو رہے تھے۔

"ان مُوؤں کو دنیا جہان میں اور کسی بات سے غرض نہیں۔ ہر وقت ایک ہی دُھن — عورت — عورت — توبہ" مہرو نے مُنہ بنایا۔

"ابھی تم پڑھ تو رہی تھیں۔ برطانیہ سر پہ سلامت ہے اخبار چی چین لکھتا ہے۔ پہلے ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی کر لیا کرتے تھے اب اس سے بھی فرصت۔"

"تمہارے والے بھی ایسے ہی ثابت ہوں گے اور کوئی نظر میں سمائی اور تمہارا پتہ کٹا۔"

"مہرو، منوری، دہ گرگ باراں دیدہ، بھی یہی کہتیں۔ اصل وارث تو ان کی تم ہو میں اس منصب کے لائق نہیں۔"

"مگر آپا۔ ہفتہ دس روز لی صاحب سلامت اور بڑھو نے تم کو نکاح کا پیغام"

"مہرو۔ نواب صاحب بڑے نیک نام رئیس ہیں۔ پابند شرع۔ دو بیگمات محل میں موجود ہیں۔ تیسری میں ہوں گی۔ اپنے مذہب کے مطابق ممنوعات تک تو رکھتے نہیں۔"

"پردے میں دم بخت ہو جاؤ گی ساری عمر کے لئے۔ اور چوتھی جو آ گئی تو —"

"منظور۔ اب مجھ سے رئیسوں کے سامنے کھڑے ہو کر مُبارکبادیاں نہیں گائی جاتیں بہت ہو لیا۔ بائیس ۲۲ برس۔"

منوری کشمیرن نگوڑی ناٹھی مریں۔ مُنہ بولی بیٹی دلنواز کو اپنی جائیداد کثیر کا وارث قرار دے گئی تھیں۔ ان کا اور ان کی ماں اصغری کا واسطہ زیادہ تر فرنگی فوجی

افسروں سے رہا تھا۔ چاآوڑی میں اصغر کشمیرن کی طرح منوّری بھی برادری کی چودھرائن بن چکی تھیں۔ سُرخ مونچھوں والے رواقی برادر بزرگ فتّے دھاڑیوں کے سردار کی حیثیت سے عرصے سے چودھری فتح محمد کہلا رہے تھے۔ دلنواز اور مہرو کی اسی شفقت سے نگرانی کرتے تھے جس شفقت اور دلسوزی سے انھوں نے سرائے طغرل بیگ کی اس ہولناک رات ان بہنوں کی دستگیری کی تھی۔ چاآوڑی میں ماموں جی کہلانے لگے تھے کہ دلنؔواز اور مہؔرو انھیں ماموں جی کہتی تھیں۔

دلنؔواز بھی منؔوری کی طرح ٹھاٹھ باٹ سے سفر کرتیں۔ اب بہلی اور رتھ کے بجائے آگ گاڑیاں چل رہی تھیں۔ نامہ بر کبوتر رٹیا ئیر ہو کر ٹیلی گراف کے تاروں پر جا بیٹھے تھے۔

نواب کلبؔ علی خان کے رامپور سے دلّی واپس پہنچے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ نواب صاحب سہراب نگر کے چیف سکریٹری کا تار ملا۔ ہز ہائی نس یاد فرماتے ہیں فوراً پہنچئے۔

اس مبارک و مسعود سفر میں نہ خاں صاحب اور سازندے ہمراہ تھے نہ خادمہ الؔبیلی۔ البتّہ ماموں جی۔ سہراب نگر ایک مین لائن پر پڑتا تھا۔ اسٹیشن پر چیف سکریڑی صاحب اور خانؔ بری استقبال کے لئے موجود۔ کمپارٹمنٹ کے دروازے سے سیٹیں تک سفید کٹاؤ کے کام کی سرخ قنات لگائی گئی۔ دلنؔواز نے بسم اللہ کہہ کر دایاں قدم پلیٹ فارم پر رکھا۔ قنات کے باہر چودھری فتّے پگڑی کے شملے سے خوشی کے آنسو بار بار پونچھا کئے۔ فینس کے بعد دوآبہ ــــــ درمیانی پردے دار کوچ میں دلنؔواز اور خانؔ بری۔ اگلی میں چیف سکریڑی۔ پچھلی میں اہلکار اور چودھری فتّے۔ کیا شاندار قافلہ تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ سورج سرخ پہاڑیوں کے پیچھے چھپتا جا رہا تھا۔ مخملیں پردے کی اوٹ سے جھانکا سپاٹ چٹیل میدان میں سڑک پر سے گذرتی تینوں گھوڑا گاڑیوں کے طویل متحرک سائے ایسے معلوم ہوئے جیسی سیاہ پرچھائیوں کی تصویریں۔ جو انگریزی کتابوں میں دیکھی تھیں۔ دلنؔواز نے سوچا گویا شیؔریں خسرو پرویز سے بیاہ کرنے جا رہی ہو۔ یا لالہ رخ کا کارواں۔

بھورے ٹیلوں کے پیچھے چند مقابر نظر آتے۔ پھر ایک وسیع، کائی آلود تالاب اُس پار سہراب نگر کا بازار۔ اُفق کے قریب ایک پہاڑی پر پھیلی قلعے کی عمارتیں۔
سرسبز باغات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹھنڈی سڑک پر پہنچ کر حکام اعلیٰ اور برٹش ریذیڈنٹ کی کوٹھیوں کے سامنے سے گذرتی کوچ شاہی گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک میں مڑ گئی کوٹھی پر پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ دست بستہ عملہ برآمدے میں مستعد کھڑا تھا۔

دوسرے روز ۔۔ نماز ظہر پڑھ کر سرکار جامع مسجد سے واپسی میں تشریف لائے۔ دلنواز اور ان کے ماموں جی سے رسمی پر تکلف گفتگو کے بعد قلعے چلے گئے۔ خان پری روز آتی۔ خان پری اور اس کا شوہر نسلاً کُرد تھے۔ اور سرکار کے جاں نثار ملازم۔ ہز ہائی نس کی والدہ ان دونوں کو نجف اشرف سے ہمراہ لیتی آئی تھیں۔ خان پری کے شوہر کو سرکار کے باڈی گارڈ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ خان پری جب بے نظیر کے میلے میں دلنواز سے ملی تھی اسے بی صاحبہ کہتی تھی اب انکو خانم کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ چند روز بعد سرکار کہے گی۔
چودھری فتح محمد اپنے کمرے میں بیٹھے دن بھر بوستان خیال پڑھا کرتے۔ دلنواز اپنی خوابگاہ میں وکٹورین چھپر کھٹ کے اوپر نیم دراز اپنے بوستان خیال کی سیر میں مگن رہتیں اور خان پری کی راہ دیکھا کرتیں۔
یہ کُرد عورت نوعمری میں ہندوستان آگئی تھی۔ صاف اردو بولتی تھی۔ سرکار کی شرافت اور کریم النفسی اور قلعے کی سازشوں کے قصے سناتی۔ ہز ہائی نس دوسرے والیانِ ریاست کے برعکس نہ عیاش تھے نہ ظالم۔ دلنواز خانم کا حُسن، اور شریفانہ انداز و اطوار ان کو بے حد پسند آئے تھے۔ ایک لکھنوی سوز خواں کی شاگرد رہ چکی تھیں۔ ایک جمعرات رامپور کی ایک نجی مجلس اعزا میں اس لاثانی فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہز ہائی نس سہراب نگر گانے سے زیادہ ان کی سوز خوانی پہ ریجھے تھے۔
سرکار اپنی بیوہ بہن کو بہت مانتے تھے۔ اہم معاملات میں ان سے صلاح مشورہ لیتے ۔۔۔ دونوں بیگمات، سینیئر اور سکنڈ ہر ہائی نس مدمّغ نواب زادیاں تھیں شہزادی

خانم کی اپنی بھاوجوں سے بالکل نہیں بنتی۔ خاص کر چھوٹی بھاوج سے۔ اس وجہ سے وہ قلعے سے باہر اپنے ذاتی محل میں رہتی ہیں اور بے حد خوش کہ بھیا ان پر سوت لا رہے ہیں

دلنواز خانم کے لئے علیحدہ محل آراستہ کیا جا رہا ہے۔ ہیروں کا تاج بنوایا گیا ہے۔ ان کا ذاتی اسٹاف منتخب ہو چکا ہے۔
ایک شام خان پری نے قلعے سے آن کر اطلاع دی: عقد اگلے جمعے کو ہوگا۔ دلنواز خاموش رہیں۔ رئیسوں کی شادیوں میں جا کر گایا بہت تھا۔ یہ معلوم نہ تھا اس قسم کی سچوئیشن میں خود کیا کرنا یا کہنا چاہیے۔ چودھری فتنے بھی کچھ نہ بتا سکتے تھے ان کے ڈیرے دار خاندان میں سات پیڑھیوں سے کسی لڑکی کی شادی نہ ہوئی تھی۔ اب دلنواز نے دن بھر عبادت کرنا مناسب جانا۔ جونیئر بیگم صاحبہ۔ ہیروں کا تاج۔ شکرانے کی جتنی نفلیں پڑھتیں کم تھا۔

بدھ کی شام۔ پانچ کا عمل رہا ہوگا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ چند سکنڈ بعد بیڈ رُوم کا بھاری مخملیں پردہ ہٹا کر خان پری نمودار ہوئی۔ بوستانِ خیال کی پری۔ تنگ موریوں والی گھیردار شلوار۔ کمر میں ٹپکا۔ چرمی پیٹی میں اُڑسا مُنّا سا مرصّع خنجر۔ مخملیں جیکٹ۔ سر پر پگڑی نما دوپٹہ۔ کوہ قاف کی کسی پری کی اماں۔ مسکرا کر بولی "خانم سرکار نے گاڑی بھجوائی ہے۔ اندھیرا پڑے ٹھنڈی سڑک پر ہوا خوری کر آئیے گا۔ اور یہ سرکار نے ایک خط آپ کے نام بھیجا ہے۔"
ٹپکے سے خریطہ برآمد کیا۔ خریطے سے سربمہر لفافہ نکال کر پیش کرتے ہی واپس مڑی۔
"اے بی بھاگی کہاں جاتی ہو——" دلنواز نے دریافت کیا۔
"سرکار نے فرمایا ہے آپ کو پرچہ دے کر فوراً شہزادی خانم کی خدمت میں جاؤں۔ ایک خط ان کے نام ہے۔ جمعے کے روز وہ 'لڑکی والی' بنیں گی۔ آپ کی طرف سے۔"
"اچھا" دلنواز نے کہا۔ پھر جھینپیں

"شہزادی خانم باغ باغ ہیں۔ چھوٹی بیگم پر سوتن آرہی ہے۔"

"اچھا۔"

"نند بھاوج کا رشتہ ہی ایسا ہے۔ خانم۔ ایک دوسرے کی دشمن ہوتی ہیں۔"

"اچھا؟ ہاں ہاں ٹھیک کہتی ہو خان پری۔"

ساس نندوں کی شکایتوں سے پُر ٹھمریاں دادرے بہت گائے تھے۔ مگر ان رشتوں سے بھرا پُرا کنبہ کب کا تہ تیغ ہو چکا ــــ بالاخانوں کے مادری نظام میں رشتوں کی نوعیت مختلف تھی۔

خان پری رخصت ہوئی۔ دلنواز نے سرکار کا مراسلہ لفافے سے نکالا۔ نہ القاب نہ تمہید۔ نمبر وار چند اطلاعات ــــ ۱۔ مہر مبلغ ایک لاکھ سکہ رائج الوقت۔ ۲۔ ہر ہائی نس نواب دلرس محل خطاب۔ (صاحب ریذیڈنٹ بہادر نے تھرڈ ہر ہائی نس کے مرتبے کی منظوری دیدی ہے۔) ۳۔ شادی کے بعد محض اپنی ہمشیر مسماۃ مہرو اور اپنے ماموں چودھری فتح محمد سے گاہے بگاہے ملاقات کی ہماری طرف سے اجازت ہے۔

۳ کو دوبارہ پڑھا۔ چہرے کا رنگ بدلا۔ گردتخواص دروازے پر پہنچ چکی تھی۔

"ذرا ٹھہرنا۔ مجھے بھی سرکار کو ایک خط بھیجنا ہے۔ بے حد ضروری۔ فوراً جا کر ان کے ہاتھ میں دو ــــ پہلے قلعے جاؤ۔ پھر شہزادی بیگم کے ہاں چلی جانا۔" دلنواز نے حکم دیا۔ وہ اسی لمحے سے اپنے آپ کو ہر ہائی نس سمجھنے لگی تھیں۔

"خانم قلعہ اڑھائی میل دور ہے۔ کب گئی اور کب آکر شہزادی خانم کے گھر پہنچی۔ وہ تو اسی طرف رہتی ہیں۔" خان پری نے جواب دیا۔ اس نے ایسی ایسی بہت دیکھی تھیں۔ "آپ خط لکھ رکھیے۔ باہر گھوم آئیے۔ آٹھ بجے تک آکر لے جاؤں گی۔ سرکار نو بجے خاصہ تناول فرماتے ہیں۔ اس وقت میرا وہاں ہونا لازمی ہے۔"

خان پری کے جاتے ہی دلنواز خط کا جواب لکھنے بیٹھیں ــــ

"سرکار۔ شرط ۳ کی بابت کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔ چودھری فتح محمد میرے ماموں نہیں ہیں۔ میرے ماموں جان مرزا طہماسپ نقشبند اور میرے والد مرزا عثمان بیگ غدر

میں شہید ہوئے - اپنے بزرگوں کی روحوں کو شرمانا نہ چاہتی تھی - آج تک کسی پر اپنی اصلیت ظاہر نہ کی - حتیٰ کہ آپ کو بھی نہ بتلایا - نکاح نامے پر میرے والد کا نام مرزا عثمان بیگ لکھوائیے گا - اس بدبخت بندی کی داستان رنج و محن یوں ہے — اپنا قصہ قلمبند کر کے خط لفافے میں رکھا - چودھری فتّے نے اندر آ کر کہا "بیٹا گاڑی بہت دیر سے تیار کھڑی ہے۔"

کوچ کوٹھی سے نکل کر مال روڈ کی طرف روانہ ہوئی - شام ہو چکی تھی - ڈوبتے سورج کی کرنوں نے درختوں کو سنہرا کر دیا تھا - سڑک خاموش پڑی تھی - گاڑی کے اندر بھی خاموشی طاری تھی — چودھری فتّے اندر بیٹھے تھے خان تّری کا طویل مونچھوں والا مسلح کُرد شوہر کوچ بکس پر متمکن تھا -

گاڑی ایک میل دور نکل آئی - دلنواز نے باہر جھانکا - پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے عجیب و غریب فخر و مسرت کا احساس ہو رہا تھا - جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی -

سامنے وہی مقبرے نظر آئے جو ریلوے اسٹیشن سے آتے ہیں دُور سے دکھلائی پڑتے تھے - سب سے اونچے گنبد پر گھاس اُگ آئی تھی -

"کوئیل کا مقبرہ -" چودھری فتّے نے بتایا -

"اے ہے - چھوٹی سی مُوئی کوئیل اور اس کا اتنا بڑا مقبرہ - نبسوں کے بھی کیا چونچلے ہیں!"

"بیٹی یہ کوئیل چڑیا نہیں ایک بنگالن تھی - سرکار کے پردادا کے حرم میں داخل تھی ایک روز انھوں نے اسے سوتے میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔"

"ہے — ہے - کیوں ؟"

"شک ہو گیا تھا - بعد میں معلوم ہوا بیقصور تھی - پچھتائے اور مقبرہ بنوایا - ہماری والدہ خدا ان کو بخشے شاہی کے لکھنؤ میں رہ چکی تھیں ان سے کتنے واقعات ایسے سنے اور خود دیکھے ایک کنیز تھی صبح دولت — غازی الدین حیدر کی ملکہ بادشاہ بیگم نے اسے انتہائی اذیت دے دے کر ہلاک کروایا — بیگم سمرو کو اپنے یورپین شوہر اور ایک کنیز کے متعلق شبہ ہو گیا تھا اس بے چاری کو قتل کروا کے اپنی مسہری کے نیچے گاڑا -

"تم تو بیٹا انگریزی راج کی امی جی میں جوان ہوئی ہو۔ دلی میں رہتی ہو۔ نیٹو ریاستوں کے حالات اب بھی وہی ہیں جو پہلے ہمارے بادشاہوں کے ہاں تھے۔ انگریزی قانون یہاں لاگو نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو اپنی من مانی کرنے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔"

"یہ بھی تو ایک چھوٹا سا لکھنؤ ہے۔" دلنواز نے باہر جھانک کر کہا۔

"ارے یہ کیا خاک لکھنؤ ہے ہم لوگوں نے غازی الدین حیدر سے لے کر جانِ عالم تک کا زمانہ دیکھا ہے۔ جب بھی میجر بار ٹلے کے ساتھ اماں لکھنؤ جاتی تھیں۔

"بیٹا اماں اتنی کسبیوں کو جانتی تھیں انکے دیکھتے دیکھتے لکھنؤ کے بادشاہوں کی ملکائیں بن گئیں۔ سلطان محل۔ پھول محل۔ بادشاہ محل۔"

"مجھے سرکار دلرس محل کا خطاب دینے والے ہیں۔" دلنواز نے کہا

"مبارک ہو۔ بھجو ڈیرے دار کی لڑکی حسینی نصیر الدین حیدر کی جاہ وحشمت والی نواب خورشید محل۔ اور آجا گر۔ بیبا جان۔ مندرا۔ سندر۔ ڈوم دھاڑی کروڑپتی ہو گئے۔"

"آپ کی والدہ حرم سلطانی میں نہ پہنچ پائیں؟"

"کیا ہوتا کیا نہ ہوتا سب مقدر کا کھیل ہے۔ جارج والٹرز کانپور کا ایک انگریز فوجی تھا۔ اس کی لڑکی نصیر الدین حیدر کو بھاگئی —— نواب مخدرہ علیا۔

"ماں والد صاحب کے مرنے کے بعد علی بخش طبلچی سے واسطہ رکھتی تھی۔

"بادشاہ نے اس کا نکاح علی بخش سے کروا دیا۔ نواب مخدرہ علیا کی وفات کے بعد انکے سوتیلے باپ انکی زبردست جاگیر پر قابض ہو گئے۔

"ایک بار جب اماں میجر کے ساتھ لکھنؤ جارہی تھیں انھیں اٹھوانے کی کوشش ناکام —— کہاں کا شاہی حرم —— سب مقدر کا کھیل۔ بیٹی یہ گونج کیسی سنائی دے رہی ہے۔ زمین آسمان جھنجھنا اٹھے۔ تو سن رہی ہے؟"

مقبروں کا چکر لگا کر کوچوان بگھی ٹھنڈی سڑک پر واپس لایا۔

دور قلعے کی طرف سے توپیں سر ہونے کی آواز آئی۔ بوم۔ بوم۔ بوم ——

دلنواز مسکرائیں۔ شادی کی خوشی میں گولے باد ہوائی آج ہی سر ہونے لگے۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ سہراب نگر۔ چار ––– پانچ ––– چھ –––

لیکن کوچوان کو کیا ہوا کہ فوراً گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور گاڑی موڑ کر تیز رفتار سے ریذیڈنٹ کی کوٹھی کی طرف بڑھا۔

سات ––– آٹھ ––– نو –––

گاڑی کوٹھی سے کچھ دور پر رک گئی۔ گُرد رسالدار کوچ بکس سے کود کر پھاٹک کی طرف دوڑا۔ ریاستی فوج کا ایک شہسوار دستہ قلعے کی سمت بھاگا جا رہا تھا۔ چودھری گاڑی سے اتر کر سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ دلنواز تعجب اور دلچسپی سے باہر جھانکتی رہیں کچھ دیر بعد رسالدار سر جھکائے آہستہ آہستہ کوچ کی جانب آیا۔ چودھری سے کچھ کہا۔ چودھری نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ زیر لب کچھ پڑھا۔ کھڑکی کے نزدیک آئے۔ دھیرے سے بولے۔ "اللہ کی مرضی۔ بیٹی سرکار جنّت کو سدھارے۔"

دلنواز چند سیکنڈ تک چودھری کو تکتی رہیں۔ پھر کہا۔ "کیا ––– ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ افواہ ہو گی۔" منتظر تھیں کہ بوڑھا بھی اس خبر کی تردید کرے۔ وہ خاموش رہا۔ اب اس اطلاع کا اثر شروع ہوا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ چکر۔ گھوڑا گاڑی طوفان کے تھپیڑے کھائی گول گول گھومتی سرپٹ دوڑی۔ چودھری باہر کھڑا بکے جا رہا تھا۔ بیٹی یہ دنیا مُردوں کی سرائے ہے۔ وغیرہ۔ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ یا میرا دماغ چل گیا۔ یہ کیا بک رہا ہے۔ بڈھا کنجر۔ کل جیبھا۔ کم ذات۔ دُور پار کوئی مرتا ہے تو گولے دغا کرتے ہیں؟ توپیں تو میرے بیاہ کی خوشی میں سر کر رہے ہیں۔ سلامی کی گیارہ توپ۔ اور یہ بکتا ہے کہ خدانخواستہ سرکار کے دشمن۔ چودھری فتّے نے کوچبن سے کہا گیسٹ ہاؤس واپس چلے۔ سوچا اب یہاں سے جلد از جلد بھاگنا چاہیئے۔ کل صبح تک جانے کیا ہو کیا نہ ہو۔ فرنگی نے ان رئیسوں کو مطلق العنان کر رکھا ہے۔ نیٹو ریاستوں کے معاملات بہت دیکھے تھے۔ ولی عہد کی اپنے سوتیلے بھائیوں سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔ ریذیڈنٹ ابھی

قلعے میں موجود ہے۔ فوجیں حرکت میں آچکی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔ خان پری کا شوہر کوچ بکس پر واپس گیا۔ چودھری جی گاڑی کے اندر مقابل کی سیٹ پر آبیٹھے۔ دروازہ بند کرکے پردے برابر کیے۔ دلنواز سر تھامے بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر بعد بولیں۔" ماموں جی۔ میں نے گنا۔ گیارہ توپ۔ ہماری گیارہ توپ کی سلامی ملکہ کی طرف سے مقرر ہے نا۔"

چودھری نے ملائمیت سے کہنا شروع کیا:" بیگماں بیٹے۔ سُن یہ جو ریاست تھی نا۔"

"تھی کیا مطلب۔ اللہ رکھے ہے۔ ہماری اسٹیٹ سہراب نگر ——"

"بیٹی! رسالدار صاحب ریذیڈنسی سے سناؤنی لائے ہیں۔ خان پری کو تیرے پاس بھیجنے کے بعد سرکار نے دیوان صاحب اور ریذیڈنٹ صاحب کو طلب فرمایا۔ ان سے گفتگو کرتے رہے۔ اچانک طبیعت بگڑی۔ محل کا فرنگی ڈاکٹر فوراً پہنچا۔ سب جتن کیے۔ مگر سرکار کا اوپر سے بلاوا آچکا تھا —— بیٹا دہ توپیں سرکار کے مرتے ہی ولی عہد کی تخت نشینی کی خوشی میں داغی گئیں۔ نئے رئیس کو سلامی دی گئی تھی۔"

دلنواز غور سے چودھری کو دیکھتی رہیں۔ گیس کے لیمپ میں ہوا بھرتے جاؤ تو وہ رفتہ رفتہ روشن ہوتا ہے اسی طرح بوڑھے دھاڑی کے الفاظ ذہن کے دھندلکے میں اجاگر ہوئے ——

چودھری اب خوفزدہ آواز میں سرگوشی کر رہا تھا —— "بیگماں بیٹی۔ کوٹھی واپس پہنچتے ہی اسباب باندھ لے۔ صبح تڑکے یہاں سے بھاگ نکلیں۔ تانگہ یکہ کریں گے اسٹیشن پر جو ریل گاڑی ملی اسی میں بیٹھ جائیں گے۔ سُن رہی ہے؟ مجھے سب حالات یہاں کے معلوم ہو چکے ہیں۔ دو پارٹیاں ہیں۔ ایک چھوٹی بیگم اور ان کے لڑکے کے طرفدار۔ دوسری شہزادی بیگم کی پارٹی۔ تجھ سے نکاح کرنے پر سرکار کو شہزادی بیگم نے اُکسایا تھا۔ دونوں پارٹیوں میں بہت خون خرابہ ہوتا ہے۔"

دلنواز چپ رہیں۔ چودھری سمجھانے میں مصروف تھا:"اس ریاست نے سارے طور طریقے شاہانِ اودھ کے اپنا رکھے ہیں۔ وہ بہادر لوگ موت سے بہت ڈرتے تھے —— سُن رہی ہے؟ مُردوں کی سرائے میں رہتے تھے اور موت سے ڈرتے تھے۔ جب ایک

شاہ اودھ کا انتقال ہوتا وراثت کے جھگڑوں کے ڈر سے اس کا بیٹا فوراً تخت نشین ہوجاتا دوسرے دن وزیر اعظم دربار میں حاضر ہو کر عرض کرتا ــــ ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہو گیا ہے ۔ جہاں پناہ اس کی تجہیز و تکفین کے لئے کچھ امداد فرمائیں ۔ نیا بادشاہ خزانہ عامرہ سے ایک رقم عطا کرتا ۔ باپ کی لاش چور دروازے سے نکالی جاتی ۔ غسل میت تک محل میں نہیں دیا جاتا تھا ۔"

بُت بنی سنا کیں ۔ چہرہ جذبات سے عاری ۔ آنکھیں خشک ۔

بوڑھا کنجر گیس کی لالٹین کی طرح سنسناتا رہا ۔ "یہاں بھی کل صبح دربار میں حاضر ہو کر دیوان بہادر عرض کریں گے ایک غریب الوطن مسافر کا ــــ وغیرہ ۔"

کوچ اب تالاب کے کنارے سے نکل کر بازار سے گذر رہی تھی ۔ دفعتاً دلنواز نے کھڑکیوں کے پردے کھینچے ۔ سر باہر نکال کر کوچبین کو پکارا ــــ "گاڑی روکو ــــ"

بڑی بھیانک سی آواز تھی ــــ کوچبین نے گھبرا کر باگیں کھینچیں ۔ دلنواز دروازہ کھول کر بھرے بازار میں اتر آئیں ۔ دکانوں پر جمع لوگ سرکار کی اچانک موت پر قیاس آرائیاں کر رہے تھے ۔ انھوں نے چونک کر اس بازاری عورت کو دیکھا جو اگر سرکار یوں چٹ پٹ نہ ہوتے تو دو روز بعد ان کی عُلیا حضرت بننے والی تھی ۔

دلنواز نے ایک جھٹکے سے دوپٹہ سر سے اتارا ۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتی تالاب کے کنارے پہنچ گئیں ۔ چودھری اور رسالدار پیچھے پیچھے دوڑے ۔

چودھری ہنفتے ہانپتے کانپتے تالاب پر پہنچے ۔ اطمنان کی سانس لی ۔ بیگماں بیٹی آرام سے منڈیر پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں ۔ چودھری کو دیکھ کر سرکار کا پرچہ اور اپنا خط شلوکے کی جیب سے برآمد کیا ۔ یہ خط رات کے نو بجے خانم پری نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرنے والی تھی ۔ قہقہہ لگایا ۔ چودھری نے تاسف سے سر ہلایا ۔ صدمے نے بے چاری بچی کے دماغ پر اثر کر دیا ۔ دھیرے سے بولے ۔ "بیٹی رنج نہ کرو ۔"

"رنج ــــ ؟" دلنواز نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بوڑھے کو دیکھا ۔" چودھری ! ارنج

ھے اس بات کا ہے کہ سرکار نے آخر دم تک مجھے تمہاری بھانجی سمجھا۔ میرا یہ خط ان
ں نہ پہنچا۔" دونوں پرچوں کے پرزے پرزے کیے اور انھیں ہوا میں اچھال دیا۔

چودھری فتح محمد سُن سے رہ گئے۔ دل ٹوٹ گیا۔ اس عورت کی بیں نے جان
پائی تھی اپنی اولاد کی طرح پرورش کی تھی۔

"جاؤ پوُت دکھن ـــــ" شدّو نے آواز لگائی۔
"وہی کرم کے لچھن ـــــ" چھوٹی بہن شمّو نے چلّا کر کہا۔ دونوں بچّے بالاخانے کے مختصر
ے صحن میں دُھوپ چھاؤں "کھیلتے پھر رہے تھے۔ جاڑوں کا سُورج کبھی بادلوں میں چھُپ
تا کبھی تیزی سے چمکنے لگتا۔ شملے میں برفباری ہوئی تھی۔ ہوا کے سرد جھونکوں سے
اڑ کھُلتے پھر بند ہو جاتے۔ دلنّواز اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ مہرو باورچی خانے میں البیلی سے
شتہ تیّار کروا رہی تھی ـــــ شدّو اور شمّو "اونچا نیچا ٹیلہ" کھیلنے لگے شدّو ایک مونڈھے پر چڑھ کر چلّایا
پھر سے بدھّو گھر کو ـــــ"
"آئے۔ جان بچی لاکھوں ـــــ" شمّو کھکھلا کر ہنسی۔
"خالہ بن گئیں خیلہ ـــــ" شدّو نے نعرہ لگایا۔
"خیلہ جان بیلا ـــــ" شمّو پکاری۔
"خالہ بن گئیں خیلہ ـــــ"
"خیلہ جان بیلہ ـــــ تیلے میں ہے میلہ ـــــ جمنا جی پہ کھیلا اونچا نیچا ٹیلہ ـــــ"
شدّو نے کوُد کوُد کر الاپنا شروع کیا۔
دو راجپوت افسر چودھپوری صافے باندھے برجس اور فُل بوُٹ ڈانٹے زینے میں
دار ہوئے۔ چودھری فتّے دروازے کے پاس مونڈھے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے
راً اٹھے تپاک سے آداب تسلیمات کر کے ان کو لال کمرے میں لے گئے۔ شدّو برآمدے

اور صحن کے چکر لگا کر الاپا گیا ــــ "خالہ بن گئیں خیلہ ۔ تبیلے بیں ہے میلہ ۔ جمنا پہ کھیلا ۔ اونچا نیچا ــــ"

چودھری فقے لپکے ہوئے باہر آئے آہستہ سے کہا ــــ کمبخت غل نہ مچا۔

"ماموں جی ۔ ماموں جی ــ کھیلا اور ٹیلہ کی تک نہیں ملتی ۔"

"شاعری کر رہا ہے نالائق ۔" چودھری نے نیچی آواز میں ڈانٹا ۔ "چل سارنگی سنبھال استاد جی آتے ہوں گے ۔ خبردار جو آواز نکالی ۔ شمو بیٹی ــــ" انھوں نے پیار سے کہا ۔ "گھنگرو لے آ ۔"

"ماموں جی ــــ" مہرو نے باورچی خانے سے جھانک کر کہا "آج آپ ہی بنا دیجئے استاد جی نے آج کی چھٹی لے رکھی ہے ۔" ماموں جی پگڑی کے شملے سے چہرہ صاف کر کے باورچی خانے میں گئے سرگوشی کی ۔ "اری مہرو ۔ خدا کا شکر ادا کر ۔ بیگماں کی سائی آگئی بات پھیل گئی تھی بیگم بننے سہراب نگر چلی گئیں ۔ بھجن لال کی دوکان سے مٹھائی منگوا ہوں ۔ جل پان ــــ نیلم گڈھ مہراج کے آدمی ہیں ۔ بہت بڑی اسامی ہے ۔"

وہ پھرتی سے لال کمرے کی طرف دوڑ گئے ۔

بچے اسی طرح کھیل میں مصروف رہے ۔ "جاؤ پوت دکھن ۔ خالہ بن گئیں خیلہ" البیلی کٹنی چولہے کے پاس بیٹھی روغنی ٹکیاں بنا رہی تھی ۔ مسکرا کر بولی ۔ "جو تم کہتی ہو تمہارے بچے تنگوڑے وہی دہراتے ہیں ۔"

باہر آ کر مہرو نے بیٹے کے کان کھینچے ۔ "خاموش ۔ بد ذات زبان گدی سے کھینچ لونگی ۔" دونوں بچوں کو مارتی پیٹتی دلنواز کے کمرے میں گئیں ۔

آپا آرام کرسی پر چپ بجیں بیٹھی تھیں ۔ "اپنی اولاد کو بہت نفیس تربیت د رہی ہو بیوی ۔"

"آپا تم بھی تو جب سے منحوس نگر سے لوٹی ہو اٹھتے بیٹھتے ایک ہی رٹ ۔ جاؤ پو دکھن ــــ وہی بچوں کے کان میں پڑتا رہتا ہے ۔"

"تم تہیں بکنی رہتیں خیر سے بُدھو ۔"

"چلو خیر ۔ معاف کرو ۔ اٹھو ۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ ۔ خیلا جان بیلا ۔"

"پھر وہی ۔"

مہرو نے قہقہہ لگایا "توبہ ۔ توبہ ۔ اب نہیں ۔ میری اچھی آپا ۔ اُٹھو کپڑے بدلو ۔ کنگھی چوٹی کرو ۔ ایسا بھی کیا سوگ ۔"

"کس دل سے کروں ۔ کنگھی چوٹی ۔ سرکار دُکھیا کی میّت ۔۔۔"

"پھر وہی صبح صبح ۔"

"کربلائے معلیٰ کے راستے میں ہوگی ۔ اتنا لمبا سفر ۔ اجنبی مسافر ۔"

"باؤلی ہوگئیں ۔"

"ریل گاڑی ۔ جہاز ۔ اونٹ ۔۔ اونٹ پر لدا سیاہ تابوت ۔"

مہرو برہم ہو کر چیخی ۔

"خبردار ۔ آپا ۔۔ آیندہ جو تم نے نام لیا ۔۔ بھرے پُرے گھر میں ۔"

"یہ بھی رین بسیرا ہے بنّو ۔ چلاؤ مت ۔"

ماموں جی دروازے میں آئے ۔ "یہ مُنّی کے ڈیرے والیاں ہیں یا بھٹیارنیں ۔؟ باہر مہاراجہ صاحب نیلم گڑھ کے افسر آئے بیٹھے ہیں ۔ ذرا چُپ رہو کم بختو ۔" قریب آکر آہستہ سے بولے ۔ "بیگماں بیٹی مبارک باشد ۔ اگلے مہینے کی اکیس تاریخ کو یُودراج کا بیاہ ہے ۔ تیاری شروع کردو ۔"

لال کمرے میں مہاراجہ نیلم گڑھ کے آدمیوں نے دستور کے مطابق نقرئی تھالی میں بیعانے کا مخملیں کیسہ اور پان پیش کیے ۔ دلنواز نے کانپتے ہاتھوں سے بیڑہ اٹھایا ۔ راجپوت رخصت ہوئے ۔ اپنے کمرے میں واپس آئیں ۔ کچھ دیر چُپ کی بیٹھی رہیں ۔۔ پھر طنبورہ اٹھا کر ریاض شروع کیا ۔

"مبارک ہو۔ مبارک ہو ——" مہرو ہنستی ہوئی اندر آئی "لاؤ کنجی دو۔ تمہارے کپڑے دھوپ میں ڈالوں۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے۔ پشوازیں کون سے صندوق میں رکھی ہیں؟"

"دیکھ لو۔ میں تو سہراب نگر —— جاتے وقت سب کپڑے یہیں پھینک گئی تھی۔"

پھر آنسو۔

"پلک مُتنی ——"

"خاموش۔ بڑی بہن سے بدزبانی کرتی ہے مُردار۔"

مہرو نے ایک صندوق کھول کر پشوازیں نکالیں "ساڑیاں بھی لیتی جاؤ نگوڑے ہندوؤں کی شادی ہے یہ پہن کر اندر کے اکھاڑے والی بننا ——"

—— بنارسی ساڑیاں برآمد کیں۔ قالین پر رکھی گئیں۔ ململ میں لپٹا ایک بنڈل نکالا "یہ کیا ہے آپا —— ؟"

آپا نے الاپتے الاپتے سر اٹھا کر دیکھا "رامپور میں رضائی نہیں بنوائی تھی؟ ادھوری پڑی ہے۔ نکال لو۔ لے جاؤں گی ساتھ۔ وہاں بھی تو بڑی سردی ہوگی۔"

مہرو نے زرد اور اودی چٹاپٹی کی گوٹ کی حسین رضائی کھول کر قالین پر پھیلائی۔

"واہ —— کیا چیز ہے۔ ابھی البیلی کو دُھنئے کے ہاں بھیجتی ہوں۔ کل پرسوں تک ڈورے بھی ڈال دے گی —— تم مہاراجہ پر ڈورے ڈالنا!"

باہر ماموں جی بچوں کو بتانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ اندر آپا ریاض کر رہی تھیں زندگی اپنے پرانے ڈھرّے پر واپس آ گئی تھی۔ مہرو اطمنان کی سانس لے کر اٹھی پشوازیں اور نامکمّل رضائی اٹھا کر صحن میں چلی گئی۔

طائفے کے ساتھ بی دلنواز چھم چھم کرتی نیلم گڈھ اسٹیشن پر اتریں۔ کیلے کے پتّوں اور گیندے کے پھولوں سے سجے پلیٹ فارم سے گذرتی کھُلی فٹن میں ننگے سر بیٹھی شہر کے

بازاروں سے گذرتی رنگ بھون پہنچیں ہر طرف بیاہ کی چہل پہل تھی بھوپا بھوپی کے تماشے۔ جا بجا پنڈالوں کے نیچے بھگت باز، قوال، دھاڑی بچے اور بھانڈ لوگوں کو محظوظ کر رہے تھے رات کو شہنائی نوازوں کی روشن چوکیاں گشت کرتیں۔ تخت رواں پر کھڑی مطربائیں "ہمیشہ دلبر سجان مبارک باشد" گاتی پھریں —— شادی کا جشن سات دن تک جاری رہا۔ آخری روز صبح منہ اندھیرے حسب دستور بھیرویں پہ ختم ہوا۔

مہروئیں رئیسوں کی شادیوں میں کھڑے ہو کر مبارکباد یا گاتے گاتے تھک گئی ہوں اسی لئے میں نے "ہاں" کر دی۔

دربار ہال میں سنگھاسن کے سامنے کھڑی بی دلنواز اوران کی ساتھ والیاں بھیرویں الاپ رہی ہیں —— پیا آون کی بھئی بیریا در و تو ٹھاڑی ہوں۔

پیا کربلائے معلیٰ کے گورستان پہنچ گئے۔

عشق بازی میں کرامات نہ ہو کیا معنی جس کو دل چاہے ملاقات نہ ہو کیا معنی در و تو ٹھاری ہوں۔

کرامت ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ہیروں کا تاج بنوایا گیا تھا۔ در و تو ٹھاری ہوں۔

آٹھویں رات مہاراج نے برٹش ریذیڈنٹ سنٹرل انڈیا ایجنسی اور بمبئی پریذیڈنسی سے آئے ہوئے انگریز حکام اعلیٰ کو ڈنر پر بلایا۔ دلنواز نے ساقی گری کی۔ اس شام انھوں نے کانوں کے بالی پتے اتار کر دلائیتی آویزے پہنے تھے۔ پیشانی پر بالوں کے "بچھو"۔ قرمزی رنگ کی بنارسی ساڑی۔ مہاراج دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ کام کنڈلا خطاب عنایت کیا۔ سمراٹ بکرماجیت کی راج نرتکی کام کنڈلا۔

ڈھ بجے صبح تک خود کام کنڈلا فرانسیسی شرابیں کافی مقدار میں اڑا چکی تھیں سکھپال میں سوار ہو کر رنگ بھون کے مہمان خانے واپس پہنچیں۔ طویل راہداریاں طے کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوئیں۔ سنگی جالی والے تابدانوں سے چھنتی چاندنی نے کمرے میں اجالا بکھیر رکھا تھا۔ کونے میں لیمپ روشن تھا آتشدان میں آگ دہک رہی تھی۔ رنگ بھون کے اسٹاف کی ایک داسی اندر وسیع ڈریسنگ روم میں محوِ خواب تھی۔

دلنواز نے دوشالہ صوفے پر پھینکا۔ ایک دم سردی سی محسوس ہوئی پڑاقے کی گوٹ کی رام پوری رضائی جو دلی سے چلتے وقت مکمل کرائی تھی پلنگ پر پڑی نظر آئی۔ لباس تبدیل کرنے سے پہلے رضائی اوڑھ کر آتشدان کے قریب بیٹھ گئیں۔ منٹ بھر ہاتھ تاپے۔ صحرا کی رات سرد ہوتی جارہی تھی۔ آگ کے اور قریب ہوکر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں پہنچے کا پری بند اتارنے میں مشغول ہوئیں۔ کوئی ایک کے سرور کی وجہ سے پتہ بھی نہ چلا رضائی کا ایک کونہ آگ میں جا گرا۔ رُوئی بھڑک اٹھی۔ پل کی پل میں دلنواز عرف بیگماں کشمیرن کا تین چوتھائی چہرہ اور جسم جھلس کر رہ گیا۔

العظمتہ اللہ۔ جو چند منٹ قبل کام کندلا تھی اب شمشان کے شعلوں میں لپٹی ایک چڑیل ــــ ہیمنت رُت کی سرد راتوں میں بھیروا اپنے بیل پر سوار صحراؤں سے گذرتا جاتا ہے۔ مہا کال جو پیچھے پلٹ کر دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔

مہاراجہ صاحب نیلم گڈھ کے انگریز سرجنوں اور حکیموں کے طویل علاج معالجے کے بعد شفایاب ہوکر دلنواز دلی لوٹیں اس وقت تک ان کا قلب بالکل لوٹ چکا تھا۔
تائب ہوگئیں۔ (اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں کسی بگڑے دل نے کہا ــــ)

مقنع کی طرح نقاب سرکاؤ تو بھیانک صورت۔ ہیبت طاری ہوتی ہے۔ گھر کے باہر نقاب گھر کے اندر گھونگٹ۔ جس میں سے نصف چہرہ جو جلنے سے بچ رہا تھا نظر آجاتا ہے۔
آدھی گوری پاربتی۔ آدھی بھدرکالی۔ جوگ مایا۔

آتشزدگی کے حادثے کے وقت چالیس کے اوپر تھیں لیکن ہجوم عشاق میں کمی نہ آئی تھی۔ چند سال بعد بحیثیت جانشین منورّی کشمیرن برادری کی چودھرائن کی مسند پر براجیں۔ انھوں نے مصلّے سنبھالا۔ دھن یوون کا گرو نہ کیجئے۔ جھوٹ وچن مت بول رے ــــ گھونگٹ کا پٹ کھولا تو ایک خوفناک صورت۔ تجھے پیا ملیں گے ــــ

بیری والے پیرجی کے آنگن میں ایک بیر ٹپ سے برقعے کے دامن پر گرا۔ پیرجی نے اٹھا کر انھیں عنایت کیا۔ فرمایا "یہ جنت کا درخت ہے۔ اسی کے پتے اُبال کر مُردے نہلائے جاتے ہیں:"

—— ایک غریب الوطن مُسافر اس شہر سے جانے والا ہے۔ اسکے سفر آخرت کے لئے حضور کی امداد درکار ہے —— دلنواز نے سر جھٹکا۔ پیرجی بیر ان کی ہتھیلی پر رکھ کر دیا تھے ——

"یہ بشارت ہے۔ خداوند کریم شاید تم کو معاف فرمادے ——"

دلنواز نے بیعت کی۔ ایک مسکین سا مُرید پیرجی کی چلمیں بھرنے پر مامور تھا۔ مرشد نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر حاضر ہوا "کل پاک صاف کپڑے پہن کر بعد نماز جمعہ آجانا —— اور تم بھی ——" انھوں نے دلنواز کو حکم دیا۔

بروز جمعہ بیری والے شاہ صاحب نے شربت کے پیالے پر مسماۃ دلنواز بانو بیگم بنت عثمان بیگ شہید کا عقد اس لاولد رنڈوے مرید سے پڑھ دیا۔ شرع محمدی پوری کی۔ بعد نماز مغرب اپنے مجہول الحال شوہر کے ہاں پنڈت کے کوچے منتقل ہو گئیں۔

اب وہ ایک تنگ و تاریک مکان میں رہتیں۔ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتیں۔ سنت رسولؐ کا اتنا خیال کہ لباس میں دس دس پیوند —— شوہر ایک مطب میں نسخے باندھتے تھے۔ ان کی قلیل تنخواہ میں گذر کرتیں۔

ایک روز ڈولی کر کے چاوڑی پہنچیں۔ مہرو کو سمجھایا بجھایا کہ وہ بھی توبہ کرلے۔ وہ ہرگز نہ مانی۔ چودھری فتّے کچھ نہ بولے۔ چپ چاپ بیٹھے تسبیح پھیرا کیے۔

دلنواز نے انھیں گلی کا تنتھاں روانہ کیا۔ منشی رام سرن وکیل کو بلا کر اپنی ساری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ مہرو کو بخش۔ کچھ رقم سید کے مدرسے کے لئے علیگڈھ منی آرڈر کردی۔ قانونی لکھا پڑھی کے بعد ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ عازم بیت اللہ تھیں پر ایک دھیلا بھی اپنے لیے نہ رکھا۔ گناہ کی کمائی سے حج جائز نہیں۔ چند روز بعد خاوند

نے اپنا مکان فروخت کر ڈالا۔ دونوں بمبئی روانہ ہوئے۔

کشمشی رنگ کا بڑا سا پگڑ باندھے لاٹھی ٹیکتے چودھری فتح محمد ڈکھیا خدا حافظ کہنے اسٹیشن پر آئے تھے۔ پگڑی کے شملے سے اپنے آنسو پونچھا کئے۔ کہا تو اتنا کہا ——"ببیٹ سہراب نگر سے چلتے وقت تو بار بار دہرائی تھی جاؤ پوت دکھن وہی کرم کے لچھن —— آگ میں جلی تب بھی یہی رٹا کی۔ اب بتا۔ تجھ سے بڑا خوش قسمت کون ہے؟ بیٹا میں تیر ماموں نہ سہی پر جب کعبہ شریف کا پردہ تھام کر اپنے بزرگوں کی مغفرت کی دعا کرے گی مجھ بدبخت کی بخشش کے لیئے بھی ہاتھ اٹھالیجو ——"

میاں بیوی تھرڈ کلاس کے دھکے کھاتے بمبئی وارد ہوئے۔ بھنڈی بازار —— حاجیوں کا مسافر خانہ افلاس زدہ آسامی اور بنگالی مسلمانوں سے پٹا پڑا تھا۔ جتنی دیر میاں ٹکٹ وغیرہ کی دوڑ بھاگ کرتے یہ ہال میں بیٹھی دوسری پردہ نشینوں کی طرح برقعے میں ملفوف دیوار کی طرف منہ کیئے رہتیں کھانا بھی اسی طرح کھاتیں۔

سرائے طغرل بیگ سے روانہ ہونے والی کلمہ گو ڈیرے دار کے رتھ میں گویا بم آدونہ کی سواری کے بھینسے جُتے ہوئے تھے۔ بمبئی سے جدّہ کے لیئے لنگر اٹھانے والا مُشرک فرنگیوں کا دخانی جہاز سفینۂ نوح تھا کہ بنت مرزا عثمان شہید کو سلامتی کے کنارے کی سمت لیئے جا رہا تھا۔ لال قلعے کی پروردہ بچّی دلنواز بانو بیگم پچیس[۲۵] سال قبل معدوم ہوئی۔ چاوڑی کی دلنواز عرف بیگماں اب غائب۔ ایک نقاب پوش غریب بدقطع عورت اپنے مفلس شوہر کے ہمراہ لبیک اللھم لبیک پکارتی مکہ معظمہ جا رہی ہے۔

(۶)

دُعاؤں کا سفر

مکّہ اور یثرب کی گلیوں میں میاں بیوی نے کئی برس گذار دیئے۔ مدینہ منوّرہ میں بی بیؑ کے مزار مقدس کے نزدیک جانے کی ہمت کبھی نہ ہوئی۔ جلتی ریت پر دور بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رویا کرتیں۔ یا خاتون جنتؑ میری شفاعت کروا دیجیو۔ یا بی بیؑ مجھے بخشوا دیجیو۔ یا بنت رسولؐ اللہ اس گناہ گار کنیز پر کرم کیجیو —— یا میری شہزادی —— میاں بیوی نجف اشرف کربلائے معلّیٰ کاظمین اور بڑے پیر کے روضے کی زیارات سے مشرّف ہوئے۔ مکّہ شریف میں شوہر ایک یمنی عطّار کی دوکان پر نوکر ہو گئے تھے۔ ایّام حج میں متموّل ہندی مسلمانوں کی خدمت کرتے۔ اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی۔ بڑی عسرت اور قناعت کی زندگی دونوں کی تھی۔ حرم شریف میں بیٹھ کر نفلیں پڑھا کرتے دلنواز اپنی قسمت پر رشک کرتیں اور اللہ کے کرم پر متحیّر رہتیں اس غفور الرحیم نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

سدا کے روگی شوہر مر گئے۔ چند مہینے عثمانی حکومت کے ایک ترک افسر کے ہاں ماماگیری کی۔ خانم بہت نک چڑھی تھی اس سے نہ پٹی۔ ترکن کی نوکری ترک کی۔ فاقوں کی نوبت آ گئی۔ حج کے زمانے میں گداگری اختیار کرنا گوارا نہ تھا۔ ماں جائی کی محبت نے جوش مارا بمبئی کا ایک دولت مند میمن کنبہ حج کر کے واپس جا رہا تھا —— خدیجہ بائی سیٹھانی نے ان کے حال زار پر ترس کھا کر جہاز کا ٹکٹ خرید دیا۔ حاجیوں کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔

بائیس[۲۲] خواجہ کی چوکھٹ پر واپس پہنچیں۔ تسبیحوں اور دینی کتابچوں کا بکس یمنی عطّار کے تیار کردہ چورن کی شیشیاں مع نسخہ جات ساتھ لائی تھیں۔ برائے

تجارت ۔ ریلوے اسٹیشن پر اتر کر تانگہ کیا ۔ سیدھی پہنچیں چنگلی قبر ۔ معلوم ہوا بیری والے شاہ صاحب کا وصال ہو چکا ۔ ان کا زر پرست اور ڈھونگی بھتیجا سجادے پر بیٹھا تھا ۔ ڈیوڑھی کے اندر گئیں ۔ پیرانی اماں کے ہاتھ چومے ۔ چند روزہ قیام کی اجازت چاہی ۔ سائبان کے ایک کونے میں پڑ کر سفر کی تکان کی وجہ سے ایسی بے خبر سوئیں کہ دوسرے روز دوپہر کو آنکھ کھلی ۔ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں ۔ گھر والوں کو قیام عربستان کے واقعات سنائے ۔ ان کی واضح بیرخی محسوس کی ۔ بڑی بہو نے کھانا سامنے رکھا ۔ چند لقمے زہر مار کر کے برقعہ اوڑھا ۔ ڈولی بلائی ۔

فانوس اور ہانڈیاں روشن ہو چکی تھیں جب اپنے سابق بالاخانے پر پہنچیں ۔ جو دراصل منوّری کشمیرن کا بالاخانہ تھا ۔ پھر دلنواز عرف بیگماں کا کہلایا ۔ اب مہرو کا کمرہ کہلاتا تھا ۔ کسی کی جائیداد بادشاہوں اور حکمرانوں کی حکومتوں کی طرح کچھ پتہ نہیں کل کس کے قبضے میں ہوگی ۔

سنہ ستاون کی فتح کے بعد لال قلعہ انگریزوں نے خالی کروایا ۔ سینکڑوں عورت سلاطین زادوں کی محبوباؤں نے چاوڑی آباد کی ۔ وہ بھی عبرت کی جا تھی کہ چاوڑی میں کچھ عرصہ قبل شاہجہاں آباد کے اصل حاکم مرہٹہ سردار عدالت لگاتے تھے ۔ یہ بھی مقام عبرت ۔

حمیت نام تھا جس کا ۔

سابق مغنیہ اور رقاصہ دلنواز عرف بیگماں ڈولی سے اتر کر اپنے مانوس زینے پر گئیں ۔ محض آٹھ سال قبل یہ ساری عمارت ان کی ملکیت تھی ۔ نیچے دوکانیں ۔ اوپر وسیع مکان ۔ بازار کے رخ طویل بالکنی ۔ جس پر چقیں پڑی رہتی تھیں ۔ اندر ایک پردے دار کوٹھری میں مہرو کی بہو رہتی تھی ۔ مہرو کا نوجوان لڑکا شنّو اب طائفے کا منیجر تھا ۔ مہرو کی لڑکی شمّو کے جمال جہاں سوز اور گلوکاری کی وہی شہرت تھی جو آج سے ۳۳ ۔ ۳۴ سال قبل اس کی ماں اور خالہ نے حاصل کی تھی ۔

زینے پر پہنچ کر دلنواز اچانک بہت گھبرائیں۔ نیچے روسائے شہر کی بگھیاں ۔
—— اوپر لال کمرے میں محفل شعر و سخن جاری ——

دلی کی مقبول ترین مغنیہ مہرو اپنی ذہانت اور حاضر جوابی کے لئے مشہور تھیں۔ فن طباخی میں طاق —— ابھی چند روز قبل جب صاحب گورنر جنرل کشور ہند کلکتہ سے تشریف لائے۔ میونسپل کارپوریشن کی طرف سے ان کا لنچ کیا گیا میزبانوں میں مہرو بھی شامل تھیں۔ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا نورمحلی موتی پلاؤ حضور وائسرے بہادر نے نوش فرمایا۔
کتھک کی ماہر دلنواز اور مہرو اور انکی ہم پیشہ بہنیں گویا اس سوسائٹی کی گیشا گرلز تھیں۔ کہ جاپان کی طرح یہاں بھی گھریلو بیویاں سوشل تقاریب میں شامل نہ ہوتی تھیں نہ ہندو۔ نہ مسلمان۔ سوائے کلکتہ بمبئی کی چند فرنگی چال ہندو پارسی اور سلیمانی بوہری خوجی خواتین کے۔ بھرت ناٹیم کی ماہر دیوداسیاں جنوبی ہند کی قدامت پرست ہندو سوسائٹی کی گیشائیں تھیں۔
اس وقت، ۱۸۹۲ء میں، دیوداسی راج رتنم کو مدرائے میں اور بی مہرو جان کو دلی میں یہ بتلایا جاتا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب اسی ہندوستان میں اعلیٰ نسب شریف زادیاں اُڑیسی کچی پڈی موہنی آتم بھرت ناٹیم کتھا کلی اور کتھک ناچیں گی محفلوں میں گائیں گی۔ بن ٹھن کے مشاعروں میں غزل سرا ہونگی آدم زاد آسمان میں تھگلی لگائے گا۔ کتھک کی تتکار کرنے والی نرتکی سماج کی ٹھُنکار کے بجائے سرکاری اعزاز حاصل کرے گی تو دیوداسی راج رتنم سوچتیں یہ آدمی بھنگ پی گیا ہے اور مہرو اس پیش گوئی کو شاہ بڑے کی گپ گردانتیں۔

چمپا کھلی —— گلاب کھلا —— موتیا کھلی —— مہرو داغ کی غزل سنا چکی تھیں کہ مہری نے پیچھے سے آکر سرگوشی کی —— "بیوی ایک بڑھیا نیچے دروازے پر کھڑی ہے۔ حج کر کے لوٹی ہے۔ تم سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہے ——" خوشی کے مارے مہرو کا

دل دھڑکنے لگا۔ آپا آگئیں۔ حاضرین جلسہ سے اجازت طلب کرکے مسرور و مضطرب زینے کے دروازے پر پہنچی۔ آپا کا آدھا سوختہ چہرہ اندھیرے میں نظر نہ آیا۔

مہرو نے بے اختیار آگے بڑھ کر بہن کے گلے لگنا چاہا۔ دلنواز ایک قدم پیچھے ہٹیں مہرو رقت بھری آواز میں بولی "سلام آپا۔ عمر دراز۔ اندر تو آؤ ۔۔۔"

بولیں "جس روز ان سیڑھیوں سے اتری قسم کھائی تھی اب اس پلید جگہ قدم نہ رکھوں گی۔ اب توبہ گنہ گار پاؤں حرم شریف، مدینہ منوّرہ، کربلائے معلّیٰ ۔۔۔" گلا رُندھ گیا۔ ۔۔۔۔۔ سنبھل کر واعظانہ انداز میں پھر بات شروع کی "مہرو بندی۔ بس اتنا کہنے آئی ہوں کوچ نگارا بجنے سے پہلے پہلے اب بھی توبہ کرلے۔ جانے کس گھڑی ملک الموت تیری روح قبض کرنے آجائیں۔ بڑھاپا دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے۔ جب تجھے مسافر بنا کر گور میں اتاریں گے یار آشنا تیرے مُٹھی بھر مٹّی ڈال کر واپس چلے جائیں گے۔ گور کا گڑھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا اور تو ۔۔۔۔۔ اور تو اور۔ بنّو۔ ہمزاد بھی ساتھ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ تختوں تلے منوں خاک کے نیچے نقد دم اکیلی ۔۔۔۔ منکر نکیروں کو کیا جواب دے گی ۔۔ ہیں ۔۔۔ ؟ اور جب بروز قیامت تو سر سے مٹّی جھاڑتی قبر سے نکلے گی ۔۔۔"

مہرو حق دق آپا کا منہ تک رہی تھی۔ زینے کی تاریکی میں جِجن بی کے اس غیر متوقع اور ناگہانی ہیبتناک وعظ نے اُلٹا اثر کیا۔ موت سے وہ بے حد خوفزدہ تھی کہ چھ سال کی جان نے پورے خاندان کی لاشوں کے ساتھ سارا دن اور آدھی رات بتائی تھی۔ معاً طیش آگیا۔ بڑی بی نے آتے کے ساتھ کیا بدشگونی کی تقریر جھاڑ دی۔ ملک الموت آئے دشمنوں کے پاس "اے آپا بیگماں" اس نے ہاتھ نچا کر کہا "اچھی بہنا ہو۔ نہ سلام نہ دعا۔ نہ خیر خیریت۔ آٹھ برس بعد لوٹیں تو چھوٹتے ہی گور گڑھا کرنے لگیں ۔۔۔ اے تم نواب فوّارے پر جا کر پادریوں سے مناظرے کرو۔ اے ہاں مرُدے شوفی مُلاّنی نہیں تو۔۔۔"

ذرا اپنا غصّہ دھیما کیا۔ بولی "اچھی یہ تو بتلاؤ۔ کب آئیں۔ کہاں ٹھہری ہو۔"

جِجن بی چُپ کھڑی تسبیح پھیرا کیں۔

"آپا ۔۔۔ اے آپا۔ اے بی کیا بہری بھنڈ بھی ہو گئیں؟ کس حال میں ہو؟

—— پھر تاؤ آیا —— "باقی یہ کہ بُوا میری فکر نہ کر جس پاک پروردگار قادرِ مطلق نے مجھے اس کوٹھے پر پہنچایا اسی سے روزِ محشر جواب طلب کروں گی۔ اے بی ہم تم تو معصوم بچیاں تھے۔ اس پالن ہار نے ہمیں یہاں کیوں پھنکوا دیا؟ اپنی مرضی سے تو ہم یہاں آتے نہ تھے —— پہلے ہمارے ماں باپ بہن بھائی سارے کنبے کو اس اللہ پاک نے تلنگوں خاکیوں کی تلواروں سے ذبح کروایا۔ پھر چند گھنٹوں بعد اس میرے ربِّ کریم نے مجھے اور تمہیں ایک کنچنی کے حوالے کر دیا۔ آپا بیٹھ جاؤ کب تلک کھڑی رہو گی۔"

صحن میں سے ایک مونڈھا گھسیٹ کر زینے میں سرکا دیا۔ جگن بی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ مہرو نے تھک کر کواڑ سے ٹیک لگالی۔

دفعتاً پھر گویا ہوئیں۔ "ماں جا مہرو۔ قیامت سر پہ کھڑی ہے۔ کہیں تیرا حشر منوّری کشمیرن کے ساتھ نہ ہو۔"

"قیامت؟ اجی قیامت اس روز طغرل بیگ کی سرا میں آکر گذر گئی اب اور کیا آئے گی۔ آئی تو دیکھ لیں گے۔ رہیں اماں منوّری۔ تو اچھی یہ تو بتاؤ اس رات اگر ہم دونوں بھوک سے بلبلا کر جان نہ دیدیتے تو یا جنگلی جانور ہم زندوں کو نوچ کھاتے یا کوئی موا سکھ تلنگا جاٹ اٹھائے جاتا۔ اُپلے تھپواتا بھنگی کے ہاتھ پڑ جاتیں۔ جھاڑو ٹوکرا کرواتا آج کسی گاؤں کھیڑے میں پڑے جھینک رہے ہوتے یا دلی پہنچتے تو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگتے۔ ارے اماں منوّری تو فرشتہ رحمت تھیں۔ کیا ہمیں لاشوں اور گیدڑوں اور مردہ خور جنگلی کتوں کی دوسراتھ میں چھوڑ آتیں؟ ہم کو جو عیش آرام عزت دولت یہاں ——"

"شیطان سے پناہ مانگ مہرو کفر نہ بک توبہ کر ——"

"بیوی خان بہادر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔"

"آتی ہوں۔" چند سال قبل مہرو نے سب سے کہدیا تھا آپا کا مکہ شریف میں

انتقال ہوگیا۔ لوگ اُنھیں بھول بھال چکے تھے مگر اے لو وہ تو سامنے موجود ہیں بھوت کی طرح۔

ہندی میں بھُوت کے لغوی معنی ماضی کے ہیں۔ اردو میں بدروح۔ لغوی طور پر ہر گذری ہوئی چیز بھُوت ہے۔ بھُوت کال یعنی ماضی میں شامل۔ بھُوت کو بھگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپا کو کس طرح اپنے آپے پر سے اتارا جائے؟ بے چاری دُکھیا ماری میرے وجود کا حصہ ہیں۔ سگی بہن۔ مگر اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بھُوت ہیں۔

جمن بی نے ہار نہ مانی۔ بولیں "اور جو میرا آپا جل گیا سارا۔ وہ ازغیبی مار نہ تھی؟" گو ان کو محسوس ہوا کہ مہرو کی منطق کے آگے ان کی تاویل ذرا کمزور پڑ رہی ہے۔ برقعہ پھیلا کر فرش پر بیٹھیں۔ مہرو مونڈھے پر ٹک گئی۔ عنّابی ساٹن کا کلی دار پائجامہ اور طلاکار جوتیاں پہنے ٹانگ پر ٹانگ رکھے شوخی سے بحث کرتی وہ اصل "مونڈھے والی" معلوم ہو رہی تھی۔۔۔

"وہ حادثہ تھا آپا۔ بڑے بڑے نیک نمازی پرہیزگار اللہ والے حادثوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اے لو ابھی پرسوں سے پہلے روز اخبار میں چھپا تھا کہ حاجیوں کی ایک اگن بوٹ میں آگ لگ گئی۔ سینکڑوں حاجی جل کے راکھ ہوگیا۔ تمہیں کتنا سمجھایا۔ ذرا سا چہرہ جھلس گیا تو کیا ہوا اوں سنیاس نہ لو۔ تمہارے گانے کے قدردان تم کو اس طرح سراہتے۔ وہی آؤ بھگت ہوتی۔ مگر تمہاری تو اس بیری والے اُوبک نے مت کاٹی۔ دنیا چھُڑوا دی۔ ایک فقیٹے کے پلّے باندھ دیا۔ برسوں پردیس کی خاک پھانکی۔۔۔ چلو اللہ توبہ اللہ معاف کرے حج کر آئیں اچھا کیا۔۔۔ مبارک ہو روزِ حشر ہماری سفارش بھی کر دینا۔ مگر اب تو گھر لوٹ آؤ۔۔۔"

"مہرو۔۔۔ ماموں جی کیسے ہیں؟"

"ان کو تو مرے بھی چار ساڑھے چار سال ہوگئے۔"

"اللہ ان کے گناہوں کو معاف کرے۔"

"گھر واپس آجاؤ اور یہیں بیٹھ کر سب کے گناہ بخشواتی رہو۔ جم جم آؤ۔ ہم سب

ہاتھوں چھاؤں کریں گے بھانجی بھانجا بہو تمہاری خدمت کو حاضر ہیں ــــ"

دلنواز چپ رہیں ۔ اس لمحے ان کے قدم ڈگمگا گئے ۔ باورچی خانے سے لذیذ کھانوں کی لپٹیں آ رہی تھیں ۔ عربستان کی پھیکی سیٹھی غذا کھاتے کھاتے عاجز آگئی تھیں ۔ یہاں دو وقت کی روٹی کا سہارا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا ۔ لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں تنہائی میں بزرگانِ دین سے یک طرفہ گفتگو کرنے کی عادت پڑ چکی تھی ۔ اپنے مرحوم پیر صاحب سے لو لگائی ۔ بند پپوٹوں کے سامنے بیری کا درخت سرسراتا جنّت کا پیڑ جس کے پتّوں میں اُبلے پانی سے آخری بار نہلائی جائیں گی ۔ سفید کھڑکھڑاتے لٹھے کا تھان ۔ قینچی ۔ تختے کھڑے کوری چٹائی ۔ آن واحد میں سب کی جھلک نظر آگئی ۔ آنکھیں واکیں ۔ بیری گوندنی میں تبدیل ہوئی ۔ ایک چرٹ بانک عورت سامنے مونڈھے پر براجمان تھی ۔ گوندنی جیسی سونے میں پیلی ۔ رات کی رانی جیسی معطّر ۔ کام کندلا ۔ بیباک ۔ حیا باختہ ۔ انھوں نے اس اجنبی زنِ فاحشہ کو مخاطب کیا ۔

"نہیں مہرو اب چل چلاؤ ہے ۔ جانے کس وقت بلاوا آجائے ۔ سات حج کرنے کے بعد اب یہ دہلیز نہ پھلانگنے کی ۔"

"رہو گی کہاں ؟ وہ تمہارے لگلہ بھگت تو گئے مر ــــ"

"مہرو بندی ان کا وصال ہو گیا ۔ بدزبان ۔ بے ادب ۔ کافرنی ۔ پہلے تو ایسی گستاخ نہ تھی ۔"

"اب بات یہ ہے آپا ــــ" مہرو نے بڑے رازدارانہ لہجے میں جواب دیا "تمہاری دعا سے اب میرے ہاں بڑے بڑے انگریزی داں عالم فاضل آیا کرتے ہیں ۔ دو چار مہربان سیّد کے مدرسے کے تعلیم یافتہ بھی ہیں ۔ شعر و شاعری کے چکر میں وہ بھی آجاتے ہیں ۔ اس وقت بھی اندر بیٹھے ہیں ۔ تو یہ لوگ آپا بیگم آپس میں ولایتی فلسفہ بگھارتے ہیں ــ چار باتیں میرے کان میں بھی پڑ جاتی ہیں یوں کہتے ہیں کہ نہ حضرت آدمؑ تھے نہ امّاں توّا ــــ شروع میں بندر تھا ۔ یوں کہتے ہیں کہ یہ جنّت جہنّم عذاب ثواب جزا سزا سب ڈھکوسلہ ہے ۔

"اللہ بخشے آکا نوشہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے۔ یاد ہے ایک مشاعرے میں وہ غزل انھوں نے پڑھی تھی۔ بڑی واہ واہ ہوئی تھی۔ ع ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ——"

"ہائے مہر و بخشی —— ہر طرح سے ماری گئی۔ گناہ فلک کی گردش نے کرائے۔ دین اسلام خود بُری صحبت میں بیٹھ کر کھویا۔ نوج اگر مجھے معلوم ہوتا انگریزی پڑھ کر یوں ایمان غارت ہوتا ہے کاہے کو علی گڈھ چندہ بھیجتی ——"

"آپا اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔ تم ہی کہو ہو کہ اس کے حکم بنا پتہ نہیں ہلتا:"

اتنے میں مہر و کو لپکا زنانہ انگریزی فیشن کا ایک جنٹلمین لال کمرے سے نکل کر صحن میں آپہنچا

"اچھا اللہ محمدؐ کے حوالے ——" جمن بی نے کہا اور گھبرا کر فوراً نقاب میں منہ چھپا لیا۔ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ زینے کی نیم تاریکی میں غائب۔

جس وقت جنتی قبر پہنچ کر بیری والے مکان پر اتری ہیں اطمنان کا سانس لیا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ گھر والے کھانا کھا چکے تھے۔ جمن بی سلیپر گھسیٹتی داخل ہوئیں۔

"آؤ بیٹھو" پیرانی اماں نے رُکھائی سے کہا۔ وہ مرحوم پیر جی کی چوتھی اور سب سے کم سن بیوی تھیں۔ جب نو سال قبل جواں سال دلنواز آگ میں جلنے کے بعد پیر جی سے بیعت کرنے آئی تھیں، تب سے پیرانی اماں ان سے بے آگ جلتی تھیں۔ یہ نکاح کر کے عرب چلی گئیں انھوں نے شکر ادا کیا۔ خیر۔ بڑے میاں خود ہی اللہ میاں کو پیارے ہوئے۔ مگر اب جو یہ دوبارہ آن ٹپکیں اِن کو بٹھلا کر کون کھلائے گا۔ تعویز گنڈے کی آمدنی الفظ۔ بھنبھنا چلی بیر۔ نوسِکھ اور اناڑی۔ اللہ ماری تینوں سوتنوں کی اولاد اور پوتوں پوتیوں کی پلاٹین کا پیٹ پالنا۔ تنتنیا مرچ ہوئیں۔ اوپر سے ان بلائے بے درماں کو سہیڑوں۔

"اے بی جہاں گئی تھیں وہاں کھانے کو نونہ ملا ہوگا۔ کہاں گئی تھیں؟"

"آئیے کھانا کھا لیجئے" ایک بہو نے آواز دی۔ بھاری قدموں سے جو لیے پاس گئیں

بہو نے بچی کھچی سالن سامنے رکھا چنگیری سے روٹیاں نکالیں۔مہرو کی التجائیں یاد آئیں
۔آپا نہ جاؤ کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرو گی۔

دوسری صبح سے حجن بی اپنا وجود کارآمد ثابت کرنے کے لئے کمربستہ ہوئیں۔
مسالے پیسے۔چنگیر پوبوں کو نہلایا دھلایا۔بڑیاں توڑیں۔سیروں آٹا گوندھ ڈالا۔
ہفتہ بھر اس طرح گذرا۔اب پیرانی اماں اور ان کی بہوؤں نے انکو باقاعدہ ماما چھوچھو
سمجھ لیا۔ہر وقت کی دُو بدُو۔بیگماں پندرہ روز ہی میں اس دانتا کل کل اور مشقت سے
جیں بول گئیں۔اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ٹھانی۔اب تک ہمت نہ پڑی تھی کہ در در
جاکر تسبیحیں اور چورن بیچیں۔اور رات کو سوئیں کہاں؟ اب اللہ کا نام لے کر اعلان کر دیا
"پیرانی اماں لو ہیں چلی۔"

"اے بی کہاں جاؤ گی گلی کوچوں کی خاک چھاننے"۔پیرانی اماں نے اخلاقاً کہا۔
"نہیں بس اب چل ہی دوں۔جمعرات کی جمعرات حاضر ہوں گی"۔حجن بی نے ہونٹ
پچکاکر جواب دیا۔"بوغچہ بند یہیں چھوڑے جاتی ہوں۔پھر آکر لے جاؤں گی۔"
پیرانی اماں چپکی بیٹھی چھالیا کترا کیں۔بیگماں نے دالان کے کونے میں رکھے
اپنے ٹرنک میں سے دو درجن رنگ برنگی تسبیحیں نکال کر کلائی میں ڈالیں۔چورن کی
شیشیاں صدری کی جیبوں میں ٹھونسیں۔بیٹھی ایڑی کی سلیم شاہی گھسیٹتی مکان سے
نکلیں۔کچھ فاصلے پر ایک شاندار خانقاہ کے صحن میں سرو کے درخت سرسرا رہے تھے۔
بیرونی احاطے میں میرزا جان جاناں مظہر کا مزار نظر آیا۔سوچا معلوم کروں شاید زنانخانے
میں ماماگیری مل جاتے۔نہیں۔اگر یہاں بھی گت بنی تو؟ بہتر یہی ہے کہ چورن اور تسبیحوں
سے جو چند آنے روز ملیں نانبائی سے خریدوں نان قلیہ اور کسی درگاہ کے کونے کھدرے
میں جہاں فقیرنیاں سوئی ہیں سوزنی بچھا کر وہیں پڑ رہا کروں۔اللہ رزاق ہے۔

لیکن نہ آدم نہ حوا۔شروع میں محض بندر تھا؟ توبہ۔

(۷)

دشتِ ماریہ۔

گلرُخ بانو عرف نواب فاطمہ بنت مرزا دلدار علی برلاس عطر فروش ساکن گلی شاہ تارا دلّی

گلرُخ بانو بیگم نام دادا نے رکھا تھا جو نازہ وارد ولائتی مغل تھے۔ نواب فاطمہ نانا نے جن کے ایرانی قزلباش اجداد نورجہاں کے زمانے سے شاہ گنج آگرہ میں رہتے آئے تھے۔ پیدائشی سبز قدم نکلیں کہ ننھیال ددھیال سب پر لگتا تھا بی بی کی جھاڑو پھر گئی۔ جو غدر میں مارے جانے سے بچے ان کو ــــ نُھوتھو ــــ وباؤں نے چُن لیا۔ پانچ سال کی تھیں بیٹھے ہیں ماں اور آٹھ سالہ اکلوتے بھائی نے قضا کی۔ دلّی کے صاحب حیثیت عطر فروش اور کبوتر بازی کے دلدادہ باپ نے بوڑھی پڑوسن کی مدد سے پالنا شروع کیا دوسری شادی کی فکر میں تھے کہ تپ دق کے شکار ہو گئے پلنگ پر پڑے رہے ــ اب ننھی منّی نواب فاطمہ باپ کی تیمارداری میں لگ گئیں ــ وہ لیٹے لیٹے خوش الحانی سے سوز اور مراثی پڑھا کرتے ــ اور روتے۔ دوکان اپنے عزیز ترین دوست مرزا سبط احمد کے سپرد کی ٹی بی کا انگریزی علاج ہرگز نہ کروایا کہ الکحل آمیز ادویہ کیسے پیتے ــ یونانی جاری تھا جب حالت دفعتاً بگڑی۔ پنجتن پاکؑ کی گواہی چہاردہ معصومینؑ کا واسطہ دیکر بچی مرزا سبط احمد کے سپرد کی۔ مرزا صاحب کمشنر دہلی کی عدالت میں پیشکار تھے۔ مرتے وقت مرزا برلاس نے یوں کہا "بھائی سبطے نواب فاطمہ تمہارے حوالے۔ یہ مکان دکان بھی تمہاری امانت۔ بچی سیانی ہو جائے تو ایک نیک شریف اثنا عشری کھرا مغل زادہ دیکھ کر اس کا عقد کر دینا مکان دکان اس کے جہیز میں دینا۔ جو نقدی تمہارے حوالے کر رہا ہوں اس سے اس کے کپڑے لتّے گہنے بنا دینا۔ کچھ اس کی مرحومہ ماں بنا گئی ہے۔ ا

ہ مرحومہ کے زیورات کا صندوقچہ بھی تم کو دیتا ہوں۔ نواب فاطمہ کی شادی سے پہلے نہ کھولنا۔ کبھی شوق میں عید بقرعید نوروز پر زیور پہنانا چاہا۔ بچہ ہے گنوا دیگی۔ بس اس کی شادی کے وقت ہی کھولنا۔ زیوروں کی فہرست صندوقچے کے پیش تختے میں موجود ہے۔ جو نقدی تم کو دیتا ہوں میری تجہیز وتکفین فاتحہ۔ اور مجلس کے بعد جو بچے بنک میں نواب فاطمہ کے نام سے اکاؤنٹ کھول کر ڈال دینا باقی جب تک تمہارے ہاں رہے اپنے گھر جانے سے پہلے، اس کے اوپر جو خرچہ آئے اس رقم میں سے منہا کرتے جانا۔"

مرزا دلدار علی تاجر آدمی حساب کتاب کے پکے۔ ایک ایک بات اپنی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے متعلق اپنے دوست سے طے کر کے سارا انتظام پختہ کر کے مرے۔ بچی کے ولی خود عدالت کے پیش کار قانونی آدمی مرزا کی وفات کے فوراً بعد روتی پیٹتی پچھاڑیں کھاتی آٹھ سالہ نواب فاطمہ کو اپنے ہاں لے آئے۔ چلتے وقت نواب فاطمہ کی گڑیوں کی سرخ پٹاری بھی ساتھ لے لی۔ صندوقچہ زیورات گڑیوں کے نیچے چھپا دیا۔ بچی کو اکیلے پر بٹھال کر اپنے گھر پہنچایا۔ گھر پہونچتے ہی زیورات کا صندوقچہ پٹاری سے نکال اپنے آہنی ٹرنک میں مقفل کر دیا۔ اس رات نواب فاطمہ روتے روتے کبھو کی سوگئی۔ چراغ کی روشنی میں سبط احمد کی بیوی نے صندوقچہ ٹرنک سے نکالا اور پچھلی کوٹھری کا کچا فرش کھود کر اس میں دفن کر دیا۔ تو اس زمانے میں لوگ بنکوں میں زیور کہاں رکھیں تھے۔

تیجے کے بعد مرزا سبط احمد مرزا دلدار علی مرحوم کے مکان کا سارا اثاثہ دو چھکڑوں پر لاد کر اپنے گھر لے آئے۔ مکان کرائے پر اٹھا دیا۔ خوشبو خانے کے شیشے اور کنستر سب اپنی تحویل میں لئے دوکان پر قبضہ کر اپنے بھتیجے کو اس پر بٹھا دیا۔

نواب فاطمہ ان کے گھر میں دن رات رویا کرتی۔ زندانِ شام میں مسلسل گریہ فرماتی جناب سکینہؑ کی ایک بے زبان کنیز۔

مرزا سبط احمد کی بیوی نے کہنا شروع کیا۔ کیا نحوست سمیٹ لائے۔ کمبخت کے آنسو ہی نہیں تھمتے دور دفان کالا منہ۔ باپ کی موت اور اچانک اپنا گھر چھُٹ جانے کا ایسا دہاکا لڑکی کے دل پر بیٹھا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے پتے کی طرح لرزنے لگتی۔ گھنٹوں گم سُم بیٹھی

یا پھر رونا شروع کر دیتی ۔ "کچھ ہاتھ بھی ہلا شہزادی گلبدن" مرزا کی بیوی ایک روز اسکے آگے آٹے کا کونڈا رکھ کر بولیں ۔ اب وہ دن بھر کام کرتی اور روتی —— اس گھر میں آئے ایک مہینہ گزرا تھا برتن دھوتے میں ہاتھ سے چینی کا ڈونگا گر کر ٹوٹ گیا ۔ مرزا صاحب کی بیوی نے چلانا شروع کیا "کھُن بیری ۔ منحوس ددھیال ننھیال ماں باپ بھائی سب کو چٹ کر گئی جب سے یہاں آئی ہے تین تو میری مرغیاں مر گئیں ۔ بچوں کو بخار نہیں چھوڑتا ۔ لو صاحب آج اتنا قیمتی ڈونگا چھن سے توڑ ڈالا ۔ کام کی نہ کاج کی ڈھائی من اناج کی۔"

"اتنا تو کام کرتی ہے صبح سے ننھی سی جان۔" بہو نے کہا ۔

"تو بہو تم ہی اس کا خرچہ اٹھاؤ ۔ میرے بس کا روگ نہیں۔"

اب اٹھتے بیٹھتے مرزا کی بیوی نے لڑکی کے کان میں بات ڈالنا شروع کی — انکے باوا ہمارے مقروض مرے ۔ ہم وہ نقصان بھی سہیں اور صاحبزادی کو بھی پالیں —— نواب فاطمہ مقروض کا مطلب نہیں سمجھتی تھی اس نے بہو سے کہا ابا کو تو دق ہو گئی تھی ۔ بہو اصل حالات سے ناواقف تھی اس نے جواب دیا شاید تمہارے ابا نے ہمارے سسر سے قرضہ لیا ہوگا ۔ بیسہ لیا ہوگا ادھار ۔ وہ ادا نہیں کر سکے ۔ ساس نے دور سے دیکھا ۔ بہو سے بولیں "یہ بیٹھی اس کے کان میں کیا بالا پڑھ رہی ہو آئیں ؟"

دو تین مہینے گزر گئے ایک روز پیشکار صاحب نے نواب فاطمہ سے کہا "بیٹا بات یہ ہے کہ ہمارا تبادلہ ہو گیا ہے لاہور ۔ تم کو ساتھ نہیں لے جا سکتے ۔ سرکاری قانون یہ ہے کہ جو بچہ جس شہر کا ہے اسی جگہ رہے ۔ اس لئے ہم تم کو ایک دوست کے ہاں پہونچائے دیتے ہیں وہاں تم بڑے آرام سے رہو گی ۔ اپنا سامان باندھ لو۔" نواب فاطمہ پچھلے چند مہینوں میں کچھ سُن سی ہو گئی تھی ۔ اس کی سمجھ میں صرف اتنا آیا ۔ چچا کہہ رہے ہیں ہم تم کو ایک اور جگہ پہنچاتے ہیں سامان باندھ لو ۔ فرمانبرداری سے اُٹھ کر دالان میں گئی ۔ پرچھتی پر چڑھ اپنی لال پٹاری اتاری ۔ اس میں اپنی گڑیاں ٹٹول کر دیکھیں کہ حفاظت سے ہیں —— اطمینان ہو گیا کہ موجود ہیں ۔ مع ابا کے عطر کی ایک شیشی ۔

مرزا کی بیوی نے اس کے روزمرہ کے چند کپڑے اسکی پٹاری میں ٹھونس دیئے۔ بڑھیا کپڑوں کا صندوق وہ پار کر چکی تھیں۔ دری چادر تکیہ اور رضائی سُتلی سے باندھی نواب فاطمہ کے گھر سے آیا ہوا سارا قیمتی سامان ایک کمرے میں مقفل کر رکھا تھا۔ پٹاری اور بستر اسنبھال وہ اپنے نئے سفر کیلئے تیّار ہوئی۔ مرزا صاحب نے اس کو ایکّے پر سٹھالا اور بلیماروں کی طرف چل دئے۔ ایک واقف کار شیخ عبدالباسط گوٹے والے سے بات کر چکے تھے۔ ایک یتیم وبیبر لڑکی ہے۔ روٹی کپڑے پر اپنے ہاں اوپر کے کام کے لئے رکھ لیجئے ثواب ہوگا۔ شیخ صاحب نے خلال کرتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا تھا بھجوا دیجئے۔

پیشکار صاحب اب نواب فاطمہ کی جائداد پر بلا شرکتِ غیرے قابض تھے۔ قانون داں آدمی۔ سب کام نگر ڈم سے کیا تھا —— مکان دکان زیورات عطریات کا اسٹاک سب ملا کر نواب فاطمہ کوئی تینتس ہزار کے ترکے کی مالک تھی اس زمانے کا۔ اللہ اکبر آج کا سمجھو پچاس لاکھ جو اس سے چھن گیا۔

شیخ عبدالباسط صدر بازار اپنی دکان پر جا چکے تھے۔ ایک باؤلا سا چھوکرا ممدو ڈیوڑھی پر کھڑا ناک کھُجا رہا تھا۔ مرزا صاحب نے اُسے آواز دی "ادھر آبے۔ لونڈیا کو اندر پہونچا دے۔ شیخ جی سے کہنا پیشکار صاحب آئے تھے۔ یہ دونوں نگ سنبھال" نواب فاطمہ خود کود کر ایکّے سے اُتر آئی۔ اُسے گاڑیوں پر سے اُترنا چڑھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پیش کار صاحب نے کوچوان سے کہا۔ چل بھئی سیدھے کچہری آج دیر ہوگئی اور پیچھے مڑ کر نواب فاطمہ پر نظر ڈالے بغیر جلدی سے ایکہ آگے بڑھوالیا۔ جیسے اچانک خوفِ خدا سے ڈر گئے ہوں۔

ممدو نے ریلوے کے قلیوں کی طرح پٹاری بغل میں دبائی بستر اسر پہ رکھا اور بولا آجا میرے پیچھے۔ وہ زنانی ڈیوڑھی میں سے گزر کر صحن میں پہونچی ممدو پردے کی وجہ سے ڈیوڑھی پر رک گیا۔ نواب فاطمہ بستر ادھکیلتی ہوئی دالان میں لے گئی۔ پھر پٹاری

اٹھا کر لائی۔ کسی نے اس کی آمد کا نوٹس نہیں لیا۔ ایک لڑکی پلنگ پر بیٹھی بال کاڑھ رہی تھی۔ مراد آبادی کٹورے سے پانی پینے کے بعد سر اُٹھا کر دیکھا۔ صحن میں ایک ننھی بچی لال رنگ کی پٹاری سنبھالے سہمی کھڑی ہے اور ٹکر ٹکر چاروں طرف دیکھ رہی ہے۔ پچھلے تین ماہ میں یہ دوسری اجنبی جگہ تھی۔ جہاں قسمت کے پھیر نے اسے لا ڈالا تھا۔

شیخ جی کی بیوی باورچی خانے سے اٹھ کر آئیں۔ بچی نے تمیز سے سلام کیا۔

"اری کہاں سے آئی ہے۔ پہلے کہاں تھی؟"

"پیشکار صاحب کے ہاں۔"

"وہاں کام کرتی تھی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ کپڑے انھوں نے ہی بنوا کر دیئے؟"

پھر آنکھوں میں آنسو۔ "ابا نے بنوائے تھے۔"

"کب مرے ابا تیرے؟"

"ابھی مرے ہیں رمضان شریف میں۔"

"کیا کرتے تھے؟"

"عطر پھلیل بیچتے تھے۔"

"اور تیرا کوئی نہیں؟"

"نہ۔"

"اجی جس کا کوئی نہ ہو اس کا خدا ہے۔" شیخ صاحب کی بیوہ بہن نے پن کٹی پر سے سر اٹھا کر ارشاد کیا۔ "ادھر آ ــــ ذرا میرے سر میں تیل لگا دے۔ اچھی طرح ــــ یہ پٹاری چھوڑ۔ رکھ ادھر۔ کیا اس میں خزانہ لے کر آئی ہے ہیرے کے زیور ہیں جو اس سے چمٹی کھڑی ہے۔ کیا ہے اس کے اندر؟"

"کپڑے اور گڑیاں۔"

سب نے قہقہہ لگایا۔ نواب فاطمہ کے دل پر چوٹ پڑی ــــ

"لا اپنی گڑیاں دکھا۔ کس نے بنائی تھیں؟"

"اماں نے۔"

"اے ہے چھوڑ نگھنی کی پٹاری۔ اسے کام پر لگاؤ۔ پہلے تیل ڈال سر میں پھر ذرا ایک لر مسالہ تو پیس دیجیو — شاباش —"

سو ننھی سی جان نواب فاطمہ جو اب نوابن چھوکری کہلاتی ہے روٹی کپڑے پر شیخ عبدالباسط گوٹے والے کے ہاں ملازم ہے پیشکار صاحب نے پلٹ کر اس کی خبر نہ لی۔ نہ شیخ جی نے کبھی اس کے متعلق کچھ پوچھا — دلّی شہر میں ہزاروں یتیم بچے رُلتے پھرتے ہیں — جب نواب فاطمہ کے ساتھ یہ غضب ہوا۔ اس کے ولی نے امانت میں خیانت کی۔ اس کی جائیداد پر قابض ہوا اس بڑھیا کو خبر ہی نہ تھی کہ اس کے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے۔ مگر دن بھر کے کام سے تھک کر جب رات کو سونے لیٹتی تو گلی شاہ تارا اور اپنا گھر اکثر آنکھوں کے سامنے آجاتا ایک ایک چیز کو یاد کرتی۔ سہ درے میں نعمت خانے کے برابر گلاب کے پودے کا گملہ رکھا تھا۔ صحن میں چنبیلی اور ہارسنگھار کی کیاریاں مرزا دلدار شوقین نفیس طبع آدمی تھے۔ مکان مشہد مقدس اور کربلائے معلیٰ کی تصاویر اور طغروں سے سجا رکھا تھا۔ مُنّے سے امام باڑے کی سیاہ چھت گیری میں بہتّر شہدا کے نام کارچوب سے کڑھے ہوئے تھے۔ سامنے دالان میں اماں کے جہیز کا ایرانی قالین بچھا رہتا۔ چاندنی کے چاروں کونے پر بھرت کے میر فرش۔ وسط میں مسند۔ پلنگوں پر نفیس سوزنیاں۔ چھت پر کبوتروں کے کابک۔ وہ ایک ایک چیز کا تصور کرتے کرتے سو جاتی کبھی رات کو وہ محرم کا زمانہ یاد کرتی پہلی سے اربعین تک کے نوحے جو ابا پڑھا کرتے تھے اور ایک بار وہ سب آگ گاڑی میں بیٹھ کر لکھنؤ گئے تھے محرم کرنے۔ دھندلا سا یاد تھا۔ اور ایک بار نانا ابا کے ہاں شاہ گنج آگرے اور شہید ثالثؒ کا روضہ۔ اور خوب دال موٹھ اور پیٹھے کی مٹھائی کھائی تھی اور نوحے جو ابا پڑھتے — یارو چہ؟ خون۔ کہ؟ دیدہ چساں؟ روز و شب۔ چرا؟ در غم کدام؟ غم سلطانِ کربلا۔ نامش چہ بکر؟ حسینؑ۔

زنشراد کہ ؟ از علیؑ ـــ مادرش کہ بود ؟ فاطمہؑ ۔ جدش کہ ؟ ۔ مصطفیٰؐ ـــ چوں شد ؟ شہید شد ۔ بہ کجا ؟ دشت ماریہ ـــ

عموماً وہ قوآنی کا یہی نوحہ دہراتے سو جاتی ہے ۔ فجر کی اذان کے ساتھ کلمہ پڑھتے ہوئے اُٹھ بیٹھتی ہے ۔ آنگن کے کنویں میں ڈول ڈال کر پانی نکالتی ہے مُنّے مُنّے ہاتھوں سے چرخی کی رسّی کھینچتی ہے ۔ تب جا کر ڈول اوپر آتا ہے ۔ شب کشتہ شد ؟ نہ ۔ روز ۔ چہ ہنگام ؟ زسر چشمۂ فنا ۔

نواب فاطمہ ڈول سے پانی نکال کر اپنا لوٹا بھرتی ہے ۔ منڈیر پر بیٹھ کر وضو کرتی ہے اتنی دیر میں گھر والے نماز کے لئے اُٹھ جاتے ہیں ۔ خود نماز کے بعد وہ بہو کے ساتھ مل کر گھر بھر کا ناشتہ تیار کرتی ہے ۔ جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر آنگن میں دھری سِل پر ڈھیروں مسالہ پیسنے میں جُٹ جاتی ہے ممدو ڈیوڑھی میں آکر سودا سلف دیتا ہے وہ خود ہاتھ بڑھا کر اس سے لے لیتی ہے ۔ اب وہ نو سال کی ہو چکی ہے ۔ اس کے لئے چھوٹا سا برقعہ سِلوا دیا گیا ہے ۔ میلے کپڑے ۔ الجھے بال ۔ پٹاری خالی پڑی ہے ۔ دو جوڑوں سے کتنی بھر سکتی ہے ۔ گڑیاں گڈّے البتہ اس میں حفاظت سے رکھے ہیں ۔ جب کبھی فرصت ملتی ہے نکال کر ان سے کھیل لیتی ہے نقلی موتیوں کا ہار اور چند چوڑیاں بساط خانے سے شیخ صاحب اپنی پوتی عوثیہ کے لئے لائے تھے اُسے پسند نہ آئیں اس نے نواب فاطمہ کو دیدیں وہ سینت کر پٹاری میں رکھ لی ہیں ۔ عید پر پہننے کے لئے ۔ اس کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں تھیں وہ شمر کے ہو توں سوتوں نے اتار لیں اپنے گھر سے چلتا کرنے سے پہلے ۔ دیکھو کلام مجید میں بار بار آیا ہے کہ یتیموں کا مال غصب کرنے والے کتنے بڑے گنہگار ہیں ۔ خائینوں منافقوں ریاکاروں اور حاسدوں کے کرتوت دیکھ کر قرآن کریم کے ایک ایک حرف پر ایمان لانا پڑتا ہے بوا ۔

آغائے تازہ ولایت دادا کی پوتی گلرخ کا رنگ ٹپکا پڑتا تھا ۔ گھنے سیاہ بال سُتواں ناک سرمگیں آنکھیں کیا پری رُو مغل بچی تھی کہ اس افلاس اور مصیبت میں بھی چاند سا روشن ہوتا جا رہا تھا ۔ تیرہ سال کی ہو چکی ۔ شیخ عبدالباسط کی بیوی نے طے کیا اگلی

ربیع الاوّل ممدو چھو کرے کے ساتھ دو بول پڑھوا دیں گی۔ کنواری جوان لڑکی گھر میں رکھنا گناہ۔ وہ خود شیخ صاحب کی طرف سے ان کی بہوئیں اپنے اپنے شوہروں کی طرف سے چوکنی ہو گئی تھیں۔

گوٹے والوں کے اس دولت مند مذہب پرست گھرانے کی فربہ مطمئن بیویاں چوڑے پائینچوں کی شلواریں پہنے کرتوں پر موٹے موٹے طلائی بٹن لگائے ٹھوس پیلے سونے کے شیر دہاں کڑے کلائیوں میں پھنسائے دن بھر پان چباتیں اور مرغن کھانے تیار کرتیں۔ شیخ صاحب کی بیوی۔ بیوہ بہن۔ دو بہوئیں اور ایک پوتی غوثیہ جو نوابن سے دو تین سال چھوٹی تھی سب کی سب ہر وقت کھانا پکانے میں جُتی رہتیں۔ گھر کے مرد زیادہ تر دکان پر رہتے یا مردانے میں۔ نہایت خوش باش اور بے فکری مستورات کھانے کھلانے نذر نیاز، شب برات، گیارہویں شریف، بی بی کی صحنک امام جعفر صادقؑ کے کونڈے، ساون کے پکوان، موسمی کھانوں، گھر یلو تفریحوں میں ہمہ تن مصروف اور مگن۔ کوئی شادی ہوتی اس کی ریت رسمیں ہفتوں مہینوں جاری رہتیں۔ نوابن دن سے لے کر رات تک کام کرتے کرتے ادھ موئی ہو جاتی ابھی اس کے کان میں بھنک نہ پڑی تھی کہ نیم پاگل ممدو سے اس کا بیاہ ہونے والا ہے۔ ایک دن معلوم ہو گیا۔

بڑی بہو کپڑے دھوپ میں ڈال رہی تھیں گوٹے لچکے سے لپے بادلے کا ایک پرانا دُھرانا سُرخ دوپٹہ نکال کر ایک طرف کو رکھا ——— ان کی لڑکی غوثیہ نے کہا امّاں لاؤ ہمیں دو۔ ہم گڑیا کے دوپٹے بنائیں گے۔

"رہنے دے" ماں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "نوابن کا بیاہ سر پر آرہا ہے۔ نگوڑی دلہن بن کر کیا اوڑھے گی؟"

قریب کھڑی نوابن دُھوپ میں لال پیلی مرچیں سُکھا رہی تھی دھک سی رہ گئی۔ میرا بیاہ کس سے ہو رہا ہے؟ رات کو کھٹولی پر لیٹنے سے قبل اس نے غوثیہ سے پوچھا "ممدو سے اور کس سے؟" غوثیہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"ممدوُستے؟" نوابن نے بھونچکّی ہوکر دہرایا۔
"تو اور کیا تیرے لئے حیدرآباد کا شہزادہ آئے گا؟" یہ کہہ کر غوثیہ نے تختوں کے چوکے پر لوٹ لگائی اور خوب ہنسی۔

اس رات جب سب سو گئے نوابن کھٹولی سے اٹھی۔ تاروں کی چھاؤں میں دبے پاؤں چلتی جا کر کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ ایک بھوری بلّی چھت پر سے کود ی۔ بے مروّت بے رحم زرد زرد آنکھوں سے اُسے گھورتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ دور ایک کتّا رویا۔ بڑا خوفناک سنّاٹا طاری تھا ــــ سارا دلّی شہر سویا پڑا تھا اس وقت اس نے محسوس کیا کہ ساری دنیا دشتِ ماریہ ہے اور اس میں وہ تنہا کھڑی ہے۔ اور اس سے زیادہ ستم رسیدہ ہونا ممکن نہیں ہے اس لمحے اس نے طے کیا کم از کم ایک دن قبل بتا ہیں گے کہ نکاح ہو رہا ہے بس رات کو چپکے سے آ کر اسی کنویں میں کود جاؤنگی یہ طے کر کے اُسے ذرا سکون سا محسوس ہوا اور وہ واپس آ کر اپنی کھٹولی پر پڑ گئی ــــ

(۸)

چورن والی چھبّن

گرمی جاڑے برسات دلّی کی گلیوں میں، اور چاندنی چوک میں پھیری والے بھانت بھانت کی صدائیں لگاتے۔ قدرت کا بنا جلیبا کھالو — گل گلاب بھدانہ — قند میں بنا بھدانہ — شاہ مرداں کی لالٹرباں — تیس ہزاری باغ کے پونڈے ہیں لے چل —

ان آوازوں میں ایک کمسن لڑکے کی منحنی آواز بلند ہوتی — اجی تسبیحیں آئیں مدینے پاک سے — چورن ہے لوکتے شریف کا۔

اس باریک صدا پر کراری کرخنداری آوازیں غالب آجاتیں — اوئے میاں۔ شبدہی گوہر کے باغ کا دانہ قند میں بنا — کھانڈ کا کھلونا ہے پیسے کا — کھانڈ کی لکڑی ہے پیسے کی — چاٹ ہے — ہندوستان کے میوے کی۔ چاٹ ہے ہندوستان کے لٹکے کی — ساس کے چورے کا گٹکا —

بچہ پھر پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلاتا — مکّہ شریف کی چورن — آب زمزم میں پسی چورن — لکڑ ہضم — پتھر ہضم — چورن —

ایک برقعہ پوش بڑی بی تھیلا سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ رینگا کرتیں۔

موسم گرما میں صدائیں بدل جاتیں — پھول والے پکارتے — بہار ہے موتیا میں — جی مدّن بان ہے موتیا کے کٹوروں میں — پانچوں کپڑے معطّر ہوتے ہیں چنبیلی میں — گڈّی ہے چمپا کی۔ بڑے کنٹھے ہیں رائے بیل چنبیلی کے —

بہشتی کٹورا بجاتے — کوئی طالب اللہ پلا دے سبیل۔ کوئی طالب حسینؑ کا پلا دے سبیل۔ ٹھنڈا بھر کے لائے ہیں پانچ کوڑی میں — تیرے پاس ہے تو دے جا۔ نہیں تو پی جا راہِ مولا — پیاسو سبیل ہے شہیدوں نام کی —

—— مکّے شریف کی چوُرن ۔ آبِ زم زم ۔
—— رنگت کے گھڑے ہیں لال تربوز —— جامنیں نوُن والی۔
—— بوندا باندی جھڑ بادل کے —— جھرنے کا بتاشہ گولر ہے ۔
—— دیا سلائی بے آگ روشن ۔ بے آگ مہتاب ۔
—— مُرمرا ہے بانس متی کا —— سنگھاڑے ہیں شمسی تلاؤ کے ہرے دودھیا ،
—— خاکِ شفا کی تسبیح ۔

رات پڑے بڑی بی اور بچّہ کسی سائبان کے نیچے جا بیٹھتے ۔ بچّہ نانبائی سے کھانا خرید لاتا ۔ سر جوڑ کر دونوں کھاتے اور وہیں پڑ کر سو رہتے ۔ بھادوں کے جھالے نے ستایا تو چوُرن والی جّن بی نے اِکّے پر بیٹھ کر سلطان جی کا رخ کیا ۔ وہاں ایک پھاٹک کے کونے میں ہاون دستے میں چوُرن کوٗٹتیں پیستیں ۔ دو دو پیسے کی پُڑیاں زائرین خرید لے جاتے رات کو چند قدم پر سنگ سرخ کی اس سرائے میں جا پڑتیں جہاں پانچ سو سال ادھر ابن بطوطہ نے قیام کیا تھا ۔

پیرانی اماں کے گھر سے نکل کر جّن بی نے اللہ توکّل تسبیح بیچنی شروع کی تھی مگر آواز لگانے سے بے طرح جھینپ رہی تھی تبھی دوسرے روز ہی سے یہ یتیم بے خانماں بچّہ ایک وفادار کُتّے کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا ۔ جّن بی نے اسے غیبی امداد جانا ۔ اسے صدا لگانا سکھلایا ۔ اور گویا باقاعدہ اپنی بزنس شروع کر دی ۔

سلطان جی آئے ایک مہینہ گذرا تھا ۔ لونڈا دلّی کی گلیوں کا روڑا محبوب الٰہی کے آستانے پر دل نہ لگا —— ایک روز جب فجر کی اذان پر جّن بی کی آنکھ کُھلی ۔ دیکھا لڑکا غائب ۔ ساتھ ہی جّن بی کا خریطہ ندارد جس میں انھوں نے اپنی ساری پونجی کا اندوختہ کیا تھا ۔ گھبرا کر جامہ دانی میں سے کُھنّی نکالی ۔ صرف ایک روپیہ ملکہ کے چہرے والا ٹھن سے گرا ۔ اپنا بے بضاعت سامان باندھ اللہ اللہ کرتی سرد آہیں بھرتی پھر باہر نکلیں طے کیا مہرو کے گھر واپس چلی جاتیں ۔ راستے بھر سوچا کیں ۔ گاڑی ایک قبرستان سے

گذری دفعتاً خوف خدا نے پھر آن دبوچا۔ فرشتوں کے گرز۔ تھوہڑ کی بھجیا۔ آب زقوم — ہمیشہ ہمیشہ۔ جب تک اللہ گنہہ گار مومنین کو پوری سزا نہ دے لے۔

بلّیماروں میں پہنچ کر کرایہ ادا کیا۔ اور اتر گئیں۔ صدا لگانے کی ہمت نہ پڑی۔

ارے اسی نغمہ آرا، کی پری نانیں بڑے بڑے گُنی جنوں کو مسحور کرتی تھیں۔ راگ سے روگ کاٹتی تھیں۔ کوہ قاف کی پری کہلاتی تھیں۔

اس وقت حلق سے ایک نحیف آواز نکلی — مدینے شریف کی چُورن —

ایک چڑی مار پنجروں کی بہنگی اُٹھائے چلاّتا ہوا آیا۔ ٹوئیاں طوطا ہے پالنے کو — نر بچہ ہے ہیرا من طوطے کا — کالا کوا چھوٹے — چھوڑ دیں جل جو گنے کو — جھڑا دو۔ دو جانور ہیں۔ بسیرا پا دیں۔

اے میرے مالک پروردگار عالم مجھے بھی کہیں پناہ دلوا دے جمّن بی نے ہل ہلا کر دعا مانگی۔ پنجروں میں بند پرندے بے پناہ شور مچا رہے تھے۔ جمّن بی نے پھر اہل دُنیا کو مطلع کیا "تسبیح ہے کربلائے معلّٰی کی تسبیح ہے خاک شفا کی" — لیکن آواز مفید چڑیوں کی فریادیں ڈوب گئی۔ آخر تھک کر گلی کے کنارے کھڑی ہو گئیں۔ برقعے سے ریلوے سگنل کی طرح ہاتھ باہر نکالا۔ کلائی میں زنگار رنگ تسبیحیں — مجسّم سوال۔

تین چار دن اس طرح گذرے۔ کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو دروازوں پر جا کر دستک دیتیں —— "خاکِ پاک کی تسبیح —— چُورن مکّے شریف کی —" رات کو ایک خالی دوکان کے برآمدے میں جا پڑتیں۔ جمعرات کے روز پھیری پر نکلیں حویلی حسام الدین حیدر کے پھاٹک میں مُڑ گئیں۔

مبارز الدولہ حسام الملک حسام الدین حیدر غالب کے خسر نواب الٰہی بخش معروف

کے عزیز دوست تھے انکے بیٹے حسین مرزا سے مرزا نوشہ کا لڑکپن سے یارانہ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ کی تباہی کے بعد حسام الدین حیدر کی وسیع و عریض حویلی کے اندر "مجیز" اور دیگر "پنجابی" آن بسے تھے۔ یہ خوردہ فروش نسلاً ملتان کے کھتری تھے ۔ صدیوں قبل ان کے تجارت پیشہ اجداد کو حضرت شمس الدین گردیزیؒ نے کلمہ پڑھایا تھا۔ بساط خانے کے کاروبار کی غرض سے بعہد شاہجہاں دہلی پہنچے۔ غدر ۵۷ء کے چار پانچ سال بعد انگریزوں نے انکے محلّے سے انہیں بیدخل کر کے اس جگہ ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا۔ انہوں نے احاطہ کالے صاحب، پھاٹک حبش خاں اور حویلی حسام الدین حیدر میں اپنے گھر بنا لیے۔

چوکیدار نے پھاٹک کا دروازہ کھولا۔ جمّن بی بہت آہستہ آہستہ چلتی گلی گنو خانہ میں کو ہولیں۔ ایک ڈیوڑھی کی کنڈی کھڑکھڑائی کہ گلی کا کتا دوڑ پڑا۔ دہل کر الٹے پاؤں لوٹیں کچھ دور جا کر ایک تنگ و تاریک کوچے میں قدم رکھا۔ ایک شاندار دروازہ دکھلائی دیا۔ سیڑھی پر جا کر دستک دی۔ آواز لگائی۔ "تسبیح خاک پاک کی ۔"

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول۔ وہ برقع سر پہ ہے جسکا قدم تلک ہے طول۔ اور انکے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ ہے اصول ۔ کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول ۔۔۔ سودا کی دلّی سے داغ کی دلّی تک شہر آشوب مسلسل ہے۔ اور دلنواز بانو بیگم بھی تو اصلاً نجیب زادی ہی تھیں۔

(۹)

پریوں کا کھٹولہ

جمعرات کے روز فقیر بھانت بھانت کی صدائیں لگاتے۔ نوابن ڈیوڑھی میں جاکر کسی کو آٹے کی چٹکی دیتی، کسی کو پیسہ۔ ٹکہ۔ پائی۔ چھدام۔ کوڑی۔ جو جسکا مقرّر اور مقدر ہوتا۔ خالی کے مہینے میں ایک جمعرات کنڈی کھڑکی۔ نوابن نے باہر جھانکا۔ میلا برقعہ اوڑھے ایک بڑی بی در میں کھڑی تھیں۔ ایک ہاتھ میں اگر بتّی کے بنڈل دوسرے میں ، چورن کی شیشیوں کا تھیلا۔ کلائی میں تسبیحوں کے رنگ برنگے لچھے۔ گویا سرتاپا ایک کوچہ گرد حجن۔ ان سے پوچھے بغیر نوابن نے پلٹ کر آواز دی
"بیوی۔ حجن بی آئی ہیں مکّے مدینے سے۔"
شیخ عبدالباسط کا چھوٹا پوتا صبح سے بخار میں پڑا بھُن رہا تھا۔ تیمارداری میں مصروف دادی نے جواب دیا "کہدے برکت ہے۔ پھر آئیں۔"
"اے ہے بھابی حجن ہیں۔ منع نہ کرو۔ گناہ ہوگا۔ اے نوابن۔ بُلالے" نند نے باورچیخانے میں سے پکارا۔

حجن گزرگاہ سے نکلتی صحن میں آئیں۔ سہ درے میں پہنچ کر تسبیحوں والا ہاتھ پھر سگنل کی طرح سامنے کر دیا۔ بولی کچھ نہیں۔ اب وہ بولتی بہت کم تھیں۔
"السّلام علیکم۔ بیٹھئے۔" شیخ جی کی بہن نے تپاک سے کہا۔
"وعلیکم السّلام۔" پیڑھی پر بیٹھ گئیں۔ دوپٹے سے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ سرخ و سفید رنگت، کھڑے نقشے والی ان جیسی مصیبت زدہ قبول صورت عورتوں سے شہر پٹا پڑا تھا۔ گو غدر کو چھتیس ۳۶ سینتیس ۳۷ برس ہونے آئے۔

جن بی نے اپنی ایک سوانح حیات گھڑ رکھی تھی جو بوقت ضرورت پرسانِ حال کو سنا دیتی تھیں نہ بھی سناتیں تو لوگ سمجھ لیتے کہ ایسی ہی کوئی بپتا رہی ہو گی۔ سارا ملک ہی اتنی بڑی ٹریجڈی بن چکا تھا۔

"بُوا کہاں سے آئیں" شیخ جی کی بیوی نے پوچھا۔ جنّن بی نے قصّہ شروع کیا۔ باپ کا قلعہ سے تعلق تھا۔ سنہ ستّاون میں مارے گئے۔ شوہر کے ساتھ حج کو گئیں۔ وہاں وہ چل بسے۔ نہ آل نہ اولاد۔ اللہ کی ذات کا سہارا۔ ایک کٹورہ پانی پلوا دو۔ حاجی کی خدمت ثواب۔ نوابن نے پانی کے کٹورے کے ساتھ ایک صحنک میں تھوڑا سا سالن اور ڈلیا میں رکھ کر ایک روٹی ادب سے پیش کی۔ جنّن بی نے تکلّف کیا۔ سالن ذرا سا چکّھا۔ پانی پی کر نوابن کو دعائیں دی ـــــ بیویوں نے ایک ایک تسبیح چُن کر آنکھوں سے لگائی۔ ہدیہ نذر کیا۔ انھیں نے بتایا سات بار حج کر چکی ہیں شیخانی نے انکے ہاتھ چُومے۔ ایک پُہنچا ادھ جلا دیکھ کر پُوچھا "اُوئی۔ اب سے دُور یہ کیا ہوا تھا مغلانی بی؟"

"جدّہ کے راستے میں آگ بوٹ پر کھانا پکانے کے لیے انگیٹھی دہکا رہی تھی۔ روئی کی صدری پر چنگاری ایسی پڑی شعلے بھڑک اٹھے۔ جہاز کے فرنگی ڈاکٹر نے علاج کیا۔ پروردگار کا کرم تھا ورنہ جل کر کوئلہ ہو گئی ہوتی۔"

جس اللہ کی بندی نے سات بار حج کیا ہو وہ ایسے سفید جُھوٹ بولے۔ مگر وہ علیم و خبیر میری ہر مجبوری سے واقف ہے۔ شاید معاف ہی کر دے۔ سامنے نگاہ کی۔ دھوپ چھتوں پر سے اتر رہی تھی۔ باوضو تھیں۔ کٹورے کے بقیہ پانی سے کُلّی کی۔ فرش پر برقعہ بچھا کر عصر کے لیے کھڑی ہونے والی تھیں کہ شیخ جی کی بہن لپک کر مصلّے لے آئیں۔

جب یہ سلام پھیر چکیں شیخانی نے آواز دی "اے جنّن بی لونڈا صبح سے بخار میں پُھنک رہا ہے۔ بہتیری دوائیں پلائیں۔ ذرا کچھ پڑھ کر پھونک تو دیجیو۔"

یہ فوراً بڈ بڈ کرتی جھکی جھکی لڑکے کے سرہانے پہنچیں۔ دعائیں پھونکیں۔ پانی دم کرکے پلایا۔ قرآن شریف کی ہوا دی۔ اے لو۔ مغرب تک چھوکرے کا بخار کم ہو گیا۔ گھر بھر جمن بی کا معتقد۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کے تسبیحوں کو واپس بائیں ہاتھ کی کھونٹی پر لٹکایا۔ چلنے کے لیے اٹھیں۔ شیخانی نے پوچھا۔ "کہاں رہو ہو ———"

"آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر۔"

"اے تو یہیں رہ جاؤ نا۔ اپنا گھر سمجھو۔ لونڈیوں کو کلام مجید پڑھا دینا۔"

جمن بی نے اطمنان کی گہری سانس لی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر دل میں خدا کا شکرادا کیا۔ ذرا ہچکچا کر بولیں "تو میں اپنی گدڑی لے آؤں۔ چتلی قبر سے ——— ؟"

"کل لے آنا بوا اب رات کو کہاں جاتی پھرو گی۔ اری نواب جمکو۔ کھانا نکال۔"

برقعہ اتار کر کھٹولے پر۔ چھوٹی بہو نے پاندان آگے سرکایا۔ نواب طباقچہ لیکر آئی۔ اب انھوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ لگتا تھا کئی دن کی بھوکی تھیں۔ دکھیا۔ مغلانی بی۔

آٹھ برس عربستان میں بسر کر کے مغلانی بی عربی داں ہو چکی تھیں۔ فارسی اردو میں پہلے سے برق کشیدہ کاری سوزن کاری طباخی میں طاق۔ خوش الحان نعت خواں۔ محلے میں جہاں مولود شریف ہو جمن کے لیے نیوتہ موجود۔ مگر انھوں نے کہہ رکھا تھا اس گھر سے قدم نہ نکالیں گی سو بیبیاں نعت خوانی سننے انکی شیخ جی کے ہاں آجاتیں۔ محرموں میں دس دن مغلانی بی نے شہادت نامہ پڑھا۔ محلے والیاں چپ چاپ بیٹھی سنا کرتیں۔ عشرے کی صبح صحن میں دیغ گاڑ کر بڑی بہو نے کھچڑا گھونٹا۔ دیغ پر کلاوہ بندھا۔ کھچڑا اور دودھ کا شربت کورے دسترخوان پر چنا گیا۔ مغلانی بی نے "اماموں کی نیاز" دی۔ نواب فاطمہ کو اپنے گھر کی اعزاداری یاد تھی۔ جو اس پھیکے بے رنگ محرم سے خاصی مختلف اور بہت شور شرابے کی ہوا کرتی تھی۔ شیخ عبدالباسط کے ہاں عشرے کے روز سب روزہ رکھتے۔ اس مرتبہ نواب فاطمہ

بول پڑی: "ہماری اماں تواسے فاقہ کہتی تھیں۔ چار بجا توڑا کریں تھے۔" وہ اتنی غیر اہم ہستی تھی کہ گوٹے والوں کے ہاں کسی نے آجتک یہ بھی نوٹس نہیں کیا تھا کہ وہ وضو کرتے ہوئے پاؤں پہلے دھوتی ہے۔ اب جا کر اتنے برسوں بعد شیخ عبدالباسط کی بیوی کو پتہ چلا کہ نواَبن رافضیوں کی اولاد ہے۔ چُپ رہیں۔ وسیع المشرب حجّن بی کے دعظوں سے مستفید ہو چکی تھیں۔ دل میں انھیں کے الفاظ دہرائے۔ تُو اسب اللہ کے بندے اور ایک رسول پاکؐ کی امتّ ہیں۔

محلّے والیاں حجّن بی کو مغلانی جی یا آتو جی بھی پکارتیں۔ چُورن کے علاوہ وہ مکہ شریف سے ترکی اور عرب دوا دارُو کے چند نسخے لیتی آئی تھیں۔ مرحوم نیم حکیم میاں کی صحبت میں نیم حکیمنی ہو چکی تھیں۔ اڑوس پڑوس کی مستورات دم درُود دوا علاج معالجے کے لیے آنے لگیں۔

ڈیوڑھی کے مقابل والی صحنچی میں حجّن بی اپنا کھٹ کھلارے بیٹھی رہتیں۔ سرہانے طاق میں بڑی رِحل۔ دینی رسالے۔ تلے دانی۔ سُرمے دانی۔ دواؤں کی شیشیاں۔ کھٹولے کے نیچے پیٹی۔ دریں نماز کی چوکی۔ دن بھر گھونگٹ کاڑھے اہل خانہ کے مسلے مسایل لڑائی جھگڑے طے کیا کرتیں۔ عصر مغرب کے درمیان غوثیہ اور نواَبن دوپٹیاں سر پہ سلیقے سے پیسٹ جُزدان سنبھالے حاضر ہوتیں۔ محلّے کی چند بچیاں بغدادی قاعدے اور سپارے لیکر آجاتیں۔ عربی داں آتو جی تیسوں کلام ناظرہ کے بجائے سمجھا سمجھا کر پڑھاتیں۔ سچ ہے کوئی گرلز کالج اسوقت موجود ہوتا تو حجّن بی اس میں پروفیسرنی بن سکتی تھیں۔ اتنی قابل تھیں دُکھیا۔

مکتب کے بعد مغرب عشاء کے درمیان محلّے والیوں کی دوا دارو کرتیں اسی وقت نواَبن کو کام کاج سے فرصت ملتی وہ غوثیہ اور ملاّنی جی کی ننھّی شاگردوں کے ساتھ آنگن میں کھیل کو دیتی وسیع ڈیوڑھی میں ایک شکستہ پالکی پڑی ہوئی تھی۔ اور چند خالی کریٹ جن میں بساط خانے کا سامان بمبئی کلکتہ کی بندرگاہوں سے شیخ عبدالباسط اینڈ سنز کے ہاں آتا تھا۔ اسی نیم تاریک گزرگاہ میں پہنچ کر کہار ہانک

لگاتے ــــــ سواری اترو الو۔ نواب فاطمہ، غوثیہ اور مکتب کی بچیاں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اکثر اس ٹوٹی پھوٹی بینس یا کسی کریٹ یا مغلانی بی کی کسی ارادتمند کی خالی ڈولی میں جا چھپتیں۔

تیرہ تیزی کی ایک شام بعد اذان مغرب آسمان کی گلرنگ وسعتوں سے سپید اور سرمئی کبوتر اپنی چھتریوں پر لوٹ رہے تھے، پتنگیں چھتوں پر واپس اتاری جا رہی تھیں، کہار چلاّئے سواری اتروا لو۔

حسب معمول نواین نے دروازے کی اوٹ سے جواب دیا "بیوی آجائیے پردہ ہے"۔

ایک سفید شٹل کاک برقعہ جھپاک سے اندر۔ متوسط اندام نو وارد نے نقاب اٹھائے بغیر سر گھما کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ گھر کی بیویاں وضو نماز میں مشغول تھیں۔ مغلانی بی اپنی صحنچی میں نیت باندھنے والی تھیں کہ برقعہ پوش انکی طرف لپکی۔ قریب جا کر چپکے سے کچھ کہا۔ مغلانی بی نے ایک صندلی کی جانب اشارہ کیا۔

نواین پان کی ڈھولی لیکر ادھر سے گزری تو وہ دبک سی گئی۔

مجنّن بی کے پاس اب رقم رقم کی مستورات آنے لگی تھیں بہت سی سمجھتی تھیں کہ ملاّنی جی عامل بھی ہیں۔ نظر بد، آسیب، مسان کا اتاز کر دینگی۔ اس امید پر وہ بے چاریاں چپکے چپکے اپنے دکھڑے رویا کرتیں۔

یہ بیوی کھڑی ڈولی آئی تھیں۔ برقعے میں سے صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ اٹھ کر ڈیوڑھی میں پہنچیں۔ کہار اندر آئے۔ غائب۔

تیرہ تیزی کی گئی گئی وہ اجنبی عورت مدار کے مہینے میں ایک شام پھر وارد ہوئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ لیکن مجال ہے جو چہرے سے نقاب اٹھائی ہو۔

تیسری بار جب آئی جاڑوں کا زمانہ تھا۔ مغرب عشاء کے درمیان گھر والیاں شب دیگ کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ کھرے پر اکڑوں بیٹھ کر دو چار بھگونے

مانجھنے کے بعد نواَبن ہمجولیوں کے سنگ آنکھ مچولی میں جُٹ گئی۔ ساری لڑکیاں آنگن کے کونوں کھُدروں میں غائب ہو چکی تھیں۔ غوثیہ انکو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ نواَبن دوڑ کر سُنسان ڈیوڑھی میں پہنچی۔ انھیں نقاب پوش بیوی کی ڈولی کا پردہ اٹھا کر اسکے اندر سمٹ گئی۔

کہار باہر منتظر تھے۔ قدموں کی آہٹ اور کھٹولی کے چرچرانے سے سمجھے بیوی آگئیں۔ بیوی کا حکم تھا جُوں ہی سوار ہوں جھٹ اندر آجاؤ۔ انھوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی۔

ایک ثانیے کے لیے نوابن کو گمان ہوا۔ دو لڑکیوں نے کھیل کھیل میں ڈولی اٹھالی ہے۔ ابھی دھم سے واپس رکھدینگی۔ مگر اے لو۔ وہ تو باہر نکل گئی۔ کہار ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ نوابن کی سِٹّی گُم۔

ڈولی گلی گئو خانہ سے ہوتی بزریا میں پہنچی۔ نوابن نے پردے میں سے جھانکا۔ گھِگھّی بندھ گئی۔ کہاروں کو روکنا چاہا۔ لیکن آواز غائب۔ جب سے وہ مرزا سبط احمد کے مکان سے تانگے پہ بیٹھ کر شیخ عبدالباسط کے ہاں آئی تھی پچھلے چھ سال میں اس گھر سے بہت کم باہر نکلی تھی۔ چھوٹی تھی تو بیویاں سودا سلف منگوانے گلی کی دوکان پر بھیجدیتی تھیں۔ اب چار برس سے وہ پردے میں بیٹھی تھی۔ ان سب کے ساتھ ہر سال سلطان جی کی سترہویں میں البتہ ہو آتی تھی۔ اور ساون میں مہرولی۔ جہاں قطب صاحب کی امریوں میں ہنڈولے پر پینگیں بڑھاتی کن سُری غوثیہ کے ساتھ اپنی سُریلی آوازیں "جھولا کِن نے ڈالو ری امریاں" الاپا کرتی۔ — بیویاں اس سے "گڑا رہی ہنڈولا میرے بابل کے گھر" اور "نیلی سی گھوڑی پاتلی" بھی بار بار گواتیں۔

گلی قاسم جان، کانکڑ۔ کٹرہ عالم بیگ۔ کوچہ رحمٰن۔

بارہ دری شیر افگن تک پہنچتے پہنچتے نوابن کو بازار کی پہچان نہ رہی۔ اتنی دور وہ کبھی نہ آئی تھی۔ اب وہ محلہ چرخہ والاں سے گزر رہے تھے۔ کوچہ بی بی گوہر پیچھے

رہ گیا۔ گلی کائستھاں کا موڑ آیا۔ اسکے بعد ایک چوڑی سڑک۔ گیس کے ہنڈوں سے روشن۔ بازار دو رویہ دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں۔ چند ایک میں سے چھُن چھُن کی آواز آرہی تھی۔ سُنا تھا چھلاوے پائیاں چھُن چھُن کر کے چلتی ہیں۔ دہشت بڑھتی گئی۔ کہار ایک بڑے پھاٹک کے اندر پہنچ کر بولے "اترییے۔ بی صاحبہ۔"

دوبارہ آواز دی۔ نواب فاطمہ چُپ۔ کہاروں نے پردہ اٹھایا۔ اندر ایک نوعمر لڑکی۔ چاند سا چہرہ۔ پھٹی پھٹی آنکھیں۔ میلے کپڑے۔ بے اوسان۔

"ابے چھیدُو یہ کیا معاملہ ہے۔ بی صاحب کہاں رہ گیئں؟ کیوں ری؟ بائی جی نہ آئیں؟ تو کون ہے؟"

نوابن چُپ۔

بنواری کہار نے آواز دی "شُبراتی بھائی!"

جُما بنواڑی۔ کے چبوترے پر سے ایک کرخندار اتر کر پھاٹک میں آیا۔ چھیدُو لال انگوچھے سے منہ پونچھتے ہوتے بولا "اوپر جاکر خبر دو۔ بی صاحب یہاں سے تو بھلی چنگی گئی تھیں۔ کسی حکیمنی کے دھورے۔ وہاں سے اس لمڈیا کو بھیجا ہے۔ ارے مُنہ سے پھُوٹ!"

کرخندار لپکا ہوا کوٹھے پر گیا۔ البیلی کُٹنی کو بُلا لایا۔ البیلی ذات کی نائن۔ بلحاظ پیشہ دلّالہ اور اب عرصے سے مہرو جان کی گرل فرائیڈے۔ چاوڑی میں مشہور تھا کہ اسکا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ چھیدُو نے قصّہ دہرایا۔ نوابن پھُسر پھُسر رونے لگی۔

"ارے لوگو غضب ہوگیا۔ ارے سنو۔ کوئی سُن جاؤ۔ چھیدُو بنواری کیا کہتے ہیں" البیلی سر پر دو ہتڑ مار کر چلائی "ارے بیوی کے دشمنوں کو کچھ ہوگیا" گلی کے اوباش تماش بین پھاٹک میں جمع ہوگئے۔ پل کی پل میں چاوڑی بازار میں اُڑ گئی بی مہرو دوالا نے کسی شیدی سی حکیمنی کے ہاں گئی تھیں۔ وہیں چل بسیں۔ حکیمنی کے گھر سے سنائونی آئی ہے۔

تین سازندے دھپ دھپ کرتے اوپر سے اترے۔ روتی بلکھتی نوابن کو

پکڑ کر چوبارے پر لے گئے۔ اس وقت اچانک نواب فاطمہ کو احساس ہوا کہ نہ برقعہ نہ ڈلائی وہ کھلے منہ بے پردہ، مردوں کے ہجوم میں گھری کھڑی ہے۔ اس انکشاف سے سرتاپا لرزی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

سازندے اسے لال کمرے میں لے گئے تھے۔ رونے کی آواز سن کر مہرو کی لڑکی شمّو غسلخانے سے نکل آئی۔ ایلکی نے نوابن کو آگے دھکیلا" اری منہ سے پھوٹ۔ بیوی کیسی ہیں؟ ارے بول کیا گونگے کا گڑ کھایا ہے کمبخت"

نوابن کو دہشت نے آن دبوچا۔ کہ جب واپس گئی عبدالباسط گوٹے والے دُھرّیا اڑا دینگے۔ ہڈیوں کا سُرمہ بن جائے گا۔ ایک بار انھوں نے ممدو کو روئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیا تھا۔ سارا محلّہ انکے غصّے سے کانپتا تھا۔

" اری بول پچھل پیری ڈُوبی اُجاڑ صورت تجھے ٹوکا لگاؤں"۔ شمّو نے ایک طمانچہ رسید کیا" منہ میں گھنگھنیاں بھرے کھڑی ہے۔ قطامہ۔ منحوس۔ بول۔ خدانخواستہ کیا ہوا ـــــ؟"

نوابن سات آٹھ سال کی عمر سے مصیبتیں سہتے سہتے اعصاب زدہ ہو چکی تھی۔ بات بے بات رو پڑتی تھی اب تو قیامت کا سامنا تھا۔ ہسٹریا کا سا دورہ پڑ گیا بُری طرح کپکپانے لگی۔

شمّو نے ایک اور دھپ جڑی۔

" نگوڑی کو شاید جاڑا بخار چڑھ رہا ہے۔ اے بی ذرا دم لینے دو کیوں مار رہو"۔ شمّو کی نیکدل بھاوج نے پردے کے پیچھے سے جھانک کر کہا۔

دسمبر کا مہینہ۔ باہر پالا گر رہا تھا۔ معاً نوابن کو غش آگیا۔ دھڑام سے قالین پر گر پڑی۔ جیسے ممدُو کو مارا تھا مجھے بھی ماریں گے۔ ممدّو کے خیال نے لرزہ طاری کر دیا۔ اس پاگل گندے غلیظ چھوکرے سے جس کے منہ سے رال ٹپکتی رہتی ہے، جو خنخنا کر بولتا ہے، جو بکرے کی طرح بے عقل ہے۔ وہ ظالم لوگ وہ رحم لوگ اس سے میری شادی کرنے والے ہیں۔ اگلے مہینے۔ ساری دنیا ستم گروں

سے پُر تھی۔ ساری دنیا یزیدی لشکر تھی۔ سارے جہان میں اشقیا کا بول بالا تھا۔ وہ تمام مناظر اس کے ذہن میں کوندے۔ مرزا سبط احمد جنھوں نے اسکی گڑیوں کی پٹاری میں چند پرانے کپڑے ٹھونس کے بطور بے دام کی کنیز گوٹے والوں کے ہاں نکال دیا تھا۔ کیسا کیسا روئی گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ پچھلے چھ برس سے ان لوگوں کے ہاں کولہو کے بیل کی طرح جُتی ہوئی تھی۔ بغیر تنخواہ۔ صرف دو اٹھنیاں بطور عیدی شیخ جی سال میں دو مرتبہ اُسے دیتے تھے۔ ابتک اسکے پاس پورے چھ روپئے جمع ہو گئے ہوتے لیکن غوثیہ اس سے اُدھار مانگ کر کبھی لوٹاتی ہی نہیں تھی۔

گھر کے مرد زیادہ تر باہر والے مکان میں رہتے۔ کھانا بھی وہیں کھاتے۔ سوتے بھی وہیں۔ کبھی کبھار اندر آجاتے۔ ابھی چند روز قبل کی بات تھی۔ بڑے شیخ جی جب زنان خانے میں آتے۔ بیوی سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ اس گفتگو سے نوابن نے پہلی بار اندازہ لگایا کہ مرزا سبط احمد اسکی اتنی بڑی جائداد ہڑپ کر کے حیدرآباد دکن جا بسے۔

لیکن اسکی طرف سے مقدمہ لڑنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ اسکے پاس اس جائداد کی ملکیت کا کوئی ثبوت موجود تھا۔ شیخ عبدالباسط پرائے پھٹے میں پاؤں اڑانے کے قائل نہ تھے۔ تہجد گزار پرہیزگار آدمی تھے۔ پیشانی پر گٹا۔ جماعت سے وہ پنجگانہ ادا کریں۔ اشراق و چاشت وہ پڑھیں۔ لیکن یتیم کے طرفدار وہ بھی نہ تھے۔ دردمندی کے دو بول کہنے والے چودہ سالہ زندگی میں اسے بہت کم ملے تھے۔ دراصل ماں باپ کے مرنے کے بعد کوئی بھی نہیں ملا تھا۔ اور غوثیہ کی بے حس سونے سے لدی بھینس جیسی ماں نے اس کے لئے پھٹے پرانے بادلے کا سرخ دوپٹہ نکال رکھا تھا خستہ گنگا جمنی کرن ٹکے والا جسے اُڑھا کر وہ اُسے ممدو کی دلہن بنائیں گی۔

پٹروس کی مسجد کے کٹھ مُلّا نے ایک بار جمعہ کے وعظ میں زوجہ کے فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ عورت ذات انسان نہیں۔ مرد سے کمتر درجے کی مخلوق ہے۔ ناقص العقل۔ اسوجہ سے اسکا دین بھی ناقص ہے۔ وعظ صحن میں صاف

سنائی دیتا تھا اور گوٹے والوں کی مستورات سر ڈھانپ کر بڑی عقیدت سے سُنا کرتی تھیں " اے ہم عورت ذات کیا جانیں " ان سب کا تکیہ کلام تھا۔ نوابن بھی ابتک یقین کرتی رہی تھی کہ وہ انسان سے کم درجے کی مخلوق ہے۔ اسوقت قالین پر لیٹے لیٹے اچانک اس نے طے کیا۔ میں انسان ہوں۔ بھیڑ بکری گائے بھینس کی طرح کوئی شے نہیں ہوں۔

کروٹ بدل کر لیٹے لیٹے اس نے اپنے ہاتھوں پر غور سے نظر ڈالی اور فیصلہ کر لیا ـــــ میں انسان ہوں۔ حیوان نہیں ہوں۔ انسان۔ لڑکی۔ اُسے لگا جیسے کسی نے اپنا نرم سا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اسے بڑی راحت کا احساس ہوا۔ سسکیاں لیتے لیتے اسکی آنکھ لگ گئی۔ شمّو کی خدا ترس بھاوج پردہ کرواکر لاں کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے ریشمی لحاف اڑھایا انگیٹھی منگواکر قریب رکھی اور گرم دودھ لانے باورچی خانے چلی گئی۔

برابر کے کمرے میں شمّو کے بَین جاری تھے۔ شور سے نوابن کی آنکھ کُھل گئی۔

"ہائے اماں جانی مجھے کس پر چھوڑ گئیں ہائے ابھی تمہارے مرنے کے دن تھے ؟ اور کتنا منع کیا جب وہ دیوانی خالہ واپس آنے کو تیار نہیں نہ ملنا چاہے ہے تو تم کیوں اس کے پاس دوڑی دوڑی جائے ہو۔ ٹوکا دو۔ ارے اسی غیبانی ملّانی نے چُورن میں ملا کر کچھ کھلا نہ دیا ہو۔ ہماری تو وہ دشمن ہو رہی ہے۔ ڈائن۔ خدا نے تھوبڑے پر جُھلسا لگا کر صورت بھی ڈائن کی کر دی ارے اسی ہیّو نے اماں کو۔"

" توبہ کرو بٹیا۔ سگی بہن سگی بہن کی قاتل ہوگی ؟" ایک مردانی آواز۔

" استاد جی آپ کیا جانیں۔ آپ تو ہمارے یہاں ابھی آئے ہیں۔ یہ چالیس کے پیٹھے میں تھیں جب تائب ہوئیں۔ کیوں ؟ چہرہ جُھلس گیا تھا۔ مجبوری کا نام صبر۔ پھر اماں کے پیچھے پڑ گئیں تم بھی توبہ کر لو۔ میں پوچھتی ہوں کاہے سے توبہ کر لو ؟ ہم ڈاکے ڈالتے ہیں ؟ قتل کرتے ہیں ؟ جرائم پیشہ ہیں ؟۔ ہم نے راگ ریت کو زندہ

رکھا ہے گانا ناچ ہمارے دم قدم سے قائم ہے۔ بڑے بڑے استادوں کا نام ہم روشن کرتے ہیں۔ اپنی مرضی سے آزادی سے رہتے ہیں۔ بھیڑ بکری گائے بھینس کی طرح جینا نہیں چاہتے۔ بے دام لونڈیوں کی طرح ساری عمر کھانا پکاؤ۔ بچے پالو میاں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ طلاق کی تلوار سر پر لٹکتی رہے۔ میاں سوتن لے آویں۔ ساس نندیں جوتیاں ماریں اُف نہ کرو۔ نا صاحب ہمیں گرہستنوں کی کیچڑ زندگی نہیں چاہیئے۔ ذرا اسی گھر میں دیکھ لو چوک کے ادھر ہمارے بھائی صاحب نے نکاحی بیوی کی کیا گت بنا رکھی ہے۔ دال میں نمک زیادہ ہوا اور وہ چلائے ابھی ایک دو تین کردوں گا۔ اور وہ سر جھکائے سنتی رہتی ہے غریب۔ نا صاحب۔ ہم کاہے سے توبہ کریں —— ایں؟ تو استاد جی یہ خالہ جانی ہماری دشمن ہو گئیں۔ ایک پیر فرتوت نے ایک کُٹرے نیم حکیم سے دو بول پڑھوا دئیے۔ حج کر کے آئیں تو گلی گلی تسبیح چُورن بیچنے لگیں۔ اماں کو پتہ چلا کسی پنجابی سوداگر کے ہاں آتو جی بن گئی ہیں مطب کرتی ہیں۔ یہ محبت کی ماری علاج معالجے کے بہانے پتہ معلوم کر کے انکے ہاں پہونچیں۔ وہ اسی رکھائی سے ملیں اب انکو یہ ڈر الگ تھا کہ راز فاش نہ ہو جائے اگر سوداگروں کو معلوم ہوا کہ یہی وہ مشہور دلنواز دلی والی ہیں یا ہوا کرتی تھیں تو آفت آجائے گی۔

" مگر صاحب ہماری والدہ کہاں مانتی ہیں۔ آج پھر گئیں۔ جی ماندہ تھا۔ میں نے کہا ٹمٹم بھیج کر انگریز ڈاکٹر بلوا لو۔ بولیں نہیں آپا سے مل آؤں انکی مکہ شریف والی دوا سے اچھی ہو جاؤنگی ——"

چند لمحوں قبل مہرو گھر پہنچی تھی۔ لال کمرے میں داخل ہوئی۔ نُور نظر کے بَین کانوں میں پڑے بے اختیار ہنسنے لگی۔ شمّو بھاگی بھاگی آئی ماں سے لپٹ گئی۔ مہرو نے لاڈ سے کہا "توبہ ہے بچی —— کیا کہرام مچا رکھا ہے۔ خواہی نخواہی۔ مجھے واپس آنے میں ذرا دیر کیا لگی تم لوگ بولا گئے۔ اور یہ لحاف میں کون ڈھیر ہے؟ یہ سونے کی جگہ ہے؟ وہاں انکی چھوکری تو ابن جمیت ہو گئی۔ انکے ہاں پٹّس پڑی ہے۔

جوان جہان لڑکی بھاگ گئی ــــ"

الیسلی دودھ کا پیالہ لے کر آئی۔ نوابن کو سہارا دیکر اٹھایا۔ وہ متوحش نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ مہرو اسے دیکھکر سٹ پٹائی۔ پیالہ اُسے تھماتے ہوئے پیار سے کہا" اے نوابن چمکو۔ کرموں جلی تو یہاں کیسے پہنچ گئی ــــ؟ میں نے ڈیوڑھی میں جاکر دیکھا ڈولی نہ کہار۔ جبھی ماتھا ٹھنکا تھا۔ ممدو دوسری ڈولی لایا۔ اندر نوابن نوابن کی پکار پڑی تھی۔ سوداگروں کے کھانے کا وقت۔ بی نوابن غائب۔ بتا تو سہی وہاں سے کیوں بھاگ آئی کیا تو وہاں بہت دُکھی ہے۔ وہاں سے نکلنا چاہتی ہے؟"

نوابن کی ذرا ڈھارس بندھی۔ اس نے سر ہلا دیا۔ جو نہ ہاں تھا نہ نہیں۔ پھر بولی "میاں میں تو آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے ڈولی میں چھپ گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ کہار اندر آئے۔ ڈولی لے بھاگے۔ سمجھے آپ ہیں"

"یا مظہر العجائیب ــــ چراغ گُل اور لونڈیا غائب" استاد جی نے کہا۔

"میں نے استاد جی چھیدو اور رنبواری سے کہہ رکھا تھا۔ جوں ہی ڈولی میں بیٹھوں وہ اسے اٹھا کر چلتے بنیں۔ میری تو اس گھر جاتے روح فنا ہوتی ہے۔ کہیں بے چاری آپا بیگماں کا راز نہ فاش ہو جائے"

"اسے تو گئی ہی کیوں تھیں۔ ٹمٹم بھیج کر بلوا لیتیں" شمو نے ناک پر انگلی رکھی۔

"انھوں نے یہاں قدم رکھنے کی قسم جو کھا رکھی ہے"

اس اثنا میں نوابن کو گرم گرم دودھ پی کر آرام ملا۔ گرمی اور راحت اور سکون کے انوکھے احساس نے غلبہ کیا اور آنکھ لگ گئی۔

سردیوں کا موسم۔ دس بجے آدھی رات معلوم ہو رہی تھی۔ شہر کے دو رئیس رائے زادہ کیلاش نرائن ماتھر اور خان بہادر برکت اللہ فوجی ٹھیکیدار تشریف لائے۔ صدر نشین ہوتے۔ الیسلی نے کنٹر اور گلاس سامنے رکھے۔ اُلٹا م اور اسکاچ پیش کی۔ جو کشمیری گیٹ کے پارسی کی دوکان سے اسی روز آئی تھی۔ مہرو فوراً

بنت بناؤ کر، انکے پاس آن بیٹھیں۔ دونوں وضعدار صاحبان مہرو سے کلامِ غالب سننے آجایا کرتے تھے۔ انھیں خوش نہ آیا کہ ایک چھوکری وہیں فرش پر پڑی بے خبر سو رہی ہے۔ "بی صاحبہ یہ کون علّت ہے؟" رائے زادہ صاحب نے پوچھا۔

"اے علّت سی علّت؟" مہرو نے افسانۂ شب زمستان گوش گزار کرنے کے بعد مشورہ طلب کیا۔ "یہ ناگہانی امر ہے۔ آدھی رات کو واپس بھیجتی ہوں سوداگر بچّے پوچھیں گے کنواری جوان پردہ نشین لڑکی کہاں گئی تھی۔ اتنی دیر کہاں رہی۔ کیا بتلائے گی۔ بتلاتی ہے تو میری بڑی بہن سابق بیگماں جان حال حاجیہ مُلّانی صاحبہ کا پردہ فاش ہوتا ہے۔"

دونوں اصحاب حقّہ گڑگڑانے میں مشغول رہے رائے زادہ صاحب کچھ دیر بعد بولے "بائی صاحب ہونی اپنی بنسی بجا چکی۔ ورنہ وہ تمہاری پالکی میں کاہے کو چھپتی۔"

"رائے صاحب وہ تو کہتی ہے ہمیشہ ہی آنکھ مچولی کھیلئے ——"

"ہاں۔ مگر یہ تمہاری ڈولی تھی۔ پریوں کا کھٹولہ۔"

"ساری زندگی ناگہانی حادثات کا سلسلہ ہے؟" مہرو پھر فلسفہ پر اتریں۔ ان پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت ہی نے انکو خراب کیا۔ پھر پوچھا "بتلایئے اس لڑکی کا کیا حشر ہوگا ——؟"

رائے زدہ گورنمنٹ کالج لاہور اور خان بہادر علیگڈھ کے گریجویٹ تھے۔ برکت اللہ صاحب کو علم جفر سے بھی شغف تھا۔ کچھ سوچ کر بولے "اس کا نام؟"

"پتہ نہیں۔ وہاں سب اُسے نوابن پکارتے ہیں۔"

"ہُوں۔ نُون بادی ہے۔ ہوائی اُڑنے اُڑانے والا۔"

"اسی لیئے یہ اُڑ کر یہاں آگئی۔" مہرو نے ہنس کر پوچھا۔ "چھوڑیے میں ان باتوں کو نہیں مانتی۔"

" نہ مانیے "۔ انھوں نے فوراً جیب سے نوٹ بک نکال کر حساب جوڑنا شروع کیا۔ " صحیح نام معلوم ہونا ضروری ہے جب عقل کام نہیں کرتی تو موڈرن فلسفہ دھرارہ جاتا ہے۔ انسان پھر اپنے بزرگوں کے علوم میں پناہ لیتا ہے۔ طرفہ واردات ہے۔ مگر پورا نام معلوم ہونا چاہیئے۔ فال نکال رہا ہوں۔

مہرو لڑکا کو بھول جھڑیں لگ گئیں " اچھا ہمارا بتایئے کیا ہوگا؟ "

" یہی ہوگا جو ہو رہا ہے ——" جلدی جلدی حساب لگایا۔ بولے " م آتشیں حرف ہے۔ آپ تو ——"

" اے نوج۔ دُور پار۔ چھائیں پھوئیں۔ آتشیں حرف ہو بیری دشمن کا۔ صاحب آپا کا ایسا بھیانک واقعہ ہو چکا ہے۔ اب آتش واتش کا نام نہ لیجیے۔ دال کیا آتشیں حرف تھا جو وہ جل گئیں ——؟"

" دال خاکی ہے۔ خاکسار اور عاجزی پر دلالت کرتا ہے۔ تو دیکھیے سچ مچ فقیری لے لی "۔

مہرو کو پھر نواَبن یاد آئی۔ جو سامنے لحاف میں لپٹی بے خبر سو رہی تھی ۔

" صاحب مجھے تو اب اس چھوکری کی فکر ہے "۔

" فکر کاہے کی۔ اگر اس کا کوئی پُرسان حال نہیں اور صورت کی اچھی ہے اپنی مملوکہ بنا لیجیے گا "۔ رائے زادہ کیلاش نرائن نے جواب دیا۔ " فقط تین سَو نوچیاں چندا بائی مہ لقائے دکن کے گویا اسٹاف پر تھیں۔ آپ مہ لقائے دلی ہیں اس یتیم لڑکی سے آغاز کیجیے !"

" توبہ ہے رائے صاحب۔ آپ مجھے کیا پیشہ ور نائیکہ سمجھتے ہیں؟ میں بھی ایک شریف زادی —" دفعتاً مہرو روہنکی ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

دونوں صاحبان متعجب نظر آئے۔ رائے صاحب نے گھبرا کر کہا معاف کیجیے گا ہمیں معلوم نہ تھا "۔ چند منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ مہرو نے گلوریاں بنا کر پیش کیں۔ کچھ دیر سوچا کیں پھر بولیں —— " سنہ ستاون میں طغرل بیگ کی سرا سے

جب نکلے، دلنواز اور مہرو کو کون جانتا تھا۔ اتنے عرصے اس ستار عیوب نے پردہ داری کی۔ آج اسوقت آپکے فقرے پر منہ سے نکل گیا۔ مگر اب کیا مضائقہ ہے پرانی باتیں ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ عرب سرائے۔ طغرل بیگ کی سرائے —— ہم جیسی ہزاروں پر کیا کیا گزری۔ غدر کو لوگ بھول بھال گئے"۔ چند الفاظ میں اپنا قصہ سُنایا۔

" ع جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا ——" رائے زادہ نے ایک آہ سرد کھینچی۔ مہرو سر جھکا کر پان بنانے لگیں۔

" بھائی برکت اللہ "، رائے زادہ کیلاش نرائن کچھ دیر کے سکوت کے بعد بولے۔ "مشنریوں نے کتنی شامت زدہ لڑکیوں کو بازار میں بیٹھنے سے بچایا۔ نصیب کی بات ہے کہ انھیں منوّری کشمیرن ملیں کسی بائیبل ٹھونکتی میم کے ہاتھ نہ لگیں"۔

" اے نوج۔ احاطے کے عیسائی بنتے میرے دشمن" مہرو نے چمک کر کہا۔ "ہمارے ہاں قسمت کی ماری بچیوں کے غمخوار کون ہیں ——؟ میر شکار۔ نائیکائیں۔ عبرت! مشنری اسپرٹ کا مالک نہ مولوی نہ پنڈت۔ فوارے پر پادری سے مناظرے کرنے کو البتہ دونوں مستعد۔ معاف کرنا بھائی برکت اللہ۔ کھری بات کہتا ہوں"۔

کم سخن خان بہادر سٹک گڑگڑا کیے۔

آتشدان پہ رکھے جرمن کلاک نے گیارہ بجائے۔

" نادر چیز ہے " رائے زادہ نے اظہار خیال کیا۔

" امّاں منوّری کی والدہ کو لارڈ لیک کے کسی افسر نے دیا تھا"۔

" واہ " رائے زادہ نے قہقہہ لگایا" جب سارا کشور ہند گھنگھرو اور تلوار کی جھنکار سے گونج رہا تھا۔ ادھر اس کلاک نے گجر بجایا ادھر کرنیل صاحب الوری کشمیرن کے ڈیرے سے برآمد ہوئے سی ہندوستانی بادشاہ کا تیاپانچہ کرنے نکل گئے"۔

" امّاں منوّری بتلاتی تھیں بیگم سمرو بھی ایک کشمیری رقاصہ تھیں۔ اور چھوٹی بیگم بھی —— نواب شمس الدین والی —— اور چودھری فتح محمد عہد نصیر الدین حیدر کے لکھنؤ کے افسانے سناتے تھے"۔

" ہاں صاحب۔ دلّی اور لکھنؤ کی زنانِ کشاّمر۔ ! ہم تو افسوس آپکو انھیں کے زمرے میں شامل سمجھا کیئے۔"

مہرو نے ایک مرمریں یونانی مجسمے کی طرف اشارہ کیا" وہ تقدیر کی دیبی ہے نا۔ آپکو بتایا تھا اماّں منوّری کرنل ہیرٹ کے بی بی خانے میں بہت دنوں رہی تھیں۔ ولایت لوٹتے وقت وہ اس طرح کی بہت سی خوبصورت چیزیں انکو دے گیا تھا۔ کافی تو میرے شیطان بچوّں نے توڑ ڈالیں۔ چاندی کی منّی سی لکھشمی سیٹھ ترلوک چند کسی دیوالی پر شموّ کے لیے لے آئے تھے۔ میں نے گھر میں نہیں رکھی کہ بت پرستی ہے۔ مہی پت پکھاوجی کو دیدی ـــــ" مہرو نے اولڈ ٹام کی چسکی لگا کر کہا۔

" مُورتی گھر میں رکھیئے نہ رکھیئے لکھشمی جی آپ پر یونہی مہربان ہیں۔" رائے زادہ صاحب ہنس کر بولے۔ چند منٹ سکوت طاری رہا۔ پھر انھوں نے کہا۔

" محمد شاہی بزرگوں کو گزرے بھی سو سال ہونے آئے۔ بلکہ زیادہ۔ لیکن پون سدی قبل کا آصف جاہی حیدرآباد! اس کے عجائب وغرائب کا تذکرہ ہم والد مرحوم سے سُن چکے ہیں۔ ہمارے دادا جی مہاراجہ چندو لال کے درباری مراسلہ نویس ہوکر دکنّ چلے گئے تھے۔ چندا بائی اس زمانے میں ایک مجرے کا ایک ہزار لیتی تھیں۔"

رائے زادہ نے اولڈ ٹام کے گلاس پر نظریں جما دیں۔ گویا مہ لقا شیشے میں اتر آئی ہوں۔ کلاک ٹِک ٹِک کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے ملول آواز میں کہا۔

" دلّی کی ان خواجہ زادیوں کو طوائف الملوکی نے طوائف بنایا۔ آپکو غدر نے ـــــ افسوس۔ ہماری سوسائٹی تے مہرو صاحب ـــــ شریف ایجوکیٹڈ لیڈیاں پیدا نہ کیں۔ البتہ تعلیم یافتہ ارباب نشاط ـــــ ہیہات ـــــ!"

مہرو نے اپنا بلوریں جام گنگا جمنی طشت میں رکھکر طنبورہ سنبھال لیا تھا۔ رکھدیا۔ وہ رائے زدہ صاحب کی باتیں اسیطرح مبہوت ہوکر سنا کرتی تھیں۔

" چندا بائی کی آفت زدہ ماں بہنوں کی دستگیری بھگتوں نے کی تھی۔ آپکی دھاڑیوں نے دونوں قومیں ردِّ خلائق۔ آڑے وقت میں وہی لوگ کام آتے۔ نہ مُلاّ نہ پنڈے۔"

خان بہادر صاحب کو مخاطب کیا جو مے نوشی سے اجتناب کرتے تھے۔ چُپ چاپ بیٹھے حُقّہ پی رہے تھے "اسی ہماری دلّی کے ایک صاحب تھے۔ خواجہ محمد حُسین۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں۔ سنیئے گا بھائی برکت اللہ۔ آپکے سننے کی بات ہے۔ سرکاری ملازم ہو کر گجرات چلے گئے۔ سُورت کے محکہ کسٹمز میں۔ وہاں کیا غبن۔ زبردست۔ فرار ہو گئے۔ بیوی بچّوں کو بے سہارا چھوڑا۔ ان غریبوں نے بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ دربدر۔ ماں اور چار پانچ بیٹیاں۔ مالوہ میں بھٹک رہی تھیں۔ چند بھگتیے مل گئے۔ نٹ۔ وہ لوگ ننھے بچّوں کو نچاتے تماشہ کرواتے جگہ جگہ گھومتے تھے۔ انھوں نے اس کُنبے کو آسرا دیا۔ بچیّوں کو ناچ گانا سکھایا۔ ناچتے گاتے برہان پور پہنچے۔

" وہاں آصف جاہ نظام الملک کیمپ کر رہے تھے۔ بھائی برکت اللہ۔ غور فرمائیے گا۔ ادھر اودھ میں ایک صوبیدار خود مختار ہو کر اپنی نئی عیش پرست سوسائٹی کی بنا ڈال رہا ہے۔ ادھر دکھن میں دوسرا صوبیدار۔ تو ہاں۔ مہرو صاحب۔ آپ سُن رہی ہیں؟"

رائے زادہ نے دوسرا جام بھرا "بھگیتوں نے ان لڑکیوں سے کہا فاقہ کشی اور خانہ بدوشی کی زندگی سے نجات چاہتی ہو۔ اپنے نام بدل ڈالو اور کُود پڑو میدان عمل میں۔ چنانچہ خواجہ محمد حسُین دہلوی کی بیٹیاں بائیاں بن گئیں۔

" مغربی ہند میں بائی تکریم کا لقب ہے۔ ہمارے ہاں اونچی ڈیرے دار طوائفوں کی بڑی عزّت تھی۔ جو کوچہ بی بی گوہر ہے۔ پچھلی صدی کی بڑی باعزّت ڈیرے دارنی تھیں

" محمد شاہی دلّی دکھن اور راجستھانی پاتروں سے پٹ گئی تھی لیکن وہ نرتکیاں برہان پور کیمپ سے آصف جاہی دربار میں پہنچیں ایک کی نور نظر چندا ——"

شدّو اندر آیا۔ حقّے تازہ کرنے کے لیے لے گیا۔ مہرو ہمہ تن گوش رہیں

" —— مہاراجہ چندولال کے دربار میں کُرسی ملتی تھی۔ خود اپنا دربار لگاتی تھیں۔ آصف جاہ ثانی کے پیچھے پیچھے اپنے ہاتھی پر میدان جنگ میں جاتی تھیں۔

" ھندوستان کی بدقسمتی۔ مہرو جان ٹیپو صاحب جو ہے وہ انگریزوں سے لڑتا بھڑتا پھر رہا ہے —— اور ہمارے آصف جاہ اس کے خلاف انگریزوں

کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اسے ایک جنگ میں شکست دے کر حیدرآباد لوٹتے ہیں۔ جشن مناتے ہیں چندا بائی کو مہ لقا کا خطاب عنایت کرتے ہیں۔ جاگیر۔ نوبت۔ منصب۔ افسوس۔ پہلے دکھن نے چاند سلطانہ پیدا کی تھی افسوس کہ اب چندا بائی —— جو دلی کی محمد شاہی طوائف نور بائی سے زیادہ شان و شوکت رکھتی تھی۔

" لیکن صاحب وہ عورت تھی یکتائے روزگار۔ نیزہ باز۔ تیر انداز۔ شہسوار۔ علم دوست۔ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ۔ کہنے لگی

ع دیکھو کبھو تو یار مجالس تمام رقص —— محفل میں ناچتے ناچتے اپنا قلمی دیوان اٹھا کر کسی کپتان میلکم کے حوالے کیا۔ وہ نسخہ انڈیا آفس لندن میں داخل دفتر۔ مرزا نوشہ کی پیشرو تھی۔ ع سر ہے مراحباب کف آبجوئے تیغ۔ اور اپنے ہم عصر اودھ کے نواب آصف الدولہ کی زمین میں ؎ ہلال مہ نو کو کم دیکھتے ہیں۔ میاں یہ جو ابرو کا خم —— اور ہر غزل کے مقطع میں مولا علیؑ کی منقبت —— ہمارے دادا جی نے اپنی بیاض میں نقل کر رکھی تھیں۔ مگر بھائی برکت اللہ ——

" اگر پردے کی بو بو ہوتی نہ اتنا لکھ پڑھ پاتی نہ اسکی قابلیت کو اتنا سراہا جاتا۔ آج بھی مہر و صاحب اردو میگزینوں میں آپ جیسی دلرباؤں ہی کی غزلیں چھپتی ہیں۔"

" رائے صاحب۔ اب اور زیادہ شرمندہ نہ کیجئے۔ یہ سوسائٹی اور اس کے قوانین میں نے نہیں بنائے۔ اور سن لیجئے خان بہادر صاحب۔ چندا بائی کتنی عالم فاضل تھیں۔ آپ صاحبان عورت کو ناقص العقل کہتے ہیں۔ ہائے ہائے۔ جس امت کی بی بی فاطمہؑ شفاعت کی سفارش فرمائیں گی۔ اسکے طبقۂ نسواں کی یہ درگت۔" مہرو نے آہ بھری اور پاندان اپنی طرف کھینچا " لفظ حرافہ اور علامہ بھی عورتوں کیلئے بطور دشنام استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کا پڑھا لکھا ہونا اتنی معیوب بات ہے!"

برکت اللہ صاحب اب بھی چپ رہے۔ انکو مہرو جیسی ذہین عورتوں سے چڑ تھی۔ مگر اپنے گھر کی ان پڑھ مستورات میں جی نہ لگتا تھا۔ ہر ہفتے یہیں آجاتے تھے اور مہرو اور رائے زادہ کے مباحثے خاموشی سے سنا کرتے تھے۔

"مہرو صاحب۔ضروری نہیں کہ چندا بائی جیسی عالم بننے کے لیے بالاخانہ کی عالم آرا بنا جائے۔"

"بھائی کیلاش نرائن۔یہ دستور تو بھارت ورش میں قدیم سے چلا آرہا ہے۔" اب خان بہادر نے بات کی۔" پرانے زمانے کی ویشیاؤں کے لیے چونسٹھ گنوں کا جاننا لازمی تھا یا نہیں؟"

"درست۔لیکن میں آج کے اہل ھنود کو یہی تو سمجھانا چاہتا ہوں۔کلکتہ بمبئی مدراس میں آج ایک سے ایک لائق نیٹو لیڈیاں موجود ہیں بے پردہ اور تعلیم یافتہ ہونے کے لیے بے عزت ہونا ضروری نہیں ہم فخریہ یہ کہتے ہیں کہ رؤسا۔ اپنے لڑکوں کو آداب و تہذیب سیکھنے اعلیٰ درجے کے بالاخانوں پر بھیجتے ہیں۔میں پوچھتا ہوں ـــ کیوں؟ کیوں نہیں ہماری مائیں بہنیں ایسی ایجوکیٹیڈ کہ خود اپنے لڑکوں کی تربیت کر سکیں؟ انگلستان میں لارڈ لوگ اپنی اولاد کو تھیٹر میں ناچنے والیوں کے ہاں تربیت کے لیے بھیجتے ہیں؟ اس اتوار کو ـــ" وہ مہرو سے مخاطب ہوئے۔ "ٹاؤن ہال میں میرا لیکچر ہے۔آئیے گا۔"

"بسر و چشم۔"

رائے زادہ اور مہرو جان کے چہرے گیس کی روشنی میں زرد نظر آرہے تھے۔ملول۔پشیمان۔متفکر۔

"واقعات پر ہمارا قابو نہیں رائے صاحب۔" مہرو نے آہستہ سے کہا۔

"کبھی بھی نہیں تھا۔لیکن انسان نے کوشش تو برابر کی۔ڈارون کہتا ہے ـــ"

"کیلاش نرائن۔تم تو بن گئے ہو ریفارمر ـــ" برکت اللہ صاحب نے قطع کلام کیا۔" تم اپنا کام کیئے جاؤ۔سوشل ریفارم۔بی مہرو کا منصب نہیں۔انھیں گانا سنانے دو۔سرسید احمد خان ہمارا برا بھلا خوب سمجھتے ہیں۔اگر وہ چاہتے تو خود ایک زنانہ مدرسہ علیگڈھ میں قائم کر دیتے۔کچھ تو وجہ ہو گی جو وہ لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کے خلاف ہیں۔"

"اچھا بھئی۔ یہ آپ لوگوں کا قومی معاملہ ہے ہم کچھ نہ کہیں گے۔ مگر اپنے آرٹیکل لکھنے کے لیے پردہ سسٹم کے متعلق ہم نے بھی بہت اسٹڈی کیا ہے۔ کائستھ قوم اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ ہم یہ تو بھی جانتے ہیں کہ مذہب اسلام کا اس موجودہ رسم سے کوئی کنکشن نہیں۔ تاریخ کی ایک سے ایک مستند کتابیں ہم نے کھنگال ڈالیں۔ سیّد امیر علی کی کتاب ابھی لندن سے چھپ کر آئی ہے۔ جی ——؟ وہ فرماتے ہیں کہ۔ سنئے مہرو صاحب۔ ایک خلیفہ تھا۔ ولید۔ پرلے درجے کا عیّاش۔ اس کے دور میں شہر بغداد ساری دنیا کی زنان بازاری سے بھر گیا۔ تو شرفاء نے اپنی عورتوں کے لیے پردہ لازم کر دیا —— بات سمجھ میں آتی ہے۔ آج بھی جو نیٹو پرنس حد سے زیادہ بدمعاش لفنگا ہوتا ہے اسکی دہشت میں اسکی رعایا اپنی بہو بیٹیوں کو بالکل دم بخت رکھتی ہے۔

"اسپین پر آپ لوگوں نے ساتؔ سو برس حکومت کی۔ وہاں پردہ تھا؟ اجی بالکل نہیں تھا۔ وہاں کی محمڈن بیبیاں کھُلے منہ ہر چیز میں شامل ہوتی تھیں۔ باقی یورپین عورتوں کی طرح۔ اور اس وقت کے یوروپ کی ساری عورتوں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ جلسے جلوس۔ ناچ گانا۔ اسکول کالج۔"

"شریف زادیاں ناچتی گاتی تھیں؟" مہرو نے حیرت سے سوال کیا۔

"رقص و سرود کسبیوں کے کھاتے میں ہیں ڈالا گیا ہے۔ مشرق میں جبھی تو فرنگی ہماری سوسائیٹی کو تعجب سے دیکھتا ہے۔ ہمارے سوشل قانون اسکی سمجھ میں نہیں آتے مہرو صاحب ایک تازہ ولایت انگریز استاد نے گورنمنٹ کالج لاہور میں مجھ سے پوچھا تھا۔ کیا تملوگ اپنی لیڈیز کو فطرتاً اتنا آوارہ اور بدمعاش سمجھتے ہو جو انکو اتنا گھونٹ کر رکھتے ہو کہ باہر نکلیں اور بھاگیں۔ کسی نامحرم کی نظران پر پڑی اور وہ ہوئیں برباد۔"

"لاحول ولا قوۃ ——" برکت اللہ صاحب نے آزردگی سے کہا۔

"جی ہاں۔ لاحول ولا قوۃ ——"

"بھائی کیلاش نرائن۔ پردہ عزّت کی نشانی ہے ناموس کا ضامن۔"

"سبحان اللہ! تو یہ لاکھوں کروڑوں غریب محمڈن عورتیں بازاروں میں سودا سلف بیچتی پھر رہی ہیں کرگھوں پر بیٹھی ہیں کھیتوں میں کام کر رہی ہیں انکی کوئی عزّت نہیں؟ سب آوارہ ہیں؟ آپکے مولوی صاحبان انکے لیے فتوے کیوں نہیں صادر کرتے ـــــ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ کردیں انھیں اسلام سے خارج کہ کھُلے مُنہ پھرتی ہیں۔ قوم اجلاف قوم ارزال!" مہرو نے طنز کی۔ "عزّت محض نجیبوں کی اجارہ داری ہے۔"

"مہرو جان! عزّت بے عزّتی سارے پیمانے گردش میں ہیں۔ پیہم گردش۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے رنگ محفل بدل گیا۔ کل تک فرنگی ہماری پوشاک پہنتا تھا۔ ہماری زبان بولتا تھا۔ آج ہماری تذلیل کرتا ہے۔"

چند منٹ کے سکوت کے بعد کیلاش نرائین نے اولڈ ٹام کی بوتل اٹھائی۔ اسے غور سے دیکھا۔ آہ بھری۔ "ہائے۔ غالب خستہ۔! واقعی انکے بغیر کون سے کام بند ہیں! ہمارے تاؤجی مرحوم کہا کرتے تھے۔ مرزا نوشہ کے بعد دِلّی میں رہے تو کیا رہے وہ بھی حیدرآباد جا بسے۔" رائے زادہ صاحب اب بہت افسردہ ہو چکے تھے۔

"سنا ہے چندا بائی مہ لقا لاکھوں روپیہ چھوڑ کر مریں۔" مہرو نے کہا۔

"لاکھوں ـــــ؟ پورا ایک کروڑ ـــــ لاکھوں تو زندگی میں خیرات کر گئی تھیں۔ مرنے کے بعد مقبرے پر عرس ہونے لگا۔ آپ مہ لقائے دہلی ہیں آپ بھی کچھ کار خیر فرمایئے۔"

"مثلاً ـــ؟"

"ایک زنانہ یتیم خانہ قائم کیجئے اس میں اس لڑکی کو داخل کیجئے جہاں وہ تعلیم حاصل کرے۔ بجائے اسکے کہ کوٹھے پر تعلیم لے۔!"

مہرو اپنی کنجوسی کے لیے مشہور تھیں۔ رائے زادہ نے پھر کہا۔ "کیوں صاحب؟"

"میرے کھولے ہوئے یتیم خانے کو لوگ قحبہ خانہ نہ کہیں گے؟"

گلوریاں بنائیں۔ چند منٹ کے توقف کے بعد سنجیدگی سے بولیں۔

"رائے صاحب۔ ہم نے کم از کم اپنے باپ دادا کا نام رسوا نہ کیا۔ آپا بیگماں اب چوڑن والی محجّن کہلاتی ہیں وہ ستّار عیوب ابتک انکی پردہ داری کر رہا ہے۔ خیر آپا کا معاملہ تو اب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا والوں سے انھوں نے اپنا کیس واپس لے لیا۔ پر اس معصوم بچّی کے لیے قدرت کو کیا منظور ہے۔ پردہ داری یا پردہ دری؟"

سنہرے فرشتوں والے جرمن کلاک نے گرررر گرررر شروع کی۔ گیس کی لالٹین مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ دونوں حضرات اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہرو انکو زینے تک پہنچانے گئیں۔ چند لمحوں بعد نیچے سڑک پر سے انکی بگھیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ مہرو دروازے پر ہاتھ ٹیکے کھڑی رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ مانوس آوازیں رات کی گہرائی میں ڈوب گئیں۔

جاگتے رہو۔ گشت کا چوکیدار چلاّ رہا تھا۔

فضل مولا اللہ والی اللہ مالک۔ "پنج خواجہ" کی دیگ میں مولا مالک۔ اندھیرے میں کسی مجذوب نے نعرہ لگایا۔ لال کمرے میں واپس آکر مہرو نے سوچا نواب فاطمہ کے لیے کھانا نکلوائیں۔ مگر وہ اطلسی لحاف میں لپٹی بے خبر سو رہی تھی۔

صبح نو بجے کے قریب اپنے پیوند لگے برقعے میں ملفوف مغلانی بی لیتڑے گھسیٹتی تسبیح ہزار دانہ جھلاتی زینے پر نمودار ہوئیں کواڑ کی اوٹ سے پکارا ــــ مہرو او مہرو چھوٹی بہن اسیوقت سو کے اٹھی تھیں۔ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتی صحن میں آئیں۔

مغلانی بی حلق پھاڑ کر چلاّئیں: "کہاں ہے۔ ادھر تو آ میرے سامنے چھتیسی۔"

"ہیں ہیں ــــ آپا۔ ذرا آہستہ سارا بازار سن رہا ہے۔"

"شفتل۔ قطامہ۔ نوابن کو اغوا کر لاتی۔ دقاقہ۔ اری تجھے ذرا خوف خدا نہیں!"

"خدا سے تو تم ڈرو آپا۔ توبہ توبہ۔"

" اری جرم بی ـــــ سوداگروں کے ہاں پڑی پڑی ہے۔ بلا اس اچھال چھکّا کو۔ اور یاد رکھ مہرو کی بچّی۔ حرفتی۔ اگر تو نے اس شتّا کو چھپا دیا۔ کچہری چڑھوں گی۔ برقندازوں سے نکلواؤں گی۔ یہ برٹش کا راج ہے سمجھی؟"

"آپا۔ دُند نہ مچاؤ۔"

" چُپ چنڈالنی۔ لو صاحب۔ یہ اندھیر دیکھو۔ ایک اجنبی جُروا دوا دارو کے بہانے میرے پاس آئے اور انکے گھر کے جوان جہان نوکرانی کو اٹھوا کے غارت غول۔ ہائے ہائے اب تو مجھ نگوڑی کا بھانڈا بھی کیسا پھوٹا۔ ہے ہے۔ کیا اوندھی تقدیر لیکے پیدا ہوئی تھی۔ جاؤ پوت دکھن ـــــ وہی کرم کے لچھن ـــــ"

خالہ کی یہ پرانی رٹ اتنے برسوں بعد دوبارہ کان میں پڑی۔ شمّو اور شدّو بے اختیار ہنس پڑے۔ وہ چلّایا کیں " برسوں بعد آرام چین کی زندگی ان نیکدل بساطیوں کے ہاں ملی تھی۔ مگر مجھ بندی کو تو اپنے لکھّے پورے کرنے ہیں۔ نوابن۔ او نوابن۔ ادھر تو آ جھاڑو پیٹی ـــــ ہُڑدا بیگنی ـــــ تجھ پر علیؑ کی سنوار ـــــ"

نوابن کی آنکھ پرستان میں کھلی اُودا اطلسی لحاف۔ نیچے فیروزی رنگ کا ریشمی تُرکی قالین۔ اسکے نیچے یہ موٹا کمبّا۔ خود کشمیری شال میں پارسل کی طرح لپٹی ادھر نفیس طشت میں دھری انگیٹھی۔ اونچے دروازوں پر ولایتی مشجّر کے پردے ایک طباقچے میں گلاب کی کلیوں کا ڈھیر۔ طاقچوں میں گلاب پاش اور عُود سوز۔ سبز تابدانوں سے چھنتی آفتاب کی نارنجی شعاعیں ایک ننھّی سی مرمریں ولائتی مورتی کو دمکا رہی تھیں۔ نواب فاطمہ مسحور ہو کر تقدیر کی دیبی کو دیکھتی رہی۔ دھوپ کے چوڑے راستے میں رنگ برنگے چمکیلے ذرّہ پرّاں تھے۔ نیلگوں کمرہ نیم غنودگی میں نوابن کو پریوں کا جل محل معلوم ہوا ہر چیز جس میں تیرتی سی پھر رہی تھی۔ عنابی مخمل کی جھالر والے آتشدان پر ایک سنہرا منقش کلاک رکھا تھا۔ اس کی محراب پر بیٹھے دو ننھّے مُنّے سنہرے فرشتوں نے پَر ہلا کر نفیریاں سنبھالیں۔ اس کرامت نے نوابن کو

بھوچکّا کر دیا۔ نو کا گجر بجا۔ عین اسوقت مُلّانی جی کی کرارہی آواز سنائی دی جو اسے گالیاں کوسنے دیکر باہر بلا رہی تھیں۔

وہ یہاں کیسے آن پہنچیں؟ جل محل کا طلسم منتشر ہو گیا۔ گھبرا کے کھڑی ہوئی۔ اپنے آپے پر نگاہ کی۔ یاد آیا۔ رات جب سردی سے لرز رہی تھی مہرو کی بہو نے اسے اُڑھا دی تھی۔ ایسی ملائم نفیس گرم چادر۔ اسے جسم سے علیحدہ کرنے کو جی نہیں چاہا۔ اسوقت بھی بہت سردی تھی۔ شال اتار کر دوبارہ اچھی طرح اپنے گرد لپیٹی۔ باہر آئی۔

مہرو کا چھیل چھبیلا نوجوان لڑکا شدّو بر می لُنگی باندھے چھینٹ کی بنڈی پر نقرئی تعویز چمچماتا، کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا۔ نوآبن کو دیکھ کر آنکھیں مچکائیں اور ماں سے بولا۔ "اماں رات جب میں حقّے تازہ کرنے اندر گیا تھا آئے زادہ صاحب کسی مہ لقا کا قصہ سنا رہے تھے۔ تم نے بھی یہ حور لقا خوب پھانسی۔ جیو"

مہ لقا اور حور لقا کبوتریوں کی اقسام تھیں۔ بھائی کا فقرہ سن کر شمّو نے ستائشی قہقہہ لگایا۔ وہ بھی جمّن بی کا تماشہ دیکھنے اپنی خوابگاہ سے نکل آئی تھی۔

مہرو نے اپنی نالائق اولاد کو آتش بار نگاہوں سے گھورا۔ وہ صحن کی دُھوپ میں مونڈھا ڈالے بیٹھی تھیں۔ نوابن سے بولیں۔ "آپا کو کتھا سنا دے"۔

نوآبن نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔

جمّن بی نے زینے کی لینڈنگ پر برقعہ بچھاتے بچھاتے رک کر اپنا ماتھا کُوٹا۔

"ہئے ہئے نواب فاطمہ۔ اُجڑی۔ ازل کی بدنصیب۔ بیاروں بیٹی۔ چل واپس۔ ہرچہ بادا باد۔ پیر شیخ جی نہ تجھے نہ مجھ بدبخت کو اب اپنی دہلیز نہ الانگنے دینگے۔"

"جب تم بھی جانو ہو کہ تمہارا وہاں بُرا حشر ہو گا تو کیوں جا رہی ہو اوکھلی میں سر دینے رک جاؤ یہیں دونوں۔ رہو آرام سے" مہرو نے کہا۔

"اس لونڈیا کے لیے برقعہ منگا ــــــ" جمّن بی نے ڈپٹ کر حکم دیا۔

بوقت ضرورت مہرو اپنی پردہ نشین بہو کا برقعہ استعمال کرتی تھیں۔

گھبراہٹ اور جلدی میں نواب بن نے کاہی رنگ کی اس کارچوبی شال کے اوپر برقعہ ڈال لیا۔ اور مغلانی بی کے ساتھ سیڑھیاں اتری۔ پالکی حویلی حسام الدین حیدر کی سمت روانہ ہوئی۔

شیخ عبدالباسط اور انکے بیٹے بھتیجے ابھی صدر بازار اپنی دوکان پر نہیں گئے تھے مکان کے بیرونی چبوترے پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اہل محلہ جمع تھے۔ علی الصبح برادری کے ایک پھیری والے کے ذریعے انکو سارا واقعہ معلوم ہو چکا تھا۔ خیرو مہرو کے ہاں پیمک لیس پچک بیچنے جایا کرتا تھا۔ مہرو کو پردے میں بیٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ کل شام اس گلی میں پہنچیں بے دھیانی میں پاؤں ڈولی کے غلاف سے باہر نکال لیے۔ خیرو تنبولی کی دوکان پر کھڑا تھا۔ خوردہ فروش تھا۔ چھوٹی سی چھوٹی چیز نظر میں رکھتا تھا۔ پائنچہ اندر سمیٹنے کے لیے ہاتھ برآمد ہوا تو ہیرے کی انگوٹھی کلائی میں جرمن سلور کی وہی چوڑیاں جو ایک روز قبل مہرو بائی نے اس سے خریدی تھیں سارے دلی شہر میں یہ نئی وضع کی ولایتی چوڑیاں سب سے پہلے اس نے مہرو جان کے ہاں بیچیں تھیں۔ انکی ہیرے کی انگوٹھی بھی پہچانتا تھا۔ انکے سازندوں نے اسے یہ بھی بتا رکھا تھا کہ بڑی بہن دلنواز حج کر آئیں اور اب شہر میں کسی جگہ مُلّانی گیری کر رہی ہیں۔ ۲ اور ۲ چار۔ سارا معاملہ صاف۔

نواب بن اور مغلانی بی جوں ہی واپس پہنچیں۔ شیخ عبدالباسط کا پہلوان نما بھتیجا عبدالخالق آگے بڑھ کر لڑکی پر جھپٹا۔ ایک زور دار تھپڑ۔ "قلماقنی —— رات کہاں گزاری —— بول —— مال زادی ——" —— دوسرا تھپڑ۔ نواب بن مار سے بچنے کے لیے جھک کر دہری ہو گئیں۔ عبدالخالق نے اسکی شال کھینچی جو برقعے سے نکل کر نیچے گھسٹ رہی تھی۔ "ذرا ہم بھی تو دیکھیں حرام کی کمائی۔ بول۔ کس تیرے یار نے یہ دیا تحفہ —— لچی زمانے بھر کی —— حرام الدھر —— بڑے آیا۔ اس شہدن کو

آپ نے اپنی بیٹی کی طرح پالا تھا۔"

"اجی مجھے تو یہ صدمہ ہے میری بچی غوثیہ برسوں اس بد ذات کی صحبت میں رہی ——"

"بس بھائی جان۔ اب اس بات کو زبان پر نہ لایئے۔ آپ بھی بغیر سوچے سمجھے"

اب عبدالباسط گرجے۔ "بڑی بی آپ نے سال بھر ہم کو بڑے دھوکے میں رکھا بڑا اُجل دیا ہم لوگوں کو ——"

"نوسَو چوہے کھا کر ——"

"چور چوری سے جائے ——"

"علّامہ ——"

"حرّافہ ——"، حاضرین کے ریمارک۔

"اس بیحیائی کا جواب نہیں۔ گشتی۔ کیسی شکتہ حثلتی، واپس آن پہنچی۔ دلّالہ سمیت۔"

"آپکی چھوٹی بہن مہرو جان آپ سے ملنے آیا کی چاوڑی سے نکل کر ہمارے زنان خانے میں در آتی تھی۔ غضب خدا کا۔ اس لونڈیا کو ورغلا کر اپنے کوٹھے پر لے گئی اب آپ کیا چاہتی ہیں بائی جی؟"

"ہم دونوں کا سامان باہر منگوا دیں۔" حجّن بی نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

"ماشاءاللہ۔ یہ بات آپ نے سمجھداری کی کری ——جی ہاں۔ بس اب ہمیں بخشیے۔ ابے اولمڈے —— ممدو کے بچے —— ابے مُنہ کیا تک رہا ہے۔ شکر کر بھوندو بخش۔ کدی اس حرّافہ نوابن سے تیرا نکاح ہوگیا ہوتا۔ عید کے چاند —— بچ گیا بے۔"

شکر الحمداللہ کہ میں بھی کیا خوب بچی۔ قربان جاؤں صدقے جاؤں اس کارساز حقیقی کی قدرت کے —— نواب فاطمہ نے گلی میں کھڑے کھڑے آسمان پر نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔

رال کے ساتھ ممدو کے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس کے بھی کچھ سہانے خواب تھے۔ جو وہ نوابن کے متعلق دیکھا کرتا تھا۔ سر نیہوڑاتے ناک سِنکتا اندر گیا۔ شیخ عبدالباسط

کی بیوی نے ڈیوڑھی میں آکر جمّن بی اور نوابن کا حقیر اثاثہ باہر پھینکنا شروع کیا۔ پوٹلیاں۔ بوغچے۔ بوسیدہ دریوں میں لپیٹ کر انکے بستر بے لڑھکاتے گئے۔ پھر تلے دانیاں باہر آن گریں۔ سرمے دانی۔ پندیا۔ نوابن کی سُرخ پٹاری۔

سرپوش پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ چبوترے پر کھٹ سے گرتے ہی اسمیں سے نکل کر نوابن کی گڑیاں، گنتی کے چند کپڑے، نقلی موتیوں کے ہار اور کانچ کی چوڑیاں گلی میں بکھر گئیں۔ وہ جُھک کر انکو چُننے لگی۔ ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتی جاتی۔ ناک سنکتی۔ دوسرے ہاتھ سے بالوں کی لٹیں چہرے سے ہٹا کر گڑیاں اور کپڑے بٹورتی۔ برقعہ اوڑھے اوڑھے چیزیں سمیٹنا مشکل تھا۔ بنجیابی میں نقاب اٹھالی مجمع بڑے اشتیاق سے اسے گھورنے لگا۔

" اجازت ہو تو اندر جا کر اپنی کتابیں لے آؤں "۔ جمّن بی نے گلی میں سے آواز دی۔

" وہیں کھڑی رہیئے۔ بھیجدی جائیں گی "۔ اندر سے شیخ جی کی بہن کا جواب ملا۔ انھوں نے لال کتاب اور دینی رسالوں کا بستہ احتیاط اور ادب کے ساتھ کواڑ کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر ممدو کو دیا۔ اس نے سوں سوں روتے سنکتے اسی تکریم سے لاکر کتابیں جمّن کو پیش کیں۔

سب سے آخر میں نواب فاطمہ کا مُنّا سا میلا برقعہ باہر آن گرا۔ اور ایک گڑیا۔

(۱۰)

دیکھو کھیلیں دھمال خواجہ معین الدینؒ

شیخ عبدالباسط گوٹے والے کے مکان کا چر چراتا صدر دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا۔ جَجّن بی اور نواب فاطمہ نے سارا سامان چُن چُن کر گلی کے کنارے رکھا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ لوگ قہقہے لگاتے فقرے کستے اپنے اپنے کام پر روانہ ہوئے۔ جَجّن بی پنجابی پھاٹک تک جا کر یکہ لائیں۔ بالکل خاموش تھیں نواب متوقع رہی، دعائیں مانگ رہی تھی، کہ وہ مہرو کے گھر واپس جائیں گی۔ وہ کیا پرستانی طلسمانی مقام تھا۔ لوگ کیا جین کی بنسی بجاتے تھے۔ مگر جَجّن بی نے ایکے والے سے کہا۔ "بیٹا۔ اسٹیشن چلیو۔"

جب وہ سولہ سالہ دلنواز بانو بیگم تھیں منوّری کے رتھ پر بیٹھ کر شہر خرابی کے بعد دلّی لوٹی تھیں۔ اس وقت شاہجہاں آباد مرحوم کی تجہیز و تدفین ہو رہی تھی۔ ادھر نیا شہر بسا ادھر وہ ایک متحرک اور موبائیل پینیٔے میں جوان ہوئیں۔ مگڈمبر، پالکی، نالکی، بُوچے، تامجان ٹمٹم، کوچ، ہاتھی، برسوں ان کی سواری میں رہے۔ دھوئیں کی گاڑی کے خس پوش دوسرے درجوں اور والیانِ ریاست کی اسپیشل ٹرینوں میں طویل مسافتیں انھوں نے طے کیں۔ پھر وہ تھرڈ کلاس میں بمبئی اور عرب حاجیوں سے بھری اگن بوٹ پر جدّہ گئیں۔ عرب و عراق میں انھوں نے ساربانوں کے نغمے سنتے اونٹوں کے کجاوے پر ہلتے ڈولتے لمبے لمبے سفر کئے۔ ارے دلنواز بانو بیگم عرف بیگماں کشمیرن عرف جَجّن بی یا مغلانی بی سے زیادہ تجربہ کار سیّاح کون ہوگا بھلا۔

جیون یاترا انھوں نے بھانت بھانت کی غیر مرئی ٹرانسپورٹ پر بھی طے کی تھی۔ منوّری کے رتھ کے بیل گویا یم راج کے سیاہ بھینسے ــــ جو چھُن چھُن کرتے تیز تیز دوڑتے انکو

اخلاقی ہلاکت کی طرف لے گئے۔ کبھی سرسوتی کے پوتر راج ہنس کہ منوری کے گھر پہ ہی انھوں نے شعر و ادب اور شاستریہ سنگیت اور رقص کی تعلیم حاصل کی۔ کبھی لکشمی کی سواری کا اُلّو کہ عیّاش امیرزادوں کو اُلّو بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کیا۔

آخر میں تیز رفتار جہاز ایس۔ ایس اِبگل گویا وشنو کا گرڑ جو پاپ کے پاتال سے نکال کر دھرم کی سورگ پر لے گیا۔

مگر بے چاری نوابن۔ اسے بچپن میں ماں باپ کے ساتھ لکھنؤ اور آگرے جانا دھندلا سا یاد تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ریلوے اسٹیشن اور ریل گاڑی آج پہلی بار دیکھی۔ حجّن بی نے صدری کی جیب سے چند سکّے نکال کر تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے۔ اب وہ اجمیر شریف جا رہی ہیں۔

ٹرین شام کو چلتی تھی۔ دن بھر وہ زنانہ تھرڈ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھی لبّیک یا خواجہؒ ـــــ لبّیک یا خواجہؒ کا ورد کرتی رہیں۔ بھوک لگی تو نوابن کو لیکر باہر نکلیں۔ خونچے والے سے خرید کر نان کباب کھائے۔ کلھڑ میں پانی پیا۔ واپس آئیں۔

ویٹنگ روم خالی پڑا تھا۔ پنجابی کرسچین آیا بڑے سُپیر بر انداز میں ادھر سے ادھر گذر جاتی ـــــ حجّن بی نماز ظہر کے لئے اٹھی ہی تھیں کہ سر منڈی جوان ہندو بنگالی ودھواؤں کا ایک قافلہ اندر آیا۔ وہ بقیہ عمر کسی آشرم میں گذارنے کے لئے بنگال سے ہردوار بھیجی جا رہی تھیں۔ ایک بے حد حسین کمسن بیوہ پر حجّن بی کی نگاہ پڑی۔ دل میں سوچیں شاید یہ ہردوار میں زیادہ دیر نہ ٹکے۔ آشرم سے فرار ہو جائے اور چند سال بعد ویشیا مشہور ہو۔ رام جنی سمجھی جائے۔ چلتے پھرتے کی اولاد ـــــ یا اگلے چالیس پچاس برس ہردوار کے ودھوا آشرم میں مقید رہ کر ایک روز گنگا کنارے پھونک دی جائے۔

العظمتہ اللہ۔ تیمم کر کے فرش پر برقعہ بچھایا اور نیت باندھ لی۔ ایک مشنری گوری میم صاحب اندر آ کر آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اردو ہندی کتابچے بیگ میں سے نکالنے لگی۔ نوابن نے موقعہ غنیمت جانا۔ دروازے کی طرف بڑھی۔ سیدھی مہرو کے گھر جائے گی۔

جالی کے کواڑ کھول پلیٹ فارم پر پہنچی۔ جہاں دوہری سبز بانات سے منڈھی ڈولیاں ایک قطار میں رکھی ہوئی تھیں۔ کہار مستورات کو ٹرین کے زنانہ ڈبوں تک لے جانے کیلئے مستعد بیٹھے تھے۔ مسافروں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ گھبرا کر پھر ویٹنگ روم میں آگئی۔

انگریز مشنری اسے دیکھ کر ہمت افزا اور پُرامید انداز میں مسکرائی۔ نواب فاطمہ نے ہونٹ پچکالیے۔ بڑی پکی مسلمان تھی۔

ججن بی سلام پھیر کر اٹھیں۔ برقعہ جھاڑا۔ اسے طویل کوچ پر پھیلا کر دراز ہوئیں۔ آنکھیں مُوند لیں۔ نوابن ہمت کر کے پھر اٹھی۔ بڑی بی نے فوراً ہنکارا بھرا۔ "کہاں چلیں —؟"
نوابن دروازے میں پہنچ چکی تھی۔ گھبرا کر بولی۔ "قدمچے پر —"
"قدمچہ باہر دھرا ہے؟ برآمدے میں؟ شتّا۔ حرافہ۔ ادھر آن کر بیٹھ ورنہ ٹانگیں توڑ دوں گی —"

نواب فاطمہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکی تھی۔

سلطان الہندؒ کے دربار کے عظیم الشان پھاٹک پر نوبت اور نقارہ بج رہا تھا۔ سُن کر جی لرزتا تھا۔ تھر تھر کانپتی توبہ تلا کرتی آنسو بہاتی ججن بی صحن میں داخل ہوئیں۔ روضے پر حاضری دینے کے بعد ایک عمارت کے برآمدے میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔ اس جگہ پہلے سے بہت سی لاوارث عورتیں اور بھکارنیں اپنے اپنے اڈے جمائے بیٹھی تھیں۔

ججن بی نے سامان قرینے سے رکھنا شروع کیا۔ دھک سی رہ گئیں۔ نسخوں کا بستہ اور دواؤں کی پیٹی گوٹے والوں کے ہاں دلّی میں رہ گئی تھی۔ سوچا تھا یہاں درگاہ شریف میں اسی طرح چُورن بیچ کر خرچ چلائیں گی۔ کھانا لنگر سے۔ اب وہ سچ مچ بھکارنوں کی طرح دونوں وقت کا کھانا لنگر سے کھانے لگیں۔ جس روز آستانہ مبارک پہ پہنچی ہیں اس کے دوسرے دن ہی بمبئی کے کسی سیٹھ کی منت پوری ہوئی تھی۔ چھوٹی دیگ کے

نیچے منوں لکڑیاں جلائی گئیں۔ نوابن ایک طرف کھڑی حیرت سے دیکھا کی۔ دو بوری آٹا دیگ میں ڈالا گیا۔ پھر پانی۔ ایک اور آدمی نے سیڑھی چڑھ کر چار بوری شکر انڈیلی۔ پورے بتیس۳۲ سیر گھی۔ چار بوری چاول۔ ڈھیروں نمک۔ ہلدی۔ چھوہارے۔ ناریل۔ نمازِ عصر کے بعد سے دس بجے رات تک پکی ——— پھر اسے ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔ فجر کے وقت دیگ لٹی۔ ایک آدمی اندر کودا۔ بالٹی بھر بھر دلیہ صحن کے پکے فرش پر پھینکتا گیا۔ دوسرے خدام اسے غریبوں اور بھکاریوں میں بانٹنے لگے۔

ہندالولیؒ کا آستانہ زمانے بھر کے ستائے ہوئے انسانوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔ حجن بی یہاں اب یونانی ادویہ اور چورن کوٹنے پیسنے کی مصروفیت سے آزاد تھیں۔ دن رات عبادت میں جٹ گئیں۔ یا قوالی بچوں کے وجد آفریں نغمے سنا کرتیں۔

پھاگن کی رت آئی۔ ایک روز ملک کے ایک نامی گرامی اُستاد حاضری دینے کے بعد سب دستور خواجہؒ کی بارگاہ میں اپنی موسیقی کا نذرانہ پیش کرنے میں مصروف تھے۔ حجن بی چہرے پہ نقاب ڈال، رینگتی رینگتی صحن میں پہونچیں ایک طرف کو بیٹھ گئیں، استاد نے الاپنا شروع کیا ——— دیکھو دھمال کھیلیں خواجہ معین الدینؒ ———

مدتوں بعد پکا گانا سننے کو ملا تھا بے اختیار خود بھی زیر لب سنگت کرنے لگیں ——— دیکھو دھمال کھیلیں خواجہ معین الدین ——— سلطان المشائخ ——— خواجہ فرید گنج شکرؒ ——— ایسی رت آئی ——— ایسی رت ———

گانا ختم ہوا۔ حجن بی کو خبر نہ پڑی اپنی دھن میں الاپے گئیں۔ اب وہ بہار کا ایک او خیال گنگنا رہی تھیں۔ کھیلیے دھمار ——— حضرت نظام الدینؒ کے سنگ کھیلیے دھمار ——— نزدیک بیٹھے ایک سارنگیے نے کان کھڑے کیے۔ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ کچھ سامعین نے انکی طرف دیکھا۔ ہڑبڑا کر اٹھیں اور تیزی سے اپنے برآمدے کی طرف بڑھ گئیں۔

لیکن اب ان کو ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ دیوار کے سہارے بیٹھی چپکے چپکے بے حد نیچے سُروں میں اپنی موسیقی کا نذرانہ خواجہؒ کو پیش کر تی رہتیں۔ سلطان الہندؒ کے دربار

میں حاضر شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے درباری گویئے حاجی سبحان کا دھرپد جوگ میں گنگناتیں — پرتھم مان اللہ — جن ریو نور پاک — نبی جی پر رکھ ایمان — اے سبحان — کبھی آدھی رات کو لیٹے لیٹے درباری میں "پیا پایو انمول" چھیڑ دیتیں — کہت کبیر — آنند بھیو ہے — پیا پایو انمول — گھونگٹ کے پٹ کھول —

خواجہؒ کی جوگن کو اپنے انمول پیا مل گئے تھے۔ نواب فاطمہ کے گھونگٹ کے پٹ دوسرے انداز سے کھلے۔

دن بھر منہ پر نقاب ڈالے ڈالے اسکا دم ہولا گیا۔ گوٹے والوں کے گھر دم بھر کی مہلت نہ ملتی تھی یہاں مستقل بیکاری اور فرصت نے طرح طرح کے منصوبے بنانے پر آمادہ کیا۔ چند روز بعد نقاب الٹ کر وسیع احاطے کے چکر لگانے لگی۔

جمن بی خیرات نہیں لیتی تھیں۔ پیٹ بھرنے کیلئے لنگر کافی تھا۔ کپڑے چکٹ ہو گئے۔ نوابن نے کہا۔" آتو جی — تیل صابن خریدنے کے لئے کچھ پیسہ کوڑی چاہیئے۔"

جو نقدی پاس تھی وہ دلی سے یہاں تک آنے میں خرچ ہو چکی تھی۔ جواب دیا —

"خالی پانی میں پھینچ لا۔"

"خالی پانی سے میل نکل جائے گا؟"

"اچھا۔ میں کچھ بندوبست کرتی ہوں۔ چل نماز پڑھ۔ اذان ہو رہی ہے۔"

جمن بی میراں جی کے چاند اجمیر وارد ہوئی تھیں۔ خواجہ جی کا مہینہ آیا۔ عرس کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ نظام دکن اور دوسرے نوابوں مہاراجوں کی طرف سے بیش قیمت چڑھاوے چڑھنے والے تھے۔ پیرزادے انتظامات میں مصروف۔

بھکاریوں کی ابھی سے چاندی۔

میراثنوں اور ڈومینوں کی ٹولیاں سنگی جالی کے پیچھے شہزادی جہاں آرا بیگم کی

عبادت گاہ میں بیٹھ کر گاتیں   تہ ریالا بنا آیا ــــ اے میرا خواجہ بنا آیا ــــ حیدر کا پوت آیا ــــ زہرا کا جایا آیا ۔ جحن بی ان پردہ نشینوں کے پاس جا بیٹھتیں اور خوب لہک لہک گاتیں ۔ " تصویر مصطفےٰ کی ۔ تنویر مرتضےٰ کی ــــ مرا خواجہ بنا آیا ــــ " انھیں بیل بھی ملنے لگی ۔ اللہ نے بیل صابن کا انتظام کر دیا ۔

درگاہ شریف سے کچھ فاصلے پر بازارِ حسن تھا ۔ جمعرات کے روز کسبیاں حاضری دیتیں ۔ نواب فاطمہ ان کے زرق برق کپڑوں اور گہنوں کو رشک سے دیکھا کرتی ۔ اپنے میلے لباس ، الجھے بال اور ننگے پیروں پر نظر ڈال کر شرم سے کٹ کٹ جاتی ۔ لوگ اسے بھی منگتی سمجھنے لگے تھے ۔ ایک سیاہ فام ہٹا کٹا نوجوان بھکاری رنگ برنگے منکوں کی مالائیں لوہے کے کڑے اور پروں کا تاج پہنے پھاٹک کے قریب ایک کونے میں بیٹھا اپنی لال لال آنکھوں سے نوابن کو گھورا کرتا ۔ وہ بہت مالدار تھا ۔ اور بیچلر ۔ ایسے گداگر والدین جنکی نوعمر بن بیاہی لڑکیاں چکٹ برقعے اوڑھے یا کھلے منہ ، کٹورے سامنے رکھے انکے پہلو میں بیٹھی رہتی تھیں ، اکثر سوچتے : کالو بادشاہ نجانے کس قسمت والی کے لئے " رقعہ " بھیجے گا ۔ لوصاحب وہ بھینکر چرسی نوجا کر ایک روز جحن بی کی پربرو بھانجی کا رشتہ مانگ آیا ۔

جحن بی چھوکری کی طرف سے ازحد فکر مند تھیں ۔ وہ نوابن کو امرتسر سے آنے والی کنجریوں کی ایک ٹولی کے پیچھے پیچھے چلتے دیکھ چکی تھیں ۔ انکو یہ بھی یاد تھا کہ نواب فاطمہ دلی ریلوے اسٹیشن کے زنانہ ویٹنگ روم سے فرار ہونے کے لیے پر تول چکی تھی ۔ انھوں نے بھینگے بھینسے کالو بادشاہ کا پیغام فوراً منظور کر لیا ۔

اس روز جب نوابن لنگر سے کھانا لے کر اپنے ٹھکانے پر پہنچی جحن بی نے کہا : شتا ! وہ سوداگر بچے تجھے ٹھیک پہچانے تھے ۔ تو ہے ہی ہوائی دیدہ ۔ ساری درگاہ میں کدکڑے

لگاتی پھر رہی تھی۔ اب بزریا تک پہنچنے لگی۔"

"آ تو جی ہیں تو ——"

"ٹھہر تو سہی خمپارہ —— اسی جمعے کو دو بول پڑھوائی ہوں۔"

"کس سے —— ؟"

"اسی کالو بادشاہ سے اور کس سے۔ کیا مرا کی کا شہزادہ تجھے بیاہنے آئے گا"

"اللہ کرے مُلّانی تم پر بجلی گرے —— ڈھائی گھڑی کی آئے۔ ڈھڈو۔ تم کھڑے سے گر پڑو اور پٹ سے دم نکل جائے۔ عبّاس علمدارؑ کا عَلَم تم پہ ٹوٹے —— ہیّو ——" نوابن نے پوری جان سے لرزتے ہوئے دانت پیس کر جواب دیا۔

حجن بی شاید سُنک گئی تھیں۔ انھوں نے نوابن کی بدتمیزی کا مطلق نوٹس نہ لیا۔ کھانا کھا، کلّی کر، دیوار سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ نیم کے تنکے سے خلال کرنے لگیں۔ سامنے کے چھتنار نیم کی بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا برآمدے میں آرہی تھی۔ چند منٹ بعد ٹانگیں پسار کر فرش پر لیٹیں اور سستانے لگیں۔

(۱۱)
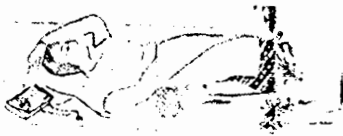
اڑھائی دن کا جھونپڑا

نوابن نے آنسو پونچھے - کچھ دیر سوچا کی - پہلا کام تو یہ کہ صابن تیل خریدوں - کپڑے دھوؤں - ایسی بھتنی بنی رہی تو کاتو باشا جیسے بھک منگے ہی رقعے بھیجیں گے - جمّن بی کو بیل کے جو پیسے ملتے تھے وہ اس کی شادی کے لئے جوڑ رہی تھیں ۔
کائی آلود گھڑے سے پانی نکال کر کٹورہ دھویا - میلا برقعہ اوڑھ کٹورہ ہاتھ میں لے بڑے پھاٹک پر جا بیٹھی - آج وہ پہلی بار بھیک مانگنے جا رہی تھی -
طرح طرح کی صدائیں لگا کر مانگنے کے فن لطیف سے ناواقف تھی - چپکی بیٹھی رہی ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا - کٹورے میں فقط ایک ٹکا جو کسی مارواڑی نے گرایا تھا - کچھ سوچ کر اس نے نقاب اُلٹ دی - آدھ گھنٹے کے اندر کٹورے میں کوڑی چھدام پائی اور ٹکوں کا انبار لگ گیا - اتنے میں بازار کی ایک عشوہ طراز مغنیہ مسکراتی ہوئی داخل ہوئی ــــ جلو میں اس کے سپر دائی اور نوچیاں - نوابن نے گھگھیا کر پیالہ اس کے سامنے بڑھایا -
" خواجہؒ کے نام پر ایک ڈبل ــ "

راحت بائی اجمیر والی نے ٹھٹھک کر اس پر نظر ڈالی - ایک نوخیز مہ جبیں - اور ہاتھ میں کاسئہ گدائی - اس نے دردمندی سے پوچھا ـــــــ
" اری کیا تیرے ماں باپ بھی یہیں ہیں ؟ "
" مر گئے ــ "
" یہیں کے بھکاری تھے ؟ "
گلرخ بانو بیگم عرف نواب فاطمہ نے نفی میں سر ہلایا - مرحوم مرزا دلدار علی برلاس

دلی کے مشہور عطر فروش اشکبار آنکھوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو انکی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔

سروم دُکھم دُکھم — مہاتما بدھ نے انکشاف کیا تھا۔ گریہ زندگی کی بنیادی حقیقت ہے سیراب کشتہ نشد ——؟ نہ۔ کس آبش نداد ——؟ ہنسی، مسرت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ چوں شد۔؟ شہید شد۔ بکجا ——؟ دشت ماریہ۔

ساری دنیا دشت ماریہ تھی۔ ساری زندگی زندانِ شام۔ ہیں، جناب سکینہؑ کی ایک حقیر کنیز — ان کی جوتیوں کی خاک —— کیا ہمیشہ اسی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روتی رہوں گی؟

"تو تو یہاں اکیلی رہتی ہے؟"

راحت بائی کی آواز نے اسے چونکایا۔

"نہیں۔ ایک ہیتو ہیں۔ دقاقہ۔ جمن بی۔ ان کے ساتھ۔"

"ہمارے ہاں چلے گی؟ نوکری کرے گی؟ اوپر کا کام —"

"بڑی بی نہیں جانے دیں گی۔"

تجھ سے بھیک منگواتی ہیں؟"

"نہ۔ مگر اپنے پاس سے ملنے نہیں دیتیں۔"

"شادی بیاہ طے کر دیا ہے؟"

نوابن نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کس سے؟"

"ایک بھکاری ہے۔ کالو بادشاہ ——" آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"اللہ غنی۔ تجھ جیسی حور لقا کا نکاح اس مکروہ منگتے سے —— کیا وہ جمن بی پگلا گئی ہیں؟"

"جی ہاں۔ کچھ سٹرن سی ہو گئی ہیں۔ ابھی۔ ابھی۔ حال ہیں۔ پہلے ایسی نہیں تھیں۔ جب سے انھیں دلی کے گوٹے والوں کے گھر سے نکالا گیا ہے ان کا کلیجہ الٹ گیا ——"

"چل۔ ادھر آ کر بات کر۔" راحت بائی نے دھیرے سے کہا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ طائفے کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

مصنوعی طور پر گھگھیا کر خیرات مانگتی جاتی کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔

اس رات نوابن درگاہ شریف سے بھاگ گئی۔ اپنی سُرخ پٹاری ساتھ لیتی گئی۔ راحت بائی نے اپنا پتہ بتلادیا تھا۔ اماوس کی اس رات جب درگاہ شریف کے پیڑ سرسرا رہے تھے اور سارے میں سوتا پڑا تھا کسی ریاست سے آئی ہوئی کوئی مظلوم بیگم صاحبہ جن کو نواب نے طلاق دیدی تھی، اس کمرے میں جہاں شہزادی جہاں آرا بیگم عبادت کرتی تھی، جانماز پر بیٹھی نفلیں پڑھ رہی تھیں۔ نوابن دبے پاؤں قریب سے گذری۔ جی چاہا سنگی جالی کے نزدیک جاکر دیکھے کیسی لگتی ہیں۔ پھر آگے بڑھ گئی۔ پھاٹک پر پہنچی۔ سارے بھک منگے اپنے اپنے ٹھکانوں پر محوِ خواب تھے۔

بازار میں اُتری۔ دورویہ دکانیں بند۔ تنور سنسان۔ ایک مُوئی نکٹی نے اپنی نارنجی آنکھوں سے اسے گھُورا۔ اسے تین سال قبل کی وہ رات یاد آئی جب غوثیہ نے اسے بتلایا تھا کہ ممدّو سے اس کا نکاح ہونے والا ہے۔ اس نے تہیہ کیا تھا کہ گوٹے والوں کے گھر کے کنویں میں کوُد پڑے گی۔

غور سے دیکھتی، ڈرتی، سہمتی، پٹاری سر پر اُٹھائے مکھّن لال حلوائی کی دوکان پر پہنچی جس کے اوپر راحت بائی کا چوبارہ تھا۔ پہلو کے تاریک زینے میں داخل ہوئی اندھیرے میں زور کی ٹھوکر لگی۔ انگوٹھے میں چوٹ آئی۔ برقعہ اتار کر پٹاری میں ٹھونسا۔ بمشکل سیڑھیاں چڑھی۔ راحت کے کمرے پر پہنچ کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ پہلے ممدّو دیوانے سے بچی۔ اب چرسی مُسٹنڈے کاتو سے۔

" قدرت کے کرشمے نرالے ہیں۔" راحت بائی نے اس سے کہا۔

چجّن بی نے صبح اٹھ کر دیکھا۔ نوابن مع پٹاری غائب۔ دو سال قبل وہ لونڈا سلطان جی میں ابن بطوطہ کی سرائے سے ان کا اندوختہ لے کر رفو چکر ہوا تھا۔

نماز فجر کے بعد احاطے میں تلاش کروایا۔ کالو باشا نے اپنے چیلے چانٹے چاروں طرف دوڑائے۔ عُرس شریف کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس بھیڑ بھڑکے میں ایک نقاب پوش لڑکی کو ڈھونڈنا کارے دارد۔ جمن بی خود اس کی تلاش میں نکلیں۔ ان کی آنکھوں میں تیزی سے پانی اتر رہا تھا۔ لاٹھی کے سہارے ٹٹول ٹٹول کر چلتی پھر آ کر اپنی شطرنجی پر بیٹھ گئیں۔ حریف انگوٹھا دے کر فرار ہو چکا تھا۔ دیوار کے کنارے بقچے اور چند برتن اسی طرح قرینے سے چُنے ہوئے تھے۔ نوابن کی لال پٹاری کی جگہ خالی تھی۔

اب وہ پھر اکیلی رہ گئیں تھیں۔ تسبیح نکال کر اللہ اللہ کرنے لگیں۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے۔

راحت بائی نے نوابن کو چند روز اپنے ہاں چھپائے رکھا۔ ریشمیں جوڑے سلوائے۔ نئے کپڑے اس نے برسوں سے نہ پہنے تھے۔ پرانا گودڑ چھجے سے نیچے پھینکنے کے بعد نواب فاطمہ نے اپنی گڑیاں پٹاری کی تہہ میں احتیاط سے رکھیں۔ ان کے اوپر نئے ملبوسات۔ جمعے کے دن ساٹن کا نیا نکور جوڑا پہنا۔ راحت نے لٹھ بند ملازم ساتھ کیا۔ ایک پردہ دار شکرم میں سوار کرا کے اپنی خالہ زاد بہن گجرا کے ہاں جے پور روانہ کر دیا۔

شکرم مدار دروازے کی طرف سے نکلی۔ پھر اڑھائی دن کا جھونپڑا نظر آیا جو ایک بادشاہ نے بنوایا تھا۔ پل پل چھن چھن دنیا کا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور اللہ بڑا بے نیاز ہے۔

حسب عادت شدید استہزا سے ہونٹ لٹکائے، اشرف المخلوقات سے حد درجہ بیزار نظر آنے والا کلبیت پسند روائتی اونٹ ایک حیران پریشان مبہوت اور تنہا لڑکی کو گاڑی میں بٹھائے ایک انجانی منزل کی طرف لیے جا رہا تھا۔

(۱۴)

مس نواب بائی آف جے پور

سُنا ہے استاد مبارک علی خاں ۔ تان رس خاں ۔ حدّو خاں ۔ بہرام خاں ۔ کلّن خاں سی بڑے فنکار کا نام لیجیے وہ سر آمد راجہ ہائے ہندوستان ہز ہائی نس مہاراجہ جے پور کے گُنی جن خانے کو رونق بخش رہا تھا ۔ نامی کتھک اور گویّے چاند پول بازار میں گجرا بائی کی چھوکریوں کو نچاتے تھے ۔ پانچ چھ برس کے اندر اندر پری رُو اور خوش آواز نواب بائی کے لئے دور دور سے کھچڑی آنے لگی اس کے علاوہ نوچندی کا میلہ، کلیر شریف ۔ بسنت کا میلہ' ریاست کپور تھلہ ۔ بینظیر کا میلہ، دارلسرور رامپور ۔ نواب بائی آج یہاں کل وہاں ۔ دیکھتے دیکھتے بیسویں صدی آگئی ۔ ۱۹۰۳ء میں پرنس ایڈورڈ طویل انتظار کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوئے ۔ انڈین ایمپائر میں دھوم کے جشن منائے گئے ۔ ایک میوزک کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی ۔ نواب بائی مدعو کی گئیں ۔ لاہور میں ان کا جی بہت لگا ۔ اتنا بارونق فیشن ایبل شہر ۔ شاندار طرّوں نوکیلی مونچھوں والے کشیدہ قامت دریا دل روسا اور جاگیر دار ۔ زندہ دل عوام ۔ محفلوں میں اور داتا کے دربار میں نواب بائی شاہی محلّے والیوں سے ملیں ۔ وہ لوگ زیادہ تر بیگم کہلاتی تھیں ۔ ارشاد بیگم ۔ سردار بیگم ۔ ممتاز بیگم ۔

لاہور میں نواب بائی بھی نواب بیگم کہلانے لگیں ۔ اسی نام سے مشہور ہوئیں ۔

شاہ ایڈورڈ کی تاجپوشی شبھ ثابت ہوئی ۔ جے پور لوٹیں ایک عقل کے اندھے کاٹھیا واڑی رئیس گانا سننے تشریف لائے ۔ یہ نوعمر دربار صاحب باپ کے مرتے ہی گل چھرّے اڑانے میں مصروف ہو چکے تھے ۔ انکی سورگباشی ماتا ایک جے پوری سردار کی اکلوتی بیٹی تھیں رام گنج بازار میں ایک وسیع حویلی باپ نے انکو دہیز میں دی تھی ۔ وہ مقفل رہتی تھی ۔

دربار صاحب جے پور آکر اسی میں ٹھہرے ۔ نواب بیگم پر ایسے عاشق ہوئے کہ حویلی انکے نام لکھ دی۔ کاٹھیاواڑ واپس گئے ۔ اس کے بعد پیرس ۔ وہاں پہنچتے ہی بذریعہ موٹر کار جہان فانی سے کوچ فرمایا۔

نواب بیگم نے حویلی میں ٹھاٹھ باٹ سے رہنا شروع کیا ۔ گانے میں راجستھانی مانڈ انکی خصوصیت تھی ۔ فونوگراف ریکارڈوں کے خاکی پیکٹ پر جو فوٹوگراف ان کا چھپتا تھا اس میں بڑی بانکی نظر آتیں ۔ ناک میں لونگ ۔ گلے میں ٹھُسّہ ۔ ساری پر بروچ کی جگہ تمغے ۔ جو ان کو میوزک کانفرنسوں میں ملے تھے ۔ نواب بیگم جے پور والی ۔

کئی بار ارادہ کیا مہرو کو خط لکھیں ۔ وقت نہ ملا ۔ جمّن بی کو خط لکھنے یا جا کر ان سے ملنے کی ہمت نہ پاتی تھیں ۔

کئی سال بعد اپنے طائفے کے ساتھ چادر چڑھانے اجمیر شریف گئیں ۔ اس برآمدے کے پاس سے گذر ہوا جہاں برسوں قبل وہ اور جمّن بی اپنا اپنا زادِ راہ اٹھاتے دلّی سے آن کر اتری تھیں ۔ اسی در میں جمّن بی کی شطرنجی کی جگہ ایک شکستہ سوزنی بچھی دکھلائی دی ۔ اس پر موجود ایک نابینا بھکارن زائرین کو لگاتار اور بے تکان دعائیں دے رہی تھی ۔

"یہاں کوئی جمّن بی بیٹھا کرتی تھیں ؟ " نواب بیگم نے ٹھٹھک کر دریافت کیا ۔

"ہاں بائی صاحب ۔ " ایک اپاہج فقیر نے برآمدے کے دوسرے کونے سے جواب دیا "اندھی ہو گئی تھیں ان کی بھانجی تھی کہ کون تھی وہ بھاگ گئی ۔ اس کے بعد سے وہ باؤلی سی بھی ہو گئیں تھیں ۔ موتیا بند نے غریب کی آنکھیں بٹ کر دیں ۔ پچھلے سال ہی مریں ۔ بڑی تکلیف میں تھیں ۔ ہر طرح سے معذور ۔ اللہ نے مشکل آسان کی ۔ اے بائی صاحب ۔ غریب نوازؒ کے نام پر کچھ دیتی جاؤ ۔ اللہ تمہیں اور دے گا ـــــ بہت دے گا ـــــ"

نواب بیگم چند منٹ گم صم کھڑی رہیں ۔ پہلے جمّن بی کے انجام پر آنسو بہائے پھر بھکاری کی دعا پر غور کیا ۔ اللہ تمہیں اور دے گا ـــــ ایک بار انھوں نے راحت بائی سے

پوچھا تھا کہ اولیاء کے مزاروں پر گانے والیوں کا ہجوم ان بزرگانِ دین کی بے ادبی نہیں ہے؟ جواباً راحت بائی نے ایک حکایت سنائی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے ایک کلال نے درخواست کی اس کے کاروبار میں برکت کی دعا فرمادیں۔ حضرت محبوبؒ الٰہی نے ایک پرچی اس کو لکھ دی جسے وہ تعویز جان کر لے گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ دلّی کا متمول ترین کلال بن گیا۔ حضرت محبوبؒ الٰہی نے اس پرچی پر محض اتنا لکھا تھا ــ خدایا تیرے کچھ بندے شراب تو پیتے ہی رہیں گے۔ تو وہ اسی کلال کی دکان سے کیوں نہ پئیں ــــ ؟

یہ حکایت سُن کر نواب بیگم کو اپنی نئی طرزِ زندگی کے متعلق کچھ اطمنان سا ہو گیا تھا۔

لیکن جمّن بی لاٹھی ٹیکتی پھر آ کھڑی ہوئیں۔ مرحومہ کہا کرتی تھیں ــ

" زندگی میں بہت بھیانک وقت آئے۔ سرائے طغرل بیگ کی شبِ محشر کے آگے سب ہیچ۔ وہ قتل کی رات تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں کی شہادت کی رات سارے رشتے ناتوں کا انقطاع۔ ایک پورے عہد کی ہلاکت۔ کہتے ہیں سمندر گاتے گاتے جل کر راکھ ہونے کے بعد اسی راکھ سے پھر زندہ ہوتا ہے۔ سارا ہندوستان اپنے ملبے اور راکھ میں دب کر اس میں سے دوبارہ نمودار ہوا تھا مگر بدلا ہوا۔ اس کی موسیقی کے سُر مختلف ہو چکے تھے کایا کلپ ــــ انسان بدل گئے تھے " جمّن بی بڑی عجیب باتیں کیا کرتی تھیں۔ تعلیم یافتہ ہوی تھیں۔

ایک بار بتلایا۔ نواب بیگم سیڑھی پر رومال بچھا کر بیٹھ گئیں اور سوچا کیں ایک بار بتلایا انھوں نے کہ جب میں خود سمندر کی طرح گاتے گاتے جل جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھی تو بہ کی اور ایک بڑی رقم سیّد احمد خان کو ان کے مدرسے کے لئے بھجوادی۔ بہت سی گانے والیوں نے چندہ بھیجا تھا۔ ہم سب رذیل، شریف غریب امیر اپنی قوم کی شکست اور ہندستان کی تباہی سے دل گرفتہ تھے۔ بہت سے لوگ خصوصاً کٹھ مُلّا سیّد کے مخالف بھی تھے مگر ہم ان کے خیر خواہ تھے۔ پھر ہم نے سنا کہ سیّد نے ہمارے چندے سے کالج کے بورڈنگ ہاؤس کے بیت الخلا بنوا دیے! بلا سے۔ اے بی ہمارا روپیہ قوم کے کسی کام تو آیا۔ یہ کہہ کر

حمّن بی خوب ہنسی تھیں۔ ایک مرتبہ بولیں ـــــ کہتے ہیں جنّات دو طرح کے خلق ہوتے ہیں نیک جن آگ سے۔ بد دھویں سے۔ تو بھئی ہندوستان میں جو آگ لگی تھی اسکے دھویں سے بھانت بھانت کے کثیف جن پیدا ہوئے۔ نفاق اور تعصب اور نفرتوں کے جن۔ ـــــ وہ ہر طرف منڈلاتے پھر رہے ہیں۔ ایک دفعہ کہا "ہمیشہ یاد رکھیو۔ ہتّو گنہگاروں کو جہنّم کا داروغہ مطبخ تھوہڑ کی بھُجیا پکا پکا کر کھلایا کرے گا۔ آبِ زقوم پینے کو ملے گا"۔ کبھی بیٹھے بیٹھے بڑبڑاتیں "ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں انتقال ہو گیا ہے اس کے کفن دفن کے لئے کچھ رقم درکار ہے" وہ خود حمّن بی کی سُنی ان سُنی کر کے فرار کی ترکیبیں سوچا کرتیں۔

"بائی صاحب اللہ کے نام پر کچھ دیتی جاؤ۔ اللہ تم کو اور دے گا ـــــ بہت دے گا ـ" اپاہج فقیر رٹا کیا۔ نابینا بھکارن فونوگراف کے ریکارڈ کے مانند اپنی دعائیں دہرا رہی تھی۔ نواب بیگم سیڑھی سے اٹھیں۔ پھاٹک کی طرف روانہ ہوئیں۔ گداگروں کا ہجوم ان کے تعاقب میں لپکا۔ نواب بیگم کے استاد جی سب کو ریزگاری بانٹتے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ درگاہ شریف کا زینہ اتر کر باہر آئیں جہاں وردی پوش شوفر اور ڈیملر موٹر کار ان کی منتظر تھی۔

(۱۳)
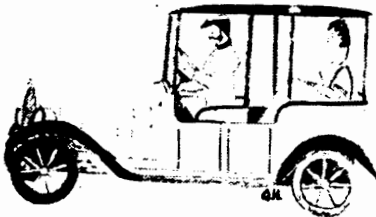
پورٹریٹ آف اے ناچ گرل

یہ ڈیملر موٹر کار نواب بیگم کے لئے ٹھاکر مہیشور سنگھ جی صاحب خاص طور پر ولایت سے لے کر آئے تھے۔ اس کچھواہا شجاعت سردار کی جاگیر بہت چھوٹی اور دل بہت بڑا تھا۔ اپنے مہاراجہ کی طرف سے، جس کے وہ باجگذار تھے، چنور، پالکی، تعظیم اور لوازمہ کا استحقاق رکھتے تھے۔ اجداد مغلیہ منصب دار رہ چکے تھے۔ اپنی اونچی شان نبھانے کے لیے محدود آمدنی کے باوجود شاہ خرچ —— باذوق تھے اور دھرماتما۔ ایک دور افتادہ بادیے کے وسط میں سرخ پہاڑی پر ان کے ٹھکانے میں سال کے بارہ مہینے پوجا پاٹ تیج تہوار راگ رنگ کا سلسلہ جاری رہتا۔ پہاڑی کی ڈھال پر ستیلا دیوی کی قدیم چھتریاں استادہ تھیں۔ جنیت کرشن اشٹمی کے روز ستیلا دیوی تخت رواں پر پورے لوازمے کے ساتھ نکالی جاتیں۔ دیوی کے علاوہ ٹھاکر صاحب مہاراجگان جے پور کے مانند امام حسینؑ کے بھگت تھے۔ دسویں محرم کو ان کا جگمگاتا تعزیہ گشت پر نکلتا۔ تین ٹھکرانیاں وشنو تھیں۔ مہاشورا تری کے علاوہ جنم اشٹمی دھوم سے منائی جاتی۔ ٹھاکر صاحب میو اسکول اجمیر کے تعلیم یافتہ اور انگلینڈ رٹرنڈ آدمی تھے مصوری کی پرکھ ورثے میں پائی تھی۔ مورث اعلیٰ فتحپور سیکری کے تصویر خانے کے محافظ دستے کے افسر رہے تھے۔

راجپوتانہ کے بیشتر ٹھاکروں کے "ٹھکانوں" میں ان کے خاندانی ورثے کی بیناتوری تصاویر کے ایسے بستے اب تک موجود تھے جن کی خبر ہیول جیسے فرنگی پارکھوں کو اب تک نہ پڑی تھی۔ ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کے خاندانی بستے میں عہد اکبر و جہانگیر کی متعدد تصاویر محفوظ تھیں۔ جن کو ٹھاکر صاحب اپنا اہم ترین اثاثہ سمجھتے تھے۔ بہت کم

خوش نصیب ایسے تھے جن کے سامنے وہ بستہ کھولا جاتا۔

ٹھاکر صاحب کا دوسرا گرانقدر اثاثہ وہ نامور گائیک اور بین کار تھے جو ٹھکانے کے چھوٹے سے دربار سے منسلک تھے نواب بیگم جیسی حسین اور نامی مطربہ بھی ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کی تنخواہ دار ملازم تھیں۔ علاقے کی ایک نیلگوں جھیل کے کنارے استادہ سترھویں صدی کی ایک بارہ دری مرمت کروا کر نواب بیگم کے لیے مخصوص کردی گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ عظیم المرتبت مغل شہزادے شہزادیاں مع لاؤ لشکر شکار کھیلنے آگرے سے اس طرف آتے تو اس بارہ دری میں ٹھاکر صاحب کے پرکھوں کے مہمان ہوتے۔ نواب بائی مستقل طور پر جے پور میں رہتی تھیں۔ سال میں چند بار تہواروں اور نجی تقاریب کے مواقع پر گانے کے لیے مدعو کی جاتیں اور اس بارہ دری میں قیام کرتیں۔ ٹھاکر صاحب کا ٹھکانہ ریاست جے پور سے دور ایک اور رجواڑے میں واقع تھا۔ ڈیملر بنز اسی مسافت کے لیے خریدی گئی تھی۔ ورنہ جے پور شہر کے اندر نواب بیگم اپنی میلارڈ فٹن استعمال کرنا زیادہ پسند کرتی تھیں۔

کاٹھیاواڑ کے احمق اور آنجہانی دربار صاحب کی عنایت کردہ حویلی جتنی عالی شان تھی نواب بیگم اسی ٹیم ٹام سے اس میں فروکش تھیں۔ لائف اسٹائل ارباب نشاط والا نہ تھا۔ نہ نائیکہ نہ میر شکار۔ ٹھاکر صاحب کی "کھلے مجرے" کی ملازم تھیں کہ دوسرے روساء کی محفلوں میں گا سکتی تھیں لیکن فن زرگری سے ناواقف تھیں اور لکھ لٹ۔ گویا اپنے مربی ٹھاکر مہیشور سنگھ کی ناؤ پر سوار۔ ان کی بھی آمدنی کم اور اخراجات وافر۔ درجن بھر ملازمین۔ شوفر۔ خانساماں۔ اس کا میٹ جو مشالچی (یعنی مشعلچی) کہلاتا تھا۔ خدمت گار۔ آیا۔ "چھوکرا بوائے" مہری۔ کوچبان۔ سائیس۔ مالی۔ دھوبی۔ جمعدار۔ ان کے علاوہ استاد جی۔ سارنگیے۔ طبلچی۔ سارا اسٹاف دو منزلہ شاگرد پیشے میں رہتا تھا۔

کاہل اتنی کہ بل کے پانی نہ پیتیں۔ پاؤں آگے بڑھاتیں۔ مہری لپک کر گرگابیاں پہناتی۔ آیا بالوں میں برش کرتی۔ سارے طور طریقے رانیوں نواب زادیوں والے اپنا رکھے تھے۔ ایک بار اپنی ہمراز اور وفادار گوانی آیا فلومینا ڈی کوسٹا سے کہا تھا۔ فلو میں نے سات آٹھ برس کی عمر سے اتنی شدید مشقت کی ہے کہ غریبوں اور کسانوں کے بچوں نے بھی ایسی کٹھن زندگی نہ گذاری ہوگی۔ اب میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔

نواب بیگم مخیر بھی تھیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر معلوم کرواتیں کسی نادار ماں باپ کی لڑکی کا بیاہ ہونے والا ہے۔ سرخ بادلے کے بھاری مسالہ ٹکے دوپٹے بنوا رکھے تھے۔ جو وہ نقدی کے ساتھ شادی سے ایک روز قبل لڑکی کے باپ کو بھجوا دیا کرتی تھیں۔

دِلّی دربار کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اخبارات اس کی خبروں سے پُر تھے۔ ٹھاکر صاحب بھی مع نواب بیگم دِلّی جانے والے تھے۔

اسی زمانے میں انڈین پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کا کرنل چارلس ڈالٹن راجپوتانہ کا دورہ کرتا ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کے ٹھکانے پر پہنچا وہ دلّی دربار کے اخراجات کیلئے والیان ریاست سے بھاری رقمیں وصول کرنے کی غرض سے وارد ہوا تھا۔ سارے راجا نواب اپنی اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے خزانے لٹائے دے رہے تھے۔ لیکن بذریعہ موٹر کار دشوار گذار ریگستانی علاقہ طے کر کے ٹھاکر صاحب کی گڑھی تک پہنچنے میں کرنل کا مدعا کچھ اور تھا۔

چارلس ڈالٹن مغل راجپوت مصوری کا پارکھ تھا۔ وہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری اور اوکسفرڈ اور کیمبرج کے کتب خانوں میں اس موضوع کا وسیع مطالعہ کر چکا تھا۔ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم لندن کے انڈین سیکشن کی مجلس مشاورت کا رکن تھا۔ ہندوستان میں جب اسے اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی والیانِ ریاست کے موروثی ذخیرے ملاحظہ کرنے ان کے ہاں پہنچ جاتا۔ وہ نادر تصاویر اس کی نذر کرتے رہتے

کرنل ان فنی نوادر کو فوراً وطن عزیز کے عجائب خانوں کے لیے روانہ کر دیتا۔ اور ان کے متعلق آرٹ کے برطانوی رسالوں میں مضامین لکھتا۔

برسات کی وجہ سے صحرا اچانک سرسبز ہو چکا تھا۔ نواب بیگم جنم اشٹمی کے جشن "راس لیلا" میں گانے کے لیے جے پور سے آئی ہوئی تھیں اور بارہ دری میں مقیم تھیں۔ رہس دھاریوں کی ایک نامی ٹولی لکھنؤ سے بلوائی گئی تھی۔ گڑھی میں بےحد چہل پہل تھی۔ جودھپور سے کرنل ڈالٹن کا تار پہنچ چکا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے نواب بیگم کا خدمتگار اور "انگریزی" خانساماں بھی جے پور سے بلوالیا تھا۔

مہیشور سنگھ جی بہت چھوٹے جاگیر دار تھے اور یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ٹھاکر صاحبان نول گڑھ، ڈگی، سیوار، دیوکہ وغیرہ کی طرح انہیں بھی دلّی دربار میں شرکت کے لیے مدعو کیا جائے گا۔ مگر کیا پتہ ــ کرنل خوش ہو جائے اور گورنر جنرل کے ایجنٹ برائے راجپوتانہ سر ایلیٹ کالون سے ان کی سفارش کر دے۔ وہ جلوس میں شامل نہ ہو سکیں تو کسی گارڈن پارٹی میں شاہ جارج اور ملکہ میری سے ہاتھ ملانے ہی کا شرف حاصل ہو جائے۔ کرنل ڈالٹن کو خوش کرنے کا ایک طریقہ مہیشور سنگھ جی کو معلوم تھا۔

نواب بیگم ــ؟

جی نہیں۔ نادر مغلیہ تصاویر۔

ٹھاکر صاحب نے اپنا اہم ترین بستہ تجوری سے نکالا۔ اس میں وہ مینا تور محفوظ تھے جو فتح پور سیکری میں ان کے جدامجد کو اکبر اعظم نے بہ نفس نفیس عنایت کیے تھے۔ تصاویر اپنے دیوان خانے کی وسطی مرمریں میز پر پھیلا کر انھوں نے کرنل کے انتظار میں گھڑیال کی سوئیوں پر نگاہ جما دی۔

کرنل ڈالٹن تیسرے پہر کے قریب پہنچا۔ وہ ٹھاکر صاحب سے ایک مرتبہ بیکانیر میں ملا تھا۔ ہاتھی کا حافظہ رکھتا تھا۔ کسی نے سرسری طور پر اس سے مہیشور سنگھ جی کی مغل

تصاویر کا تذکرہ کیا تھا۔ چنانچہ آج وہ گڑھی پر وارد ہو رہا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے چند ناقہ سوار قصبے کے بوسیدہ پھاٹک پر تعینات کر دیے تھے۔ کرنل نے بے پروائی سے ہاتھ کا اشارہ کر کے انہیں واپس لوٹایا اور ڈرائیور کو جھیل کی سمت مڑنے کا حکم دیا۔

دراصل کرنل ڈالٹن کو سنگِ سرخ کی وہ بارہ دری دُور سے نظر آگئی تھی۔ دُوربین لگا کر دیکھا تو مغل راجپوت طرزِ تعمیر کا نہایت دل کش نمونہ ثابت ہوئی۔ اپنے ساتھ بیٹھے نوجوان بلجین فوٹوگرافر آندرے ریناں سے کہا۔

"LET'S HAVE A DEKKO."

یہ فقرہ امپیریل انگریزوں کی اپنی ریختہ یعنی انگلش اُردو کھچڑی کی اصطلاحات اور جملوں میں شامل تھا۔ لیکن آندرے ریناں بلجیم سے آیا تھا اور چندر نگر میں رہتا تھا اور HOBSON-JOBSON کا علم نہ رکھتا تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے کرنل کو دیکھا۔

چارلس ڈالٹن دوربین میں منہمک ہو چکا تھا۔

یہ نوجوان بلجین فوٹوگرافر بھی دلّی دربار کے سلسلے میں اپنا گھوڑا دوڑانے میں مشغول تھا۔ اسے برسلز سے ہندوستان آئے ڈھائی تین سال ہوئے تھے۔ وہ کلکتہ کا ایک فیشن ایبل پورٹریٹ فوٹوگرافر بننا چاہتا تھا۔ مگر گھوڑ دوڑ اور جوئے کی لت کی وجہ سے اپنا کاروبار نہ جما پایا تھا اور چندر نگر کے ایک فرانسیسی فوٹوگرافر کے ہاں ملازم ہو گیا تھا۔ اب وہ شملہ پہنچا تھا اور کرنل ڈالٹن سے درخواست کی تھی کہ دِلّی دربار کے سرکاری فوٹوگرافروں کے زمرے میں اس کا نام بھی درج کر لیا جائے۔

شملہ کلب کی بار پر ایک شام کرنل ڈالٹن نے دفعتاً اس سے کہا "نوجوان آدمی. میں پرسوں راجپوتانہ جا رہا ہوں وہ ملک فوٹوگرافروں کے لیے جنّت ہے۔ اگر تم چاہو تو میرے ہمراہ وہاں چلو۔ علاوہ ازیں میں چاہوں گا کہ چند مغل راجپوت تصاویر کے فوٹو بھی تم سے بنوالوں "

موسیو ریناں نے کرنل ڈالٹن سے تعلقات بڑھانے کے اس سنہرے موقع کو مضبوطی

سے پکڑا۔ چنانچہ وہ اس دشوار گذار سفر میں برطانوی افسر کے ہمرکاب یا ہم موٹر تھا۔

ڈرائیور نے فورڈ بارہ دری سے کچھ فاصلے پر روکی۔ چپڑاسی نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ پہلے کرنل چارلس ڈالٹن اور اس کے بعد موسیو آندرے رینال سفید سولا ہیٹ اوڑھے گاڑی سے برآمد ہوئے۔ دوسری موٹر کار اسباب اور فوٹوگرافی کے لوازمات سے لدی دھول اڑاتی پیچھے پیچھے آرہی تھی۔

بُوٹی دار شلوار قمیص اور آبِ رواں کے دوپٹے میں ملبوس نواب بائی بال بکھرائے بادلوں کے نیچے شہ نشین میں کھڑی تھیں اور بے فکری سے ایک ملہار کا ریاض کر رہی تھیں۔
کرنل نے دوربین لگائی اور ٹھٹھک گیا۔ "یا ئی جو و —— !" اس نے دوربین آندرے رینال کو تھما دی۔ آندرے نے شہ نشین کا نظارہ کیا اور دھیمی سی سیٹی بجائی۔
"کیا تم کو ایسا نہیں لگتا نوجوان آدمی کہ ایک مغل راجپوت تصویر کا اوریجنل منظر ہمارے سامنے موجود ہے؟ بارہ دری — آسمان پر کالی گھٹا۔ اور سفید پرندے۔ شہ نشین میں نغمہ سرا حسینہ۔"
کرنل کی بات آندرے کے پلے نہ پڑی۔
"راگ مالا تصاویر میں" کرنل نہایت جوش سے بولتا رہا" اس منظر کا عنوان، ملہار ہو سکتا تھا۔"

آندرے نے پھر سر ہلایا۔ ہم اہل یوروپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ انگریز قوم ایک سنکی قوم ہے۔ وہ جو کہاوت ہے "باؤلے کتّے اور انگریز لوگ دھوپ میں گھوما کرتے ہیں!" سولا ہیٹ اوڑھے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں اپنے ملک برطانیہ کی عظمت کی خاطر سرگرداں اور انڈین آرٹ کا محقق کرنل ڈالٹن کیا ایک مثالی سنکی انگریز بڈھا نہیں تھا؟ آندرے نے مسکرا کر دریافت کیا "سر۔ یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟ ٹھاکر کی رانی؟"

" غالباً کوئی ناچ گرل"۔ کرنل نے جانکاری سے جواب دیا۔" ٹھاکر صاحب کی رانیاں بے پردہ نہیں کھڑی ہوں گی۔ یا ہم کو دیکھتے ہی فوراً اندر چلی جاتیں۔ آؤ گڑھی چلتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی اجازت سے شام کو آکر اس بارہ دری کے طرز تعمیر کا مطالعہ کریں گے۔"

بڈھا کرنل تیز تیز قدم رکھتا موٹر کار کی سمت چلا گیا۔ آندرے نے ٹھٹھک کر نواب بیگم پر نظر ڈالی اور مسکرایا۔ ناچ گرل !۔ اولا ۔ لا ۔ لا ۔

نواب بیگم اس منظر سے محظوظ ہوئی ۔ دو فرنگی نفر ہونقوں کی طرح منہ کھولے اسے تک رہے تھے۔ بڈھا تو یقیناً وہی کرنل تھا بانکا فرنگی شاید اس کا اسسٹنٹ۔ آندرے نے یوروپین انداز میں کندھے اُچکائے اور نواب بیگم کو وِنک کیا۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔ شوفر نے ہارن بجایا۔ آندرے دوڑتا ہوا کار میں جا بیٹھا۔

کرنل اور فوٹوگرافر نے تین روز گڑھی میں قیام کیا۔ ٹھاکر مہیندر سنگھ جی نے چار نادر مغل تصاویر کرنل کو نذر کیں۔ کرنل نے ٹھاکر کو دلّی دربار کے لیے مدعو کیا۔ اور آندرے کو حکم دیا کہ ناچ گرل نواب بائی کا پورٹریٹ بنا کر ٹھاکر صاحب کو کلکتے سے بھیجے۔ آندرے نے یہ کمیشن بخوشی منظور کیا۔

فوٹو سیشن بارہ دری میں منعقد ہوا۔ سولہ سنگھار کیے ٹھاکر کے عنایت کردہ قدیم حلیہ زیورات سے بنی ٹھنی نواب بیگم کوچ پر بیٹھی۔ آندرے نے کیمرہ اسٹینڈ پر جما کر نہایت انہماک سے اس کی تصویریں کھینچیں۔" ان میں سے BEST پوزیشنٹ کر کے ہم تم کو بھیجے گا"۔ کلکتہ میں رہ کر اسے ٹوٹی پھوٹی گورا شاہی اُردو آ گئی تھی۔ نواب بائی کو انگریزی کی شُد بُد۔ فی الحال اتنی HOBSON-JOBSON کافی تھی۔

(۱۴)

روشن چوکی

"حضرت اکبر نے ــ" بوڑھے رائے زادہ کیلاش نرائن ماتھر پان کی پیک سنبھالنے کے لیے منہ چھت گیری کی طرف کر کے بولے " ۱۹۰۳ کے دلّی دربار میں صاحب ڈیوک کناٹ کو دیکھا تو آنسو بہائے۔ ۱۹۱۱ کا دلّی دربار کہیں زیادہ عبرتناک ہے۔ کیوں بی مہرو؟ وہ گلوریاں بنانے میں مصروف تھیں۔ رائے صاحب کہتے رہے ــ" ملکہ میری لندن سے چلنے لگیں تو بیگم مرشد آباد نے زنانِ ہند کی جانب سے ان کو ایک عدد ایڈریس پیش کیا۔ والدہ سراج الدولہ کی روح کیسی اس روز تڑپی ہو گی"۔

" رائے صاحب کس کس کی روح کس کس بات پر تڑپے گی ــ"۔ مہرو نے جواب دیا۔ نواب بیگم ڈلی کاٹ رہی تھیں۔ وہ سب دہرو کے لال کمرے میں صوفوں پر بیٹھے تھے۔ چاندنی کے فرش اور مسندوں کے علاوہ ایک کونے میں "ڈرائینگ روم" بنایا جا چکا تھا۔ وسطی میز پر تازہ اردو اخبارات اور دربار کے متعلق باتصویر ضمیموں کا انبار لگا ہوا تھا۔ نواب بیگم اور مہیشور سنگھ جی لال قلعے کی گارڈن پارٹی سے سیدھے یہاں وارد ہوئے تھے۔ شہر نفریوں اور ولائتی بینڈ باجے کی دھنوں سے گونج رہا تھا۔ آتش بازی چھٹ رہی تھی۔ روشن چوکیاں چاوڑی سے گذرتی چاندنی چوک جا رہی تھیں رائے صاحب اٹھ کر چھجے پر گئے۔ چند منٹ بعد واپس آ کر بولے "ہر روشن چوکی پر سازندوں کے بھیس میں ایک ایک آدمی سی۔ آئی۔ ڈی کا ضرور موجود ہو گا ــ بنگالیوں کے ڈر سے

ہر بزمِ طرب میں غم کا سی۔ آئی۔ ڈی نو بھیس بدل کر چھپا رہتا ہے۔ مہرو نے انداز میں سوچا۔ اللہ کے کرم سے پڑھے لکھوں کی صحبت اب تک میسر تھی۔ بے چار

خان بہادر برکت اللہ پچھلے سال اللہ کے گھر گئے۔ اب رائے زادہ کیلاش ماتھر کا دم ایسا ویسا غنیمت تھا؟ بڑھاپے میں ذرا غیبسلے ہوگئے تھے۔ اور تلک اور گوکھلے کے بھگت بن چکے تھے۔ اب وہ برافروختہ آواز میں فرمارہے تھے یہ ہمارے راجہ نوابوں نے جھک جھک کر اپنی تلواریں اس سالے جارج پنجم کے قدموں میں رکھیں۔ ہمیں تو فقط ایک آدمی پسند آیا۔ کوئی عدن کا بے چارہ سلطان لاہج۔ یہ سب مسخرے نواب راجہ مرغ زریں بنے ہیروں زیور لادے بادشاہ اور ملکہ کے قدموں میں لوٹے جارہے تھے یہ عرب تنفر۔ سلطان لاہج۔ اس کا ملک بمبئی پریذیڈنسی میں شامل کرلیا گیا ہے مگر صاحب وہ رعب میں نہیں آتا۔ جناب عالی۔ تہہ بند باندھے سادا چوغہ پہنے سر اٹھائے کیا نام کہ سیدھا چلتا ہوا آیا بادشاہ سلامت کو السلام علیکم کھینچ کے مارا میرے شنیبر نے اور فوراً واپس۔ یہ ہے خودداری۔ نہ کہ سب سسرے آداب تسلیمات کورنشات بجالاتے ادھ موئے ہوئے جارہے ہیں۔"

مہرو نے ابرو کے اشارے سے رائے زادہ کو روکنا چاہا اور ٹھاکر صاحب کا پورا تعارف کرایا۔ "رائے صاحب۔ آپ ٹھاکر ہیشور سنگھ جی ہیں۔ دربار میں شرکت کے لیے راجپوتانہ سے تشریف لائے ہیں۔"

"ارہاں معاف کرنا ٹھاکر صاحب۔" رائے زادہ نے بے تکلفی سے ارشاد کیا۔ ہم صاف بات کہنے کے عادی ہیں۔"

ٹھاکر صاحب خاموش رہے۔ مہرو نے نواب بیگم کی طرف اشارہ کیا "رائے صاحب آپ ان کو پہچانتے ہیں؟"

"ان کو کون نہیں پہچانتا۔"

"وہ سترہ اٹھارہ سال قبل کی رات، یاد ہے؟۔۔۔ یہی دسمبر جنوری کا زمانہ تھا یہ میری ڈولی پر بیٹھ کر غلطی سے یہاں پہنچ گئی تھیں۔"

"خوب یاد ہے اسی رومی قالین پر لحاف اوڑھے پڑی سورہی تھیں۔ ہونی شدنی۔"

"تو بس۔" ہیشور سنگھ جی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ "یہ بھی ایک شدنی امر

تھا کہ راجپوت سردار فرنگی سمراٹ کے قدموں میں اپنی تلواریں رکھیں۔ مغلوں کے قدموں میں بھی نور کھی تھیں۔"

"کیوں رائے صاحب ہوئے لاجواب؟" نواب بیگم بے تکلفی سے بولیں۔

"آپ تو کنگزوے پر تشریف فرما ہوں گے۔؟" رائے صاحب نے پوچھا۔

"راجگان راجپوتانہ کے کیمپ میں۔"

"جی نہیں کشمیری گیٹ ۔۔ ہوٹل میں آج اس طرف آتے ہوئے ایک مہاجن کے مکان پر بادشاہ سلامت کی وہ تصویر دیکھی جو برقی قمقموں سے بنائی گئی ہے" ٹھاکر نے اس انداز سے جواب دیا گویا تم دلی والے بھی ہم راجپوتوں سے کم ٹوڈی نہیں ۔۔

"ڈیڑھ ۱۵۰ سو نواب راجے۔ سات سو جاگیردار۔ جلوس تھا کہ شیطان کی آنت۔ میں تو کھڑے کھڑے تھک گئی۔" مہرو کی نواسی شمو کی لڑکی چھنو نے اٹھلا کر کہا۔ وہ اسی وقت کمرے میں آئی تھی۔

"تم نے کہاں سے دیکھا؟" نواب بیگم نے دریافت کیا۔

"ٹاؤن ہال کی چھت پر سے۔" چھنو نے جواب دیا اور بام پہ جاکر روشن چوکیو کا نظارہ کرنے لگی۔

"آپ نے ان کو دربار لائیٹ ریلوے کی سیر کرائی؟" رائے زادہ نے ٹھاکر سے دریافت کیا۔

"صاحب ہم کو آج کل قطعی فرصت نہیں۔ انہیں ان کی مہرو خالہ کے سپرد کر دیا جو چاہیں دکھلائیں۔ ہم تو آپ کی دلی میں پردیسی ہیں۔"

"اس ریلوے کی تیاری کے لئے مہاراجہ جے پور نے بھی نو کثیر رقم دی ہے۔"

"رائے صاحب" نہیشور سنگھ جی نے متانت سے کہا "اسمیں تعجب کی کیا بات با جگذاروں کا یہی کام ہے۔ امپیریل مغلوں کے درباروں اور تقریبوں کے لیے بھی

ہمارے پُرکھے اس طرح حاضر ہوتے تھے۔ رہے آپ لوگ تو ہم نے سنا ہے آپکے بزرگ تو دِلّی کے آخری قلّاش بادشاہوں کو قرضہ دیا کرتے تھے۔"

"وہ ہم نہیں۔ دلّی کا ایک اور گھرانا ہے۔ بنیوں کا۔ ہمارے بزرگ تو قلعے میں محض منشی متصدی تھے۔ بی نوابن۔ کل دربار لائیٹ ریلوے پر سارے جشن کی سیر کرآؤ۔ کیس ہزاری سے ہر پانچ منٹ پر چھوٹتی ہے۔ رستے میں اٹھارہ اسٹیشن بنائے گئے ہیں ایک سے ایک خوب صورت۔" انھوں نے ایک اخبار اٹھایا۔ اس کی سرخیاں اور خبریں پڑھ کر سنانی شروع کیں ــــ

"کشور ہند کے نامور علمائے دین، اور مہا پنڈتوں نے کل حضور ملک معظم کی خدمت میں بزبان عربی و سنسکرت قصائد پیش کیے۔

"مشاعرہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر اقبال نے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کا قصیدہ بہاریہ بہترین قرار دیا۔

"۔ بنگال کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور نے اس مبارک موقعے کے لیے ایک ترانہ بزبان بنگالی رقم کیا۔ ترانے کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں: جن گن من ادھنایک جے ہے بھارت بھاگیہ وِدھاتا۔ ناظرین۔ مادرِ ہند کی خوش نصیبی سے آج ہم۔"

راتے صاحب نے اخبار رکھ کر نواب بیگم کو مخاطب کیا۔" کیوں صاحب ــــ ع ــــ جمنا جی کے گھاٹ کو دیکھا؟"

"جی ہاں۔ توپیں اور رسالے دیکھے۔ بینڈ بجانے والے دیکھے۔ کل بادشاہی میلے میں گئے۔ زیریں قلعہ وہاں سب سے اونچے لاٹ کو کل دیکھا۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ آج۔"

چھنّو نے بالکنی سے واپس آکر بڑی ادا سے بات کی۔" سنا ہم تو بینڈھوں کی اور ہاتھیوں کی لڑائی دیکھیں گے۔ سرکس۔ تھیٹر۔ انگریزی بائیسکوپ۔ کلکتہ کی میموں کا زندہ ناچ۔"

"میمیں نہیں یوریشین چھوکریاں۔" ٹھاکر مہیشور سنگھ نے حقارت سے کہا۔

" سنا ہے جو کچھ آج کل ہو رہا ہے۔ اس کا بھی بائیسکوپ بن گیا ہے وہ دکھلایا جاوے گا۔ کوئی یورپین فوٹو گرافر آیا ہوا ہے کلکتہ سے۔ رینال صاحب کر کے۔ وہ بھی ایسا کیمرہ لایا ہے جو چلتی پھرتی تصویریں کھینچ لیتا ہے۔" مہرو بولی۔ اور جھنو کو ابرو سے اشارہ کیا کہ قرینے سے ایک طرف کو بیٹھے۔

" یہ رینال صاحب۔" ٹھاکر مہیشور سنگھ نے فخریہ کہا " میرے ہاں آچکا ہے گڑھی پہ نواب بائی کا فوٹو بھی اسنے کھینچا۔"

" او ہو۔ ماشا اللہ۔" راتبے صاحب بولے۔ پھر ایک باتصویر اخبار اٹھایا۔" ہمیں تو ساب بیگم بھوپال سب سے شاندار لگیں۔ نیلے برقعے پہ ہیروں کا تاج پہنے۔ ہمارے خان بہادر صاحب مرحوم آج زندہ ہوتے بھائی برکت اللہ۔ تو خوش ہوتے کہ بیگم صاحبہ نے اپنا پردہ ترک نہ کیا۔ سلطان لاہیج کی طرح وہ بھی کسی کے رعب میں نہیں آئیں صاحب۔ اوہو یہ خبر سنیئے۔ مہارانی صاحبہ پٹیالہ نے زنانِ ہند کی جانب سے حضور ملکہ معظمہ کو زیورات پیش کیے۔ بس ہم سے واں بیٹھے کڑھا کرتے ہیں۔ بوڑھے ہو گئے ورنہ ایک آدھ بم ہم بھی جا کر پھینک آتے۔" اخبار پھینک کر وہ اپنی جریب فرش پر کھٹکھٹانے لگے۔

ٹھاکر صاحب نے چہرہ اونچا کر کے بالکنی پر نگاہیں جمادیں یہ کائستھ بڈھا یا خبطی ہے یا خود سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی۔ اب یہاں سے بھاگنا چاہیے۔ توقف کے بعد ماتھر صاحب بولے" جان نثارانِ دولت برطانیہ کے اس جشن میں بس شاید بی مہرو ہی ہماری ہم خیال و ہمزبان ہیں۔ دیرینہ غم خوار ــــ جب ہم اس چہل پہل میں مغل شہزادوں شہزادیوں کو بھیک مانگتے دیکھتے ہیں دل خون ہوتا ہے۔ آج آئے تو دیکھا بی مہرو یہ اخبارات سامنے پھیلائے بیٹھی رو رہی ہیں۔ ہم نے پوچھا خیریت؟ بولیں رائے صاحب غدر میں لڑنے والے خاکیوں کی فوج کے تیس چالیس گورے اور کالی پلٹن کے آٹھ دیسی ابھی قیامت کے پورے سمیٹنے کو زندہ ہیں۔ کل صبح ان کا جلوس نکلا تھا۔ ان بوڑھے پنوسہ پنشنیے فوجیوں کو بادشاہ کے حضور میں تمغے پہنائے گئے۔ یہ تصویریں دیکھیں تو دل پہ

ایک گھونسہ سا لگا۔ کیا پتہ جن ظالموں نے سرائے طغرل بیگ میں میرے کنبے کو بھونا ان ہی میں سے رہے ہوں۔"

"سرائے طغرل بیگ۔۔؟" ٹھاکر صاحب نے پوچھا۔

"اجی چھوڑیے۔ پرانی خبر ہے۔ آج کی نیوز۔۔ سنیے۔"

ماتھر صاحب نے طنزیہ انداز سے پھر ایک اخبار اٹھایا۔

"مسٹر المالطیفی آئی۔سی۔ایس۔ انچارج انڈین پریس کیمپ کو مسٹر محمد علی جوہر اڈیٹر کامریڈ نے ورناکیولر اخبار نویسوں کی طرف سے ایک نقرئی ٹی سیٹ پیش کیا۔۔ ٹھاکر صاحب ہمارا ایک بھتیجا بھی انگلینڈ سے آئی۔سی۔ایس بن کر آیا ہے۔ وہ بھی بنگالیوں کو مفسد اور باغی گردانتا ہے۔"

آتشدان پر رکھے منوری کے قدیم جرمن کلاک نے گھرررر گھرررر شروع کی۔

"کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔" مہرو نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔

"نوابن۔ تم نو قلعے کی گارڈن پارٹی میں ہو آئیں۔ مبارک ہو۔"

"ٹھاکر صاحب نے مجھے جونیر رانی ظاہر کر کے دعوتی کارڈ حاصل کیا۔ کرنل ڈالٹن جو آیا تھا گڑھی پر۔ اس کے ذریعے۔" نواب بیگم نے آہستہ سے کہا۔

"ماشا اللہ۔ ماشا اللہ۔ وہ وقت یاد ہے۔ جب اسی دلی شہر میں نوابن چھوکری کو ذلیل کر کے گوٹے والوں نے اپنے گھر سے نکالا تھا۔"

"ہاں مہرو خالہ، مگر کنچنی بن کے یہ عزت ملی تو کیا ملی۔" نواب بیگم نے نیچی آواز میں جواب دیا۔ اور سیاہ سنجاب کا روسی اوور کوٹ کوچ پر سے اٹھایا۔ جرمن کلاک کے مکینیکل فرشتوں نے دس کا گجر بجانے کے لیے اپنی نفریاں سنبھالیں۔

(۱۵)

ماہیرا جنم امول تھا

دلّی دربار کی گھمسان میں آندرے سے ملاقات ناممکن تھی۔ قلعے کی گارڈن پارٹی میں سارے فرنگی فوٹوگرافر ایک سی شکلوں کے دکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک شاید آندرے تھا کہ دیوان خاص کی ایک برجی میں بندر کی طرح بیٹھا تصویریں کھینچنے میں مصروف تھا۔ نواب بائی اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں اور وہ نیچے کود کر مجمع میں غائب ہو گیا۔

جے پور واپس پہنچیں۔ چند ہفتے بعد چندر نگر سے ایک پارسل آیا۔ فلومینا نے بڑے اشتیاق سے کھولا اور چلائی ”میم صاحب تمہارا فوٹو——“

نواب بیگم دالان سے اٹھ کر بھاگی بھاگی صحن میں آئیں۔ ”اوہو میم صاحب“ فلومینا نے باچھیں کھلا کر کہا۔ ”یہ صاحب تمہارے LOVE میں پڑ گیا ہے۔ LOOK, LOOK کیا بیوٹی فل پینٹ کیا ہے تمہارے کو——“

”دیکھیں —— دیکھیں ——“ نواب بیگم نے پورٹریٹ سنبھال کر ہاتھ میں اٹھایا۔

”تم کو ایک دم ملکہ نور جہاں کے موافق بنا دیا۔ باپ رے“ اس نے دفتی پلٹی اور پیچھے لکھا فوٹوگرافر کا نام پڑھا——

JACQUES CORBIN
CHANDRANAGORE

”آندرے صاحب بولا تھا وہ اسی فرنچ صاحب کے اسٹوڈیو میں نوکر ہے۔“ فلومینا نے کہا۔ ”اس کا ایک دم بڑھیا فریم بنانا مانگتا۔ بالکل جیسے پیلس میں مہارانی لوگ کے فوٹو کا فریم ہم دیکھتا تھا۔ ہم بڑودہ پیلس کے اندر جایا کرتا تھا جب ہمارا POOR ——“

”فلومینا ——“ نواب بائی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”دیکھو شاید ٹھاکر صاحب تشریف لائے ہیں۔“

فلومینا باہر لپکی ۔ نواب بائی نے تصویر دیوان خانے کے مینٹل پیس پر سجائی ۔ دیکھ دیکھ کر مسرور ہوا کیں ۔ آندرے نے کہا تھا کہ وہ اس تصویر کو لندن اور پیرس کے رسالوں میں چھپوانے کے لئے بھیجے گا ۔ بعنوان "پورٹریٹ اف اے ناچ گرل"۔

فلومینا نے کھڑکی میں جھانکا ۔ ہیم صاحب گڑھی سے انوپ سنگھ آئے تھے ۔ بولے ۔ ٹھاکر صاحب کل آئے گا ۔ بولے تمہارے کو گھر بیچ پہ رہنا مانگتا ۔ بولے ۔"

نور ظہور کا وقت ۔ چڑیوں کی چہکار سے چمن گونج رہا تھا ۔ دالان میں نماز پڑھ کر نواب بیگم نے چائے پی ۔ اندر ری استاد جی اور سازندے اندر آئے ۔ دری پر اپنی جگہ سنبھالی ۔ طنبورے کے سُر ملائے گئے ۔ مطبخ میں کھانا پکنا شروع ہوا ۔ مالی ہزارہ لیے سامنے سے گزرا ۔ شاگرد پیشے میں خدمت گار کی بیوی زور سے ہنسی ۔ گلابی فراک پہنے سیاہ فام فلومینا ڈی کوسٹا صحن میں استری کے کوئیلے دہکا رہی تھی ۔

طنبورہ سنبھالتے ہوئے نواب بیگم نے اپنے اس وسیع کارخانے پر نظر ڈالی اور خدا کا شکر ادا کیا ۔ برسوں انھوں نے دوسروں کے دسترخوان کی جھوٹن سے پیٹ بھرا ۔ اب سالہا سال سے پالن ہار نے ان کو اس لائق کر رکھا تھا کہ اس کے چند بندوں کی رزق کا وسیلہ بنیں ۔

دستور کے مطابق حمد و نعت سے ریاض شروع ہوا ۔ طبلچی نے جھپتال بجائی ۔ نواب بیگم نے بھیرو کا خیال چھیڑا ـــــ نواب یاد کرلے بندے ـــــ اپنے اللہ کو ـــــ جو کچھ بھلا ہووے تیرا

ٹھاکر مہیشور سنگھ جی پھاٹک میں نمودار ہوئے ۔

نواب بیگم گاتی رہیں ـــــ لا الٰہ اللہ محمدؐ الرسول اللہ ـــــ کلمہ نبی جی کا پڑھ لے ـــــ ثواب یاد کرلے ـــــ

ٹھاکر صاحب آہستہ آہستہ چلتے دالان میں پہنچے ۔ سر جھکا کر کھڑے سُنا کیے ـــ ثواب یاد کرلے بندے اپنے اللہ کو ۔

خیاؔل ختم ہوا۔ نواب بیگم اور سازندوں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ ٹھاکر تخت کے نزدیک آرام کرسی پر بیٹھے۔ دوسری منزل کے کمرے ان کے قیام کے لیے مخصوص تھے۔ چرڑھواں داڑھیوں والے ملازم اپنے آقا کا ولائیؔ ٹرنک، بستر بند اور پوُجا کے سامان کی پیٹی اٹھائے زینے کی سمت چلے گئے رسوئیا اپنی ٹوکریاں سنبھالے ایک رسوئی گھر کی طرف بڑھا۔ جو ٹھاکر صاحب کے لیے مقفّل رہتا تھا۔

مہیشور سنگھ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ سوموار کی صبح۔ دور نزدیک کے شوالوں سے گھنٹیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے زیر لب شیوجی کی اپاسنا میں مشغول ہو گئے۔

کرالم مہاکال۔ کالم کرپالم۔

ایک بار انھوں نے نواب بیگم کو سمجھایا تھا — بھیانک ڈُر درشٹی شِو مہاکال سنسار کو ختم کر دیتا ہے۔

جاپ ختم کر کے آنکھیں کھولیں۔ پریشان سے نظر آرہے تھے۔ استاد جی نے اب نواب بیگم سے گانے کے لئے کہا۔ ٹھاکر صاحب کبیرؔ کے دلدادہ تھے۔ نواب بیگم نے ایک آدھ کبیرؔ بانی گنگنا کر ایک چھیڑی — رات گنوائی سوئے کے — دن گنوایا کھائے — ہیرا جنم امول تھا کوڑی بدلے جائے

ہیرا جنم — ہیرا جنم امول تھا —

ٹھاکر صاحب جھُوما کیے۔ بھجن ختم ہوا تو چونکے گھڑی دیکھی۔ نواب بیگم نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ وہ فرشی سلام کر کے رخصت ہوئے۔ ٹھاکر صاحب نے کہا: "ہم اشنان کر کے ابھی آتے ہیں نواب بائی تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" استاد جی ڈیوڑھی تک پہنچ چکے تھے۔ انھیں پکارا وہ الٹے پاؤں لوٹے۔ فرمایا۔ "خاں صاحب۔ چندراوتی کے بیاہ میں آپ کو ہمارے دربار کا نام روشن کرنا ہے۔ بائی جی کی ایسی تیاری کروائیے —"

"حکم۔" استاد جی نے دست بستہ عرض کی۔

"ہمیشہ دلِ سبحان مبارک باشد!" طبلے پر تھاپ دیکر نواب بیگم خوشدلی سے گنگنائیں لیکن ٹھاکر صاحب بہت متفکر نظر آتے تھے۔ کرسی پر سے اٹھے۔ ہم اشنان کر آئیں۔ انھوں نے دہرایا اور آہستہ آہستہ چلتے زینے کی طرف مڑ گئے۔

اسنا دجی نے سوالیہ نظروں سے نواب بیگم کو دیکھا اور پھر واپس گئے ۔ نواب بیگم اپنی خوابگاہ میں آکر سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئیں ۔ فلومینا استری شدہ ساریاں الماری میں رکھ رہی تھی پلٹ کر مالکن کو مخاطب کیا ۔

"میم صاحب"، کانوں تک باچھیں پھیل گئیں سیاہ چہرے میں سفید دانت جھلملائے ۔ بڑی بڑی آنکھیں چھت کی طرف گھما کر ـــــ "بھنوری بائی کا ویڈنگ میں ٹھاکر صاحب میرے کو سچا گولڈ کا گھنٹیاں دے گا نا؟ انوپ سنگھ بولتا گیارہ توپ کا سیلوٹ والا اسٹیٹ کا پرنس ہے ۔ باپ رے گیارہ توپ ۔ اپنا ٹھاکر صاحب کے واسطے تو ایک پٹاخہ بھی نہیں چھٹتا ۔"

"چپ فلومینا ۔"

"ایسا بڑا اہیا راجہ کا چھوکرا اپنا بھنوری بائی سے سادی بنائے گا ڈیم لکی گرل ۔ بٹ ویری بیوٹی فل گرل میم صاحب ۔ ہم تو اس کو گڑھی کے اندر جا کر دیکھا ہے ۔"

"جبھی تو سات پردوں میں سے اس کی خبر باہر پہنچ گئی ۔" نواب بیگم نے کہا ۔

"بیوٹی فل تو تم بھی ہے میم صاحب پن لکی نہیں ہے ـــــ" فلومینا نے زبان دانتوں تلے داب کر بات بدلی ۔ "پرنس کو اس کا فوٹو دکھلایا ہوگا ۔"

نواب بیگم کی آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے تھے ۔ فلومینا ایک محافظ فرشتہ تھی لیکن اسکے قدم مضبوطی سے دھرتی پر جمے ہوئے تھے ۔ جب نواب بیگم اونچی اڑانیں بھرنے لگتیں ۔ وہ کوئی بات ایسی کہہ کر فوراً ان کو حقیقت کی سطح پر واپس اتار دیتی تھی ۔ نواب بیگم نے معطر رومال سے آنکھیں خشک کر جواب دیا "ہاں ۔ دلی سنگنزوے کیمپ پر راجہ لوگوں نے بات طے کروائی ۔ مجھے تو ٹھاکر صاحب نے ابھی بتایا پلے روز جب آئے تھے ۔"

"ہم جانتا ہے ۔ ٹراونکور بولو ۔ بائی سور بولو ۔ اینڈ ـــــ کولہا پور ـــــ جام نگر بولو ـــــ بڑودہ بولو ۔ اتنا بڑا بڑا پرنس لوگ کے لیے یوراج کا بات آیا ۔ پن اپنا چندراوتی جی ـــــ گریب آدمی کا بیٹی ـــــ اس کے بھاگ ـــــ انوپ سنگھ بولے پرنس اینڈ پرنس یورپ ـــــ

ـــــــــــــــــــ

[1] راجستھان کے ٹھاکر جاگیرداروں کا بڑا لڑکا کنورجی، منجھلا بھنورجی چھوٹا تنورجی کہلاتا ہے ۔ اسی طرح بڑی منجھلی اور چھوٹی بیٹیاں کنوری بائی بھنوری بائی اور تنوری بائی ۔ اہل بمبئی کی زبان میں گھڑی ۔

میں ہنی مون منائے گا۔ ہز ہائی نس کا ایک بنگلہ انگلینڈ میں بھی ہے ––– باپ رے ۔“
نواب بائی بے دھیانی سے عطر کی شیشیاں سنگھار میز کی سطح پر ادھر ادھر سرکا یا کیں۔ کپڑے تہہ کرتے ہوئے فلومینا نے بات جاری رکھی –– ”پن اپنا –– پوپٹ بھائی وہ نوا کاٹھیا واڑی ڈرائیور ہے نا میم صاحب وہ میرے کو بولا ابھی انگلینڈ ونگلینڈ تو سمجھے –– پہلے بیاہ تو ہو جانے دو ––– اور بھی کیا کیا بول رہا تھا ––– “
”بڑا نمک حرام ہے ۔ اپنے آقا کے خلاف بکتا ہے“ نواب بیگم نے غصّے سے کہا ۔
”باہر کا آدمی ہے بائی ۔ نوا آدمی ہے ۔ بولا اس نے ٹھاکر صاحب سے پگار مانگی ۔ چار مہینا سے اس کو پگار نہیں ملی ۔ ٹھاکر صاحب بولے ابھی نہیں بھر دے گا ۔ پوپٹ بھائی تاؤ کھا گیا ۔ بولتا ہے ایسا خالی پیلی شان کائے کو مارتا ۔ کرنل صاحب آیا اس کے لئے اُدھار دلّی گیا تب اُدھار گڑھی کا اکھّا جیز گروی رکھ چکا ہے ۔ جانے کب سے ایسا چل رہا ہے میم صاحب ۔ اپن لوگ کو ابّی مالوم ہوا ۔ اُدھر جب کنوری بائی کا سادی بنایا تھا ۔ وہ تو گوالیر کا ایک معمولی سردار تھا ۔ ابّی بھنوری بائی کا سادی تو اننے بڑے راجکمار سے ہوتا ۔ اس کے لئے ہمارا اولڈ مین کیا کریگا ––– ؟ کتنا سُود بھر یلا ہے اس نے اب تک ––– “
نواب بیگم خاموش بیٹھی سنتی رہیں ۔
”میم صاحب جھوٹا شان کائے کو مارنے کا ––– ؟“
امیروں کے معاملات یہ دو ٹکے کی کرسٹان آیا کیا سمجھے ۔ نواب بیگم نے خفیف سی حقارت کے ساتھ سوچا ۔ فلومینا نے کمرے کے دروازے بند کیے اور سنگھار میز کے قریب آکر سرگوشی میں بولی ”ایک بات بولوں ––– ؟ ٹھاکر صاحب بڑا UNLUCKY ہے ۔ ––– تین تین ٹھکرانیاں تینوں سے چھوکرا ایک نہیں ۔ پانچ پانچ چھوکری ۔“
”تو پھر ۔ ؟“
”بات سنو ۔ ابھی پانچ چھوکری میں سے ایک کی سادی بنایا یا دوسری کے لیے ––– “
”پچھلے محرم میں میں نے کہا جناب عباسؑ سے بھنوری بائی کے لیے منت مان لیجئے ۔ امام حسینؑ سے تو وہ مان ہی چکے تھے ۔ میں نے کہا جناب عباسؑ کی طبیعت میں عجلت پسندی

بہت تھی وہ جلدی کام کر دیتے ہیں۔ تو دیکھو سال کے اندر اندر اتنا بڑھیا رشتہ۔"

"میم صاحب ہمارا بات سنو" فلومینا نیچی آواز میں مصر رہی " ٹھکرانی لوگ تم سے بہت خُنس کھاتا۔"

"تعجّب کی کون سی بات ہے ؟" نواب بیگم نے اُکتا کر پوچھا۔

"سنو۔ ٹھکرانی لوگ بولتا مغل ٹائیم کا اتنا داگینہ ٹھاکر نے وہ کنجنی کو دیدیا۔ ابھی چار چھوکری کا شادی بنانا ہے۔"

"ارے فلومینا۔" نواب بیگم نے بے پرواہی سے کہا۔ "ٹھاکر کے پاس بہت داگینہ ہے سیروں۔"

"ہاں پَن اس کو چار چھوکری کا میرج بنانا ہے — THEN ؟ بائی۔ تم بھی ذرا اپنا کھانے پینے میں ہوشیاری رکھو۔ کوئی چیز ٹھاکر کا سرونٹ لوگ تم کو کھانے کو دے کہ گڑھی سے آیا ہے۔ بالکل نہیں کھانے کا — تمہارے کو بول دیا ہے۔ ٹھکرانی لوگ تمہارا دشمن ہو رہا ہے —"

"فلومینا —" باہر سے رسوئیے نے پکارا۔

ہیرا جنم امول تھا۔ کوڑی بدلے جائے —

کھرج میں گنگنا تے مہیشور سنگھ زینہ ترے۔ بیشتر شیو شاکت ٹھاکروں کی طرح گوشت خور تھے۔ دالان میں پہنچ کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ رسوئیے نے میز سامنے رکھ کے کاچری کا گوشت اور سانگری کا ساگ پیش کیا۔

"نواب بائی —" انھوں نے آواز دی۔

نواب بیگم کمرے سے برآمد ہوئیں۔ فلومینا کی گفتگو کو شاگرد پیشے کی گپ سمجھ کر نظرانداز کر چکی تھیں۔ زیورات کے سلسلے میں ٹھکرانیوں کے "خنس" والی بات البتہ کھٹک رہی تھی۔ تخت پر گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ بھنوری بائی کی ماں اس رسوئیے کے ذریعے تو زہریلا اچار مجھے بھجوائے گی نہیں۔ فلومینا کی نصیحت پر ہنسی آئی۔

ٹھاکر صاحب چپ چاپ بھوجن کرتے رہے ——— راجپوت رسوئیا گرم گرم پوری لیے سارے صحن کو ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے عبور کرکے والان میں آتا تھا۔ اور پھر فوراً اسی رفتار سے رسوئی گھر واپس جاتا تھا۔

دوسرا ملازم چمچماتی چلمچی اور گڑوی لے کر حاضر ہوا۔ ہاتھ دھو کر کُلّا کرنے کے بعد مونچھوں پر تولیہ پھیرتے ہوئے پھر کہا "نواب بائی"

"حضور۔ دیوان خانے میں تشریف لے چلیے"

ٹھاکر صاحب اٹھے۔ نواب بائی نے پیچھے سے جا کر دیوان خانے کے دروازے بھیڑے۔ برقی روشنی جلائی۔ ربنال کی بنائی ہوئی تصویر جمک اٹھی۔

ٹھاکر نے پورٹریٹ پر نظر ڈالی ———

"واہ ——— واہ ——— بہت خوب" انھوں نے ذرا بے دھیانی سے کہا اور صوفے پر بیٹھ گئے ——— حرف مدعا زبان پر لاتے بے طرح ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر مختصراً اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا۔ کچھ دیر قبل فلومینا کی گفتگو سُننے کے باوجود نواب بیگم کو انکی اس زبوں حالی کا اندازہ نہ تھا۔ بھونچکی رہ گئیں۔

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ بھنوری بائی کے جلسے کے بعد مجبوراً انہیں اپنے سنگیت کاروں کو علیحدہ کرنا پڑے گا۔

"سرکار میں تو آپ سے ایک کوڑی کی بھی طلبگار نہیں۔ آپ کا دیا کھاتی ہوں۔"

مہیشور سنگھ سے ہمدردی کے جوش میں وہ بھول گئیں کہ اس ملازمت سے علیحدگی کے بعد انکے ہاں بھی یہ اللے تللے نہیں رہیں گے۔

"سرکار کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ میری طرف سے خاطر جمع رکھیے۔"

"ہمیں معلوم ہے نواب بائی" ٹھاکر شیروانی کی جیب سے گول گھڑی نکالتے ہوئے بولے "تم بڑی عالی ظرف عورت ہو۔ نجانے کوٹھے پر کیسے ——— خیر یہ تو تمہارے کرموں

کا پھل ہے۔ مگر ہمیں یقین ہے اگلے جنم میں تم ایک شریف گھر سنسار کی مالکن بیاہتا ستونتی کا جیون بتاؤ گی۔"

نواب بیگم کے دل پر بڑی کڑی چوٹ لگی۔ پٹ پٹ آنسو بہانے لگیں

"افسوس تمہارا دل دکھایا۔" انھوں نے گھبرا کر کہا۔

نواب بیگم نے آنسو پونچھے۔ سوچنے لگیں کس طرح اس نیک طینت تنگ حال آدمی کی مدد کریں جس نے اپنے بھلے دنوں میں انہیں مالا مال کر دیا تھا۔ راجپوت دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔ ٹھاکر کے عطا کردہ مغلیہ زیورات کسی بہانے انھیں لوٹانے کی ہمت نہ تھی

"نواب بائی۔" ٹھاکر صاحب بولے۔ "اپنی فضول خرچی کی وجہ سے تم بھی مقروض رہتی ہو یہ تمہارا ساہوکار جو ہے — چھوٹی چوپڑ والا گردھاری لال رنچھوڑ مل — اس کے سود کی شرح بھلا کتنی ہے؟ ہمیں سر دست تلک کے لئے محض پچاس ہزار نقد کی کمی پڑ رہی ہے باقی ساری تیاری مکمل ہے۔ اس سے سود کی شرح کم کروا دو —"

"حکم۔ ابھی بلاتی ہوں۔ مولو مل کو —" دروازے میں جا کر فلومینا کو پکارا۔

"ڈرائیور کو بولو سیٹھ گردھاری لال کو لے کر آئے — فوراً سے بیشتر —"

"یس میم صاحب —" فلومینا ڈیوڑھی کی سمت بھاگی۔

"گلے گلے پانی — پچاس ہزار روپلی کی کیا حقیقت ہے۔ گردھاری لال بھی بھلا آدمی ہے۔" نواب بیگم نے شبنر لونگ کی طرف واپس آتے ہوئے کہا۔

"بھولی بائی! سود خور بھلا آدمی — ؟ اسی لئے تمہارے مذہب میں سود حرام ہے۔"

ٹھاکر نے کشمیری کڑھت کے کشن سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سفید بڑی بڑی نوکیلی مونچھوں والے وجیہہ اور شاندار سورج بنسی راجپوت — نواب بیگم نے — راہوارِ تخیل کو آزاد کیا۔ انکے پرکھا اکبر اور جہانگیر کے دربار میں اسی طرح بیٹھتے ہوں گے خیر۔ وہاں صوفہ تو ہوگا نہیں۔ کھڑے رہتے ہوں گے۔ دست بستہ۔ دیوانِ خاص میں —

بے چارہ لڑکی کا باپ ۔ لڑکیوں کا باپ ہونا سچ مچ بڑی بدقسمتی ہے —— اگر یہ ہم مغلوں کا زمانہ ہوتا ۔ اتنی فکر ان دُکھیا کو کاہے کو ہوتی ۔ جہیز شاہی دربار سے عطا ہو جاتا —— یا ایک پالکی انکی گڑھی میں شہنشاہ کے محل جانے کے لئے علیحدہ رکھی ہوتی ۔ چندر اوتی اس میں بٹھال کر آگرے بھیج دی جاتی ۔ مغل شہزادوں کی ماں بنتی ——

آگرہ یاد کیا تو ننہیال کا خیال آیا آنسو پھر امنڈ رہے ۔ اسپ تخیل گلی شاہ تارا ، دلی، کی جانب موڑا ۔ اگر ابا زندہ ہوتے ۔ مرزا دلدار علی برلاس ۔ اور میری شادی ہونے والی ہوتی کسی نواب زادے سے ۔ اعلیٰ امر تبت سمدھی سے ٹکر —— جہیز کی فراہمی کی خاطر اسی طرح پریشان ہوتے میرے ابا —— میری شادی —— ابا میرے بیاہ کے انتظامات میں مصروف میرے ابا میرے بیاہ کے انتظامات —— ٹپ ٹپ آنسو ——

پردہ نشین بھنوری بائی گڑھی میں مایوں بیٹھی ہے ۔ چوٹی کے والیان ریاست —— بارات میں آرہے ہیں اور فرض کر دٹھاکر پچاس ہزار مہیا نہ کر پایا ۔ شادی میں لگی دیر ۔ اور یُوراج کو لے اُڑی بڑا ونکور کی راجکماری —— تو چندر اوتی کیا گڑھی کی خندق میں کود جائے گی —— نہیں نہیں —— میں ایسا نہیں ہونے دوں گی ——

آنسو کھل کھل رواں تھے جب ڈیملر کا ہارن پھاٹک پر بجا ۔

ٹھاکر صاحب نے چونک کر آنکھیں کھولیں ۔ صدر دروازے سے چھوٹی چوپڑ والے سیٹھ گردھاری لال رنچھوڑ مل کنوڑیا اپنے بستے سمیت فٹ بال کی طرح لڑھکتے صحن میں داخل ہوئے ۔ نواب بیگم کو یاد آیا یہ ڈیملر بھی ٹھاکر مہیشور سنگھ ہی نے عنایت کی تھی ۔

دوسری شام فلومینا نے نواب بیگم کے بالوں میں بُرش کرتے ہوئے کہا "ہم صاحب یہ تم نے بہت FOOLISH بات کیا ۔ اپنا بلڈنگ کا گارنٹی پر ٹھاکر کو پیسہ نہیں دلوانا مانگتا ۔ —— ٹھاکر نہیں مانتا تھا ۔ اپنا اکھا مغل پینٹنگ گارنٹی میں دینے کو تیار تھا ۔ تم ہی نے ضد کیا باہر سے ہم سب سن رہا تھا ۔"

"فلومینا۔ ٹھاکر صاحب جلد از جلد اصل مع سُود ادا کر دیں گے۔ خالی خولی گارنٹی میں میرا کیا بگڑا؟"

"میم صاحب۔ اگر وہ رقم اولڈ ٹائم پر نہیں دیا تو سیٹھ اکھّا بلڈنگ کُرکی کر والے گا۔"

"اکھّا نہیں۔ ہاف۔ آدھی حویلی تو پھر بھی میرے پاس باقی رہے گی۔" نواب بیگم نے بے فکری سے قہقہہ لگایا۔

"لائبرویٹ نس کے سامنے لکھا پڑھی ہوا۔ میم صاحب تم اس بات کو جوک سمجھتا!"

"ارے فلومینا کی بچّی۔ کیا رات کے وقت بدشگونی کر رہی ہے۔ کالی موٹی بھینس۔ چُڑیل۔ بھاگ —— بھاگ جا یہاں سے۔" نواب بیگم نے جھلّا کر سر تہوڑایا۔ اور آئینے میں عکسِ جمال ملاحظہ کرنے لگیں۔ خدا نہ خواستہ —— شیطان کے کان بہرے —— تھُو تھُو —— اگر کچھ گڑبڑ ہوئی اس رہن نامے کے سلسلے میں۔ گردھاری لال میری آواز اور رنگ روپ تو قرق نہیں کرا سکتا۔ اتنا ہی پھر پیدا کر لونگی۔ اللہ اور دے گا —— ایسے آڑے وقت میں ٹھاکر کی مدد نہ کرتی؟

بُلبُل کی آواز پر چونک کر دریچے میں گئیں: "اے لو رات کی راگنی ابھی سے الاپ رہی ہو؟"

پڑوسیوں کی بُلبُل اطمنان سے گائے گئی۔

نواب بیگم نے ہنس کر پکارا۔ "اے بی۔ تم عندلیب ہزار داستان تو نہیں ——؟"

(۱۶)

پری چہم

چندراوتی جی کی شادی میں نواب بیگم نے پوری تیاری سے گایا اور ٹھاکر مہیشور سنگھ کے دربار کا نام روشن کیا۔ باپ کا دیوالہ نکال کر بھنوری بائی اپنے پرنس کے ساتھ ہنی مون کیلئے یوروپ سدھاری۔ نواب بیگم جے پور واپس آکر اپنے معمولات میں مصروف ہوئیں۔ صبح کو ریاض دوپہر کو قیلولہ۔ شام کو ڈیملر موٹر کار یا میلارڈ فٹن پر ہوا خوری۔ بیاہ کے جلسے کے بعد ٹھاکر کی بارہ دری کو روتے دھوتے خیر باد کہہ آئی تھیں۔ مجرے آمدنی کا واحد ذریعہ رہ گئے مہاراجہ گوالیار کے برادر خورد بھیا گنپت راؤ نے رامپور سے ہارمونیم کو فروغ دیا تھا گھر گھر عطائیوں کی محفلیں سجنے لگی تھیں کسبی کے مقابلے میں عطائی میدان میں آرہے تھے۔ مجرے کے بجائے فونوگراف۔ مہیشور سنگھ جی کی ملازمت کے خاتمے نے حالات بدل دیے۔ نواب بیگم نے خدمت گار مہری، مشعلچی اور ڈرائیور کو ایک ایک ماہ کا نوٹس دیا۔ استاد جی سے کہا ڈیملر بکوادیں اخراجات میں تخفیف کی دوسری سبیلیں سوچنے لگیں۔

چندراوتی کے بیاہ کو تین چار ماہ گذر گئے نواب بیگم کے لئے کہیں سے سائی نہیں آئی۔ ایک روز دن چڑھے دالان میں چپ چاپ بیٹھی پان بنا رہی تھیں کہ ٹھاکر صاحب وارد ہوئے۔ "آج جے پور میں بہت سے کام نپٹانے ہیں۔ چند منٹ کے لئے تمہاری خیریت معلوم کرنے آ گئے" آرام کرسی پر بیٹھے۔ چند لمحوں بعد بولے "نواب بائی۔ تم نے ہمارے لئے بہت کیا۔ تم بہت بھلی عورت ہو۔"

برآمدے کے نیچے کیاری میں تیز سرخ گلاب کھلے ہوئے تھے —— بلبل گلاب کی ٹہنی پر آن بیٹھی۔ ٹھاکر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اڑی نہیں۔ اسی طرح بیٹھی چہکتی رہی۔

"یہ تو خالص ایرانی بلبل معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کیسے آگئی؟" انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

"پرندے اُڑکر کہاں چلے جاتے ہیں۔ حضور"۔ نواب بیگم نے جواب دیا۔" یہ بلبل ہے ؟ میں سمجھی کوئل ہوگی۔ مجھے اُڑتے پرندوں کو پہچان نہیں ۔"

دفعتاً ٹھاکر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے ۔گیارہ بجے ڈاکٹر سے اپوائنٹمنٹ تھا۔ انھیں رخصت کرکے پژمردہ سی تخت پر لیٹ رہیں ۔ ایک بجے خاصہ تناول کیا۔ اپنے کمرے میں جا لیٹیں۔ بے مصرف بے کار زندگی ۔شام کو پانچ بجے برآمدے میں آکر چائے پی رہیں تھیں کہ وہ بلبل پھر شاخ گل پر آن بیٹھی اور یکسانیت سے گانا شروع کر دیا۔

پڑوس میں فیروزے کے ایرانی تاجر آن کر بسے تھے ۔اسے پنجرے میں بند کرکے اپنے ہمراہ اصفہان سے لائے تھے۔ اس کے تھوڑے سے پر کاٹ دئے تھے ۔ وہ آہستہ آہستہ نیچا نیچا اڑتی پھدکتی نواب بائی کے صحن چمن میں آجاتی تھی ۔

"ہلو سسٹر نائیٹ انگیل ـــ" فلومینا نے چار دائی لاتے ہوئے اسے آواز دی۔"میم صاب یہ ہمارا بہن ہے ۔اپنا سینٹ فرانسس اف اسیسی سب چڑیا لوگ کو اپنا بہن بھائی بولتا تھا ، اکھا جانور لوگ کو اپنا سگا والا بولتا تھا۔"

"ایسا ـــ ؟" نواب بائی نے بے دھیانی سے کہا اور سوچیں گجرا بائی کے ہاں ہو آئیں۔ گجرا بائی عرصے سے مفلوج پڑی تھیں انکی بیٹیاں نواب بائی کی شہرت اور کامیابی سے بے طرح جلتی تھیں اور فلومینا کی اطلاع کے مطابق انکے خلاف جادو ٹونے کرواتی رہتی تھیں ۔نواب بائی بڑی نمک حلال اور احسان ماننے والی خاتون تھیں۔ جو انکے ساتھ بدی کرتا اسے پانی پی پی کر کوستیں۔"لعنت" ،تکیہ کلام ۔جو نیکی کرتا اس کی ہمیشہ ممنون احسان رہتی تھیں۔ گجرا بائی کے ہاں کی تعلیم و تربیت نے انکی زندگی بنائی تھی۔ لڑکیوں کی پرخاش کے باوجود وہ مہینے میں ایک آدھ بار انکے ہاں مزاج پرسی کے لیے ہو آتی تھیں۔ دوسری محسنہ راحت بائی جب تک زندہ رہیں ان سے ملنے اکثر اجمیر جایا کیں۔

چائے ختم کرکے اٹھنے ہی والی تھیں کہ بلبل کی آواز نے پھر متوجہ کیا۔ وہ بڑی مستقل مزاجی سے گائے جا رہی تھی ۔

"کوا بولے تو سمجھ میں بھی آئے کہ بھئی کوئی مہمان آنے والا ہے ۔ یہ نگوڑی بلبل کیوں

چلائے جا رہی ہے۔" انھوں نے فلومینا سے کہا۔ "اچھا ڈرائیور کو بولو غائب نہ ہو جائے۔
چاند پول بازار جانا ہے۔" معًا یاد آیا۔ ڈرائیور تو اب غائب ہونے والا ہے۔ یہ گاڑی گھوڑا
موٹر سب بہارِ چند روزہ ہے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ گرگابی میں پاؤں ڈال کر ڈریسنگ روم
رُوم کی سمت جا رہی تھیں کہ فلومینا بھاگی بھاگی آئی ——" بائی —— او بائی —— باہر وہ صاحب
آیا ہے۔ وہی فوٹو والا رینال صاحب —— ہز ہائی نس کی موٹر کار پر آیا ہے —— تم بولا تھا گوڈ
ایک ڈور بند کرتا ہے تو ستر ڈور کھولتا ہے۔ ادھر ٹھاکر گیا ادھر وہ آیا ——"
"ایسا —— ؟" نواب بیگم مسکرائیں۔ دل ڈوب سا گیا۔ وہ خوش مزاج خوش شکل بنکھرا
سا نوجوان پھر آموجود ہوا تھا —— ستر اسی برس پہلے کا زمانہ ہوتا اصغری اور منوری کشمیرن وال
اور یہ یوریپین ایک معمولی فوٹوگرافر کے بجائے ہوتا ایک دولت مند تاجر فوجی ایڈونچرر۔ پلانٹ
یا کسی ہندوستانی فرمانروا کی فوج کا جرنیل۔ اور وہ خود ایک ڈیرے دارنی۔ تو وہ بخوشی اسکی
کمپاؤنڈ میں بنے "بی بی خانے" میں اپنی عمر گذار دیتیں۔ مگر یہ ۱۸۱۲ء کے بجائے ۱۹۱۲ء
تھا۔ وقت بدل چکا تھا۔
"گول کمرے میں بٹھلاؤ میں ابھی آتی ہوں۔" فوراً ڈریسنگ روم میں گئیں۔ گجرا بائی
کی بیٹیوں کو جلانے کے لئے نیا بنارسی جوڑا پہننے والی تھیں۔ جو چندراوتی کے بیاہ میں ملا تھ
اب رینال صاحب کی خاطر انھوں نے "اپٹوڈیٹ انگریزی فیشن" مناسب جانا۔ بھاری
جھالر دار بلاؤز۔ ککروندے کی بیل ٹکی سُرخ و سیاہ جارجٹ کی ساری پارسی وضع سے
باندھی۔ جوڑا کھول کر بال شانوں پہ بکھرائے۔ بنگالنوں کی طرح۔ سینٹ کی شیشی نکالنے
کے لیے سنگھار میز کی ایک دراز کھولی تو اس کے کونے میں پڑے ہیرے کے پری جھم جھک
ٹھے۔ نکال کر وہ بھی پہن لیے۔ تیار ہو کر باہر آئیں۔ دالان سے گذرتے ہوئے ہاتھ بڑھا
ے کیاری میں کھلا ایک سُرخ گلاب توڑا۔ اسے کان کے پیچھے اُڑسں، اونچی ایڑی کے نوکیلے
لائیی جوتوں پر کھٹ کھٹ کرتی گول کمرے میں پہنچیں۔

آندر سے جوزف رینال صوفے پر بیٹھا جرُٹ پی رہا تھا۔ فوراً تعظیماً کھڑا ہو گیا —— پچھلی با

یہ نیٹو ناچ گرل ایک مغل پرنس لگی تھی۔ آج اسپینش جپسی ڈانسر۔ سرخم کر کے مصافحہ کیا۔ اور نواب بیگم کے فروکش ہونے کے بعد خود بیٹھا۔

ہم نیٹو رئیسوں کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ درباروں میں کھڑے ہو کر گاتے ہیں۔ حضور سرکار کہہ کر ان کو مخاطب کرتے ہیں۔ آج تک کوئی نیٹو جنٹلمین نواب بیگم کیلئے کرسی چھوڑ کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ نہایت ممنونیت کے ساتھ بولیں: "سلام آندرے صاحب جے پور کیسے آنا ہوا؟"

"ہز ہائی نس کے فوٹو گراف ——" آندرے نے گویا نرت کر کے بتایا۔ کھُس خرِدماغ انگریزوں کے برخلاف یہ یوریپن لوگ کتنے چونچال اور بے تکلف ہیں۔ اور اچھے خاصے کتھک۔ کیا بھاؤ بتاتے ہیں۔

"مبارک ہو۔"

"مغ سی۔"

"ہم نے آپ کو دلّی میں دیکھا تھا۔ ریڈ فورٹ کی گارڈن پارٹی میں —— آپ ایک بُرجی پر چڑھا ہوا تھا ——" نواب بیگم ہنسیں۔

"اوہ —— ؟" آندرے بھی ہنسا —— مہمان اور میزبان چند منٹ تک ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اردو میں گفتگو کرتے رہے۔ فلومینا چائے کا بندوبست کرتی ہوئی آئی تو اسے مزید ترجمانی کے لئے روک لیا۔ فلومینا ڈی کوسٹا کی گوآنی بمبیّا انگریزی گوکنگز انگلش تو نہ تھی البتہ بقدر ضرورت کافی۔

خادمت گار نقرئی ٹی سیٹ میں بڑھیا دارجلنگ ٹی لے کر داخل ہوا۔

آندرے محویت اور دلچسپی کے ساتھ اپنی میزبان کو رنی ژاں کی طرز معاشرت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ حسین خاتون ماہر فن بھی تھی۔ دولت مند اور باذوق بھی۔ آندرے رینال اپنی پورٹریٹ فوٹو گرافی کی بزنس کلکتے میں اب تک نہ جما پایا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ نواب بیگم جیسی خودمختار متموّل اور جذباتی عورت سے اس کی دوستی کارآمد ثابت ہوگی۔ پچھلی مرتبہ ٹھاکر مہیشور سنگھ کے ہاں فوٹو سیشن کے دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ نواب بیگم اُس سے

دوبارہ ملاقات ناپسند نہ کرے گی۔ اتنے دنوں بعد آج پھر یہ مطربہ۔۔۔ مسرور و مضطرب نظر آئی اس کے ننھے مُنّے گھنگروؤں والے ہیرے کے کڑے چھُن چھُن کرتے تو بہت اچھا لگتا۔

آندرے ریاست کے مہمان خانے میں مقیم تھا۔ رائل فیملی کے پورٹریٹ بنانے کا کمیشن ختم ہوتے ہی نواب بیگم کی دعوت پر انکے ہاں منتقل ہو گیا۔

نواب بیگم کے نیم دیسی نیم برطانوی کولونیل طرزِ رہائش نے برسلز کے پٹی بورژوا آندرے رینال کو بہت متاثر کیا۔ صبح بیڈ ٹی۔ نو بجے چھوٹا حاضری۔ (نواب بیگم اکثر سوچتی تھیں کہ جب عباسؑ کی حاضری فرنگیوں کا بریکفاسٹ کس طرح بن گئی، کئی کورس کا لنچ۔ شام کو ہائی ٹی (HIGH TEA)۔ رات کو بڑھیا ڈنر۔ نواب بیگم اتنی عالی دماغ تھیں کہ ایک بوھرے ملک التجار کریم علی جاپان والا کے ذریعے اپنے ڈنر سیٹ پر انگور کے حلقے میں "نواب بیگم اف جے پور" کا طغریٰ اتک چھپوا منگوایا تھا۔

ایک روز فٹن بھیج کر نواب بیگم نے سیٹھ گردھاری لال رنچھوڑمل کنوڑیا اور انکے پارٹنر پرشوتم داس جھاویری کو پھر بلوایا۔ جھاویری کے ہاتھ وہ ہیرے کے پری چھم فروخت کرنا چاہتی تھیں تاکہ آندرے کلکتے جاتے ہی فوٹوگرافی کی بزنس جما سکے۔ ٹھاکر مہیشور سنگھ کی تباہی کے متعلق جے پور میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ جھاویری صورت حال فوراً بھانپ گیا۔ بائی جی کی ملازمت ختم ہو گئی۔ عمر ڈھل رہی ہے۔ خود اس صاحب پر عاشق ہو گئی ہیں۔ آمدنی بہت کم ہے۔ اپنے گہنے بیچ بیچ کر اس چالو گورے کو کھلا رہی ہیں۔ جھاویری کاٹن ایکسچینج کی طرح اس بازار کا اتار چڑھاؤ بھی پہچانتا تھا۔ نواب بائی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کیلئے اس نے پری چھم کے دام بہت کم لگائے پیچھے کھڑی فلومینا نے آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ نواب بیگم نے جگمگاتی جوڑی اپنے پرس میں رکھ لی۔

جھاویری کو معلوم تھا کہ فوٹوگرافر رینال یہیں مقیم ہے۔ وہ اپنے ساتھ چند کیمیو لایا تھا۔ بولا صاحب لوگ کو مغل راجپوت نوادر کی بہت تلاش رہتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ آندرے نے وہ پسند نہیں کئے۔ بے حد مہنگے تھے۔

تب جہادیری نے آتشدان پر رکھے رنگین پورٹریٹ کی طرف اشارہ کیا: "بائی جی آپ اس فوٹو کا کیمیو کیوں نہیں بنوا لیتیں؟ ہمارا آرٹسٹ اس کو ہو بہو ہاتھی دانت پر بنا دے گا۔ واجبی قیمت پر۔" پھر اس نے آندرے کو مخاطب کیا: "صاحب — بائی جی کو تم وہ برتھ ڈے پریذنٹ دینا مانگتا — کیا؟"

نواب بیگم مسکرائیں۔ اب تک وہ خود ہی صاحب کو پریذنٹ پر پریذنٹ دیے جا رہی تھیں۔ انھوں نے خود ایک فرنچ پرفیوم کے علاوہ انکو کچھ نہ دیا تھا — مگر یہاں معاملہ لین دین کا نہیں عشق کا تھا —

ہفتہ بھر میں پرشوتم داس جہادیری کی میناکاری ورکشاپ میں ملازم مغل نژاد مصوّر مرزا فاروق احمد جے پوری نے اپنے موروثی فن کا نمونہ بنا کر پیش کر دیا۔ ہاتھی دانت پر بنے نواب بیگم کے میناتور کو آندرے نے اپنے کارپٹ بیگ میں رکھا۔ نواب بیگم نے چپکے سے الماس کے پری جھم اس کے سوٹ کیس میں ڈال دیئے۔

چلتے وقت وہ کہتا گیا اپنا اسٹوڈیو سیٹ اپ کر لوں پھر تم بھی چندرنگر آجانا۔

چندرنگر سے بہت دن بعد ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس کا خط آیا۔ نواب بیگم نے فوراً فلومینا سے جواب لکھوایا۔ وہ ایک مصروف لاابالی سا نوجوان تھا اور مہینوں بعد اس کا مختصر پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ نواب بائی اب بے حد فکرمند تھیں۔ مگر چلتے وقت اس نے جو جملہ کہا تھا میں اپنا اسٹوڈیو سیٹ اپ کر لوں پھر تم بھی شاندرناگور آجانا۔ یہ ایک نہایت امید افزا جملہ تھا — بھلا کوئی کیوں کسی کو اپنے ہاں بلاتا ہے۔ کیوں فلومینا —؟

"برو تبر۔ بٹ جب تم ریناں میم صاحب بن جائے گا میرے کو بھی بلجیم لے جانا اِچ مانگتا نہیں تو بابا کی دیکھ بھال کون کرے گا —؟"

نواب بیگم کو بچی کا نام عندلیب بانو بیگم رکھنا اِچ پڑا کیونکہ پڑوسن بُلبُل متواتران کے

باغیچے میں آیا کی اور مسلسل گاتی رہی۔ بُلبُل تھی یا شاماما یا گُلدم۔ نواب بیگم کو اڑتے پرندوں کی پہچان نہ تھی۔ مگر شربتی آنکھوں اور بھورے بالوں والی بچّی بہرحال عندلیب تھی شہر کے ایک پارسی فوٹوگرافر سے بچّی کی تصویر کھنچوا کر آندرے کو بھیجی۔

خلاف معمول بواپسی ڈاک جواب آیا۔ فلومینا نے ترجمہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں تم کو اب کلکتہ آجانا چاہیئے مگر جب تک میں سٹیل نہ ہو جاؤں۔ ایسا ممکن نہیں۔ میں اب تک اپنا اسٹوڈیو نہیں کھول سکا۔ کلکتہ مہنگا شہر ہے دوکان کے لئے بہت سرمایہ درکار ہے۔ البتہ چندر نگر میں ایک بوڑھا فرانسیسی جس کے اسٹوڈیو میں میں ملازم ہوں اپنا اسٹاک، اسٹوڈیو گڈول ہر چیز فروخت کر کے فرانس واپس جانا چاہتا ہے۔ اس سارے اثاثے کی قیمت اس نے محض چالیس ہزار لگائی ہے جو واجبی بلکہ سستی ہے۔ لیکن اتنی بڑی رقم میرے بس کی بات نہیں تم جس عیش و آرام کی عادی ہو اور ننھّی نائیٹ اینگیل جن آسائشوں کی مستحق ہے وہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ میں اپنے کاروبار کا خود مالک ہوں۔ کیونکہ میں ہرگز نہ چاہوں گا کہ تمہاری دولت اور آمدنی پر تکیہ کروں۔ کوئی ایشیاٹک یا یوروپین غیرت مند مرد ایسی صورت حال قبول نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں میرے ماں باپ جو ملک بلجیم کے شہر برسلز میں رہتے ہیں قدامت پسند رومن کیتھولک ہیں وہ یہ کبھی گوارا نہ کریں گے کہ میں نے ہندوستان آکر ایک نیٹو محمڈن ڈانسنگ گرل سے شادی کرلی ہمارے چند نوجوانوں نے بلجین کونگو میں افریقی لڑکیوں سے بیاہ کیئے ہیں مگر وہ ہماری اپنی کولونی ہے۔ اور وہ لڑکیاں عیسائی۔ تم بھی پسند نہ کرو گی کہ اپنا مذہب تبدیل کرو۔ لہٰذا ان حالات میں بہتر یہی ہو گا کہ ہم کوئی فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ گو میں یقیناً یہ چاہوں گا کہ میری لڑکی مادر کلیسا کے بپتسمے سے محروم نہ رہے اور ایک کورتی زاں کے ہاں پرورش نہ پائے۔

آخری جملے پہ نواب بیگم تلملا کر رہ گئیں۔ سوچتے سوچتے حیران ہو گئیں۔ بڑی کُٹن بنی تھی۔ اگر وہ شادی کے لیئے تیار ہو بھی گیا تو مرتی مر جاؤں گی نہ خود کرسٹان بنوں نہ لڑکی کو بننے دوں۔ معًا ایک ترکیب سجھائی دی۔

پیسہ — پیسہ — ہر مصیبت کا حل پیسہ۔ چالیس ہزار۔ آندرے نے ربنال کو چالیس ہزار چاہیے۔ ہیرے کے پری چہم اس کے حوالے کیے۔ چلو۔ بلا سے۔ اس چھوکری کا باپ ہے۔ شادی کر لے۔ چھوکری کی زندگی سنور جائے گی۔ صاحب کی بیٹی کہلائے گی۔ چالیس ہزار وہ اسٹوڈیو خرید لے۔ احسان مند ہو کر کلکتہ بلا لے۔ سنا ہے اب عدالت میں جا کر بیاہ کرنے لگے ہیں تم اپنے مذہب پر قائم ہم اپنے۔ یکلخت بڑا سکون محسوس ہوا مولا نے راہ سجھا دی۔
عندلیب کی فکر میں مزید بچت شروع کی۔ ڈیملر اور فٹن گھوڑا بکوا کر پچھلے قرضے مع سود ادا کیے۔ سوائے باورچی اور فلومینا کے سارے ملازمین علیحدہ کیے۔ گردھاری لال کو بلوانے کے لیے نہ ڈیملر باقی تھی نہ فٹن۔ تانگے پر آئے اور کرایہ نواب بائی سے دلوایا۔
گلابی رنگ کی حویلی مردانہ اور زنانہ حصّوں میں اس طرح منقسم تھی کہ دونوں کو ایک سنگی جالی دار راہداری نے ایک دوسرے سے ملحق کر رکھا تھا۔ بیرونی حصّہ دو سال قبل مہیشور سنگھ کو دینے کے لیے مبلغ پچاس ہزار روپیہ میں رہن رکھ چکی تھیں۔ اس کا سود در سود ٹھاکر صاحب ادا کر رہے تھے۔ شرائط کے مطابق دو سال بعد اصل رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں مہاجن اس حصّے کی قرقی کروانے کا مختار تھا۔
تانگے پر سے وہ وکیل صاحب بھی اترے جنہوں نے کاٹھیا واڑی بیوقوف دربار صاحب کی موجودگی میں انکے حکم سے اسی دیوان خانے کی اسی وینیشین کوچ پر بیٹھ کر اس حویلی کو نواب بائی کے نام منتقل کیا تھا۔ دو سال قبل انھوں نے حویلی کے نصف حصّہ کا رہن نامہ تیار کیا تھا۔ آج زنان خانہ، شاگرد پیشہ اصطبل اور شتر خانہ رہن رکھ کر مبلغ چالیس ہزار روپیہ گردھاری لال سے نواب بیگم کو دلوایا۔ اب سود در سود کی رقم لرزہ خیز تھی مگر نواب بائی کا دل کہہ رہا تھا کہ آندرے کا کاروبار جلد چمک جائے گا۔ اس نے بتلایا تھا کہ بوڑھا فرانسیسی ژاک کوربیں کلکتہ کا نامی فوٹو گرافر ہے۔ شملہ دہلی لاہور تک بلایا جاتا ہے وائسرائے کمانڈر انچیف گورنر بنگال، انکی لیڈیاں اور والیان ریاست سبھی اس سے اپنے پورٹریٹ بنواتے ہیں اُکی دوکان خریدنے کے بعد یہ رقم ادا کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ چند روز بعد چالیس ہزار کا بنک ڈرافٹ آندرے کو روانہ کیا۔ اصل خبر سے تو دچند رنگر پہنچنے کی

منّت مانی۔ ساتھ ہی عندلیب کے عقیقہ کی تقریب منعقد کی۔ چاندپول بازار کی سہیلیوں نے گلگلے تلے۔ عرصے بعد راگ رنگ کی محفل جمی۔ رت جگہ منایا گیا۔ صبح منہ اندھیرے گھی کے چالیس چراغ تھالی میں رکھ کر نواب بیگم ہمجولیوں کے ساتھ گاتی بجاتی مسجد کا طاق بھرنے گئیں۔ گردھاری لال اور وکیل صاحب کو بلا کر انھوں نے بقیہ حویلی انوار کے روز رہن رکھی تھی جب فلومینا کئی گھنٹے کے لئے چرچ جاتی تھی۔ انکو ڈر تھا کہ نگوڑی پھر کوئی بدشگونی نہ کرے مثلاً یہ کہ بائی تمہارا منک بھریلا ہے۔ تمہارا ابھی خلاص —— اکھا بلڈنگ گروی۔

اتوار کے روز گردھاری لال قانونی کاغذات پر دستخط کرواکے اپنے گھر گیا۔ چند گھنٹے کے اندر اندر ہیضہ سے قضا کی۔ بڈھا نسبتاً شریف آدمی تھا۔ گو بے انتہا بیٹو —— سنا گیا کہ چوکے ہی میں اس کا دم نکلا۔ لڑکا خورد سال تھا۔ چھوٹا بھائی بیکانیر سے آکر گدّی پر بیٹھا۔ وہ معاملے کا سخت مشہور تھا۔ اب تو اللہ ہی خیر کرے۔ نواب بیگم کے دل کو پنکھے لگ گئے۔ جلے پاؤں کی بلّی کی طرح کمروں کمروں گھومتیں اور سامانِ آرائش کو چھو چھو کر دیکھتیں۔ جیسے بہت جلد اس سے بھی ہاتھ دھونے والی ہوں۔ دربار صاحب آنجہانی سجی سجائی حویلی بخش گئے تھے۔ عنابی مخمل کے سنہری ڈوریوں والے پردے۔ بڑھیا قالین اور دریاں۔ وینیشین طرز کا فرنیچر۔ عندلیب گھنگرو لگے رنگین گجراتی پنگوڑے میں بڑی غاؤں غاؤں کیا کرتی۔ نواب بائی سے زیادہ فلومینا اس پر جان چھڑکتی تھی گھر میں اب دو ملازم رہ گئے تھے۔ باہر خانساماں جی۔ اندر فلومینا۔ دیکھتے دیکھتے نواب بائی کی ”ریاست“ پر زوال آگیا تھا۔

چندر نگر سے بنک ڈرافٹ کی رسید آچکی تھی۔ شکریے کا خط ندارد۔ ایک روز ٹھاکر مہیشور سنگھ کا گھنگرو بجاتا سانڈنی سوار آخری تنکا لے کر وارد ہوا جس نے اونٹنی کی کمر توڑی —— ٹھاکر صاحب کا گڑھی میں دیہانت ہو گیا۔ چندراوتی کی شادی کے بعد ڈیڑھ سال کے اندر تیسرا ہارٹ اٹیک۔ بال بال توان کا قرضے میں بندھ چکا تھا۔

سورگباشی آخری بار جب آئے تھے کہہ رہے تھے کہ اس شورا نزی پر بائیں کے واسطے مالوہ جانے والے ہیں وہاں ایک گھنے بن کے بیچوں بیچ بھیروجی کا مندر تھا۔ وہ شیوجی اور درگا بھوانی کے پرستار تھے۔ ڈکھیا کہا کرتے تھے۔ شنو مہاکال ہے۔ تمہارے پیغمبر صاحبؐ کی بھی ایک حدیث ہے کہ خدا صاحب زمانہ ہے۔ اس لئے زمانے کو برا نہ کہو— ٹھاکر صاحب جیسے شائستہ گیان دھیان والے اور وضعدار آدمی اب کہاں — انکی موت کی خبر سے نواب بیگم کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ غش آگیا۔ سانڈنی سوار پیغامبر نے اسے صدمے پر محمول کیا۔ فلومینا نے دال باٹی اور باجری کی کھیچ سے اس کی تواضع کی۔ دوڑی دوڑی واپس آئی۔ مالکن پر لونڈر چھڑکا۔ پانی پلایا۔ جب حواس ذرا بجا ہوئے تو کہنے لگی "میم صاحب ہم تم کو پہلے ہی بولا تھا۔ اولڈ مین دو سال کے اندر ڈبہ گول کیا تو تم کیا کرے گا۔ ارے اب ہم لوگ رستے پہ کھڑا ہوگا۔ وہ نواسیٹھ بڑا ظلمی مشہور ہے۔ ہم لوگ کو نکال باہر کرے گا" بینک ڈرافٹ فلومینا ہی نے رجسٹری کیا تھا — محض اینڈی بابا کی خاطر —— مگر اس چار سو بیس موالی نے ڈکار تک نہ لی۔ باٹلی کا وقت تھا جھولے میں پڑی عندلیب زور سے روئی۔ فلومینا دودھ گرم کرنے باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

نواب بیگم ہڑبڑا کر مسند سے اٹھیں۔ وضو کیا۔ نفل پڑھنے کھڑی ہوگئیں۔ سجدے میں گر کر زار وقطار روئیں۔ اب انکی لاج خدا کے ہاتھ میں تھی۔

فلومینا نے بچی کو دودھ پلایا بنا سنوار کر پریمبولیٹر میں بٹھالا۔ باہر خانساماں جی کو دے آئی۔ خود بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی۔ سیاہ جالی کا اسکارف سر پر ڈالا۔ سینٹ فرانسس اف اسسی کی مورتی کے سامنے شمع روشن کی۔ کوکتی میں جلدی جلدی بڑبڑاتی ہولی فادر ہم سب مورکھ جانور ایک دوسرے کا سگا والا ہے۔ ہولی فادر ہمارے لئے دعا کرنا مانگتا۔ چھوٹا اینڈی بابا کے لئے دعا کرو۔ اس کی بے وقوف ماں کے لئے دعا کرو۔ ہولی فادر ——

آدھی رات کو نواب بیگم صحن میں گئیں۔ گھپ اندھیرے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر بال بکھرائے۔ فریادی ماتم کیا —— اے کلُ کے مددگار مدد کے لئے آؤ— فریاد کو پہنچو—

استاد جی اور سارنگی نواز ماموں بھانجے چھٹی لے کر اپنے وطن اندور گئے ہوئے تھے۔ افیمچی طبلچی کو پہلے برطرف کر چکی تھیں کہ ہر وقت پینک میں رہنے لگا تھا۔ شاگرد پیشے میں اب محض خانساماں جی تھے۔ حویلی کی نچلی منزل میں دو خوفزدہ عورتیں۔ بالائی منزل کے کمرے بند پڑے تھے۔ دوپہر کے سناٹے میں اور رات کے وقت لق و دق عمارت بھائیں بھائیں کرتی۔

کنڈی کھڑکی اور نواب بیگم دہلیں کہ قرق امین آ گیا۔ کبھی سوچتیں شہر میں ڈونڈی پٹے گی ـــ نواب بائی کی حویلی کا نیلام ـــ دیواروں پر اشتہار لگیں گے۔ اخباروں میں سرخیاں ـــ ایک کسبی کی ناعاقبت اندیشی کا عبرتناک نتیجہ۔ افسانے چھپیں گے۔ ایک طوائف کا حسرتناک انجام۔ اور کیا جگ ہنسائی ہوگی۔ اللہ اللہ۔ وہ خدمت گار۔ شوفر۔ ذاتی کربسٹ کے برتن۔ ڈیملر فٹن۔ سارا کرّوفر غائب ـــ

عندلیبؔ سبز قدم ہے۔ توبہ توبہ۔ عندلیب کا ہے کو منحوس ہونے لگی گجرا بائی کی بدذات لڑکیاں! مجھے ہفت نظری کی نظر لگ گئی۔ دشمنوں نے کلّو ابیر کے ذریعے مجھ پر عمل کروا دیا۔

فلومینا یہاں سے بھاگ چلو۔

کہاں۔

کلکتہ اور کہاں۔

اخباروں میں سرخیاں ـــ نواب بیگم کی پراسرار گمشدگی۔ سیٹھ گردھاری لال کنوڑیا کو دھوکہ دے کر فرار۔

ایک رات خواب میں کیا دیکھتی ہیں۔ دروازے پر نیلام کا اشتہار لگ گیا ہے۔ ڈنکا بج رہا ہے۔ لوگ جمع ہیں۔ وہ خود لال پٹاری سر پہ اٹھائے سڑک کے کنارے کھڑی ہیں ـــ برقعہ اوڑھے تسبیح ہزار دانہ جھلاتی حجن بی ساتھ موجود ہیں۔ صبح چار بجے کا خواب تھا۔ ہیبت زدہ ہو کر اٹھیں۔ فلومینا کو جگایا جو عندلیبؔ کے پالنے کے قریب غالیچے پر سو رہی تھی۔ اسے خواب سنایا اس نے فوراً صلیب کا نشان بنایا۔ دن بھر پریشان رہیں۔ دوسری رات پھر خواب میں دیکھا کہ شکستہ برقعہ اوڑھے تسبیحیں بیچ رہی ہیں۔ اندھی حجن بی لاٹھی ٹیکتی ساتھ ساتھ رینگ رہی ہیں

تیسری رات خواب میں اجمیر کی درگاہ شریف نظر آئی۔ پکھاوج پر دھمار ـــ کوئی استاد الاپ رہے تھے۔ جن کا چہرہ انڈے کی طرح صاف سپاٹ تھا۔ نہ آنکھ نہ ناک نہ منہ۔ اور اس انڈے میں سے آواز نکل رہی تھی ـــ دیکھو کھیلیں دھمال خواجہ معین الدینؒ ـــ دیکھو کھیلیں دھمال خواجہ معین الدینؒ ـــ اب ایسی رُت آئی ـــ ایسی رُت آئی۔ دہشت سے دل دھڑکنے لگا آنکھ کھُل گئی۔ اٹھ کر پانی پیا۔

اب روز صبح بیڈ ٹی پیش کرتے ہوئے فلومینا پریشانی سے پوچھتی ـــ "میم صاحب آج کوئی سپنا گرا۔؟"

دو سال کی مدت چند روز بعد پوری ہونے والی تھی۔ نواب بیگم نے نیک سرشت خانساماں جی کو محرم راز بنایا۔ انھوں نے کہا آپ کیوں اتنی پریشان ہیں۔ خدا کا دیا اتنا گہنا تو آپ کے پاس موجود ہے۔ خدانخواستہ سیٹھ اگر کچھ جیں پٹاخ کرے تین چار چیز الگ کر کے ـــ

"اور چھوکری کے لئے کیا باقی بچے گا۔ زیور بھی الگ کر دوں۔ واہ خانساماں جی بڑی اچھی صلاح دی آپ نے ـــ" نواب بیگم اب بے انتہا چڑ چڑی ہو گئی تھیں۔ بات بے بات عندلیب کو مارتی پیٹتی رہتیں۔ وہ ڈیڑھ سال کی جان سہم کر فلومینا کے گھیر دار فراک کے پیچھے چھپ جاتی۔

ایک روز صبح آندرے کو تار بھجوایا۔ اور پیکنگ میں جُٹ گئیں۔ کچھ سامان چپکے سے خانساماں جی کے ذریعے فروخت کروایا۔ صندوقچۂ زیورات آہنی ٹرنک میں مقفل کر کے اس پر نادِ علیؑ کا حصار کیا۔ خانساماں جی نے لوگوں سے کہا بائی جی بمبئی جا رہی ہیں اکثر اس طرح دُور نزدیک جایا کرتیں تھیں اور بہت ساز و سامان کے ساتھ جاتی تھیں کسی کو شک نہ ہوا۔

کرائے کی دو بند گاڑیاں منگوائیں ایک میں خانساماں جی مع اسباب دوسری میں نواب بیگم۔ فلومینا۔ عندلیب۔ مقابل کی سیٹ پر عندلیب کا فولڈنگ پریمبولیٹر اور نواب بیگم کی لال پٹاری۔

آٹھ سال کے سن میں مرحوم ماں باپ کے گھر سے نکل کر سبط احمد کے ہاں گئی تھیں

تو انکی گڑیوں اور کپڑوں سے بھری یہ سُرخ پٹاری ساتھ تھی۔ وہاں سے یہ شیخ عبدالباسط گوٹے والے کے گھر آئی۔ پھر اجمیر شریف۔ درگاہ سے راحت بائی کے چوبارے۔ اجمیر سے گجرابائی کے ہاں جے پور۔ بالآخر انکی ذاتی حویلی میں منتقل ہوئی۔ پچھلے دس سال سے وہ بحفاظت انکے ڈریسنگ روم کی الماری کے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ اب ایک اور جادہ پیمائی پر نکلی۔ قدیم عبرانیوں کے آرک — صندوق سکینہ — کی طرح —

ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ٹکٹ خریدے۔ پولس کے سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا سمجھیں سمّن لئے کر انکی تلاش میں آئے ہیں۔

وہ آگے نکل گئے۔ مگر یہ ہڑبڑا کر فوراً ایک زنانہ انٹر کلاس میں گھُس گئیں۔ قُلیوں کی مدد سے خانساماں نے بمشکل اسباب چڑھایا۔ وہ بے چارے پلیٹ فارم پر کھڑے آنسو بہایا کیے ٹرین چل دی۔

دلّی پر گاڑی بدلی۔ جنگ چھڑ چکی تھی۔ ساری ریلیں فوجیوں سے لدی ہوئی گذرہی تھیں اس بھیڑ بھڑکے میں فلومینا اور شیر خوار بچّی اور بے تحاشا سامان کے ساتھ کلکتے والی ٹرین میں زنانہ ڈبہ ڈھونڈتی پھریں۔ جب ایک مرغیوں کے ڈابے جیسے کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی اللہ کا شکر ادا کیا۔

دُھواں اُگلتی چھک چھک کرتی ٹرین روانہ ہوئی۔ ابتک آرام آسائش سے سفر کرنے کی عادی تھیں۔ بمشکل ایک کونے میں کھڑکی کے قریب ٹھُنس کر بیٹھیں۔ شور مچاتی مارواڑنوں کا دھاڑا شاید کمبھ میلے جارہا تھا۔ عندلیب کو گود میں سنبھالے فلومینا حفاظت کے خیال سے صندوقچۂ زیورات والے ٹرنک پر چڑھ بیٹھی۔ اور کونی میں AVE MARIA کا ورد شروع کیا۔ آدھی رات گذر گئی تب جا کر نواب بیگم کے حواس ٹھکانے ہوئے۔ ایک الاپ گنگنانا چاہا۔ اتنے دنوں سے گانے بجانے کا ہوش کہاں تھا۔ اب ایک بار پھر دھک سے رہ گئیں۔ آواز غائب۔ جو نکلی وہ بے سُری۔ ابتک انھوں نے فلومینا کے اس نظریے پر یقین کرنا نہ چاہا تھا کہ گجرابائی کی بیٹیوں نے پان میں سیندور کھلادیا ہے یا جادو کر دیا ہے۔ نزلہ کھانسی کی وجہ سے

گلا پڑ ہی جاتا ہے ۔ بہت کھانسیں کھنکاریں مگر جو آواز نکلی وہ بھدّی اور کرخت ۔
اب انھوں نے انتہائی لاچاری کے ساتھ چُپکے چُپکے زار و قطار رونا شروع کر دیا ۔
پھر سوچا کلکتے میں ایک سے ایک قابل ڈاکٹر موجود ہے ۔ آندرے علاج کروا دے گا ۔
روتے روتے آنکھ لگ گئی ۔

گاڑی ہوڑہ اسٹیشن پہنچی ۔ آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا ۔ بے شمار وردی پوش گورے فوجی ۔ آندرے ندارد ۔
علی علی کرتی پلیٹ فارم پر اتریں ۔ تین گھنٹے تک ٹرنک پر بیٹھ کر انتظار کیا ۔ فلومینا عندلیب کو بہلانے میں جُتی رہی ۔ آخر تھک ہار کر اٹھیں باہر جا کر گھوڑا گاڑی کی ۔ کوچبان سے کہا "چندر نگر چلو ۔"
وہ ہنس پڑا ۔" بہت دور ہے بیگم صاحب کل لاری سے چلی جائیے گا ۔ ہوٹل چلی چلیے ۔"
کلکتے سے ناواقف تھیں ۔ ایک دفعہ ہفتہ بھر کے لیے آئی تھیں ۔ اور یہاں صرف گوہر جان کو جانتی تھیں ۔ ان سے بھی ایک دو بار ہی ملاقات ہوئی تھی ۔
لیکن اب وہ مادام ریناں کی حیثیت سے شریفانہ زندگی کا آغاز کرنے جا رہی تھیں گوہر جان کے ہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ گاڑی بان نے برقعہ پوش کے قیمتی اسباب ولایتی فراک میں ملبوس گوری چٹی بچی اور کرسچین آیا پر نظر ڈال کر دریافت کیا ۔" کہاں ۔ گرینڈ ہوٹل ؟" گرینڈ کے متعلق سُن چکی تھیں بہت مہنگا ولایتی ہوٹل ہے ۔" کسی دیسی ہوٹل پر لے چلو ۔" فرض کیجیے تین چار دن تک آندرے کا پتہ نہ چلا ——— ممکن ہے وہ کلکتہ سے باہر ہو ——— اتنے عرصے میں گرینڈ و رینڈ میں تو کھال ادھڑ جائے گی ۔

کوچبان نے انکو ئیر چیت پور روڈ کے ایک معمولی ہوٹل پر جا اتارا ۔
دوسرے روز علی الصبح پتے پوچھتی پوچھتی ٹرام کے ذریعے پھر ہوڑہ پہنچیں ۔ وہاں چندر نگر کے لئے "موٹر بس" پکڑی ۔

شہر کے بازار میں داخل ہوتے ہی "ژاک کوربیں۔ فوٹوگرافر" کا اسٹوڈیو ۔ اندر گئیں۔

بوڑھا فرانسیسی میز کے پیچھے بیٹھا چند ہفتے پرانا ایک فرنچ روزنامہ پڑھنے میں محو تھا۔ آہٹ پر سر اٹھایا۔ فوراً تعظیماً کھڑا ہوا۔ نواب بیگم نے سوال کیا ـــ "آندرے صاحب؟ کدھر ہے؟ آئی ایم وائف۔"

"وائف ـــ؟" موسیو کوربیں نے تعجب سے دہرایا۔

"آئی ایم انڈیا ـــ وائف ۔ انڈیا ـــ انڈین وائف ـــ"

"پلیز ـــ؟"

"نو ـــ نو ـــ انڈین وائف ۔ مسٹر آندرے ـــ"

"او ـــ مادر دیو ـــ" فرانسیسی نے سر تھام لیا۔ "کم میر سبت داؤن بائی دیر ـــ"

وہ ایک اسٹول پر ٹک گئیں۔ پرس میں سے نکال کر پاسنگ شو جلایا۔ بوڑھا تاڑ گیا۔ یہ وہی ناچ گرل تھی جس کا آندرے نے وہ شاندار پورٹریٹ بنایا تھا۔ بدمعاش اس بے چاری کو کیسا چُل دیا۔ افسوس۔ بنگالی اسسٹنٹ کو آواز دی "کیفے۔"

"وی۔ موسیو۔" بنگالی نوجوان ڈارک روم سے نمودار ہوا ـــ چند منٹ بعد سیاہ فرانسیسی کافی بنا کر لایا۔ موسیو کوربیں اٹھا۔ ایک الماری سے برانڈی آف نپولین نکالی۔ فرنچ دستور کے مطابق سیاہ کافی میں تھوڑی سی کونی ایک ملائی۔ پیالی نووارد عورت کو پیش کی۔

نواب بیگم کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ لرزاں ہاتھوں سے پیالی اٹھائی۔ ایک گھونٹ بھرا۔ جھجکتے ہوئے چند الفاظ میں سارا واقعہ بتایا۔ بنگالی اسسٹنٹ فرنچ میں موسیو کو بتاتا گیا۔

بڈھے نے تاسف سے سر ہلایا۔ "وہ لڑکا ـــ وہ شریر بدمعاش لڑکا ـــ یہاں سے جا چکا ہے شیری۔ تم کو معلوم ہے یورپ میں لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اعلان جنگ ہوتے ہی وہ بلجیم روانہ ہو گیا۔ وہ فوجی فوٹوگرافر کی حیثیت سے محاذ پر جانا چاہتا تھا۔ اس وقت فرانس کی کسی خندق میں بیٹھا ہوگا۔ یا شاید اب تک مارا جا چکا ہو ـــ مادر دیو ـــ" بڈھے نے صلیب کا نشان بنایا۔ بنگالی اسسٹنٹ نے ترجمانی کی۔

"میں نے ــــ میں نے اسے چالیس ہزار کا بنک ڈرافٹ ــــ" نواب بیگم کی آواز ڈوب گئی۔ آنکھوں کے سامنے نرمرے ناچنے لگے۔

"مون دیو ــــ" بڈھا انگشت بدنداں رہ گیا۔" اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک زبردست رقم کلکتہ ریس کورس پر جیتی ہے ــــ ژاک پوت ــــ یُو نو ــــ ژاک پوت ــــ"

"جیک پوٹ"۔ بنگالی نوجوان نے نواب بیگم کو سمجھایا۔

موسیو کوترییں کہتا رہا" وہ ریس کا عادی تھا۔ اسی مارے ہمیشہ پریشان حال رہتا تھا۔ وہ بڑا چالاک لڑکا تھا۔ تمہارے بھیجے ہوئے ڈرافٹ کے لئے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ پھر وہ رقم بھی ریس میں ہار گیا۔ یکمشت۔ کیونکہ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے وہ ساری پُونجی "ڈائمنڈ کوین" پر گنوا دی ہے۔ ڈائمنڈ پر خیال آتا ہے۔ اسے ایک جوڑی ڈائمنڈ BANGLES بھی شاید تم ہی نے دیے ہوں گے۔ انہیں بھی کھا پی کر برابر کیا ــــ خدا اسے معاف کرے میری بچی۔ اس نے تمہیں بہت بڑی دغا دی"۔

آٹھ سالہ نواب فاطمہ کو اس کے ولی مرزا اسبط احمد بھیانک دھوکہ دے چکے تھے۔ مگر اب چھتیس ۳۶ سال کی عمر میں اس نے خود فریب کھایا محض ایک محفوظ باعزت مستقبل کی موہوم امید پر۔ دوسرا سگریٹ۔ اضطرابی کیفیت پر قابو پانے کے لئے زور زور سے کش لیے۔ ژاک کوترییں کے سفید سر کے عین اوپر ایک طاق میں کنواری مریم استادہ تھیں۔ تاج پہنے۔ ہاتھ جوڑے۔ سر جھکائے افسردگی سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ دیواروں پر بھانت بھانت کی تصاویر آویزاں تھیں فرینچ کولونیل افسر۔ نارنگی کے شگوفے سنبھالے سفید باریک ویل اوڑھے فرانسیسی دلہنیں۔ کلکتے کے ہوٹلوں میں کیبرے ناچنے والی "ہاف کاسٹ"، یوریشین قاصائیں۔ فرسٹ کمیونین کے لئے "دولہا" اور "دلہن" بنے ننھے فرانسیسی بچے اور "ہمارا لارڈ" جن کے دلوں میں اترنے والا تھا۔

نواب بیگم نے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھایا تب انکی نظر ہاتھی دانت کے اس کیمیو پر گئی ایک الماری میں مہارانی کوچ بہار اور ایک اینگلو برمن حسینہ کی تصاویر کے درمیان نمایاں طور پر سجا ہوا تھا۔

"کمبخت اسے بھی چھوڑ گیا۔ لعنت —" بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
بوڑھے ژاک نے ندامت سے سر جھکا لیا گویا آنندے کے کمینے پن کا خود ذمے دار تھا
"بعض نوجوان بہت ہی نامعقول ثابت ہوتے ہیں۔ کاش وہ ایسا نہ کرتا۔"

نواب فاطمہ پیدائشی پلک متنی تھیں اور محکمہ قضا و قدر نے افراطِ گریہ کیلئے انواع
اقسام کے مواقع انھیں ہمیشہ فراہم کیے۔ اب پرس میں سے ننھی عندلیب کی تصویر نکالے
ہوئے آنسوؤں کی جھڑی — "میری بچی اور آپا کلکتے کے ایک سٹریل سے ہوٹل میں
اکیلی پڑی ہیں۔ میرا سارا قیمتی اثاثہ بھی وہیں رکھا ہے۔ خدا کے بھروسے پر۔"
"اب تم کیا کروگی؟ تم تو جیسا تم نے بتایا جے پور میں اپنی کشتیاں جلا آئیں"
"اب میں وہی کروں گی —" نواب بائی نے قہوہ ختم کر کے اٹھتے ہوئے بکلخت بڑی
مضبوط آواز میں جواب دیا —"جو جے پور میں کرتی تھی۔ اور عندلیب کے بڑے ہونے
انتظار کروں گی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"
"اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ میرا ٹیلی فون نمبر لکھ لو۔ خدا
تمہارے ساتھ ہو۔"
بوڑھے فرانسیسی نے نواب بیگم کو دوکان کے برآمدے تک پہنچایا۔ اچانک اسے
یاد آیا۔ دوڑا ہوا اندر گیا۔ وہ کمبولا کر نواب بیگم کو پیش کیا — "یہ تمہاری چیز ہے۔ لے جاؤ۔

MAKHZANEULFAT MALKA
DEWAN 1886 MALKAJAN
Pr. BIBI MALKAJAN OF BENARES NOW AT CALCUTTA.

مس گوہر جان
انڈین شیکسپیر کے
بے مثال ناٹک
سلور کنگ
عرف نیک پروین میں
میڈن تھیٹرز لمیٹڈ
کلکتہ

(۱۷)

ماہ و سالِ عندلیب

عندلیب بانو بیگم بنت موسیو آندرے جوزف ریناں۔ باشندہ شہر برسلز۔ صحیح پتہ نامعلوم۔ غالباً معرفت فرنچ فورن لیجین۔ الجیریا۔ شمالی افریقہ

"بیٹا منصور۔ اگر تم کسی سے یہ سوال کرو اس کے والد کہاں ہیں اور وہ جواب دے ٹمبکٹو! تو تم یقیناً سمجھو گے کہ وہ شخص مذاق کر رہا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں یہی جواب دیتی تھی۔ ساری برٹش ایمپائر میں لندن کے بعد سب سے زیادہ شاندار اور بارونق کرسمس سیزن کلکتہ کا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فلومینا اور مما کے ساتھ پارک اسٹریٹ میں بڑے دن کی چہل پہل دیکھتی پھر رہی تھی۔ ایک دوکان کے سامنے موسیو ژاک کورنغ میں مل گئے۔ مما کو پہچان کر ہیٹ اتاری سلام کیا۔ مما اس پہلے روز کے بعد نہ پھر کبھی ان سے ملی تھیں نہ فون کیا تھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ موسیو نے پوچھا آندرے کی کچھ خیر خبر معلوم ہے؟ مما نے نفی میں سر ہلایا۔ کہنے لگے "دس سال بعد اس نے پہلی بار کرسمس کارڈ بھیجا ہے۔ شاید فرنچ فورن لیجین جوائن کر لی ہے۔ کارڈ پر الجیریا کے ٹکٹ اور ٹمبکٹو کی مہر پڑی تھی۔" مجھ سے پوچھا "جانتی ہو۔ ٹمبکٹو کہاں ہے؟"

"اس وقت کوئی گیارہ سال کی رہی ہوں گی۔ لوریٹو کانونٹ میں اپنی کلاس کی ذہین ترین طالب علم سمجھی جاتی تھی۔ فوراً بتایا۔ مسکرا کر بولے "بس نہیں۔ صحرا کے وسط میں۔" پھر وائیٹ وے لیڈلا سے گڑیا اور چوکلیٹ خرید کر دی۔ اور اپنے راستے چلے گئے۔ مما نے پولس کے چند سپاہیوں کو آتے دیکھ کر فوراً چہرے پر نقاب ڈال لی۔

اِس ہم لوگ کلکتہ میں عجیب بے تکی اندوہناک زندگی گذار رہے تھے۔ مما جس روز سے کلکتہ پہنچی تھیں ان کو مستقل یہ دھڑکا تھا کہ ان کے نام وارنٹ گرفتاری آتا ہوگا۔ نوّے ہزار اصل مع سود در سود کی دہشت نے ان کا خون خشک کر رکھا تھا۔ بال قبل از وقت سفید ہو چلے۔ رنگ روپ کمہلا گیا۔ آواز تو پہلے ہی غائب ہو چکی تھی پھر بھی ان جیسی نامی گرامی مطربہ کا کلکتہ میں گمنام اور روپوش رہنا ناممکن تھا۔ چندرنگر سے جب لوٹ کر آئیں اس کے دوسرے روز یہ المناک قافلہ گوہر جان کے گھر پہنچا۔

" انٹ گوہر ایک لیجنڈری ہستی تھیں کروڑپتی اور بارسوخ۔ انھوں نے مما کے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے۔ زیور بنک میں رکھوایا۔ اب سوال یہ تھا کہ مما رہیں کہاں اور روزی روٹی کا وسیلہ کیا ہو۔ اعلیٰ درجے کی طوائفیں بہو بازار میں رہتی تھیں معمولی سوناگاچی، سینڈو رَیہ پٹی اور ناخدا مسجد کے علاقے میں اور جانے کہاں کہاں۔ آنٹ گوہر نے مما کو بتایا کہ یہ مسجد جہازیوں نے پہلے کبھی یہاں بنوائی تھی۔ ان کی وجہ سے اس علاقے میں طوائفیں بھی آباد ہو گئی تھیں۔ مما جو ایک زانی کی طرح اپنی حویلی میں رہ چکی تھیں۔ ریڈلایٹ ایریا کے تصوّر سے لرزیں۔ نہ وہ کبھی اس طرح بازار میں بیٹھی تھیں۔ لیکن پہلے کی طرح محض بطور کلاسیکل سنگر گذر بسر اب ناممکن تھی۔ آواز اگر باقی بھی ہوتی تو گانا بجانا شروع کرنے میں افشائے راز کا خطرہ تھا۔ خیر اب تو بانس ہی نہ رہا جو بانسری بجے انھوں نے روتے ہوئے آنٹ گوہر سے کہا۔ یہ سب باتیں جب میں بڑی ہوئی تو فلومینا مجھے بتایا کرتی تھی۔

"آنٹ گوہر نے ایک بڑھیا باعزت علاقے میں رپن اسٹریٹ پر ایک یہودی تاجر کے مکان کی دوسری منزل ان کو کرائے پر دلوادی۔ وہ اپنے عالی مرتبت ہندوستانی مربیّوں سے مما کا تعارف کرواسکتی تھیں مگر اس صورت میں بھی بھید کھُل جاتا۔ آنٹ گوہر کے پرستاروں میں دولت مند یوروپین، ایرانی، ارمنی،

ہودی بھی شامل ہے۔ ان میں سے چند ایک سے ملاقات کرادی بوقت ضرورت
بڑھے مریضوں کی نرس کمپینین بننے کے لیے تھوڑی سی نرسنگ اورانجکشن
لگانا بھی سیکھا۔ نہایت جزرسی سے گذر بسر کرنے لگیں۔ جب کبھی بگھی کی جھلملیاں
گرا کے رات کے وقت کہیں جاتیں تو فلومینا مجھ سے کہتی۔ اینڈی بابا۔ تمہارا مما
ڈاکٹر کے پاس گیا ہے۔

" بحثییت ایک کالی میم فلومینا کو اس بات پر بیحد ناز تھا کہ میں نصف یورپین
تھی۔ اس نے شروع سے میرا نام آندرے اور عندلیب کے وزن پر ولایتی نما
AND رکھ لیا تھا۔

"وہ بتلاتی تھی کہ مما جے پور میں بے انتہا فضول خرچ تھیں مگر میں نے جب
سے ہوش سنبھالا ان کو پائی پائی کا حساب جوڑتے دیکھا۔ دراصل روپئے پیسے کے
معاملے میں بچپن سے لے کر اب تک تابڑ توڑ اتنی زبردست چوٹیں کھانے کے بعد
ان کو دولت کا ہوکا ہو گیا تھا۔ اب ان کا واحد مقصد حیات یہ تھا کہ مجھے ایک
ہرفن رقاصہ بنا کر ان تمام نقصانات کی تلافی کریں جو اب تک ان کو سہنے پڑے۔

" ساڑھے چار سال کی عمر سے مجھے کتھک سکھلایا گیا۔ فلومینا کے ساتھ رکشا پر بیٹھ
کر ایک بنارسی گروجی کے گھر جاتی۔ اس وقت شہر کی سڑکوں پر سے گذرنا بہت
اچھا لگتا۔ رکشا والا گھنٹی بجاتا تیز تیز دوڑتا۔ برابر سے ٹن ٹن کرتی ٹرامیں گذرتیں اور
اونچی چھتوں والی موٹریں۔ رنگا رنگ ٹریفک۔ مڈل کلاس بنگالی عورتیں سڑکوں پر
۔۔ کم نظر آتیں اس وقت بنگالی ہندو عورتیں بھی بہت کم باہر نکلتی تھیں
پورشین لڑکیاں البتہ بہت دکھلائی دیتیں۔ کلکتہ ہندوستان کی یوریشین کمیونٹی
کا گویا ہیڈکوارٹر تھا۔ گوہر جان بھی میری طرح یوریشین تھیں۔

"پانچ سال کی عمر میں آنٹ گوہر کے اصرار پر ممانے یہودی مالک مکان کے
کے ذریعے مجھے لوریٹو کانونٹ میں داخل کروادیا۔ داخلے کے رجسٹر میں میرا نام اینڈی
رینال اور باپ کا "آندرے جوزف رینال حال مقیم برسلز" لکھوایا گیا۔ کوئی مشکوک
بات نہ تھی بہت سے اینگلو انڈین بچے اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ مجھے لوریٹو ہاؤس
بہت بھایا۔ ناچ سیکھنے میں دل نہ لگتا۔

"اب میں کتھک سکھلانے والے مہاراج کے ہاں بلبل تھی (عندلیب گروجی کو
مشکل لگتا تھا) اسکول میں اینڈی۔ ذرا بڑی ہوئی تو یہ دوغلا پن کھلنے لگا۔

"یہ شاید ۱۹۲۳ یا ۱۹۲۴ کا واقعہ ہے۔ جے پور سے نہ کوئی سمن آیا نہ وارنٹ۔
عجیب بات تھی۔ ممانے اسے معجزے پر محمول کیا تھا اب ان کی دہشت کچھ کم ہوگئی تھی۔
یکطرفہ کارروائی کے بعد مُرلی دھر کنوڑیا کب کا اس حویلی پر قابض ہو چکا ہوگا۔ یہ سوچ
کر انھوں نے صبر کرلیا تھا کہ کم از کم جگ ہنسائی سے بچیں۔ اب وہ بے پردہ باہر نکلنے
لگی تھیں۔

" اپنے ایک میمن مربی کے ساتھ بمبئی گئیں۔ میں بھی ساتھ تھی۔ فلومینا بھی۔ ایک
روز ہم چوپاٹی سے گذر رہے تھے وکٹوریہ گاڑی میں۔ سمندر کے کنارے بڑا مجمع نظر آیا۔
گاڑی والے نے کہا "بی اماں جنت کو سدھاریں۔ تعزیتی جلسہ ہے۔"
" بی اماں کا انتقال ہوگیا؟ ممانے دہرایا اور فوراً آنسو بہانے لگیں۔ اپنی نئی
کنجوسی کے باوجود وہ خلافت فنڈ میں بھی چندہ دے چکی تھیں۔ وکٹوریہ رکوائی میں
اوپر کوچ بکس پر جا بیٹھی۔ سب صاف نظر آرہا تھا۔ کوچوان نے بتایا۔ اسٹیج پر وہ
گاندھی جی بیٹھے ہیں۔ انھوں نے بی اماں کے جنازے کو کندھا بھی دیا تھا۔ یہ ... ر
نے۔ وہ سی۔ آر۔ داس ہیں۔ ادھر موتی لعل نہرو ہیں۔ سروجنی نائیڈو تقریر کر رہی ہیں
میں نے ان سب پر حقارت کی نظر ڈالی۔ یہ سب لوگ، میں نے کوچوان سے کہا،

ہمارے دشمن ہیں۔ اسکول میں ہندوستانی لیڈروں کے متعلق انگریز اور اینگلو انڈین لڑکیاں یہی کہتی تھیں کو جوان نے چونک کر میرے سنہرے بالوں کو نوٹس کیا اور خاموش ہو گیا۔

"اس کے دو تین برس بعد کا ایک قصہ سناؤں۔

"اچھا اب باقی پھر —

"ایک ڈچ یہودی تاجر کو مما کے ایک شناسا کے ذریعے اطلاع ملی کہ وہ کام چلاؤ نرسنگ سے بھی واقف ہیں۔ وہ بوڑھا آدمی ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے دورے پر نکل رہا تھا اور دل کا مریض تھا۔ اس نے مما سے معلوم کروایا۔ بطور نرس کمپینین ساتھ جانے کے لئے فوراً تیار ہو گئیں۔ چنانچہ ہم لوگ سیاحت پر نکلے۔ مما۔ فلومینا۔ میں اور وہ ڈچ مین۔

"پہلے مدراس گئے۔ وہاں سے کولمبو۔ رنگون۔ سنگاپور۔ اس دورے میں میں نے برٹش ایمپائر کے رومانس کا نظارہ کیا۔ لائیڈز آف لندن اور طامس کک کے دفتر۔ پی۔ اینڈ۔ او۔ کے جہاز۔ کولونیل کلب۔ بنگلے۔ پلانٹرز کی گارڈن پارٹیاں۔ "یورو پینز اونلی" کلبوں میں مما اور فلومینا نہیں جا سکتی تھیں۔ میں بحیثیت یوریشین مزے سے اس ڈچ مین کے ساتھ چلی جاتی۔ اور وہاں بیٹھ کر خوب آئس کریم کھاتی۔ میں چاہتی تھی لوگ مجھے ایک نیٹو ناچ گرل کی اولاد کے بجائے یورپین لڑکی سمجھیں۔ مما کی اور میری ذہنی دنیاؤں میں کتنا فرق تھا اس کا اندازہ مجھے رنگون جا کر ہوا۔"

اچانک عندلیب بانو الاپنے لگیں —" میرے پیا گئے رنگون — وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون —" منصور نے ایک بار پھر اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ لیکن پچھلے تین روز سے انھوں نے نواب بائی کی داستان مختصراً اس کو سنانا شروع کی تھی اور اور اب مسز بیگ اور ان کے غیر متوقع پُر فلمی گیت اب اس کی سمجھ میں کچھ کچھ آتے

لگے تھے۔ ماضی جادو کی طرح سر چڑھ کر بولتا ہے۔

عندلیب بانو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر ہنس پڑیں "یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میرا اسکاٹش بوائے فرینڈ ۱۹۴۲ میں برما فرنٹ پر گیا رنگون سے اس کا ٹیلی فون کبھی نہ آیا ۔۔ خیر۔ تو میں کہاں تک پہنچی تھی ؟"

"۱۹۲۶ ۔ آپ رنگون گئیں۔"

"ہاں۔ کولمبو سے رنگون۔

"مما کہنے لگیں۔ میں جہاں پناہ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جاؤں گی۔ میں نے پوچھا کون جہاں پناہ ؟ زور سے چلائیں: حضرت بہادر شاہ اور کون۔

"ایک روز اس معمولی سے چوبی دو منزلہ مکان کی زیارت کے لیے پہنچیں جہاں بادشاہ کو نظر بند رکھا گیا تھا۔ بولیں ہائے ہائے بڈھا کو دس روپئے روز خرچ کے لیے دیتے تھے حرامزادے۔ لعنت۔ میں سمجھ گئی انگریزوں کو گالیاں دے رہی ہیں۔ مجھے بہت برا لگا۔ میں نے منہ پھلا لیا۔ میں اسکول میں ہسٹری پڑھ رہی تھی اور 'SEPOY MUTINY'، 'بلیک ہول' وغیرہ سب ازبر تھا۔

"مگر مما کی ہسٹری دوسری تھی۔ وہ ان کے دل پر ان کے خون دل سے لکھی گئی تھی۔ اس وقت میں نہ مما کو سمجھ سکی نہ ان کے آنسوؤں کی قیمت پہچان پائی۔ رونا تو ان کی عادت ہی تھی۔ اور لعنت تکیہ کلام۔

"پھر ہم بادشاہ کے مزار پر گئے۔ وہاں ان کے پڑپوتے شہزادہ سکندر بخت نہایت خستہ حال، مجاور بنے بیٹھے تھے۔ ایک آدمی نذر نیاز کی روٹیاں لایا۔ وہ نوش کرنے میں مشغول ہو گئے۔ مما نے بچشم پرنم ان کو "صاحبِ عالم" کہہ کر مخاطب کیا اور نذر پیش کی۔ مجھے بیساختہ ہنسی آگئی۔

"تب مما نے پلٹ کر ایک زور دار تھپڑ مجھے رسید کیا۔ میں بھونچکی رہ گئی۔ مما

زدوکوب تو ہمیشہ کرتی رہتی تھیں مگر اتنی طاقت اور جوش سے کبھی نہ مارا تھا۔

"میں بھنّا کر ٹہلتی ہوئی جا کے ایک جنگلے سے ٹیک گئی۔ فلومنیا منہ اٹھائے بیر کا درخت ملاحظہ کر رہی تھی۔ جو بیکسی کے مزار کے سرہانے کھڑا تھا۔

"یہ جنّت کا درخت ہے۔ مزار پر اگر بتیاں سلگاتے ہوئے ایک برمی مسلمان نے فلومنیا کو مخاطب کیا۔

"ایسا؟ اس نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ بڑی انگریز پرست عورت تھی مگر اس وقت وہ بھی متاثر نظر آ رہی تھی۔

"مما نے مزار کے تعویذ پر دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں ٹکا کر فاتحہ اور دعائیں پڑھیں۔ فلومنیا نے بھی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ مما نے بیری کے چند پتّے قبر پر سے چن کر تبرکاً اپنے پرس میں رکھ لیے۔ اپنے بوریہ نشین "صاحبِ عالم" کے سامنے کورنش بجالا کر رخصت ہوئیں۔ واپسی میں راستے بھر ظفر کی المناک غزلیں اپنی بے سُری آواز میں گنگناتی گئیں۔ وہ میری ولادت کے کچھ عرصے بعد ہی جے پور میں اپنی آواز کھو چکی تھیں۔ شاید راحت بائی کی لڑکیوں نے پان میں سیندور کھلا دیا تھا۔ یا کیا۔ کلکتہ پہنچ کر ایک روز شدید ڈپریشن کے عالم میں اپنے فونوگراف ریکارڈ چکنا چُور کر دیے تھے۔ دوکانوں پر شاید ان کے ریکارڈ ملتے تھے لیکن فلومنیا کو حکم دے رکھا تھا۔ خبردار جو میرا کوئی توا خرید کر اس گھر میں لائی۔ لہٰذا مجھے ان کی سابقہ شان و شوکت کے افسانوں کی طرح یہ بھی یقین نہ آتا تھا کہ وہ ایک ماہرِ فن گائیکہ رہ چکی تھیں۔ دراصل مما کسی گریک ٹریجڈی کا سا کردار تھیں مگر مجھے اس کا احساس ہی نہ تھا۔

"چنانچہ سرمہ در گلو نواب بیگم ظفر کے اشعار گنگناتی رہیں اور میں ان کے غیر متوقع تھپیڑ کے غم و غصّے سے تلملا یا کی۔

"میرے اور مما کے درمیان زبردست ٹینشن کا آغاز چند روز قبل کلکتہ ہی میں ہو چکا تھا۔ میں چودھویں سال میں پڑ رہی تھی۔ اور مصائب کی وجہ سے بچّی نچروٹ ہو چکی تھی،

" ٹین ایجرز کی فطری بغاوت کے علاوہ یہ عقل بھی آ گئی تھی کہ مما مجھے کس قسم کی ٹریننگ دے رہی ہیں۔ اس زمانے میں شریف زادیاں ناچ نہیں سکتی تھیں یہ محض ارباب نشاط اور کلکتہ میں یوریشین طوائفوں کا فن سمجھا جاتا تھا۔ آنٹ گوہر کے منع کرنے کے باوجود مما نے مجھے ایک خاموش فلم کے گروپ ڈانس میں بھرتی کروا دیا کیونکہ اس کے پیسے اچھے مل رہے تھے یہ اطلاع کہ ایک دیسی فلم میں ناچ رہی ہوں کانونٹ کی مدر سپیریر کو مل گئی انھوں نے مما سے جواب طلب کیا۔ مما نے فوراً اسکول سے میرا نام کٹوا دیا۔ میں اپنے جونیر کیمبرج کے امتحان کی تیاری میں بے طرح مشغول تھی۔ ایک روز حسب معمول یونیفارم پہن، بستہ سنبھال اسکول جانے کے لیے زینے سے نیچے اتری رکشا والا اندار د۔ اس وقت مما دروازہ پر آئیں اور آواز دی۔ بس بیوی آج سے تمہارا اسکول القط۔ اب اپنی اوقات پر آؤ۔

" میرا خون خشک ہو گیا۔ ان کا منہ تکنے لگی۔ سرد آواز میں بولیں۔ اپنے توڑے پخنہ کرو ماشا اللہ پہلے مجرے کی سائی آ گئی ہے۔

" میرے اوپر بجلی سی گری۔ والدہ کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ کشادہ چوبی زینے کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے مجھے گھور رہی تھیں ان کے پیچھے لینڈنگ پر یہودی لینڈ لارڈ کا گرینڈ فادر کلاک کالے بھوت کی طرح دانت نکوسے کھڑا تھا۔ دروازے میں فلومینا کا پریشان چہرہ نظر آیا۔ نیچے جو دروازہ تھا وہ لور بیٹو کی سمت جانے والے راستے پر کھلا ہوا تھا۔ اوپر نواب بائی نائیکہ مسلط تھی۔ اس کے عقب میں میری ہمدرد مگر بے بس فلومینا۔ میں زینے کے وسط میں دو دنیاؤں کے درمیان معلق۔ بستہ پھینک کر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مما دھم دھم کرتی اتریں باہنہ پکڑ کر کھینچا۔ چل اوپر سیدھی طرح حرامزادی ورنہ ساری مس صاحبی نکال دوں گی۔ ایک تھپڑ۔ میں وہیں مچل گئی۔ فلومینا۔ فلومینا۔ میں نے چیخ چیخ کر ماں کی گرفت سے آزاد ہونا چاہا۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی اوپر لے گئیں کمرے میں مقفل کر دیا۔ فلومینا کی خوشامد پر رات گئے

تالہ کھولا۔ اس سے بعد ہی مما نے سنگاپور وغیرہ کے دورے پر نکلنا طے کیا تاکہ میرا جی بہل جائے۔ مما کے بجائے محبت کی تتلی فلومینا کو زیادہ چاہتی تھی اب اپنی ماں سے باقاعدہ نفرت سی کرنے لگی۔

" میرے اور مما کے درمیان یہ سرد جنگ ایک رات عروج پر پہنچ گئی سنگاپور میں ــــ"

"جہاں آپ نے پیتیوں کے سرخ دروازوں والے گھر دیکھے تھے"
" ہاں۔ اے بیٹا تمہیں کیسے معلوم ؟"
" اس شام آپ کھڑکی میں سے عنبر کو بتلا رہی تھیں جب میں اپنے آلات لینے واپس آپہنچا تھا۔"
" رائیٹ۔ تو سنگاپور میں مشہور انگریزی ہوٹل رَیفلز میں ٹھیرے جس میں سمرسٹ ماہم نے اپنے ناول لکھے تھے۔ وہ ہوٹل انٹرنیشنل طوائفوں کا اڈا بھی تھا۔ مشرق ومغرب کی حسین ترین چھوکریاں وہاں منڈلاتی نظر آتی تھیں۔"
" اُسی دور کے شنگھائی اور ہانگ کانگ کی طرح۔"
" ہاں۔ سُنو تو۔ رات کو مما ڈائیننگ ہال سے لوٹیں۔ اب تک وہ کام چلاؤ انگریزی بولنے لگی تھیں۔ میرے اور فلومینا کے کمرے میں توبہ تلّا کرتی داخل ہوئیں۔ توبہ توبہ لعنت۔

THIS HOTEL FULL OF LOOSE WOMAN

I DON'T LIKE LOOSE WOMAN

".میں نے پلٹ کر تلخی سے سوال کیا ــــ

AND WHO DO YOU THINK YOU ARE ?

" مما کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ نجانے کیوں مجھے مارنے پیٹنے کے بجائے چُپ رہیں فلومینا نے ان کا کوٹ اٹھا کر وارڈروب میں ٹانگا۔ پلٹ کر ایک لمحے کے لیے ساکت رہی پھر بلی کی طرح دبے پاؤں چلتی میرے قریب آئی اور میرے گال پر ایک زوردار طمانچہ رسید

کیا۔ میری قوت گویائی سلب ہو گئی۔ فلومینا نے مجھے بے انتہا لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اور مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔

" اب اس نے کمرے میں گشت کرتے ہوئے آتش بار آواز میں کہنا شروع کیا۔ "لک ہیر۔ مس سپیریر۔ تم اپنی اینجل مدر کو کیا بولا؟ پھر سے بولو۔ تم اپنی ماما سے ماپھی مانگو۔ سوری بولو۔ سوری بولو۔ تمہارا مدر تمہارے واسطے کیا کیا مصیبت اٹھایا۔ کیسا ٹربل دیکھا۔ تم اس کو LOOSE WOMAN بولتا؟ تم کو مالوم تم کو BEST اسکول میں بھیجنے واسطے تم کو LUXURY میں رکھنے واسطے وہ جبر جستی ایسا لائف LEAD کرنا۔

" میری پیدائش سے پہلے کون سی لائف لیڈ کر رہی تھیں؟ میں نے پھر کر سوال کیا۔ " شٹ اپ یو ناٹی گرل ۔ وہ جو کچھ کیا مجبوری کیا۔ ہم تم کو کتنے باران کا اسٹوری بتایا۔ اینڈ یہ تمہاری FATE میں لکھیلا تھا کہ تم ان کے ہاں جنم لو ۔ ہم بے عقل جانور لوگ ہے۔ ہمارے کو مالوم اپچ نہیں ہمارا HEAVENLY FATHER ہمارے لیے کیا سوچتا۔ کیا کرتا۔ اچانک وہ آنسو بہانے لگی ۔ بڑا بڑا بات نہیں کرنا مانگتا میرا بچہ۔ جب ہم بنیڈرہ برس کے ORPHANGE سے شادی بنا کر اپنا الفریڈو کے سنگ جے پور گیا تھا الفریڈو مہاراجہ کا ہیڈ کک تھا۔ ہم بھی بڑی شان مارتا تھا۔ اپنے کو پورچگیز میم صاحب بولتا تھا۔ اپنے کو پورچگیز میم صاحب بولتا تھا۔ ہمارا گریٹ گرینڈ فادر بھی پورچگیز وائٹ مین تھا۔ BUT? THEN? میرا الفریڈو جوان مر گیا۔ میرا دونوں بے بی مر گیا میرے کو آیا گیری کرنا پڑا۔ پھر؟ THEN ؟۔
" بڑا بول کبھی نہیں بولنا مانگتا۔ اینڈ ہی بابا ۔ گوڈ کو بھی سوری بولو ۔ ماما کو بھی سوری بولو ۔

" مجھے آج تک فلومینا ڈی کوسٹا کی یہ تقریر لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ مگر میں گوڈ سے بغاوت شروع کر چکی تھی چاروں طرف اتنی بے انصافیاں اور مظالم دیکھنے کے بعد ایک

شفیق و کریم، منصف، عادل، خبیر و بصیر قادرِ مطلق کا وجود سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج تک نہیں آیا۔

"بیگم صاحب۔ کھانا لگ گیا۔" بہادر نے دروازے میں جھانک کر آواز دی۔
"آؤ ۔" عندلیب بانو کی شربتی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے تھے۔
"عنبر کا انتظار تھوڑا اور کرلیں۔؟"
"اس نے فون کیا تھا شام تک آئے گی۔ سیزیرین کیس ہے۔ چلو تم کو یہ قصّہ سنا کر آج ختم کروں۔ اس وقت فلومینا یاد آگئی۔ اپنی رقیق القلب ماں کے ردِ عمل کے طور پر خاصی غیر جذباتی خاتون ہوں مگر اس وقت جی بھر آیا۔"

لنچ کے دوران عندلیب بانو نے کہانی جاری رکھی: "رنگون میں مزارِ ظفر پر جانے کا قصّہ سنایا تھا نا؛ اس طرح کا ایک دردناک واقعہ کلکتہ میں پیش آیا۔
"ہم لوگوں کو —— لو یہ گومتی کی مچھلی نوش کرو۔ بڑی خوش نصیبی کی علامت ہے۔"
"اسی کا نوشاہانِ اودھ نے اپنا طغرا بنایا تھا۔ آپ بھی تو لیجئے۔"
"تاکہ خوش نصیب ہو جاؤں۔ ؟ ہاہاہا۔ ہاں تو ہم لوگوں کو سنگاپور وغیرہ سے لوٹے چند روز ہوئے تھے کہ دلّی سے مہرو خالہ مع شمّو خالہ اور نواسی چھنّو آپہنچیں۔"
"ٹھیر جایئے۔ میں ذرا ورک آؤٹ کرلوں۔ مہرو خالہ اس روز آپ نے بتایا تھا۔ دلنواز عرف حجّن بی کی بہن۔ مگر شمّو یاد نہیں رہیں اور چھنّو ——"
"ان کی لڑکی اور نواسی اور بیٹیا شدّو۔"
"آپ نے یہ داستان مجھے بالکل شارٹ ہینڈ میں سنائی ہے۔"
"اے تو بٹیا کیا میں بوستانِ خیال گوش گذار کر رہی ہوں اور جتنا مجھے مّما اور فلومینا نے بتایا وہی دہرا رہی ہوں۔ تفصیلات مجھے بھی نہیں معلوم۔ اپنی تو تم کو ہیر قطیر سنا رہی ہوں —— ہاں تو یہ دلّی والیاں آئی تھیں۔ عالی جاہ نواب بہادر مرشد آباد

کے ہاں ایک جلسے میں گانے۔ گانا تو محض چھنو کو تھا۔ ماں نانی اور ماموں ہمراہ آئے تھے۔ مما مہرو خالہ اور شمّو خالہ کو کبھی کبھار خط لکھتی رہتی تھیں۔ وہ لوگ کلکتہ پہنچتے ہی دوسرے روز ملنے آئیں۔ مہرو خالہ آن بان والی نورہ بیٹی بیوی تھیں۔ بتاتی تھیں غدر کے وقت چھ برس کی بچّی تھیں۔ اب پچھتر سال کی رہی ہوں گی۔ مگر مضبوط کاٹھی کی کھری مغل زادی۔ کڑی کمان کے تیر جیسی چال۔ عمر سے دس سال کم لگتیں۔ اُودی مخمل کا تنگ پائجامہ۔ فلالین کی قمیص۔ کشمیری شال۔ ناک میں ہیرے کی بڑی سی لونگ۔ مما کی طرح بارعب شخصیت۔ شمّو جانے کس چیز قنات کی اولاد تھی۔ اس میں عامیانہ پن تھا چھنو جان تیز طرار۔ بڑی شکل۔ دیکھو تیسری پیڑھی تک پہنچ کر وہ —— مرزا عثمان بیگ غائب ہوگئے۔

"عالی جاہ کے جلسے کے بعد ایک روز آئیں مہرو خالہ تو کہنے لگیں۔ جلسے میں حضرت جانِ عالم کے ایک پوتے سے معلوم ہوا کہ حضرت بہادر شاہ کے ایک یتیم ولیسر پڑپوتے شہزادہ بیدار بخت برما سے آگئے ہیں۔ دُکھیا کو رنگون میں آٹھ روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی۔ اپنے نانا کے ساتھ مٹیا برج کے ایک بوسیدہ کمرے میں مقیم ہیں۔ وہ حضرت جانِ عالم کے پوتے بتلا رہے تھے کہ صاحب عالم کے والدین کی جوانمرگی کے بعد گورنمنٹ نے ان کا مکان ضبط کر لیا۔ ایک ڈبہ تھا اس میں بڑی بڑی کنجیاں تھیں۔ مغل دفینوں کی —— کنجیاں حضرت بہادر شاہ ساتھ لے گئے تھے۔ دفینے یہیں رہ گئے۔ برما کے انگریز حکام نے وہ کنجیاں بھی چھین لیں۔ حضرت بادشاہ سلامت کا کلام، کتابیں ہر چیز برباد کی۔ دس ماہ کے نواسے کو لے کر ان کے نانا یہاں آگئے تھے۔ کلکتے میں گورنمنٹ نے ان کی پنشن سولہ روپئے مہینہ مقرر کی۔ ہئے غضب۔ مہرو خالہ نے کہا۔ ارے چنگیز کی اولاد کہلاتے ہم تھے۔ چنگیز ہلاکو کی ذریت تو یہ ہیں حرام الدہر فرنگی۔

"مما بولیں۔ جناب عباسؑ کا عَلم ٹوٹے۔ ان پیارے بیٹوں پر۔ اے مہرو خالہ

ہیں تو جب بھی لاٹ صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گذرتی ہوں یہی دعا مانگتی ہوں۔" میں ان دونوں کے اس مکالمے پر زیرلب مسکرائی۔

"خیر تو دوسرے روز ہم لوگ دو گاڑیوں پر لد کر مٹیا برج پہنچے۔ مہر و خالہ جیسی خسیس خاتون خورد سال شہزادہ بیدار بخت کو چند اشرفیاں نذر کرنے لے گئی تھیں میں اور چھنو، مما، شموّ خالہ اور مہر و خالہ کے مقابل کی سیٹ پر بیٹھے۔ کوچ بکس پر مہر و خالہ کا معمّر بیٹا شدّو خاں جواب چاوڑی کا چودہری تھا۔ دھاڑیوں کا سردار چودہری فتّے کا جانشین۔

چنانچہ بیدخل مغلوں کا یہ قافلہ اپنے بیدخل بادشاہ کی بیدخل اولاد کی خدمت میں حاضری دینے جا رہا تھا۔ مہر و خالہ غدر کے قصے سناتی رہیں۔ سرائے طغل بیگ میں ان کے خاندان کا قتل۔ جمنا کی ریتی اور کوتوالی کے چبوترے پر ہزاروں مسلمانوں کو پھانسی۔ یا گولیوں کی باڑھ یا توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا جاتا۔ بادشاہ ملکہ اور شہزادہ جواں بخت کی رنگون جلاوطنی۔

"پھر مہر و خالہ بولیں۔ عالی جاہ کے ہاں کل وہ اودھ کے شہزادے بتلا رہے تھے کہ جب حضرت سلطانِ عالم نے موتیوں سے بھرا ہوا تھال نذر کرنا چاہا — ان بدمعاش انگریزوں نے وہ بھی قبول نہ کرنے دیا۔

"یہ دُکھیا بچہ شہزادہ بیدار بخت شہزادہ جواں بخت کا پوتا ہے۔ ہائے کس مصیبت میں پڑا ہے بے چارہ۔ لعنت۔ لعنت — مما نے دہرایا۔

" میں ان دونوں کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ یہ لوگ سب مغل ایمپائر کے مجاور تھے، ادھر مٹیا برج والے کنگڈم آف اودھ کے روّنے اور مرثیہ خواں۔ ٹالی گنج میں ٹیپو سلطان کی اولاد سلطنت خداداد میسور کی نوحہ گر۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر مرشد آباد والے اپنی عظمت رفتہ پر آہیں بھر رہے تھے۔ اس گھوڑا گاڑی میں مما اور مہرو خالہ آبدیدہ شموّ خالہ مغموم۔ لیکن چھنو گویا مس ۱۹۲۶ء بے پرواہ۔

" ہم لوگ شہزادے کے نانا ایک مفلس لکھنوی وثیقہ دار پیارے مرزا کے جائے قیام پر پہنچے۔ شموّ خالہ کے بڑے بھائی شندّو خان کوچ بکس سے اتر کر دروازے پر ... ایک اور بوڑھا باہر نکلا۔ انھوں نے اس سے کچھ کہا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ لاٹھی ٹیکتے واپس آئے۔ گاڑی کی کھڑکی کے نزدیک پہنچ کر شموّ سے سرگوشی کی۔ کوچبان کی مدد سے کوچ بکس پر چڑھے۔

" گاڑی واپس مڑی۔ سب خاموش۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہاں سے کیوں لوٹ آئے۔ یا نانا نواسے نے ملنے سے انکار کر دیا یا مکان پر موجود نہ تھے۔

" گھر پہنچ کر چھنوّ نے مجھ سے کہا۔ " اجی وہ بادشاہ زادے مونڈھے والیوں کی نذر قبول کرتے؟ بہت جوش و خروش سے گئی تھیں۔ اللہ قسم نانی سے غدر کے مرثیے سنتے سنتے کان پک گئے۔ بادشاہ سلامت کا ایک اور سگا پڑپوتا ___ سلطان جی میں خواجہ حسن نظامی کے ہاں نوکر ہے۔ مرزا سہراب شاہ۔ خواجہ صاحب کا ذاتی ملازم ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ستر ہوں شریف کے زمانے میں اور بادشاہ کے نواسے جو ہیں۔ قمر سلطان اور نصیر الملک وہ شہر میں گداگری کرتے ہیں۔ باقاعدہ بھکاری ہیں بڑی نانی دلنواز قلعے کے ایک عرض بیگی ہی کی بیٹی تھیں۔ اور انھوں نے بھیک نہیں مانگی۔ چورن بیچی۔ اور وہ بھی اپنی مرضی سے۔

" اب مہرو خالہ دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھر کر مما سے کہہ رہی تھیں ۔ نوابن! میں جب بھی لال حویلی کے سامنے سے گزرتی ہوں ہمیشہ وہ شعر یاد آتا ہے

" بوم نوبت می زند ___ ؟ مما نے پوچھا۔

" ہاں اور وہ کیا ہے ۔ دیکھا میں قصر فریدوں کے در پر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں ۔

" ہے کیوں نہیں۔ میں جل کر اس گفتگو میں کود پڑی۔ پوری برٹش چھاؤنی ۔

ہوئی ہے اسمیں۔ اور یہ تو بتائیے مہر و خالہ میں نے ہسٹری پڑھی ہے ـــــ پورٹیو ہاؤس
میں ـــــ اس نام سے میرے دل پر چھری سی چل گئی مگر مضبوطی سے بولے گئی ـــــ
دلیؔ کو تو دراصل نادر شاہ اور احمد شاہ نے تاراج کیا تھا۔

" ۱۸۰۳ء میں ـــــ میں کہتی رہی۔ جب لارڈلیک نے قبضہ کیا اسکے بعد سے تو دلیؔ پھر
سے بسی۔ اور اس نے ترّقی کی۔ مما خود بتاتی ہیں کہ انکے دادا پردادا شاہی خوشبو ساز
تھے۔ انکی عطر کی دوکان چاندنی چوک میں تھی۔ اور وہ ولایتی پرفیوم منگوانے لگے تھے۔
دوکان پر انگریزی میں بورڈ لگا دیا تھا اپنے نام کا۔ غدر سے پچیسؔ تیسؔ سال پہلے ـــــ
" ہمارا پشتینی کارخانہ بھی تو گردسی میں برباد ہوا۔ مما نے ٹھنڈی سانس بھری۔
آباؤ کھیا دوبارہ اپنی ساکھ تھوڑی سی جما پائے تھے کہ خود چل بسے ـــــ
" ان کمبخت مرزا سبط احمد کا کچھ پتہ نہ چلا جنھوں نے تمہاری جائیداد ہڑپ کی تھی؟
مہر و خالہ نے دریافت کیا۔

" مرزا سبط احمد سے گفتگو مما کی بے پوری حویلی کے رہن وغیرہ کے قصےّ کی طرف
منتقل ہو گئی۔ میں نے اب شدّو ماموں کو مخاطب کیا۔ جو دسترخوان کے کونے پر بیٹھے تندہی
سے کھانے میں مصروف تھے۔ ان کی اماّں مہر و ٹانٹی تھیں یہ کمزور اور بہرے بھی ہو
گئے تھے۔ مگر میں اپنی بات کسی کو سنانا چاہتی تھی۔ کوئی میری بات سننے کو تیار نہ تھا۔
میں نے چلاّ کر کہا ـــــ شدّو ماموں۔
" انھوں نے کان کے پیچھے ہاتھ رکھا۔
" سنیئے۔ سلاطین زادے جو تھے ـــــ "
" سلاطین زادے ـــــ؟ ہاں ہاں ـــــ کہو شاہ عالم کی اولاد تھے۔ شاہی
خاندان کے سب لوگ سلاطین کہلائیں تھے ـــــ کیا ہوا ـــــ؟ غدر سے پہلے ہی
افغانوں اور مرہٹوں نے پلیتھن نکال دیا تھا۔ اور روہیلے تھے یا قہر الہٰی اللہ بخشے
ماموں جی بتایا کرتے تھے۔ کمپنی کی سرکار کو دلیؔ ٹھیکے پر دیدی گئی تھی۔ کہ اسکا انتظام

کرو۔ حضرت بادشاہ سلامت کو خود اپنی اور ان دو ہزار سلاطین کی کفالت کے لیے بارہ لاکھ سالانہ ملتا تھا۔ قلعے کے بھاری خرچے ۔سلاطینوں کی عادتیں بگڑی ہوئی ——زیادہ تر تو بٹیا بہت تنگدست تھے۔ قلعے سے باہر رہنے لگے تھے۔

"مرزا بھورے تو بڑی شان سے قلعے میں رہتے تھے۔ ہمارے آ کا حضرت ان کے مرض بیگی تھے۔ مہرو نے جے پور والی بات ادھوری چھوڑ کر اپنے بیٹے شدّو کو مخاطب کیا۔

" آپ لوگ یہ شاہی خاندان شاہی خاندان لال قلعہ لال قلعہ کب تک رٹتے جائیں گی ؟ میں نے بھنا کر جواب دیا۔ محض اس لیے کہ ایک ناکارہ آدمی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس سے اتنی ہمدردی۔ جن کروڑوں غریبوں کے کنبے صدیوں سے مفلس چلے آرہے ہیں ان پر ترس نہیں آتا ؟ محض کسی شاہی گھرانے سے رشتہ داری سُرخاب کا پر لگا دیتی ہے آدمی میں ؟

" وہی سُرخاب کا پر لگا دیتی ہے صاحبزادی جو تم سمجھتی ہو تمہاری ہَیٹ میں لگا ہے کیونکہ تم ایک یوریشین کی اولاد ہو۔ ایک گورے ٹھگ کی۔ چلتے پھرتے کی اولاد۔ رم جھنی کتیا۔

" میں لاجواب شرم سے پانی پانی۔ مہرو دلّی کی شائستہ طوائف تھیں۔ مما کو اس بیہودہ گوئی سے جز بز ہوئیں۔ میری سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو غصّے سے بپھر کر پھر اپنی بات دہرائی۔ آپکی چہیتی دلّی کو ایرانیوں نے اجاڑا تھا۔ افغانوں اور روہیلوں نے غارت کیا تھا۔ وہ لوگ کیا کافر مشرک فرنگی تھے ؟ آپ ہی لوگوں کے ہم مذہب تھے۔

" ہم لوگوں کے ہم مذہب ؟ مہرو خالہ نے ناک پہ انگلی رکھ کر دہرایا۔ اور تیرا کو سا مذہب ہے چھوکری ؟

" میرا ؟ میرا کوئی مذہب نہیں۔

"سب نے ایکدوسرے کو دیکھا۔
" اور نہ میں آپ لوگوں کا پیشہ اختیار کرونگی۔

" فرنگی خون کا اثر۔ شموخالہ نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فیصلہ صادر کیا۔
" اسے ہے تو فرنگی خون تو نگوڑی گوہر میں بھی ہے دیکھو کیسے پیالہ پی کر ڈیرے دار بنی۔ چلی جاتی ولایت۔ یا رہتی میموں کی طرح۔ نہیں صاحب۔ لکھنؤ کی ڈیرہ داروں نے اسے اپنا ہم پلہ نہ سمجھا تو بے چاری نے ننو آپجو اکی خوشامد کی۔
" ننّا آپ بھی تو پیدائشی ڈیرے دار نہیں تھیں۔ آپ نے بھی پیالہ پیا تھا ۔۔۔ ؟ چھنّو نے دلچسپی سے پوچھا۔
" نہیں میرے چاند۔ مہرو خالہ نے نواسی کو جواب دیا۔ اماں منّوری نے آپا بیگماں مرحومہ کو اور مجھے اپنی بیٹیاں بنا کر پالا تھا۔ ہمیں خود بخود وہ حیثیت مل گئی۔
" اب میں نے نوٹس کیا کہ مہرو خالہ کی آواز میں خفیف سے غرور کی جھلک آگئی تھی۔ ابتک اپنے کھرے شریف مغلیہ حسب نسب کو رو رہی تھیں۔ انسان بھی کیا چوں چوں کا مربہ ہے۔

" پیالہ پی کر ڈیرے دار کیسے بنتے ہیں۔ ؟ چھنّو نے اٹھلا کر پوچھا۔
" مہرو خالہ نے بتلایا گوہر نے ننو آپجو اکے ہاں برادری کی دعوت کی۔
" ضیافت کے بعد پیالہ بھر شربت پہلے ننو آپجو اکی بھانجیوں نے پھر ان دونوں لیجنڈری بہنوں نے ۔۔۔ پھر ساری طوائفوں نے باری باری چکھا۔
" آخر میں اسے گوہر نے نوش کیا اور گویا آنریری ڈیرے دار بن گئیں۔ ڈیرے دار کے لیے بنیادی شرط یہ تھی کہ سات پشتوں تک اسمیں حلالی کوئی نہ ہو۔"
" یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ ؟" منصور نے پوچھا۔
" ہر سوسائٹی کے اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ جب مہرو خالہ نے یہ قصّہ سنایا میرا ابھی

یہی ری ایکشن ہوا۔ میں نے طیش میں آکر کہا۔ شرم نہ آئی آنٹ گوہر کو ——
"پیشہ ور عورتوں کا جھوٹا شربت اسلیئے پی گییں کہ سات پُشت کی حرامی کہلائیں۔
غصّے کے مارے میرا بُرا حال۔ میں تو انکو بہت معقول پڑھی لکھی خاتون سمجھتی تھی میرے
اندر بہت دنوں سے جولاوا سا ابل رہا تھا اب وہ سطح پر آچکا تھا۔ میں نے دسترخوان پر سے
اٹھتے ہوئے اعلان کیا آپ سب کان کھول کر سُن لیجئے۔ نہ میں آپکا دین قبول کرتی ہوں
نہ آپکا خدا۔ نہ آپکا پیشہ۔

"میں اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی کہ چکرا کر گر پڑی۔ مما نے مجھے زور کر تھپڑ لگایا تھا۔ پھر
لاتوں گھونسوں کی بارش۔ فلو، مہرو اور شمّو خالہ مما کو نہ روکتیں تو شاید اس روز کی مار
سے جانبر نہ ہو پاتی۔"

"جو بنگالی ہندو" عندلیب بانو نے دوسری شام داستان آگے بڑھائی "پچھلی دو
صدیوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتوں کی حیثیت سے بے تحاشا دولت کما چکے تھے۔
انہوں نے زمینداریاں خرید لی تھی۔ انکے خاندان کلکتہ کے مرچنٹ پرنس کہلاتے تھے۔
انہوں نے مرحوم دربار مرشدآباد کی تہذیب اور طور طریقے اختیار کر رکھے تھے۔
"ایک مرچنٹ پرنس نے میرے پہلے جلسے کا خرچ اٹھانے کی پیش کش کی —— مما
انتظامات میں بے طرح مصروف ہو گییں۔ وہ مجھے مار مار کر ایک مولوی صاحب سے
اردو فارسی بھی پڑھوا رہی تھیں۔
"برآمدے میں درزی بیٹھ چکا تھا۔ زرق برق پوشاکیں تیار کی جا رہی تھیں۔

"رقص کے مردانہ اور زنانہ اصل لباس جو اسوقت تک رائج تھے آج کے کتھک
ڈریس سے مختلف تھے۔ رقّاص برکا پاجامہ پہنتے تھے۔ مشروع کا۔ گوٹا بنت ٹکا۔ انگرکھا

تار بانے کا۔ بوٹی دار۔ بالوں میں بیچ کی مانگ۔ پٹّے۔ دوپٹے کا کروس۔ لڑکیوں کی پشواز کے نیچے بَر کا پاجامہ۔ اتنا نیچا کہ اڑھائی سیر گھنگرو کی جوڑی نظر نہ آوے۔ آڑا پاجامہ رائج نہ تھا۔ گھنگرو موری کے اوپر نہیں باندھے جاتے تھے۔ پنڈلیاں لہولہان ہو جاتی تھیں۔ کہا جاتا تھا جب تک گھنگرو گوشت نہ کھالیں مہارت حاصل نہیں ہو گی۔"

"افوہ —" منصور نے کہا۔

"اس سارے بکھیڑے سے میری روح فنا ہوتی تھی۔ طبلہ بجا۔ تہرا شروع ہوا۔ جسم سادھا۔ بھنویں چلیں —" اچانک عندلیب بانو پھر گنگنانے لگیں "کہاں جاگے ساری رات نیناں کسمبری رنگ ہو گئے۔ ایک تو تلنگوا — تلنگوا کا پہرہ — دوجے ٹھاڑے جمعدار —

"میں مصوری سیکھنا چاہتی تھی۔ کہاں ٹرنزا در کانسٹبل کہاں دُوجے ٹھاڑے جمعدار۔ گت نکتہ ادّھا۔ تال کہروا۔"

"لیکن مسز بیگ یہ تو بہت عظیم آرٹ ہے۔"

"ہو گا۔ ایک روز جلسے کے لیے گھر پہ پریکٹس کر رہی تھی مما کی ایک سہیلی بولیں نام بُلبُل ہی رہے گا؟ مما نے کہا۔ اور کیا۔

"وہ بولیں اگر یہ بابو کے بُلبُلی خانے سے اُڑ گئی تو بُلبُلہ نہ بیٹھ جائے گا؟

"اے توج خدا نہ کرے جو میری لڑکی نکلے۔ مما نے چمک کر جواب دیا۔

"شرفا میں اگر لڑکی ماں باپ کے گھر سے نکل کر آوارہ ہو جائے اسے بھاگ جانا کہتے ہیں۔ طوائفوں کے ہاں الٹا حساب تھا۔ لڑکی نکاح کر لے یا کسی کے گھر بیٹھ جائے تو نہایت تاسف سے کہا جاتا تھا فلاں کی لڑکی بھاگ گئی۔"

"امّی ذرا مختصر کیجیے۔ ابھی ہم لوگوں کو کلنک بھی جانا ہے۔" عنبرین نے الجھ کر یاد دلایا۔

"مجھے بڑھاپے کا ANECDOTAGE ہو گیا ہے۔ بھلا میں کہاں تک پہنچی تھی؟"

"نرت سے آپکی روح فنا ــــ"

"ناقدین فن روسا، کے سامنے ناچنے کے خیال سے لرزہ چڑھ رہا تھا۔ اس دور کے چند امراء بھی کتھک کے ماہر تھے۔ رامپور کے نواب رضا علی خاں کتھک کے اُستاد تھے۔"

"واجد علی شاہ کی روایت!"

"ہاں۔ اور مجرے کا جو ایٹی کیٹ محمد شاہ رنگیلے کے دور سے چلا آرہا تھا اور مما مجھے سکھلا رہی تھیں۔ وہ یاد نہیں رہتا تھا۔ یہ ہندوستانی فلموں میں جو SO-CALLED مجرے کے VULGAR سین تم دیکھتے ہو آج سے پچاس سال قبل تک مجرا قطعی مختلف اور انتہائی شائستگی کی محفل ہوتی تھی۔ گانیوالیاں اپنے معزز سامعین اور بڑے والیانِ ریاست کے سامنے پان نہیں کھا سکتی تھیں۔ چہرہ ایک طرف کر کے بیڑہ منہ میں رکھتی تھیں۔ پانی بھی اجازت حاصل کر کے پیتی تھیں۔ نہایت شرعی قسم کا لباس پہننا پڑتا تھا۔ پوری طرح پردے دار۔ نہایت رکھ رکھاؤ اور تہذیب کا پرتکلف ماحول ہوتا تھا۔ اور کیسے کیسے اہل کمال اس زمانے میں موجود تھے۔ لکھنؤ کی نتوا بچوا کا لکا بندادین کی شاگرد۔ بے پناہ کہروا ناچتی تھیں۔ کون البیلے کی نار جھما جھم پانی بھرے۔

"شمبھو مہاراج "کس نے چلمن سے مارا نجارا مجھے" ستّر طریقے سے بتاتے تھے۔

"ایسے ماحول میں تو میرا DEBUT ہونے والا تھا۔ وحشت کے مارے راتوں کی نیندیں حرام۔ کبھی سوچتی جو فلومینا کہتی ہے میری قسمت ہی میں لکھا تھا ورنہ نواب بائی کے ہاں کیوں جنم لیتی۔ لیکن مجھے یہ قسمت والی بات لغو معلوم ہوتی تھی۔ ان دنوں کلکتہ میں سوویٹ یونین اور سوشلسٹ انقلاب کا بہت چرچا تھا۔ ٹیگور شاید رُوس ہو آئے تھے یا جانے والے تھے۔ یاد نہیں۔ بولشویزم کا تذکرہ اخباروں میں

چھپتا رہتا تھا وہ زیادہ پلّے نہ پڑتا۔ مگر اتنا سمجھ میں آگیا تھا کہ انسان ایک ان دیکھی مفروضہ اور خیالی آسمانی طاقت پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنی جدوجہد سے حالات بدل سکتا ہے اور EXPLOIT کیے جانے سے بچ سکتا ہے۔

"لیکن میں اتنی کمسن تھی۔ کیا کر سکتی تھی۔ جلسے سے دو روز قبل رات کو سونے کیلئے لیٹی تو اچانک ایک راہ فرار سوجھ گئی۔ بہت ہی DESPERATE ترکیب تھی مگر اس ناتجربہ کار اور کچّی عمر میں وہی ایک راستہ دکھلائی دیا۔

"صاحب پرسوں میں کہاں تک پہنچی تھی؟"

"آپ کو ایک راہِ فرار ——"

"ہاں تو میں گجردم اٹھ بیٹھی۔ مما اور فلومینا دونوں اپنے اپنے کمروں میں غافل سو رہی تھیں۔ میں نے روشنی جلائے بغیر فراک پہنا ہیٹ لگائی۔ پرس اٹھایا۔ دبے پاؤں زینہ اتر کر رپن اسٹریٹ میں آئی۔ کچھ دور تک دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ ایک رکشا ملا۔ سیدھی اوٹرم گھاٹ۔

"چندر نگر پچیس ۲۵ میل دور تھا۔ موٹر لانچ ایک جیٹی پر پہنچی۔ سامنے فرانسیسی پرچم لہرا رہا تھا۔ کانونٹ کا راستہ پوچھ کر پیدل روانہ ہوئی۔ ایک مہربان فرانسیسی نے اپنی موٹر کار روک کر لفٹ دی — سینٹ جوزف اف کلونی کی درسگاہ پر جا اتارا۔

"اندر گئی۔ یہاں ہر طرف فرنچ بولی جا رہی تھی۔ اپنے ان دیکھے باپ کی کلچر کی ایک جھلک نے مضطرب کیا۔ ایک نوعمر نن اپنے ڈریس کے مطابق سیاہ لبادے کے ڈھیلی آستینوں میں ہاتھ چھپائے سر جھکائے دیوار کے کنارے کنارے جا رہی تھی مجسم عجز و انکسار۔ آگے بڑھ کر اس سے بات کی۔ وہ انگریزی سے ناواقف تھی۔ ٹوٹی پھوٹی میں پڑھی ہوئی ابتدائی فرنچ کے ذریعے سمجھایا —— چندر نگر کے ایک باشندے موسیو آندرے رینال کی لڑکی ہوں۔ وہ فرنچ فوراً انجین میں شامل ہو گئے

تھے ۔عرصے سے لاپتہ ہیں ۔میری نیٹو ماں مجھے ڈانسنگ گرل بنانا چاہتی ہے ۔کل شام وہ مجھے باضابطہ اپنے پیشے میں شامل کرے گی ۔خدا کے واسطے مجھے آج ابھی ابھی اس خانقاہ میں داخل کر کے فوراً نن بنا لیجیے ___

"نوجوان راہبہ نے اپنی پرندوں جیسی روشن آنکھیں پوری طرح کھول کر مجھے تعجب سے دیکھا ___ صاف ظاہر تھا کہ نئی نئی فرانس سے آئی ہے اور پُراسرار مشرق کے معاملات سے ناواقف ہے ۔ایک نیٹو ڈانسنگ گرل کی بلونڈ لڑکی ___ اموں دیو ___ !!

"میری دردناک التجا کو سر جھکا کر بڑے دھیان سے سُنا ۔اور خاموشی کے ساتھ مجھے ایک سرخ عمارت کی طرف لے چلی ۔

"راستے میں ایک گرد تو پڑا ۔بلند و بالا مرمریں مریم کے عقب میں ننھا سا جھرنا گر رہا تھا ۔ مذہب سے برگشتہ ہو چلی تھی مگر اس لمحے گڑگڑا کر دعا مانگی ۔ ہولی میری ناچ گرل نہیں ___

"میں نے تورینٹو میں دیکھا تھا ۔ہماری راہبہ استانیاں کیسی پُرسکون مصائب سے آزاد زندگیاں گذارتی تھیں ۔اسوقت میں بےحد کنفیوزڈ تھی اور ہر قیمت پر مما کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی تھی ___ نن مجھے پرنسپل کے دفتر میں لے گئی ۔ مدر سپیریر میاری جوزف نے متعدد سوالات کیے ۔پھر بجلی گرائی ___ تم ابھی قانوناً بالغ نہیں ہو ۔تمہاری والدہ تمہاری سرپرست ہیں ۔اور وہ برٹش سبجکٹ ہیں ۔ابھی تم گھر جاؤ ۔بڑی ہو جاؤ تو ہمارے پاس ضرور آنا ۔ہم ابھی سے تمہارے لیے دعا کرتے رہیں گے ۔

"انہوں نے انگریزی ،فرانسیسی اور بنگالی میں چھپے چند دینی کتابچے اور مشہور مبلغ راہبات کی زندگیوں کے متعلق ایک باتصویر کتاب مجھے تھما دی ۔ان فرنچ راہبات نے فرانس اور برطانیہ کی افریقی اور ایشیائی نو آبادیات میں اسکول اور ہسپتال قائم کیے تھے ___ وغیرہ ۔

"ایک فادر نے بڑا سا چوکلیٹ کا ڈبہ مرحمت کیا ۔جب وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر نہایت شفقت سے مجھے دروازے کی طرف لے چلا میں دھاروں روئی ۔باہر کئی فادروں اور ننوں نے مجھے گھیر لیا ___ اور دلاسہ دینے لگے ۔صبح کچھ کھائے پیے بغیر گھر سے بھاگ آئی تھی اور بھوک

اور صدمے سے نڈھال تھی۔ ایک فادر نے اسکول کے ڈائیننگ ہال میں لے جاکر لنچ کھلایا۔ پھر موٹر میں بٹھال کر کلکتے روانہ ہوا۔ میں راستے بھر خاموش رہی۔ ان لوگوں کی غداری پر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ ایک مظلوم گوری لڑکی کو اس نیٹو انڈین غلاظت میں واپس پھینکنے جا رہے تھے۔

"اسٹرینڈ پر پہنچ کر فادر نے میرے گھر کا پتہ دریافت کیا۔ رپن اسٹریٹ کے موڑ پر اتارا۔ "میں نے گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ دینی رسالے اور راہبات کی سوانح حیات کوڑے کے ڈھول میں پھینک دی۔ چوکلیٹ کا ڈبہ نہیں پھینکا۔

"اب تم تو بن گئے ہو CAPTIVE AUDIENCE آج ایک اور تصویر بھی دیکھ لو۔" وہ منصور کو اپنے اسٹوڈیو میں لے گئیں۔ دیوار کے سہارے کھڑے چند کینوس سرکاتے۔ ایک بڑا فوٹو گراف نمودار ہوا۔ پشواز میں ملبوس ایک پری پیکر، کتھک کی "آمد" کا پوز بنائے، بڑے شوخ تبسم کے ساتھ کیمرے کو دیکھ رہی تھی۔

"پورٹریٹ اف اے ناچ گرل II
"یا — وِمنیز فورن لیجین کی ایک رکن۔" وہ اسٹول پر ٹک گئیں۔
"ایک روز ہم لوگ فرنچ فورن لیجین کے متعلق ایک خاموش فلم دیکھ کر آ رہے تھے۔ یوجین پیٹرسن کے ساتھ۔ تو اس نے کہا تھا دنیا بھر کی مصیبت زدہ عورتیں ایک قسم کی وِمنیز فورن لیجین میں بھرتی ہو جاتی ہیں۔ اپنے نام بدل لیتی ہیں۔ انکی شخصیتیں ماحول تبدیل کر دیتا ہے۔

"مما جاپانی جارجٹ کی نیلی ساری پہنے بند جوتوں پر کھٹ کھٹ کرتی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ہم چورنگھی سے گذر رہے تھے۔ میں اپنی ماں سے متنفر تھی۔ اسوقت ترس آگیا۔ یوجین ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے سوچا معصوم شریف زادی نواب فاطمہ کیسی رہی ہونگی۔ کیا سے کیا بن گئیں۔ پھر

بھی کتنی بہادر کیسی امید پرست۔ سمجھ میں آنے نہ آتے۔ فرنچ فورن لیجین کے متعلق ایک فلم نہیں چھوڑتیں۔ محض اس موہوم، احمقانہ توقع پر کہ شاید کسی سین میں موسیو آندرے رینال دکھلائی دے جائیں۔

"یوجین نے بتلایا تھا ان فلموں کی شمالی افریقہ میں لوکیشن شوٹنگ ہوتی ہے۔

"یوں بھی اس کولونیل دور میں فرنچ فورن لیجین ایک بڑی رومینٹک چیز سمجھی جاتی تھی۔ دراصل، ہما، فلومینا اور میں ـــــ تین مضطرب دُکھی رومان پرست رُوحیں تھیں۔ انگلش اور اردو بائیسکوپ دیکھنا ہمارا محبوب مشغلہ ـــ یوجین ـــ عرف اندرا دیوی بھی ہمیں فری پاس بھجواتی رہتی تھی وہی رُوسی لڑکی جسکا فوٹوگراف ڈرائینگ روم میں رکھا ہے۔ آنٹ گوہر کے ہاں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔

"وہ عجیب زمانے تھے۔ مہر منیر چودھرائین لکھنؤ کے نام سے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ یہودی نژاد گوہر جان کی مجالس محرّم کے حصّے چاندی کی طشتریوں سمیت تقسیم کیے جاتے تھے۔ اور گوہر ہی نے مجھے 'ولائیتی ناچ' سکھوایا ـــــ جو اس زمانے میں کلکتہ اسٹیج پر بہت مقبول تھا"

(۱۸)

ولائتی چکر

"چُلبلے والی ملکہ ——"

"ایک اور پری چھم سے نکلی —— پٹاری سے!"

"—— بہترین بھاؤ بتاتی تھی۔ اس کی سوتیلی بہن جدّن ——"

"سوتیلی ——؟ میرا مطلب ہے —— میرا خیال تھا کہ اس سوسائٹی میں سب ایک دوسرے کے نصف بہن بھائی ——مطلب ماں ایک اور —— یعنی کہ ——"

"ملکہ اور جدّن ایک سیر دائی طبلہ نواز کی بیٹیاں تھیں۔ گوہر نے جدّن کو گرُدم کیا۔"

"سیر دائی پر مختصر نوٹ ——"

"تم کو ایک موڈرن باشعور انسان سمجھا تھا نکلے تم بھی شیخ عبدالباسط گوٹے والے۔"

"استغفراللہ آپ تو خفا ہوگئیں۔ اچھا ملکہ اور جدّن ——"

"ایک سیر دائی کی لڑکیاں تھیں ——"

"وہی تو پوچھ رہا تھا سیر دائی کیا ——"

"پاتروں کے ایک گاؤں چُلبلا، ضلع الہ آباد کے ایک سیردا ——"

"وہی تو پُوچھ ——"

"تم ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے ہاں ذات بندیاں کیں۔ بے مثال فنکاروں کو 'میراثی' پکار کر حقیر سمجھا۔"

"میڈیول یوروپ میں بھی تماشا گروں کو ٹاٹ باہر سمجھا جاتا تھا۔ اب ہم اعلیٰ سرکاری اعزازات ——"

"اگر تمہاری کوئی بہن ہوتی تم اس کی شادی ایک ماہر فن گویّے سے کر دیتے؟"

"پچاس ساٹھ سال میں تو پرانے تعصبات اور رویّے مٹ نہیں سکتے اچھا سپر دا۔"

"اس ذات بند سماج میں خود ان کے ہاں زبردست کاسٹ سسٹم موجود تھا۔"

"بس تو آپ خود ہی سوچیے۔"

"بلند پایہ گویوّں اور تنت کاروں کا طبقہ علیحدہ تھا۔ طنبورہ بند میراثی برتر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی عورتیں سخت پردے میں —"

"مسز بیگ — للّٰلہ — سپر دا —"

"گانے والیوں کے سازندے — اکثر ان کی لڑکیاں بھی پروفیشن میں شامل —"

"آئی سی۔ واقعی یہ بھی ایک علم دریا ہے۔ اب جدّن بائی اور چُلبُلی ملکہ بتائیے۔"

"چُلبُلے والی۔ جب بیگا جان کے باپ جگّو خاں کنچن —"

"کنچن سمجھاتی چلیے۔"

"تمہارا رویّہ تمسخر کا ہے۔ کیونکہ تم زندگی کے بازار سے ناواقف ہو۔ ہٹاؤ۔"

"پلیز۔ گوہر جان تو رہی جاتی ہیں۔"

"بیوقوفی کی باتیں جو کیے جا رہے ہو۔ گوہر کی ماں دوسری ملکہ جان تھیں۔ بنارسی۔ دراصل ارمنی۔ بنارس میں کسی انگریز کے ہاں آیا گیری کرتی تھیں۔ وہ شخص گوہر کا باپ بنا تو ماں بیٹی کو بے سہارا چھوڑ کر غائب۔ ملکہ بے چاری ایک ارمنی نائیکہ کے ہتھے چڑھ گئیں۔ ناچ گانا سیکھا۔ اور اکیڈیمک اردو فارسی جو اعلیٰ کورٹی زن کے لیے لازمی تھی۔ شعر کہنے لگیں۔ استاد نہایت ٹپکل رہے ہونگے۔ حکیم بنّو صاحب ہلالؔ بنارسی۔ کاشی میں رہیں پھر کلکتے آگئیں۔ وہاں یوریشین، یہودی، ارمنی اونچی طوائفوں کی کثرت تھی لیکن ملکہ جان کی دھوم مچ گئی۔ اصلاً ارمنی یہودی تھیں۔ یوروپین لباس پہنتیں۔ میم صاحب کہلاتی تھیں۔ بیحد ذہین اور ٹیلنٹڈ۔ سیلف میڈ کریردومن۔ مسکراؤ مت۔" مسز بیگ ذرا جوش سے اٹھ کر اندر گئیں ایک خستہ کتاب پڑھتی واپس آئیں۔ "کلکتے میں ٹیپو سلطان کے پڑپوتے پرنس ابراہیم شاہ رسؔا انکے ایک سرپرست تھے۔"

"طاؤس و رباب آخر!" منصور نے آہ بھری۔

"نہیں۔ موسیقی رزم و بزم کا جز و تھی ٹیپو کی فوج کے مارچنگ سونگ کوئی ہنڈول میں باندھا گیا تھا کوئی جنگلہ۔ بھیرو۔ سارنگ۔ گوری کلیان۔ پرنس ابراہیم شاہ ہی نے آنٹ گوہر کو تبلایا تھا۔ ایک فوجی ترانہ تھا ـــــ ملک ہندوستان کا دیں میں وہی سلطان ہے۔ غرق جس کی آب خنجر میں فرنگستان ہے!"

"واہ ـــ!"

"اور غزلیں آہستہ قدم۔ جلد قدم۔ طلوع صبح۔ وقت شام۔ وقت طنبور دوم کوچ ـــ اور جانے کیا کیا لیکن تم نے پھر میری بات کاٹی۔ خیر تو ۱۸۸۶ء میں یہ مخزن آلفت ملکہ چھپا۔ اکثر شعر نہایت ادق ہے لکھا حساب خلق کا جو کلک مرگ سے۔ تھا حرف کن سے رابطہ روز شمار کا ـــ اور ـــ خیر یہ تو آسان ہے۔ عجب حکمت سے خاک لامکاں بنیاد میں ڈالی۔ بنایا جب خدا کے قصد نے ایواں رسالت کا۔ یہ لو ـــ خمیر گرد کن تھا موجہ رفتار کا جوہر ـــ اور سنو ـــ چشم بتاں نقشہ عین الیقین ہے صاد کا ـــ کسی مداح نے لکھا ہے ـــ دیکھو ہے زیب محفل مشکل خیال ملکہ! اب شہزادہ ابراہیم شاہ کی تقریظ ملاحظہ ہو: ـــ جہانگیر نہیں مگر افسانہ ہے مجنوں نہیں مگر دیرانہ ہے۔ جالینوس نہیں مگر سرزمین طوس ہے۔ ناسخ نہیں مگر دیوان ہے۔ میر تقی میر نہیں مگر ذکر ہے۔ نور جہاں نہیں۔ زیب النساء نہیں۔ یہ کارخانہ الٰہی ہے یہاں جو ہے سوئے عدم راہی ہے ـــ مولفہ گو ایک عورت ہے مگر رفعت مضامین فصاحت و بلاغت اور سنو آگے ـــ صاحب دیوان تو ماشاءاللہ اور معاذاللہ ـ انکی ادائیں انکی وفائیں ـــ"

"یہ ٹیپو سلطان کے پڑپوتے بھی سبحان اللہ۔"

"ـــ داغ کے مشہور شاگردوں نے تاریخیں نکالیں۔ ان گنت۔ آج بندے سے کئی حسن پرستوں نے کہا۔ ملکہ کشور بیداد کا چہرہ کہیے۔ عارض انور جاناں کے لیے ہے زیبا۔ معنی آیت والشمس کا جلوا کہیے۔ فکر سے زندہ کیے مردہ خیالات بہت۔ ذہن ملکہ کو بھی اعجاز مسیحا کہیئے۔ جسکے چھپنے کا خدائی میں مچا ہے اک شور۔ میم صاحب کا وہ دیوان انوکھا کہیے۔

"مہاراج یووراج بیر بر ٹھاکر ہرکشن سنگھ والی ریاست کشن کوٹ :۔ بدین نوید کہ دیوان ملکہ شد مطبوع ۔ مہاراجہ پدمانند سنگھ بہادر افسر والی ریاست نیلی دکھڑک پور ضلع بھاگلپور :۔ سُنے جب کچھ مضامین ذہن بولا طبیعت علم غایب پر ہے حاضر۔ صفات اوج معنی کیا بیاں ہوں۔ زبان بلبل سدرہ ہے قاصر۔

"ایک شاگرد داغ :۔ نقطہ کو اختر فلک کہیے۔ سطر کو خط کہکشاں کہیے۔ میں نے استاد سے اجازت لی۔ حکم نافذ ہوا کہ ہاں، کہیے اسکی تاریخ ہے قیامت کی۔ سخن فتنہ جہاں کہیے

"بے حساب ارباب نشاط کی تاریخیں ۔ بی میجو صاحبہ پری، طوایف یہودن ۔ بی بی منجھو صاحبہ مشتری طوایف لکھنوی ۔ خورشید جان دہلوی صاحب دیوان ۔ بی بی شیریں جان شیریں طوایف لکھنوی ۔"

"یعنی طوایف نام کے آگے اسطرح لکھا جاتا تھا جیسے ڈینٹسٹ یا وکیل !"

"مکھن جان صاحبہ متوطن گیا ۔ پردہ غیب میں پنہاں تھا جو سال ہجری۔ کان میں آگئی ناگاہ ۔ فغان ملکہ۔ یہ جلد آنٹ گوہر نے مما کو دی تھی وہ اسکا ایک شعر اکثر دہراتیں ۱۳۰۲ھ

ے اسدرجہ خوشخرام چلا کاروان عمر۔ میدان حشر طے ہوں تنوا ایک راہ میں۔ دیوان ملکہ کا دوسرا واحد نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے،

"کلکتہ ہندوستانی میوزک کا گڑھ بن چکا تھا۔ لکھنؤ اور بنارس کا رنگ غالب ملکہ بنارسی نے ہولیاں ٹھمریاں دادرے ایسے بنائے آج تلک گائے جاتے ہیں۔ دستور کے مطابق استھائی پوربی یا اودھی میں انترہ فارسی ۔ ناہین کرت بات گریات جات بیا بیا کہ ملکہ بیقرارم ۔ وغیرہ اور بھری گگری موری ڈھرکائی شام ۔

"ملکہ بنارسی مشہور شاعرہ تھیں۔ نامی گائیکہ اور کمپوزر۔

"مگر طوائفوں کے سماج میں بھی کاسٹ موجود تھی۔ چنانچہ گوہر جان جب کالکا بندادین سے کتھک کی تعلیم لینے لکھنؤ گئیں کیونکہ بے چاری محض فرسٹ جنریشن غیر حلالی تھیں۔ لہذا انھوں نے پیالہ پی کر ۔"

"جی ہاں۔ آپ بتا چکی ہیں۔ مجھے یہ واقعہ بہت اندوہناک معلوم ہوا۔ ایک ذہین طباع

پڑھی لکھی لڑکی اپنی قابلیت اور فنکاری کی بدولت کوئی بہتر مقام حاصل نہیں کر سکتی تھی؟"
" آج سے اسّی نوّے برس پہلے؟ ہرگز نہیں — اور جدّن کی لڑکی نے آجکل کے زمانے میں جو مرتبہ سوسائٹی میں حاصل کیا وہ ایک منفرد واقعہ ہے۔"
" بالکل منفرد بھی نہیں ہے۔"
" بہر حال۔ آنٹ گوہر اپنی اس زندگی سے بیحد مطمئن تھیں اور اس سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ آؤ تازہ ہوا میں چلیں۔"

وہ باہر آ کر لان پر پڑی سفید کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ عنبریں باورچی خانے کی سمت سے آتی دکھلائی دی — گویا بن دیوی کی طرح درختوں کے جھرمٹ سے نمودار ہوئی۔ منصور نے سوچا — بن دیوی جس کی جھلک جھٹ پٹے وقت دکھلائی دے جاتی ہے۔ بن دیوی جیسے انسانوں سے ڈر لگتا ہے۔

" مغرب میں" عندلیب بانو نے سلسلۂ کلام جاری رکھا " اس وقت مادام میلبا وغیرہ افسانوی ہستیاں شو بزنس میں تھیں گوہر ان کی ٹکر کی تھیں " LARGER-THAN-LIFE
" کم آون امّی — آغا حشر انڈین شیکسپیر — گوہر جان انڈین مادام میلبا!" عنبریں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
" کیپ کوائیٹ۔ تم کیا جانو تم نے آنٹ گوہر کو دیکھا ہی کہاں۔
" ممّا ۱۹۰۷ء میں پہلی بار ان سے ملیں بمبئی میں۔ آنٹ گوہر نے ٹاؤن ہال کے کسی چیریٹی شو میں گایا تھا۔ سر فیروز شاہ مہتہ نے اسٹیج پر آ کر ان کی بیحد تعریف کی۔ جواباً انہوں نے بڑھیا انگریزی میں یورپین میوزک پر ایک تقریر کر ڈالی۔ وہ عربی داں بھی تھیں۔ کیونکہ کلکتہ میں بغدادی یہودی تاجروں کی کثرت تھی اور وہ لوگ ہندوستانی موسیقی کے بہت دلدادہ تھے۔ اچھا جب ایک ایرانی ان کا GIGOLO تھا فرفر فارسی اُڑاتیں۔ وہ بنگالی فرنچ انگریزی گانے خوب گاتی تھیں — شاندار اور مدمغ اطالوی PRIMA DONNA معلوم ہوتی تھیں۔ گھنگریالے چوکلیٹ براؤن بالوں کی الٹی چوٹی — چوڑی دار پائجامہ

"— جب وہ گاتی تھیں والیان ریاست ان کے اوپر سے جواہرات نچھاور کرتے —
انکی تو آیا تک ہمیشہ بنارسی ساڑیاں باندھتی تھی۔ سونے کا خاصدان لیے انکے پیچھے چلتی —
انکے طبلچی ہیرے کی انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ بچپن میں میں اکثر انکے ڈرائنگ روم کے ایک کو
میں بیٹھی رہتی جب وہ روساء کو گانا سناتی تھیں۔ سامعین بڑے بڑے چیک کاٹ کر ان کو
دیتے۔ جب وہ باہر جاتی تھیں مسلح باڈی گارڈ ساتھ ہوتے۔"

"ہُوں ہُوں" منصور نے امریکن اسٹائل ہنکارا بھرا۔

"دھرم تلے میں انکی کوٹھی کے پھاٹک پر دو سنگی شیر بنے ہوئے تھے۔ خود بھی شیرنی سی
لگتی تھیں۔ دبنگ۔ شاندار۔

"حامد علی خاں نواب رامپور ان کے بڑے قدردان تھے وہ محل کے اندر بھی بلائی جاتی
تھیں بیگمات ان کی دلچسپ گفتگو بڑے شوق سے سنتیں۔

"ہر ہائی نس فاروقی بیگم صاحبہ پٹھان تھیں۔ گوہر کی دلیری بہت سراہتیں۔ شاید
پرنس اف ویلز یا ڈیوک اف کناٹ یاد نہیں بہر حال وہ لنگڑے شہزادے کہلاتے تھے
رامپور آئے۔ ایوننگ گاؤن اور ہیرے جڑے موزے پہنکر گوہر نے انکے ساتھ بال روم
رقص کیا۔ اسی محل میں جواب رضا لائبریری ہے۔

"نواب حامد علیخاں نے انگلش پرنس کے لیے ایک پلے اسٹیج کروایا۔ گوہر ہیروئن
ہز ہائی نس کہا کرتے تھے کیا کروں گوہر تم موٹی بہت ہو ورنہ تم پر عاشق ہوجاتا۔ ایک با
نواب صاحب نے گوہر ڈے منایا۔ سو سو روپے ٹکٹ۔ ستر ہزار روپیہ لیکر کلکتہ لوٹیں۔

"انکا ایک فیورٹ دادرا جسے وہ نرت سے گاتی تھیں۔ سناؤں۔؟ ترچھی نگاہوں
کی برچھی۔ جگر پہ ماری۔ لگی ایسی کاری، ارے ہم نے ملائی جو نظر آنکھوں سے —"

حسین بخش کافی لا رہے تھے۔ چونک کر خاموش ہوگئیں۔

"اس روز—" عنبریں نے چپکے سے منصور کو مخاطب کیا "ریذیڈنسی میں ہم لوگ ہندو
کے تضادات کی بات کر رہے تھے۔ امیّ بھی مجموعہ اضداد ہیں۔ گوہر جان اف کیل کتا کو آئیڈیلا
کرتی ہیں اور سوویٹ خلاباز لڑکیوں کو بھی۔"

انہوں نے سُن لیا۔ معاً جی آتی اینگلو انڈین لہجے میں ڈانٹا" پائپ ڈاؤن"۔ چینی چمپا کے پتوں سے پھسل کر بارش کی چند بوندیں ان کے سفید بالوں پر گریں۔

" مس صاحب میں آنٹ گوہر کو اس لیے ایڈ مایر کرتی تھی کہ وہ انڈپنڈنٹ اور سیماب صفت تھیں اور یہ ان کے ولایتی خون کا اثر تھا۔"

" خالص ہندوستانی عورتیں انڈپنڈنٹ نہیں ہوتیں؟" عنبر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "آپ کو تو اپنے ولایتی خون کا COMPLEX ہے۔ شکر ہے کم از کم میں نہیں ہوں کسی قسم کی MIXED BREED "

" ہاں ہاں۔ سیّد زادی۔ تمہیں کوئی کومپلیکس بھلا کاہے کو ہونے لگا۔" عندلیب بانو نے چمک کر جواب دیا۔

وہ تینوں دوبارہ ڈرائینگ روم میں آکر اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ گئے۔

" کلکتے کے عوام بھی انکی بیخوفی کی وجہ سے انکی بہت عزت کرتے تھے۔ برٹش گورنمنٹ سے اعلانیہ نافرمانی کا طرح طرح سے اظہار کرتیں۔ چوراہے پر بتی سرخ ہوئی یہ اپنی موٹر کار ریں زن سے نکل گئیں۔ انگریز پولس کمشنر انکی اس قسم کی حرکتوں سے عاجز آگیا تھا۔ آئے دن جرمانے ہوا کرتے۔ گورنر بنگال کے فینسی ڈریس بال میں خود بھی بھیس بدل کر پہنچ گئیں۔ چند والیان ریاست نے اعتراض کیا۔ گوہر نے انھیں اپنی محفلوں میں آنے کی مناہی کر دی۔

" سالنہ کی بڑی نمائش میں الہ آباد گئیں۔ اکبر نے کہا ؎ خوش نصیب آج یہاں کون ہے گوہر کے سوا۔ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا۔ چنانچہ ایک ایرانی سے نکاح کر لیا۔ اکبر نے فوراً ارشاد کیا ؎ مرد خلیج فارس۔ گیسو ہیں جس کے کالے۔ گوہر نے آب اپنی کر دی جسے حوالے۔ اس واقعے کو شاعر سانچے میں کیسے ڈھالے۔ سعدی کا ہاں یہ مصرع لحنوں میں لا کے گالے۔ ہرگز حسد نہ بردم با منصبے و مالے۔ الا

برآں کہ وارد بادبرے ـــــ ارے وہ آغا صاحب ابھی ابھی میرے تصوّر میں آ گئے۔
عبّاس نام تھا۔ نہایت شکیل۔ ہر وقت مالا پھیرا کرتے۔ ایسا لگا جیسے اپنی تسبیح عقیق ؛
اس پردے کے پیچھے سے نکل آئینگے۔ انہوں نے گوہر کو بہت دُکھ دیے۔
" ان سے علیحدگی کے بعد بہت سے جگ لو آتے اور گئے "
" جگ لوز کے متعلق ولایتی ناولوں ہی میں پڑھا تھا۔ امریکہ میں ایک انڈین پرنسز
ملے۔ وہ خود ایک ـــــ مگر وہ گوہر کے زمانے کے تو نہ رہے ہونگے "
" ان بے چاری کو تو مرے بھی آدھی صدی گذر گئی "
" وہ اتنے قدیم نہیں تھے مگر اولڈ ولڈ کرٹسی اور چارم کے پُتلے ـــــ سنا ہے
حال ہی میں انکو مافیا والوں نے چلتا کیا۔ یعنی یہ پروفیشن اور مافیا ! ڈیڈلی کومبی نیشن
اچھا اور بتلائیے "
" اب ایک سیمنار جگ لوز پر بھی ہوگا ؟ " عنبر نے کوفت سے پوچھا۔
" تم چُپ رہو جی۔ آپ فرمائیے "
" علیگڈھ میں انکا مجرا تھا ـــــ "
" ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں ؟ گڈ ہیونز "
" ڈونٹ بی ڈافٹ۔ ضلع کے ایک رئیس کے ہاں۔ بہت زیادہ شوخی سے نرت
کر رہی تھیں۔ آگرے کی نامی گرامی گائیکہ زہرہ بائی بھی موجود تھیں۔ بڑی رکھ رکھا
والی۔ قتّالہ عالم کے عشوے انہیں خوش نہ آئے۔ تنبیہ نہ کرتیں مگر جلسے کے بعد اس
آفت جاں نے بائی صاحبہ کی سادگی اور سنجیدگی پر فقرہ کسا۔ انہوں نے کہا۔ بیو
محض موسیقی میرا ذریعہ معاش ہے۔
" حساس اور خوددار بھی بہت تھیں۔ اس روز سے حُسن فروشی ترک کی۔ باعث
مزاج کی وجہ سے خرید و فروخت کا قانون البتہ اُلٹ دیا۔
" اسی زمانے میں وہ وائسرائے والا مشہور واقعہ ہوا ـــــ آنٹ گوہر اپنی چوکڑی پر ولا
چکر " میں ہوا کھا رہی تھیں برابر ان کا نیا جگ لو براجمان تھا ـــــ چوبدار ...

مڑا تھا۔کرسمس سیزن تھا۔وائسرائے شاید لارڈ ریڈنگ کی چوکڑی سامنے سے آرہی
تھی۔قریب آئی تو گوہر جان نے نیم قد ہو کر لاٹ صاحب کو وِش کیا۔جواباً لاٹ صاحب نے بھی
ٹوپ اتار کر سلام کا جواب دیا۔گاڑی ذرا آگے نکلی تو ایک اے۔ڈی۔سی نے کہا۔یو ایکسلنسی
آپ نے یہ کیا غضب کیا۔وہ عورت تو اس شہر کی مشہور طوائف ہے۔

" وائسرائے بہت بھنایا۔دوسرے روز غیر معمولی سرکاری گزٹ کی رو سے ممانعت کر
دی گئی جب تک وائسرائے یا گورنر پبلک میں خود کسی ہندوستانی کو مخاطب نہ کرے کوئی نیٹو
ان کو WISH نہیں کرسکتا۔اس بات پر اخباروں میں ایک سیاسی مباحثہ شروع ہوا۔ایک
انگریزی اخبار نے لکھا کہ کلکتہ کی طوائفیں عرصے سے ایک مسلہ بنی ہوئی ہیں۔۱۸۴۵ء میں کلکتے
کے اخباروں میں انگریز مراسلہ نگار شاکی رہتے تھے کہ اسٹرینڈ پر نیٹو ناچ گرلز بگھیوں پر ہوا
خوری کے لیے نکلتی ہیں ان کی ممانعت کی جاتے۔۔۔اور آج تک وہی حال ہے۔وغیرہ وغیرہ

" پھر بھی اس عہد کے لحاظ سے گوہر نے بہت عزّت حاصل کی تھی۔والیانِ ریاست
کے درباروں میں انکو کرسی ملتی تھی۔بڑی AWARE بیوی تھیں۔ان کے ڈرائنگ روم
میں طرح طرح کے اخبار رکھے رہتے تھے۔کلکتہ کے سرداؤد سیسُون کا عبرانی اخبار جو عربی
رسم الخط میں کلکتے کے بغدادی یہودیوں کے لیے چھپتا تھا وہ بھی پڑھتی تھیں۔کلکتہ کا فارسی
اخبار حبل المتین۔شہر کے ارمنی اور انگریزی اخبار سب میں نے انھیں پڑھتے دیکھا۔ان کے
یہاں سے میں انگریزی فلمی رسالے مانگ لایا کرتی تھی۔نیویارک کا مُووِیز ویکلی۔لندن کا
بائیسکوپ اور پکچر شو اور ڈرامہ۔انکا آخری جگ لو۔۔۔"

"یہ ایک افسانے کا عنوان ہوسکتا ہے۔آخری جگ نو۔۔۔"

"چُنّی لال۔سوداگر بچہ۔دیوالیہ ہوا تو زیور ساٹھ ہزار میں گروی رکھ کر اسکی مدد کی۔
وہ انکی ساری دولت اور جایداد ہڑپ کر گیا۔یعنی ایک اور کلاسیک پیٹرن۔نواب بائی
چالباز کے جھانسے میں آکر تباہ و برباد کلکتہ پہنچیں اسوقت گوہر جان کا ڈنکا بج رہا
۔چند سال بعد انکا وہی حشر ہوا۔مطلب یہ کہ بکوتب بھی گھاٹا۔خریدو تب بھی۔"

"کامل مساوات کی دعویدار نئی عورت کا رُوم میٹ جب غائب ہوتا ہے عموماً

خانہ داری کے بل وہی چکاتی ہے۔ اولاد بھی اسی کے ذمے۔ ملکہ ارمنی کو انگریز نے دھوکا دیا۔ انکی بیٹی گوہر کو ہندوستانی اور نواب بائی کو بلجین نے۔ ان تینوں میں اور باعزت، جدید ترین مغربی عورت کی سچویشن میں مجھے تو کوئی خاص فرق معلوم نہیں ہوتا۔ اخلاقیات کے محض پیمانے بدل گئے ہیں"۔

"اسی مولویانہ منطق کی وجہ سے یہاں عورتیں جائز آزادی حاصل نہیں کر پاتیں"۔

"جائز و ناجائز بھی اضافی اصطلاحات ہیں"۔

"جب حکومت نے چوکرٹی پر سواری کی ممانعت کی گوہر نے کلکتہ ہی چھوڑ دیا۔"

"اس زمانے کا کلکتہ نہایت FASCINATING رہا ہوگا"

"ایسا ویسا —" عندلیب بانو نے ایک آہ بھری۔ "شہر سے باہر امرا کے گارڈن ہاؤس۔ ویلزلی کے علاقے میں ان کے عالی شان مکانات۔ پارک اسٹریٹ پر نواب بہادر مرشد آباد کا محل۔ ٹالی گنج میں ٹیپو سلطان کی اولاد۔ بمبو والا میں نواب مظفر جنگ کی۔"

"امی سوشلسٹ ہیں" عنبر نے پھر چپکے سے منصور کے کان میں کہا۔

"شام کے وقت لوگ باگ اپنی اپنی بگھیوں اور موٹر کاروں میں ولایتی چکر کے چکر لگاتے۔ باغ کے وسط میں انگریزی بینڈ بجا کرتا۔ کلکتہ بڑا انٹرنیشنل قسم کا شہر تھا۔ چائنا ٹاؤن کے چینی۔ تھیٹر اسٹریٹ کے یہودی۔ کو لو ٹولہ اور ارمنی ٹولہ کے ارمنی۔ فری اسکول اسٹریٹ کے اینگلو انڈین — ان کی حسین لڑکیاں — یہ کچھ قانون قدرت ہے — کہ مخلوط النسل اولاد عموماً زیادہ حسین ہوتی ہے — زیادہ تر یہی یوریشین لڑکیاں ان دنوں خاموش فلموں کی ہیروئین ہوا کرتی تھیں۔

"وہ رڈولف ویلینٹنو کا دور تھا۔ ایک ہینڈسم پنجابی نوجوان ولایتی فلموں میں کام کر کے مشرق کا رڈولف ویلینٹو کہلانے لگا تھا۔ شیخ افتخار الرسول —"

"اے لیجئے۔ آپ نے پٹاری میں سے ایک اور گڈا نکالا!"

"یہ حضرت قانون پڑھنے ملتان سے لندن گئے تھے۔ بیرسٹر بننے کے بعد انگلش فلموں

ہں کام کرنے لگے۔ گارڈن آف اللہ۔ شیڈو آف دی حرم شہرزاد۔ سرپنٹ آف دی نائیل۔ میں نے یہ سب فلمیں یوجینی کے ساتھ جاکر دیکھیں۔ وہ رقاص بھی تھے۔ اودے شنکر سے برسوں پہلے انھوں نے بوڈاپسٹ، دی آنا وغیرہ میں ہندوستانی رقص پیش کئے۔ لیکن شوبزنس کی شہرت چند روزہ ہوتی ہے۔ آج کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔

"شاید ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ شیخ صاحب انگلستان میں ایک انڈین ٹاکی بنا رہے تھے۔ لالہ رخ۔ اس کے لیے یوجینی نے مجھ سے کہا۔"

"ارے پھر آپ کیوں نہ گئیں ؟"

"مما کی حراست! سترہ سالہ اور نابالغ! ایک دفعہ چندر نگر بھاگنے کا نتیجہ دیکھ چکی تھی۔ پھر بھی راتوں کو جاگ جاگ کر بہت منصوبے بناتے۔ بندرگاہ پہنچ کر جہاز پر چڑھ جاؤں۔ پھر طرح طرح کی خوفناک ممکنات کا خیال آتا۔ بردہ فروشوں کے ہاتھ پڑ گئی تو وہ مڈل ایسٹ میں اتار لیں گے یا شنگھائی پہنچا دیں گے ـــ اگلے سال رینی اسمتھ عرف سیتا دیوی ایک فلم ایکٹرس تھی وہ انگلستان گئی۔ مس بلبل اسی طرح تھیٹر میں سہیلیوں کے ناچ اور سو کو ناچاکیں یہی ذریعہ آمدنی تھا۔ دوسری اینگلو انڈین رقاصاؤں کی طرح ـــ مس بنسن، مس ڈورین عرف مس منجری وغیرہ ـــــ میرا نام بھی اشتہاروں میں چھپتا: مس اینڈی رینال عرف مس بلبل۔ جی چاہتا تھا کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لوں۔

"ذہنی فرار کا واحد راستہ بائیسکوپ تھا۔ اور وہ اداکار خالص رومانس۔ گریٹا گاربو۔ پولا نیگری۔ نورما ٹالمیج۔ کلارا بو۔ للین گش۔"

"اگر آپ مودی ایکٹرس بن جاتیں تو آپ کی زندگی کچھ مختلف ہوتی ؟"

"پتہ نہیں۔ مگر میں ہر قیمت پر مما کے چنگل سے آزاد ہو کر یوریشین ڈانسرز کے اس سرکٹ سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ انھیں دنوں غالباً ۱۹۳۰ء میں ایک اردو رسالے میں اشتہار دیکھا۔ اے۔ آر۔ کاردار کی طرف سے۔ انہوں نے ایک ٹاکی فلم کمپنی لاہور میں قائم کی تھی۔"

"اس اشتہار کے الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں ـــ

"تجربہ کار حسین اور چالاک ایکٹرسوں کی ضرورت
ناتجربہ کار لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ ایک سو سے پانچ سو ماہوار تک،
"میں نے فوراً درخواست بھیجی والدہ نے وہ خط پکڑ لیا اور مجھے خوب مارا۔
"انھیں دنوں ۱۹۳۰۔۳۱۔ میں سروجنی نائیڈو عطیہ فیضی کملا دیوی چٹوپادھیا وغیرہ اخبارات میں بیان دے رہی تھیں کہ شریف لڑکیوں کو فلموں میں کام کرنا چاہیئے میں تو شریف بھی نہ تھی مگر ماں کو یقین تھا ایک بار لاہور یا بمبئی گئی اور ان کی گرفت سے نکلی۔
"۱۹۲۸ء میں لاہور میں ایک فلم بن رہی تھی۔ اس کی کہانی علامہ اقبال نے لکھی تھی فلم کا نام افغان شہزادہ اناؤنس ہوا تھا۔ خواجہ حسن نظامی اس کے ڈائیلاگ رائیٹر تھے! کلکتے میں 'THE FATAL NIGHT' بن رہی تھی مکالمہ نویس مولانا ابوالکلام آزاد!"
"تو کیڈ نگ ——؟
"اور وہ خاموش فلم —— ڈارک اینجل۔ اسے تھیف ان بیراڈائیز۔ ڈیزرٹ برائیڈ۔ سیر ینیڈ۔ ڈون جواں۔ بولتی فلموں میں اپنا کرسٹی۔ برڈ ڈو سے میلڈی الوبااف دی ساؤتھ سینز۔ رایو ریٹا۔ ہندوستانی خاموش فلمیں: اندرا دیوی کی عربی دلیر —— سلوچنا کی انارکلی"
دفعتاً وہ ہنس پڑیں "گلوریا سوان سن۔ ویلما بنکی —— ایشیخ افتخار الرسول۔!!

WHERE ARE THE SNOWS OF YESTERYEAR? "

حسین بخش نے دروازے میں سے جھانکا۔
"اگلے تین چار روز میں میں تم کو باقی داستان بھی سنا دوں گی" کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولیں "میں نے تم سے کہا تھا۔ ہر بات صحیح، بلا کم و کاست ہونی چاہیئے۔"

لیکن ڈاکٹر منصور کاشغری کے ذہن میں ایک بات کھٹک رہی تھی۔
عنبر ڈاکٹر (مس) بیگ کہلاتی ہے تو عندلیب بانو نے کچھ دیر قبل اسے اتنے طنز سے "سید زادی" کہہ کر کیوں مخاطب کیا ——؟

(۱۹)

پھول والی گلی

"آج میں حسین بخش کو ساتھ لے کر چوک گئی تھی عنبر کے BIG BOX کے لئے چکن کی ساریاں وغیرہ خریدنے۔"

"بگ بوکس۔؟"

"HOPE CHEST"

"——؟"

"نہیں جانتے؟ مغرب میں لڑکیاں اپنے ٹروسو کے لیے جو چیزیں خرید خرید کر ایک صندوق میں جمع کرتی جاتی ہیں وہ ہوپ چیسٹ کہلاتا ہے۔ میں برسوں سے عنبر کے لئے۔"

"اوہ —"

"دکھلاؤں —؟"

دوسرے اتوار کو منصور ڈرائنگ روم میں بیٹھا مسز بیگ کی باقیماندہ رام کہانی سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھا۔ اب وہ یہ کہانی سننا اپنا اخلاقی فریضہ تصور کر رہا تھا۔

وہ فوراً اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئیں اور پلاسٹک کے بیگ لاکر دیوان پر پھیلا دیئے چکن کی ایک بیش قیمت ساری نکالی "دیکھو بیلی گارد میں جو بڑے میاں ملے تھے ان جیسے خستہ حال وثیقہ داروں اور دیوالیہ نوابوں کی بیویاں اور بیٹیاں یہ لاجواب چکن کاڑھتی ہیں۔ انتہائی معمولی اجرت پر—— دولتمند کاروباری سارا منافع خود وصول کرتے ہیں۔

"— ایک ایئر کنڈیشنڈ دوکان کی کھڑکی میں ایک بیحد بوڑھا لاغر سوزن کار آنکھ کے بالکل قریب لے جا کر چکن کاڑھنے میں منہمک تھا۔ میں نے سفید براق گدیلے پر براجمان سیٹھ سے پوچھا آپ ان بزرگ کے لئے عینک کیوں نہیں بنوا دیتے۔ اس نے بیفکری

سے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ بیگم صاحب۔ یہ پرانے چاول ہیں۔ عینک بغیر ہی کام چلا لیتے ہیں۔
مجھے اتنا غصہ آیا کچھ خریدے بنا اٹھ کر باہر آ گئی ——

"چاندی بازار میں آگے بڑھی۔ پھول والی گلی تک پہنچی۔ معاً وہ پچپن۵۵ برس قبل کا زمانہ آنکھوں میں پھر گیا۔ صاف ستھری گلیاں۔ دوکاندار، خریدار معطر۔ ہر دوکان سے خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔

"حسین بخش بھوتوں کے رکھوالے، گریک کورس کی طرح ساتھ ساتھ چل رہے تھے حضور وہ اس سامنے والے کوٹھے پر بتن رہتی تھیں۔ محرم میں انکا اپنا تعزیہ نکلتا تھا۔ بال کھولے ننگے پاؤں نوحہ پڑھتی ہوئی جاتی تھیں۔ ادھر جلی خورشید —— وہی جو کنکوے بازی کی استاد تھیں۔ مہ لقا اور زہرہ اس طرف رہتی تھیں۔ اور اللہ رکھی۔

"ادھر خواجہ عزیز لکھنوی کی محلسرا ہے —— ابا عزیز منزل میں بانو بیٹا کے دادا کے ہاں کھانا پکاتے تھے —— چلئے آپ کو بانو بیٹا سے ملوائیں۔ اللہ رکھی نے ذکر کیا تھا کہ وہ اس محلسرا کی شادیوں میں گا چکی تھیں۔ خاقانی ہند کی زندگی میں یہ خیابان شیراز سمجھی جاتی تھی لیکن میں تجاہل عارفانہ سے یہ سب سنا کی۔ اگر میں بے چارے حسین بخش کو بتلاتی تھی کہ پچپن۵۵ برس قبل میں خود اس پھول والی گلی میں ان گانے والیوں کی مہمان کی حیثیت سے آ چکی ہوں یقیناً بے چارے کا SHOCK کے مارے دم نکل جاتا۔"

"آپ رپن اسٹریٹ کلکتہ سے یہاں ——؟" منصور نے تعجب سے پوچھا۔

"ایسا ہوا کہ آنٹ گوہر تیو آلفریڈ کی چیف ایکٹرس تھیں۔ انھوں نے مجھے کورس گرلز میں بھرتی کر والیا تھا۔ کمپنی تماشا دکھانے لکھنؤ آئی۔ مجھے بھی آنا پڑا۔ مما ساتھ نہیں آئی تھیں مگر انکے بجائے گوتھر جان مجھ پر کڑی نگرانی رکھتی تھیں۔ کہیں بھاگ نہ جاؤں۔"

"اگر وہ اتنی باشعور خاتون تھیں وہ بھی کیوں چاہتی تھیں کہ آپ اس زندگی کو ترک نہ کریں؟"

"انکا کہنا تھا کہ اس ہندوستانی سوسائیٹی میں مجھے عزت نہ ملے گی۔ بعد کے تجربے سے ثابت ہوا کہ انکا قول غلط نہ تھا۔"

"مسز بیگ محض ہندوستانی سوسائیٹی ہی کیوں۔ ہر قدامت پرست سماج کے روّیے یکساں رہے ہیں۔ کِنگ ایڈورڈ کو تو محض ایک مطلقہ کی وجہ سے تخت چھوڑنا پڑا تھا۔ آج بھی کوئین ایلزبتھ کیا کسی ایکٹرس کو بہو بنالیں گی ؟"

"تم میں نے محسوس کیا ہے ESTABLISHMENT کے طرفدار ہو ــــ"

"ہرگز نہیں ــــ لیکن وہی عادت ہے۔ معاملات کو انکے صحیح تناظر میں ــــ"

"خیر۔ چوک کا قصہ سُنو۔ آج میں نے دیکھا کہ چوک کی رونق کا وہی سماں تھا صّرافوں کے ہاں چاندی کے ننھے مُنّے عَلَم اور نیچے اسی طرح بک رہے تھے۔ گل فروش بھی موجود تھے۔ اندر پیچدار گلیاں اسی طرح آباد تھیں۔ فرق محض یہ تھا کہ بالاخانوں سے طوائفیں غائب ہو چکی تھیں انکی جگہ عام عزّت دار شہری بسے ہوئے تھے۔ نیچے بازار میں بے پردہ ہندو مسلمان خواتین کے غول۔ جو خریداری کرتی پھر رہی تھیں۔ اُس وقت اس علاقے کے شرفاء کی بیگمات پردے سے منڈھی پالکیوں میں نکلا کرتی تھیں۔

"تحسینؔ کی مسجد کے نزدیک اصغر علی محمد علی کی حنا بلڈنگ نظر آئی۔ حسینؔ بخش فوراً بولے۔ حضور اس جگہ پر نوابچوا کا بڑا عالیشان مکان تھا۔ جو انھوں نے کسی نواب سے خریدا تھا۔ حضور وہ آپ کے کلکتے میں ایک گوہر جان ہوا کرتی تھیں۔ آغا میر کی ڈیوڑھی پر جن نواب صاحب کے ہاں ہمارے چچا ملازم تھے وہ بھی انکے بڑے قدر دان تھے۔ انکا ایک نام لیوا اب بھی زندہ ہے۔ قریب ہی ایک گلی میں رہتا ہے بُری حالت میں۔

"میں چونک پڑی۔ اور حسینؔ بخش کی قائل ہو گئی۔ واقعی شہر خبرو تھے۔

"پھر بولے چلیے آپ کو مرزا محمد عسکری کے مکان پر لے چلیں جہاں میر انشاء آن کر ٹھہرے تھے۔ مرزا محمد عسکری کی پہلی بہو ایک یوروپین لیڈی تھیں۔ وہ وارثی فقیر بن گئیں۔ مرزا صاحب مرحوم کے ایک پوتے یہاں بنک کے بڑے افسر ہیں۔

"چلیے آپ کو انکی والدہ اور بیگم سے ملوا دیں ــــ انکے ہاں ہمارے چھوٹے چچا کھانا پکاتے تھے۔ بادشاہ پسند دال انکی مشہور تھی۔

"میں نے کہا حسینؔ بخش میں ان تمام پرانے گھرانوں سے ملتی پھری جہاں آپ کے

بزرگوں نے فن طباخی کے جوہر دکھلائے تو یہیں سویرا ہو جائے گا۔ میں گوہر جان کے ایڈمائیرر سے ملنا چاہتی تھی۔ کہا چلیے ان بڑے میاں سے مل آئیں۔

" میری اس فرمائش پر انکو تعجب ہوا۔ کہاں جائیے گا اندر گلی کوچوں میں ——— میں نے فوراً بات بنائی کہ مجھے کلکتے کے لوگوں سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں کوئی کلکتے والا نہیں ملتا۔ بادل ناخواستہ ہمراہ چلے۔ پھول والی گلی سے نکل کر کوچہ میر انیس میں مُڑ گئے۔ کچھ دور جا کر ایک ڈیوڑھی پر ٹھٹھکے۔ اندر گئے پھر مجھے بلایا۔

" ڈیوڑھی میں ایک مفلوج و معذور بوڑھا کھاٹ پر پڑا تھا، چیتھڑوں میں لپٹا۔ حسین بخش نے چلا کر اس سے کہا یہ کلکتے کی بیگم صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔

" کلکتہ ——— میں نے بھی چلا کر کہا ——— جہاں گوہر جان رہتی تھیں۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا بولا۔ گوہر جان کیسی ہیں؟ خیریت سے ہیں؟

" میرا دل دُکھا۔ اس بے چارے کا خیال تھا وہ اب تک زندہ ہیں۔ میں نے جواب دیا ہاں خیریت سے ہیں آپ کو سلام کہلوایا ہے۔

" وعلیکم السلام۔ اس نے طمانینت سے جواب دیا۔ بڑی نیک دل بیوی ہیں۔ ہم جیسے غریبوں کو یاد رکھتی ہیں۔

" میں نے کہا آپ کلکتہ میں کب تک تھے؟ کہنے لگا بیگم صاحب میں گارڈن ریچ میں مستری تھا۔ گانا سننے کا بہت شوق تھا۔ گوہر جان کے ناٹک دیکھا کرتا تھا میری کیا حیثیت تھی کہ انکے گھر پہ جا کر گانا سنتا۔ بس ایک دفعہ ہمت کر کے پہنچ گیا تھا۔ انکے بیرے نے گول کمرے میں بٹھایا۔ لیمونیڈ کا گلاس لا کر دیا۔ بولا آج شام کو محفل ہے۔ تم بھی باہر بیٹھ کر سُن لینا۔ اس طرح بس ایک مرتبہ انکا گانا سُنا۔

" اب آپ یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ کہنے لگا۔ کیا کروں بیٹی کوئی ہے نہیں جو خیال رکھتی۔ بیٹا بہو ساتھ نہیں رکھتے۔ ان بچاروں نے اپنی ڈیوڑھی میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ دس روپیے انکو دے کر سیڑھیاں اتر آئی۔ میر انیس کے مکان کے سامنے گذری تو خیال آیا واہ

——دنیا کی بے ثباتی کی حقیقت تو انہیں نے پہچانی تھی——

"یہ آج صبح کا ذکر ہے۔ جب میں نے اس جہان رفتنی و گذشتنی میں آخری سانسیں لیتے، گوہر جان کے شاید آخری مداح کو دیکھا۔ لیکن میں بات کر رہی تھی اس زمانے کی جب میں یہاں نبو آلفریڈ کے ساتھ آئی تھی——

" رفاہ عام کلب کے سامنے میڈنز تھیٹر کا منڈوہ بنایا گیا تھا۔ اس کے اندر مٹی کا اونچا پلیٹ فارم چونی والوں کا درجہ کہلاتا تھا۔ شاید خوبصورت بلا دکھلایا گیا تھا۔ گوہر جان برسوں پہلے بندادین سے ناچ سیکھنے لکھنؤ آچکی تھیں۔ اُسی مرتبہ جب پیالہ پی کر ڈیرے دار بنی تھیں۔ اِس بار انھوں نے ایک کوٹھی کرائے پر لے رکھی تھی۔ شام کو ہوا خوری کے لئے ٹمٹم پر نکلتیں۔ بھیروجی روڈ جھاؤلال کے پل پر بندادین کا مکان تھا۔ جب فٹن سامنے سے گذرتی وہ اترتیں اپنے گرو کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیک کر آگے جاتیں۔ بندادین کے والد درگا پرشاد واجد علی شاہ کے استاد تھے۔ جب جانِ عالم میٹا برج گئے ہیں اسوقت بندادین شاید بارہ سال کے رہے ہوں گے۔ بچو ابھی انہیں کی شاگرد تھیں۔"

وہ گنگنانے لگیں "کون البیلے کی نار۔ جھما جھم پانی بھرے——"

کچھ دیر بعد پھر بات شروع کی "ایک روز آنٹ گوہر کے ساتھ ہوا خوری کیلئے چھاؤنی کی طرف گئی۔ راستے میں لوریٹو کانونٹ کا بورڈ نظر آیا۔ اسی کے سسٹر اسکول لوریٹو ہاؤس کلکتہ میں میں نے پڑھا تھا۔ حلق میں کوئی چیز سی آن اٹکی۔ میں اپنی بدقسمتی پر متحیر فٹن میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ ایک دن گوہر جان سیر کے لئے نکلیں تو لا مارٹینر گرلز اسکول راستے میں پڑا۔ نیلے یونی فارم پہنے سفید فام اور اکا دکا سانولی لڑکیاں بیفکری سے سبزے پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے آنسو ضبط کر کے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ سکندر باغ کا چکر لگا کر گاڑی چوک روانہ ہوگئی۔

" اُس روز چاندی بازار اور پھول والی گلی میں معمول سے زیادہ چہل پہل نظر آئی۔ اور خوبصورت چوپہلوں کے ریل پیل۔ وہ نوچندی جمعرات کا دن تھا۔ ہم لوگ اللہ رکھی کے

ہاں پہنچے۔ وہاں بھی بسنت کے میلے میں جانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔

"تب مجھے ایک بڑی خوفناک بات معلوم ہوئی۔ چوک کی نوچیوں کی ساری تعلیم و تربیت آج کے دن کے لئے کی جاتی تھی۔ یعنی ہر سال جو لڑکیاں گویا گریجویشن کر چکی ہوتیں انکو بسنت کے میلے میں گویا انکے کانووکیشن کے لئے لے جایا جاتا تھا۔ عہد سعادت علیخاں سے یہ رسم چلی آرہی تھی شیعہ طوائفیں چوپہیوں پر درگاہ حضرت عباسؑ کے میلے میں جاتیں۔ سُنّی درگاہ شاہ میناؒ صاحب کے میلے۔

"روسائے کرام چاندی بازار میں اپنے اپنے رستوگیوں کی دوکانوں پر آن کر بیٹھ جاتے "مہرے چوپہلے اٹھائے سامنے سے گذرتے۔ نوچیاں بڑی ادا سے انکو آداب تسلیم عرض کرتی نکل جاتیں۔ انکی نائیکاؤں کے میر شکار پہلے سے ان دکانوں میں موجود رہتے۔ جو لڑکی جس رئیس کو بھا جاتی وہ اپنا مصاحب خاص میلے کی طرف دوڑا دیتا اس موقعے پر یہ لوگ اپنی حویلیاں جائیدادیں رستوگیوں کے ہاں رہن رکھ دیتے تھے۔

"ہندو امیر زادے بھی چوپہلوں کی اس پریڈ کے ملاحظے کے لئے موجود رہتے۔ لیکن وہ ان اہل اسلام کے سامنے ٹِک نہیں پاتے تھے۔ اتنے احمق نہ تھے۔"

"جب میں میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ میں نے بھی یہ نظارے دیکھے ہیں"

مسز بیگ صوفے سے اٹھیں۔

"گوہر جان کیا ہوئیں؟" منصور نے انکے ساتھ ڈائیننگ روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

"بُرا حشر۔ وہ بے چاری ایک NYMPHO خاتون تھیں۔ آخری جگ لوچنی لال نے چونا لگا دیا ـــــ خوب لُوٹا کنگال ہوگئیں۔ شاید مہاراجہ بڑودہ نے ترس کھا کر اپنے ہاں بلوایا۔ چار پانچ سو ماہوار پنشن مقرر کر دی۔ سنا ہے بصارت بھی زائل ہوگئی تھی۔ جب مریں تو گمنام تھیں اور تنہا ـــــ انکی والدہ ملکہ جان بنارسی کا ایک شعر ہے ؎

وہ گورِ غریباں پہ آسکے تو بولے　　　یہ جنگل ہمارے بسائے ہوئے ہیں"

(۲۰)

نیک پروین

" بعمر سترہ سال کلکتہ کے ایک بڑے کاروباری امباپرشاد کی ملازمت میں مجھے
رپن اسٹریٹ سے ٹالی گنج منتقل ہونا پڑا ــــ تنخواہ ــ ہزار روپئے ماہوار۔ موٹر ۔بنگلہ۔
" عالمی کساد بازاری کا زمانہ ۔ امریکن کروڑپتیوں کی خودکشی کی خبریں چھپ رہی تھیں اس
وقت ۔ ہزار روپئے ماہانہ بہت بڑی رقم تھی ۔ ممانہال اور میرا غم و غصّے سے بُرا حال ۔
" لیکن امباپرشاد ایک معقول انسان ثابت ہوتے ۔ جس طرح کے قصّے ممارا جستھان والے
ٹھاکر مہیشور سنگھ کی نیکی کے سناتی تھیں ۔ امباپرشاد بھی اسی قسم کے وضعدار اور شریف آدمی
تھے ۔ ان پڑھ بیوی نیم پردے میں رہتی تھیں ۔ نہایت مذہبی اور چھوا چھُوت والی خاتون ۔ امباپرشاد
گوشت خور تھے ۔ ان کے برتن بھانڈے بھی الگ کر دیے تھے ۔ وہ اپنے گھر میں مہمانوں کی
طرح بسر کرتے لڑکے لڑکیاں جوان ہو چکے تھے ۔ سیٹھ جی جُوٹ کے کاروباری تھے ۔ لکھنؤ
کے کائستھ انکے داداجان عالم کے متوسلین میں شامل تھے ۔ بادشاہ کے ہمراہ کلکتے آئے تھے ۔
امباپرشاد بھی پرانی لکھنوی روایت کے بیحد مہذّب اور نفیس الطبع شاعر آدمی تھے ۔ احقر
تخلص کرتے تھے ۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ماہرِ فن مغنیہ یا رقّاصہ ان سے وابستہ رہتی تھی ۔ اب
ہفتے میں ایک دو بار وہ اپنے ٹالی گنج والے بنگلے پر آجایا کرتے ــــ پرانے لکھنوی ٹائپ
آدمی ۔ مگر مصر رہتے تھے کہ جب ان کے ساتھ باہر جاؤں ہمیشہ انگریزی لباس پہنوں ۔ تاکہ
وہ ایک بلونڈ چھوکری کے ساتھ ولایتی چکر" اور ریس کورس پر نظر آئیں ۔

" جس سال ٹالی گنج پہنچی ۔ انھیں رائے بہادر کا خطاب مل گیا مجھے بھاگوان
سمجھنے لگے اب وہ ٹرف کلب میں میرا تعارف باقاعدہ جونیر رانی کی حیثیت سے کرواتے

" مجھ پر ایک اور دُھن سوار ہوئی۔ کسی طرح کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کروں پھر ایف۔ اے۔ بی اے۔ مما اور امباپرشاد کی غلامی سے آزاد ہوکر اسکول پڑھاؤں۔ یہ خیال کبھی نہ آیا کہ بلبل دی ڈانسر کو اسکول کی ملازمت کہاں ملے گی ؟

" تعلیم سے میرا شدید شغف دیکھ کر امباپرشاد نے اخباروں میں ٹیوٹر کی ضرورت مشتہر کی۔ کئی نوجوان آئے۔ رائے بہادر نے انھیں ریجکٹ کردیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کا ایک گریجویٹ سیّد زادہ قابل اعتبار معلوم ہوا۔ چالیس روپئے ماہوار پر دو گھنٹہ روز انٹرنس کے امتحان کی تیاری کروانے کے لیئے مقرر کیا۔

" سیّد شکور حسین سنجیدہ۔ خوش قیافہ۔ مہذب۔ یعنی ایسا نوجوان جسے کوئی بھی مڈل کلاس شریف زادی برضا و رغبت بحیثیت خاوند قبول کر سکتی تھی۔ مگر میں نہ مڈل کلاس شریف زادی۔ نہ وہ میرا خواستگار۔ بات بنے تو کیسے۔

" بیٹے منصور۔ میرے منصوبوں میں بڑی ورائیٹی تھی۔ چندر نگر جاکر نن بن جاؤں۔ منصوبہ فیل۔ انگلستان جاکر لاآ رخ فلم میں ایکٹنگ کروں منصوبہ فیل۔ لاہور جاکر اے۔ آر۔ کاردار کی فلم کمپنی جوائن کروں۔ منصوبہ فیل۔

" اب تازہ ترین نہایت رومنٹیک اور آئیڈیلسٹک پلان یہ تھا کہ سیّد شکور حسین سے شادی کرکے پتی ورتا ہاؤس وائف بنوں وہ تلاش روزگار کے لیے کلکتہ آیا ہوا تھا والد مشرقی۔ یوپی کے کسی ضلع میں نائب تحصیل دار تھے۔ میں نے فوراً ایک مسلم مڈل کلاس گھرانے کا تصوّر کیا جس کا ایک اصول پرست نوجوان بطور قومی خدمت ستم رسیدہ نواب فاطمہ عرف نواب بیگم کی شامت زدہ لڑکی عندلیب بانو عرف بلبل دی ڈانسر کو معاشرے میں واپس لائے گا۔ وغیرہ۔

" پچھلی مرتبہ فرار کے موقعہ پر ورجن میری سے امداد طلب کی تھی۔

" یہ مسلم سماج کا معاملہ تھا۔ سوچا مما کے بزرگان دین کو ٹرائی کروں۔ چنانچہ یا علیؑ یا علیؑ کا ورد شروع کیا۔

" لیکن نہ ورجن میری پر اعتقاد تھا نہ مما کے مذہب پر۔

"اب پڑھنے میں جی نہ لگتا۔ صبح سے شام تک سوچا کرتی ماسٹر صاحب سے کسطرح کہوں۔ جو ہوم ورک وہ دیں وہ نہ کروں۔ ایک روز انھوں نے جھنجھلا کر کہا رانی صاحب۔ رائے بہادر صاحب نے فرمایا تھا آپکو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یہ غالباً انکی خوش فہمی تھی۔ لیکن آپ نے دل لگا کر نہ پڑھا تو انکو کیا جواب دوں گا وہ سمجھیں گے پڑھانے کے بجائے بیٹھا آپ سے باتیں کرتا ہوں۔ مجھے برطرف کر دیں گے۔ یہی چالیس روپئے میری کلّہم آمدنی ہے۔

" ایک روز خوش خوش آئے۔ بولے۔ مجھے رائٹرز بلڈنگ میں کلرکی مل گئی ہے۔ ستّر روپئے ماہوار۔ ڈیپارٹمنٹل امتحان کے ذریعے ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ میں رائے بہادر صاحب سے عرض کروں گا۔ صبح کے بجائے شام کے وقت آجایا کروں۔

" میں نے فوراً ایک اور پلان بنایا۔ ہاں اب وہ بولشویزم وغیرہ دماغ میں بھر چکی تھی۔ انٹرنس پاس کر کے میں بھی ملازمت کروں گی۔ شادی کے بعد دونوں کامریڈ مل کر ایک نئے ہندوستان کی تشکیل میں حصّہ لیں گے۔ جنگ آزادی میں شامل ہونگے۔

" بولشویزم کی وجہ سے پرانے PRO-BRITISH خیالات اور اپنے نصف یوروپین خون پر ناز کرنے کا روّیہ بھی زائل ہو رہا تھا۔ میری اس نئی کایا پلٹ کا ذمہ دار ایک انقلابی بنگالی آرٹسٹ پردیپ مکرجی تھا۔ رائے بہادر صاحب نے میرا مصوّری کا شوق دیکھ کر چند ماہ سے اسے بھی لگالیا تھا۔ تیسرے پہر کو وہ آکر پینٹنگ سکھاتا۔"

"چندر نگر کا نونٹ جانے کا خیال آپکو کبھی نہ آیا؟ بالغ ہونے کے بعد؟"

"نہیں۔ بڑی عجیب بات ہے۔ میں رائے بہادر کے فلیٹ سے بھاگ کر یا انکو بتا کر کسی روز بھی چندر نگر جا سکتی تھی۔ اگر میں ان سے کہتی کہ میں اس قسم کی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تو وہ اتنے شریف تھے خلاف مرضی ہرگز نہ روکتے — یوریشین طبقے کو بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ میں اینگلو انڈین ایسوسی ایشن کو بھی CONTACT کر سکتی تھی۔ آسان ترین بات یہ تھی کہ برٹش انڈیا سے بھاگ کر چندر نگر پہنچ جاتی۔

کانونٹ والے مما کے چنگل سے بچانے کے لیے بلجیم روانہ کر دیتے میرا آبائی وطن"۔

" آپ کا آبائی وطن دراصل مغلوں کی دلیؔ تھی"۔ منصور نے کہا۔ "موسیو رینال آپ کے لیے محض ایک نام تھے ایک تصویر جو آپ کی سنگھار میز پر رکھی رہتی تھی۔ اپنی والدہ — نواب فاطمہ سے جدا کر دی جاتیں۔ موسیو رینال آپکو اپنے ہمراہ بلجیم لے جاتے جہاں برسلز میں آپ کی پرورش آپکی بلجین دادی اور پھوپھیوں نے کی ہوتی تو آپ ایک رومن کیتھولک بلجین لڑکی ہوتیں۔ جس کے لیے ہندوستان اور اردو زبان اور کتھک ناچ بے معنی تھے"۔

" درست"۔ عندلیب بانو نے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اور میں فرانس یا بلجیم کے کسی چرچ میں جا کر عبادت کرتی اور پٹی بورژوا ہاؤس وائیف ہوتی۔

" لیکن بھیّا اگر حالات بدستور ناساز گار رہتے تو مجھے وہاں بھی برسلز یا پیرس یا لندن یا برلن میں اسٹریٹ واکر ہی بننا پڑتا۔

" زندگی کی گاڑی اندھا دھند پٹریاں بدلتی ہے۔ کوئی اس کا انجن ڈرائیور نہیں ہے۔ سب معاملہ اندھا دھند ہے۔

" شکور حسین صاحب اب شام کے پانچ سے سات تک پڑھانے لگے۔ تیسرے پہر کو چار سے پانچ پردیپ مکرجی کے ٹیوشن کا وقت تھا۔ مگر اس ایک گھنٹے میں وہ واٹر کلر پینٹنگ کم سکھاتا۔ بھاشن زیادہ دیتا۔ وہ کہتا۔ تم CAPITALIST سوسائیٹی کا VICTIM ہے۔ تم کو ایک پونجی پتی EXPLOIT کر رہا ہے۔ تمکو اپنی شکتی کے بل پر سماج کو بدلنا ہوگا۔

" میں نے اس کو اپنا ہمراز بنایا۔ شکور صاحب!

" TYPICAL بنگالی رومان پرست نوجوان — آنکھوں میں چمک آ گئی۔ بولا بلبل — ڈرتا کیوں ہے؟ ہمّت کر کے آج ہی اس کو بول دو۔ کل ہم تم سے پوچھے گا تم اسکو کیا بولا۔

" دوسری شام جب ماسٹر صاحب وارد ہوئے تو اس سے پہلے کہ میں پردیپ کی رٹائی

ہوئی تقریر سماج کے مظالم کے بارے میں شروع کروں انھوں نے کہا آج کیٹس کی نظم پڑھانی ہے۔ بہت مشکل نظم ہے۔

" کون سی والی ؟ میں نے پوچھا۔

" ODE TO BULBUL JAN ۔ انھوں نے ہنس کر جواب دیا۔

" مجھے ان کی بات بہت کھلی اور میں دفعتاً رو پڑی۔ میری بھلا کیا عزت تھی ان کی نظروں میں۔ مگر پردیپ مکرجی نے کہا تھا۔ شکور حسین OLD MORALITY کا پٹی بورژوا آدمی ہے ـــــ پہلے اس کو ایجوکیٹ کرنا پڑے گا۔

" ماسٹر صاحب بہت گھبرائے۔ رائے بہادر کی دولت و اقتدار سے بہت مرعوب تھے۔ اس وجہ سے مجھ سے نہایت شائستگی سے پیش آتے تھے۔ اس وقت ذرا بے تکلف ہو گئے تھے۔ میں نے کتاب کھولی۔ بولے۔ ہم پندرہ دن کی رخصت پر گھر جا رہے ہیں۔ رائے بہادر صاحب سے بھی اجازت لے لی ہے۔

" کہاں کا قصد ہے ؟ میں نے پوچھا۔

" وطن۔ جب سے سرکاری نوکری ملی ہے والدین مصر ہیں کہ شادی کر لیں۔ ہمیں کلکتہ شہر میں خورد و نوش کی بہت تکلیف ہے۔ بیوی آ جائے گی تو کھانا چائے ڈھنگ کا ملے گا۔

" پھر پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مگر یہ بھی خیال آیا کہ بیوی ان کے لیے بھی باورچن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ٹپیکل LOWER MIDDLE CLASS رویّہ۔"

" ایل۔ ایم۔ سی " منصور نے لقمہ دیا۔

" رائیٹ۔ ایل۔ ایم۔ سی۔ ای۔ یو۔ پی۔ ایم۔"

منصور ہنس پڑا " آپ نے تو مجھے بھی مات کر دیا۔ مطلب ؟ "

" لوور مڈل کلاس ایسٹرن یو پی مسلم ـــــ ! اچھا مگر پردیپ مکرجی کہہ گیا تھا کہ ہمیں شکور حسین جیسے لوگوں ہی کی تربیت کرنی ہے ـــــ "

" خود مکرجی کے متعلق آپ کی کیا رائے تھی۔ ؟ وہ تو مجھے شکور حسین سے کہیں زیادہ معقول معلوم ہو رہا ہے ـــــ "

" تھا۔ بے حد معقول۔ مگر وہ 1920's کا تربیت یافتہ کمیونسٹ تھا۔ اس زمانہ
کے رُوس کی گلاس آف واٹر تھیوری کا مداح۔ لیکن میں خواہ شکور حسین ہی سہی سیکیور
چاہتی تھی اور زندگی گزارنے کا SOCIAL SANCTION
" احترام اور سماجی اجازت کی شدید آرزو اس لیے تھی کہ آنکھ ایک بے عزّت ماحول
میں کھولی تھی۔ یہ احساس اب تک ہے۔
" قصہ کوتاہ۔ ماسٹر صاحب کی متوقع شادی کی اطلاع سے میں برق زدہ سی رہ گئی
والدہ کی طرح پلک منتی نہیں تھی لیکن اس وقت دوبارہ رو پڑی۔ سسکیاں بھرتے ہوئے
التجا کی ماسٹر صاحب۔ مجھے یہاں سے نکال لے جائیں۔ میں آپکے لیے بڑا اچھا کھانا پکایا کروں
گی۔ بالکل آپ کی نوکرانی بن کر رہوں گی۔ بالکل نوکرانی۔ مجھ سے شادی کر لیجئے۔
اب ماسٹر صاحب ہونقّوں کی طرح میرا منہ تکنے لگے۔ مجھے بھی احساس ہوا کہ کیا کہہ رہی ہوں
لیکن میں نے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی ــــ بس مجھے یہاں سے نکال لے جائیے۔ بے شمار
بائیسکوپ دیکھے تھے اور نیو الفریڈ کے ناٹکوں کی ریہرسلیں ان کا اثر تھا یا کیا کہ مجھ جیسی میم صاحبہ
اور یہ واہیات اور تھیٹریکل پوز اور ڈائیلاگ۔
" اس زمانے میں ایک گرامو فون ریکارڈ نہایت مقبول تھا۔ بلبل نا شاد نے کچھ اس طرح
فریاد کی"۔ تو ماسٹر صاحب تو گم صم بیٹھے رہ گئے۔ نہ وہ مجھ پر عاشق تھے نہ اس قسم کی میلو
ڈریمٹک عرضداشت کے متوقع۔ اور امبا پرشاد جیسے مقتدر آدمی کی منظورِ نظر کو بھگا لے جانا
ہنسی کھیل نہ تھا۔ عاشق ہوتے تو دوسری بات تھی۔ سر پہ کفن باندھ کر اڑا لے جاتے۔ سوچتے
ہوں گے بڑے پھنسے۔
" سرمایہ دار سماج کی بے انصافی اور مظالم کے متعلق جو نکتے پردیپ نے ذہن نشین کرائے
تھے سب بھول گئی۔ ماسٹر صاحب کے سامنے نہایت خجل، قابلِ رحم افسوس ناک حالت
میں بیٹھی آنسو بہایا کی۔ اس وقت خیال آیا۔ پردیپ کو روک لیا ہوتا وہی میری طرف سے
بات کر لیتا۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی ــــ چلو بھئی اب باقی کل" عندلیب بانو نے
گھڑی دیکھی" ذرا ماتا بدل کی دوکان پر ہو آؤں۔ امین آباد ـــ"

" کلائیمکس پر پہنچ کر پرانے داستان گو بھی یہی تکنیک استعمال کرتے تھے"۔ منصور نے الجھ کر کہا۔ عنبریں اپنا بیگ اٹھائے کمرے میں آئی۔ عندلیب بانو دوسرے دروازے سے باہر گئیں۔ عنبریں نے کہا" باقی میں سنادوں گی۔ مختصر کرکے۔ ورنہ امی تو یہ الف لیلہ جانے کب تک جاری رکھیں گی۔ نہ معلوم کیوں تمکو یہ ہیر قسطیر سنانے پر تلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنے یا نانی اماں کے بارے میں آج تک کسی کو ایک لفظ نہیں بتایا۔ نہ اسکی ضرورت ہے۔ یہاں وہ زیادہ تر لوگوں سے بات ہی نہیں کرتیں چہ جائیکہ انھیں آتم کتھا سنائیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ ستری بہتری رہی ہیں"

عندلیب بانو شاپنگ بیگ سنبھالے باہر جانے کے لیے کمرے سے گزریں۔ تلخی سے بولیں۔ میں یہ کتھا ڈاکٹر منصور کو اس لیے سنارہی ہوں کہ یہ صاحبزادے تم میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان کو تمہارے متعلق پوری جانکاری ہونی چاہیئے"

" امی جان ـــــ" عنبریں نے نرمی سے کہا۔" سیّد شکور حسین کو آپ کے متعلق پوری جانکاری تھی۔ پھر کیا ہوا ـــــ؟ کوئی فرق پڑا ـــــ؟"

عندلیب بانو کار میں بیٹھ اور پھاٹک سے باہر نکل گئیں۔

منصور نے سگریٹ جلایا۔ دریچے کے سامنے چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ باغ میں سے رام سروپ اور رم کلیا کی تکرار کی آواز آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد عنبریں نے کہا" کوفت ہو رہی ہے اب آگے کے واقعات کیسے سناؤں"

" سُنا کر ختم کرو"

" اچھا" اس نے ایک گہری سانس لیکر کہنا شروع کیا" قصہ مختصر۔ سیّد شکور حسین کو ترس آگیا۔ فلومینا کہا کرتی تھی اینڈ ٹس بابا اس وقت ہیرے کا پورا سیٹ پہنے ہوئے تھیں۔ اس سیٹ نے ماسٹر صاحب کو آمادہ کیا۔ میرا خیال ہے یہ فلو کی زیادتی تھی۔ بہرحال چند روز بعد موقع محل دیکھ کر ماسٹر صاحب نے خود امبا پرشاد سے بات کی۔ ان جیسی درجنوں ناچ گرلز بلکہ

سٹو فیصدی فرنگی خون والیاں آپ کو مل جائیں گی۔ مس بلبل اس طرز زندگی کو ترک کرنا چاہتی ہیں۔ آپکے بلبل خانے سے رہائی کی آرزو مند ہیں۔

" امبا پرشاد نے پوچھا۔ میرے ہاں آنے سے قبل انھوں نے اس طرز زندگی کو کیوں نہ ترک کیا؟ سیّد صاحب نے کہا۔ اس وقت ان کو موقع نہ ملا تھا۔ کم عمر تھیں اور ماں سے ڈرتی تھیں۔

" سیّد شکور حسین اس وقت کچھ خدمت اسلام بھی کرنا چاہ رہے تھے۔ یعنی ایک مسلمان لڑکی کو ہندو کی ملازمت سے علیحدہ کر کے اس سے نکاح کرنے میں ثواب دارین مضمر تھا لیکن بعد میں وہ چڑیل فلومینا ہمیشہ وہی بات رٹے جاتی تھی۔

" خیر تو امبا پرشاد خلاف امید راضی ہو گئے۔ نیک سرشت آدمی تھے۔ بولے۔ ٹھیک ہے۔ لے جاؤ۔ اِن سے کہا اگر تمہارا یہ گرہستی کا تجربہ کامیاب ثابت نہ ہو تو واپس آجانا۔ یہ بنگلہ تمہارے لیے مقفّل رہے گا۔ انھوں نے جواب دیا۔ اب میں کبھی واپس نہ آؤں گی۔

" اچھّا نواب بیگم کو ہوا نہیں لگنے دی۔ بے چارے امبا پرشاد بھی اس سازش میں شریک ہو گئے۔ ان ہی کی موٹر میں عندلیب بانو بیگم سیّد شکور حسین کے ساتھ ناخدا مسجد پہنچیں۔ برائے عقد۔ جانے سے قبل وہ سارا زیور جو امبا پرشاد نے انکو دیا تھا واپس کرنا چاہا۔ انھوں نے کہا گدھے پن کی باتیں مت کرو۔ ہم دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے۔ بالکل یہی بات ٹھا کر مہیشور سنگھ نواب بیگم سے کہتے اگر وہ ان کے زیور واپس کرنا چاہتیں۔"

" اگلے وقتوں کے لوگ!"

" ہاں مگر سیّد شکور حسین نے بھی عندلیب بانو سے کہا وہ ان کا ایک پیسہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ ان کے گھر پہنچتے ہی انھوں نے وہ ہیرے کا سیٹ اتار دیا۔ معمولی سوتی ساری پہن کر آغا حشر کی نیک پروین بن گئیں۔ ان کا باقی زیور بنک میں محفوظ تھا۔

" اب کو ٹولہ کے اس تنگ و تاریک مکان میں محصور ہو کر چولہا جھونکنے میں مصروف ہوئیں۔ شروع کے چند روز یہ نئی گھریلو زندگی بہت رومینٹک لگی مگر کھانا کبھی پکایا نہیں تھا۔ برتن مانجھتے مانجھتے ہاتھ برباد ہو گئے۔ کبھی سالن جل جاتا کبھی چپاتیاں۔ خاوند ناک بھوں چڑھانے لگے۔ خود بہت جلد عاجز آگئیں۔

"نواب بیگم کو جب معلوم ہوا کہ ان کی لڑکی بھاگ گئی۔ انھوں نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ عاق کر دوں گی۔ ساری دولت یتیم خانے کو دے جاؤں گی۔ فلومینا ہر اتوار کو کولوٹولہ آیا کرتی تھی۔ وہ سب قصے سناتی۔"

"پردیپ مکرجی سے کبھی ملاقات ہوئی؟"

"توبہ کرو سخت پردہ۔"

"شکور حسین کا برتاؤ کیسا تھا؟"

"بہت خراب۔ شروع شروع میں ٹھیک رہے۔ پھر اٹھتے بیٹھتے طعنے بازاری عورت میرے گلے پڑ گئی۔ عذاب جان ہو گئی۔ وغیرہ۔ بیوی خاموش۔ وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکی تھیں۔ ٹھیک چھ مہینے بعد شکور صاحب اسی لڑکی کو جس سے ان کی نسبت طے ہوئی تھی۔ وطن جاکر بیاہ لاتے۔ امّی بتاتی ہیں وہ کپڑے دھو کر صحن کی الگنی پر پھیلا رہی تھیں۔ شوہر یہ کہکر گئے تھے کہ والدین سے ملنے جا رہے ہیں۔ باہر گھوڑا گاڑی آکر رکی۔ یہ خوش ہوئیں کہ آ گئے۔ وہ حضرت ایک برقعہ پوش کو لیکر اترے۔ اندر آکر کہا لو بھئی یہ تمہاری بہن ہیں۔ ہماری نئی بی بی۔ دونوں مل جل کر رہو۔ اگر ایک نے بھی چیں پٹاخ کی تو دونوں کو کان پکڑ کر گھر سے نکال دوں گا۔"

"اللہ اکبر۔ یہ تو پرانے اصلاحی ناولوں والا نقشہ معلوم ہو رہا ہے! یہ کب کی بات ہے؟"

"۱۹۳۴ء! لیکن منصور بہت سے سماجی رویئے اب تک کہاں بدلے ہیں؟

"ابھی آپ کا نزول اجلال نہیں ہوا۔"

"بتاتی ہوں۔ یُوپی سے آئی ہوئی سوتن نے حسب توقع امّی کا ناک میں دم کر دیا۔ لڑائی جھگڑے۔ شوہر سے شکایتیں۔ امّی صبح کو سو کر اٹھتیں تو انکے تکیے کے نیچے سے تعویز اور پُڑیاں نکلتیں۔ ایک دن پلنگ سرکایا تو ایک پائے کے تلے سے ایک پُتلا برآمد ہوا جس میں سُوئیاں چُبھی ہوئی تھیں۔ امّی اس الابلا کو کوڑے کے ٹین میں پھینکتی رہیں "سوت محلّے کی ایک بڑھیا کے ذریعے ٹونے ٹوٹکے کروا رہی تھی۔ اب امّی کو یہ

فکر ہو گئی وہ لڑکی اسی جہالت میں کچھ عرصے بعد کوئی زہر وہر کھلا کر انکے متوقع بچے کا کام نہ تمام کر دے۔

" فلومینا ہر ہفتے پابندی کے ساتھ امّی سے ملنے آیا کرتی تھی۔ متوقع ولادت کی اطلاع نواب بیگم کو دے چکی تھی۔ سیّد صاحب نے بیوی کو زنانہ ڈفرن ہسپتال کے جنرل میٹرنٹی وارڈ میں داخل کر دیا۔ وہیں مَیں پیدا ہوئی۔ فلومینا عزیب موجود تھی۔ اس نے فوراً اسٹرز بلڈنگ جاکر ابّا کو اطلاع دی پھر آکر امّی کو بتلایا کہ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بولے۔ لاحول ولا قوۃ ۔ لڑکا ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ کچھ عیب چھُپ جاتا کنجی کی جنی سے کون شادی کرے گا۔

" مجھے دیکھنے بھی نہیں آئے۔ نواب بیگم بھی نہیں آئیں۔ فلومینا نے امّی سے کہا۔ اینڈی بابا ہم ہاتھ جوڑتا ہے۔ ضد چھوڑو۔ بائی کے گھر چلی چلو۔ اسپتال سے سیدھی رپن اسٹریٹ چلو آج ہی۔ امّی نے کہا۔ نہیں میں نے جان بوجھ کر گرہستن کی زندگی اختیار کی تھی۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ ایک عام ہندوستانی عورت کی گھریلو زندگی BED OF ROSES نہیں — بس کم و بیش کا فرق ہوتا ہے۔ اور اگر شوہر کی آمدنی کم ہو اور وہ بدمزاج بھی ہو اور بیوی کو وہ سماجی HANDICAP حاصل ہو جو میرا ہے اور شوہر سوَت بھی لا چکا ہو۔ تو سبحان اللہ۔ آلام و مصائب کا نسخہ مکمل ہے MY CUP BRIMMETH OVER

" بہتر حالات کی توقع ہی نہیں کرنی چاہیئے۔

" دراصل امّی بیحد خود دار تھیں۔ اور اپنے کیے کو نباہ رہی تھیں۔

" چند روز بعد وہ گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر ڈفرن ہسپتال سے خود ہی گھر آگئیں۔ شوہر ایک بار بھی ہسپتال نہیں گئے۔ اب وہ مجھے بھی پالتیں اور کھانا بھی پکاتیں۔ سوتن دن بھر پلنگ پر چڑھی گراموفون سنا کرتی۔ یا ان پر حکم چلاتی۔ طرح طرح سے ذلیل کرتی۔ امّی شاید اذیت پسند ہو گئی تھیں۔ ساری تکلیفیں چُپ چاپ برداشت کرتی رہیں۔

" انکو صرف ایک ہی شوق تھا سینما۔ ایک اسکول ٹیچر پڑوسن مسز گھوش سے

دوستی ہوگئی تھی۔اس کے ساتھ شوہر کی اجازت سے کبھی کبھار پکچر دیکھ آتیں۔میٹنی شو تاکہ وقت پر لوٹ کر کھانا تیار کر سکیں۔

" میری ولادت کے بعد سے نہیں جا پائی تھیں میں شاید چھ سات مہینے کی ہو چکی تھی۔جب ایک روز فلومینا نے آتے کے ساتھ ہی چپکے سے کہا۔اینڈی بابا۔گل حمید کا نیا پکچر آیا ہے۔باغی سپاہی۔اس میں اپنا اینیٹ میم صاحب بھی ہے۔آزوری کر کے۔ہم ایمبر بابا کو سنبھال لے گا۔تم گھوش میم صاحب کے ساتھ پکچر دیکھ آؤ۔تمہارے کو تھوڑا BREAK مانگتا ——

"بائی دی وے —— میرا نام عنبریں رائے بہادر امبا پرشاد ہی نے رکھا تھا۔فلومینا نے انکو ہسپتال سے ٹیلی فون کر دیا تھا۔انھوں نے فوراً یہ نام تجویز کیا۔بڑے لٹریری آدمی تھے۔بے چارے فلومینا نے اس کو AMBER کر دیا تھا۔

" شکور صاحب نے اس نام پر کوئی رائے نہیں دی ؟ " منصور نے پوچھا۔

" وہ قطعی بے نیاز تھے —— خیر تو اب بے چاری امی نے کہا۔میں ماسٹر صاحب سے پوچھے بغیر کیسے جا سکتی ہوں۔وہ اب تک انکو ماسٹر صاحب کہتی تھیں۔فلومینا غصّے سے بولی۔اینڈی بابا۔اب تھوڑا ہمّت سے کام لو۔تم بھی تھوڑا باغی سپاہی بن جاؤ ورنہ یہ لوگ تمہارا دم گھونٹ کر مار ڈالے گا۔

" امی بھی اب تک اس قدر عاجز آ چکی تھیں کہ شوہر کی بغیر اجازت سینما جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔سوت اس وقت محلّے کی جادو ٹونے والی بڑھیا سے کھُسر پسُر میں مشغول تھی۔فلومینا بھاگی بھاگی پڑوسن مسز گھوش کے ہاں گئی۔

" انھوں نے کہا۔ہم باغی سپاہی دو ٹائم دیکھ آیا ہے۔بے بی کو ہم رکھ لے گا تم اپنی میم صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔

" ابّا اس وقت آفس سے نہیں لوٹے تھے۔

" رات کے ساڑھے نو بجے امیؔ اور فلومینا سینما ہال سے نکلیں۔ امیؔ نے نقاب بھی الٹ رکھی تھی۔ اتفاق سے بھیڑ میں امبا پرشاد کا ڈرائیور نظر آ گیا۔ وہ انکی کار لیکر کہیں جا رہا تھا — روک کر امیؔ سے کہا چلیے آپکو گھر چھوڑ آؤں۔

" چنانچہ امیؔ اور فلومینا امبا پرشاد کی کرسلر میں سوار ہو کر گھر پہنچیں۔ امیؔ نے ڈرائیور سے کہا کار گلی سے باہر ہی روک لے۔

" عین اس وقت ابّا آ گئے۔

" شاید کھانا کھا کر سگریٹ خریدنے نکلے تھے۔ پنواڑی کی دوکان کی طرف سے آ رہے تبھی انھوں نے امیؔ اور فلومینا کو گھر سے دُور امبا پرشاد کی کار سے اترتے دیکھا۔

" اب گلی میں آگے آگے امیؔ اور فلومینا، دم بخود۔ پیچھے پیچھے ابّا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی قیامت برپا کر دی۔ گالیاں۔ تھپڑ۔ گھونسے۔ لات۔ اس کُٹنی فلومینا اس دلاّلہ کے ساتھ امبا پرشاد کے ہاں جانے کا سلسلہ کب سے جاری ہے —؟ پھر ایک تھپڑ —— میں تمہیں اسی وقت طلاق دیتا ہوں۔ جہنم رسیدؔ ہو —— پھر ایک گھونسہ۔ فلومینا نے امیؔ کو بچایا اور کس کر ایک جھانپڑ موصوف کے رخسار پر رسید کیا۔ وہ چکرا گئے۔ فلومینا اب کوکنی اور پرتگالی میں گالیاں دیتی ماسٹر صاحب پر پل پڑی۔ نہایت مضبوط، لحیم شحیم دیونی سی عورت۔ ابّا دھان پان۔ پلنگ پر گر کر بازوؤں سے چہرہ بچایا۔ دوسری بیوی نے چیخ پکار مچائی۔ اینڈی بابا اپنا سامان باندھو۔ فلومینا نے امیؔ کو حکم دیا اور ان کی سوتن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک دھپ اسے لگائی۔ گالیاں انگ۔ بلڈی ڈومن۔ ہمارا بچہ لوگ کو جان سے مارنے کے لیے جادو کی پڑیا منگاتا تھا۔ ہم پولیس میں رپٹ لکھا دے گا مائوم —— امیؔ نے ہاتھ جوڑے کہ اب بس کرے اور باہر جا کر گاڑی لاتے۔

" ابّا فلومینا کے زد و کوب سے حواس باختہ بیٹھے تھے۔ امیؔ نے اب ان کی پرواہ نہیں کی۔ وہ غصےؔ سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ پولیس کے نام پر انکی دوسری بیوی

جواب انکی واحد بیوی تھی، سہم کر دوسرے کمرے میں جا گھسی۔

"امیّ کو کھٹ سے طلاق مل چکی تھی لہذا انھوں نے اپنی چوٹوں کی پرواہ بھی نہیں کی جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹنے لگیں۔ سید صاحب چُپ بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے۔

"امیّ بتلاتی ہیں کہ جب ابّا طلاق طلاق طلاق دہاڑے فلومینا خوشی کے آنسو بہانے لگی۔ امیّ بھی کِھل اٹھیں۔ مگر فوراً ہی ابّا نے امیّ کی ٹھُکائی شروع کر دی۔

"بہرحال اب تو امیّ چھٹکارا پا چکی تھیں۔"

"محض یہ ایک موقع تھا جب حنفی اسٹائل طلاق نہایت کارآمد اور برمحل ثابت ہوئی۔" منصور نے بے اختیار ہنستے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

"ہاں اور وہ خوش خوش پیکنگ میں مصروف تھیں۔ اس دوران میں مسز گھوش چیخ پکار سنکر صحن کی دیوار پر سے جھانک رہی تھیں۔ انھیں دیکھ کر امیّ کو اچانک میں یاد آئی بھاگی بھاگی فوراً پڑوسن کے گھر پہنچیں۔ جاتے جاتے اپنا برقعہ گلی میں پھینکتی گئیں۔ مسز گھوش کے گھر سے میری ٹوکری اٹھائی۔ فلومینا گاڑی پر آتی نظر آئی۔ امیّ کہہ رہی تھیں بالکل کوئین وکٹوریہ کی طرح بڑے فاتحانہ انداز سے کوچ میں بیٹھی تھی۔

"چند ماہ قبل شکور صاحب نے اپنی دوسری بیوی کے چند معمولی سے زیور اور امیّ کا بیحد قیمتی ہیروں کا سیٹ صندوقچے میں رکھ کے اپنی ذاتی الماری میں مقفّل کر دیا تھا جب یہ لوگ گاڑی میں سوار ہو کر کولوٹولہ سے نکلیں رپن اسٹریٹ کے راستے میں فلومینا کو اچانک وہ ہیرے یاد آئے۔

"امیّ نے کہا لعنت بھیجو۔ DAMN HER — DAMN THEM

"فلومینا نے دہرایا۔ DAMN HER بٹ یہ ڈائمنڈ اس جادوگرنی BITCH کی قسمت کا تھا۔ — BLOODY BITCH

"امیّ نے جواب دیا۔ GOD BLESS THE BITCH

"بٹ اینڈی بابا اس کا جادو ٹونا پکا تھا۔ تم کو گھر سے نکال دیا۔

" امیّ خوب ہنسیں۔ بولیں فلو مینا۔ DON'T TALK NONSENSE

" وہ بولی اوہ نو اینڈی بابا۔ جے پور میں گجرا بائی کا چھوکری لوگ بائی کے خلاف کام کروایا دیکھو بائی پر کتنی مصیبت پڑی گھر سے بے گھر ہوا۔ حویلی ہاتھ سے گئی۔ منہ چھپا کر جے پور سے بھاگا۔ صاحب دھوکہ دے کر بھاگ گیا۔ کلکتہ آ کر ہماؤں کو کتنا مشکل ٹائم دیکھنا پڑا۔ بابا۔ یہ ورلڈ ایک بھیانک جنگل ہے۔ اس میں رہنے والا ہم لوگ بے عقل جانور لوگ ہے۔ دوسرا جانور لوگ اگر چالاک ہو تو بے عقل جانور کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اونلی گوڈ سب جانتا والا ہے۔

" امیّ بتاتی ہیں کہ فلومینا اسی طرح اپنا ذاتی فلسفہ بیان کرتی گئی۔ جھلملیوں والی بند گاڑی خوابیدہ شہر کی سنسان روشن سڑکوں پر سے گزرتی رہی۔ گھوڑوں کے ٹاپ کے علاوہ مکمل سناٹا۔ سڑک کی روشنیاں جھلملیوں میں سے چھن کر فلومینا کے سیاہ فام چہرے پر پڑتیں تو وہ بڑی پر اسرار معلوم ہوتی۔ ہزاروں برس پرانی روح۔ ینگ والے اجتماعی لاشعور کی مفسّر۔

" ادھر امیّ اپنی بائیس سالہ زندگی کے انقلابات پر حیرت زدہ بیٹھی تھیں۔ رپن اسٹریٹ آگئی۔ فلومینا نے اوپر جا کر خوابیدہ نواب بائی کو جگایا۔ بائی گوڈ کو تھینک یو بولو۔ اینڈی بابا آگیا۔ ایمبر بابا آگیا۔ دوسری صبح ہی سے میرے لیے ایک آسامی کرسچین NANNY کا انتظام کیا گیا۔ نواب بیگم امیّ سے جدائی اور ان کی شادی کے صدمہ سے نڈھال تھیں۔ صحت بھی بگڑ چکی تھی۔ اب وہ امیّ کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ لہٰذا جب امیّ نے ان سے کہا ـــ محض اس شرط پر ان کے ساتھ رہنے کو تیار ہیں کہ وہ انکو پرانی زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں گی نہ نواسی جب بڑی ہو گی اسے اس لائن کی ٹریننگ دینے کی کوشش کریں گی۔ نواب بائی یہودی مالک مکان کی دوکان میں ساجھے دار بن چکی تھیں۔ خاصی آمدنی تھی۔

" امیّ نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھا۔ اخباروں میں اشتہار دیکھ کر ایک اسکاٹش فرم میں درخواست روانہ کی۔ وہاں اسٹنوگرافر کا کام مل

گیا۔ یورپین ورکنگ گرل کی وضع اختیار کر کے کلائیو اسٹریٹ جانے لگیں پہلے روز جب دفتر سے خوش خوش لوٹیں ہیٹ اتار کر فلومینا کو دیتے ہوئے کہا آج زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو ایک کارآمد، باعزت اور خود مختار ہستی محسوس کر رہی ہوں۔

" دفتر کے اسکاٹ نوجوانوں کے ساتھ شام کو پکچر زجاتیں گریٹ ایسٹرن جا کر بال روم ڈانس کرتیں۔ فرپو میں چائے پیتیں اپنی اس نئی من بھاتی زندگی سے بے حد مطمئن تھیں۔ نواب بیگم کو ایک اجنبی لڑکی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک یورپین آفس گرل جو گویا بطور انکی PAYING GUEST گھر میں مقیم تھی۔ امی اپنی پچیس سالہ زندگی میں اب تک لوریٹو ہاؤس کی ایک یوریشین طالبعلم، تھیٹر کی یوریشین رقاصہ "مس بلبل"، ایک ہندو رئیس کی پابند اور ایک ایل۔ ایم۔ سی مسلمان ہاؤس وائف اہلیہ شکور حسین بن چکی تھیں۔ اور اب ایک بار پھر اینڈی کی ریناں تھیں۔ کلائیو اسٹریٹ پر ایک جوٹ کی فرم میں کام کرنے والی اینگلو انڈین سکریٹری ـــــ حیرت انگیز بات تھی نا ـــــ؟

" جب سکنڈ ورلڈ وار چھڑی۔ امی نے طے کیا WAC(I) جوائن کر کے فرنٹ پر چلی جائیں۔ نانی اور فلومینا اور ایک عدد آسامی آیا تو مجھے پال ہی رہی تھیں۔ امی کو میری زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ اپنے آپ میں مگن تھیں۔ بے چاری کو زندگی میں پہلی بار اپنی من مانی کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ اپنی اس نئی آزادی سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔ ایک روز یونیفارم لیکر آئیں اسے پہن کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئیں۔ فلو کہتی تھی کہ بے حد اسمارٹ لگیں۔ لیکن فوج میں بھرتی ہونے کی بات پر نانی اور فلومینا دونوں نے بہت رونا پیٹنا مچایا۔ امی نے پلٹ کر کہا۔ جب مک نیل صاحب سے شادی کر کے اسکاٹلینڈ چلی جاؤں گی۔ تب تم لوگ کیا کرو گی؟ لڑائی ختم ہوتے ہی ہم لوگ شادی کر لیں گے۔

" نواب بیگم یہ سنکر پھر دم بخود رہ گئیں۔ مگر لڑکی بہرحال انکے ہاتھوں سے کب کی نکل چکی تھی۔

"ان کا اسکاٹش بوائے فرینڈ جو انکے سیکشن کا انچارج تھا، رائل ایر فورس میں شامل ہوکر فرنٹ پر چلا گیا تھا۔ امیّ بیقراری سے اس کے خطوں کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ شاید وہ زنانہ امدادی فوج بھی اسی امید پر جوائن کرنا چاہتی تھیں کہ اس طرح ممکن ہے کسی محاذ پر وہ مل جائے۔"

"— قطع کلام ہوتا ہے عنبر—" منصور نے کہا۔ "امبا پرشاد صاحب سے ان کی کبھی ملاقات نہ ہوئی؟"

"امبا پرشاد کو معلوم ہوگیا تھا کہ امیّ طلاق لیکر نواب بیگم کے ہاں واپس آچکی ہیں۔ میری پہلی سالگرہ پر گڑیاں کھلونے کپڑے اور منےّ منےّ سچے زیورات بھجوائے۔ یہ تو لونڈیا کا جہیز معلوم ہورہا ہے۔ اچھا خاصا۔ نواب بیگم نے کہا۔ لیکن امیّ نے فون کرکے ان بچارے کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔ شاید تین چار سال بعد ہی امبا پرشاد کا انتقال ہوگیا۔ بہت ہی بڑھیا آدمی رہے ہونگے بے چارے۔

" پانچ برس کی عمر میں مَیں بھی لورٹیو کانونٹ میں داخل کردی گئی۔ نو دس سال کی تھی جب نانی اماں دنیا سے رخصت ہوئیں۔ ۱۹۵۸ء میں بہت شاندار بیوی تھیں۔ جیسی تم نے ان کی وہ تصویر دیکھی ہے۔ کیمیو والی — بالکل ویسی ہی تھیں۔ بوڑھی ہو چکی تھیں مگر اب بھی بہت حسین تھیں۔"

"کیسے مریں؟"

"چہرے کا کینسر۔ ایسا دلکش چہرہ اور سارا گل گیا تھا۔

"ایک روز میں ہسپتال گئی نواب بیگم پرائیویٹ وارڈ میں بستر مرگ پر پڑی کسی لکھنوی شاعر کا شعر پڑھ رہی تھیں ؎

آیا ہوں جان دے کے، دم آئے تو ظلم کر
اے قبر ابھی یہ کون محل ہے فشار کا

غنودگی طاری ہوئی تو دہرانے لگیں — ایک غریب الوطن مسافر کا اس شہر میں

انتقال ہوگیا ہے۔ اس کے کفن دفن کے لیے اجازت درکار ہے۔ مجھے ڈر سا لگا امیّ سے پوچھا کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے برآمدے میں لے گئیں —— اور بولیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تمہاری گرینی دنیا سے جانے والی ہیں۔ قاعدہ ہے کہ مرتے وقت انسان کو پرانی باتیں یاد آتی ہیں۔ تمہاری گرینی نے ایک بار بتلایا تھا کہ حجنّ بی جنکی وجہ سے انکی زندگی کا رخ بدلا ایک زمانے میں دلنواز دلّی والی کہلاتی تھیں اور مشہور سنگر تھیں۔ آج سے پینسٹھ ستّر سال پہلے وہ کسی دیسی ریاست میں بلائی گئی تھیں اس اسٹیٹ کے نواب بھی شاہانِ اودھ کی طرح موت سے ڈرتے تھے۔ اور جانشین کے دربار میں اس کے باپ کی موت ان الفاظ میں اناؤنس کی جاتی تھی جو اس وقت گرینی دہرا رہی ہیں۔

" لیکن موت ایک کیمیکل ایکشن ہے۔ اس سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ قاعدہ ہے ہر پرانی چیز بوسیدہ ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کا جسم بھی موٹر کی طرح ایک مشین ہے۔ تمہاری گرینی تو بہت پرانی مشین ہیں۔ اس لیے اب اس مشین کا کام چھوڑنے کا وقت آگیا ہے۔

" میں کمرے میں واپس گئی۔ اب نواب بیگم کو غنودگی کے عالم میں ایک اور رٹ لگ گئی تھی اور وہ تھوہڑ کی بھجیا —— تھوہڑ کی بھجیا —— دہرائے جا رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ اس بار امیّ ذرا پریشان ہوئیں سمجھ میں نہ آیا کہ انکی مما کیا کہہ رہی ہیں۔

" نانی نے آنکھیں کھولیں بے نُور سی آنکھیں جو پانی پانی ہو رہی تھیں۔ انھوں نے کہا —— عندلیب۔ کسی مولوی کو بلاؤ۔ کسی جناب کو بلاؤ۔

" امیّ کسی جناب یعنی شیعہ مولانا کی تلاش میں فوراً باہر گئیں۔ بہت دیر بعد ایک لوکل مولوی دستیاب ہو سکے۔ ہسپتال کے قریب کی کسی مسجد کے ملّا جی۔ رات ہو چلی تھی اور نانی اماّں تھوہڑ کا ساگ۔ تھوہڑ کا ساگ رٹے جا رہی تھیں۔

" امیّ نے مولوی صاحب سے پوچھا۔ میری والدہ کیا کہہ رہی ہیں؟ اگر کوئی آخری خواہش ہو ان کی تو پوری کر دی جاتے۔

" پندرہ بیس سال قبل امیّ بطور بُلبُل دی ڈانسر مشہور رہ چکی تھیں۔ وُہ انکی شکل

پہچانتے تھے۔ مولوی صاحب بھی پہچان گئے۔ عجیب چیز تھے۔ پلٹ کر بولے آخری خواہش! اجی میم صاحب وہ تو ابھی جہنّم میں پوری ہوئی جاتی ہے۔ تھوہڑ کا ساگ اہل دوزخ کو زبردستی کھلایا جائے گا۔ یہ ابھی سے مانگ رہی ہیں۔

" امیّ طیش سے لال پیلی ہو گئیں۔ مولوی صاحب بولے۔ توبہ۔ توبہ۔ ان کا چہرہ سارا گل چکا ہے۔ اکثر زنان فاحشہ کا مرنے سے قبل جسم کا کوئی حصّہ سڑ گل جاتا ہے۔ فلومینا کمرے میں موجود تھی۔ مولوی صاحب کو مارنے دوڑی۔ امیّ نے بھی اپنی چھتری اٹھائی اور ایک اینگلو انڈین گالی دے کر ملاّجی کی طرف بڑھیں۔

GET OUT YOU BLEEDING HE-GOAT. DROP DEAD.

مولوی صاحب سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ میں نے دہل کر رونا شروع کر دیا۔ اس ہڑبونگ میں نانی کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا۔ اس اثنا میں ان کا دم نکل گیا۔ بے چاری نواب فاطمہ عرف نواب بیگم کو آخری وقت نہ کلمہ نصیب ہوا نہ لیسین شریف ـــــــ"

" تمہارا یہ خالص مذہبی ری ایکشن ہے" منصور نے تعجب سے کہا۔

" ہاں۔ نواب بیگم حد سے زیادہ مذہب پرست تھیں۔ انکے ری ایکشن میں امیّ بے دین ہو گئیں۔ امیّ کی بے دینی کے ری ایکشن میں بہت پابند مذہب ہوں۔ اور شاید تھوڑی سی MYSTICAL بھی۔"

" شکور صاحب سے کبھی تمہاری ملاقات ہوئی ؟"

" بالکل نہیں۔ طلاق دے کر گھر سے نکالتے وقت انھوں نے امیّ سے کہا تھا ان کو یقین نہیں کہ لڑکی انھیں کی ہے۔ امیّ نے جواب دیا تھا بہت ٹھیک اب اس لڑکی کو بالکل CLAIM نہ کیجئے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ انکے آخری الفاظ تھے۔

" چنانچہ جب میں پانچ سال کی ہوئی لوریٹو ہاؤس کے کنڈرگارٹن میں میرا نام محض عنبریں بیگم لکھایا گیا۔ باپ کا نام مسٹر بیگ۔ اپنے نانا مرزا دلدار علی بیگ عطر فروش کا نام امیّ کے ذہن میں محفوظ تھا۔ لہٰذا ہمارا گویا خاندانی نام بیگ ہو گیا۔ بعد میں امیّ خود کو مسز بیگ کہلوانے لگیں ـــــ نام ـــــ عزّت کا پاسپورٹ ہے۔" عنبریں خاموش ہو گئی۔

کچھ وقفے کے بعد منصور نے سوچتے ہوئے کہا۔" عنبر ایک بات بتاؤں۔ میرا خیال ہے تمہارے والد صاحب بقید حیات ہیں۔ میں امریکہ سے واپسی میں کراچی رکا تھا وہاں ـــ"
" ہوسکتا ہے " عنبرین نے بات کاٹی۔ ـــ" وہ وہاں بہت بڑے آدمی ہوں گے۔ امیر کبیر۔ عالیشان کوٹھی بنوالی ہو گی۔ اولاد۔ مڈل ایسٹ میں ـــــ"
" بالکل ایسا ہی ہے۔ مجھے یاد آرہا ہے شاید کراچی جم خانہ میں اسی نام کے ایک بزرگوار سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پارٹیشن کے وقت وہ کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے تھے۔ وہاں سے کراچی۔ ڈپارٹمنٹل پروموشن کے ذریعے اونچے سرکاری عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ رائیٹ۔ میں ان سے ملا ہوں، ہاتھی کا حافظہ رکھتا ہوں بھائی۔ تمہارے ابا وہاں موجود ہیں"
" میری صحت پہ کوئی اثر نہیں پڑتا"
" رائیٹ تمہاری امی کے لیے موسیو آندرے جوزف رینال ایک بے معنی نام رہا۔ تمہارے لیے سید شکور حسین "
" بے چاری فلومینا کہا کرتی تھی ـــــ"
" فلومینا کا کیا ہوا ـــ؟"

" ہوتا کیا۔ مر گئی۔ لمبی عمر پائی۔ چھیاسی (۸۶) سال۔ نواب بیگم سے بھی دس گیارہ سال بڑی تھی۔ ان کی وفات کے دس سال بعد مری۔ ۵۵ء میں پورے پچاس برس ان ماں بیٹیوں کی خدمت کی۔ بیوہ ہو کر بے پور میں آیاگیری شروع کی تھی۔ اور کیا وفادار پیاری عورت تھی۔ فرشتہ خصلت۔ امی اسے TEASE کیا کرتی تھیں ـــــ فلومینا اب تم SAINTHOOD کے لیے APPLY کردو۔ تمہارے لیے HALO اور WINGS کا آسمان کے کارخانے میں آرڈر دیا جا چکا ہے ـــــ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ امی نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا رکھ لی تھی۔ مرنے سے ایک دن پہلے امی سے کہہ رہی تھی ـــ اینڈی بابا۔ وہ ٹھاکر مہیشور سنگھ مہا کال بن کی یاترا کو جاتے جاتے خود اکال بن چلا گیا تھا نا۔ سالا یہ زندگی مہا کال بن ہے۔ اس کے بیچوں بیچ مہا کال بھیرو کا مورتی رکھا ہے۔ بھیرو سب

چیز کو خلاص کرنا مانگتا۔ یہ گھور اندھیرا جنگل ہے۔ اس میں ہم لوگ سب بیوقوف جانور لوگ کی طرح گھوم رہا ہے۔ ONLY GOD ALMIGHTY سب جانتا والا ہے ـــــ پھر اس نے امی سے کہا دیکھو اینڈری بابا جب ایمبر بابا اپنا ایم بی ایس پاس کرے تم ایک دم اسکاٹ لینڈ کا ٹکٹ کٹاؤ ـــــ میرے کو پکا وشواس ہے مک نیل صاحب تمکو وہاں مل جائے گا۔

" امی نے جل کر جواب دیا۔ مما کو موسیو آندرے رینال چندر نگر میں مل گئے تھے۔ جو مجھے مک نیل اسکاٹلینڈ میں مل جائے گا ـــ فلومینا ـــ

YOU ARE AN INCORRIGIBLE ROMANTIC.

" اس نے تکیے سے سر اٹھا کر جواب دیا۔ ضرور ملے گا۔ ہم اوپر جا کر تمہارے لیے بڑے زور سے PRAYER کرے گا۔ بس آج کل میں اوپر جانے والا ہے۔

" امی رونے لگیں۔ میں بھی خوب روئی۔ فلومینا نے اسی رات سوتے میں انتقال کیا۔ نواب بیگم کے برعکس اس کی بڑی پرسکون موت تھی۔ چونکہ اس نے زندگی سے کوئی توقعات ہی نہیں رکھی تھیں۔

امی کو اپنی والدہ کی موت کا زیادہ رنج نہیں ہوا تھا فلومینا کے مرنے پر وہ روتے روتے بیحال ہو گئیں۔ میرا بھی بُرا حال۔ سیاہ فراک پہن کر چہرے پر سیاہ ماتمی VEIL لگائے شیشے کی تابوت گاڑی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی کیتھولک قبرستان گئیں۔ اس کے لیے چرچ میں بڑا شاندار REQUIEM MASS کروایا۔ پھول لیکر اکثر قبرستان جاتی رہیں۔ اپنی والدہ کی قبر پر مسلمانوں کے قبرستان شاذ و نادر ہی جاتی تھیں ـــــ مجھ سے کہا فلومینا مر گئی۔ ہندوستان سے ہمارا LINK ختم اب چلو ولایت۔ دراصل وہ آزادی کے فوراً بعد جانا چاہتی تھیں۔ کلکتہ کے سارے اینگلو انڈین جا رہے تھے۔ مگر بوڑھی بے سہارا فلومینا کی وجہ سے نہیں گئی تھیں۔ جوں ہی میں نے ایم بی بی ایس کیا امی نے روانگی کی تیاری ـــ "

"وہ اسکاٹلینڈ اور مسٹر مک نیل کی کیا بات تھی؟"

"وہ ایک اینگس مک نیل ان کا بوائے فرینڈ تھا نا جو کلائیو اسٹریٹ کی جُوٹ فرم میں انکے سیکشن کا انچارج تھا۔ اس سے شادی طے کرلی تھی۔ مگر وہ سیکنڈ ورلڈ وار چھڑتے ہی ایرفورس میں بھرتی ہو کر ویسٹرن فرنٹ پر چلا گیا۔"

"فرسٹ ورلڈ وار کے موسیو آندرے رینال کی طرح؟"

"نہیں۔ میرے نانا جان آندرے رینال تو کوئی عام سے SWINDLER تھے جو ایک بیوقوف ہندوستانی ناچ گرل سے چالیس ہزار روپیہ اور ہیرے کے پری چہم ٹھگ کر بلجیم بھاگ گئے تھے۔ اینگس مک نیل ایک معقول پرخلوص نوجوان تھا۔ مگر پہلے وہ یورپین محاذ پر بھیجا گیا اور برابر وہاں سے خط لکھتا رہا۔ پھر۔ برما۔

"ایک صبح امی نے اسٹیٹسمین کھولا تو REPORTED MISSING کی فہرست میں فلائیٹ لفٹیننٹ اینگس مک نیل کا نام بھی موجود۔ دن بھر اپنا کمرہ بند کرکے روتی رہیں۔ عزت کا پاسپورٹ پھر انکے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ فلومینا نے دلجوئی کی کہ بہت سے REPORTED MISSING زندہ بچ جاتے ہیں۔ مک نیل صاحب ضرور واپس آئے گا۔

"دنیا امید پر قائم ——— امی ہی کی خاطر میں نے لندن کے بجائے اڈنبرا میڈیکل کالج میں داخلے کا ارادہ کیا۔ آزادی کے بعد امی کی اسکاٹش فرم کے جنرل منیجر مسٹر ڈگلس میکلوڈ اڈنبرا واپس جا چکے تھے۔ میں نے انکو خط لکھا کہ کوشش کرکے میرا داخلہ میڈیکل کالج میں کرا دیں۔ چنانچہ مجھے وہاں جگہ مل گئی۔ اسکاٹلینڈ پہنچ کر بھی امی نے مک نیل کی تلاش بے سود سمجھی۔ اڈنبرا کی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ہزارہا مک نیل تھے۔ میں نے چند ایک کو فون کیا۔ کسی کو فلائیٹ لفٹیننٹ مک نیل کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ برما کی جنگ کو خاصی مدت گزر چکی تھی۔

"چھٹیوں میں ہم لوگ سیر کے لیے یورپ گئے۔ اوسٹینڈ پہنچتے ہی اب میں نے

آندرے رینال کا پتہ چلانے کی کوشش کی۔ برسلز کی ٹیلی فون ڈائریکٹری کھنگالی۔ اسمیں سیکڑوں رینال۔ تھک کر یہ کوشش بھی چھوڑ دی۔ لیکن امیّ بار بار بلجیم جاتی رہیں۔"

منصور نے اپنا خود اور گوگلز اٹھائے۔

"کل شام ضرور آنا۔ امیّ تمہاری دعوت کا انتظام کرنے ابھی بھاگی بھاگی ایبن آباد گئی ہیں۔"
"کل کیا خاص بات ہے بھئی ؟"
"ماشاآہلیتھ کلب کے افتتاح کا CELEBRATION ۔" عنبر نے شگفتگی سے جواب دیا "اتفاق سے کل وہ مہینہ اور تاریخ بھی ہے جب امّی اور فلومینا مع یوزرٹرولی کی ٹوکری کو لوٹولہ سے رپن اسٹریٹ واپس گئی تھیں۔ فلومینا بتاتی تھی اس نے امّی سے کہا تھا اینڈی بابا بالکل اسی مافِک تمہارا باسکٹ لیکر گھوڑا گاڑی میں تمہاری ماما کے ساتھ ہم اسی بلڈی کیل کٹا کی روڈ پر تھا جب باٹی جے پور سے دھکے کھانے ادھر آیا تھا۔"
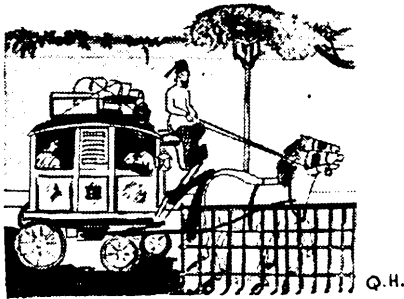
(۲۱)

تارے والی کوٹھی

" افوہ۔آج تو آپ نے واقعی بڑا اہتمام کیا ہے —!" منصور نے دروازے سے جھانک کر جھلملاتی ڈنر ٹیبل پر نظر دوڑائی۔

" آؤ کچھ دیر اسٹوڈیو میں بیٹھیں۔ وہاں اس وقت دروازے کھولو تو بڑی خوشگوار ہوا گومتی کی طرف سے آتی ہے —— بالکل فرح بخش۔"

لیکن اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی مسز بیگ نے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے پردے گرا دیے۔ ایک الماری سے اسکاچ وہسکی کی چند بوتلیں نکال کر میز پر رکھیں۔ منصور تعجب سے انکی یہ غیر متوقع کاروائیاں دیکھتا رہا۔ عنبریں ناگواری کے ساتھ ایک مصری پوف پر ٹک گئی۔ منصور نے پنکھا چلایا۔

" کیا پسند کرو گے؟ CLAYMORE BAGPIPER ROYAL SALUTE "

دو جام بھرے۔

منصور نے عنبریں پر متفکرانہ سی نظر ڈالی۔

عندلیب بانو نے قہقہہ لگایا۔

" مولانا بخاری! اطمینان رکھو۔ عنبریں بی بی بڑی پرہیز گار سیّد زادی ہیں۔ میرا کیا ہے میں تو ہوں ہی ایک آوارہ یوریشین ریٹائرڈ ڈانسر۔"

" امی —!"

" ہاف کاسٹ۔ TRAMP جب دل بہت گھبراتے — اس جگہ یہ شغل اسٹوڈیو کے دروازے بند کر کے —— کہیں حسین بخش نہ دیکھ لیں۔ وہ مجھے کلکتہ کی بڑی بیگم

صاحب سمجھتے ہیں۔ اور بہادر دیکھ پاوے تو سارے محلّے میں پھونک آوے۔ عزّت —
عزّت! عزّت کی بڑی دُھن ہے مجھ بندی کو — TO MASHA HEALTH CLUB!

TO AMBER AND MANSOOR'S FUTURE HAPPINESS!!

"چیرز" منصور نے اپنا جام اٹھایا۔
مسز بیگ گلاس پہ گلاس چڑھائے گئیں "آہا۔ کلیان!"

شیلف میں سے تلاش کر کے فیض کا ایک ٹیپ نکالا اسے لگا کر چند لمحوں تک سنا
پھر ساغر اٹھا کر بولیں۔ "پوسٹ مینوں کے نام! جو میرے لیے کبھی کوئی خط نہ لائے
عبدالباسطوں کے نام —! مہشور سنگھوں کے نام۔ آندرے ریناؤں کے نام —
شکور حسینوں کے نام —!" رُوسی انداز میں گلاس فرش پر پٹخ کر توڑا۔
بل کھاتی اٹھیں اور بانہیں پھیلا کر سر پیچھے ڈال، چھت کو تکنے لگیں۔
گویا ایزاڈورا ڈنکن۔ گوہراف کیل کٹا۔ یوجین پیٹرسن عرف اندرا دیوی۔

انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی اسوقت ہے جب وہ دوسروں کو مضحکہ خیز
لگنے لگے "منصور" عنبر نے چپکے سے التجا کی "امّی پر ہنسنا نہیں"
"استغفراللہ۔ عنبر۔ آئی انڈر اسٹینڈ —"
"نو یو ڈونٹ"
"دشتِ تنہائی ڈھونڈ لاؤں" گنگناتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

"امّی کی ٹریجڈی — RIDICULOUS لگتی ہوں تو انھیں معاف کر دینا"

واپس آئیں "نہیں ملا"
دریچے کا پٹ کھسکایا "آہا۔ ایسی تاروں بھری کالی رات — آکاش گنگا کیسی
جھلملا رہی ہے۔ مشرق کی پراسرار سیاہ راتوں کی پُرفسوں کہکشاں —! ہاہاہا۔ یہ سب

قسمتوں کے ستارے ہیں؟ ہندو کرم کا پھل کہہ کر بچ گئے۔ تم بتاؤ مولانا۔"

"یہ تو چند ازلی سوالات ہیں میم۔"

"اماں ازل بھی دیکھ لیا دوربین سے۔ اُفّوہ۔ زحل کیسا تنہا نظر آتا ہے۔ اتنا — دُور — اور اتنا تنہا —"

"ٹیپو سلطان کی ہیئٹ لگاتے۔"

"ایں —؟"

"جی ہاں مسز بیگ۔ ایک صاحب رصدگاہ سے اسے دیکھ کر کہنے لگے اسکی رنگ تو بالکل ٹیپو سلطان کی ہیئٹ معلوم ہوتی ہے!"

"ہاہا — وَیری گُڈ — دوربین سے ہر ستارہ کتنا اکیلا دکھلائی دیتا ہے اور ایسا بے چارہ سا سنیچر انسانوں کی تقدیروں کو بھلا کیا متاثر کرے گا؟"

ڈائننگ روم میں داخل ہو کر وہ میز کے سرے پر کھڑی ہو گئیں۔ "خواتین و —

"امّی بیٹھ جائیے۔ حُسین بخش —"

"ہاہاہا ڈاکٹر صاحب۔ ہم لوگ دلّی والے ہیں۔ حُسین بخش سے نہیں ڈرتے۔ ہم چاول پہلے کھاتے ہیں بریانی نوش کیجئے۔ دہرہ دون کا باسمتی ینبال کوٹھی چوک، کا زعفران۔ اٹاوے کا گھی۔ انگلش چائنا۔ رشن سِلور۔ گوآن فرنیچر — نوابجان کی امرکہانی زندہ باد۔"

"منصور۔ یُوَر امّی اِز کوائیٹ ڈرنک۔ تم کو معلوم ہے یہ برسوں کلکتے کی اسکاٹش فرم میں سکریٹری رہیں ہیں چوبیس سال سے ڈاکٹر ہوں۔ اور یہ سازوسامان میں نے اپنے نوبل پروفیشن کی حق حلال کمائی سے —" اسکی آواز حلق میں اٹک گئی۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اب اسے اپنی ناممکن قسم کی والدہ کو معاف کرتے رہنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ "امّی ہمیشہ تمہارے سامنے میری توہین کرتی ہیں۔ جانے وہ مجھ سے کس چیز کا بدلہ لینا چاہتی ہیں؟"

منصور اس غیر متوقع صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ عنبریں نے آنسو خشک کیے۔

عندلیب بانو اب ان دونوں کو گھور رہی تھیں ''بھاگ ان بردہ فروشوں سے'' انھوں نے ڈپٹ کر بیٹی کو مخاطب کیا۔

''میم۔ ہمارے ہاں لوگ طوائفوں سے شادیاں کرتے ہیں ان کو عزّت بھی ملتی ہے۔ کوئی ان کا بائیکاٹ نہیں کرتا۔ آپ نے خواہ مخواہ اس مسئلے کو اپنے لیے ایک بکھیڑا بنا لیا ہے۔ للّٰلہ بھول جائیے یہ قصّہ۔ آئیے اسی لمحے سے ہم یہ طے کر لیں کہ نواب بیگم کبھی تھیں ہی نہیں۔''

حسین بخش گرم چپاتیاں لیکر اندر آئے۔ انگریزوں کے زمانے کے ریٹائرڈ خانساماں کی حیثیت سے صاحب میم صاحب لوگ کی کیفیات و معاملات سے چشم پوشی کی اور دبے پاؤں واپس گئے۔

مسز بیگ اپنی کہے گئیں۔ ''پچھلے زمانے کے نخاسوں میں مویشی اور لونڈی غلام ایک ساتھ بکا کرتے تھے۔ مولانا —— یوں تو مارکیٹ میں تمہارا بھاؤ بھی بہت چڑھا ہوا ہے۔ آج یہاں ڈنر اڑا رہے ہو کل وہاں۔''

''آئی بگ یور پارڈن'' منصور نے بھنّا کر جواب دیا۔

خاموشی۔ عنبریں شرم سے کٹی جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اب کھانا زہر مار کر رہا ہے اور جلد از جلد یہاں سے بھاگنا چاہتا ہے۔

آج بہت بُرے پھنسے۔ عندلیب بانو ایک بڑی سی سفید مکڑی کی طرح بیٹھی جالا بُنتی جا رہی ہیں۔ خود اس جالے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ جو دوسری مکڑیاں انکے لیے بُن گئیں۔ اپنے تلخ تجربات کی بنا پر عندلیب بیگ اینٹی مسلم، اینٹی انڈین بنیں۔

اگر انکی زندگی خوشگوار گزری ہوتی۔ مسلمان شوہر اچھّا ثابت ہوتا۔ یا کسی بہتر آدمی سے انکی شادی ہو جاتی۔

جہانِ ممکنات بیکراں لیکن ہم حقیقتوں میں محصور۔

اولیائے کرام کا ارشاد ہے کہ جو لوگ سماج کی تلچھٹ کہلاتے ہیں انکے دُکھ درد جان دان سے محبّت کرنے لگو گے۔

عندلیب بیگ سماج کی تلچھٹ تھیں؟ نفیس، متمدّن، اعلیٰ تعلیم یافتہ۔

وہ چکن کاٹنے میں مصروف تھیں یکلخت چھُرا اٹھا کر مہمان سے مطالبہ کیا۔

"سنہ سینتالیس میں تم کتنے بڑے تھے؟"

"جی —— جی اسکول میں پڑھتا تھا۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

"یاد ہے اخباروں میں مغویہ لڑکیوں کے ہولناک حالات۔ گھر والوں کا واپس لینے سے انکار EXTREME SITUATIONS میں بھی عورت کی حیثیت سکنڈری بے عزّتی ہوئی گویا اسکے مردوں کی۔"

"آپ کو مسلم سماج میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ لیکن یتیموں اور بیواؤں اور مساکین کی امداد کے احکام کا سبق ایسا گھُٹّی میں پڑا ہے ہم لوگوں کی غریب سے غریب مسلمان فوراً مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔"

"پھر ——؟"

"جی مجھے تو یہ یاد ہے کہ الجمعیت وغیرہ میں اپیلیں چھپا کرتی تھیں کہ مسلم نوجوان اپنے فرقے کی مغویہ لڑکیوں سے شادیاں کرلیں۔"

"پھر —— کیں؟"

"بے شمار نے۔"

"ارے واہ —— واہ بے بانگی کے مرغے!"

"امّی جان —— پلیز ——" عنبر پھر آنکھوں سے موتی پرونے لگی۔

"نی میں چھم چھم چھم رونیاں ـــ میں چھم چھم ـــ اب میں چپ رہونگی بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دھی دا ور پیدا۔ ہا ہا۔ ستو نغفور کا شغر انتا عقیل ـــ عالمگیر سفاکی کا پہلا نشانہ ہمیشہ رناں تے کڑیاں۔ پوسٹ وار جرمنی۔ جاپان۔ اٹلی۔ ویت نام۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ گشتیوں کے پیشے لگ گئے۔ ایک روسی بھگیتا کلکتے آیا تھا سفید روسی لڑکیاں خاموش ہندوستانی فلموں میں نچاتا تھا۔ سرجی گرنوف۔"

"ہولی وڈ میں ناچتیں تو آپ انکو قابل رحم نہ سمجھتیں"، عنبر نے آنسو پونچھ کر بحث کی۔

"KEEP YOUR GOB SHUT" اسکی والدہ خالص جی جی آواز میں چلائیں۔

منصور نے نرمی سے کہا "ساری دنیا میں لاتعداد عورتیں ایسی بھی ہیں جو مجبوری کے بجائے شوقیہ ـــ"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ عطائی کسبیوں کو بید خل کر رہی ہیں ہُنر سے۔"

"اچھا وہ راحت بائی گجرا بائی کیا ہوئیں۔ اور مہر و خالہ؟"

"مہرو خالہ ـــ؟ بُرا حشر۔ علاج کے لیے پٹنے جا رہی تھیں۔ شدّو ماموں کے ساتھ۔ چلتی ٹرین پر ڈاکوؤں کا حملہ۔ ماں بیٹے۔ دونوں ـــ" عندلیب بانو نے اپنی گردن پر انگلی سے گویا چھری پھیری "سارا زیور لوٹ کر لے گئے ڈکیت۔"

"زیور پٹنہ کیوں لے جا رہی تھیں؟"

"کہیں شمو بائی انکی بیٹی ان پر قبضہ نہ کرلے۔ بنک کے بجائے صندوقچہ چھپر کھٹ تلے چھپائے رکھتی تھیں۔ اکتوبر سنہ سینتالیس میں شمو مع آل اولاد دلّی سے اڑنچھو" عندلیب بانو نے دائیں ہاتھ سے ہوائی جہاز کے ٹیک آف کا نرت کیا "چاہنے والے اسپیشل طیاروں پر اُڑا لے گئے۔ پرانے قلعے میں پڑے کنبوں کی حق تلفی کر کے۔ گجرا بائی کی ایک نواسی انگلینڈ میں لیڈی اف دی مینر بن گئیں۔"

"اوہو ـــ!"

"اسکے امیر خاوند نے انگلستان میں ایک لارڈ کا کاسل خرید رکھا ہے۔ اولاد کیمبرج میں
رہی ہے۔" عندلیب بانو نے گویا شورٹ ہینڈ میں بات ختم کر کے نیپکن سے چہرہ خشک کیا۔

" چاندپول بازار سے کیمبرج۔ ڈیم گڈ ـــــ آپ جیسی ترقی پسند کو تو ان کی
مدگی سنور نے پر خوش ہونا چاہیئے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" منصور نے کہا۔
" میں کب کہتی ہوں بُری بات ہے۔ اگر ہماری اصلیت بھی یہاں کُھل جاتے۔
نہ کہیں گے چاندپول بازار سے اڈنبرا ـــــ ڈیم گڈ ـــــ بڑی خوشی کی بات۔"

" امّی جان تو اس صورتِ حال میں آخر مجھے کیا کرنا چاہیئے خودکشی؟"
انھوں نے چھُری میز پر پٹخی۔
" خودکشی کریں تمہارے دشمن۔ مرتے وقت مما کو یہ GUILT کیوں رہا کہ
وہ سیدھی دوزخ میں جائینگی جہاں تھوہڑ ـــــ مرزا اسبطا احمد۔ شیخ عبدالباسط۔
اندر سے رینال ـــــ وہ کمینے کیوں نہ تھُوریں تھوہڑ کی بجھیا؟ کہاروں کی غلطی
سے انکو رات بھر مہرو کے کوٹھے پر رکنا پڑا۔ انھیں جوتے مار کر گھر سے نکال
دیا۔ اور بالاخانہ ہی آباد کرنے پر مجبور ہوئیں۔ اصل گنہ گار شیخ عبدالباسط ہیں یا
نوابن چھوکری؟ حضرت مولانا منصور احمد بخاری ـــــ مسلم معاشرے کا ایسا بیرحم
روّیہ کیوں؟"
" وہی بیلی گارد والے نواب صاحب کی بات یا داتی ہے کہ اپنے معاشرے
کے بزرگوں کو مطعون کرنے سے پہلے ذرا انکے حالات پر دھیان دھر لیجیئے۔"
" بولو جی ـــــ گنی جن کا ہے پہ دھروں دھیان ـــــ؟"
" گزشتہ نسلوں کے سماجی رویّوں کا ذرا فراخدلی سے تجزیہ کیجیئے تو شاید اتنی
تلخی محسوس نہ ہو۔ آپکو ایک بات بتاؤں۔" منصور نے کرسی پر پہلو بدلا ـــــ "عرض
کیا تھا نا میرے از بک پردادا مسجد فتحپوری میں مولوی ہو گئے تھے۔ مولوی نذیر احمد

کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ انکا روزنامچہ ابّا کے پاس موجود تھا۔ وہ میں نے پڑھا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ایک مرتبہ دِلّی کے چیف کمشنر کلارک نے ایک گرلز اسکول قائم کرنے کی تجویز دِلّی کے مقتدر مسلمانوں کے سامنے رکھّی ـــــ انھوں نے مسترد کر دی۔ غدر سے قبل پردے کی اتنی شدّت نہیں تھی۔ لیکن سنہ ستّاون کے بعد مسلم سماج کی تباہی اور DEMORALISATION اور کرسچین مشنریوں کا خوف ـــــ آپکو ان مصائب کا کیا اندازہ ہے ـــــ؟ ایّام غدر میں مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں بھانجا بھتیجا، بڈّھا جوان لنگڑا لُولا جو ہاتھ آیا اس سے کر دیں تاکہ وہ بے عزّت ہونے سے بچ سکیں۔ میری پرنانی کا ایمرجنسی نکاح اسیطرح کیا گیا تھا ـــــ ان گنت لڑکیاں اغوا کی گئیں۔ اسکی یاد مسلمانوں کے دلوں میں تازہ تھی۔ خود آپکی دلنواز اور مہر و قتل عام کے بعد چاوڑی جا پہنچیں رائٹ ـــــ؟ اسیوجہ سے مسز بیگ مسلمانوں کے ہاں غدر کے بعد اتنا شدید پردہ رائج ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے چیف کمشنر کو جواب دیا کہ مسلمان اپنی نوعمر لڑکیوں کو ایک منٹ کے لیے اپنی آنکھوں سے اوجھل کرنے کو تیار نہیں چنانچہ مدرسہ بھیجنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

"علاوہ ازیں ـــــ نواب َن کے معاملے میں شیخ عبدالباسط کے اتنے شدید ری ایکشن کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ڈپٹی کمشنر کلارک کو یہی بات سمجھائی تھی۔ کہ اکیلی لڑکی گھر سے جاتی ہے اسکول۔ اور وہاں یا کہیں اور یا راستے میں اسکے ساتھ حادثہ پیش آتا ہے ـــــ"

"ریپ"

"جی۔ یا فرض کیجیئے وہ خود کسی چکّر میں پڑ جاتی ہے تو اسکی سزا از روئے شرع بہت سخت ہے۔

"اب دُرّے لگتے ہی لڑکی مر جاتے گی۔ سخت جان ہوئی تو زندہ درگور ـــــ

سوشل آؤٹ کاسٹ - دونوں صورتیں بھیانک۔

" اچھا غدر کے بعد انگریزی قانون لاگو ہو چکا تھا لہذا ADULTERY کے مقدمے کے لیے کچہری۔ اس رسوائی کا سامنا کرنے کے بجائے لڑکی کو زہر دینا بہتر۔ تو آپ ملاحظہ فرمائیے۔ گھر سے نکلنے ——— اسکول بھیجنے میں لرزہ خیز ممکنات اور انکے نتائج کا خوف شکست خوردہ مسلمانوں کے دلوں میں اسوقت بیٹھا ہوا تھا — انکے ڈیلیما پر غور فرمائیے ۔

" یہ کب کا واقعہ رہا ہوگا —— ؟ لیجئے میں ورک آوٹ کرتا ہوں۔ کل عنبر نے بتلایا کہ بعمر اڑسٹھ سال ۱۹۴۵ء میں نواب بیگم کا انتقال ہوا۔ اور چودہ سال کی عمر میں وہ شیخ عبدالباسط کے گھر سے نکالی گئیں۔ تو سمجھیئے یہ لگ بھگ ۱۸۹۲ء کا واقعہ رہا ہوگا۔

" آپ ۱۸۹۲ء میں ایک اوسط ذہن کے قدامت پرست دلّی والے مسلمان سے یہ کسطرح توقع کرتی ہیں کہ انکی نوعمر ملازمہ جو چاوڑی کے ایک بالاخانے پر رات گزار کر ایک قیمتی شال اوڑھے گھر لوٹتی ہے وہ اسے واپس لے لیں گے ؟ جبکہ چوّن سال بعد نئی روشنی کے ان گنت ہندؤوں سکھوں اور مسلمانوں نے اپنی مغویہ عورتوں کو واپس نہیں لیا ؟ آپکے ہاں کٹ گلاس بہت نفیس ہے۔"

" وی آنا میں خریدا تھا۔ پیسہ ہو تو کیا نہیں خریدا جا سکتا۔ کٹ گلاس کی کیا حقیقت ۔"

" جی ہاں۔ یہ تو بڑی OBVIOUS سی بات ہے۔"

" تم بھی پیسے کی اہمیت کے قائل ہو ؟"

" پیَسہ۔ پیَسہ ——" وہ ہنس پڑا۔" ایک حد تک ——— کون نہیں ہے ؟ میرا بچپن اتنا افلاس زدہ گزرا کہ جبھی طے کر لیا تھا۔ ڈاکٹر بن کر خوب کماؤں گا۔"

" ڈاکٹر ہی کیوں۔ بزنس مَین کیوں نہیں ؟"

" وہ ۔ ایسا ہوا بیگم صاحبہ کہ ہمارے محلّے میں ایک بیحد دولتمند ڈاکٹر کا ۔
تھا ۔ رات کو میں اسکول کا ہوم ورک کرنے انکے مطب کی خوب روشن سیڑھی
جا بیٹھتا تھا ۔ انھوں نے مجھے اندر آکر پڑھنے کی اجازت دے دی ۔ پھر میں ؛
کے ایک کونے میں لیمپ کے نیچے پڑا جاتا ۔ جب ہی مجھے ڈاکٹری سے بھی شغف پ
ہوا ۔ انہی مرحوم نے میرا داخلہ علیگڈھ میں کروایا ۔ سنہ سینتالیس کے فسادوں :
بے چارے مارے گئے ۔"

دریچے کے باہر کسی کی آواز آئی ۔

" کون ہے ؟ " عنبریں نے پوچھا ۔

سفید رومال میں بندھا کٹوردان ہاتھ میں لیے حُسین بخش اندر آتے ۔ " کہ
نہیں بٹیا ـــــ بختو بھائی کے ہاں آج نذر تھی ہمارا حصّہ لے کر آئے تھے ۔"

" اوہ ۔ بختُو ـــــ ابن انار کلی ـــــ ! " مسز بیگ بولیں ۔

" بختُو تو انارکلی کے ہیرو ہوا کرتے تھے نہ کہ فرزند " منصور نے کہا ۔

" بختُو نہیں ـــــ شیخُو ـــــ ! " عنبریں نے تصحیح کی ۔

" یہ شہزادے نہیں ۔ غلام زادے ہیں ۔ غلام ابن غلام ابن غلام ـــــ تمہار
اس سرمایہ دار سوسائٹی نے ان گمنام و ثیقے دار جیسے شہزادوں کا بھی پلتھین نکا
دیا ۔ غلام تو خیر غلام ہیں ہی ـــــ " مسز بیگ نے ایک گہری سانس لی " تمہا
اس نستعلیق دوست کا کیا نام ہے عنبر ـــــ ؟ "

" رفعت آرا بیگم ۔ "

" ہاں ۔ رفعت آرا بیگم ۔ ضلع ہردوئی کے کسی تعلقہ دار کی صاحبزادی ۔ ا
روز آئیں ۔ میں بیلی گارد سے اسکیچ بنا کر لوٹی تھی ۔ کہنے لگیں کسی ویک اینڈ پر ہم
تشریف لا کر تصویریں بنائیے ۔ ہمارے مورث اعلیٰ نواب صدر جہاں کا مقبر

بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ـــــ یہاں اور شاہ آباد میں ان گنت عمارتیں ہیں
مغل پیریڈ کی۔ دادا صدر جہاں اکبر کے وزیراعظم تھے۔ انکے مقبرے میں ستون بے شمار
ہیں۔ چھت ندارد۔ کہتے ہیں راتوں رات جنات روضے پر چھت ڈال رہے تھے لیکن صبح
منہ اندھیرے وقت سے پہلے کنیزوں نے چکّی چلادی۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر غائب۔
" میں نے کہا اے بٹیا تو جنات دوسری رات کو آجاتے وہ ہنسنے لگی۔ پھر اس
نے آواز دی ۔ انار کلی! ـــ میں نے دل میں کہا یہ بی بی تو بہت تاریخی ہیں ۔
اکبر اعظم اور انار کلی سے کم بات نہیں کرتیں۔غرارہ پہنے ایک بوڑھی ملازمہ کارسے آئی
عفت آرا بیگم کا پاندان سنبھالے ۔ پھر باہر جا بیٹھی۔ میں نے کہا بٹیا تمہاری تو نوکرانی بھی
نہایت افسانوی ہے۔بولی ہماری پرانی کنیز ہے ۔
" کنیز ـــ؟ میں نے تعجّب سے دہرایا۔ بولی جی ہاں ۔ ہمارے یہاں کنیزیں غلام
تو ابتک خریدے جاتے تھے ۔ آزادی سے قبل تک ـــ میں نے پوچھا انھیں بیچتا کون
تھا۔کہنے لگی ۔غریب کسان اور کون۔ کہنے لگی۔ بنٔس آنے اور ڈلیا بھر کودوں فی لڑکی لڑکا
قیمت مقرر تھی ۔پشت درپشت ہمارے ہاں کام کرتے تھے۔ بلا تنخواہ؟ میں نے پوچھا۔
بولی بالکل۔عمرپٹے" میں تنخواہ کیسی۔ بس روٹی کپڑا۔غلاموں سے کنیزوں کے بیاہ کر
دیے جاتے۔ جہیز دیا جاتا ۔
" میں نے جہیز کی تفصیل پوچھی۔ بولی بہت کچھ۔ چاندی کے گہنے ـــ بجلیاں ۔
ڈھولنا ۔ چندن ہار۔ طوق ۔ کنٹھ سری ۔ چھن چوڑی یا پری جھم ۔ چکن کے کرتے ۔
مشروع کے سیدھے پائجامے ۔تن زیب کا لال دوپٹہ پیلے آنچل والا ـــ پاؤں
میں کلکتیہ جُوتی ۔ بالی پتّے اور نتھ سونے کی دی جاتی تھی ۔ اتنا جہیز کنیزوں کو ملتا
تھا۔ میں نے کہا ہاں اور کیا چاہیئے ۔ بولی ۔ ہمارے ہاں کی چند کنیزیں تو ابتک
زندہ تھیں ۔ دل بہار۔ پھول کلی۔ حُسن بہار۔ دل افزا ۔ نین سکھ۔ یہ انار کلی اب بھی
جیتی ہیں۔ ہماری دادی کی رادھا کنیز افیمچی تھی۔ایک نیولہ پال رکھا تھا۔کنویں
کی منڈیر پر پڑی رہتی تھی ۔ ایک دن اسی کنوئیں میں گر کے مرگئی۔ایک اور تھی۔

گوراکینز۔ وہ چکی پیستے دھان کوٹتے متواتر بڑبڑایاکرتی تھی۔ بولتی کبھی نہیں تھی۔ جب زمینداری ختم ہوئی کنیز غلام آزاد ہو گئے۔ انکو زمینیں دے دی گئیں کھیتی کرنے لگے۔ جو وفادار تھے انھوں نے ہماری ڈیوڑھیاں نہ چھوڑیں۔

" انار کلی بھی انھیں وفاداروں میں سے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ کہنے لگی جی ہار لیکن اُنکا بیٹا بخشو لکھنؤ آگیا۔ رکشا چلاتا ہے۔ کلارکس اودھ کے پھاٹک پر اپنی رکشا کھڑی کرتا ہے۔ میں اس سے کہتی جاؤں گی جب ضرورت ہو بُلوا لیجیئے —— بے زبان ہے کرائے پر جھگڑتا نہیں "۔

" میں کلکتے میں پلی بڑھی مجھے علم نہ تھا کہ کو دوں کیا شے ہے۔ رفعت آرا بیگم نے بتلایا۔ ایک حقیر قسم کا چاول —— اگر گیہوں میں مل جائے۔ امیروں کے ہار انکو چُن کر پھینک دیتے ہیں۔ غریب غربا اسے کھاتے تھے۔

" سوا روپیہ اور ڈلیا بھر کودوں ۔ ! سمجھے مولانا۔ آج قانونی اور غیر قانونی TENDER بھی بدل گئے ہیں۔ خریدار بھی مختلف "۔

" شاب "۔ بہادر نے گیلری کے دروازے میں سے جھانکا "شہوار بٹیا کا فون —— پری محل "۔

" پوچھو کیا بات ہے "۔ عنبر نے کہا۔

" وہ بولتی ہیں شسٹر کی طبعیت کھراب ہے۔ ڈاکٹر شاب کو زلدی بھیجو "۔

منصور میز سے اٹھا۔ چند سکنڈ بعد گیلری میں سے اسکی آواز سنائی دی۔ " کیا ہوا ——؟ ارے۔ اوہو —— اچّھا۔ ابھی آتا ہوں۔ ہاں ہاں۔ فوراً۔ گھبراؤ مت بھئی۔ ابھی پہنچتا ہوں —— RELAX "۔

وہ کھانے کمرے میں واپس آیا " سوری مسز بیگ —— عنبر —— نگار خانم اچانک بیمار —— شاید ENGINA کا کچھ کھپلا ہے "۔

" تم ہارٹ اسپیشلسٹ تو ہو نہیں "۔ عنبر سرد آواز ۔

" انکا پرسنل فزیشین تو ہوں بھئی۔ کیا میرا فرض نہیں کہ فوراً جاؤں ـــــ؟"
رنے چڑ کر جواب دیا۔" اچھا گڈ نائٹ AND THANKS FOR THE
LOVELY DINNE اب بمبئی سے واپسی پر۔"

عنبریں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کمرے میں سنّاٹا۔ عندلیب بانو ذرا لڑکھڑا کر اٹھیں۔
ل کر نقرئی شمعدان پر پھونکیں مارنے لگیں۔ شمعیں ایک ایک کرکے بجھتی گئیں۔
ار کا سُوئیس کلاک ٹِک ٹِک کرتا رہا۔
" کیسا بھاگا" کچھ دیر بعد عنبریں نے کہا۔
" جب تمہاری کال آتی ہے تم سارے کام چھوڑ کر اسیطرح نہیں دوڑتیں؟"
ز بیگ نے آہستہ سے جواب دیا۔
" جیس آنے اور ڈلیا بھر کو دل ـــــ! LEGAL TENDER اور ILLEGAL
ی بدل گئے ہیں ـــــ آج پوری شام میں آپ نے ایک پتے کی بات کہی!
صل مشاعرہ! آپکو معلوم ہے یہ لوگ کتنے امیر ہیں؟ اور پتہ ہے ڈاکٹر کا شعری کا
تی فلسفہ کیا ہے؟ حصولِ کامیابی۔ نرسنگ ہوم کے لیے ہلکان ہوا۔ اب ہیلتھ کلب
کے لیئے سرکاری پیر پہیّہ ـــــ کامیابی اور دولت کے امریکن فلسفے کا پکا
یل ـــــ یاد ہے ابھی ابھی اس نے کیا کہا تھا؟ بچپن میں اتنا افلاس دیکھا۔"
" وہ تو زر پرستوں کا مذاق اڑاتا ہے۔"
" سب دکھاوے کی باتیں ہیں امّی جان۔ اور جب لڑکی بے تحاشا دولتمند ہو۔
حسین اور کم عمر ـــــ اور اعلیٰ نسب ـــــ"
" عنبر ڈیر۔ تم خواہ مخواہ شکّی ـــــ"، مسز بیگ کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔
" کیپ کو آیٹ امّی ـــــ عمر بھر آپ صحرائے لیبان کی SPHINX کی طرح
ش رہیں۔ اب آپکو یہ کتھا بکھاننے کے لیے کس حکیم نے کہا تھا؟ لگاتار۔
بھی وہ آئے وہی گراموفون ـــــ اس نے تو نواب بیگم کی تصویر کے متعلق

کوئی سوال ہی نہیں کیا تھا۔ الٹا کوئی مغل شہزادی سمجھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔"

چانک اس نے میز پر مکّہ مارا۔

"عنبر —!"

"ایک امیر کبیر شریف زادی۔ ایک یوریشین ڈانسر کی اولاد۔ ہاہاہا —
گیہوں کے دانوں میں اگر کودوں مل جائے تو اسے چُن کر الگ کر دیتے ہیں۔"
دوسرا مکّہ۔

"عنبر ہوش میں آؤ۔ تم پھر ہسٹریکل ہو رہی ہو۔"

"کودوں۔"

تیسرا مکّہ۔

ایک گلاس سرک کر چھن سے نیچے گرا۔

بہادر فوراً اندر آ کر کانچ کے ٹکڑے چُننے میں مصروف ہو گیا۔

عنبر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ عندلیب بیگ نے دریچے کے پردے برابر کرنے سے قبل حسب عادت باہر نظر ڈالی آسمان پر تاروں کی روشن ندی اسی طرح بہہ رہی تھی۔ سارا باغ معطّر تھا۔ گویا نہایت رومنٹک رات۔ کلکتے میں وہ کیا نظم مولوی صاحب نے یاد کرائی تھی۔ خدا کی قدرت کے ہیں نظّارے —— زمیں پہ پھول آسمان پہ تارے۔

آکاش گنگا ہے کہ جھلملائے جا رہی ہے۔ لامتناہی۔ افلاک کے تاریک فاصلوں میں جانے کہاں جا کر گرتی ہے۔

دروُن ذات کی تارے والی کوٹھی میں دُوربین سامنے آئی تو بھاگ گیا ——
الغ بیگ سمرقندی۔

(۲۲)
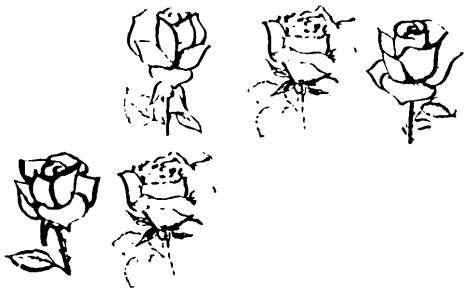
پری محل

بختشو رکشا والا اپنی سواری بلرام پور ہسپتال سے لا رہا تھا۔ لال باغ کی سڑکوں پر پہنچ کر گڑبڑا گیا۔ بڑے میاں صحیح پتہ ہی نہیں بتا پا رہے "اندھیرے میں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ــــ" بڑے میاں نے جھنجھلا کر کہا "سڑکوں کے نام بدل گئے ہیں۔ کالی داس تلسی داس ــــ اسی قسم کا کچھ نام ہے بھائی"

"ابھی تو ہم بالمیکی مارگ کا چکر لگا کر لوٹے ہیں"

"ارے بھئی پہلے وہ رٹلیج روڈ تھی نا ــــ اس کے آگے ــ ہمارے حواس باختہ ہیں۔ اس کوٹھی کے پھاٹک پر املتاس کا پیڑ کھڑا ہے ــــ وہ رہا ــ"

بختشو رکشا ایک پھاٹک کے قریب لے گیا۔

"کون ؟" چوکیدار للکارا۔

بڑے میاں جس انداز سے رکشا میں بیٹھے تھے معلوم ہوتا تھا فٹن اور موٹر کار کی سواری کے عادی رہے ہیں۔ "بڑی خانم۔" انھوں نے گویا پاس ورڈ دیا۔

"سلام۔ نواب صاحب" چوکیدار بولا۔

برساتی میں پہنچ کر نواب صاحب نے شیام سنگھ سے کہا "چھوٹی خانم" شام سنگھ اندر گیا۔ بختشو نے رکشا لے جا کر ایک تاریک گوشے میں کھڑی کر دی۔ نواب صاحب سیٹ پر بیٹھے دربان کا انتظار کرتے رہے۔

ایک موٹر سائیکل گھڑگھڑاتی ہوئی آئی۔

ڈاکٹر کاشغری۔ وہ سیدھے ڈاکٹر عنبریں بیگ کے مکان واقع رور بنک روڈ سے آرہے تھے اور صاحبزادیوں کے دولت کدے تک فاصلہ انھوں نے ریکارڈ ٹائم میں طے کیا تھا ــــ ٹیلی فون پر شہوار خانم نے کہا تھا باجی پر دل کا دورہ پڑا ہے ـــ ایسی ایمرجنسی میں بحیثیت ایک فرض شناس ڈاکٹر منصور کاشغری اپنے مریضوں کے ہاں عطارد کی رفتار سے وارد ہوتے تھے۔

ایک قدم برساتی میں۔ دوسرا اسیڑھی پر تیسرا برآمدے میں۔ آبشار والے کمرے سے گذرتے اندر گئے۔

دونوں بہنیں ٹی۔ وی۔ لاؤنج میں چرمی آرام کرسیوں پر نیم دراز خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ نگار خانم بے حد صحت مند نظر آرہی تھیں۔ اور خشک میوے سے شغل کر رہی تھیں منصور کے قدموں کی مانوس چاپ پر کان لگا کر شہوار نے فوراً دایاں ہاتھ پھیلایا۔ ” بجیا لائیے ایک عدد دہرا پتہ نکالیے ـــ میں جیت گئی شرط آپ سے کہا تھا اگر فون کروں گی کہ بجیا سخت بیمار ہیں ڈاکٹر منصور اُڑتے چلے آئیں گے ـــ چاہے آدھی رات کو بلائیے۔ ابھی تو سوا دس ہی بجا ہے ـــ“

ڈاکٹر صاحب لاؤنج میں داخل ہوئے۔ شہوار فوراً بولی ــ” وہ ـــ جنوّں کا کیسیٹ آگیا ڈاکٹر صاحب ـــ میں نے سوچا یوں تو آپ آنے کے نہیں باجی کی علالت کا بہانہ ــ“

ڈاکٹر منصور دنگ رہ گئے۔ رومال سے چہرہ پونچھ کر آہستہ سے کہا ـــ” یہ آپ نے اچھی بات نہیں کی۔“

"ALL WORK AND NO PLAY MAKES JACK A DULL BOY"

نگار خانم بولیں ۔” اتنے مصروف آدمی۔ پکچر دیکھنے بھی کبھی نہیں جاتے۔ ہم نے سوچا اسی بہانے ـــ“

” یہ آپ نے بالکل اچھی بات نہیں کی۔“ منصور نے دہرایا۔

” میں نے تو شہوار کو سمجھایا تھا ـ یہ بہانہ نہ کرو۔ مگر اس کا بچپنا ہے۔ آپ کو کلنک

فون کیا — پھر آپ کے فلیٹ فون کیا پھر یاد آیا شام کو تو آپ اکثر اپنی پارٹنرز ڈاکٹر نی کے گھر پہ ہی پائے جاتے ہیں —"

اس اثنا میں شہوار خانم ویڈیو پر جنون شروع کر چکی تھیں۔

"نوش کیجئے" نگار خانم نے خشک میووں کی پلیٹ پیش کی "یہ کابلی بادام آج صبح ہی دلی سے آئے ہیں۔ ڈیڑھ سو روپے کلو۔ افغانستان کی جنگ کی وجہ سے اتنے گراں — بھئی نفیسہ علی کیا حسین لڑکی ہے — اس پکچر کی شوٹنگ جب ملیح آباد میں ہوئی تھی ہم لوگ دیکھنے گئے تھے — ششی کپور، شبانہ اعظمی، نصیر الدین شاہ، جنیفر کپور، عصمت چغتائی۔ سب سے ملے — ڈاکٹر صاحب — یہ اخروٹ تو نوش کیجئے۔ آپ نے اپنی پارٹنر خوب منتخب کیں —"

"جی۔ شاردا کھنہ عنبرین بیگ دونوں بے حد لائق اور نفیس خواتین ہیں۔ آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہے؟" منصور نے رُکھائی سے پوچھا۔

"ڈاکٹر کھنہ سے تو ملنے کا اتفاق ہوا ہے — مگر ڈاکٹر بیگ —" دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نگار خانم نے کہا "وہ — ایسا ہے — ایسا ہے ڈاکٹر صاحب کہ ہم ایک قدامت پرست جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہمارے ہاں **P's** سے میل جول معیوب سمجھا جاتا ہے —"

"**P** —؟" منصور نے بلڈ پریشر کے آلے کی پٹی نگار خانم کے بازو پر باندھتے ہوئے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"جی۔ آپ جانتے ہیں نا — **P** —" شہوار نے GIGGLE کرنا شروع کیا۔

"PEA — یعنی مٹر —؟"

"جی نہیں — — **P** — **P** — کھی کھی کھی — قہ — قہ — قہ —"

شہوار کی ہنسی — نگار خانم کا قہقہہ۔

"— **P** — نہیں جانتے؟ — ! PROS" شہوار نے وضاحت کی۔

"PROS AND CONS" منصور نے پوچھا۔

"ارے نہیں بھئی ــــ آپ کے امریکہ میں انھیں کیا کہتے ہیں ؟ ارے PROS بھئی ــــ"

"اوہ ــــ آئی سی ــــ" ڈاکٹر منصور نے انتہائی آزردگی اور تعجب سے دونوں بہنوں پر نظر ڈالی۔

"آجکل آزادی کا زمانہ ہے ــــ شہوار۔ ذرا ایکچر کی آواز کم کر دو ــــ آجکل آزادی کا زمانہ ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سب نے شرافت کی نقابیں اوڑھ لی ہیں ــــ آپ کو ڈاکٹر بیگ اور انکی ماں کے بارے میں معلوم نہیں ؟ وہ تو کہیئے ہمارے منجھلے بھیا بال بال بچ گئے۔ پچھلے سال یہ ڈاکٹرنی ولایت سے لوٹی۔ منجھلے بھیا سے نینی تال میں ملاقات ہوئی بھیا نے گھر آکر ہم لوگوں سے بہت تعریف کی۔ ہم نے کہا حسب دستور پیغام دینے سے قبل ہڈی بوٹی تو معلوم کروالو ــــ"

"آپ کے بھائی صاحب ORTHOPAEDICIAN ہیں ــــ ؟"

"جی ــــ ؟ وہ کیا چیز ــــ ؟" نگار خانم نے پوچھا۔ پھر بولیں "بڑی چھان بین سے تھوڑا سا پتہ چلا۔ اصل میں ماں بیٹیاں مدتوں فارن میں رہیں اس وجہ سے انکے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ خوش قسمتی سے ہمیں کسی کلکتے والے کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹرنی کی ماں بھی P تھی اور نانی بھی ــــ شکر کہ ہم بیوں کے خاندان سے بچ گئے۔ ورنہ کیا تھڑی تھڑی ہوتی۔ آپ کا تو کچھ اس قسم کا ارادہ نہیں ــــ ؟"

غصے کی وجہ سے ڈاکٹر منصور کو خود اپنا بلڈ پریشر بڑھتا محسوس ہوا۔ ترشی سے جواب دیا۔ "میں اپنے ذاتی معاملات DISCUSS کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"کم اون۔ آپ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ جیسے میں نے منجھلے بھیا کے متعلق آپ کو بتلایا اسی طرح پوچھ بھی لیا۔ لیجئے پسنے کھائیے۔ یہ بھی بے حد مہنگے ملے ہیں ــــ منجھلے بھیا کو دراصل یہ سودا ہو گیا ہے کہ گھر میں ایک ڈاکٹر ہونا چاہیے۔ بیوی ڈاکٹر ہو۔ ایک میٹرنٹی ہوم اسکے لئے بنوا دیں۔ اپنی نگرانی میں چلائے۔ بہنوئی ڈاکٹر ہوا سے سو پچاس بیڈ کا نرسنگ ہوم بنوا دیں۔ ان کے لئے معمولی بات ہے بفضل خدا۔"

"جی ۔ماشاءاللہ۔"

"آجکل دو چیزوں سے زبردست آمدنی ہے۔ ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم۔ ایک پرائیوٹ اسکول۔"

کھٹ — ڈاکٹر نے کیس بند کیا۔ نگار خانم کو انکے بلڈ پریشر کی اطلاع دی اور اُٹھ کھڑا ہوا —

"نرسنگ ہوم تو خیر آپ کا اپنا ہی موجود ہے۔ مگر ساجھے کا ہے — آپ اپنی بھٹ بھٹی پر آئے ہیں ؟" باجی پھر گویا ہوئیں۔

"جی —"

"منجھلے بھیا نے فییٹ کی ایجنسی لے لی ہے۔ آپ ایک گاڑی منتخب کرلیں۔ پے منٹ کی کوئی جلدی نہیں۔ ہوتا رہے گا۔"

شہوار بجیا کی بھونڈی باتوں سے نادم ہورہی تھی۔"ڈاکٹر صاحب کے مستقبل کے سارے انتظامات آپ کو آج شام ہی مکمل کرنے ہیں ؟ انھیں پکچر دیکھنے دیجئے۔" اس نے "جنون" کی آواز تیز کی۔ نفیسہ علی کا کلوز اپ دیکھ کر نگار خانم بولیں۔" اس عمر میں شہوار بالکل ایسی ہی لگا کرتی تھی۔"

"تو اب میں کون ایسی ANCIENT ہوگئی ہوں۔"

باجی واقعی سٹھیاتی جارہی ہیں۔

منصور نے شہوار پر نگاہ ڈالی۔ آج شام وہ گلابی غرارے کے جوڑے میں واقعی نہایت دلکش اور حسین نظر آرہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ پھر بلوری صوفے پر بیٹھ گیا۔

شیام سنگھ حاضر ہوا۔

"بٹیا۔ وہ کتابوں والے بڑے میاں بڑی دیر سے آئے بیٹھے ہیں۔"

"اس وقت ؟ بولو کل صبح آئیں۔" نگار خانم نے جواب دیا۔

"کہہ رہے ہیں انکا لڑکا بہت بیمار ہے۔ کچھ پیسے فوراً چاہئیں۔"

"ان غریب لوگوں کا ہمیشہ یہی رونا رہتا ہے۔ آج بیوی بیمار ہے۔ کل لڑکا بیمار ہے شہوار ذرا جا کر دیکھنا۔ سو پچاس دے کر رخصت کرو۔ روز آ کر سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔"

یہ نگار خانم ناموَرنا ولسٹ بہت ہی بدعورت ہے۔ منصور نے طے کیا۔ اور پھر اٹھا۔

"میں جا کر بڑے میاں سے معلوم کرتا ہوں۔ انکے لڑکے کو کیا مرض ہے۔ اس کے علاج کی کوشش کروں گا۔ تھرڈ ورلڈ میں۔ ٹی۔ بی ——"

"کہاں جا رہے ہیں بیٹھیے" نگار خانم نے گھبرا کر جواب دیا" لڑکے کو ہم نے بلرام پور ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ ان بڑے میاں کو جب آتے ہیں سو پچاس دیدیتے ہیں۔ آپ کس کس کی مدد کیجیے گا۔ یہاں ہر شخص یہی رونا روتا ہے کہ میرا حال پتلا ہے۔ بیٹھیے" نگار خانم نے انکا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھال دیا۔

منصور نے پھر پوچھا" یہ بڑے میاں کتب فروش ہیں؟ ابھی آپکے دربان نے ——"

"جلد ساز۔ ہمارا کتب خانہ ابھی پردھان پور سے منتقل ہوا ہے۔ چند خستہ قلمی نسخوں کی جلد بندی ان سے کروائی تھی تبھی سے یہ ہمارے پیچھے پڑ گئے"۔ شہوار نے جواب دیا اور باہر چلی گئی۔

اب بسنتی مہری اندر آئی" بڑی بٹیا —— چھوٹے بھیا کا پھون آوا ہے —— مسکت سے ——"

"اوہو —— معاف کیجیئے گا ابھی آئی۔ مسقط سے ٹرنک کال ——" نگار خانم بھی اٹھ کر مرصّع زینے کی سمت لپکیں۔

منصور پھر ویڈیو کی طرف متوجہ ہوا۔ "۱۸۵۷ء کی ایک سچی کہانی —— ایک پورشین ماں اور انگریز باپ کی لڑکی سے ایک پٹھان زمیندار کے جنوں خیز عشق کی داستان ——" نگار خانم نے چند روز قبل اس پکچر کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مخصوص میلوڈرامیٹک سٹائل میں اسے بتلایا تھا۔

تھیٹر —— نگار خانم کے ہاں بھی تھیٹر کی فراوانی ہے۔ عندلیب بانو کے ہاں بھی۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔۔ کہ

بے چاری مسز بیگ کے لئے ایک نامعلوم طریقے سے میرے روّیے میں فرق آگیا ہے۔ پہلے میں اپنی ماں یا خالہ یا کسی اور بزرگ عزیزہ کی طرح انکا بے انتہا احترام کرتا تھا۔ اب وہ بات کیوں نہیں رہی ؟ کیا میں بھی واقعی بنیادی طور پر شیخ عبدالباسط گوٹے والے کا وارث ہوں ؟ سارا فساد جانکاری کا ہے ۔ اودّیا بڑی نعمت ہے ۔

وہ اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ بالائی منزل پر دونوں بہنیں مسقط سے طویل گفتگو میں مصروف تھیں۔ کسی انسان کے پس منظر میں کوئی غیر معمولی سانحہ پنہاں ہو ـــــ اس کے کسی قریبی عزیز نے خودکشی کرلی ہو یا کسی کو قتل کرکے پھانسی چڑھا ہو یا اس کی کوئی عزیزہ اغوا کرلی گئی ہو ـــــ تو اس سانحے کی ایک غیر معلوم پرچھائیں سی اس بالکل غیر متعلق انسان کی شخصیت پر پڑ جاتی ہے ـــــ اگر دوسروں کو اس کے متعلق معلوم ہو جائے ـــــ اب بے چاری عنبریں۔ یہ حقیقت ـــــ کہ اس کی نانی کا نام نواب بائی تھا ـــــ ماں کا "بلبل دی ڈانسر" ـــــ محض اس وجہ سے عنبریں اب مجھے پہلے سے ذرا مختلف معلوم ہوتی ہے کاش وہ لال پٹاری بند رہتی ـــــ اسے محسوس ہوا دریچے میں سے کوئی بھیانک سی ریچھ نما شے اندر جھانک رہی ہے ۔ ذرا خائف ہوکر وہ پیچھے ہٹا ـــــ وہ شاگرد پیشے والا سبز پوش خبطی باہر دانت نکوسے کھڑا تھا۔ ایلس اِن ونڈرلینڈ کی CHESHIRE CAT کی طرح اندھیرے میں صرف اس کی مسکراہٹ نظر آرہی تھی ۔

باہر کار آکر رکی شہوار کے بڑے بھائی ہلدوانی سے واپس آگئے تھے ۔

"بھاگ جا بے ـــــ" پاگل دریچے پر دستک دے کر آہستہ بولا "بھاگ جا ـــــ ورنہ پھنسا اس اندرجال میں" وہ ایک قہقہہ لگا کر CHESHIRE CAT کی طرح تاریکی میں تحلیل ہونا شروع ہوا ۔

شہوار خانم اور انکے پیچھے بسنتی مہری کافی کے ٹرے لئے لاؤنج میں آئیں

پیچھے پیچھے قبلائی بہادر۔ رنگ برنگی اشیائے آرائش اور روشنیاں انتہائی بیش قیمت بلوریں فرنیچر پر منعکس تھیں۔ رنگ کے اندر رنگ۔ پرچھائیوں کے اندر پرچھائیاں۔ اندر جال کا طلسم۔

"بجیا کے نئے ناول کا —" شہوار نے کافی بناتے ہوئے منصور کو مخاطب کیا۔ "جشن اجرا ہونے والا ہے۔"

"مبارک ہو۔"

"سارے اردو اور انگلش پریس والوں کے صبح سے شام تک فون آتے رہتے ہیں۔ حالانکہ بجیا تو پبلسٹی بالکل پسند نہیں کرتیں۔ مجبوراً انٹرویو دینے ہی پڑتے ہیں۔"

"بیشک۔"

"آج بھی ایک اردو اڈیٹر نے ٹیلی فون کیا تھا۔ باجی کے متعلق اسپیشل نمبر نکالنے پر مصر ہیں۔ کل صبح آئیں گے۔ وہ باجی کے احباب سے بھی مضمون لکھوا رہے ہیں۔ یُو نو HUMAN ANGLE باجی بحیثیت ایک پرخلوص دوست آپ بھی کچھ لکھ دیجیے۔"

"میں —؟ مجھے معاف رکھیے — اچھا۔ اب اجازت؟" کافی کا ایک گھونٹ بھر کر منصور کھڑا ہو گیا۔

"نہیں۔ کچھ تو ضرور لکھیے۔ چند الفاظ — یا نہنتی پیغام رسالے کے لیے — آپ بھی ایک معروف شخصیت ہیں۔ اور باجی کے ذاتی معالج۔"

"بھئی شہوار۔ میں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔ نہ مجھے لکھنا لکھانا آتا ہے۔"

"اچھا انگریزی ہی میں چند الفاظ — کل صبح اس اخبار کے اڈیٹر صاحب باجی کو انٹرویو کرنے آ رہے ہیں۔ ان سے کہوں گی آپ کو فون کرلیں۔"

دوسری صبح، دس بجے، حضرت زاغ دہلوی، جناب بطلیموس اور جناب یفنا توُس

پنی سائیکلوں سے اترے۔ شیام سنگھ نے انکو آبشار والے کمرے میں پہنچایا۔

ایوان نشست کے مصنوعی پہاڑی نما مینٹل پیس سے ایک مصنوعی آبشار جاری تھا۔ جس کا پانی ایک پوشیدہ نالی کے ذریعے پائیں باغ میں جا گرتا تھا۔ کمرے کے وسط میں فوارہ۔ شیشے کی چھت میں سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔
"یہ کمرہ اگر نفاست سے سجایا جاتا تو بہت خوبصورت ہوتا۔ اب تو بالکل فرنیچر کا شوروم ——" حضرت زاغ نے اظہار خیال کیا۔
"بھائی خاموش رہیے ——" جناب بطلیموس نے آہستہ سے کہا۔
"صاحب انکی فیکٹری میں نوکری آپ کے لڑکے کو ملی ہے۔ خاموش میں رہوں۔" زاغ نے جواب دیا۔ ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے ایک سنہرے گھوڑے کو چھوا۔ اور بولے —— "رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے۔ نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں ——"
"زاغ صاحب بگلا گئے ہیں۔" یفناتوس بولے۔
"حق گو ہمیشہ پاگل کہلاتا ہے۔" انھوں نے سقراط کے مجسمے پر انگلی رکھی۔ "پورے کمرے میں یہی ایک معقول چیز نظر آئی۔ غلطی سے خرید لی ہوگی۔ آئیے حضرات ہم۔ یہاں گاندھی جی کے تین بندروں کی طرح بیٹھ جائیں۔ نہ کچھ دیکھیں۔ نہ سنیں۔ نہ بولیں۔"
"اہل ثروت سے اتنا تنفر آپ کے احساس کمتری کا غماز ہے ——" بطلیموس نے کہا۔ وہ تینوں ایک طویل سنہرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ٹیپ ریکارڈر سامنے منقش کافی ٹیبل پر رکھا۔ مصنوعی جھرنے کی آواز سنتے رہے۔
"صدائے آبشاراں از اطاق شاہوار آمد ——" زاغ دہلوی نے فرمایا۔

صاحبزادی شہوار خانم ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آئیں فرانسیسی "اوپیم" سے معطر۔ آداب عرض کرنے کے بعد تینوں صم بکم بیٹھے رہے۔ انکی بدتہذیبی پر جز بز ہوئیں
"اڈیٹر صاحب تشریف نہیں لائے؟" انھوں نے ایک مرصع اسٹول پر ٹکتے

ہوئے اس انداز میں دریافت کیا جو اپنے سے سماجی طور پر کمتر انسانوں کے لیے مخصوص رکھتی تھیں ـــــ یہ بے چارے منی مسکین سے صحافی۔ انھیں زیادہ سر چڑھانے کی یوں بھی ضرورت نہیں۔ فوراً بے تکلفی پر اتر آئیں گے۔ دراصل ہمارے مڈل کلاس مردوں کو ابتک بے پردہ آزاد خود مختار خواتین سے بات کرنے کی نہ عادت ہے نہ سلیقہ۔ اگر ذرا دوستانہ انداز میں بات کی فوراً مغالطے میں مبتلا۔ ہمارے ہاں بیشتر لوگ ابتک مخلوط سوسائٹی کے عادی نہیں۔ لیکن بجیا کا حکم کہ اردو پریس کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آؤ۔ میں اردو رائٹر ہوں۔ میرا تعلق اردو پریس سے ہے۔ شہوار مصر تھیں کہ جشن اجراء کے متعلق ایک پریس کانفرنس کلاس اودھ میں کی جائے۔ اس میں انگلش کے نیشنل روزناموں ٹائمز آف انڈیا، اسٹیٹسمین، ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس وغیرہ کے اسمارٹ، پائپ پیتے ہوتے نمائندے مدعو ہوں۔ نہ کہ یہ ٹٹ پونجیے اردو والے۔

"جی۔ اڈیٹر صاحب نہیں آسکے اپنے بجائے ہم تینوں کو بھیجا ہے" بطلیموس نے جواب دیا اور زاغ دہلوی پر متفکر نظر ڈالی جو نہایت انہماک سے اپنے سامنے رکھے کاغذ پر DOODLING کر رہے تھے۔ "نگار خانم اردو فکشن کی للیتا پوار۔" بطلیموس نے کاغذ ان سے چھینا اور پھاڑ کر اپنے بریف کیس میں چھپا دیا۔

"آج صبح نگار صاحبہ نے اڈیٹر صاحب کی یاددہانی کی تھی کہ انٹرویو کے لئے منتظر ہیں ـــــ" زاغ صاحب نے فرمایا۔

"پہلے آپ صاحبان کا تعارف ہو جاتے۔" شہوار خانم خاصی رکھائی سے بولیں۔

"خاکسار کا قلمی نام بطلیموس ہے۔ مزاحیہ کالم لکھتے ہیں۔ آپ جناب یفنا نوئس ہیں۔ یہ بھی ان کا فرضی نام ہے ـــــ"

"جی۔ اتنا تو میں سمجھ سکتی ہوں۔ کسی شخص کا نام سید یفنا نوئس حسین تو ہو نہیں سکتا۔" بطلیموس اور یفنا نوئس نے توصیفی قہقہہ لگایا۔ شہوار خانم سنجیدہ رہیں۔

"ہم فیچر لکھتے ہیں۔ زاغ صاحب سنڈے اڈیشن کے لئے مزاحیہ سیاسی غزلیں" بطلیموس نے عرض کیا۔

"اڈیٹر صاحب نے کہلوایا ہے کہ آپ نے جشن اجراء کے لئے جو تاریخ طے کی ہے اس کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیجئے کیونکہ اُس ہفتے چیف منسٹر صاحب اور دوسرے وی۔ آئی۔ پی لکھنؤ سے باہر ہوں گے۔ علاوہ ازیں جس قسم کا شاندار اسپیشل نمبر نگار صاحبہ چھپوانا چاہتی ہیں اس کی تیاری میں بھی دیر لگے گی۔"

"باجی اسپیشل نمبر چھپوانا چاہتی ہیں؟ خود آپ کے اڈیٹر——"

"میڈم۔ ہم پریس کے آدمی ہیں۔ ہم سے کیا پردہ؟" زاغ صاحب نے فرمایا

یہ شخص بہت ہی بیڈھب تھا۔ بے تُکا۔ شہوار خانم کا پارہ تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ باجی کی نصیحت یاد کر کے خاموش رہیں۔ سرد مہری سے پوچھا "اپوائنٹمنٹ آپ کے اڈیٹر سے تھا۔ وہ کیوں نہیں آئے——؟"

"انھوں نے فرمایا نگار خانم عصمت چغتائی تو ہیں نہیں جو انکو انٹرویو کرنے میں خود جاؤں" زاغ صاحب بولے۔ شہوار کا چہرہ غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا بطلیموس اور یفنانوس نے زاغ صاحب کو گھور کے دیکھا۔ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوتے۔

"اڈیٹر صاحب کو یاد دلا دیجئے گا ہماری فیکٹریوں کے سارے اشتہار آپ کے اخبار کو دیے جاتے ہیں۔" صاحبزادی شہوار نے ایسی برفیلی آواز میں جواب دیا جو سیدھی قطب شمالی سے آرہی تھی۔

"بھائی زاغ آج آپ نے ہم دونوں کو نوکری سے نکلوانے کا بندوبست اچھّا کیا۔" بطلیموس نے رنجیدگی سے بات کی۔

"زہر ہلاہل کو کہا جائے قلاقند؟"

"خاموش رہیئے۔"

میں بھی خاموشی کی سازش میں شامل ہو جاؤں۔جی ؟ شہوار خانم اپنے بھائی کی فیکٹریوں کا رعب ڈال رہی تھیں۔"

"ایک ناول نویسی کی فیکٹری تو بڑی بہن چلا رہی ہیں۔ انکے ہر ناول پر چھپنا چاہیے نگار خانم پروڈکشن۔"

"زاغ صاحب اب آپ خود ایک اخبار نکالیے۔ اسکا نام رکھیے صورِ اسرافیل" بطلموس نے ترشی سے جواب دیا۔

وہ تینوں املتاس کے نیچے رکھی سائیکلوں کی طرف بڑھے۔

اپنی بائیسکل کا تالہ کھولتے ہوئے بطلیموس نے سر اٹھا کر درخت کو دیکھا۔ اور افسردگی سے بولے ۔" اللہ غنی۔ آج سے چالیس بیالیس سال قبل ہم اس پیڑ کی چھاؤں میں سائیکل کھڑی کیا کرتے تھے۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ہم آج بھی اسی املتاس کے نیچے کھڑے سائیکل ــــــــ"

"یہ خاندان تو دو سال قبل ہی یہاں منتقل ہوا ہے۔" یفنا نوش نے کہا۔" پہلے تو یہ لاپلاز میں رہتے تھے۔"

"ہم ۱۹۴۱ء کی بات کر رہے ہیں۔ یہاں ایک زرد رنگ کی کوٹھی تھی۔ اس میں دو بہنیں رہتی تھیں۔ لال بیبیاں۔ ہم جوبلی کالج میں پڑھتے تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں۔ ٹیوشن کرنے یہاں آتے تھے۔ وہ دونوں ہم سے اردو پڑھتی تھیں ــ بڑی بہن بہت ذہین تھی۔ تیز و طرار ـــ اردو بھی بہت صاف بولتی تھی۔ نورا ڈریک ـــ"

(۲۳)

لال بی بی

نورما تورین ڈریک۔ باپ کا نام: جارج نورمن ڈریک۔ سابق ٹکٹ چیکر ایسٹ انڈین ریلوے
ساکن لال باغ۔ لکھنؤ۔

لال باغ لکھنؤ میں جو سڑک حضرت گنج جاتی ہے اس کے نکڑ پر چند کاٹجیں ایک قطار میں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں لال بیبیاں رہا کرتی تھیں۔ ایک بار ایسا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ ــــ ٹرینیں کھچا کھچ بھری ہوئی چل رہی تھیں۔ برج اور ٹینس کے مشہور کھلاڑی کنور دلشاد علی خان عرف دلن میاں کے چچا ٹھاکر جواد علی تعلقدار دھانپور ــ اللہ بخشے سیدھے سادے نیٹو جنٹلمین بہت کم سفر کرتے تھے اور انگریزوں سے گھبراتے تھے۔ ایک روز کانپور سے لکھنؤ واپس آرہے تھے۔ ٹرین چھٹنے سے چند منٹ قبل کانپور ریلوے اسٹیشن پر پہونچے۔ ہر سکنڈ اور فرسٹ کلاس میں گورے فوجی۔ اُن سے بچنے کے لئے ایک انٹر کلاس میں گھسے۔ اس میں بے شمار کالے ٹن۔ انگریزوں سے بچنے کے لئے یہ صعوبت اٹھائی تھی دیکھا تو یہاں بھی ایک عدد میم موجود۔ راجہ صاحب کے شوقین بھتیجے دلن جو برٹش اور امریکن فلمی رسالے منگواتے تھے ان میں چھپنے والی ولائتی ایکٹرسوں کی ایسی۔ بندکی دار فراک سر پہ بُندکی دار پگڑی نما اسکارف۔ ساتھ ایک بے حد شریر پانچ سالہ بچہ۔ کھڑکی میں بیٹھی ایک گورے ٹامی سے باتیں کر رہی تھی جو باہر پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ اور اسے پہونچانے آیا تھا۔ ٹھاکر جواد علی فوجی عہدوں کے نشانات سے ناواقف تھے۔ انکے لئے ہر گورا وردی پوش بڑا افسر تھا۔ انکو میم کے بالکل برابر جگہ ملی۔ دم بخود بیٹھے افسوس کرتے رہے کہ رش کی وجہ سے

بے چاری کو انٹر کلاس میں سفر کرنا پڑا۔ جوں ہی ٹرین چلی میم کا بچہ انکی طرف متوجہ ہو
اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ ان سے چھینا جھپٹی شروع کر دی۔ انکی ململ کی نفیس
دو پلی ٹوپی اتار کر خود اوڑھی اور جوتوں سمیت گود میں چڑھ کر کودنے لگا۔ میم اس ک
ڈانٹنے کے بجائے اطمنان سے "فوٹو پلے" پڑھتی رہی جو گورے سارجنٹ نے
اسے وھیلرز سے خرید کر دیا تھا۔

میم کارمن میرانڈا کی نئی فلم "ڈاؤن ارجنٹینا وے" کی کہانی ملاحظہ کر رہی تھ
اس کے لڑکے نے راجہ جواد علی کی طلائی جیبی گھڑی مع طلائی زنجیر جیب
سے گھسیٹ لی۔ اور اسے پھرکی کی طرح گھمانے لگا۔ تب ماں نے گھڑی اس کے
ہاتھ سے لے کر ٹھاکر صاحب کو دی۔ ایک نظر ان پر ڈال کر بڑے اخلاق سے معذرت
چاہی — ٹھاکر صاحب نے اپنا تعارف کرایا۔ کارڈ نکال کر دیا۔ "راجہ جواد علی خان
آف دھان پور۔" میم نے اُسے پڑھا اور زیادہ اخلاق سے باتیں کرنے لگی۔ بڑی
ملنسار عورت تھی۔ کاش ہر انگریز ایسا ہوتا چودھری صاحب نے دل میں سوچا۔
اتنے میں سیٹ سے اٹھتے ہوئے ایک مسافر کا پاؤں میم کے پاؤں پر پڑ گیا۔ وہ
بے حد تیز آواز میں چلائی۔ "یو بلڈی انڈین آر یو بلائنڈ — بلڈی فول بروک مائی
بلڈی ٹو —"

"بلڈی" اس کا تکیہ کلام معلوم ہوتا تھا۔

لکھنؤ آ گیا۔ میم نے ٹھاکر صاحب کو اپنا کارڈ دیا۔ اور بولی کسی روز ضرور آیئے
گا۔ کیسی خوش اخلاق فرنگن تھی۔ وہ اور اس کا بدتمیز لڑکا اسٹیشن سے باہر تانگہ اسٹینڈ
پر بھی نظر آئے۔ میم نے دُور سے ٹھاکر صاحب کو بائی بائی کیا۔

چند روز بعد کرسمس ویک آیا۔ جو برطانوی دور کے لکھنؤ میں بڑا چہل پہل کا زمانہ
ہوتا تھا۔ راجہ جواد علی خان اپنی پرانی ڈوج پر حضرت گنج سے گزر رہے تھے خیال آ

میم صاحب کو سیزن کی مبارکباد دیتے چلیں۔ بے چاری نے بڑے اخلاق سے مدعو کیا تھا۔ گاڑی راوک کراس بے ہودہ بچے کے لئے ایک قیمتی ولایتی کھلونا خریدا اور لال باغ کا رخ کیا۔ ہیلمز بلڈنگ کے نکڑ پر پہونچ کر ایک تنبولی سے پوچھا: "کیوں میاں! یہاں صاحب لوگ کس طرف رہتا ہے۔" جیب سے میم کا دیا ہوا وزٹنگ کارڈ نکالا۔ "مس نورما ڈریک" اور رینواڑی کو کوٹھی کا نمبر بتلایا۔

"جی ہاں سمجھ گئے۔ بہت صاحب لوگ ادھر آتا ہے۔ وہ سامنے جائیے۔ جس بنگلے میں املتاس کا پیڑ کھڑا ہے۔"

"کو کا پوچھت ہیں؟" ایک راہ گیر نے ٹھٹک کر سوال کیا۔

"ایک ٹھو لال بی بی کا پوچھت ہیں۔ ہیاں اور کو کا پوچھیں۔"

"کون سی والی لال بی بی؟ ڈورا میم صاحب؟"

"نہیں نورما مس صاحب۔"

"ارے وہی سامنے تو بنگلہ ہے۔" راہ گیر نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

"لال بی بی" کا مطلب چودھری صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا —— خیر ہوگا۔ آگے بڑھے۔ کرسمس کی وجہ سے ہر کاٹج کا برآمدہ کاغذی رنگین غباروں اور چمکیلے "اسٹار اوف ڈیوڈ" سے آراستہ۔ ولایتی موسیقی کی آواز ہر گھر سے آرہی تھی۔

ڈورج املتاس والی کوٹھی کے پھاٹک میں لے گئے۔ برآمدے میں ایک بوڑھا انگریز آرام کرسی پر نیم دراز پائپ پڑھ رہا تھا۔ بیر کا مگ تپائی پر دھرا تھا۔ ایک لبریڈور فرش پر خوابیدہ۔ راجہ صاحب نے حلق صاف کرکے کہا "گڈ مورننگ سر —— میری کرسمس!"

بڈھے نے گاڑی اندر آتی دیکھ لی تھی۔ اخبار مُنہ کے سامنے سے ہٹا، مسکرایا اور پوچھا: "ہلو کس سے ملنا مانگتا؟"

"مس ڈریک سر۔"

"نورما یا سیلی؟"

راجہ صاحب نے گھبرا کر پھر کارڈ نکالا "نورما ڈریک سر۔ ٹرین میں ملی تھیں۔
ہم نے کہا بابا لوگ کو بڑا دن وِش کر آویں۔"

"اوہ ——— کم ایلونگ ——" بڈھا جو شکل سے مس ڈریک کا باپ معلوم ہوتا تھا
راجہ صاحب کو ایک نفیس ڈرائنگ روم میں بٹھا کر غائب ہو گیا۔ کمرے کے ایک کونے
میں اونچی سجی سجائی کرسمس ٹری استادہ تھی۔ آتش دان پر کرسمس کارڈ —— دیواروں
پر گریٹا گاربو کلارک گیبل اور ڈوروتھی لیمور کی تصاویر۔ ایک کالی چمریشین عورت جھاڑن
ہاتھ میں لئے اندر آئی جو بعد میں ٹھاکر صاحب کو معلوم ہوا کہ بڈھے کی بیوی اور مس نورما
ڈریک کی ماں تھی۔ وہ اس عورت کو آیا سمجھے۔ اب تعلقدارانہ تحکم سے فرمایا: "راجہ صاحب
دھان پور۔ ٹرین میں ملے تھے مس صاحب کو سلام بولو۔"

"یس راجہ صاحب" چمریشن نے مرعوب ہو کر جواب دیا۔ "مس صاحب ابھی آتا
ہے" باہر چلی گئی۔ دفعتاً خیال آیا اگر یہ مس ڈریک ہیں تو وہ بچہ ان کا لڑکا کیسے ہے۔
خیر ہو گا۔

چودھری جواد علی بیٹھے اکتا گئے۔ صوفے کے نیچے اخبار کا ایک پرزہ پڑا ہوا تھا۔
اس میں شاید کوئی امریکن فوجی کرسمس کا تحفہ لپیٹ کر لایا ہو گا لاس اینجلز کے کسی اخبار
کا ذرا سا ٹکڑا۔ ٹھاکر صاحب نے اٹھا کر وہی پڑھ ڈالا ——— سی۔ بی۔ ایس۔ "بلونڈی"
"بگ ٹاؤن" "شوز۔ ایڈورڈ جی روبنسن۔ لوکل ڈرافٹ بورڈ۔ ٹامس ماسٹر سنگر۔ بنگرا
روحانی نغمے اور ' ڈرنک ٹوٹی اونلی ود دائن آئیز' —— کیری می بیک ٹو اولڈ ورجینی:
کلیرنس سیل۔ ۶۴۲۵ سن سیٹ بولوار۔ کورنڈ بیف ۱۷ بسنٹ۔ وی آنا ساسیج ۸ سینٹ

تبھی پردہ سرکا اور گلابی ساٹن کے ولایتی فرغل میں ملبوس —— متبسم ، اداس
معطر مس ڈریک داخل ہوئیں۔ ٹھاکر صاحب کا کسی گوری چمڑی والے سے اس
گھر پہ ملنے کا اتفاق کم ہوا تھا۔ نہ انکو یہ معلوم تھا کہ کوئی شریف اور شائستہ انگریز خاتو
ہاؤس کوٹ پہن کر کسی اجنبی سے ملاقات نہیں کریگی۔

نورما ڈریک انکے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا "بابا کیا ہے۔ ہم اس کے لئے یہ معمولی سا کرسمس پریذنٹ ——"

"او ہاؤ نائس آف یو —— تھینک یو —— راجہ صاحب۔ مگر جارج بابا تو کل اسکول چلا گیا۔ بارلو گنج۔ مسوری —— آپ کیا پیئے گا؟ کوئی ایک —— ؟"

"مس صاحب ہم محمڈن آدمی ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔ بس آپ کو بڑے دن کا سلام کرنے چلے آتے تھے۔" نورما ڈریک زور سے ہنسی۔ سمجھ گئی لڑہیں۔

باہر نکلے۔ اسی وقت ایک سرمئی شیو آ کر رکی۔ اودھ چیف کورٹ کا ایک انگریز جج برآمد ہوا۔ ٹھاکر جواد علی اُسے پہچان گئے۔ دل میں سوچے اپر کلاس لوگ ہیں۔ انگریز ہائی کورٹ جج ملنے آیا ہے۔

جج نے ذرا ترش روئی سے ان پر نگاہ ڈالی اور سر اٹھائے ناک کی سیدھ ڈرائنگ روم میں چلا گیا ——

چند ماہ بعد راجہ جواد علی نے کلکٹر لکھنؤ ادریس نویس لائیڈ کی دعوت پر چھاؤنی میں فوجی دلخوش سبھا کی ایک تقریب میں شرکت فرمائی تو وہاں یہ دیکھ کر بھونچکے رہ گئے کہ مس نورما ڈریک اونچا لہنگا اور شیشے کے کام کی چولی پہنے ماتھے پر سنگھار پٹی اور بور سجائے ایک پنڈال کے نیچے ناچ رہی تھی۔ نام اس کا مس نرملا دیوی اناؤنس کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور گوری چھوکری نے ہندوستانی ناچ دکھایا۔ اس کا اسٹیج کا نام شیلا دیوی اور اصل نام ونی فریڈ کلیٹن تھا۔ وہ بھی لال باغ کی ایک لال بی بی تھی بے چارے راجہ صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ لال بیبیاں کلکتے کی یہودی رقاصہ مس ہینسن اور یورشین رادھا رانی اور ڈورین عرف مس منجری اور اینڈی ریناال عرف مس بلبل کی روایت کی یادگار تھیں —— اور انکے کنبے شاہی کے زمانے سے لکھنؤ میں رہتے آتے تھے۔ ٹھاکر جواد علی کو اپنے اوپر بے حد غصہ آیا۔ اس روز کیسے بیوقوف بنے۔

چودھری جواد علی جتنے بھولے اور نیک تھے۔ انکے مرحوم چھوٹے بھائی کا لڑکا دلن اتنا ہی شاطر اور حرفوں کا بنا۔۔۔ چودھری صاحب بے چارے کی بیوی بچے مر چکے تھے چھوٹے سے تعلقے دھان پور کے مالک تھے۔ اس کی ڈھائی تین ہزار ماہوار کی آمدنی میں فراغت سے گزر کرتے تھے۔ جاپلنگ روڈ پر رہتے تھے اور فارسی ادب اور صوفیائے کرام کی ملفوظات کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ یا اپنے اکلوتے بھتیجے اور وارث دلن صاحب کی تعلیم و تربیت کی ناکام کوشش میں۔۔۔

اگر آپ کو ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے اور چارمنگ راسکل کی صحیح اور دلکش تصویر دیکھنی منظور ہے تو کسی شام کبھی چھتر منزل کلب یا دلکشا کلب جاکر کنور دلشاد علی خان آف دھان پور سے ملنا چاہیے۔ یہ نوجوان شخص اس وقت تک لا مارٹینیر لکھنؤ سے انٹرمیڈیٹ نہیں کر پایا تھا۔ البتہ تاش کا ماہر تھا۔ بیلہ اچھا بجاتا تھا۔ اصغر علی محمد علی والے حاجی اصطفےٰ خاں کے ساتھ اسکیٹنگ کرتا تھا۔ اپنے تایا کو بہت مانتا تھا۔ ان کا ادب کرتا تھا۔ اور انکو چونا لگانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔

اس روز بڑے باپ فوجی دلخوش سبھا کے جلسے سے لوٹ کر آئے تو بہت ملول معلوم ہو رہے تھے۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔

دیوان خانے میں آکر اپنی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے بھتیجے سے دریافت کیا (جس کی اس ڈپارٹمنٹ سے واقفیت کا انھیں تھوڑا سا علم تھا)۔۔۔

"کیوں میاں یہ لال بیبیاں کون چیز ہیں؟"

"بڑے ابا آپ معلوم کرکے کیا کیجئے گا۔ مخرب الاخلاق شے ہیں۔"

"ہاں مگر اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ گوری بھچ اور بے تحاشا پاؤڈر سرخی ممکن ہے اس وجہ سے عوام نے انکو لال بی بی کہنا شروع کر دیا ہو۔"

"عین ممکن ہے۔۔۔" بھتیجے نے مختصر جواب دیا۔ لیکن بڑے باپ اسکالر آدمی۔۔۔ ان کو ٹوہ لگ گئی تھی۔ عینک لگائی۔ اٹھ کر ایک الماری سے تین ضخیم فرہنگیں اُتاریں مگر کھولے بغیر واپس رکھ دیں۔ اپنی جگہ پر آن بیٹھے۔

"بھیا پرانی اردو میں ——"

دلن بھیا اس وقت اپنی بندوق صاف کرنے کے بعد ایک امریکن مووی میگزین میں سوئیٹ گرل لانا ٹرنر کے متعلق مضمون پڑھ رہے تھے۔ بے دھیانی سے سنا کئے۔

بڑے ابا فرما رہے تھے۔ "مستورات قرآن شریف کو لال کتاب کہتی تھیں۔ اسی طرح لال خیمہ، لال کمرہ، لال ڈگی مطلب اہم۔ مگر لال بی بی۔ شاید اس وجہ سے کہ لال باغ میں رہتی ہیں؟ —— جان کمپنی کے زمانے میں بی بی انگلش میڈ سرونٹ کو بھی کہتے تھے اور کم حیثیت انگریز عورت کو بھی۔ اونچے درجے کی میم بڑا بی بی کہلاتی تھی انگریز لوگ ہندوستانی طوائفوں کو بھی بی بی کہتے تھے۔"

"جی بڑے ابا۔ ہم نے سنا ہے کہ لال بی بیوں کا طبقہ جان کمپنی کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ اور رم جینوں کو گورے RUM JOHNNY پکارتے تھے!"

"اور بھلا لال باغ نام کیوں پڑا؟ کہ وہاں لال بیگی رہتے تھے؟"

"بڑے ابا —— ہم ذرا گون ود دی ونڈ دیکھ آویں؟ پچھلی بار مس کر دی تھی۔"

دلن بھیا کی آسٹن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ بڑے ابا بے چارے حقہ گڑگڑاتے، لال بی بی کی وجہ تسمیہ پر غور کرنے میں منہمک رہے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔

چند سال بعد ٹھاکر جواد علی بھی مع تعلقہ دھان پور گون ود دی ونڈ ہو گئے۔ راجہ صاحب نے رحلت کی۔ دھان پور "ابولیشن آف زمینداری" میں غائب ہوا۔ رہ گئے دلن بھیا جو بونڈز فروخت کر کے، اپنے رئیسانہ مشاغل میں مصروف رہے۔ گرمیوں میں بوٹ کلب نینی تال۔ جاڑوں میں چھتر منزل کلب لکھنؤ۔ شکار کیلئے ترائی۔

بڑے باپ کی وفات کے چند ماہ بعد اپنی جیگوار (جو ولایت واپس جانے والے ایک انگریز سویلین سے خریدی تھی) حضرت گنج سے گزر رہے تھے انکو سابق امبر ہلوررراج کا انور اعظم نظر آیا۔ جو اپنی نیلی کار برابر اڑا جا رہا تھا۔ اس کے

ساتھ ہبر ورڈ لال باغ والی ایک لال بی بی کوئین روز بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس نے سرخ رنگ کی ہیٹ لگا رکھی تھی ۔ جس پر رنگ برنگے مصنوعی پھول چسپاں تھے۔۔ اس سرخ ہیٹ پر نظر پڑتے ہی معًا دلّن میاں کے ذہن میں آیا ۔۔۔۔ لال بی بی اسکارلٹ وومن کا ترجمہ رہا ہوگا۔ یا ایک زمانے میں انکے مکانوں پر شاید سرخ لالٹین رکھی جاتی ہو ۔ عقدہ حل ہوگیا ۔

اسٹرنگ وھیل کو چکر دیا ۔ مُڑ کر گھر جائیں اور بڑے ابا کو بتائیں کہ لال بی بی کے معنی معلوم ہوگئے ۔ اسی لمحے دل پر چوٹ سی پڑی ۔ بڑے ابا تو ملکِ خاک بسا چکے۔

جاپلنگ روڈ کی کوٹھی دھان پور کے مکانات فروخت کیے ۔ مرحوم راجہ جوادؔ علی کا کتب خانہ کباڑی کے ہاتھ بیچا ۔ ترکے کا پیسہ اور پونڈز کی قیمت جلد از جلد بخیر و خوبی اُڑا کر نوجوان راجہ صاحب دھان پور نے پَر نولے ۔۔ ” صاحبزادہ دلشاد علی خان آف دھان پور “ کے وِزیٹنگ کارڈ چھپوائے ۔ پاکستان میں راجہ اور ٹھاکر کے موروثی خطاب سے شاید لوگ کنفیوز ہوتے ۔ ایک سہانی صبح لکھنؤ کو خیرباد کہا اور بذریعہ ٹرین لاہور پہونچے ۔ اس کے بعد دنیائے دُوں میں حوصلہ آزمائی کیلئے نکلے ۔ سوائے اپنی وِٹ اور چارم کوئی اثاثہ نہ رکھتے تھے ۔

تاش کی مہارت ان کا سب سے بڑا حربہ تھا۔

(۲۴)

نورِ ماہ خانم

جس وقت وکٹوریہ جہاز نے بلیرڈ پیر بمبئی سے لنگر اٹھایا ٹورسٹ کلاس میں بھانت بھانت کے ہندوستانی طلباء بھرے ہوئے تھے۔ اسی مجمع میں کلکتے کی ڈاکٹر ایسے۔ بیگ بھی شامل تھیں جو اڈنبرا میڈیکل کالج جا رہی تھیں۔ مسز ایس بیگ انکے ہمراہ تھیں متموّل پارسی خوجے بوہرے اور غیر ملکی فرسٹ کلاس میں ٹہلتے پھر رہے تھے۔ بندرگاہ کراچی سے بھی پاکستانی طلبا و طالبات زیادہ تر ٹورسٹ کلاس میں سوار ہوئیں۔ اعلیٰ فوجی اور سویلین افسروں، پاکستانی پارسیوں متموّل خوجوں بوہروں نے فرسٹ کلاس کا رخ کیا۔ درجہ اوّل کی فہرست میں صاحبزادہ دلشاد علی خاں کا اسم گرامی شامل تھا۔ ٹورسٹ کلاس میں ایک اینگلو پاکستانی عورت بھی موجود تھی بحر پیماؤں کی فہرست میں اسکا نام نورِ ماہ خانم درج تھا۔ وہ عموماً الگ تھلگ ایک ڈیک چیئر پر بیٹھی انگریزی جاسوسی اور رومانی ناول پڑھتی رہتی۔

صاحبزادہ دلشاد علی خان عدن پہونچتے پہونچتے فرسٹ اور ٹورسٹ کلاس کی ہر قومیت اور ہر عمر کی خواتین میں یکساں طور پر مقبول ہوگئے — وہ آرام کرسیوں پر چپ چاپ بیٹھی معمّر خواتین سے انکی مختلف النوع علالتوں پر تبادلہ خیالات کرتے انکے نانی پوتوں کی تصویریں دیکھتے۔ نوجوان خواتین کو انکے ڈریس سنس اور اسمارٹ نس اور خوبصورتی پر مبارکباد دیتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ مغربی بوڑھوں اور نوجوانوں سے انکی دلچسپی کی گفتگو کرتے۔ بچوں کو تاش اور جادو کے کھیل دکھاتے اڑتیس ۳۸ سالہ صاحبزادہ صاحب اپنی کنپٹی کے گرے بالوں اور وجیہہ شخصیت کی وجہ سے ہر بین الاقوامی

مجمع میں ممتاز نظر آسکتے تھے ۔ لاتینیڈ ٹریسٹینو کے اس اطالوی جہاز پر ان کی ہر دلعزیزی باعثِ تعجب نہ تھی ۔

عدن پہونچنے سے دو روز قبل صاحبزادہ صاحب کی نورِ ماہ خانم سے ملاقات فرسٹ کلاس بار پر ایک ایسی رومان پرور شام ہوئی جب آسمان اور سمندر پر پونم کا چاند جگمگا رہا تھا۔ اور مسافر لنڈا ڈارنل کی چند سال پرانی فلم "FORFVER AMBER" دیکھ کر واپس آچکے تھے ۔

نورِ ماہ خانم ٹورسٹ کلاس کی مسافر تھی لیکن ایک پاکستانی خوجے بزنس مین کی دعوت پر ادھر فرسٹ کلاس بار پر آئی ہوئی تھی ۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اپنی جہاں دیدہ نظروں سے بھانپا کہ یہ اینگلو انڈین یا اینگلو پاکستانی گرگ باراں دیدہ ان سے چند سال بڑی لیکن انھیں کی طرح ہارڈ بوائیلڈ اور سخت جان ہے ۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ اسے پہلے کہیں دیکھ چکے ہیں ـــــ صاحبزادہ صاحب نے خوجے سے بات چیت شروع کی ـــ پھر اس خاتون سے پوچھا "کیا آپ لاہور جم خانہ اکثر جاتی ہیں ؟ شاید میں نے آپ کو وہاں دیکھا ہے ۔"

نورِ ماہ خانم کو اس OPENING GIMMICK کی حاجت نہیں تھی ۔ مسکرا کر نفی میں سر ہلایا ۔ اور انکے اگلے MOVE کی منتظر رہی ۔ صاحبزادہ صاحب سوچا کئے ۔ کیانتی سے پُر بوتل روشن سی ہوئی دفعتاً بڑے ابا مرحوم یاد آئے ۔

اللہ جنت نصیب کرے یہ بڑے ابا مرحوم والی لال بی بی تھی ۔ کمال ہے ۔ کہاں سے کہاں ـــــ ! بارمینڈ نے ان کا دوسرا گلاس کیانتی سے بھرا ۔ اور ان کو وہ پورا منظر یاد آیا ۔ گیارہ سال قبل کا حضرت گنج ۔ ۱۹۴۵ء ۔ وکٹری ڈے کی شام جشنِ فتح کی چہل پہل اور ہجوم ۔ دلن میاں اپنے دوست کنور بنڈی کے ساتھ انڈیا کافی ہاؤس سے نکل رہے تھے ایک موسیقار دوست مدن موہن دروازہ پر مل گیا ۔ بولا ۔ یار دیکھو

وہ نور رما ڈریک جا رہی ہے۔ وہی جو نرملا دیوی کے نام سے ناچتی ہے۔ لچھو مہاراج کی شاگرد رہ چکی ہے۔

نور رما ڈریک زرد جارجٹ کی ساری میں ملبوس، بھورے سیدھے بال۔ معمولی شکل۔ ایک گورے کارپورل کا بازو تھامے برآمدے میں سے گزر رہی تھی۔ دلن میاں سے نگاہیں چار ہوئیں تو پروفیشنل انداز سے مسکرائی۔

کنور دلشاد علی خان جو بیگمات راجکماریوں اور صاحبزادیوں کی سوسائیٹی کے عادی اور پبلک میں ایک عام اینگلو انڈین رقاصہ پر نظر ڈالنا کسر شان سمجھتے تھے بے نیازی سے ٹہلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ بے چارے بڑے باپ مرحوم اس لڑکی کو بڑی میم صاحب سمجھ کر اسکے گھر گئے تھے اگلے وقتوں کے لوگ اتنے بھولے ہوا کرتے تھے۔

وہ نور رما ڈریک عرف نرملا دیوی جو اس شام حضرت گنج کے ایک برآمدے سے گزر رہی تھی۔ بحیثیت نور رماہ خانم تربوزی شنیل کے شلوار سوٹ میں ملبوس اس وقت وکٹوریہ جہاز کی بار پر موجود تھی۔ اب بھی وہ سامنے سے گزر رہی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں۔

"اگر لاہور میں نہیں تو میں نے یقیناً آپ کو لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ حضرت گنج میں۔ آپ لال باغ میں تو نہیں رہتی تھیں؟"

نور رماہ خانم پھر مسکرائی۔ اب اسے اس دلکش اجنبی کو اپنے متعلق کچھ بتلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کی اپنی پرانی دنیا سے نکل کر سطحِ سمندر پر اچانک نمودار ہو گیا تھا۔ گو اس وقت دونوں پاکستانی تھے۔

"مختصر دنیا ہے۔" نور رماہ خانم نے معنی خیز تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

"اور بڑی شریر —— آپ پاکستان کب آئیں؟"

"سنہ سینتالیس میں۔ پارٹیشن سے ذرا قبل۔ مجھے لاہور میں پنچولی فلمز نے اپنی ایک پکچر میں ڈانس کرنے کے لئے بلایا تھا۔ میں وہیں تھی۔ شوٹنگ چل رہی تھی۔ جب پارٹیشن

ہو گیا اور وہ سب مار کاٹ۔ راستے بند ہو گئے۔ میری ایک کزن فلیٹیز ہوٹل لاہور میں گایا کرتی تھی۔ شاید آپ نے اس کا نام سنا ہو۔ مشہور سنگر تھی۔ بمبئی کے تاج میں بھی گا چکی تھی۔ رلیبن مارک ——— اس نے مجھ سے کہا۔ تہیں پاکستان میں رہ جاؤ۔ یہاں انٹرٹینمنٹ انڈسٹری بالکل INFANCY میں ہے۔ ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

"اور یوں بھی آپ جانتے ہیں انڈیا میں ہم لوگوں کی کمیونٹی کے لئے CHANCES بہت کم ہیں YOU KNOW THESE BLOODY INDIANS THEY HATE OUR GUTS ہم انگریز لوگوں کے لئے اب ہندو بنیوں کے انڈیا میں گنجائش کہاں تھی۔"

راجہ دلشاد علی خان زیرِ لب مسکرائے۔ ان کو یاد آیا بڑے ابا مرحوم نے بتلایا تھا کہ "بلڈی" "اینڈ اول" AND ALL مس نورما ڈریک کا تکیہ کلام تھا۔

بے چارے چودھری صاحب مرحوم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ایک چی چی اینگلو تکیہ کلام ہے۔

اپنے میزبان خوجے کو بالکل نظر انداز کر کے نورماہ خانم اسی کی خریدی ہوئی کیانٹی نوش کرتے ہوتے صاحبزادہ صاحب کو قصہ سناتی رہیں۔ "میرے پاپا کی دو سال قبل وفات ہو چکی تھی۔"

"اور آپکی والدہ ——— ؟ میرے انکل ان سے بھی آپ کے ہاں ملے تھے۔"

نورماہ خانم ہچکچائیں۔ "وہ میری ماں نہیں آیا تھی جس نے ہمیں پالا تھا۔ میری ماں یوریکا کیبٹن تھیں۔ ہمارے بچپن میں مر گئی تھیں۔ اس بے چاری آیا کا بھی انتقال ہو گیا ——"

"آئی سی ———" صاحبزادہ صاحب نے سر ہلایا۔ ہم سب کو اپنی اپنی نسل برتر اور خالص ثابت کرنے کا کسقدر سودا ہے۔ اور گورے رنگ کی کتنی اہمیت۔ ان بے چارے قابلِ رحم اینگلو انڈین لوگوں ہی کو کیوں مطعون کیا جاتے۔ بڑے ابا مرحوم فخریہ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ خالص سورج ونشی راجپوت ہیں۔

نورماہ خانم بولتی رہیں: "میں نے اپنی چھوٹی بہن سیلی کو بھی لاہور بلالیا۔ مگر میں نے جلد بازی سے کام لیا۔ لال باغ والی کوٹھی فروخت کرکے جانا چاہیے تھا۔ کوٹھی اتنی بڑی نہیں تھی مگر اس کا کمپاؤنڈ کتنا وسیع تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا باہر سے۔"

"آپکی ذاتی کوٹھی تھی؟"

"جی ہاں پاپا نے خریدی تھی۔ سیلی کے لاہور جاتے ہی کسٹوڈین نے قبضہ کرلیا۔"

"اور آپکا لڑکا ——؟"

"آپکو میرے لڑکے کے بارے میں بھی معلوم ہے؟"

"آئی ایم سوری۔ میں نوزی نہیں ہوں۔ دراصل میرے چچا مرحوم نے بتلایا تھا کہ ٹرین میں اس بچے ہی سے انکی دوستی ہوگئی تھی۔ اور وہ اسی کیلئے کرسمس پریزنٹ لیکر آپکے یہاں گئے تھے۔ میرے چچا ایک نہایت بھولے بھالے پاک باطن انسان تھے۔"

اچانک نورماہ خانم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

نوجے نے جو کچھوے کی طرح گردن جھکائے بار پر بیٹھا تھا مکینیکل انداز سے رومال پیش کیا نورماہ خانم نے جلدی سے آنسو خشک کئے۔ تھرڈ کا سلز سگریٹ جلایا۔

"آئی ایم سوری"، صاحبزادہ صاحب نے رنجیدہ آواز میں دہرایا۔

"جارج بارہ سال کا ہوگیا تھا۔ اسے لارنس اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ نتھیا گلی میں ایک روز گھوڑے سے گرا۔ سر میں چوٹ آئی۔ مجھے طوفانوں کے تھپیڑے کھانے کیلئے اکیلا چھوڑ گیا —— میں بالکل اکیلی ہوں"۔ نورماہ خانم نے پھر آنکھیں خشک کیں۔

آدھی رات۔ چاروں طرف سمندر۔ اوپر مغموم تنہا چاند۔ بار سنسان ہوچکی تھی۔ اداس آنکھوں والی اطالوی میڈ گلاس سمیٹ رہی تھی۔ اس نے ان بحری مسافتوں کے دوران ایسی پر فضا اُداس راتوں میں ان گنت مسافروں کی ان گنت المناک داستانیں اس خوش فضا عرشے پر سُنی تھیں۔

"بطور رقاصہ نرملا دیوی پاکستان میں نہ چلتا لہذا پروڈیوسر لو نے نورماہ خانم کردیا۔"

"جی ہاں آپکا نام تو بہت مشہور ہے۔ ایک آپ اور ایک وہ اینگلو پاکستانی ڈانسر کیا نام ہے ــــــ رُخسانہ ؟"

"جی مگر میرے ڈانس فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے ہیں"

خوجہ کاروباری جو ابلی ہوئی مینڈک نما آنکھوں سے اپنے گلاس کو تک رہا تھا۔ صاحبزادہ صاحب سے بولا "یہ اپنا نور بائی تو پاکستانی کلو کہلاتا ہے"

"بیشک۔ بیشک" انہوں نے صاد کیا۔

"میں سات آٹھ سال سے پاکستانی فلموں میں ناچ رہی ہوں۔ لیکن اب میری مارکیٹ ختم ہو چکی ہے پاکستانی فلموں میں ناچنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ میں لاہور اور کراچی کے بڑے ہوٹلوں میں فلور شو اکثر دیتی ہوں"

"برو بڑ ــــــ" خوجے نے جانکاری سے سر ہلایا "ایک مس ایمی من والا۔ ایک اپنا نور بائی دونوں فرسٹ کلاس ڈانسر"

"لیکن اب میرے ریٹائر ہونے کی عمر آگئی ــــــ" اس بے چارے خوجے کو نظر انداز کرکے بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے صاحبزادہ صاحب کو مخاطب کیا وہ راجہ دلشاد کی BREED اور بیک گراؤنڈ سے مانوس تھیں اور وہ ہندوستان کے نایاب اور اکثر ونک پرندوں اور جانوروں کی طرح اب ایک DYING BREED تھے۔ اور نور ماہ خانم کے ہم وطن تھے انکی موجودگی سے نور ماہ خانم کو چاروں طرف پھیلے بیکراں سمندر اور اجنبیوں سے بھرے اس جہاز میں بڑی انوکھی سی تقویت محسوس ہوئی۔ حالانکہ اپنے پروفیشن میں ساری عمر اجنبیوں ہی سے پالا پڑا تھا۔ مگر اب وہ خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہی تھیں۔ عمر کا تقاضہ تھا۔ صاحبزادہ دلشاد علی خاں گویا اس وقت بحیرۂ عرب میں روشنی کے مینار کی طرح نمودار ہوئے۔

بحیرۂ روم میں ایک روز صاحبزادہ صاحب نے نور ماہ خانم سے پوچھا "یہ نیچے تمہارے درجے میں دو گوری چٹی خواتین سفر کر رہی ہیں۔ وہ کون ہیں ۔ ؟"

مسز بیگ اور ڈاکٹر بیگ ـــــــ؟ پتہ نہیں۔ کلکتے سے آئی ہیں۔ سب سے الگ تھلگ رہتی ہیں۔ ماں بوٹ ڈیک پر جاکر تصویریں بنایا کرتی ہیں بیٹی موٹی موٹی میڈیکل کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔ کیا تم ان سے ملنا چاہو گے؟"

"غالباً نہیں۔"

"ہاں بیکار ہوگا۔ ایک تو یہ کہ وہ بہت زیادہ دولت مند نہیں معلوم ہوتیں دوسرے وہ تمہارا ٹائپ نہیں۔"

بات یوں تھی کہ سوئیز تک پہونچتے پہونچتے نورماہ خانم اور صاحبزادہ دلشاد علی آف دھان پور ایک قسم کے خاموش بزنس پارٹنر بن چکے تھے ـــــ نورماہ امیر کبیر مسافروں سے دوستی بڑھائیں انکو گھیر گھار کر صاحبزادہ صاحب کی کارڈ پارٹیوں میں شامل کرتیں۔ راجہ دلشاد علی ماہر فن کارڈ شارپر تھے۔

نورماہ خانم انکو بتلا چکی تھیں کہ وہ ہمیشہ کیلئے لندن جا رہی ہیں جہاں انکی چھوٹی بہن سیلی ڈریک پہلے سے پہنچ چکی ہے۔ ایک آسٹریلین یہودی پارٹنر کے ساتھ سوہو میں اس نے ایک مساج پارلر کھولا ہے اور ایک اسٹوڈیو جس میں لوگ اپنے اپنے کیمرے لاکر لڑکیوں کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ کئی فری لانسر گوری اور افریقی لڑکیاں سیلی اور ہنری کے اسٹوڈیو اور مساج پارلر سے منسلک ہیں۔ نورماہ خانم لندن جاکر اس بیحد منفعت بخش کاروبار کی دیکھ بھال میں اپنی بہن کا ہاتھ بٹائیں گی۔

صاحبزادہ دلشاد علی خان نے پائپ پیتے ہوئے اس اسکیم پر صاد کیا مگر GENOA پہونچتے وقت انھوں نے نورماہ خانم سے کہا: "اگر تم چاہو تو میرے ساتھ امریکہ بھی چل سکتی ہو۔ میں عموماً کوین ایلزابتھ یا کوین میری پر لندن سے نیویارک جاتے اور آتے ہوئے OPERATE کرتا ہوں۔"

نورماہ خانم نے وعدہ کیا کہ اس آفر پر غور کرینگی لیکن انھوں نے اس خوش گوار

بحری سفر کے دوران یہ بھی بخوبی نوٹس کر لیا تھا کہ انکے ساتھ معاشقے کے علاوہ صاحبزادہ صاحب خالص کاروباری انداز میں گو نہایت رکھ رکھاؤ اور شائستگی کیساتھ معمّر امریکن اور یوروپین خواتین کیساتھ بھی وقت گزارتے تھے —— فرسٹ کلاس میں متعدد امریکن کروڑپتی بیوائیں سفر کر رہی تھیں۔ جو حسبِ دستور شوہروں کی چھوڑی ہوئی بے اندازہ دولت خرچ کرنے کیلئے دنیا کی سیاحت پر نکلی تھیں۔

"ہم لوگوں کو ——" نورِ ماہ خانم نے جنیوا میں جہاز سے اترتے ہوئے صاحبزادہ دلشاد علی خاں سے کہا۔ "لکھنؤ کے عوام لال بی بی کہتے تھے —— تم جیسے لوگوں کو کیا پکارا جاتے ؟"

"لال میاں ——" انہوں نے سگریٹ سمندر میں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

(۲۵)
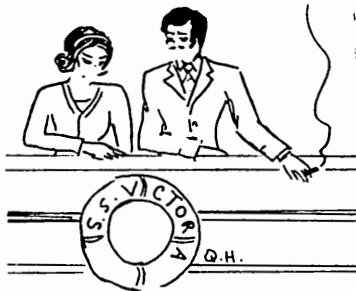
یہ قصہ ایک نوجوان برطانوی اسکالر کی نظر میں

میری ماں ایک اینگلو انڈین (یا اینگلو پاکستانی) رقاصہ ہے۔ میرا باپ ایک انڈین (یا پاکستانی) کارڈ شارپرا اور پروفیشنل جگ لو۔ اُسے انٹرنیشنل جیٹ سیٹ کا قرب حاصل ہے ایک ریٹائرڈ ہولی وُوڈ ایکٹرلیس کے بوائے فرینڈ کی حیثیت سے اس کا تذکرہ ہیڈا ہوپر اپنے کالم میں کر چکی ہے۔ وہ زیادہ وقت یورپ اور امریکہ کے درمیان فضائی سفر کرتے ہوئے گزارتا ہے۔ گو بحری سفر اور لکژری لائنرز کے خاتمے نے اسکی بزنس کو زبردست نقصان پہنچایا۔ مگر وہ متعلقہ کاروباروں میں مصروف ہو گیا اگرچہ ہم اسے بین الاقوامی انڈر ورلڈ کا بادشاہ نہیں کہہ سکتے البتہ وہ ایک خاصہ کامیاب اور بیحد چارمنگ انسان ہے۔

میری ماں ایک ریٹائرڈ ٹارٹ کے بجائے ایک سنجیدہ ہاؤس وائف معلوم ہوتی ہے۔ اس نے مجھے اس جزیرے کی بہترین درسگاہوں میں تعلیم دلوائی۔ اور اس چیز کا خیال رکھا کہ میں اپنے باپ کے نقشِ قدم پر نہ چلوں۔

میرا ایک بھائی تھا یعنی نصف برادر۔ اسکا باپ دوسری جنگ عظیم سے قبل کا کوئی انگریز میجر تھا۔ جو لکھنؤ چھاؤنی میں تعینات تھا۔ میرا وہ بھائی جارج بعمر بارہ سال بمقام کوہ مری گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اور اپنی بے چاری ماں کی دنیا اندھیر کر گیا۔ اس حادثے کے چھ سال بعد نور تارا خانم کی ملاقات صاحبزادہ دلشاد علی خاں سے اطالوی جہاز وکٹوریہ پر ہوئی اور میں عالم وجود میں آیا۔

میرے والدین ایک دوسرے کے بہترین اور پرخلوص دوست ہیں۔ انھوں نے

آج تک ایک دوسرے سے شادی نہیں کی۔ وہ دونوں اپنے آپ کو آزاد پرندے پکارنے
کے شوقین ہیں۔

میری والدہ نور ما ڈریک پہلے لکھنؤ (انڈیا) میں نرملا دیوی اور لاہور (پاکستان
میں نورماہ خانم کہلائیں۔ اب لندن (انگلستان) میں پھر نورما ڈریک ہوگئی ہیں۔
اسی شہر سے انکے COCKNEY مزدور پیشہ دادا محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میں
بھرتی ہوکر ہندوستان گئے تھے۔ اور وہاں ایک "ہاف کاسٹ" لڑکی سے شادی کی
تھی۔ ممی کی ماں شاہجہاں پور مشن کی پروردہ ایک نیٹو یتیم لڑکی تھی جسکے ہندو ماں باپ
ذات کے کہار تھے۔ ایسے لوگ شمالی ہند میں بنظر حقارت "احاطے کے عیسائی" کہلاتے ہیں
بحیثیت ایک کلچرل انتھروپولوجسٹ جب میں نے والدہ کے خاندان کی تحقیق شروع کی
بیحد جزبز ہوئیں کیونکہ انکی محبوب فینٹسی یہ ہے کہ انکی عالی نسب انگریز ماں کی موت کے بعد
انکو اس کالی عورت نے پالا تھا۔ ہم اپنی وِش فُل تھِنکنگ کے ہاتھوں خاصے مجبور اور
بے بس رہتے ہیں اور اسلیے قابل رحم ہیں۔ ہمیں ایکدوسرے کو معاف کرتے رہنا چاہیۓ

ممی کی ایک پھوپھی سرکس میں کام کرتی تھیں ـــــ دوسری تاج محل ہوٹل بمبئی
کے پچھواڑے جو پُراسرار گلیاں ہیں۔ ان میں مقیم رہیں۔ وہ بھی لاپتہ ہیں۔ ممی کے مطابق
شاید وہ کولابہ سے وائیٹ لین منتقل ہوگئی تھیں۔ ممی کے والد ریلوے میں ملازم تھے
جو کسٹمز اور محکمہ ڈاک کی طرح اینگلو انڈین نوجوانوں کے لئے سرکار کا مخصوص محکمہ تھا
ممی کا کہنا ہے کہ انکے والد خاصے نامعقول بزرگ تھے جنکو غبن کے جُرم میں سروس سے
نکال دیا گیا تھا۔ گو جُرم ان پر ثابت نہ ہوسکا تھا۔ انھوں نے اس روپئے سے لال باغ
کی لال بتیوں کے محلے میں کوٹھی خرید لی تھی۔ اور اپنی دونوں لڑکیوں کو بڑے اطمینان
سے لال بی بی یعنی اسکارلٹ وومن بنا دیا تھا۔ تاکہ خود محنت کیے بغیر آرام سے رہیں بڑھیا
اس زندگی پر معترض نہیں ہوتی تھیں۔ کیونکہ اس میں عیش و آرام تفریح اور پیسہ وافر

میری آنٹ سیلی جو پارٹیشن سے قبل لکھنؤ میں ڈانسر سریتا دیوی کہلاتی تھیں لاہور سے لندن آکر پہلے ایک سستے ناچ گھر میں ٹیکسی ڈانسر بھرتی ہوئیں۔ پھر ایک سنیما گھر میں ٹکٹ بیچے اس کے بعد کچھ عرصہ پکیڈلی میں اسٹریٹ واکر بھی رہیں۔ مگر بقول انکے یہ بہت مشکل زندگی تھی انکے بس کا روگ نہ تھا۔ بہت جلد ایک یوریشین یہودی کی پارٹنرشپ میں "مساج پارلر" اور "اسٹوڈیو" کھولا۔ اس کے اشتہار اس قسم کے کاروبار کے دستور کے مطابق پرچیوں پر لکھ لکھ کر تمباکو فروشوں کی دکانوں پر لگائے۔

SALLY'S MASSAGE PARLOUR AND HENRI'S STUDIO FOR ARTISTIC PHOTOGRAPHS

کاروبار خوب چلا۔ یہ وولفنڈن رپورٹ کی اشاعت سے قبل کا زمانہ تھا۔ اُنہی دنوں نورما ڈریک لاہور سے آکر بہن کی بزنس میں شریک ہوئیں۔ پچھلے چند سال سے انہوں نے ایک ایسکورٹ سروس بھی قائم کرلی ہے۔ اس میں متعدد ہندوستانی پاکستانی لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ جنکے والدین ربع صدی قبل یہاں آگئے تھے اور وہ یہیں پیدا ہوئیں یا بہت کمسنی میں ان قدامت پرست ممالک سے یہاں آئیں میرے والد ایسکورٹ سروس کے ایک ڈائریکٹر ہیں۔

مجھ میں اپنے والدین کی دلچسپ اور رنگین روایات کی تقلید کرنے یا انکو آگے بڑھانے کی توفیق کیوں نہ ہوئی ؟۔ میں اپنے نانا کی پیروی بھی کرسکتا ہوں۔ مگر میرے کون سے انگلش کوکنی ڈریک یا اودھ کے مسلم راجپوت پُرکھ میں ادب فلسفہ شاعری اور مختلف خرافات کے جراثیم موجود تھے۔ جنھوں نے میرے اندر عود کیا؟ اٹھارہ سال کی عمر سے میری نظمیں انگلستان امریکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے معیاری رسالوں میں چھپ رہی ہیں۔ میری تیئسویں سالگرہ سے ایک ماہ قبل میری نظموں کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے ممی مجھ پر بے حد نازاں ہیں۔ میری کتاب پر اتنے جتنے ریویو چھپے ہیں۔ (ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ سمیت) ممی نے انکے تراشے ڈیڈی کو نیویارک بھیجے۔ میں نے انکو کتاب روانہ کی۔

مگر معلوم ہوا کہ اس وقت انسٹرپول مغرب کے چھ ممالک میں میرے پیارے قبلہ وکعبہ کے تعاقب میں ہے اور وہ شاید ساؤتھ امریکہ میں کہیں روپوش ہیں۔ گڈ اولڈ ڈیڈا مجھے یقین ہے۔ وہ جلد پھر سطح پر نمودار ہونگے اور ہم لندن کے کسی پب میں ممی اور میرے مجبّر العقول والد ــــ ساتھ بیٹھکر میری ادبی کامیابی کا جشن منائینگے۔ مجھے اور میری والا اور خالہ ہم تینوں کو خوشی ہے کہ ڈیڈ نے اس مرتبہ لمبا ہاتھ مارا۔ ڈیڈ کو ہمیشہ یہ افسوس رہا کہ وہ آدھی زندگی اس لائین میں گزارنے کے باوجود اب تک BIG TIME پر نہیں پہنچ پائے ــــ میں امید کرتا ہوں کہ غیر قانونی منشیات کی خفیہ فروشی میں اب ڈیڈ اپنے خواب پورے کر سکیں گے۔

میرے والدین AMORAL ہیں۔ اور میں خود کو ان سے مختلف سمجھتا ہوں ممکن ہے یہ میرا حسنِ ظن ہو۔ مگر میں اپنے والدین کے متعلق کوئی اخلاقی فیصلے صادر نہیں کرتا انہوں نے اپنی اپنی زندگی اپنے حالات اور اپنے طبعی رجحانات کے مطابق گزاری میں محض یہ معلوم کرنا چاہونگا کہ ان حالات کے عمرانی اسباب کیا تھے۔

ہندوستان کے چند شاعروں نے جو انگریزی میں لکھتے ہیں اور "انڈو اینگلین" کہلاتے ہیں (اور خود کو ان ادیبوں سے برتر سمجھتے ہیں جو اپنی مادری یا نیٹو زبانوں میں لکھتے ہیں) مجھے ایک کانفرنس کیلئے مدعو کیا ہے میں برٹش کونسل کی طرف سے ہندوستان آیا ہوں، آجکل اپنی رُوٹس ROOTS اور اپنی بیک گراونڈ کی تلاش عصری ادبی فیشن ہے۔ میں اپنی ماں کی NON-BACKGROUND کی تلاش اور مطالعے کی غرض سے لکھنؤ بھی جاؤنگا۔

گھر سے روانگی کے وقت میری ماں نے مسافروں کی حفاظت کرنے والے "سینٹ کرسٹوفر" کا تعویز مجھے پہنا دیا تھا۔ روم کے ایک کارڈینل نے خود بلیس کر کے یہ چارم ممی کو دیا ہے۔ مگر دنیا پاگلوں کے رحم وکرم پر زندہ ہے۔ ممکن ہے راستے میں ہوائی قزاق نمودار ہوں

اور مجھے موت کے ایرپورٹ پر اتار دیں۔ اس صورت میں یہ میرا ذاتی روزنامچہ اگر بچ رہا تو شاید چھپ جائے گا۔ لہٰذا یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ اشاعت کے لئے نہیں ہے اکیسویں صدی میں بشرط حیات شاید چھپوا دوں۔ ایک طویل مدت گذرنے کے بعد "شرمناک اسکینڈل" "دلچسپ تاریخی واقعات" میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مستقبل میں اگر میں ایک بیحد اہم لٹریری ہستی بن گیا تو میرے والدین اور انکی قابل اعتراض زندگیاں ادبی مورخین کیلئے "گہری معنویت" اختیار کریں گی۔ ماہرین نفسیات اور نقاد میری شخصیت کو انکی زندگیوں کی روشنی میں پرکھیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرے مرحوم اور نادیدہ نصف برادر جارج نے سر ہنری لارنس کے قائم کیے ہوئے اسکول پہلے شملہ (انڈیا)، اور پھر مری (پاکستان)، میں پڑھا تھا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا ممی نے اسکی کتابیں اور کھلونے مجھے دیے۔ جو وہ مامتا کی ماری اپنے ساتھ انگلستان لیتی آئی تھیں۔ ان کتابوں میں بچوں کی ایک "بک اف نالج" بھی تھی جو ۱۹۳۵ء کے لندن میں چھپی تھی اور جس کے سرورق پر بنے اطفال عالم کے رنگ برنگے جلوس میں انگریز بچے سب سے آگے آگے دکھلائے گئے تھے گویا ماسٹر ریس۔ انکے پیچھے باقی یورپین۔ آخر میں ننھے منے چینی۔ جاپانی۔ اسکیمو۔ عرب۔ پگڑیاں باندھے کالے ہندوستانی۔ اور حلقہ بگوش حبشی۔ گویا حشرات الارض۔

میں آنٹ سِلی کو دیکھتا جو کالی تھیں۔ ممی گوری۔ سمجھ میں نہ آتا۔ ایک بار خالہ سے پوچھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھنّا کر رہ گئیں۔ اگر آزاد ہندوستان میں ہوتیں۔ ممکن ہے بطور "شریمتی سریتا دیوی، کتھک ڈانسر"، اس نئے معاشرے میں انکو عزت بھی ملتی۔

سارے گھپلے کیا محض تاریخی سچویشن پیدا کرتی ہے؟

انگلستان میں نسلی فسادات شروع ہوتے۔ ممی مجھے خالص انگریز بنانے پر تُل گئیں جو میں بنا۔

گو میری ماں اور خالہ کا "بھوانی جنکشن" والا "چی چی اینگلو انڈین" لہجہ اب تک نہیں بدلا

پتہ چلا۔ بنگالی چھی چھی بہت کہتے ہیں۔ کیل کتا یورشین "چی چی" کہتا تھا۔
آج سے دو سو سال قبل HICKY کے بنگال گزٹ میں ایک اشتہار چھپا
تھا۔ "چی چی مس لوگوں کے لیے سستے آئینے ——"
چی چی —— ! ہندو کاسٹ سسٹم پر اعتراض کرتے تھے۔ بلومن راسکل۔ اپنے وفا دار
جاں نثار ہم مذہب آدھی گوری قوم کو بلومن آؤٹ کاسٹ بنا دیا —— ! بلڈی ہل۔ کیوں ؟

"آئی ٹولڈ یو مین —— بلومن اکونمکس ——" بوڑھے یورشین اسکول ماسٹر نے جواب دیا۔
میں نے ٹیپ ریکارڈ چلایا۔ مسٹر اینڈریو جونز آزادی کے کئی سال بعد "ایلا بیٹ" سے ریٹائر
ہو کر آئے تھے۔ سیمی ڈی ٹیپڈ مکان کے پھاٹک پر بورڈ لگا رکھا تھا —— "نینی تال"
"اوہ —— نینی ٹھول ——" ممی نے آنکھیں نیم واکیں۔
بدقسمتی سے یہاں مسز جونز کو ایک دولتمند پاکستانی کے ہاں ہاؤس میڈ بننا پڑا تھا۔ وہ
اسوقت ڈیوٹی پر پارک لین گئی ہوئی تھیں۔ انکے پڑوسی بوٹبے گوان سیاہ فام مسٹر ڈی سلوا
تشریف لائے۔ وہ زیادہ خوش قسمت رہے تھے۔ انکی لڑکی بی۔ او۔ اے۔ سی میں ایرہوسٹس
تھی۔ "بلیک از بیوٹی فل" نیا نعرہ ہے (حالانکہ "پکی بنبنگ" کے زمانے میں میری آنٹ سیلی
کو بہت محتاط رہنا پڑا تھا)
میں مسٹر جونز اور مسٹر ڈی سلوا کے لہجے بغور سنتا رہا۔
"پروفیسر ہگنز —— نو —— ؟" مسٹر ڈی سلوا کے موتی جیسے دانت جھلملاتے۔
مسٹر جونز نے ہم لوگوں کی خاطر "ڈول بیٹ اینڈ کری" ڈنر تیار کیا تھا۔ وہ کھلے جا رہے تھے
مدتوں بعد انہیں کوئی ایسا شخص جو انکی گفتگو کو اہم سمجھ کر خاص طور پر ملاقات کرنے آئے۔
"بلومن اکونمکس اینڈ اول من ——" انہوں نے وھسکی پیش کرتے ہوئے کہا۔ نشے کی
ترنگ میں وہ ممی سے اپنی اینگلو انڈین اردو بولنے لگے —— "تمہارا چھوکرا پوچھتا —— کیوں —— ؟
میں نے درخواست کی اسیطرح بولتے رہیں۔ مطلب ممی سے بعد میں پوچھ لونگا۔
"اردو ؟ ہندوستانی ؟ ہیٹو لنگو —— ایہہ —— ؟"

"یس سر ـــ کیری اون ـــ"

"اسکا ریکارڈ بنائے گا پروفیسر بگنیز؟" مسٹر ڈی سلوا نے دریافت کیا۔ سب ممی سمیت بیحد مسرور تھے۔

"آہ ـــ یوروپین لوگ پہلے ارڈو کو بھی مُور بولتا۔ انڈین محمڈن لوگ کو بھی مُور بولتا تھا۔ اسپٹو پڈ راسکلز ـــ"

مسٹر جونسز زیادہ اینٹی برٹش ہوتے گئے ـــ "ہوم" آکر انہیں شدید مالی اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"ہندو کو جنٹو بولتا تھا۔ اگنورنٹ باسٹرڈز ـــ مسلمان کو مُور ـــ چھی ـــ ہم لوگ کو ہاف کاسٹ۔ ایسٹ انڈین ـــ"

"ویری فنی ـــ بوائے ـــ ہم ویسٹ انڈیا میں رہتا تھا۔ ہمارے کو ایسٹ انڈین بولتا تھا۔ ویری فنی۔" مسٹر ڈی سلوا اتنا ہنسے کہ انکی آنکھوں میں آنسو آگئے "اگنورنٹ بلڈی سوائنڈ سو۔"

ممی اردو اور انگلش مغلظات کی ماہر ہیں۔ لیکن اسوقت اپنے شائستہ "پکا انگلش مین" بیٹے کی موجودگی میں گالی گلوج انہیں خوش نہ آئی۔ خاموش بیٹھی وھسکی پیا کیں۔

"ارے ویسٹ انڈین کیسے بولتا۔ ویسٹ انڈیز تو اُدھر تھا ـــ وہ سائیڈ میں انکے باپ نے اصلی امریکن کو انڈین بنا دیا تھا۔ تو ہم لوگ کو ایسٹ انڈین بولنا ہی مانگتا ـــ"

مسٹر جونسز نے اٹھ کر باوا آدم کے زمانے کا ریکارڈ لگا دیا جو وہ یقیناً اپنے ساتھ "ایلابیٹ" سے لائے تھے۔ ممی سے ناچنے کی درخواست کی۔ وہ اٹھ کر انکے ساتھ فوکس ٹروٹ کرنے لگیں۔ یقیناً یہ لوگ چالیس سال قبل کے "لک ناؤ" اور "ایلابیٹ" میں واپس پہنچ چکے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے اپنا سوال دہرایا ـــ "مسٹر جونسز ـــ انگریزوں نے انڈیا کی دوغلی نسل کے ساتھ ایسا سوتیلا پن کیوں ـــ"

انہوں نے چٹکی بجائی ـــ "پیشہ ـــ بلڈی پیشہ ـــ ادھر نیولین ڈنڈ مچاتے

ہوئے ادھر انڈیا میں یہ ہارڈ ورکنگ انٹلی جنٹ ہاف بریڈ چھایا جاتا ہے۔ خرگوش کے موافق۔ انڈیا میں اگر ہاف بریڈ ایسے ہی آگو بڑھتا گیا تو انگلینڈ سے آنے والا ینگ مین کیا کریگا تمہارا سر — لک ادھر ساؤتھ امریکہ میں کیا ہوا۔"

"ایکدم گڑبڑ گھٹالا —" مسٹر ڈی سلوا بولے۔

"ملاٹو لوگ لوکل لوگ سے مسکوٹ کرکے اسپنش حاکم لوگ کو — بولا گیٹ آؤٹ — آؤٹ کر دیا — دیر فور کمپنی کا کورٹ اف ڈایریکٹرز اسی سٹی آف لندن سے ایک فائیل کیل کٹا ڈیسپیچ کرتا ہے۔ ارجنٹ۔ ۱۷۹۵ میں۔ کیا بولتا ہے کہ آج سے انگلش فادر اور نیٹیو مدر کا بیٹا لوگ آرمی اینڈ سول اونچے جوب کے لیے ان فٹ۔ گورنر جنرل کیل کٹا سے فائیل پر لکھا ہے۔ ایکشن ٹیکن — اب وہ گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں میں آنے نہیں سکتا۔ انکا کلب، محلہ، چرچ — سب الگ — چھوٹا موٹا جوب انکے لیے ریزرو — دیئر فور ٹو ہنڈرڈ ایرز سے ہم لوگ آرمی سارجنٹ۔ پوسٹ آفس کلرک۔ اسکول ماسٹر۔ نرس — ٹو ہنڈرڈ ایرز۔"

"چی — چی — بڑا ظلم کیا ہم لوگ کے ساتھ — سوائین —" ممی کو شاید پہلی مرتبہ اس ظلم کا احساس ہوا۔ اب وہ آنسو بہانے لگیں۔

"جب تم بک لکھے گا ہمارا نام اسمیں ضرور ڈالنا نورمن بوائے۔"

"میرا بھی فل نیم — فل نیم — فرانسس زیویر ماریو فرنینڈیز ڈی سلوا — نو — ؟ نائیس لیڈ — نو — مسٹر جونسر —؟"

"یس یس مسٹر ڈی سلوا — لیٹس ڈرنک ٹو ہز سکسیس ایز این آؤتھر اینڈ آول فور ہی از اے جولی گڈ فیلو — فور ہی از — ہی از آ ڈرا دن بجیہ —"

چنانچہ چی چی مس لوگوں کے لیے سستے آئینے!

اب میں نے کمپنی کے عہد اور آخری مغلوں کے بارے میں پڑھنا شروع کیا۔

میرے نیوز پیپر آفس کی ایک اینگلو انڈین اسٹنو گرافر نے اپنے ماموں مسٹر جونسز کا پتہ بتلایا
تھا۔ برطانیہ کے جانے مانے سلور ایکسپرٹ مسٹر چارلس گریگ سے ایک پب میں اتفاقیہ ملاقات
ہوگئی۔ وہ شاہ عالم ثانی کے گریٹ گریٹ گریٹ گرینڈ سن نکلے ——— ماں کی طرف سے۔
فاتح مغل مفتوح راجپوت سنڈروم؟ اسی ویک اینڈ پر وفیسر پرسیول اسپیرز
سے اس علم دوست فارنی داں یوریشین ارسٹوکریسی کے بانیوں کی فہرست حاصل کی۔
جنرل اور بیگم فیض النساء پامر۔ کرنل و بیگم کرک پیٹرک۔ میجر حیدر ہرسی۔ جنرل جیمز اسکنر ———
کرنل ولیم گارڈنر ———
مگر اس زمانے کے عالی مرتبت مسلمان اتنے آزاد خیال تھے کہ اپنی لڑکیوں کی شادیاں
——— یا یہ کہ کلاس ایک تھی۔ اور ان صاحبان عالیشان نے مغل تمدّن کیوں اپنایا؟
کہ غالب تمدّن تھا۔

ممی کو بتلایا ایک ادبی کانفرنس کے لیے انڈیا جا رہا ہوں۔
"انڈیا دیٹ از بھارت ———" انہوں نے ناگواری سے کہا۔ "وہاں اب کیا رکھا ہے؟"
"کیا تم نہیں چاہو گی کہ لال باغ لکھنؤ میں تمہاری کوٹھی دیکھ کر آؤں۔ کس حال میں ہے۔
لیمنی اسٹائل کا طرز تعمیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور کیتھولک قبرستان میں تمہارے پاپا کی قبر پر پھول۔"
دفعتاً وہ رونے لگیں۔
"میرا بچہ گھوڑا گلی بھی جانا۔ پاکستان۔ جارج کی قبر بھی ———"
ممی نے چلتے وقت یہ بھی کہا تھا بارلوگنج مسوری ضرور جاؤں جہاں ریلوے والوں
کے بچوں کے اسکول میں ان دونوں بہنوں نے اپنا معصوم بچپن گذارا تھا۔
مسوری میں ممی ایک مس اسکنر کو جانتی تھیں انکا پتہ بتایا۔

مسٹر جیمز اسکنر بارلوگنج مسوری میں پولٹری فارمنگ کرتے ہیں۔ انکا ہمنام اسکاٹ مورث
اعلیٰ اٹھارہویں صدی ہندوستان کا نقشہ بدلنے میں مصروف رہا تھا۔ مسز جیمز اسکنر ضلع مرزاپور

کے ایک ٹھاکر زمیندار کی لڑکی ——— اور ان دونوں کا نامور بیٹا جنرل جیمز اسکنر جو ایک وسیع حرم رکھتا تھا بلند شہر میں قلعہ و جاگیر۔ چاندنی چوک دلی میں ٹاؤن ہاؤس فارسی میں خط و کتابت اسی اولادیں چھوڑیں۔

صاحبان تازہ ولایت اس دلچسپ مغل یورپین معاشرے کو عجوبہ سمجھنے لگے تھے ۱۸۳۵ میں سر طامس منکاف کی بیٹی لیڈی کلائیو بیلی :—

"آج ضعیف العمر جنرل اسکنر مع اپنی بیگم ملنے آئے۔ سانولے ہیں۔ مگر خود کو انگریز سمجھتے ہیں۔ اس خاندان کے مذہب کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا"۔

اس بوڑھے جنگی گھوڑے کی بہو مسز الگزنڈر اسکنر نے لیڈی بیلی کو اپنے عالیشان گارڈن ہاؤس میں پیانو پر ایک عدد ولایتی گانا سنایا جو "انکے عجیب و غریب لہجے" کی وجہ سے مہمان خاتون کے پلے نہ پڑا۔ البتہ ہمعصر لندن کے مقبول میوزک ہال گیت "وِلی کنزا در ڈائینا" کی دھن پہچانی۔

میں دہلی میں ایک اردو داں انڈواینگلین شاعر کے ساتھ کشمیری گیٹ کا علاقہ گھوم رہا تھا جب جنرل اسکنر کا بنوایا ہوا سینٹ جیمز چرچ نظر آیا۔ اسکے اجاڑ سے احاطے میں کسی پنجابی کاروباری کی شادی کا پنڈال سجایا جا رہا تھا۔ "سر طامس منکاف بنگال سول سروس" کی قبر پر ایک باجے والا اکڑوں بیٹھا اپنی کلارنٹ کی کھونٹیاں کسنے میں محو تھا۔ اسکنر گورستان کے ایک مقبرے پر فارسی اور اردو کتبے نظر آئے۔ صلیب اور مرمریں فرشتے کے نیچے "ہوالعزیز الرحیم ———" جو اردو داں دوست نے پڑھ کر بتایا کہ خدا کا نام لکھنے کا اسلامی طریقہ ہے۔

عجیب و غریب لہجے میں "وِلی کنزا در ڈائینا" الاپنے والی اس "کدبانوئے الگزنڈر اسکنر" کا نام ایلس اور خطاب سردار محبو تھا۔ وہ "بہر نجات بطریق عیسوی" دفن کی گئی ——— شاید مسلمان رہی ہوگی۔ اور اسکے شوہر نے کہ سکندر تخلص کرتا تھا، اردو میں ایک قطعہ کندہ کروایا تھا۔

اس کنبے کے مسلمان افراد گورستان نظام الدین اولیاء میں مدفون ہیں۔ جس اسکنر

لڑکی سے ممی واقف تھیں ہانسی حصار میں انکی جاگیر تھی ۔مسلمان دادی خاندان لوہارو سے تعلق رکھتی تھیں ۔مسوری میں سینئر مسٹر اسکر مسند پر بیٹھے سٹک گڑگڑایا کرتے تھے ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ خودکشی کر لی ۔

اس قسم کے لوگ تاریخ کے LEFT-OVERS ہیں۔

بیشتر عورتوں کی طرح ممی ایک جذباتی خاتون ہیں اپنے بچپن کی یادگار، کوٹ پتلون میں ملبوس ایک مسخرہ حبشی گڈا ابھی سنبھال کر رکھ چھوڑا ہے یہ "گولی وُوگ" انگریز بچیوں کے گڑیا گھر کا ایک لازمی جزو ہوا کرتا تھا WOG "ویسٹرنائیزڈ اورینٹل جنٹلمین" کا مخفف تھا مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے مجاہدین آزادی "محمڈن فناٹک" کہلاتے ہندوستان کے کھدر پوش قوم پرستوں کا "بھوانی جنکشن" میں جان ماسٹرز نے مذاق اڑایا۔ خود اینگلو انڈین تھا لیکن میری طرح اپنے آپ کو انگریز مشہور کر رکھا تھا۔

ممی مسوری کی ایک ہم سبق گارڈنر لڑکی کا ذکر بھی کرتی ہیں جس کا باپ انجن ڈرائیور تھا۔

لونگ اسٹن مینر نیویارک کے کرنل لونگ اسٹن اس شہر کے آبادکاروں میں شامل تھے ۔وہ پونے دو لاکھ ایکڑ زمین دریائے ہڈسن کے کنارے بسنے والے ریڈ انڈین قبائل سے چھین کر اپنی چودہ پشتوں کے لیے بے اندازہ دولت کا انتظام بھی کر گئے تھے ۔انکی بیٹی نے ایک آئرش نژاد برٹش کیپٹن ویلنٹائن گارڈنر سے شادی کی ۔ویلنٹائن کا بھائی انگلینڈ کا نامور ایڈمرل ایلن لارڈ گارڈنر جہانِ نو کی بحری جنگوں میں فرانس اور ہسپانیہ کے خلاف برطانوی فتوحات کے پھریرے اڑاتا پھرتا تھا۔

کولونیل امریکہ نے مدرکنٹری کے خلاف پرچم لہرائے ۔برطانوی شکست کے بعد کیپٹن ویلنٹائن گارڈنر اور امریکن امیرزادی کا نوعمر بیٹا ولیم اس نئی بساط پر وارد ہوا جسکی بازی انگلستان نے جیت لی تھی۔

جان کمپنی نے کیپٹن ولیم گارڈنر کو بسلسلہ ریشہ دوانی بطور ایلچی نواب کھمبایت کے دربار میں بھیجا۔ یہ حسین رومینٹک مہم جو نوابزادی پر عاشق ہوا۔ باپ سے شادی کا مطالبہ کیا۔ یہ ۱۷۹۶ء کا واقعہ ہے۔ گجراتی نواب نے مجبوراً قاضی بلواکر ۱۳ سالہ منظور النساء بیگم کا نکاح ۲۶ سالہ کپتان ولیم سے پڑھوایا۔ بشپ اف کلکتہ نے از روئے کلیسائے انگلستان اس سنجوگ کو جایز قرار دیا!

مسز گارڈنر اندور، پونا اور جے پور کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ دلّی پہنچیں جسے ۱۸۰۱ء میں لارڈ لیک فتح کر چکے تھے۔ پنشن یافتہ اکبر شاہ ثانی نے منظور النساء کو اپنی بیٹی بنایا۔ انکی بہن ظہور النساء بیگم کا شوہر میجر ہرسی ضلع بدایوں میں اپنی جاگیر پر براجتا تھا۔

میجر ولیم گارڈنر نے کمایوں فتح کر کے ہندوستان کا پہلا ہل اسٹیشن الموڑہ آباد کیا۔ اپنی فوج گارڈنر ہورس کے لیے ضلع ایٹہ میں کالی ندی کے کنارے چھاؤنی چھائی تاکہ اسکے گھوڑے بآسانی پانی پیا کریں۔ ماں کی طرف سے نیویارک کی کیٹر لونگ اسٹن جایداد شریک تھا ــــ اودھ میں اس نے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے ایک چکلے دار کی حیثیت سے مال بٹورا۔ اپنی پوتی سوزن کا بیاہ مغلیہ تزک و احتشام کے ساتھ سلیمان شکوہ شہزادے کے بیٹے انجم شکوہ سے لکھنؤ میں رچایا۔

اب سلیمان شکوہ۔ اکبر شاہ ثانی کا حقیقی برادر خورد۔ شاہ اودھ کا وظیفہ خوار۔ اسکی ایک بیگم نے اسکے درباری گوّیے مان خاں کی پر پر ڈبچی گود لی تھی۔ شہزادہ اسے اپنی سگی اولاد کی طرح چاہتا تھا۔ شہزادی قمر چہر۔ اسکا عقد اپنے بھتیجے شاہزادہ سلیم ابنِ اکبر شا ،کر دیا تھا۔ وہ اپنے عیاش شوہر سے ناخوش لکھنؤ میں رہتی تھی۔

مرزا سلیم بھی اپنے جلاوطن جوانمرگ بھائی مرزا جہانگیر کے مانند اینٹی برٹش تھا۔ چنانچہ لارڈ مٹکاف نے اسکے بجائے اسکے سوتیلے مرنجاں مرنج شاعر بھائی کو برائے نام تخت پر بٹھایا ورنہ قمر چہر رنگون میں مرتیں۔

لیکن انکی زندگی ایک اور رخ اختیار کرنے والی تھی جسکا انکو پتہ نہ تھا بطور آوارہ

اپنے راستوں کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔ ذہانت جبلّت سے مات کھاتی ہے۔

۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ سیلمان شکوہ سے کہا قمر چہر کو بھی حرم میں بھیجدیں تو آپکے وظیفے میں پانچ ہزار مہینے کا اضافہ۔ شہزادے کے غضبناک انکار پر اودھ نریش نے قمر چہر بیگم ایک کُٹنی کے ذریعے اٹھوالی۔ سیلمان شکوہ نے انگلش ریذیڈنٹ مقیم بیلی گارد سے فریاد کی۔ قمر چہر واپس منگوائی گئیں۔ انکے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر شہزادے نے اپنے سمدھی کرنل ولیم گارڈنر کو اٹیہ سے بلوایا۔ وہ مرد میدان لکھنؤ آکر باپ بیٹی کو اپنے علاقے پر لے گیا۔

کنٹری ہاؤس کا سگنج میں ولیم اور منظور النساء کے نور بصر جیمز اس ماہ پیکر پر عاشق ہوئے۔

خوش رو۔ نیم ولایتی، شولرس۔ جیمز گارڈنر کی معیت اور اس انگلش چھاؤنی میں قیام نے غالباً قمر چہر کو اس سیکیوریٹی کا احساس دلایا جو قلعہ معلّیٰ اور لکھنؤ دونوں جگہ مفقود تھی۔

ہندوستانی مصوّری اور گیتوں کی رادھا بھیگی اندھیاری راتوں میں اغیار کی نظروں سے بچتی کنہیا سے ملنے کالی ندی کے تٹ پر جایا کرتی ہیں۔

سیلمان شکوہ نے اس پری کو یہاں بھی اس کے بیڈ چیمبر میں قید کر دیا۔

لیکن ایک تاریک اور طوفانی رات وہ چندر مکھی اپنے نٹور کے ساتھ الو فرار ہوئی۔

نالائق فرزند کی اس حرکت سے بوڑھا کرنل شاہ دلی اور اودھ اپنے مہمان پناہ گزیں بادشاہ زادے کو منہ دکھلانے کے قابل نہ رہا۔ اس نے بیٹے کو معاف نہ کیا۔

(پریشان حال بے خانماں سیلمان شکوہ آگرے چلے گئے۔ دس برس بعد وہیں مرے۔ ڈھلتی دھوپ میں زندگی کاٹی۔ نصف النہار کے آفتاب نے آخری پناہ دی۔ اپنے جدّ اکبر کے مقبرے میں دفن کیے گئے۔)

جیمز اور قمر چہر دو سال تک مارے مارے پھرے۔ تب جیمز نے خشمگیں باپ کا دل نرم کرنے کے لیے ایک ناٹک رچا۔ وہ بوڑھا سُور ما مونچھوں سے چنگاریاں اڑاتا ذاتی بجرے کی ناؤ پر سوار متھرا سے گذر رہا تھا۔ یہ لارڈ لوکنوار کا ثانی ساحل پر پہنچا۔ جمنا میں کود گیا۔ کشتی تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ڈوبنے لگے۔ باپ نے ہڑبڑا کر پانی سے نکالا۔ کاسگنج لوٹ کر قمر چہر کا شہزادہ سلیم سے طلاق دلوائی چھوکرے کے ساتھ اسلامی نکاح پڑھوایا۔

قمر چہر محرّم میں لکھنؤ جا کر ایک لاکھ روپئے سالانہ کی اعزاداری کیا کیں، بیٹے انکے سلیمان ٹنکو گارڈنر فنا باپ دادا کی طرح عیسائی رہے مگر چار بیویاں بھی رکھتے تھے اور لکھ لٹ یعنی خالص مسلم وضع کے رئیس تھے۔

دراصل یہ صحیح معنوں میں ایک رومینٹک معاشرہ تھا۔ ۱۸۵۷ء انڈو مسلم فیوڈل تہذیب کی شکست کا سال ہے۔ غدر کے بعد روکھی پھیکی وکٹورین اخلاقیات اور عیسائیت کے فروغ نے برطانوی ہند میں ایک کٹر سوسائٹی کی بنا ڈالی۔ اس تبدیلی کا اثر گارڈنرز میں نظر آتا ہے کہ حضرت فنا کے اگلی پیڑھیوں میں محض جوشیلے مشنری پیدا ہوتے۔ یہ ریورنڈ صاحبان گرج گرج کر گنہ گاروں کو عذاب جہنم سے خبردار کرنے والے ہم عصر امریکن پروٹسٹنٹ پادریوں سے کتنے قریب اور اپنے دلچسپ، مہم پسند، "زندگی سے وسیع تر" بزرگوں کے مقابلہ میں کسقدر بے رنگ اور منحنی سے معلوم ہوتے ہونگے۔

لیکن اس گذرے ہوتے مغلیہ زمانے کا اثر اس حد تک اب بھی باقی تھا کہ یہ حضرات اپنے ایک ہاتھ میں انجیل اور دوسرے میں اپنے اردو کلام کی بیاضیں تھامے رکھتے تھے

شہزادہ انجم شکوہ اور سوزن گارڈنر کی بیٹی اختر زمانی بیگم یعنی شاہ عالم ثانی کی سگی پڑپوتی باضابطہ عیسائی ہوگئیں۔ اپنے ایک کزن ایلن سے شادی کی۔

جرمن سردھنہ اور فرنچ کوئیل (علیگڈھ) کی طرح کاسگنج بھی ایک افسانہ رہا ہوگا "بیگم کے کیتھڈرل" کے بعد ایٹے کا ارادہ کر رہا تھا جب نئی دہلی میں، ایک ڈنر پر الہ آباد ہائیکورٹ

کے ایک مسلمان جج صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پروگرام کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کوئی گارڈنر کا سگنج میں اب موجود نہیں۔ انکے سولیین والد ۱۹۳۶ء تک اس مقام کے حاکم پرگنہ تھے۔ اسوقت ایک نہایت وجیہہ لوکل مفلوک الحال انگریز بطور موٹر ڈرائیور ایٹہ میں انکے ہاں ملازم تھا۔ اسکا نام ولیم تھا اور وہ ایک مسکین سا آدمی تھا اور اکثر انکے باغ میں مالی کی مدد کرتا تھا اور مٹی کے ٹوکرے سر پر رکھ کر ڈھویا کرتا تھا۔

ایک نیشنل انگریزی روزنامے کے ریذیڈنٹ اڈیٹر کے ڈرائینگ روم میں، اُس رات، "دور درشن" پر ایک برہمن رقاصہ اُوما شرما، مغل پوئیٹ غالب کے اشعار کتھک نرتیہ میں پیش کر رہی تھیں۔ لیکن مجھے گارڈنرز نے پریشان کر رکھا تھا۔ ڈنر کے بعد جج صاحب سے پھر کہا، چند سکنڈ سوچ کر انہوں نے دو گھرانوں کا پتہ بتایا۔ جو اس ضلع کے باشندے ہیں۔ ان میں سے ایک کنبہ دہلی میں مقیم ہے دوسرا ڈسٹرکٹ ایٹہ کے ایک مشہور مسلم سینٹ کی شرائین سے تعلق رکھتا ہے۔ صبح کو میں نے دلّی میں رہنے والے صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے بھی اسی شرائین کا پتہ دیا اور یہ بھی کہ قمر چہر ان مقدس بزرگ کی معتقد تھیں موجودہ کسٹوڈین کا سولیین لڑکا فلاں جگہ تعینات ہے۔ فلاں محکمے میں۔

آگرہ۔ ہوٹل کلارکس شیراز کی "مغل لاؤنج" سے تاج نظر آتا ہے۔ بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہم دفعتاً ایک کیمرہ آؤبسکیورا میں داخل ہوگئے ہوں۔ وہ عظیم مغل بھی بہت نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ آخری مغل بہت دُور جن میں سے ایک سلیمان شکوہ تھا اور اسکی بے باک لڑکی قمر چہر گارڈنر۔ بنت استاد مان خاں کلاونت۔ زوال سلطنت تیموریہ کی علامت۔
بریکفاسٹ کھاتے مغربی سیّاحوں کے چھُری کانٹوں کے مدھم شور میں ریسٹوراں کے فلور منیجر سے ایٹے کا راستہ دریافت کیا۔
"ایٹہ ——؟" وہ متعجب نظر آیا: "ڈاکوؤں کے متعلق ٹیلی ویژن فلم ——؟ بی بی سی ؟"
"نہیں،" میں خاموش ہوگیا، ایک غیر معروف تاریخی ہستی قمر چہر کی تلاش —— بتاؤں تو لوگ مجھے سنکی سمجھیں گے۔

ایک کمرشل فائدہ۔۔میں بھی انڈیا کے لیے اہل برطانیہ کے موجودہ قومی نوسٹیلجیا کو کیش کروں — قمر چہرا اور جیمز گارڈنر۔ بیگم سمرو۔ میڈوز ٹیلر۔ کرنل سلیمن اور انکے ٹھگوں کے بارے میں ایک ٹی وی سیریل کا ڈول ڈالوں۔

لیکن مجھے تاریخ کی اس مسٹری اور میٹا فزکس (؟) کی جستجو ہے جو سامنے جون کی دھوپ میں تیرتے تاج کی پرچھائیں سی معلوم ہوتی ہے اور مشکل سے گرفت ——

مصافحے کے لیے ایک ہاتھ سامنے آیا۔ پھر آواز: "مسٹر نورمن ڈریک؟"

میں نے چونک کر پلیٹ پر سے سر اونچا کیا۔

شرائن سے تعلق رکھنے والے جس نوعمر سوبلین کو آگرہ پہنچتے ہی فون کیا تھا وہ جیپ لیکر آگیا تھا۔

ایٹہ پہنچ کر ضلع ہیڈ کوارٹر سے میرے نئے دوست نے ایک اور افسر کو ساتھ لیا۔ ایک "تحصیل" سے "تحصیلدار" کو جیپ پر بٹھا لا۔ ایک دور افتادہ اجاڑ سے موضع میں داخل ہو کر ایک وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے رکے۔ یہ گارڈنر برادران کی تین شاخوں میں سے ایک کی کنٹری سیٹ رہی تھی۔ اب اس کھنڈر میں محض دو کمرے رہائش کے قابل باقی تھے۔

دو گارڈنر بھائی ایک کمرے میں نظر آئے۔ ایک پلنگ پر لیٹا ٹائمز آف انڈیا پڑھ رہا تھا۔ ہندوستانی پوشاک میں ملبوس انکی نوعمر لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ جو ہمیں دیکھتے ہی فوراً چلی گئیں اور کھنڈر سے گذرتی ایک ملحقہ مکان میں غائب ہوتی دکھلائی دیں۔

میں متحیر ہوا۔ منظور النساء بیگم اور قمر چہر کی مسلم تہذیبی روایت کا اتنا دیرپا اثر۔ اضلاع میں انڈین بیورو کریسی کا رعب داب اور اسکی MYSTIQUE مجھے مغلیہ اور برطانوی عہد کی یادگار معلوم ہوئی۔

میں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ انھوں نے ذرا اطمنان کی سانس لی۔ ایک بھائی فوراً اٹھا۔ الماری سے انگلش ارسٹوکریسی کے نسب نامے ڈیبرٹ کا تازہ ترین اڈیشن نکال کر ایک صفحہ کھولا۔ اس پر ان دونوں بھائیوں کے نام درج تھے۔

میں نے کتاب انکے ہاتھ سے لیکران اوراق پر نگاہ دوڑائی۔ صوفیہ شکوہ۔ فلاں۔ فلاں۔ فلاں۔ والی کاؤنٹس اف ہاورڈین۔ فلاں فلاں۔ ریذیڈنس : وی اوک لینڈز۔ کنٹری۔ کلب : یونائیٹڈ ہنٹس ۔ گارڈز ۔

"یہ شہزادہ انجم شکوہ کی کرسچین لڑکی جین اختر زمانی والی شاخ ہے۔" ایک بھائی نے مطلع کیا۔ وہ دونوں ہماری خاطر مدارات میں مصروف ہو چکے تھے۔

پر فضا کنٹری۔ پھولوں سے بھرے مرغزار۔ اونچے درختوں میں گھرا با رونق کنٹری ہاؤس اعلیٰ ترین کلب۔ یہ گرد آلود گاؤں۔ بے رنگ و بو۔ پسماندہ۔ دو بیحد مختلف دنیائیں تھیں۔ شاید یہ موسم کا اثر بھی تھا مجھ پر اداسی طاری ہوتی گئی۔ نرس کے سفید یونیفارم میں ملبوس ایک گارڈنر خاتون برآمدے میں سے گذر گئیں ۱۷۹۵ والا سرکاری فیصلہ بھی اتنا دیرپا۔

دور آم کے باغ میں کوئل کوک رہی تھی۔

"کرنل ولیم گارڈنر" ایک میزبان کی آواز آئی ۔"ایک لاکھ درخت لگوا گئے تھے کہ اگلی پیڑھیاں نکمّی نکل جائیں تو بھی ایک لاکھ سالانہ کی آمدنی۔

"سب آسٹریلیا جا بسے۔ وہ بھی دراصل ——— کرنل کو کیا پتہ تھا محض ڈیڑھ سو سال بعد ملک انکی قوم کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ دیکھا جائے تو آج کی مدّت خاصی مختصر رہی۔

عمرانی تفتیش و جستجو۔ سر حروف میں چھپی تاریخی حقیقتیں انسانوں کی کہانیاں ہیں انکا اچانک سامنا جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ میری اداسی بڑھتی گئی۔ ان خلیق بھائیوں سے رخصت ہو کر باہر نکلا۔ ہوا میں خنکی آچلی تھی۔

آخری بار اس کھنڈر پر نظر ڈالی۔ بھلا زندگی میں دوبارہ یہاں کیوں آؤنگا۔

جیپ شاہراہ پر آگئی۔ دونوں طرف حدِ نظر تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ زمین۔ زمین۔

زمین۔ انسانوں کو کتنی زمین چاہیے؟ شاید ٹالسٹائی نے سوال کیا تھا۔ کتنی ——؟ کرنل لونگ اسٹن اور اسکی قوم کی "ریڈ انڈین" زمین۔ گارڈنر کی قوم کی "بلیک انڈین" زمین۔ اسرائیلیوں کی مقبوضہ عرب زمین۔ اور اب اس دیس کی آزاد دھرتی کا منافع بالآخر کس کو پہنچ رہا ہے؟

جمہوریہ ہند کے عاملانِ ضلع کو انکے مقامات پر پہنچاتے ہوئے میرے رہبر دوست نے کہا۔ قمر چہر، جیمز گارڈنر اور انکے فرزند سلیمان شکوہ گارڈنر۔ قتا ہمارے مقدس بزرگ کے معتقد تھے۔ انڈین ہولی مین! ہمارے ویسٹ میں ہولی مین نہیں ہوتے۔ کیتھولک چرچ میں بھی اولیاء کا سلسلہ اسطرح نہیں چلا۔ دوست کے ہمراہ اسکے گھر یعنی اس شرائین پر جاسکتا تھا۔ لیکن نہیں گیا۔ مسلم شرائینز کی تحقیق و مشاہدات کا باب نہیں کھول سکتا۔ فرصت نہ دلچسپی۔

مغل انگریزی داں ہوتے گارڈنرز وغیرہ کو WOGS پکارتے —— مطلب الٹ ہوتا۔ ویسٹرن اورنٹیلائیزڈ جنٹلمین! میڈیول اسپین کے عیسائیوں جیسے۔
اسیطرح کا معاملہ اسپین و پرتگال میں پیش آیا تھا۔ مگر وہاں بزورِ شمشیر ساری مسلم آبادی کو رومن کیتھولک بنا لیا گیا۔ گو وہ ابتک تمدنی لحاظ سے خاصے موُرش چلے آرہے ہیں۔
فاتح انگریز بھی تمام ہندوستانیوں کو جبراً عیسائی کرسکتے تھے لیکن وہ انیسویں صدی تھی۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان سے قبل مسلمان فاتحین بھی ساری آبادی کو بزورِ شمشیر کلمہ پڑھا سکتے تھے۔ انہوں نے قرونِ وسطیٰ میں بھی ایسا نہیں کیا۔
میرا نیا دوست اپنی درگاہ کی طرف جانے والی سڑک پر سے جیپ موڑ کر مجھے آگرہ پہنچانے کے لئے شاہراہ پر لے آیا۔ راستے میں اس نے کہا —— گریٹ گرینڈ فادر نے گرینڈ پا کو بتلایا تھا کہ قمر چہر ہاتھی پر بیٹھ کر اور چاندی کی کھڑاویں پہن کر درگاہ پر آتی تھیں۔ مقدس بزرگ کو پاپا کہتی تھیں۔ انکی خواصیں چمڑے کے دستانے پہنے رہتی تھیں انکے ہاتھوں پر باز کی نسل کے چھوٹے پرند بیٹھے ہوتے تھے۔ یہ پرند تیتری کہلاتے ہیں ——

"قمر چہر ملکہ زمانی بیگم چیتے کا شکار بھی کھیلتی تھیں زمینداری کا سارا انتظام خود کرتی تھیں۔

ل کی تجارت شروع کی تھی۔ اولڈ کورٹ ہاؤس کلکتہ میں اسکا دفتر قائم کیا تھا۔" مسٹر
برائین سلیمان شکوہ گارڈنر نے کہا۔ ہم لوگ سابق امپیریل جم خانہ حال دہلی جم خانہ کے ایک
ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔
"کرسچین انگلش خاندان کا اثر جس میں انکی شادی ہوئی تھی؟" میں نے اظہار خیال کیا۔
"جی نہیں۔ مغلیہ شہزادیوں کی روایت۔" انڈو اینگلین شاعر نے جواب دیا "میں سمجھتا ہوں
من "اس نے پائپ سلگاتے ہوتے ابرو اُٹھا کر کہا "تم کو مشرق کے متعلق اپنے تصورات بدلنے
ہئیں۔"
میں خاموش رہا۔ میری عمر کتنی ہے۔ محض پچیس[۲۵] سال۔ لیکن ایک بوڑھی دنیا اور بوسیدہ
ناشرے کے تخلیق کردہ ایمیج میرے ذہن میں ابھی سے پختہ ہو چکے ہیں۔ مثلاً ـــــ مسلمان
رتوں کی ادنیٰ حیثیت۔ اسلام میں عورت کا کمتر درجہ ـــ وغیرہ۔ ان تصورات کو مڈل ایسٹ
خبروں سے مزید تقویت ملتی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا ـــ اینگلو انڈین طبقہ بھی تو غلط ایمیج
شکار ہے۔ محض چند کیبرے ڈانسرز کی بدولت۔ دوسرے فرقوں میں پیشہ ور عورتیں نہیں ہوتیں؟

"نورمن بیٹھے بیٹھے اچانک غائب ہو جاتا ہے۔" ایک دوست نے کہا۔
"شاعر ـــــ!" دوسرے مہمان نے جواب دیا۔
سلیمان شکوہ صاحب مسکرائے۔ انکے ہاں شاعری کا سلسلہ بہت طویل رہا تھا۔
ضلع ایٹہ کے ان دو بھائیوں نے دہلی میں مقیم دو قرابت داروں کے ایڈریس مجھے
یے تھے۔ اس کلب کے ممبر میرے اڈیٹر دوست نے ہم سب کو یہاں لنچ پر مدعو کر رکھا تھا۔
کی صفدر جنگ لین میں موسم گرما کے پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ کچھ دور صفدر جنگ روڈ پر
یر اعظم اندرا گاندھی اپنی کوٹھی میں فروکش تھیں۔ انکے بزرگوں کو شہنشاہ فرخ سیر نے ایک
نہر کے کنارے زمین دی تھی۔ اور فاصلے پر محمد شاہی امیر، دوسرا نواب اودھ صفدر جنگ
مقبرے میں خوابیدہ تھا۔ مغلوں کا شاہجہاں آباد۔ لیٹنز کی نئی دہلی۔ سوتنتر بھارت کی
جدھانی! شہروں اور انسانوں کی شخصیت یکساں ہے۔ اس پر پیاز کے سے پرت چڑھتے

رہتے ہیں۔ اگر انکو اتارنا شروع کیجئے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

میں پھر دونوں گارڈنرز کی طرف متوجہ ہوا۔ ایٹہ والوں کی طرح کے دو سادھارن بہت نیک سے لوگ۔ مرنجا مرنج۔ مسٹر ریجی گارڈنر نسلاً اینگلو انڈین تھے۔ اردو سے بھی ناواقف طویل عرصہ یوروپ اور مڈل ایسٹ میں گذار کر لوٹے تھے۔

"میں دو مہینے وکٹر اسکنر کے ہاں رہا۔ بلاسپور ضلع بلند شہر۔ اب بیڈنی جا رہا ہوں"

"وکٹر اسکنر! جنرل اسکنر کے قلعے میں رہتے ہونگے" میں نے مسحور ہو کر پوچھا۔

ریجی صاحب کو ان معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی کہنے لگے "قلعہ؟ وہ تو کب کا ٹوٹ پھوٹ چکا۔ سکندر صاحب کا کوٹ!"

"آپکو اپنے بچپن کا کاسگنج یاد ہے؟"

"جی ہاں۔ اونچے جار جین پیل پائے۔ دیواروں پر سجی تلواریں۔ اور دادی جو کرسچین تھیں لیکن ہمیشہ غرارہ پہنتی تھیں۔"

گوارہ۔ میں نے فوراً جوٹ ڈاؤن کیا ــــ مسلم ڈریس۔

اوبرائین سلیمان شکوہ شگفتہ مزاج۔ نستعلیق اور کھلتی رنگت کے ہندوستانی وہ کہہ رہے تھے "لڑکپن میں ہم نے اپنے خاندانی عَلَموں کے سامنے بہت دعائیں مانگی ہیں۔ جب تک ہمارا امام باڑہ مقفّل نہ ہوا"

محرم اور امام باڑے کا مطلب چند روز قبل نوٹ کر چکا تھا اسلئے سُننے میں مصروف رہا

"تو سال تلک ہمارے ہاں مسلمانوں میں شادیاں ہوا کیں"

"اس قسم کا دو رنگا طرز حیات ممکن ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس زمانے میں زندگیاں اتنی پیچیدہ نہیں تھیں رواداری بھی تھی ایمیلیا سلطان بنت مرزا اکبر حسین میری والدہ تھیں۔"

"اوبرائین صاحب! ہم قمر جہر ملکہ زمانی بیگم سے کافی دور نکل آئے" میں نے انہیں یاد دلایا۔ "آپ نے تو وہ امام باڑہ ہی بند کر دیا! ذرا واپس چلیے۔"

"ابھی انکے بہت نزدیک ہیں سُنتے جائیے۔ انکے اکلوتے بیٹے سلیمان شکوہ گارڈنر فنا
ی بڑے غیر معمولی قسم کے انسان تھے صوفی منش مُنّا صاحب۔ ساری دولت احباب اور
حبتمندوں پر لُٹا دی۔ وضعدار۔ ہمیشہ پالکی میں سفر کیا۔ حرم بھی رکھتے تھے اور نامی طوائفوں
ے سرپرست بھی تھے۔"

"واہ۔" جرنلسٹ دوست نے توصیفاً سر ہلایا۔

"ریر ایڈمرل لارڈ فرانسس گارڈنر کی پوتی، کیتھرین جارجینا انکی کرسچین بیوی تھیں۔

"ایام غدر میں سلیمان شکوہ گارڈنر فنا نے روپیے پیسے اور ہتھیاروں سے باغیوں کی مدد
۔ جب پیسہ ختم ہوگیا۔ لندن اور کلکتے کی جائیداد بیچ ڈالی۔ انگریزوں سے جان بچانے کے لیے
بلگڈھ اور درگاہ مارہرہ شریف میں چھپے رہے۔ غدر کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی عام معافی کے باوجود
ریزوں سے میل جول ترک کر دیا۔ آخر دم تک ان سے ملاقات نہیں کی۔ ۱۹۰۱ء میں وفات
ئی۔ انکے بیٹے فیلکس گارڈنر فلک میرے والد تھے"۔۔۔۔ سلیمان شکوہ صاحب خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔ "کاسگنج میں منظور النساء بیگم کا امام باڑہ کرنل ولیم گارڈنر
ے بنوایا تھا۔ وہ ایک بار محرّم کے لیے لکھنؤ گئیں۔ وزیر اعظم منتظم الدولہ نے حسن باغ
ں ٹھہرایا وہاں انہوں نے جس دھوم کی اعزا داری کی وہ لوگوں کو برسوں یاد رہی۔
اس بہو کے سنگ سرخ کے حمام بارہ دری مقبرے اب کھنڈر ہو چکے۔

"میرے دادا مُنّا صاحب کی بہت ساری بیگمات میں ایک بے انتہا حسین ایرانی
ادراحیل خانم انکی محلسرا کی مختار کُل تھیں۔ میرے بچپن تک زندہ رہیں۔ ایام محرّم
ہم بچّوں کو فقیر بناتی تھیں۔ اعزاداری انہوں نے جاری رکھی۔ سیسرہ گارڈنر کو بیٹی
یا تھا۔ آنٹ سیسرہ پکّی مشنری تھیں لیکن امام باڑے کی دیکھ ریکھ بڑے خیال سے
تی تھیں۔

"دادی راحیل خانم کے انتقال کے بعد شاید ۱۹۲۷ء میں وہ سونے چاندی کے
ضریحیں جھاڑ فانوس شمعدان وغیرہ سب امام باڑہ شہید ثالثؒ آگرہ بھجوا دیے

گئے۔ لے جانے سے قبل باقاعدہ الوداعی مجلس ہوئی۔ ایکسو پچیس[125] سال تلک یہ عالیشہ
امام باڑہ اور اسکا نوبت خانہ آباد رہا تھا۔"

سامنے بیٹھے گارڈنر کی آواز کس فاصلے سے آرہی ہے۔ میں نورمن ڈریک سوچ
ہوں۔ وہ کیسے انوکھے، روادار عیسائی اور مشنری تھے جنکے ہاں سوا سو سال تک محر
کا نقارہ بجا، یہ وسیع القلبی اور رچاؤ کس تمدن کی دین تھی؟
شاہان اودھ اور مغلوں کی۔

"کرنل ولیم گارڈنر کے خزانے کی ناکام کھوج میں والد مرحوم نے ہمارے اس دو
امام باڑے کا تہ خانہ کھدوا ڈالا تھا۔ اسی رات ایک سفید پوش بزرگ انکے خواب میں
آئے اور بولے۔ ایلی مجھے نہ ستاؤ۔ صبح انہوں نے یہ کوشش ترک کر دی۔ اس جگہ ایک
مرمریں مزار بنوایا۔ ہر جمعرات کو اس پر چادریں چڑھنے لگیں۔ ایک انجیر کا درخت وہا
خود بخود اگ آیا۔
"پندرہ بیس سال قبل میں کاسگنج ہی میں رہتا تھا۔ کرنل ولیم کے لشکریوں کی اولا
وہاں دیہات میں آباد ہے۔ ایک روز ان میں سے ایک شخص، لال خاں میواتی گاؤ
کے ایک ہندو بھگت یا ستیا نے کے ہمراہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ صاحب۔ میں
نے خواب میں دیکھا ہے کہ ملکہ بیگم کے مزار کے نزدیک فرش میں ایک کنڈہ گڑا ہوا ہے
دفینہ اسکے نیچے ملے گا۔
"میں اپنی والدہ کو بتلائے بغیر چپکے سے ان دونوں کے ساتھ اپنی پردادی اور پردا
کے مقبرے پر پہنچا۔ مقفل دروازہ کھول کر اندر گیا۔ قمر چہر کا سرہانہ کعبے کے رخ پر تھا
اسکے قریب مرمریں فرش میں واقعی ایک آہنی کنڈہ نظر آیا۔ ہم تینوں نے اسے پکڑ کر
تختہ اٹھایا تو نیچے تہ خانہ۔ اسکے اندر سے گرم ہوا کا تیز بھبکا نکلا۔ بزرگوں سے اس بے اد
کے لیے خدا سے معافی مانگتا سیڑھیاں اترا تو سات فیٹ کی گہرائی میں خزانہ وغیرہ تو نہ

البتہ لالٹین کی روشنی قمر چہر ملکہ بیگم کی کھوپڑی اور ہڈیوں پر پڑی۔ ایک ٹانگ کی ہڈی بھر بھری راکھ سی ہو چکی تھی۔ لحد کے برابر دیوار میں ایک کھڑکی دکھلائی دی جو انکے شوہر جیمز کی قبر میں کھلتی تھی۔

" قمر چہر جواں سال مریں تھیں۔ تب مجھے علم ہوا کہ انکے خاوند نے یہ مقبرہ مغلیہ طرز کا بنوایا تھا جس میں مصنوعی مزار اوپر اور اصل تہ خانے میں تعمیر کیے جاتے تھے۔ بیگم کی وفات کے کچھ عرصے بعد ۱۸۴۵ء میں انہوں نے بھی رحلت کی اور وصیت کے مطابق اپنی مسیحی اور بیوی کی اسلامی قبروں کی درمیانی دیوار میں ایک دریچی رکھوا گئے۔

" انکی ماں منظور النساء بیگم کی قبر کی طرح ملکہ بیگم کے مزار پر بھی ہر جمعرات کو قرآن خوانی ہوا کی۔

" لالٹین کی روشنی میں نواب قمر چہر کے استخواں پھر چمکے۔

" وہ لکھنؤ دہلی اور آگرہ تین شہروں کی حسین ترین بیگم کہلاتی تھیں۔

" اوپر آ کر لال خاں میواتی کے کہنے پر میں نے غلّہ خیرات کیا۔

" قمر چہر جسقدر خوبصورت اور ذہین تھیں اتنی ہی شکّی، بے رحم اور ظالم۔ ایک باندی نے انکو پلٹ کر جواب دیدیا تھا تو وہ چھری لیکر اسکی زبان کاٹنے کی تیاری میں مصروف تھیں جب عین وقت پر انکے شوہر نے آن کر انہیں روکا۔ دو خواصوں کو جیمز گارڈنر سے ہنستے بولتے پایا تو دونوں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا انکی لاشیں امام باڑے کے تہ خانے میں گڑوا دیں۔ جب میرے والد نے دفینے کی تلاش میں تہ خانہ کھلوایا تو دو ڈھانچے برآمد ہوئے۔"

ماضی کے دفینے۔ میں، نو رومانی شاعر نورمن ڈریک قمر چہر کو آئیڈیلائیز کر رہا تھا۔ مابعد التواریخ کی جستجو اور شناخت میں محو تھا کہ اچانک تاریخ کی مظہریت میرے سامنے آگئی۔ مقتول کنیزوں کے پنجر۔ اب مجھے حال میں واپس آنا چاہیے۔

"انجم شکوہ کے داماد ایلن یکے کیوں رنگنے لگے تھے؟" کچھ دیر بعد میں نے دریافت کیا۔
"۱۸۸۲ء میں تیسرے بیرن کا انتقال ہوا۔ انکے واحد نرینہ وارث تھے۔ کاسگنج کی جائیداد بیچ کر لندن پہنچے ——— اپنے موروثی خطاب کا دعوے کیا۔ حکومت کا جواب ملا آپکی ہندوستانی شاخ میں بے ضابطہ شادیاں بہت ہوئیں لہٰذا خطاب منسوخ۔ ڈریک صاحب۔ کیا وہ نسل پرست گورنمنٹ ایک ہاف کاسٹ شخص کو لارڈ بنا دیتی؟
"بے نیل و مرام اور قلاش واپس آئے۔ بازار میں یکے رنگنے لگے۔
" آخری لارڈ گارڈنر کی نواسی البتہ لیڈی ارون کہلائیں۔ وائسرائے ہند کی بیوی۔"

"فریڈم ایٹ مڈنائٹ" کا فرنچ یہودی مصنف لاپیئر مسکراتا ہوا سامنے سے گذرا۔
"اکثر آیا کرتا ہے۔" جرنلسٹ دوست نے کہا۔ "اس کتاب کے لیے اس کے اسٹاف نے اتنا ٹنوں میٹریل جمع کر لیا تھا کہ اسی کی بنیاد پر نہرو جناح وغیرہ کے متعلق دو تین بیسٹ سیلر اور لکھنے والا ہے۔"
"اچھا وہ موٹر ڈرائیور ولیم"۔ سلیمان شکوہ صاحب میرے سوال کا جواب دینے میں مصروف تھے۔ "نہیں۔ وہ گارڈنر نہیں تھا۔ کوئی انگریز تھا۔ ایک ہریجن عورت کے ساتھ رہتا تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے اسے ٹاٹ باہر کر رکھا تھا۔ زیدی صاحب کے ٹرانسفر بعد ادریس لوئیس لائیڈ انکی جگہ آئے۔ وہ انکا شوفر نہیں رہا۔"
ادریس لوئیس لائیڈ۔ فوراً میرے تصور میں ممی کے البم کی وہ تصویر آگئی۔ لہنگا چولی پہنے ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ فوجی دلخوش سبھا۔ دلکشا گارڈن ۱۹۴۲ء۔
"ادریس لوئیس لائیڈ ———" میں نے دہرایا۔
"جی ہاں۔ غالباً یہودی انگریز تھا۔ لارڈ ریڈنگ کی طرح۔ اس زمانے میں یہودی اپنی یہودیت کو چھپاتے تھے۔ اپنے اوریجن کو مستقل پوشیدہ رکھنا نہایت صبر آزما ہوتا ہوگا ———"
"کیا آپ لوگوں کو کبھی اس بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑا؟" میں نے یکلخت ذرا ترشی سے پوچھا۔ "تشخص کا بحران" ایک جدید اصطلاح ہے۔

"بالکل کرنا پڑا۔ ان سب کو زبردست کومپلکس تھا۔ وہ دراصل کون ہیں۔ انکی مُونگز کہاں
ہ؟ مُنّا صاحب نے اس سوال کو حل کر لیا تھا۔"

دن ڈھل رہا تھا۔ پھاٹک پر پہنچ کر دونوں گارڈنرز کو خدا حافظ کہا۔ چند لحظوں تک میں
براین سیلمان شکوہ گارڈنر کو راستہ پار کرتے دیکھا کیا۔ ۱۹۸۲ء کی دہلی میں شہزادہ سیلمان شکوہ اور
رچہر بیگم کے ایک غیر معروف نام لیوا۔ راجدھانی کی بھیڑ میں کھو جانے والا ایک چہرہ ——
میں اڈیٹر دوست کی کار کی طرف بڑھا۔ جم خانہ کے پرسکون باغ میں ایک مور بے نیازی
سے گردن اٹھائے، خراماں خراماں، سامنے سے گذر گیا۔

لکھنؤ۔ ممی کی کوٹھی دیکھنے کو نہ ملی۔ اسکی جگہ بڑی محل کھڑا ہے۔
پانیر اخبار میں یہ اطلاع چھپ گئی ہے کہ ہونہار نوجوان انگلش پوئیٹ مسٹر نورمن
ریک ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد چند روز کیلئے لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ شاید
ہ لوگ یہ خبر پڑھ چکے تھے۔ جب میں نے فون کیا۔ ایک خاتون نے بات کی ان کا
SING-SONG انڈین لہجہ دلچسپ لگا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ وہی نامور انگریز شاعر فون
کر رہا ہے وہ بہت اکسائیٹیڈ معلوم ہوئیں۔ اور بن بن کر انگریزی بولنے لگیں:
— محض اتنا کہا کہ میں ایک موڈرن ہندوستانی کنبے سے ملنا چاہتا ہوں، یہ حقیقت
ی برٹش کونسل والوں سے بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اب اس کنبے سے ظاہر
یہ نہ کہنا چاہتا تھا کہ پینتیس ۳۵ برس قبل جو لال آبی بی یہاں رہتی تھی اس کا نورِ نظر ہوں۔

جس وقت میں وہاں وارد ہوا اسی لمحے وہ گھر پہنچی تھی۔

وہ ہاتھی کے ہودج سے نہیں اتری۔ ایک اسپورٹس کار سے چھلانگ لگائی میں اسکی

شکل دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ بیساختہ اسکے پیروں پر نگاہ کی۔ اس نے چاندی کی کھڑاویں نہیں پہنی تھیں۔ بلکہ نہایت بھدّے بوٹ۔ گھسی ہوئی جینز۔ میک اپ سے عاری چہرہ "ہائے ـــــ" اس نے ہاتھ اٹھا کر بیفکری سے کہا۔

اسکا نام پری بیگم ہے اور وہ پری محل میں رہتی ہے اور وہ اتنی خوبصورت ہے کہ مجھے خیال آیا قمر چہر ایسی ہی رہی ہوں گی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرے لئے اتنے زبردست لنچ کا انتظام کرینگے میزبان خاتون ایک اردو رائیٹر ہیں وہ فضول سے رومانی ناول لکھتی ہیں جو بے حد بکتے ہیں۔ انکے بھائی اونچے کاروباری ہیں۔ لنچ بالکل انگلش تھا (حالانکہ میں ہندوستانی مسلم دسترخوان کی خواہشمند تھا) جو اعلیٰ درجے کے خانساماں نے تیار کیا تھا۔ میزبانوں نے شاید مجھ پر میلکم مگرج کے اس مقولے کی صحت ثابت کرنی چاہی تھی کہ پکا انگریز براؤن صاحبوں کے روپ میں اب صرف ہندوستان میں موجود ہے۔ مہمانوں میں چند اعلیٰ اسوبلین نوجوان شامل تھے۔ ملک کے پبلک اسکولوں کے تعلیم یافتہ ـــــ چھاؤنی کے چند اعلیٰ فوجی افسر سینڈھرسٹ ٹائپ۔ ناولسٹ خاتون کی بھتیجی پری بیگم وُوڈسٹاک اسکول مسوری۔ اولڈمیڈ پھوپھیاں نیوسنس ناولسٹ چنٹ اور چھوٹی اپنی عمر کے لحاظ سے چپلّی۔ جو اپنے فیملی ڈاکٹر منصور کاشغری کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ یہ سمجھدار قبول صورت شخص اس صورت حال سے گھبرا رہا تھا۔ مگر اس خوش شکل خاتون سے فلرٹ کرنے میں بھی مصروف تھا۔

میں نے پری بیگم کو انگریزوں کے قبرستان چلنے کی دعوت دی۔

دوسرے روز ہم لوگ مال روڈ کی طرف اس وسیع بکھر سک شہر خموشاں۔ پہونچے۔ گرینڈ فادر ڈریک کی قبر آسانی سے مل گئی۔

نام نظر آرہا تھا۔ باقی عبارت پر گرد جمی ہوئی تھی۔ میرے اندر ایک شریر بھتنا جاگا۔

پری بیگم نے اُچک کر پڑھنا شروع کیا "جارج نورمن ڈریک۔"

"سرز آجر ڈریک کی لائن،" میں نے ذرا بے نیازی سے کہا۔
"گوش! سرز ادجر ڈریک ــــ یو۔پی کے گورنر تھے؟"
"نہیں بھئی بہت پہلے۔ سراج الدولہ کے عہد میں ــــ گورنر فورٹ ولیم۔ کلکتہ۔"
"جیسز! بری بیگم نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔ مرعوب ومسحور۔
"مگر میں نسب پرستی کا سخت مخالف ہوں۔ اسکا ذکر کبھی نہیں کرتا ــــ" میں نے اپنے باپ والی چارمنگ مسکراہٹ اپنے چہرے پر پھیلتی محسوس کی ــــ معاً مجھ پر منکشف ہوا کہ میں بھی اپنے نانا اور ماں باپ سے مختلف نہیں۔ فرق محض اس چیز کا ہے کہ مجھے زندگی میں ان سے بہتر مواقع
لیکن میرے والد تو چاندی کا چمچہ منہ میں لیے پیدا ہوئے تھے۔ سارے مواقع انھیں میسر تھے پھر بھی انہوں نے غلط راہیں اختیار کیں کیونکہ انتخاب اُنکا اپنا تھا۔

ہندوستانی "سین" کے بارے میں ودیا دھرنیپال اور وید مہتہ کی طرح بھی لکھا جاسکتا ہے، آندرے مارلو کی طرح بھی۔ میں محض اپنی والدہ کی کمیونٹی کے متعلق حقائق قلمبند کرونگا۔ والد کے کثیر الجہت مسلم ورثے سے بیگانہ ہوں۔ انسان کتنا کچھ جان سکتا ہے۔ شاید گیتا میں سری کرشن نے کہا ہے سمندر کے جس حصّے میں خود کو موجود پاتے ہو اسی سے واقف ہو جاؤ تو غنیمت ہے۔

ہمارے مغرب میں باغی نوجوانوں کی اصطلاحات بسرعت بدلتی رہتی ہیں۔
آؤٹ سائیڈرز کی جگہ ڈراپ آؤٹ آگئے۔ سین اور ٹرپ کا زور رہا۔ پہلے زمانے میں ایک ہارٹ وغیرہ مثلک بزرگ اپنی روحانیت کے بل پر افلاک کی خبر لاتے تھے۔
اہل کیلی فورنیا نے ذات کا سفر ایل ایس ڈی کی لہروں پر طے کیا۔ جہاں غرب ان دنوں ہندو اور بدھسٹ ٹرپ بھی نہایت مقبول ہے، ادھر مڈل ایسٹ، پاکستان اور یہاں بھی، اسلامی بنیاد پرست ٹرپ بہت رش لے رہا ہے۔ میں ان دنوں چونکہ

یورشین ٹرپ پہ ہوں ایک روز پری بیگم کے ساتھ لکھنؤ امیر الدولہ پبلک لائبریری میں براؤزنگ کرتے ہوئے کلکتہ کا پرتگالی نژاد ہنری ڈیروزیو ڈسکور کیا۔ جوانمرگ شاعر، جرنلسٹ۔ وطن پرست۔ رومینٹک۔ سروجنی نائیڈو کا پیشرو۔ جبوقت اسکے انگریزی داں نیٹو بنگالی معاصرین مغرب کی یلغار سے متاثر اور مرعوب تھے وہ ملک کی غلامی پر آنسو بہاتا تھا۔ "سنو پری! وہ دلدار نامی ایک کشمیری ناچ گرل سے کیا کہہ رہا ہے۔"

پری بیگم ناچ گرل نہیں۔ ڈسکو کی ماہر ہے۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔

THE HEART ETERNALLY IS BLEST WHERE HOPE

ETERNAL SPRINGS THEN HUSH THY SORROWS ALL TO REST

WE'LL TREAD THE COURT OF KINGS

LIKE BIRDS FROM LAND TO LAND WE'LL RANGE

AND WITH OUR SWEET SITAR

۱۹۸۲ء کی غیر جذباتی پری بیگم ہنس پڑی۔ "یہ حضرت غیب دان بھی تھے!"
"ہاں طیارے پہ میرے ہمسفر استاد مُنّو خاں مع اپنے ستار حسب معمول کسی مغربی دورے سے ہندوستان واپس آرہے تھے۔" مجھے بھی ہنسی آگئی۔

OUR HEARTS THE SAME THOUGH THE WORLD MAY CHANGE

WE'LL LIVE AND LOVE, DILDAR.

میں نے کتاب بند کردی۔ پری بیگم نے متفکر ہو کر گھڑی دیکھی۔ "اب گھر جاؤں۔"
"اگر آج رات تم میرے ساتھ گھومنے چلی گئیں تو کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔
وہ بھونچکی سی نظر آئی۔ "رات کو گھومنے؟ یعنی ——؟"
"یہی۔ میرے جائے قیام پر چلکر ڈنر۔ اسکے بعد —— کافی وغیرہ۔"
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تمہارے گھر والے بہت خفا ہونگے؟"

"محض خفا — ؟"

دریچوں سے آتی ڈھلتی دھوپ میں نصیر الدین حیدر کا اسٹیچو دمک رہا تھا۔ اوقمر جہر

"تم نے کوئی ڈرگ چکھی ہے؟"

"میں نے تو نہیں مگر کالجوں میں اسکا فیشن چل پڑا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ سُنا ہے طرح طرح کے منظر دکھلائی دیتے ہیں۔ تم کبھی ٹرپ پر گئے ہو؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "آؤ۔ تمہیں گھر پہنچا دوں۔"

مہاراجہ محمود آباد کے قدآدم روغنی پورٹریٹ کے نیچے سے گذرتے ہم باہر آتے قیصر باغ کی زرد خستہ عمارتیں پیلی دھوپ میں اور زیادہ اداس نظر آرہی تھیں۔ لکھنؤ رِوکوکو۔ مغلیہ طرز تعمیر کے تنزّل کا نمائندہ۔ زوال پذیر شفق آلود تمدّن ہمیشہ بڑا نظر فریب ہوتا ہے نصیر الدین حیدر جنرل گارڈنر اور قمر جہر کا لکھنؤ۔ ۱۸۲۷ میں دُور کلکتے میں بیٹھا ہنری ڈیروزیو اسی زوال پر آنسو بہا رہا تھا۔

"ہمارے ہاں بھی تو افیونی ہوا کرتے تھے" پری بیگم نے کہا۔ وہ ابھی تک منشیات کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اچانک بولی "پتہ ہے میری شادی ہونے والی ہے۔"

"اوہو۔ مبارک ہو۔"

"ڈیم — مبارک — اِہل — !"

"کیوں؟"

"وہ لوگ ڈیڈ کی طرح کاروباری لوگ ہیں کروڑپتی۔ داڑھی والے۔ حاجی۔ لڑکا سنا اور میں پڑھ چکا ہے مگر وہ بھی حاجی۔ بور۔ مجھے ذرا پسند نہیں۔"

"تو انکار کردو۔"

"وہ لوگ ڈیڈ کے بزنس پارٹنر ہیں۔"

لال باغ پہنچکر ہم لوگ ایک پرانی عمارت کے سامنے سے گذرے "اس حویلی میں ۔۔" پری بیگم نے کہا "بیگمات اودھ رہتی تھیں ۔ وہی ـــــ وارن ہیٹینگز والا قصہ ـــــ" اوہ ۔!! میں نے اشتیاق سے سر باہر نکالا ۔ ایک گرلز کالج کا بورڈ لگا ہوا تھا ۔ کیلے کے پتوں سے سجے پھاٹک پر ایک متین ، چھریری سی خاتون چند لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھیں ۔ اندر دورویہ لڑکیاں ! سڑک پر پولیس کا بندوبست ۔

"آداب باجی بیگم ـــــ" پری نے کار کی رفتار دھیمی کر کے انھیں سلام کیا " یہ پرنسپل ہیں ۔ آج یہاں یونین منسٹر اف ایجوکیشن آنے والی ہیں ۔ کوئی کلچرل پروگرام ہے "

"کلچرل پروگرام" جہانِ سوئم کی مخصوص و مرغوب اصطلاح ہے ۔ میں مسکرایا ۔ ہم لوگ آگے بڑھ کر پری محل پہنچے ۔

اس فیسٹری کا سل کے اندرٹی وی لاؤنج میں دونوں پھوپھیاں ویڈیو کے سامنے اسطرح براجمان تھیں گویا جادوگرنیاں اپنی جادو کی دیگچی کے سامنے بیٹھی کھدبد کچھ پکا رہی ہوں ۔ انکا افغان ہاؤنڈ قبلائی بہادر مرمریں فرش پر ڈٹا گویا انکی سازش میں شامل تھا ۔ میں نے پلکیں جھپکیں ۔

خرانٹ قسم کی بڑی پھوپھی نے مجھے تیکھی نگاہ سے دیکھا ۔ مجھے یکلخت عجیب سے خوف نے آدبوچا ۔ جنرل اسکنر کی راجپوت ماں نے اس غم میں خودکشی کر لی تھی کہ اسکا فرنگی شوہر اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیج رہا تھا ۔ وہ تو دو سو سال قبل کی بات تھی حال ہی میں انگلستان میں رہنے والے ایک سکھ نے اپنی لڑکی کو اس وجہ سے قتل کر دیا کہ وہ انگریز لڑکوں کے ساتھ ڈیٹنگ کرنے لگی تھی ۔ یہ لوگ بہت موڈرن بنتے ہیں مگر یہ بھی مجھے اور پری بیگم دونوں کو مار ڈالیں گے

یکلخت مجھے ہنسی آگئی ۔ انگلستان اور انڈیا کے کتب خانوں میں کمپنی کے عہد کی کتابیں ، اور کرنل میڈوز ٹیلر اور کرنل سلیمن کی تصانیف پڑھتے پڑھتے شاید میرا دماغ ضرورت سے زیادہ فعال ہو گیا ہے ۔ چند ماہ میں میرا یہ حال ہوا ۔ یوروپ تو مشرق کے متعلق چار سو سال سے طرح طرح کی خرافات پڑھ رہا ہے ۔

محض خرافات؟
اور جو ابھی ایک شہزادی اور اس کے دوست کے سر قلم کر دیے؟

بڑی پھوپھی نے نہایت اخلاق سے بدھ کی شام ڈنر کی دعوت دی ـــــ مغربیوں
، دوستی یہاں اسٹیٹس سمبل ہے۔ محض گوری چمڑی کیوجہ سے میری اسقدر آؤ بھگت!

پھر اسٹیریوٹائپ اور ایمج ـــــ کیا معلوم یہ پھوپھیاں نہایت نارمل خواتین ہوں۔
بڑی محل انکے بھائیوں نے بالکل جائز کمائی سے تعمیر کیا ہو۔ ہر بزنس مین بے ایمان نہیں
اس آئینہ خانے میں جہاں ہر چیز ترچھی نظر آرہی ہے، اپنے ذہن کو آئینے کی طرح صاف
ہوں ـــــ یہی تو کیتھولک مسٹک بھی کہتے ہیں ـــــ میں نے دریچے سے باہر نظر ڈالی۔ کچھ
صلے پر حضرت گنج کے نئے فلک بوس رومن کیتھولک کیتھڈرل کی سرخ صلیب سیاہ آسمان
ں لعل بدخشاں کے مانند درخشاں تھی۔
کل اتوار ہے۔ صبح سویرے ماس میں جانا ہے۔ ہوٹل واپس جا کر سونا چاہیے۔

نوجوان ذہن پرستوں کی ایک محفل۔ میزبان ایک امیرزادہ کہ ایک شوقیہ ڈرامہ گروپ
سرپرست ہے۔ یہ منڈلی سائبانوں میں جمع ہو کر (کرسیوں کی جگہ لکڑی کے ڈبے، بکٹ وغیرہ
سٹیج کرتی ہے۔ ہاؤ کیوٹ! بڑی بیگم نے ذرا کمینے پن سے کہا۔ اسکا "آؤٹ ڈور" حلقہ مختلف ہے
ہ مجھے اس لڑکے کی کوٹھی پر اتار کر ٹینس کھیلنے چلی گئی۔

DEN میں بیرے ڈرنکس سرو کر رہے تھے۔ آرٹی قسم کی لڑکیاں لڑکے چٹائیوں پر
ے ہوئے تھے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کھادی سلک سے مجلد "جدید ہندستانی حسیت"
سے لبریز انڈو اینگلین نظموں کے مجموعے مغربی مصنفین کی کتابیں۔ دیواروں پر مغربی پوسٹر۔
یک موتیف کی ایک عریض موڈرن پینٹنگ۔

پرجوش گفتگو۔

"لکی گائے یار۔ دِس مِڈ نائنٹیس چلڈرن والا۔"

"میرے انکل وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ باقی کار گئے تھے۔"

"نون وائیلنٹ کنٹری! جیزس کرائیسٹ۔۔۔!!"

"ٹرائی دِس مسٹر ڈریک۔ میری اکیسویں سالگرہ پر ڈیڈی کا تحفہ۔" میزبان کا چھوٹا بھائی

"ہیرے سنی ۔۔۔ فری براؤن اینڈ ٹوئنٹی ون ۔۔۔! یو مسٹر ڈریک ۔۔۔ فری وائیٹ اینڈ

ٹوئنٹی فائیو ۔۔۔!"

" WASP "

"وہ کیا چیز ہے بیٹا ۔۔۔؟" ایک اور نوجوان کا سوال۔

"ویسٹرن اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ ۔۔۔ کائنات کی سب سے زیادہ برخود غلط مخلوق۔

بارسو سال سے دنیا کو جیب میں ڈالے گھوم رہے ہیں۔"

"ویسٹرن اینگلو سیکسن کیتھولک ۔۔۔!" میں نے اپنے متعلق تصحیح کی۔

"او۔ کے۔ او۔ کے۔ جیزس کرائسٹ۔ چار سو سال سے ۔۔۔"

"میرے انکل وہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ آل مائی جیزس ۔۔۔"

اینٹے میں وہ اینگلو انڈین کرسچین بھائی عادتاً اللہ تعالیٰ ماشاءاللہ انشاءاللہ کہہ رہے تھے

کندھے سے جھولا لٹکائے ایک اور نوجوان کا داخلہ۔ ایک طویل کاغذ پیش کیا۔ سب نے

باری باری اس پر دستخط کیے ۔۔۔ واپس جانے لگا مجھے دیکھ کر ٹھٹھکا۔

"ایچ۔ ایم۔ رائٹس کے خلاف ہمارا احتجاج۔ یہ خط ۔۔۔ انگلش پریس میں چھپے گا۔"

"اس سے کیا ہوگا ۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے افسردگی سے جواب دیا۔ "میں تو آرمز ریس کے خلاف بھی کئی خط

چھپوا چکا ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

میں نے اپنے حلق میں کوئی چیز اٹکتی محسوس کی۔

"موجودہ رائٹس کے خلاف شہر کے آٹھ سینیئر انٹلکچوئیلز کے دستخطوں والا خط تو کل ہی انگلش پیپرز میں آگیا ہے ——"

"ہاؤ نائیس"، میری سمجھ میں نہ آیا اور کیا کہوں۔

"کلچر" کی طرح "انٹلکچوئیل" اس خطہ ارض کا ایک مرغوب لفظ ہے۔ آل انڈیا انٹلکچوئیلز کانفرنس ینگ مسلم انٹلکچوئیلز کانگریس۔ انٹلکچوئیلز فورم۔

میں نے پوچھا: "یہ شہر یہاں سے کتنی دور ہے۔ جہاں یہ۔ ایچ۔ ایم"

"بے حساب مارکاٹ ——"

"میں قینچی سے کاٹتا نہیں۔ شوئی دھاگے سے جوڑتا ہوں ——"

"ڈیم گڈ یار۔ یہ کس نے کہا ہے؟"

"ایک شوفی شینٹ۔ میڈیول ڈیلہی"

"ایلی منٹری ہیومنزم یار" ایک کونے سے آواز آئی۔

"چلو اسکا پوسٹر بناتے ہیں۔ ڈیم گڈ سلوگن"

"ایلی منٹری سلوگن یار۔ سارے مذہب ایک راستہ دکھاتے ہیں۔ سب انسان ایک ہیں —— بوگس —— مسٹر ڈریک —— آپ بتائیے کیا موسک ٹمپل چرچ ایک دوسرے سے جڑ سکتے ہیں؟ ناممکن —— اسٹون اسپنڈر نے کہا ہے —— کہ یہ حقیقت کہ ہر آدمی کی ایک آنکھ —— دو ناکیں —— سوری —— دو آنکھیں ایک ناک دو کان ہیں اسکا یہ مطلب نہیں کہ میں اور جاپانی ایک ہیں ——؟ آخری تجزیے میں ڈریک صاحب —— سب الگ الگ ہیں —— رائیٹ ——؟

"اس آخری تجزیے کے بعد تم سالے ہم سب کو آخری نیوکلیر دھماکے تک بہت جلد پہنچا دوگے —— شاباش ——"

"شوُ —— شوُ —— شوُ —— "

لڑکیوں نے نعرہ لگایا

سب نے ملکر اس چھوکرے کو دوڑا دیا۔
نائیس کِڈز۔ انکے دل صحیح جگہ پر ہیں۔

پری محل میں ڈنر پر میرا انتظار کیا جا رہا تھا۔

میز پہ بین الاقوامی سیاست کا ذکر چھڑا۔ صاحب خانہ بار بار مجھے مخاطب کرتے آپ انگریز لوگ ـــــ آپ کی انگلش قوم ـــ
جی چاہا انکو بتلا دوں کہ میرے والد اودھ کے ایک سابق تعلقدار ہیں۔ مگر اس میں دو قباحتیں ہیں:ـــ
(الف) والد محترم کا نام کسی روز بھی بسلسلہ انٹرپول ہندوستان کے انگلش پیپر میں چھپ سکتا ہے۔
(ب) ہندوستانی باپ کی اولاد کی حیثیت سے انکے لئے میری شخصیت کا وہ سحر فوراً زائل ہوجائیگا جو ایک "انگلش پوئینٹ" میں مضمر ہے۔

بال بال بچا ـــ
اس عجیب وغریب ڈرائنگ روم میں پری کے والد اور چچا اس آبشار کے نزدیک بیٹھے ایک اعلیٰ سرکاری افسر سے باتیں کر رہے تھے کمرے کے دوسرے حصے میں ایک پنجابی انڈسٹریلسٹ نے تاش کے کھیل دکھانے شروع کئے۔ میں اس گروہ میں موجود تھا کارڈ شارپنگ کا تذکرہ نکلا۔ تین چار مہمانوں نے کارڈ شارپرز سے اپنے اپنے ابن کاؤنٹ کے قصے سناتے۔ پری بیگم کے فیملی ڈاکٹر منصور کاشغری نے کہا "صاحب جب میں بوسٹن میں کام کرتا تھا ایک حیرت انگیز پاکستانی کارڈ شارپر سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک کروڑپتی "بوسٹن برہمن" بیوہ کے ہاں مقیم تھے۔ معلوم ہوا ماہر فن: ـــ"

میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر کاشغری نے اپنا بیان جاری رکھا" وہ حضرت دراصل اسی شہر لکھنؤ کے باشندے تھے۔ کسی تعلقدار کے بیٹے۔ صاحبزادہ صاحب آف دھان پور۔ خوب چیز تھے۔ بیحد دلچسپ فنِ گفتگو کے ماہر۔"

پری خانم کی چھوٹی پھوپھی شہوار ڈاکٹر کے نزدیک کشن چیئر پر پوز بنائے بیٹھی تھیں ۔۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے ڈاکٹر اچانک بار بار اچٹتی سی نظر ڈال کر مجھے دیکھ رہا ہے۔ گویا راجہ دلشاد علی خان آف دھان پور کی ایک جھلک میرے چہرے میں اُسے نظر آگئی ہو۔

بہتر یہ ہوگا کہ میں کل ہی دلی جاؤں۔ وہاں سے لندن۔ پری بیگم نے وعدہ کیا ہے کہ بہت جلد انگلستان کا ایک چکر لگائے گی۔

لیکن جو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہوئی وہ یہ کہ جب ڈاکٹر کاشغری مس شہوار خانم کو میرے والد کا قصہ سنا رہے تھے کہ وہ آزادی کے کچھ عرصے بعد پاکستان چلے گئے تھے تب سے مغربی ممالک میں ٹھگی وغیرہ کرتے پھر رہے ہیں۔ مافیا سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور یہ کہ شاید مافیا والوں ہی نے انکو قیدِ حیات سے آزاد کر دیا ہے۔ یہ آخری جملہ سُن کر تو میں بے اختیار رکھنا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ مگر شہوار خانم نے لاپروائی سے کہا "ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ ہمارے کزن تھے، ہمیشہ کے GOOD-FOR-NOTHING ۔"

مجھے پری خانم نے یہ تو بتلایا تھا کہ۔ یہ لوگ بھی پہلے جاگیر دار تھے۔ مگر یہ عجیب و غریب اتفاق ہوا۔ گویا یہ سب میرے رشتے دار ہیں۔ اب پہلی فلائیٹ سے برطانیہ واپس او قمر چہر! افسوس کہ میں جیمز گارڈنر جیسا جیالا نہیں۔ بائی بائی پری بیگم!

(انگریزی سے ترجمہ)

(۲۶)

گھر گھوڑا نخّاس مول

کوٹھی ایک بنگالی نے بنوائی لہٰذا لامحالہ اسمیں ایک تالاب بھی موجود تھا۔ حسین بخش
نے اس کے کنارے بطخیں پال رکھی تھیں۔ جب وہ انکو دانہ ڈالتے وہ موٹی موٹی بطخیں
قیں قیں کرتی ایک ساتھ ان کی سمت لپکتیں۔ اسوقت وہ عندلیب بانو کو کم عقل
عورتیں معلوم ہوتیں۔ بیوقوف خواتین اور بطخوں میں کسقدر مشابہت پائی جاتی ہے
بطخ کو SILLY GOOSE کہتے ہیں۔ میں بھی ایک سِلی گوز ہوں۔
پھر وہ اسٹوڈیو کے دریچے میں کھڑے آسمان کا جائزہ لیتیں ان گنت
پرندے —— جو سائبیریا سے چلتے ہیں اور راہ میں جبلی طور پر اپنے اسٹیشنوں پہ رکتے
منزل پر پہنچ جاتے ہیں یا آندھی چلتی ہے تو راستہ بھول کر کہیں سے کہیں نکل جاتے
ہیں۔ عینک لگا کر وہ سفید سائبیرین سارس اور قازا اور بگلے اور ہنس میں تفریق کرنے
کی کوشش کرتیں مگر اُڑتے پرندوں کی انہیں پہچان نہ تھی۔
کیا یہ محض اتفاق ہے کہ منصور بمبئی سے واپس آکر صرف ایک بار ملنے آیا ہے
وہ ماتا شا ہیلتھ کلب قائم کرنے اور MADISON AVENUE نیویارک کے اصولوں
پر اس کی پبلسٹی کروانے میں مصروف ہے مگر فون پر بھی خیریت نہیں پوچھ سکتا

اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال، دانشور بھی اپنے قدیم، لاشعوری تعصبات
حصار کو نہیں توڑ پاتے کسی نے کہا ہے —— ہندوستان کے ہریجن ہی مہذّب دنیا
واحد اچھوت فرقہ نہیں۔ یہودی۔ عرب۔ شیعہ۔ سُنّی۔ ہندو۔ مسلمان۔ بہائی
نیگرو۔ طوائفیں —— سب تعصّبات کا شکار ہیں۔ تعصّبات ذہن میں جاگزیں

ہیں پھر رفتہ رفتہ سائیکی میں سرایت کرتے ہیں۔ نسلوں کی جبلت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کی طرح ہم سب اپنی اپنی جبلت کے پابند ہیں۔۔ جس کے آگے منطق ہتھیار ڈال دیتی ہے ——

چنانچہ راستبازی اور ایمانداری بھی غلط ہے۔ نقیہ صحیح۔ انسان جبلی طور پر جھوٹ بول کر اپنا دفاع کرتا ہے۔ اپنے آپ کو خطرے سے بچاتا ہے —— او۔ کے۔ مگر میں نہیں مان سکتی کہ منصور جیسا سمجھدار جہاندیدہ آدمی عنبر جیسی نیک لڑکی سے محض اسلیے بددل ہو جائے گا کہ اسکی ماں اور نانی کو عرصہ دراز قبل بحالت مجبوری۔۔ —— لیکن انسانی دماغ ایک قطعی ناقابل اعتبار شے ہے۔ انسان کسی بھی وجہ سے آپ سے آپ بالکل بدل جاتا ہے۔

او۔ کے۔ اور کیا یہ بہتر نہ ہوا کہ میں نے عنبر کی اصلیت آشکار کی تو اس شخص کی ذہنیت واضح ہو گئی ؟

عندلیب بانو دریچہ بند کر کے شراب کی الماری کھولتیں۔ فرانسیسی اور اسکاچ بوتلوں کے لیبلوں پر چھپے سنہ غور سے پڑھتیں — VINTAGE YEAR فلاں —— سنہ فلاں۔ جو شراب جتنی پرانی ہو اتنی ہی بڑھیا اور نادر سمجھی جاتی ہے۔ VINTAGE میں بھی ہوں مگر ناکارہ۔ فضول۔ ABSURD ۔ چپ رہی تو برسوں چپ رہی بولنے پہ آئی تو متواتر بولتی چلی گئی۔ ستر برس جنگل میں گذار کر دوسرے جانوروں سے کچھ نہ سیکھا۔ نہ لومڑی سے چالاکی نہ بھیڑیئے سے خونخواری نہ ہتھنی سے کینہ رہی وہی رسلی گوز۔

وہ مے ناب سے غم غلط کرنا شروع کرتیں۔ بھری دوپہروں کا طویل سناٹا۔ میں اپنے کلینک میں حسین بخش، رام سروپ اور رم کلیا شاگردپیشے میں محو خواب۔ بہادر سٹر گشت کے لئے باہر چلا جاتا۔ وہ اپنے تصویر خانے میں بیٹھی پرانی تصویریں دیکھا کرتیں۔ وہ پورٹریٹ جو بنگالی مرچنٹ پرنس کی بگان باڑی میں بنایا گیا تھا۔ وہ تصویر جو ولایتی چکر میں ہوا خوری کرتے ہوئے امبا پرشاد نے ایک فوٹو گرافر سے اتروائی

SNAPSHOT ۵۷ جو محاذ پر جانے سے قبل وکٹوریہ میموریل کے باغ میں
پائیلٹ افسر اینگس مک نیل نے کھینچا۔
پرندوں کو اپنا راستہ معلوم ہے۔ دنیا کی بیشتر مخلوق اپنی اپنی منزل پر پہنچ جاتی
ہے۔ الآمیرے ـــــ

شراب کی الماری کے نچلے خانے میں رکھے پرانے ریکارڈ الٹتی پلٹتیں۔ اس امید
پر کہ شاید نواب بیگم کا کوئی پرانا "توا" ہاتھ آجائے۔ انکو اچھی طرح معلوم تھا کہ نواب بیگم
جے پور سے کلکتے پہنچتے ہی اپنے سارے ریکارڈ چکنا چور کر چکی تھیں۔ مگر ہمیشہ عندلیب
بانو کو یہ آس رہتی کہ شاید ایک آدھ فلومینا نے بچالیا ہوا اور وہ اس انبار میں مل
جائے۔ نواب بائی کے ریکارڈ کے بجائے ایک غزل ہاتھ لگتی جسے ممّا بار بار بجایا کرتی
تھیں ـــــ کیا جہاں برباد کو وہ سر بسر دمساز تھا ـــــ فراموش شدہ ماسٹر محمد اسلم
کی گائی ہوئی۔ وہ ٹھٹھک کر سوچنے لگتیں ـــــ ممّا کی حسین مخروطی انگلیوں نے یہ ریکارڈ
چھوئے تھے ـــــ وہ انگلیاں مدتیں گذریں خاک ہوگئیں۔ وہ اپنی انگلیوں کو غور سے
دیکھتیں۔ بہت جلد یہ انگلیاں بھی کیڑوں کی غذا بنیں گی۔ نہیں صاحب ـ میں وصیت
کر جاؤں گی میری لاش کو الیکٹرک کریمٹوریم کے سپرد کیا جائے ـ دہشت طاری ہوتی
پھر ریکارڈوں کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔ مس دلاری۔ زہرہ بائی۔ عنایت بائی ڈھیرو والی
انور بائی اف آگرہ ـ وہ مسکراتیں ـ یہ سب اپنی سوسائیٹی کے لوگ تھے ـ انکے سامنے
کسی عزت کا ڈھونگ نہیں رچانا پڑتا تھا۔ ببّو ـ مجیدن ـ بُندو ـ

ڈرامہ لیلےٰ مجنوں کے قسط وار توے نکلتے چلے آتے ـ اور مزید غزلیں ـ کہ وہ
شوخ جس گھر میں مہمان ہوگا ـــــ ماسٹر اعجاز علی۔ اس ڈھب سے جھلک اپنی اس
شوخ نے دکھلائی ـــــ پیارے قوال۔ غم جدا، رنج جدا، درد جدا دیتے ہیں ـــــ
مس زہرہ جان ـــــ میرے درد جگر کی خبر ہی نہیں ـــــ مس گوہر جان اف کلکتہ ـــــ
ایک بار انھوں نے گوہر جان کا ریکارڈ ریڈیو گرام پر لگایا۔ ایک پھُسپھُسی گھسی ہوئی
آواز نکلی ـــــ میرے درد جگر کی خبر ہی نہیں ـــــ میرے ـــــ گویا ایک بھُوتنی

بھوت کال کے اندھے کنوئیں میں بیٹھی خنخنا رہی ہو ——— گوہر کی آواز ریکارڈ کی نیبرنی ابھرتی سیاہ لہروں میں بھی معدوم ہو چکی۔

لیکن کسی چیز کے باقی رہنے کی ضرورت کیا ہے ؟ ریکارڈ الماری میں واپس رکھ کر وہ دوبارہ بیگ پائیپر کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔

شام کو عنبر کلنک سے گھر آتی تو ماں سے بات نہیں کرتی تھی۔ بات کرو تو کاٹنے کو دوڑتی ——— نرسنگ ہوم میں کام کی زیادتی کی وجہ سے شاید اسکا نروس بریک ڈاؤن ہوتا جا رہا تھا۔

چند روز قبل وہ تین چار بلیاں تھیلے میں رکھ کر کہیں سے لے آئی تھی۔ اور اناؤنس کیا تھا۔ میں اب بلیاں پالوں گی۔ قاعدہ ہے OLD MAIDS بلیاں پال لیتی ہیں۔

وہ بلیاں اب بطخوں کے پیچھے پڑ گئیں تھیں۔ تالاب کے کنارے دن بھر ہنگامہ بپا رہتا۔ جس روز بہادر نواب بیگم کی تصویر اور دوسری قیمتی چیزیں چرا کر بھاگا اس روز سے مسز بیگ نے اسٹوڈیو میں محصور ہو کر دن دن بھر پینا شروع کر دیا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے۔ ایک شام انھوں نے خود ہی PIZZA تیار کر کے منصور کو فون کیا — اسکے ملازم نے اطلاع دی۔ بیگم صاحب وہ کوئی انگریز شاعر ولایت سے آیا ہے۔ اسکا ڈنر ہے شہوار بیٹا کے گھر۔ صاحب وہیں گئے ہوئے ہیں۔ پری محل۔

ایک اتوار کی صبح وہ برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں کہ موٹر سائیکل آکر رکی۔ گوگلز اور خود اتار کر منصور سیڑھیاں چڑھا۔

"تمہارا نام لکھنؤ میں فلائینگ ڈاکٹر پڑ جائے گا ——— یا فلیش گورڈن ———"
عندلیب بانو نے مصنوعی شگفتگی سے کہا اور سنہری زنجیر میں آویزاں عینک اتاری۔

"مزاج عالی بخیر ——— ؟"

"فائین۔ تھینک یو۔"

"کیا پچھلے دنوں طبیعت ٹھیک نہیں رہی ؟" ڈاکٹر نے مسز بیگ کے چہرے سے بھانپ کر پوچھا۔

"ہاں۔ ایسے ہی ذرا ــــ بقول شخصے حرج مرج تو لگا ہی رہتا ہے۔ ضعیفی خود ایک لاعلاج مرض ہے ــــ بیٹا ــــ" وہ اخلاقاً ہنسیں۔ "مگر تم بہت دنوں میں راستہ بھولے ــــ کیا پھر بمبئی چلے گئے تھے ؟"

"جی نہیں۔ وہ ــــ لکھنؤ میں ایک برطانوی شاعر آیا ہوا تھا۔ نگار خانم تقریباً روزانہ اسکے لیے کوئی نہ کوئی پروگرام کرتی رہیں۔ ڈنر۔ چائے۔ پکنک ــــ وغیرہ۔ مصر تھیں کہ میں بھی شرکت کروں۔ بمبئی تو میں اگلی بار شاید ایک ماہ کے لئے جا رہا ہوں ــــ"

"اوہو ــــ"

"جی بہت سے کام جمع ہو گئے ہیں ــــ SAUNA کے لئے دوسرا لیمپ خریدنا ہے۔ ایک یوگا ایکسپرٹ تلاش کروں گا۔ شارد آ کا خیال ہے کہ ساتھ ہی ایک اعلیٰ درجے کا بیوٹی پارلر بھی کھول دیا جائے۔ جڑی بوٹیوں والا۔"

"اس لائین میں تم لوگ بیگم حسین سے مقابلہ نہیں کر پاؤ گے۔"

"مقابلے کے بغیر جیے تو کیا جیے۔"

"تم زندگی کی دوڑ میں بہت آگے جاؤ گے پہلے میرا خیال تھا کہ خاصے بیفکرے سے انسان ہو ــــ اچھا وہ برطانوی شاعر ابھی ہے یا چلا گیا ؟ نورتن ڈرنک ؟"

"جی۔ کل گیا۔"

"پائنیر میں اسکا انٹرویو پڑھا تھا ــــ اسکی ایک نظم بھی چھپی تھی۔ ایک ایمپائر کا گورستان ــــ لکھنؤ کے انگریزی مقابر میں چند لمحے ــــ بڑی اداس خیال انگیز نظم تھی۔ مگر بھئی۔ قبرستان تو ظاہر ہے اداس ہی کرتے ہیں۔ مسرور تو کر نہیں سکتے۔ اچھا تمہارے لیے کافی بنا لاؤں۔"

"آپ زحمت نہ کیجئے۔ بہادر کہاں ہے ــــ ؟ ذرا سگریٹ لا دیتا۔"

"بہادر چوری کر کے بھاگ گیا۔"

"چوری ——— ؟"

"ہاں۔ بھئی۔ ہمارے ہاں چوری ہوگئی۔"

"ارے۔ ؟ کب ——— ؟ عنبر نے ذکر ہی نہیں کیا۔ کلینک میں اس سے روز ملاقات ہوتی ہے۔"

"اسے بتانا یاد نہیں رہا ہوگا۔"

"اتنا بڑا واقعہ ہوگیا اور اسے بتانا یاد نہیں رہا! بہت نقصان تو نہیں ہوا ——— ؟"

"بیٹا ——— وہ ——— یاد ہے اس شام جب تم نے مما کا وہ CAMEO دیکھ کر پوچھا تھا کہ بیحد قیمتی ہوگا کہاں سے خریدا؟ کس کی تصویر ہے ——— وغیرہ۔ یاد ہے ——— ؟"

"جی ہاں۔ قطعی۔"

"بہادر اس وقت کمرے میں آیا تھا۔ کافی کی ٹرے لے جانے۔ اس نے شاید غور سے یہ بات سُنی کہ یہ بیحد قیمتی تصویر ہے۔ بہت مہنگی خریدی ہوگی ——— بہرحال۔ اتنے دنوں وہ شاید موقعے کی تلاش میں رہا ——— اس اتوار کی صبح جب ہم لوگ سوکر اٹھے تو گھر میں صفایا۔ ڈرائینگ روم کے ڈیکوریشن PIECES ——— کھانے کمرے کا سلور ——— سب غائب۔ سب سے زیادہ دکھ مجھے مما کی تصویر کا ہے صدمہ سے میری جان نکل گئی۔ کیسی بھی تھیں میری ماں تھیں۔ اور انکی یہ تصویر میرے لئے انکی بڑی پیاری اور نادر یادگار تھی۔"

منصور نے فوراً اندر جاکر ڈرائینگ اور ڈائیننگ روم کا چکر لگایا۔ دونوں کمرے خالی خالی سے نظر آئے۔ برآمدے میں واپس آکر پوچھا ———

"آپ نے پولیس کو اطلاع کی ؟"

"بیکار ——— پولیس آئی۔ ایف۔ آئی۔ آر لکھوایا ——— کچھ نہیں ہوا وہ سارا سامان تو اب تک نخاس میں بک بکا گیا ہوگا۔"

"میں ابھی تفتیش شروع کرواتا ہوں۔ ایس۔ ایس۔ پی میرا دوست ہے"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انھوں نے عنبر سے کہا ہم تہوار کیلئے ناکہ بندی کروا رہے ہیں ــــ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ میاں لاکھوں کا مال چلا جاتا ہے۔ ڈاکو پکڑے نہیں جاتے۔ ہمارا تو کچھ ایسا بہت زیادہ قیمتی سامان گیا بھی نہیں۔ سوا اس تصویر کے۔ چاندی کی زیادہ قیمتی چیزیں مقفل رکھی ہوں زیور بنک میں ہیں۔ یہ آرائش کی چیزیں میں نے یورپ مڈل ایسٹ وغیرہ میں جمع کی تھیں۔ پھر بھی خریدی جا سکتی ہیں۔ لیکن بے چاری مما کی تصویر کہاں سے آئیگی ــــ"

"میں ابھی خود نخاس جاتا ہوں۔ ایک ایک کباڑی اور نیلام گھر میں تلاش کرونگا۔ آپ فکر نہ کیجئے ــــ"

"کوشش کر دیکھو گئی ہوئی چیز واپس نہیں ملتی۔"

"میں ابھی نخاس جا رہا ہوں۔ شام کو آکر بتاؤنگا" وہ موٹر بائیک پر بیٹھکر ہوا ہوگیا۔

عندلیب بانو نے رسالہ "سوسائیٹی" کی ورق گردانی شروع کر دی۔

چار پانچ دن تک نخاس میں تصویر کی ناکام تلاش کے بعد ڈاکٹر منصور کا شغری چند روز کیلئے بمبئی چلے گئے۔ وہاں کے مشہور عالم چور بازار میں کیمبو کی جستجو بھی اس مرتبہ انکے پروگرام میں شامل تھی ہیلتھ کلب کے لئے مطلوبہ سامان خرید کے تصویر کی تلاش میں ناکام رہ کر لکھنؤ واپس آئے۔ گھر پر صاحبزادی شہوار کے ٹیلی فونی پیغامات کا انبار رکھا ملا۔ ڈاکٹر منصور مال ایونیو پر ایک بیچلر فلیٹ میں رہتے تھے۔ عمارت کی مالکن انکی پنجابی لینڈ لیڈی راکھی بہن بن چکی تھیں۔ اور انکے سارے پیغامات اور ڈاک بڑی احتیاط سے رکھتی تھیں۔ مسز پدما بھنڈاری کو اپنے اس متوسط العمر بیچلر کرائے دار اور دھرم بھائی کے نجی معاملات سے ازحد دلچسپی تھی بھائی صاحب معمولی شکل والی سیدھی سادی لیڈی ڈاکٹر امبر سے بیاہ کرینگے یا اس کر وڑپتی کی اسمارٹ اور سندر بہن شہوار سے۔ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس اتوار کو ڈاکٹر منصو

ایرپورٹ سے گھر پہونچے ہی تھے کہ گیلری میں سے مسز بھنڈاری کی آواز آئی ——" نمستے جی —— بھائی صاحب — وہ آپکی شہوار جی کے ہاں آپکا بڑا انتجار ہو رہا ہے ۔کوئی فنکشن ہے ۔پچیّس ہجار فون آچکے ہیں ——"

صاحبزادی نگار خانم کے گھر پر اس طرح انتظامات ہو رہے تھے گویا کسی کی شادی ہے ۔شاید انکے منجھلے بھیّا کی بات کہیں طے ہو گئی ہو ۔یا ممکن ہے شہوار —یا انکی بھتیجی پرّی خانم —— ابھی تین بیاہ اس گھر میں باقی تھے ۔نگار خانم کو شامل کر و تو چار۔ آبشار والے کمرے میں داخل ہو کر نظر دوڑائی ۔اب وہ مدراس میں بنی کسی فارمولا مسالہ فلم کا سیٹ معلوم ہو رہا تھا۔ ایر پورٹ لاؤنج یا کسی فرم کے رسپشن روم کی طرح صوفے دیواروں کے ساتھ ساتھ نصب کئے گئے تھے ۔سفید پلاسٹک کے ٹکلیوں والے عظیم الجثہ گلوب سفید منقش پلاسٹک کی مصنوعی چھت سے لٹک کر فرش تک آرہے تھے اچانک روشن ہو گئے ۔اُس نے مُڑ کر دیکھا ۔ صاحبزادی شہوار خانم۔

" ویلکم ہوم لمبا غوطہ لگا یا سونا لیمپ خرید لائے ؟ ہندوستان میں بنا ہوا خریدا ہے ؟ امپورٹ کرتے —— اچھّا آپکے پیچھے ہم نے انٹریر ڈیکوریٹر بلوایا تھا۔ وحیدہ رحمٰن ، ہیما ، دھرمیندر ، امجد خاں وغیرہ سب کے گھر اسی نے سجائے ہیں دیکھیے یہ کمرہ کتنا بڑھیا ڈیکوریٹ کیا ہے اس نے ۔تین لاکھ صرف اس کمرے پر خرچ ہوا ۔"

منصور خاموش رہا۔

" دراصل بات یہ ہے کہ ۔ ہم لوگ دو سال قبل اس کوٹھی میں آئے ۔مطلب وہ پرانی کوٹھی بھیّا نے خریدی تھی دقیانوسی سی ۔کسی زمانے میں کسی انگریز کی ملکیت تھی ۔اسے گرا کر یہ نئی عمارت بنوائی ۔فلورز کیلئے بہترین سنگ مرمر جبل پور سے منگوایا خیال تھا منجھلے بھیّا کی بات کہیں پکّی ہو جائے تو اس سے پہلے ڈیکوریشن مکمّل کروالیں وہ کہیں طے ہی نہیں ہو پاتی ۔آپکو باجی نے بتایا تھا نا منجھلے بھیّا کو وہ آپکی پارٹنر ڈاکٹرنی پسند آئی تھی مگر وہ ایک P کی لڑکی نکلی ۔"

شہوار خانم کے منہ سے دوبارہ یہ واہیات جملہ سن کر ایک بار پھر منصور کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ "یہ آبشار والا مینٹل پیس بھی اب مکمّل ہوگیا ہے"۔۔۔۔ شہوار نے قطب مینار کے نمونے کا نقرئی لیمپ اور چاند نما گلوب جلایا۔ چاند کے نیچے دیوار پر بنی بار ریلیف کی برفپوش پہاڑی چمک اٹھی۔ دوسرا سوئچ دبایا۔ پہاڑی کا آبشار جاری ہوگیا۔۔۔۔ "یہ درخت ابھی لگایا گیا ہے"۔ تیسرا سوئچ۔ ایک نقلی درخت پر بیٹھی پلاسٹک کی چڑیاں سُریلی آواز میں چہچہانے لگیں۔

شہوار نے فخریہ منصور کو دیکھا۔ "ہے نا شاندار چیز!"

الٰہہ العالمین۔ تم لوگوں کو VULGARITY کا پرم ویر چکر اور بدمذاقی کا پدم بھوشن ملنا چاہیے۔ منصور نے دل میں کہا۔ چپ رہا۔

شہوار نے سوپ آسٹون کا تاج محل روشن کیا۔ "یہ پورے تیس ہزار میں خریدا ہے"۔ یہ اطلاع دینے کے بعد اس نے پہاڑی نما مینٹل پیس کی چوٹیوں پر سے ایک ایک چیز اٹھا کر دکھلانی شروع کی۔ باریک بلّوری ہرن، پلاسٹر آف پیرس کا بودھی ستو پدم پانی اور کھجوراہو کی مکتوب نویس عورت۔

اس وقت منصور کی نظر نواب بیگم کی تصویر پر پڑی جو بلند ترین چوٹی پر بڑے ممتاز انداز میں سجائی گئی تھی۔

"۔۔۔۔ ارے یہ تصویر تم کو کہاں سے ملی۔۔۔۔؟" آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہی تصویر تھی۔ پھر پوچھا۔۔۔ "تمہیں کہاں سے ملی۔۔۔۔؟"

"ملتی کہاں سے۔۔۔۔ یہ ہماری دادی حضرت کی تصویر ہے"۔۔۔ شہوار نے بے پروائی سے جواب دیا اور نچلی چوٹی سے ایک ننھا سا جیڈ کا بُدھا اٹھا کر منصور کو دکھلانا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر نے اپنی جگہ پر جم کر بھونچکی آواز میں دہرایا۔۔۔۔ "تمہاری دادی۔؟"

"جی ہاں!"

"مگر یہ تصویر تو میں نے تمہارے ہاں پہلے نہیں دیکھی۔"

"دیکھ نہیں سکتے تھے ۔ ہمارا سارا قیمتی سامان جاگیر — مطلب — سابق جاگیر پر — پردھان پور پیلیس میں مقفل تھا — گزشتہ ماہ جب یہاں آرائش کا کام شروع ہوا منجھلے بھیّا نے مسلّح پیادے بھیج کر منگوالیں سب چیزیں موروثی کتب خانے سمیت ۔ کئی ٹرک بھر کے سامان آیا ۔ بہت لمبا فاصلہ اور خطرناک علاقہ ہے ۔ بابا مستقیم مسلم اور پھولن دیوی سب اسی راستے پر OPERATE کرتے ہیں ۔"

"اچھا — ؟ پردھان پور اتنی دور ہے — ؟"

"ہاں بھئی پرانی سنٹرل انڈیا ایجنسی میں تھا ۔ اب مدھیہ پردیش میں شامل کیا جا چکا ہے کب کا ۔ بس پیلیس ہمارے پاس باقی بچا تھا ۔ وہ کھنڈر ہو گیا ۔ یہ سامان کتب خانہ وغیرہ وہیں موجود تھا ۔ بیحد سامان اب تک برباد ہو چکا ہے ۔" صاحبزادی شہوار خانم نے جیڈ کے بدّھا کو ہتھیلی پر رکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا ۔ "مہاتما بدھ ٹھیک کہہ گئے تھے کہ سب مایا ہے ۔ بہتا پانی ۔ آپکو تو معلوم ہی ہے ہمارے فیوڈل طبقے پر کتنی بڑی تباہی آئی آزادی کے بعد —"

"تو آپ کو پریوی پرس تو ملا ہو گا ۔"

"نہیں صاحب — اسکا بہت لمبا قصّہ ہے ۔ چھوڑئیے ۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ بھیّوں نے بزنس کر کے حالت سنبھال لی ۔"

"میں یہ کیمیو دیکھ سکتا ہوں —"

"کیا چیز — ؟"

"یہی کیمیو —"

"اوہ — ضرور ۔ سُنا ہے ۔ ہمارے دادا حضرت نے خاص طور پر ایک مشہور مصوّر سے بنوائی تھی ۔ لیجئے ۔"

منصور نے کیمیو ہتھیلی پر رکھ کر "قطب مینار" کی روشنی میں غور سے دیکھا ، اور کنفیوز ہوا ۔ بالکل وہی تصویر معلوم ہو رہی تھی ۔ جانے کیا چکر تھا ۔ گویا اسرار دربار پردھان پور ۔ تصویر کو پلٹا ۔ پشت پر مرقوم ، ہر ہائی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور ۔

منصور نے آنکھیں ملیں۔عبارت دوبارہ بڑے غور سے پڑھی ــــ

ہر ہائی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور

زبردست انکشاف "نواب بیگم" کے شروع میں "ہر ہائی نس دی" اور آخر میں "صاحبہ آف پردھان پور" تازہ اضافہ تھا۔مگر تقریباً اسی قسم کے قلم اور روشنائی میں۔

"تری شان جلِّ جلالہٗ ــــ"

"جی ــــ؟"

"کمال ہے صاحب ــــ"

"جی ــــ؟"

"کمال ہے" منصور نے مسکرا کر دہرایا "آپ نے یہ نادر فیملی ایلبوم منگوا کر واقعی بہت اچھا کیا۔"

"جی پچھلے تین ۳۵ پینتیس سال میں پردھان پور میں رکھے رکھے بہت سی قدیم خاندانی نصاویر برباد ہوگئیں ــــ کل آپکو کتب خانہ بھی دکھلاؤنگی۔اس میں مصوّر مخطوطے بھی موجود ہیں۔ہمارے بزرگوں کو نادر کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔اس جنریشن میں تینوں بھتیجے تو کاروبار میں لگ گئے باجی البتہ خاندان کی پرانی روایات کی تجدید کر رہی ہیں۔لائبریری اور باجی کی اسٹڈی میں ابھی کام ہورہا ہے۔فرسٹ فلور پر مکمل ہوجائیگا تو دکھلاؤنگی۔"

"چھوٹی بیٹا ــــ" بسنتی مہری نے کھلے کنول نما دروازے میں آکر کہا "مستری جی بلاوت ہیں۔"

"اچھا ــــ اصل میں باجی کے قارئین کے اصرار پر انکے ۳۵ پینتیسویں ناول کی رسم اجراء ذرا دھوم سے منانے کا پروگرام ہے۔اسی لئے ہم نے سوچا تقریب سے قبل گھر کی آرائش مکمل کرلی جاوے۔معاف کیجئے۔ابھی آتی ہوں۔میرے بیڈروم میں کام ہورہا ہے۔ذرا کاریگروں کو سمجھا آؤں۔دیواروں پر گدیلے والی گلابی ساٹن لگوا رہی ہوں۔آپکو کون سا رنگ پسند ہے؟ ابھی آئی ــــ"

شہوار کے جاتے ہی منصور مصنوعی درخت کی شاخ پر ٹنگے نئی وضع کے ٹیلی فون کے پاس پہونچا۔ نمبروں کے بٹن دبائے۔

"ہلو ــــ ہلو ــــ" عنبرین کی آواز آئی۔

منصور نے آہستہ سے کہا "عنبر تمہاری قبلہ نانی جان کے ایڈونچر ابھی ختم نہیں ہوئے۔"

"کیا مطلب ؟"

"وہ یہاں موجود ہیں ــ برّو نٹے سسٹرز کے بھیانک ڈرائینگ روم میں۔"

"ہائیں ــــ کس طرح ــــ ؟"

"سیمپل مائی ڈیر لیڈی واٹسن ۔ نخاس میں بک رہی ہونگی۔ انھیں بھی خرید لائیں۔ ــــ نواب بیگم اب ہر ہائی نس دی نواب بیگم اف پردھان پور بن گئی ہیں۔"

"نو کڈنگ ــــ ؟"

"ان ذہین خواتین نے انکے نام کے دائیں بائیں ان الفاظ کا اضافہ کرلیا ہے۔ مگر یار میں بڑی الجھن میں ہوں۔ یہ بھی تو ممکن ہے ــــ یعنی ایک بیحد REMOTE POSSIBILITY ہوسکتی ہے ــــ کہ واقعی تمہاری نانی نے اپنی طوفانی زندگی کے کسی دور میں کسی نواب صاحب ہز ہائی نس آف پردھان پور سے عقد کرلیا ہو ــــ اور یہ کیمیو اس کیمیو کی جو تمہارے پاس تھا اس کی نقل ہو ــــ جو ان نواب صاحب نے بنوائی ہو۔ بحیثیت شرلک ہومز مجھے ان تمام ممکنات کو ملحوظ رکھنا چاہئیے۔ ذرا اپنی امّی سے پوچھو کیا انکی مما نے کسی نواب پردھان پور سے نکاح کرلیا تھا ؟"

دوسرے سرے پر عنبرین نے باآواز بلند سوال دہرایا۔

"ہرگز نہیں۔" عندلیب بانو کی آواز آئی۔

"ہرگز نہیں۔" عنبرین نے دہرایا۔

"تو بات صاف ہے۔ جوں ہی میں نے یہ تصویر انکے انتہائی بے تُکے مینٹل پیس پر رکھی دیکھی میں ان سے کہنے ہی والا تھا کہ اسے میرے ہاتھ بیچ دو یا یہ کہ چور کا

وارنٹ نکلا ہوا ہے۔ مال مسروقہ کے خریدار کی حیثیت سے وہ بھی پکڑی جائینگی۔
"میں یہ سب کہنے ہی والا تھا کہ شہوار نے نواب بیگم کو اپنی جدّہ DECLARE کر دیا لہٰذا مجھے خاموش رہنا پڑا۔"
"جدّہ ؟ — شہوار خانم جدّہ جارہی ہیں ؟ ذرا زور سے بولو۔ تمہاری آواز صاف نہیں آرہی —"
ارے یار جدّہ۔ جد کی بیوی۔ اس پر یاد آیا کہ جدّہ میں امّاں حوّا کا مزار ہے۔ بہ بخد طویل اسی وجہ سے وہ شہر جدّہ —"
"امّاں حوّا — ؟ امّاں حوّا کا کیا ذکر تھا۔ ؟"
"اماں یار —"
"صاف آواز نہیں آرہی لائین میں بہت گڑبڑ ہے۔ تم نے ان سے کہا کیوں نہیں کہ وہ تصویر ہماری ہے — کہاں کہاں تو تم اُسے ڈھونڈ آتے۔ نخاس اور بمبئی کا چور بازار"
"ہاں صاحب۔ گھر گھوڑا نخاس مول۔"
"گھوڑا — کیسا گھوڑا — منصور زور سے بولو۔ تم نے ان سے کہا کیوں نہیں۔"
"اماں کیسے کہتا۔ ایک معقول لڑکی۔ اتنا بڑا اسفید جھوٹ بول رہی ہو اور میں اسے جھٹ سے بتا دوں کہ اس کا جھوٹ کھل گیا تو اسے شرمندگی نہ ہوگی ؟ عنبر سُن رہی ہو — ؟"
"ہاں ہاں اب لائین صاف ہے —"
"عنبر یار اس ٹیلی فون کے اوپر کی ٹہنی پر پلاسٹک کی رنگ برنگی چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں جو گاتی بھی ہیں —"
"نو کِڈنگ — ؟"
یہ پول کھلنے کے بعد شہوار خانم کی طرف سے جو اچانک میرے رویّے میں تبدیلی آگئی ہے۔ کیا میری آواز ہی میں عنبر نے اسے محسوس کر لیا ؟ عندلیب بانو نے اپنا پول خود کھولا تھا کیونکہ وہ زندگی کے انتخابات کے معاملے میں خود کو آزاد سمجھتی ہیں۔ مگر اپنے

پنے آپ کو اور اپنی ماں کو حالات کا شکار بھی تصور کرتی ہیں اور ایک شہیدانہ انداز اپنے
نعلق رکھتی ہیں ۔ مگر شہوار نے اس قدر لایعنی اور بے کار جھوٹ کا انتخاب کیوں کیا؟ کیا
س لڑکی کی قوت متخیلہ ضرورت سے زیادہ ہے ؟ بڑی بہن نے اپنے تخیل کو ناول نویسی
ں استعمال کر لیا ہے ۔ یہ محض فینٹسی بنانے میں مصروف ہے ۔ وہ فون بند کرنے والا تھا
عنبر کی آواز آئی ——— ڈاکٹر چینگ شاؤ لو چو ——— وہ معاً بیحد بشاش معلوم ہو رہی تھی ۔
رانی عنبر ———

" لولو ——— ملک عنبر ——— "

" تم نے انکے تعلقے کا کیا نام بتایا ؟ "

" پردھان پور ——— "

" ——— اس پر ایک گھنٹی سی بجی میرے ذہن میں ۔ "

" لولو مائی ڈیر مس واٹسن ——— "

" وکٹوریہ جہاز پر جب ہم ولایت جا رہے تھے ۔ ایک صاحبزادہ صاحب اف دھان پور
مارے ہم سفر تھے زبردست کارڈ شارپر ——— انہوں نے ایک پاکستانی فلمی ڈانسر ماہ نور خانم
ے ساتھ ٹیم اپ کر لیا تھا ۔ GENOA پہنچنے سے قبل جہاز ہی پر ایک بار پکڑے جانے سے
ل بال بچے ۔ "

" عنبر ——— میں ان ذات شریف سے واقف ہوں ۔ اب سیدھا گھر جا رہا ہوں ۔
ہاں سے فون کرونگا ۔ تم دس بجے کے بعد رنگ کر لو ——— رائیٹ ——— ؟ میں بہت
ھکا ہوا ہوں ۔ بمبئی سے دلی رات کی فلائیٹ سے پہونچا ۔ وہاں سے صبح آٹھ بجے کا جہاز پکڑ
لکھنؤ آیا ۔ دن بھر میں بہت سا کام نپٹایا ۔ بدّما بہن جی پیچھے پڑ گئیں کہ فوراً نگار جی کے
ں جایئے ۔ چنانچہ یہاں پہونچا ۔ باقی بات گھر سے کرونگا ——— ہاں صاحبزادہ صاحب
ھان پور اور نگار خانم کے پردھان پور سے میرے ذہن میں بھی گھنٹی بجی ہے ۔ "

ڈاکٹر عنبریں بیگ نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور دریچے سے باہر نظر ڈالی جہاں

کاغذی گلاب اور مغلیہ گلاب مکان بسے چھنتی روشنی میں قمقموں کی طرح روشن تھے۔
کی طرح یعنی جبتک اس نے نگار خانم کے ہاں جانا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ اسی طر
زبانی یا فون پر اپنی ساری مصر دنیات کی رپورٹ دیا کرتا تھا — اب شاید وہ پھر وا
آرہا تھا۔

مال آیونیو واپس پہنچ کر اس نے پھر فون کیا۔
"لیڈی ایمبرا اف ابرڈین —" فون تکیئے پر رکھ کر اس نے بات شروع
مجھے بڑی سخت نیند آرہی ہے۔ لہٰذا فوراً بتاؤ — وہ صاحبزادہ صاحب اف دھان پ
کے نام پر کیا گھنٹی بجی تھی —"
"بس کچھ بجی سی تھی — تم بتاؤ ڈاکٹر نوہ۔"
"بھئی میرا تو خیال یہ ہے کہ پچھلے دنوں وہ انگریز — میرا خیال ہے کہ ا
انڈین چھوکرا ہے — بہر حال انگریز کہلاتا ہے۔ وہ یہاں آیا تھا۔ شہزادی درشہ
کے ہاں۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ایک رات انکے ہاں ڈنر کے بعد کچھ کارڈ شار پرز کا نا
نکلا — میں نے صاحبزادہ صاحب اف پر دھان پور کا نام لیا تو وہ لڑکا چونک
گیا۔ اور میں نے جو غور سے دیکھا تو شکل ان بزرگوار سے کچھ ملتی جلتی معلوم ہوئی۔"

"WOW! THE PLOT THICKENS AND THE MYSTERY DEEPENS!"

"بالکل۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ جب میں نے کہا میں بوسٹن میں انکا معا
رہا تھا۔ اور مافیا والے شاید انکا رشتہ حیات منقطع کر چکے ہیں تو شہوار تے بالکل
BY THE WAY سرسری طور پر کہا اچھا وہ — وہ ہمارے ایک کزن تھے
GOOD-FOR-NOTHING.

"تو صاحبزادہ دلشاد علی خان اف دھان پور صاحبزادی شہوار خانم اف
پر دھان پور کے کزن نکلے اہم نکتہ اچھا خانم عنبر بس کل شام کیلئے برڑھیا ZZA

اب مجھے رات بھر خواب میں وہ آبشار اور چڑیاں نظر آئیں گی۔۔۔ گڈ نائیٹ

"امی۔۔۔ امی جان۔۔۔" ریسیور رکھ کر عنبر تیر کی طرح اسٹوڈیو کے دروازے پر
پہنچی اور زور زور سے دستک دینے لگی۔

مسز بیگ نے شراب کی الماری بند کر کے دروازہ کھولا "کیا بات ہے کیوں غل
مچا رہی ہو۔۔۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟"
"امی۔۔۔ شہوار خانم بھی EXPOSE ہو گئیں۔۔۔ منصور واپس آرہا ہے"
اندر جا کر وہ ایک کرسی پر دھم سے بیٹھ گئی۔

پچھواڑے تالاب کے کنارے حسین بخش نے شاید دانہ پھینکا تھا۔ بطخیں قیں
قیں کرتی بے پناہ شور مچا رہی تھیں۔
"بلّیاں۔۔۔ کہاں ہیں بلّیاں۔ سب کمبختوں کو ابھی باہر لیجا کر پھینکتی ہوں۔۔۔
بلّو۔۔۔ بلّیو۔۔۔" اس نے دریچے میں جا کر چلّانا شروع کیا۔

"CALM DOWN AMBER, TAKE IT EASY. RELAX."
مسز بیگ نے جلدی سے الماری کھول کر کامپوز کی گولی نکالی۔

(۲۷)

اندر جال

عرف

اسرارِ دربار پردھان پور

" رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے ۔ نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پاؤں رکاب میں —" حضرت زاغ دہلوی نے آبشار والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فرمایا تینوں صوفے پر بیٹھ کر مصنوعی آبشار ملاحظہ کرنے لگے ۔ شہوار خانم کمرے میں داخل ہوئیں — صحافیوں سے کافی فاصلے پر رکھی ایک کرسی پر ٹِکیں اور پوچھا —" آپ صاحبان کی تعریف —؟"

" محترمہ آپ ہم تینوں سے چند روز قبل اسی کمرے میں اسی جگہ شرف ملاقات حاصل کرچکی ہیں ۔" زاغ صاحب نے جھنجھلا کر کہا ۔" خاکسار زاغ دہلوی : مزاحیہ غزلیں لطیفے مزاحیہ کالم ۔ یقیناً تو مس مدیرا دبی ایڈیشن — کل نگار صاحبہ نے ہمارے دفتر فون کیا تھا کہ جشن اجرا کی نئی تاریخ مقرر کر لی گئی ہے ۔ ہمارا اسپیشل نمبر اسی روز مہمانوں میں تقسیم کیا جائے گا ۔ موصوفہ نے آج صبح دس بجے کا وقت دیا تھا فوٹو سِشن کے لئے ۔"

" فوٹو سِشن —؟ اس میں تو باجی چاہتی ہیں کہ میں بھی شریک ہوں جیسے وہ مجھ سے باتیں کر رہی ہیں ۔ میرے ساتھ پھول سجا رہی ہیں گلدان میں ۔ ہمارے نئے امریکن کچن میں کھانا پکا رہی ہیں — وغیرہ ۔ آپ فوٹو گرافر ساتھ لائے ہیں ؟"

" جی ہاں ۔"

شہوار نے ہاؤس ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا ۔" باجی یہ اخبار والے آگئے ہیں ۔" انھوں نے اس طرح کہا گویا سبزی ترکاری بیچنے والے آگئے ہیں " آپ انکو انٹرویو دیجئے ۔ ہیر ڈریسر کے ہاں حضرت گنج ہو آؤں ۔ یہ لوگ میری تصویریں بھی کھینچنے کو کہہ رہے ہیں ۔"

" یہ تو آپ نے خود ہی فرمایا ہے ہم نے نہیں کہا ۔" زاغ صاحب نے بات کاٹی ۔

"نہیں تم انٹرویو کے وقت موجود رہو۔ بال خود بنالو،" نگار خانم نے اوپر سے جواب دیا۔
" اچھا بجیا کون سی ساری پہنوں ؟ یا چوڑی دار ؟ تصویریں تو کلر میں ہوں گی نا ؟"
" ہمارا خیال تھا ایک رائیٹر کا انٹرویو کرنے آئے ہیں۔ یہاں آکر معلوم ہوا ہیمامالنی اور
ت امان کی تصویریں کھنچنے والی ہیں" زاغ صاحب گویا ہوئے۔ مگر اس وقت تک
ارفون بند کر کے دوڑتی ہوئی اوپر جا چکی تھیں۔
ایک ملازم چائے کی ٹرے لے کر آیا اور ڈن ہل اور مارلبرو کے پیکٹ۔

کچھ دیر بعد نگار خانم کمرے میں داخل ہوئیں۔ تینوں اسی طرح بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔
رخانم سرپرستانہ انداز میں مسکرائیں۔ چھوٹی بہن احمق ہے جو ان بے چاروں سے بگاڑ چاہتی
، ۔ ان سے بنائے رکھنی چاہیئے۔ اگر خلاف لکھنے پر آگئے تو خواہ مخواہ کا قضیہ۔
قریب کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اخلاق سے کہا "مزاج شریف۔ میں تو بھئی بالکل نہیں
ی تھی کہ میرا اسپیشل نمبر نکلے۔ مگر آپ لوگ مصر ہیں۔ روز آپکے ایڈیٹر کا فون آجاتا ہے۔"
" مگر آپ تو خود متواتر چیف ایڈیٹر کو ـــــــ" بطلیموس نے اپنے پاؤں سے زاغ صاحب
دُس دیا یا مگر وہ بولتے رہے "ـــــ فون کرتی رہتی ہیں کہ اسپیشل نمبر نکلوائیے اس کی
اعت کا پورا خرچہ میں دوں گی۔ بھائی بطلیموس صاحب آپ میرے پاؤں کا انگوٹھا کیوں
رہے ہیں ؟ ـــــ میڈم یہ لاگت کا تخمینہ ایڈیٹر صاحب نے بھجوایا ہے۔"
"زاغ صاحب ہمیں بات کرنے دیجئے۔" بطلیموس نے کہا۔
"پچاس ہزار ـــ ؟" مصنفہ نے کاغذ دیکھ کر پوچھا۔
" جی آپ تمام تصاویر رنگین چاہتی ہیں۔ آرٹ پیپر۔ ہر صفحے پر آرٹ ورک۔ پھر آپکے جو
ٹ اب لکھوائے جائیں گے انکے لئے مضمون نگار حضرات بھاری معاوضہ طلب کر رہے
،" زاغ صاحب نے جواب دیا۔
" اوپر چلیئے۔ تصاویر کتب خانے میں کھنچوا لیجئے گا" نگار خانم نے اٹھتے ہوئے کہا ـــــ
لوگوں نے چائے پی ؟ کچھ کھایا نہیں ؟ تشریف لائیے۔"

گرینڈ اسٹیرکیس پہ انکی قیادت کرتی تینوں کو دوسری منزل پر اپنے کتب خانے لے گئیں۔ چند بڑھئی ایک طرف اکڑوں بیٹھے بیڑیاں پیتے اپنے کام میں مصروف تھے۔
"تم لوگ اب چھٹی کرد۔ جاؤ۔ بطلیموس صاحب یہ ہمارا کتب خانہ پر دھان پور سے ابھی پہونچا ہے۔ الماریاں وغیرہ تیار کی جارہی ہیں۔"
اخبار نویسوں نے عربی فارسی اردو کی نادر کتابوں اور قلمی نسخوں کا جائزہ لیا
"ہمارا موروثی ذخیرہ ہے۔"
"جی ہاں —— جی ہاں ——" بطلیموس نے مرعوب آواز میں کہا۔
"خاتمۂ ریاست کے بعد ہم لوگ کتب خانے کو پر دھان پور سے یہاں منتقل نہ کر سکے تھے کیونکہ کسی قانونی پیچیدگی کی وجہ سے گورنمنٹ نے پیلیس مقفل کر دیا تھا۔"
شہوار خانم اندر آئیں اور بڑی بہن کے مُنہ سے بات چھین کر بولیں "دراصل ایسا ہے کہ ہمارے ایک کزن صاحبزادہ صاحب اف دھان پور پاکستان چلے گئے تھے اس لئے کسٹوڈین نے ہمیں بہت تنگ کیا۔"
اس دوران میں پفنا توس نے نہایت مستعدی سے نوٹ لینے شروع کر دیے تھے۔ اور ٹیپ ریکارڈ بھی چالو تھا۔
"کسٹودین نے صاحب بہت ہی ناک میں دم کیا —— وہ سردار پٹیل کا زمانہ تھا آپ جانیے۔" شہوار خانم نے دبیز چرمی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے بات جاری رکھی "میں خیر پیدا نہیں ہوئی تھی۔ باجی بتاتی ہیں۔ باجی بھی خیر اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ ان کزن کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے گورنمنٹ اف انڈیا نے پیلیس پر تالا ڈال دیا۔ اب لڑا کیجئے مقدمے ——"
"صاحبزادہ صاحب —— ؟"
"دھان پور —— پاکستان چلے گئے تھے۔ وہاں سے امریکہ۔ وہیں وفات پا
"کیا نام بتایا —— ؟ صاحبزادہ صاحب دھان پور —— ؟"
"دھان پورا اور پر دھان پور توام جاگیریں تھیں جیسے یہاں محمود آباد اور ..

پفنانوس نے جان کاری سے سر ہلایا (وہ خود سیتاپور کے رہنے والے تھے) اور تیزی سے لکھا کئے ——

"پھر کسٹوڈین سے بیلیس کس طرح بحال ہوا؟" زاغ صاحب نے دریافت کیا۔

"لمبا قصہ ہے پڑھنے والوں کو اس میں کیا دلچسپی ہوگی۔"

"قارئین اپنے پسندیدہ مصنّف کے ذاتی زندگی کی تفصیلات جاننا چاہتے ہیں اور یہ علم دوست حضرات کے لئے بالخصوص باعثِ دلچسپی ہوگا کہ کس طرح اتنا نایاب کتب خانہ برباد ہونے سے بچ رہا۔" پفنانوس نے عرض کیا۔

"تکیہ کلام معاف یہ ذخیرہ بھی سینکڑوں برس میں جمع ہوا ہوگا۔" زاغ صاحب نے کہا روم ایک دن میں نہیں جلا تھا ——"

"جو بات کی بے تکی۔ قطع کلام معاف اور روم ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا ——" بطلیموس نے آہستہ سے کہا۔ "نگار صاحبہ ہم کو ایسے دردناک واقعات معلوم ہیں کہ تباہ حال روساء کو محض دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے اپنے آبائی کتب خانے اور نوادر کوڑیوں کے مول بیچنے پڑے ——" پفنانوس نے کہا۔

"جی اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا کتب خانہ بچ رہا ——"

"اچھا نگار صاحبہ آپ کے کچھ حالات زندگی ——"

"اجی میرے کیا حالات ——"

"انکسار کی ضرورت نہیں۔ قارئین جاننا چاہیں گے۔ سنہ پیدائش —— ؟"

"۱۹۲۵ء۔"

زاغ صاحب نے منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے اچھو لیا۔

"کیا ہوا —— ؟"

"کچھ نہیں۔ اچھو لگ گیا۔ ایک گلاس پانی منگوا دیجئے۔"

شہوار نے گھنٹی بجائی۔

"جی۔ سنہ پیدائش ۱۹۴۵ء" پفنا توس نے سنجیدگی سے دہرایا۔" تعلیم ——— ؟"

" اعلیٰ ———"

" والدین ——— ؟"

" مرحوم نواب صاحب پردھان پور و بیگم صاحبہ جنت مکانی۔"

" کھیلیں دھمال خواجہ معین الدینؒ ——— دیکھو کھیلیں دھمال خواجہ معین الدینؒ ـ"

نیچے شاگرد پیشے سے فلک شگاف نعرہ بلند ہو رہا تھا ـــ

" کون گا رہا ہے ؟" زاغ نے کان کھڑے کئے۔

" ایک مجذوب ہیں۔ نیچے رہتے ہیں احاطے میں۔"

" اور عزیز و اقارب ——— ؟" پفنا توس کے سوالات جاری رہے۔

" بس اللہ رکھے تین بھائی ہیں۔"

" کھیلیں دھمال خواجہؒ کھیلیں دھمال ———"

" شہوار! ایک تو نرکھانوں کی کھٹ کھٹ اور ایک یہ باباجی نے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ دریچے بند کر دو ——— جی بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ چھوٹا بھائی مع اہل و عیال مسقط میں ہے۔ منجھلے والے نے نینی تال میں سیب کے اور چیڑ لگائے ہیں۔ فیکٹریوں کے علاوہ مڈل ایسٹ گوشت سپلائی ———"

" جی مگر آپ اپنے متعلق ———"

" میں ناول نویسی کے علاوہ چند قدیم شعراء پر مضامین لکھ رہی ہوں۔ ارادہ ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر ڈالوں۔"

" پڑھنے والوں کو تعجب ہے کہ آپ کو وہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں جو ابتک محققین کی نظروں سے اوجھل تھیں ———"

" اسی کتب خانے کی بدولت جو اب تک مدھیہ پردیش کے گھنے جنگل میں چھپے پردھان پور پیلیس میں پوشیدہ تھا۔"

" نگار صاحبہ چند حاسدوں نے اڑا دی ہے کہ آپ نے کسی ضرورت مند افلاس زدہ

عالم کے غیر مطبوعہ مضامین خرید لیئے ہیں ۔" زاغ نے کہا۔
"جی ۔ چلیئے تنقیدی مضامین میں نے خرید لیئے ۔ یہ پینتیس ۳۵ عدد ناول ـــــ یہ بھی بیر
نے کسی سے لکھوائے یا خریدے ہیں؟"
"جی ہاں ۔ یہ واقعی کمال ہے ۔" زاغ دہلوی نے فرمایا۔" نگار صاحبہ کیا میں یہ کہہ
سکتا ہوں ممتاز شیریں مرحومہ کے بعد آپ پہلی خاتون نقاد ہیں جس نے مردوں کے کان کاٹے"
" زاغ صاحب ۔ یہ کان کاٹنا وغیرہ شرفاء کی زبان نہیں ۔ مجھے انٹرویو کرنے دیجئے ۔"
یفناتوس نے بگڑ کر کہا۔
" میں محض اتنا اور پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ تنقید کے میدان میں کب کودیں ـــــ
میرا مطلب ہے کب قدم رنجہ فرمایا یعنی آپ کا پہلا مضمون کب ـــــ"
" زاغ صاحب آپ ذرا نیچے جا کر انتظار کیجئے ـــــ" بطلیموس دانت پیس کر آہستہ سے
ـــــ" آؤٹ ـــــ آؤٹ ـــــ"
زاغ صاحب ڈن ہل کا پیکٹ جیب میں ڈال کر فوراً اُٹھے ۔ اطمنان سے سر جھکائے
نیچے چلے گئے۔
" بطلومیاں ۔" نگار خانم نے ممنونیت سے کہا ۔" بعض چیپڑ قنات لوگ پیدائشی بدتمیز
ہوتے ہیں ۔ مہمان سمجھ کر میں نے بہت طرح دی ۔ مجھے معلوم ہے حاسدوں نے میرے خلاف
سرگوشی کی مہم شروع کر رکھی ہے کہ میں پیسے دے کر مضمون اپنے نام سے چھپوا رہی ہوں ۔
اور اپنی تعریفیں بھی ۔ مگر یہ میرا HANDICAP ہے ۔ بطلومیاں میری دولت اور سماجی
پوزیشن میرا ہینڈی کیپ ہے ۔"
" باجی جان مخالفین کی بہتان اور اس قسم کی کریہہ افواہیں آپ کی مقبولیت اور
کامیابی کی دلیل ہیں ۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب ۔" بطلومیاں نے کہا۔
" ہاں صاحب ۔ جلنے والے دور روٹی اور کھالیں ۔" یفناتوس بولے ۔" بہار آمد
نگار آمد نگار آمد قرار آمد ۔ صدائے آبشاراں از اطاق شاہوار آمد ۔"
" کیا بات پیدا کی ہے ۔" بطلومیاں نے ہاتھ اٹھا کر داد دی ۔" جشن نگار خانم کے بجائے

تقریب کا عنوان یہی کیوں نہ رکھا جائے ـــــ بہار آمد نگار آمد ـــــ نگار خانم کا طرزِ نگارش' تو اسپیشل نمبر کے پہلے حصّے کا عنوان ہوگا۔ تصویری فیچر کا عنوان کیا ہو۔؟"

"اس نو بہارِ ناز کو ـــــ" پفنا نوس نے کاغذ پر لکھا۔ بطلیموس نے اس کے نیچے اضافہ کیا "زاغ کی طرح ہم آپ کو بھی جلنا کر دیں گے۔"

شیام سنگھ نیچے سے فوٹو گرافر لے کر آیا۔ دوسرے ملازم نے اس کا سامان اٹھا رکھا تھا۔

"جو تصویریں البم میں موجود ہیں ان میں سے بھی منتخب کر لو اور چند خاندانی تصویریں نیچے سے لے آؤ ـــــ فیملی گروپ وغیرہ ـــــ" نگار خانم نے شہوار سے کہا ـــ

فوٹو گرافر نے روشنیاں ایڈجسٹ کیں۔ نگار خانم ایک بک شیلف کے سامنے ایک قلمی نسخہ ہاتھ میں لے کر کھڑی ہوگئیں۔ فوٹو سیشن شروع ہوا۔

تھوڑی دیر بعد شہوار تیار ہو کر آئیں۔ بسنتی مہری البم اٹھائے ساتھ ساتھ تھی۔ شہوار نے نواب بیگم کا کیمیو احتیاط سے میز پر رکھا۔

"یہ لیجئے۔ یہ ہماری دادی حضرت خلد آشیانی کی نادر روزگار تصویر ہے۔ اسے بھی کلر میں چھاپیے۔ CAPTION میں لکھ کر دیتی ہوں"

بطلیموس اور پفنا نوس کیمیو کی قصیدہ خوانی میں مصروف ہوئے۔ اب وہ نگار اور شہوار سے واقعی بے حد متاثر نظر آرہے تھے۔

شہوار نے لکھنا شروع کیا "نامور ناول نگار نگار خانم ـــــ نہیں ٹھہریئے ـــــ نامور ناول نویس نگار خانم کی دادی ہر ہائی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور خلد آشیانی ـــــ یہ پردھان پور کے بعد خلد آشیانی ٹھیک نہیں بیٹھ رہا ہے۔ عُلیا حضرت نواب بیگم صاحبہ خلد آشیانی آف پردھان ـــــ"

"لایئے مجھے دیجئے ـــ یہ CAPTION وغیرہ لکھنے کا کام مجھ پر چھوڑیئے۔" بطلیموس نے کاغذان کے ہاتھ سے لے لیا ـــ "جشن کی صدارت کے لئے کسی منتری وغیرہ کو بلایا جائیگا؟" نواب بیگم کا کیمیو لفافے میں رکھتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔

"جی منسٹری وغیرہ ہمارے گھر پر آئیں گے اور ڈنر بھی میری طرف سے کلارکس آودھ میں ہوگا۔ اس کا آپ کے رسالے سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ آپ جن چنیدہ ادیبوں کو دوسرے شہروں سے مدعو کرنا چاہیں انکی فہرست بنا دیجئے۔ ہوائی جہاز سے آمدورفت کا کرایہ کلارکس اودھ میں قیام وطعام میری جانب سے۔ اس سلسلے میں بڑے بھیا کے سکریٹری کو فون کر لیجئے گا۔"

"جشن کے ساتھ ایک عدد مشاعرہ اور شب افسانہ بھی رکھ لیجئے" پفنا نوس نے کہا۔

"بے شک۔ بے شک۔ اس کا پروگرام آپ مرتب کر دیجئے۔ شہوار چلو اب تم میرے ساتھ آکر اس دیوان پر بیٹھو۔ تصویریں کھنچوائیے — بطلو میاں —"

"پردھان پور پیلیس کی تصویریں اور آپ کے دادا حضرت اور والد مرحوم نواب صاحب کے فوٹوگراف بھی مل جاتے تو فیچر مکمل ہو جاتا۔"

"بطلو میاں جتنا میٹریل آپ کو دیا گیا ہے اسی کا لے آؤٹ بنوائیے باقی تصاویر تلاش کرنے کی کوشش کروں گی۔ ہمارا آدھا سامان ابھی تک سینکڑوں میل دور مدھیہ پردیش کے اس علاقے میں پڑا ہے جہاں ریل بھی نہیں جاتی۔" نگار خانم بولیں۔

"خطرناک ڈاکوؤں سے پُر گھنے جنگل اور دشوار گزار گھاٹیاں۔" شہوار نے کہنا شروع کیا۔" ابتک وہاں کجلی بن میں شیر اور چیتے موجود ہیں۔ ہمارا اپنا علاقہ شیر اور بارہ سنگھے کے لئے مشہور تھا۔ ہمارے کزن اور نامور شکاری صاحبزادہ صاحب آف دھان پور —"

پفنا نوس تندہی سے نوٹ لیتے رہے۔

نیچے باغ کی ایک سنگی بینچ پر متمکن زاغ ڈن ہل پہ ڈن ہل پھونکے جا رہے تھے گمنام نواب صاحب رکشا پر بیٹھے پھاٹک میں داخل ہوئے۔

"آدمیاں گم شدند ملک خدا خر گرفت زاغ صاحب سوچ رہے تھے۔ بطلیموس اور اور پفنا نوس دونوں، دونوں بہنوں کی چاپلوسی میں مصروف ہیں۔ خوشامدی ٹٹو — بھاڑے کے ٹٹو۔ ٹٹو کو خوشامدی کیوں کہا جاتا ہے۔ کس کی خوشامد کرتا ہے بے چارہ

نہایت مسکین غیور جانور ہے ـــــ ان بڑے میاں کی طرح۔ جانے کون ہیں۔ ان سے انکا نام پتہ پوچھکر انکو شرمندہ نہیں کروں گا۔ رکشا سے اتر کر نواب صاحب نے شام سنگھ کو آواز دی۔ پھر حضرت زاغ کو مخاطب کیا ـــ "میاں عنایت ہوگی اندر بڑی بٹیا سے کہلوا دیجئے ابھی ابھی ڈاکٹر نے کہا ہے لڑکے کا گردہ فوراً بدلوائیے ـــــ بڑی بٹیا نے ارشاد کیا تھا آج کچھ رقم عنایت کریںگی ـــــ" نواب صاحب بے حد سراسیمہ نظر آتے تھے۔

زاغ نے سر اٹھا کر دیکھا بطلیموس و یفناتوس سامنے کھڑے تھے۔ بطلیموس نے یفناتوس سے کہا ـــ

"بھائی یفناتوس شخصیت پر مضمون لکھنے کے لئے پوائنٹ: نگار خانم خاموشی کے ساتھ حاجت مندوں کی امداد۔ وغیرہ۔"

"رسالے کا کام اتنا بڑھا لیا ـــ" یفناتوس نے جواب دیا۔ "نگار صاحبہ نے یہ دعوت نامہ چھپنے کو دیا ہے ـــ تاریخ بھی مقرر کر لی ہے۔ ۴؍ جنوری ۸۳ء۔"

(۲۸)
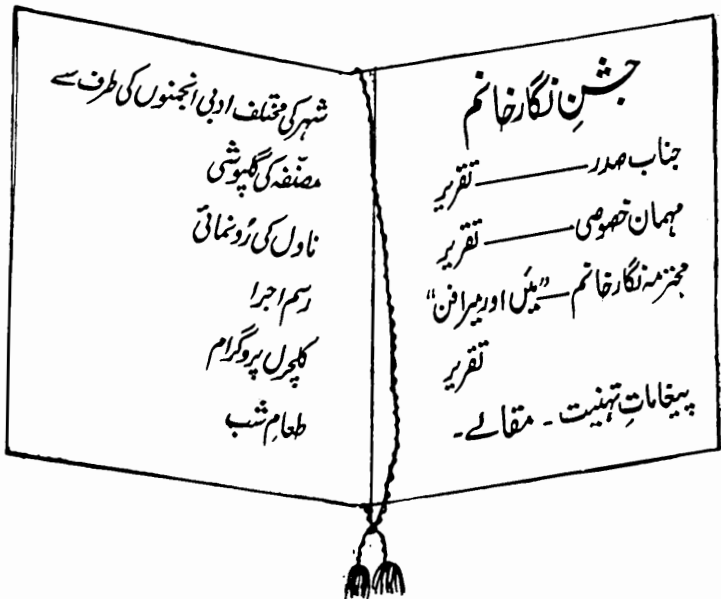
تاش کا محل

ساؤتھ ہیرو
۲۳ر نومبر ۸۲ء

میری پیاری نگار خانم

اس بے تکلفی کیلئے معذرت خواہ نہیں۔ آپکا ابن عم ہوں۔ میرے لڑکے کنور بہزاد علی خان عرف نورمن ڈریک نے ہندوستان سے واپس آکر بتلایا کہ لکھنؤ میں اسے چند گمشدہ رشتہ دار ملے —— یعنی آپ لوگ۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ میری عزیزہ میں بھی یہ علم نہ رکھتا تھا کہ میرے کچھ اعزہ اس جہان فانی میں ابھی بقید حیات ہیں۔ میرے مرحوم والد اور مرحوم تایا نے بھی کچھ تذکرہ نہیں کیا وجہ اس کی غالباً وہی زمینداری کے جھگڑے رہے ہونگے۔ جو ہر فیوڈل مسلم گھرانے کے نفاق اور بربادی کا باعث ہوئے۔ مزید برآں ہمارا تعلقہ دھان پور (جو میں اعتراف کرونگا کہ بہت معمولی چھوٹا سا تعلقہ تھا) آپکی بڑی ریاست پردھان پور سے سینکڑوں میل کی دوری پر واقع تھا۔ ہم اودھ میں تھے آپ شاید سی۔ پی میں۔ ہم دلّی تم آگرے۔ تو کیسے بجے گی بانسری۔

الغرض یہ نیرنگ زمانہ ہے کہ میں آپکا ایک قریبی عزیز آپکا ابن عم عرصۂ دراز شہر نیویارک میں گزارنے کے بعد اب شہر لندن میں رہتا ہوں۔ اپنی سابق گرل فرینڈ اور موجودہ بزنس پارٹنر مس نورما ڈریک عرف نور ماہ خانم (جو میرے لڑکے راجکمار بہزاد علی خاں عرف نورمن ڈریک کی ماں بھی ہیں) اور انکی بہن سیلی ڈریک عرف سرینا دیوی کے ساتھ ایک ایسکورٹ سروس چلاتا ہوں۔ اور آپ لوگوں سے ابتک ناواقف تھا۔ اور آپ سے بھی شاکی ہوں کہ آپ نے کبھی ہماری خبر نہ لی۔

ہم لوگوں کا دفتر سوہو میں ہے۔ مکان ساؤتھ ہیمپٹن میں۔ میرا اور نُوزماہ خانم کا بیٹا ہم لوگوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھتا۔ اسکی دلچسپیاں ذہنی قسم کی ہیں (جیسا کہ آپ بخوبی واقف ہیں)۔ علاوہ شاعری کرنے کے وہ فلیٹ اسٹریٹ کے ایک اخبار میں سب اڈیٹر ہے شہر میں رہتا ہے۔

آپکی پیاری بھتیجی پری بیگم جسے عرصہ تین ماہ کا ہوا آپ پیارے لوگوں نے بغرض اعلیٰ تعلیم لندن بھیجا تھا۔ میرے بیٹے کے ساتھ مقیم ہے۔ آجکل کی اصطلاح میں اس کی "رُوم میٹ" یا LIVE-IN-FRIEND —

اس نے آپ لوگوں کو ظاہر ہے اسی لئے اطلاع نہیں دی کہ آپ قدامت پرست ہندوستانی اس پیاری بچّی کے موجودہ سماجی و اخلاقی نظریات سے متفق نہ ہونگے۔

یہ بھی کیا حسن اتفاق ہے (جتنا سوچتا ہوں کارخانۂ قدرت کے ایڈمینسٹریشن پر حیرت ہوتی ہے) کہ میرا لڑکا برٹش کونسل کے زیر اہتمام انڈیا جاتا ہے۔ لکھنؤ پہنچتا ہے آپکو فون کرتا ہے کیونکہ ایک موڈرن ہندوستانی خاندان کے طرز رہائش کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے (کلچرل اینتھروپولوجی اور سوسیولوجی اس بچے کا کیمبرج میں مضمون تھا)۔ بطور ایک ادیبہ آپ کو وزِٹنگ مغربی اہل قلم سے ملاقات کرنا پسند ہے۔ اسے اپنے دولت خانے پر اکثر مدعو کرتی ہیں۔ وہاں ایک طرف تو اس کی ملاقات آپکی بھتیجی سے ہوتی ہے (خیر وہ تو آجکل کے نوجوانوں کی دنیا ہی جُداگانہ ہے اسے ہم آپ پچھلی نانتی والے نہیں سمجھ سکتے)۔ مگر جو اہم بات ہے وہ یہ کہ آپ کے ہاں ایک ڈنر کے دوران بات سے بات نکلتی ہے اور کوئی ڈاکٹر منصور صاحب اس ناچیز فدوی کا تذکرہ فرماتے ہیں اور میرا نام سنکر آپکی ہمشیر خورد بے پرواہی سے سرسری طور پر کہتی ہیں کہ وہ ہمارے کزن تھے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کی اطلاع میرے متعلق صحیح نہیں تھی۔ انہوں نے سُنا تھا کہ میرا انتقال پُرملال ہو گیا۔ مگر جیسا کہ اس عریضے سے ثابت ہو گا میں بفضل الٰہی ابھی

زندہ سلامت ہوں اور اس تحیر زا اور دلچسپ جہان رنگ و بو سے کوچ کرنے کی ابھی قطعی جلدی نہیں۔

میرے نورنظر نے اس وقت آپ لوگوں پر یہ منکشف نہیں کیا کہ وہ اس ہیچمداں کا لخت جگر ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر منصور کا شغری (موصوف امریکہ کے شہر بوسٹن میں میرے معالج تھے۔ مجھے خوب یاد ہیں) اور شہوار صاحبہ نے میرے متعلق زیادہ توصیفی کلمات استعمال نہیں کئے تھے۔ اس صورت حال میں اگر وہ بے چارہ لڑکا یہ انکشاف کرتا کہ یہ دونوں اس کے والد محترم کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اسکی میزبان شہوار خانم اور میرے سابق معالج ڈاکٹر کاشغری کو کتنی ندامت ہوتی۔ لہٰذا خاموش رہا بھری بزم میں راز کی بات کیسے کہتا۔

اس وجہ سے بھی خاموش رہا کہ وہ بطور ایک انگریز شاعر نورمن ڈریک ہندوستان گیا تھا اور اسی نام سے یہاں اسے شہرت ملتی جا رہی ہے

اپنے دو تہائی ایشین بچے کا نام میں نے بہزاد علی خان اور اسکی اینگلو انڈین ماں نے نورمن ڈریک رکھا۔ لہٰذا نسل پرست برطانیہ میں وہ بطور نورمن ڈریک ہی کیوں نہ مشہور ہوتا۔ جیسے شوبزنس میں نصف گجراتی کرشنا بھان جی بن کنگزلے!

نورمن نے مجھے وہ تصاویر دکھلائیں جو آپکے دولت خانے پر آپ سب کے ساتھ کھینچیں۔ ان میں آپ بھی موجود ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آپ کی تصاویر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسم با مسمّیٰ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنا طویل عرصہ دیار مغرب میں گزارنے کے بعد اب اپنی کلچر شدت سے یاد آتی ہے اور آپ سے بڑھکر اپنے تمدن کا دلآویز نمائندہ اور کون ہوگا۔

معاف کیجئے گا آدھی عمر پچھم میں بسر کرنے کی وجہ سے میں لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں نہ بات کو گھما پھرا کر کہنا جانتا ہوں جو اہل مشرق کی خصوصیت ہے۔ صاف بات کرنے کا

عادی ہوں۔ میری پیاری بنتِ عم —— واقعہ یہ ہے کہ جب سے آپ کی تصاویر دیکھی ہیں اور نورمن بچّے نے آپکے اخلاق اور دیگر اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا ہے اکثر آپ کے متعلق سوچتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اپنے متعلق تفصیلات سے آگاہ کروں۔

نورمن راوی ہے کہ شہوار بی بی نے جس وقت صرف ایک جملہ میرے متعلق کہا۔ "ہمارے کزن تھے —— ہمیشہ کے گڈ فور نتھنگ ——" اس وقت آپ وہاں موجود نہ تھیں (کچھ فاصلے پر ایک مصنوعی اِن ڈور واٹر فال کے نزدیک جلوہ افروز تھیں) ممکن ہے آپ اپنی بہن کی رائے سے متفق نہ ہوں کیونکہ ہم اودھ میں اور آپ دُور دراز سی پی میں۔ آپکو میرے بارے میں یوں بھی زیادہ علم نہ ہوگا۔ باقی یہ کہ اس دور میں سبھی مسلمان زمینداروں کے لڑکے عموماً گڈ فور نتھنگ ہوا کرتے تھے۔ بہرحال ناچیز کی مختصر سوانح حیات یوں ہے کہ والدین کی رحلت کے بعد شفیق تایا نے پالا۔ بڑے آبا کی وفات حسرت آیات کے کچھ عرصے بعد ہی زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ ساری عمر عیش و عشرت میں گزری تھی۔ بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بونڈز وغیرہ فروخت کر کے ۵۳ء میں لاہور چلا گیا۔ وہاں ایک کاروبار شروع کیا ۵۴ء میں انگلستان گیا اور اسی کاروبار کے سلسلے میں بحری جہازوں کے ذریعے سال میں دو چکر لندن نیویارک بمبئی کراچی کے لگاتا رہا۔ اسی طرح ۵۶ء میں کراچی سے لندن جا رہا تھا جب جہاز پر پاکستانی ڈانسر نُورماہ خانم سے ملاقات ہوئی جو لاہور کو خیرباد کہہ کر عازم برطانیہ تھیں ——

نُورماہ خانم دراصل لال باغ لکھنؤ کی ایک اینگلو انڈین رقاصہ تھیں اور وہاں لال بیبیوں کے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ نورما ڈریک کہلاتی تھیں۔ ۴۶ء میں لاہور آ گئی تھیں —— یہ کوٹھی جو آپکے پیارے بھائیوں نے خرید کر دوبارہ تعمیر کروائی ہے دراصل انہی کی ملکیت تھی جو انکے والا مسٹر جارج نورمن ڈریک سابق ٹی۔ ٹی۔ آئی نے ایسٹ انڈین ریلوے کی کچھ رقم غبن کر کے خریدی تھی۔

نورمن ڈریک ہمارا یعنی نورما اور اس خاکسار کی آنکھوں کا تارا جو ۱۹۷۵ء میں لندن میں پیدا ہوا تھا (اور بڑا ہو کر ایک غیر معمولی انٹلیکچوئل ثابت ہوا) دراصل اسی کوٹھی کو دیکھنے لکھنؤ گیا تھا۔ وہاں اسکی جگہ آپکا طرز جدید کا دولت خانہ دیکھکر اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ خاموش رہا۔

نورمن شاعر ہے اور ذہن پرست اور اسکالر۔ وہ اپنی ماں سے محبت بھی کرتا ہے اور ماں کے اوریجن، اس کے طبقے اور پیشے اور کمیونٹی کے بارے میں ایک خالص اکیڈمک اور معروضی رویّہ بھی رکھتا ہے اور یہ ارادہ کر رہا ہے کہ برطانوی ہند کی اس FRINGE SOCIETY یعنی یوریشین فرقے اور اس کی SUB-CULTURE پر ریسرچ کرے اور کمپنی کے عہد میں بنی ہوئی تصاویر حاصل کرکے ایک کتاب شائع

میں اصل موضوع سے بہت دور چلا گیا۔ غرضیکہ عزیزی نورمن کی ولادت کے بعد بھی اس کی والدہ نے اور میں نے یہ ارادہ کبھی نہ کیا کہ ہم باضابطہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ کیونکہ ہم دونوں پیدائشی آزاد پرندے تھے۔ علاوہ ازیں میں اپنے نہایت منفعت بخش کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رہتا تھا (گو پاسپورٹ برٹش رکھتا ہوں)۔ نورما اپنے فائدہ مند بیوپار کی خاطر لندن میں مقیم رہی پھر ان بہنوں نے مل کر ایک ایسکورٹ سروس قائم کر لی۔

عرصہ چار سال کا ہوتا ہے میں بوسٹن سے لندن آ گیا اور اس ایسکورٹ سروس میں اپنے وسیع تجربات اور تعلقات کی بنا پر ڈریک سسٹرز کیلئے ایک قابل قدر بزنس پارٹنر ثابت ہوا ہوں۔

میں نے یہ طویل خط پرسوں یہاں تک تحریر کیا تھا۔ کل آپکی پیاری بھتیجی پری بیگم

رہیں اُسے اپنی کومتی لا بہوکہنے پرحق بجانب ہوں) سی اردو اخبار یا رسالے کا وہ ضخیم با تصویر خصوصی نمبر لیکر آئی جو آپکے فن و شخصیت کے بارے میں ابھی شائع ہوا ہے اور جو آپ نے اُسے بذریعہ ایر میل لکھنؤ سے ارسال کیا ہے (آپ لوگ جس پتے پر اُسے خط بھیجتے ہیں وہ نورمن کے فلیٹ کا پتہ نہیں ہے وہ اپنی ایک سہیلی کی معرفت اپنی ڈاک منگوا رہی ہے۔)

بہرحال وہ رسالہ میں نے رات بھر میں ختم کر لیا۔ اسکی رنگین اور مونوکروم تصاویر ملاحظہ کیں۔ چند مضامین پڑھے۔ آپکی سوانح حیات کے بارے میں جو انٹرویو آپکی بہن شہوار خانم نے رسالے کو دیا ہے اس میں خاکسار کا ذکر بھی موجود ہے۔ یعنی دو جملے مندرجہ ذیل شائع ہوئے ہیں:

"ہمارے کزن صاحبزادہ دلشاد علیخاں آف دھان پور نامور شکاری تھے ہماری اسٹیٹ کے جنگلوں میں انہوں نے بارہ شیر مارے (مشردہ ہو عزیزہ بہنو کہ بارہ شیر جو میں نے مارے سو مارے اب تیرہویں شیرنی کا شکار کرنے عنقریب لکھنؤ آرہا ہوں)
دوسری جگہ پر شہوار بیٹا ایک سوال کے جواب میں فرماتی ہیں " صاحبزادہ دلشاد علی خان کا دھان پورا اور ہمارا پر دھان پور توام ریاستیں تھیں جیسے محمود آباد اور بلہرہ ___"

یہاں بی بی سے ذراسی چوک ہوئی کیونکہ دھان پورا ودھ میں تھا۔ پر دھان پور اگر صوبجات متوسط میں واقع تھا تو اس جغرافیائی فاصلے کے باعث انکو توام ریاستیں نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال اہم نکتہ یہ ہے شہوار بیگم کے بیان کے مطابق میرے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے آپکے پر دھان پور پیلیس کو کسٹوڈین نے مقفل کر دیا۔
اے عزیزہ۔ آپکی ہمشیرہ کے اس بیان کی بنیاد پر میں آپکی جائیداد منقولہ وغیرہ منقولہ میں اپنا حصّہ طلب کروں ؟ لیکن چھوڑیئے جانے دیجئے۔ اصل سوال یہ ہے کہ شہوار خانم نے خاکسار سے رشتے داری کا یہ سارا قصّہ کیوں گھڑا۔

اسکی وجہ سمجھ سکتا ہوں کیونکہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور انواع اقسام کی سنگل خواتین سے سابقہ پڑا ہے۔ شہوار خانم ضرورت سے زیادہ خیال پرست ہیں۔ بے ساختہ جھوٹ بولتی ہیں دروغ گوئی فطرت ثانیہ بن چکی ہے اور جھوٹ وہ محض تفریحاً بولتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر کاشغری میرا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ فرماتے ہیں کہ انکا انتقال ہوچکا ہے وہ بے ساختہ کہتی ہیں۔ ہمارے کزن تھے۔
سوچا ایک کلرفل شخصیت کا ذکر ہو رہا ہے اس کا پورا حال سُن لیا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جسکا نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ سمندر پار رہتا تھا۔ کوئی عزیز اقارب نہ رکھتا تھا۔ مر چکا ہے۔ سوچا کون تفتیش کرنے جا رہا ہے۔ جھٹ اُسے اپنا کزن بنا لیا۔ بے ضرر جھوٹ — JUST FOR THE HECK OF IT

وہی نام ذہن میں رہ گیا تھا تو رسالے کے انٹرویو میں "کزن دلشاد علی خاں" بطور نامور شکاری تخیل کے پٹارے میں سے کود کر نکل آتے۔ اب انہوں نے ایک نہ دو، جنگلی بن میں پورے بارہ ببر مارے۔!!

مبالغہ۔ گپ اور فنٹیسی۔ یہ تین عناصر مجھے پیاری بیٹا شہوار کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں۔
مگر ان کو علم نہ تھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ "کزن" زندہ سلامت ہیں بلکہ انکے بیٹے ہی سے وہ یہ بات کہہ رہی ہیں۔ لڑکا بے چارہ اس گپ کو صحیح سمجھا کیونکہ آپ فیوڈل لوگوں کی مجھ سے رشتے داری عین ممکن تھی۔
نہ آپکو یہ معلوم تھا کہ آپکی بھتیجی اس لڑکے کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ یا پڑنے والی ہے۔

اب معاملہ یہ ہے کہ مجھ سے آپکی "رشتے داری" کا ذکر رسالے میں چھپ چکا ہے خود شہوار خانم کی زبانی —— وہ اس بیان سے منکر نہیں ہوسکتیں اور بڑی بیگم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ اوپری فیشن پرستی اور موڈرن ازم کے ملمع کے نیچے اصلیت میں

آپ لوگ کافی قدامت پسند ہیں ۔ بالخصوص رشتے ناتوں کے معاملے میں ۔ آپ کا منجھلا بھائی ایک بہت نیک شریف لیڈی ڈاکٹر سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر آپ لوگوں نے منع کر دیا۔ محض اس لیئے کہ " اس کی ذات میں گڑبڑ تھی " یعنی شاید اس کی ماں طوائف رہ چکی تھی ۔ اب یہ حقیقت کہ آپکی نورِ بصر لندن میں ایک طوائف زادے کے ساتھ رہ رہی ہے جسکی سگی خالہ باقاعدہ پکیڈلی سرکس کی اسٹریٹ واکر بھی تھی اور دونوں بہنیں برسوں لندن میں ایک فیشن ایبل قحبہ خانہ چلاتی رہیں (جسکی آمدنی سے اس لڑکے نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی) تو یہ اطلاع آپ سب کو بیہوش کرنے کیلئے کافی ہے ۔

مزید برآں پری بیگم نے یہ بھی بتایا کہ اسکی منگنی آپ لوگوں نے کانپور کے ایک قدامت پرست پابند صوم صلوٰۃ کروڑپتی پنجابی سوداگر چمڑہ فروش خاندان میں کر دی ہے ۔ عقد کی تاریخ طے ہونے والی تھی مگر پری بیگم ضد کر کے آگے پڑھنے کیلئے یہاں آگئی ۔ اب قصہ یہ ہے پری بیگم کے سسرال والوں کو بھی نورِ من کے متعلق اطلاع پہنچ سکتی ہے ۔ چھوکرا مذاقاً کسی گذشتہ امیرزادی قمر چہرا اور یوریشین گارڈنر کے طوفانی رومانس کی مثال دینے کے علاوہ پوچھتا ہے کہ چوڑی محل اور مسٹریس کی پرانی منافقت بہتر ہے یا پائیڈ کا اعلان اور اور اخلاقی دیانت داری ۔ آداب بجا لاتا ہوں ۔

مندرجہ بالا کوائف کے مدِ نظر اگر آپ فدوی کو سردست مبلغ پچاس ہزار پاؤنڈ جلد از جلد روانہ فرمائیں تو اس میں سب کا بھلا ہے ۔ گو یہ یاد رہے کہ پری سلمہا بالغ ہے اور میرے غیر قانونی لڑکے کے ساتھ غیر قانونی طور پر رہ رہی ہے ۔ مگر اس کا آپ قانونی طور پر کچھ نہیں بگاڑ سکتیں ۔ اس کا یہاں کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیوں ہندوستان کے برعکس یہاں اس نئے لائف اسٹائل کو سماجی اجازت مل چکی ہے ۔

لیکن ہندوستان میں آپ کے خاندان کی بدنامی وغیرہ کی روک تھام کے خیال سے ہی میں تجویز کرتا ہوں کہ فی الحال مبلغ پچاس ہزار پاؤنڈز جو آپکے ملک التجار بھائیوں کیلئے کوئی بڑی رقم نہیں ۔ انکا کاروبار مڈل ایسٹ میں بھی ہے ۔ مسقط میں مقیم آپ کا چھوٹا بھائی بنک ڈرافٹ مجھے بھیج سکتا ہے ۔

ورنہ عین ناول کے جشن اجراء کے روز حاضر خدمت ہونگا۔ یوں بھی آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔

پس نوشت: تاش کے پتّوں کا ماہر فن میں کہلاتا ہوں۔ مگر تاش کے محل شہوار خانم اور آپ تعمیر کرتی ہیں۔ اِلّاماشااللہ۔

میں ہوں آپ کا دور افتادہ ابن عم

دلشاد علی خان (سابق ٹھاکر صاحب آف دھان پور راج۔ اودھ)

"بلڈی بلیک میلنگ باسٹرڈ ——— بدمعاش کریمنل کرُوک — حرام الدہر —"

"شہوار یہ شریف زادیوں کا طرز گفتگو ہے؟ خاموش۔"

"لندن کی بیّوں سے رشتہ داری قائم ہو چکی۔ شریف زادیاں! — ہینہہ — اور یہ کمینہ — بلیک میلر ——— چار سو بیس پروفیشنل جگ لو اب آپکا سمدھی ہے ——— شریف زادیاں!!"

"شٹ اپ۔ قصور تمہارا ہےبھگتیں ہم۔"

"قصور؟ ——— میں نے تو محض ایک چھوٹی سی گپ ہانک دی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کمبخت زندہ ہو گا۔ مگر آپ کی مارے انٹلکچوئل پن کے حالت خراب۔ مشہور ناولسٹ جو ٹھہریں۔ وزٹنگ انگلش پوئیٹ کی روز دعوتیں۔ بھتیجی کو اسکے ساتھ ڈرائیو پر دلکشا اور چنہٹ بھیج رہی ہیں۔ وہ نکلا P کا لڑکا ——— اور کراس بریڈ۔"

"لاؤ خط مجھے دو۔ بھیّوں کے ہاتھ لگ گیا تمہاری میری ناک چوٹی کاٹ کر ———"

"اجی وہ کیا ناک چوٹی کاٹیں گے۔ وہ تو آپ کی چہیتی بھتیجی ہی نے کاٹ دی۔ کیا یہ بات چھُپنے والی ہے۔ اس روز بہت بڑھ بڑھ کر منصور کو سُنا رہی تھیں۔ ہم ڈاکٹر عنبریں بیگ سے نہیں ملنے ——— ہمارے یہاں طوائف زادیوں سے میل جول پسند نہیں کیا جاتا ——— عبرت ———"

بس خاموش۔ آہستہ۔ سب آواز باہر جا رہی ہے"
"ہمارے یہاں کی آوازیں باہر نہیں جاتیں۔ کالے دھن سے بھتیوں نے بہت ساؤنڈ پروف گھر بنوایا ہے۔"
"مگر عقل کی پتلی تمہیں سوجھی کیا تھی جو کسی اجنبی دلشاد علی خاں کو اپنا کزن بتایا اور اخبار والوں کو یہ من گھڑت سنانے کی کیا ضرورت تھی؟"
"مجھے کیا معلوم تھا کہ منصور نے غلط سنا کہ مافیا والوں نے اسے مار ڈالا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ کمبخت مرا نہیں اور یوں بلیک میل کریگا۔ کچھ بھی ضرورت نہیں تھی۔ تم کیوں اوٹ پٹانگ ناول لکھتی رہتی ہو؟ وِش فُل تھنکنگ ہی تو کرتی ہو۔ میں بھی وِش فُل تھنکنگ کرتی ہوں —— اب سوال یہ ہے کہ اس بدمعاش کو پچاس ہزار پاؤنڈ—"
"کیوں انکو گالیاں دیے جا رہی ہو۔"
"اے۔ ہے۔ اُس پر وفیشنل جگ لو نے چار چکنی چپڑی باتیں لکھ دیں۔ ربشہ خطمی ہو گئیں۔ اے باجی تمہاری یہ نوبت آگئی ہے کہ ایک بین الاقوامی شہرت کے کارڈ شارپر اور کوکین فروش نے تمہاری تعریف کر دی اور تم لہلوٹ۔ عبرت —— عبرت —— میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ یہ خط ڈی۔ آئی۔ جی کے حوالے کر دوں۔ منصور اسی ڈنر والے روز بنا رہے تھے کہ جب یہ بوسٹن میں تھا انکے زیر علاج۔ اس وقت بھی انٹرپول کی فہرست پر اسکا نام تھا مگر مافیا والوں کا اُسے پروٹیکشن ملا ہوا تھا۔
"مگر تمہارا تو یہ حال لگ رہا ہے DESPERATION کا کہ وہ یہاں پہونچا اور تمکو سونے کی چڑیا سمجھ کر پیغام مناکحت دیا تو اسے منظور بھی کر لوگی۔"
"وہ میرا معاملہ ہے۔ اگر وہ لڑکپن سے بُری صحبت کی وجہ سے بگڑ گئے —— رئیس زادے بگڑ ہی جاتے ہیں —— تو انکی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے۔ بے چارے نے خود خط میں لکھا ہے کہ والدین بچپن میں مر گئے تھے۔ نانا نے پالا —— اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔"
"پینسٹھ سالہ عادی مجرم کی اصلاح —— ! اے باجی میری تم تو بالکل سٹھیا گئیں۔"

"توبہ ہے لڑکی میں تو مذاق کر رہی تھی اور تم کو کیا معلوم کہ انکی عمر پینسٹھ ۶۵ سال ہے ؟
"خود حساب لگا لو ـــــ لکھنا ہے بدمعاش کہ پہلی بار تینتس ۳۳ سال قبل ـــــ "
"انتیس ۲۹ "

"بھئی انکو ہماری بہن کو تو سارا خط ازبر ہو گیا - اچھا انتیس ۲۹ سال قبل ـــــ وہ انگلستان گیا تھا تو اُس وقت دودھ پیتا بچہ تھا منحوس ؟ ارے جب ہی کم از کم پینتیس ۳۵ برس کا تو رہا ہوگا - اور بجیا سنو تو سہی - یہ تم کو اس روز کیا سوجھی جب وہ اخبار چی انٹرویو لے رہے تھے تو اپنا سنہ پیدائش ۳۵ء بتا دیا ؟ انھوں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی "

"تم نے کہہ تو دیا کہ میں وِش فُل تھنکنگ کرتی ہوں "

"اے مگر کچھ خدا سے ڈرو باجی - تم کو سنہ پینتالیس کی پیدائش کون سمجھے گا ساری دنیا ہنس رہی ہے یہ انٹرویو پڑھکر - "

"کہہ دونگی کتابت کی غلطی ہے - میں نے ۳۵ء کہا تھا "

"۳۵ء ـــــ ؟ اے باجی ۳۵ء میں تو اللہ رکھے منجھلے بھیّا پیدا ہوئے تھے آپ تو اللہ رکھے بڑے بھیّا سے بھی دو سال بڑی ہیں ـــــ "

"توبہ میری تو شہرت میرے لئے عذابِ جان ہو گئی - چلو میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئی تھی لوگوں سے مطلب ؟ جان کھالی ہے ـــــ ہاں نہیں تو ـــــ اور بھئی تو دوسری بات یہ کہ تم بھی نھنّی مُنّی بچی نہیں ہو - ڈاکٹر منصور تم سے دس یا پانچ سال چھوٹا ہی ہوگا جس پر تم لہلوٹ - "

"خیر ـــــ وہ میرا معاملہ ہے - یہاں بات اس جرائم پیشہ ٹھگ کی ہو رہی ہے "

"تم کو کیا معلوم پروفیشنل ٹھگ لو ہے ؟"

"منصور ہی نے بتایا تھا - منصور بوسٹن ایک فیشن ایبل ہسپتال میں ڈاکٹر تھے - وہی دولتمند امریکنوں کی سوسائٹی میں اٹھتے بیٹھتے تھے - کنٹری کلب اور یہ اور وہ - وہ بھی اُسی سوسائٹی میں گھومتا تھا - "

"چلو خیر یہ ویمنیز لب کا زمانہ ہے۔ اگر مرد WOMANISE کر سکتے ہیں تو عورتیں MANISE کیوں نہیں کر سکتیں۔ اور کیوں نہ ہوں جگ لوز۔"

"سبحان اللہ باجی۔ ڈاکٹر منصور کے سامنے تو تم بڑی روایت پرست بنتی ہو اس منافقت کی کیا ضرورت ہے؟"

"بیٹا تمہارا تو سنس اف ہیومر بھی غائب ہو گیا۔ مگر اب پچاس ہزار پاؤنڈ۔"

"باجی جان۔ ابھی چپکی بیٹھی رہو۔ منصور سے رائے لیں گے۔"

"منصور تمہاری حماقت پر ہنسے گا نہیں؟"

"پھر کیا کیا جائے؟ وہی ایک قابل اعتبار شخص ہے۔ جس سے راز کی بات کہی جا سکتی ہے ——— فیملی ڈاکٹر تو اچھے خاصے فادر کنفیسر ہوتے ہیں۔"

"میرا تو یہ خط پڑھ کر بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا ہو گا کہ ——"

"نہیں بڑھا۔ اس راسکل نے خط کے ذریعہ ہی آپکو مسحور کر لیا ہے۔ منصور بتا رہے تھے۔ بیحد دلکش شخص ہے۔ پروفیشنل چارمر۔"

"بکواس مت کرو۔ کوئی مسحور و سحور نہیں کیا اور ڈاکٹر منصور کو فون کرو کہ کلینک سے سیدھے یہاں آئیں۔ میرا بی۔ پی دیکھنے ——"

"دیکھ لینا۔ وہ بھی یہی رائے دینگے کہ اس خطرناک آدمی کو بالکل خط مت لکھو۔ اگنور کرو۔"

"اور اگر اس نے اخباروں میں نکلوا دیا ——— بری خانم کے بارے میں؟"

"اگر اُسے مزید بلیک میل کرنا ہے تو وہ اتنی جلد اپنا ٹرمپ کارڈ نہیں چلے گا۔ واہ باجی۔ کارڈ شاریر کی مناسبت سے کیا بات کہی ہے میں نے ——— اہونہہ ——— لکھتا ہے راسکل کہ آپ تاش کے محل بناتی ہیں۔ شاید اس چغد کو یہ معلوم نہیں کہ ——— وہ منصورا کسی مریض کا کیا تکیہ کلام سناتے ہیں۔ پیسہ ——— پیسہ ——— ہر مرض کی دوا ہے تو بڑی بہن ہمارے پاس بھی خدا کا دیا اتنا پیسہ موجود ہے جو تاش کے گھر کو کاخ مرمریں بدل سکتا ہے۔ ٹھہرو میں منصور کو فون کروں ———"

(۲۹)

نواب بیگم کی واپسی

کلارکس اودھ ہوٹل

لکھنؤ ۲۸ر فروری ۸۲ء

میری بہت پیاری نورما

فرینک فرٹ سے پالم پہنچ کر لکھنؤ کیلئے انڈین ایرلائینز کا جیٹ۔ صبح کا سہانا وقت۔ تیز سرخ گرم آفتاب کا نظارہ بھول چکا تھا۔ جب اموسی کے گرد پھیلے آم کے باغات پر پہنچا۔ جی بھر آیا۔ اودیس میں رہنے والے بتا ——! کیا امریوں میں اب بھی جھولے پڑتے ہونگے لڑکیاں گاتی ہونگی —— اب کے ساون گھر آجا —— اور امبوا تلے ڈولا رکھدے مسافر آئی ساون کی پھوار ——! نورما۔ نورما —— تم جو کبھی مرحوم جارج کو یاد کرکے جھکو پھکو روتی ہو۔ اب ہندوستان کی سرزمین پر اترتے ہوئے سمجھ میں آیا کوئی اہم پیاری قیمتی شئے ہمیشہ کیلئے کھو جائے اسکا کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ ہم نے وہ پرانا ہندوستان کھویا اور اپنی معصومیت کھوئی۔ ایک بار جب آدم گریں سے گر گیا تو اب کیا غم —— مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ مجھ جیسے ہارڈ بوائیلڈ سخت جان آدمی بھی جذباتی ہو سکتے ہیں۔ کچھ شرم سی آئی اکتیس ۳۱ سال بعد گھر آیا تو کس مقصد سے —— دو احمق چھچھوری اپنسٹر عورتوں کو انکی بے ضررسی سنکی کی بنا پر بلیک میل کرنے —— تبھی طیارے نے اموسی پر لینڈ کیا۔ تم مُصر ہو کہ میں تم کو ہمیشہ اردو میں خط لکھوں۔ تم کہتی ہو تمہیں اس زمانے کا بہت ناسٹلجیا ہے جب رٹیلیج روڈ پر جوبلی کالج کا ایک غریب طالبعلم تم کو اردو پڑھانے آتا تھا اور تم لچھو مہاراج سے کتھک سیکھتی تھیں۔ میں بھی تو اسی زمانے کی یادگار ہوں۔

جہاز نے اموسی پر لینڈ کیا اور مسافر اترنے لگے تو مجاز یاد آ گئے۔ ہائے بیچارہ مجاز۔ میں نے نورمن بچے کو ایک بار اس کے بارے میں بتلایا تو وہ کہنے لگا بلا نوشی اور جوانمرگی کے اعتبار سے تو یہ شاعر اردو کا ڈی لن طامس معلوم ہوتا ہے ـــ تم نے اسے کہاں دیکھا ہوگا حالانکہ یہ تمہارے زمانے ہی میں لکھنؤ میں براجتا تھا اور ہمارے حلقۂ احباب کو رونق بخشتا تھا۔ طیارے کی سیڑھیاں اترتے ہوتے میں بے اختیار گنگنایا۔

رخصت اے ہمسفرو! شہر نگار آ ہی گیا۔

شہر نگار پر نگار خانم یاد آئیں جنکی ادبی تقریب میں بلائے بے درماں اور آفت ارضی و سماوی کی طرح ناگہانی نازل ہونے کیلئے بندہ یہاں وارد ہوا ہے۔ کیا سمجھیں ؟ لغت دیکھ لو۔ میں اس وقت موڈ میں ہوں خوب لکھونگا۔ میرا ہی لٹریری ٹیلینٹ چھو کرے میں آیا ہے۔ کاش میں ایک COMMON CROOK کے بجائے ادیب بنا ہوتا۔
مگر پھر تم کہاں اور ہم اور نورمن کہاں اور یہ خط کیسا ـــ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا!

شہر نگار پہونچ کر تمہارے مکان یعنی لال بی بی والی کوٹھی گویا شہناز لالہ رُخ کے کاشانے پر جاتا تھا۔ جواب نگار کے بھائیوں کی ملکیت ہے۔
شہر نگار کی اقتصادیات بدلی ہوئی نظر آئی ـــ طیارے سے ہمارے ساتھ چند برقعہ پوش عورتیں اور انکے شوہر بے تحاشا ولائتی سامان (مع ٹو اِن وَن) کے ساتھ اترے۔ سعودی عرب وغیرہ میں بجلی کے مستری تھے چھٹی پر آتے تھے۔ ان ان پڑھ خوشحال مستریوں کو دیکھ کر نگار خانم کے ملک النجار بھائی یاد آتے اور پھر اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کیلئے گویا کمر کسی

ایر پورٹ کے چھوٹے سے ہال میں داخل ہو کر سوچا ایر لائنز کی کوچ یا ٹیکسی سے شہر جاؤں اور کسی ہوٹل میں قیام کا پربندھ کر دوں کارلٹن، برلنگٹن یا رائل ـــ اگر اب تک موجود ہوتے۔ وگرنہ کہیں اور بعد ازاں نگار خانم کو فون کروں۔ مگر تین چار نوجوان "جنن

لگاراں" کے بلّے لگائے مستعد نظر آتے۔ طیّارے سے چند حضرات ایسے اترے تھے جنکو فوراً پہچان کر بڑے تپاک سے انکی جانب لپکے۔ معلوم ہوا اردو کے مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ واقعی لگتا ہے اس تقریب کیلئے نگار خانم کے بھائیوں نے بہت پیسہ خرچ کیا ہے۔ انکی بزنس کیلئے پبلک ریلیشنز کی یہ بھی بہترین ترکیب ـــــ

جی چاہا ان رضا کار چھوکروں کو مطلع کروں خاکسار کو دلشاد دھانپوری کہتے ہیں مشاعرے میں شرکت کیلئے آیا ہوں۔ مگر سر دست اپنی IDENTITY مخفی رکھنا منظور تھی۔ میرے ولائتی سوٹ کیس اور بی۔ او۔ اے۔ سی کے ایئر بیگ پر رضا کاروں کی نظر پڑی۔ میں نے اپنی چارمنگ مسکراہٹ سوئچ آن کر کے ان سے پوچھا معاف کیجئے گا یہاں ٹیکسی مل جائیگی؟ بندے کو ڈی۔ اے۔ چودھری کہتے ہیں برطانیہ کی اردو انجمنوں اور اردو رسائل نے مجھے اس تقریب میں نمائندگی کے لیئے بھیجا ہے۔

میرا یہ جملہ کھُل جا سم سم کا اثر رکھتا تھا۔ "برطانیہ کی اردو انجمنوں" سے سامعین بے انتہا مرعوب نظر آتے۔ ایک نوجوان نے فوراً اسباب میرے ہاتھ سے لیا۔ دوسرے نے اردو ادیبوں سے مجھے ملوایا وہ بھی متاثر دکھلائی دئے۔

ہم لوگ موٹروں میں سوار کیے گئے۔ قافلہ شہر روانہ ہوا۔ بھینسوں کی یلغار۔ بے انتہا ٹریفک۔ حضرت گنج اور مال پر مویشیوں کے گلّے۔ یاد آیا ہمارے لڑکپن میں وہاں انگریزوں کا ولیز یو ریسٹوراں تھا۔ سی۔ مل فوٹو گرافر کی دوکان کے آگے لکھنؤ ملب جہاں ہمارے چند ساتھی اینگلو انڈین لڑکیوں کے چکر میں جایا کرتے تھے پھر انڈیا "فی ہاؤس کا دور آیا جو ہم طلباء کے لئے اپنے اندر ایک معصوم سا رومانس رکھتا تھا۔

پرانی ELEGANCE غائب۔ راستوں میں گوبر کے ڈھیر۔ لکھنؤ پر اب گائے بھینسوں کی حکومت ہے۔ معلوم ہوا ـــ سابق جنتا سرکار کے ایک منتری نے اپنے ووٹر گوالوں کو اجازت دے دی تھی کہ سارے لکھنؤ کو اپنا طویلہ اور چراگاہ سمجھیں۔

در و دیوار کی صورت نہ رہی وہ افسوس   میں وطن میں کبھی پہنچا تو وطن یاد آیا

اس فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں "جشن نگاراں" کے تحائف میرے منتظر تھے۔ گو بن بلایا مہمان تھا۔ حسن انتظام کا معترف ہوا۔ ایک زبردست گلدستہ، ایک نفیس ٹوکری میں سیب۔ ٹوکری کے ربن پر نگار خانم کے بھائیوں کے نینی تال والے اور چرڈ کا پتہ۔ انکی بلائی ووڈ فیکٹری میں بنی چند ہلکی پھلکی فینسی چیزوں کے پیکٹ۔ یہ اشیاء دوسرے مہمانوں کے لئے بھی انکے کمروں میں رکھی ہونگی۔ ہاں۔ اور اس رسالے کا وہی نگار خانم نمبر جو لندن میں پری بیگم نے مجھے دیا تھا اور جو اس سفر کا محرک بنا SOUVENIR - رسالہ کیا - چکنے کاغذ پر ان گنت اشتہار اور دوسرے بزنس ہاؤسوں کی طرف سے تہنیتی پیغامات۔ آرٹ اور انڈسٹری کا سنجوگ مغرب میں ہو چکا ہے۔ ادب اور ہائی فائی بزنس کا نال میل یہاں دیکھنے کو ملا۔

رسالے کے ساتھ دوسرا پیکٹ۔ بڑھیا گفٹ پیپر اور سنہرے ربن سے بندھا۔ کاغذ کھولا اندر سے وہ ناول برآمد ہوا جسکے "اجرا" کے لئے یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ عنوان پڑھ کر چونکا ——"ابکے ساون گھر آجا ——"

ہم تو ساون سے پہلے ہی حاضر ہو گئے! اب دھم سے آکھوں گا صاحب سلام میرا!!

شام کو جب سورج نیچے گومتی میں ڈوب رہا تھا مندوبین SUNDOWNERS کیلئے چھٹی منزل پر بار میں جمع ہوتے۔ اسیوقت دونوں میزبان بہنیں تشریف لائیں بیش قیمت ساریوں میں ملبوس —— میں نے دونوں کے ایک ایک SOLITAIRE ہیرے کی قیمت فوراً ذہن میں کمپیوٹ کی۔ ماشاءاللہ۔ بندہ جیسا کہ تم جانتی ہو بفضل خدا ہر مجمع میں اپنی وجاہت اور سلور گرے بالوں کی وجہ سے ممتاز نظر آتا ہے (کھنکارا)۔ دونوں میری طرف متوجہ ہوئیں۔ عرض کیا ڈی۔ اے۔ چودھری برطانیہ کی اردو انجمنوں کا نمائندہ۔ دونوں کھل اٹھیں۔ چھٹکی زیادہ تیز ہے۔ اس نے باتیں کرتے کرتے دوبارہ دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اسے شاید کچھ شک ہو گیا ہے۔

دوسرے روز وقت مقررہ پر نگار خانم کے موجودہ اور تمہارے سابق مکان پر پہنچے تو شادی کا سا منظر نظر آیا۔ بینڈ باجے کی کسر تھی۔ عمارت اور سارے درخت برقی قمقموں سے فروزاں۔ شامیانے کے نیچے بڑھیا قالین اور صوفے۔ شاندار اسٹیج۔ پہلو میں "پریس" کی طویل میز پر صحافیوں کی قطار۔ مقامی ٹیلی ویژن کیمرہ ذاتی ویڈیو کیمرے۔ ہر چیز تیار۔ شہر کی سوسائٹی کے کریم یعنی بالائی طبقے کی بالائی آ کر صوفوں پر جمی۔ آرک لائیٹس اور فلیش بلبوں کی چکا چوند میں مصنفہ (" ایکے ساون گھر آجا" کی مناسبت سے دھانی غرارے کا جوڑا) مہمان خصوصی کے ساتھ خراماں خراماں تشریف لائیں۔ بڑھیا شیروانی اور چوڑی دار پائجامے میں ملبوس دونوں بھائی (ان دونوں سے میری ملاقات ابتک نہ ہوئی تھی) اور شہوار خانم (بڑاقے کی گوٹ کا غرارہ) ہمراہ ___ وہ سب اسٹیج پر پہونچے۔ مجھے ڈائیس کے عین سامنے والے صوفے پر بٹھالا گیا تھا۔ میرے برابر جو صاحب براجمان تھے وہ ڈاکٹر منصور کاشغری نکلے۔ چھ سال قبل بوسٹن میں میرے معالج تھے۔ انھیں حضرت نے میرا تذکرہ شہوار خانم سے کیا تھا ___ جسکی بنا پر میں اپنے نامناسب مقاصد کی تکمیل کیلئے یہاں موجود ہوں ___ ایک اردو ادیب نے جو میرے دائیں جانب تشریف رکھتے تھے میرا تعارف ڈاکٹر سے کرایا "مسٹر ڈی۔ اے چودھری۔ برطانوی ڈیلی گیٹ "

ڈاکٹر نے ابرو اٹھا کر مجھے دیکھا۔ خفیف سی حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ وہ بھی ایک گھاگ ہے۔ بولا "چودھری صاحب آپ سنہ پچھتر میں امریکہ میں تشریف رکھتے تھے؟"

عرض کی "اشتیاق بہت ہے لیکن آجتک اس حیرت انگیز ملک کی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا۔ لندن میں رہتے ہوئے بس اتنا ضرور سُنا ہے کہ پار لبت ہے دیس سنہرا۔"

"جی۔ اور قدم قدم پر آشنا اپنا روپ الوپ دکھاتی ہے ___" ڈاکٹر نے کہا ___

انکا فقرہ نظر انداز کر کے میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا ___ "اردو کا عاشق ہوں شعر بھی کہتا ہوں۔ قوم کا جاٹ ہوں۔ لہٰذا سر پہ کھاٹ رکھ کر قسمت آزمائی کے لئے انگلستان چلا گیا تھا۔ برطانیہ کی کتنی اردو انجمنوں کا فعّال ممبر ہوں۔ انھوں نے چندہ کر کے یہاں بھیج دیا۔ حالانکہ مدعو نہ کیا گیا تھا۔ سوچا وطن عزیز کے درشن کا اچھا موقع ہے سو آ گیا۔

چودھری دھیان سنگھ بندے کا نام ہے۔ آرزو تخلص۔ اسی لئے ڈی۔ اے چودھری کہلاتا ہوں"

ڈاکٹر نے توصیفاً سر ہلایا۔ گویا میری فنکاری کے قائل ہو چکے ہوں اپنے برابر بیٹھی دو خواتین کو مخاطب کیا "مسز بیگ۔ عنبر۔ چودھری دھیان سنگھ"۔ پھر مجھ سے کہا "مسز بیگ۔ ڈاکٹر بیگ"۔

میں نے اخلاق سے انکو نمسکار کیا۔ فوراً پہچان گیا۔ یاد ہے وہ دو ماں بیٹیاں جو وکٹوریہ جہاز پر ٹورسٹ کلاس میں تمہاری ہم سفر تھیں۔ اڈنبرا جا رہی تھیں سنہ چھپن میں۔ مسز بیگ کا سر سفید ہو چکا ہے گو چہرے پر اب بھی رونق ہے۔ اتنی عمر رسیدہ نہیں لگتیں ستر سے کیا کم ہونگی۔ لڑکی اس وقت کم سن چھوکری تھی اب ایک باوقار خاتون۔ ماں کے برعکس کافی کم رُو۔ ان دونوں نے بھی مجھے ذرا غور سے دیکھا۔

ابھی تقریب کی کاروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ شہوار خانم مہمانوں کی دیکھ بھال کرتی ہماری جانب آئیں۔ میں نے فوراً بھانپ لیا کہ ڈاکٹر عنبرین بیگ اور صاحبزادی شہوار خانم کے درمیان برف کے پہاڑ حائل ہیں ــ کارن: ڈاکٹر منصور کاشغری۔

آہ ــ! یہ ابدی مثلث ــ!!

اب چند رضا کاروں نے (مجھے بعد معلوم ہوا کہ وہ سب نگار خانم کے بھائیوں کے دفاتر اور کارخانوں میں ملازم تھے) چکر لگا کر حاضرین جلسہ کو اسی گفٹ پیپر اور ربن میں بندھا رسالے کا خصوصی نمبر اور تازہ ناول کی ایک ایک جلد پیش کی گلاب کے عظیم الجثہ بار ڈائیس کی میز پر رکھے تھے۔

مدیر رسالہ اسٹیج پر بلائے گئے۔ ناظم جلسہ نے مائیکروفون پر یہ بھی اعلان کیا کہ برطانیہ کی اردو انجمنوں اور اردو رسالوں نے خاص طور پر اپنے نمائندے مسٹر ڈی۔ اے چودھری کو لندن سے بھیجا ہے۔ اس اطلاع پر خوب تالیاں بجیں۔ ڈاکٹر منصور کاشغری نے پہلو بدل کر دوسرا سگریٹ سلگایا۔

لمبی لمبی تقریریں شروع ہوئیں۔

منسٹر کا بھاشن اردو اشعار سے پُر۔ یو۔ پی گورنمنٹ فروغ اردو کیلئے جو کچھ کر رہی ہے ــــ (کیا کر رہی ہے؟ مجمع میں بھنبھناہٹ)۔ نگار صاحبہ کی ادبی خدمات وغیرہ کا ذکر۔ انہی کی کتاب انکوبیشن کی ـ مصافحہ۔ مصنّفہ کی گلپوشی۔ تصویریں ـ
تالیاں۔ مزید تقریریں۔
باپ رے۔ اہل ہند کو ابھی تک مرضِ تقریر سے افاقہ نہیں ہوا۔ بلکہ اب تو یہ عارضہ لاعلاج معلوم ہوتا ہے۔

اے میری پیاری نورما ڈریک عرف نرملا دیوی عرف نورماہ خانم ــــ تم نے اور میں نے اپنی رنگا رنگ اور مختلف النوع مصروفیات سے پُر زندگی میں بہت کچھ دیکھا اور سُنا ہے ــ لیکن اب ایک ایسا واقعہ پیش آیا عجیب وغریب اور BIZZARE جسے یاد کرکے مجھ جیسے پُرانے پاپی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے بڑے باپ مرحوم چودھری جوّاد علی خان آف دھان پور کہا کرتے تھے بیٹا اللہ تعالیٰ ہر سزا دے مگر بازار رُسوا نہ کرے ــــ
اب جو واردات ہوئی اس کے مقابلے میں میری اسکیم گویا بچّوں کا کھیل تھی جو میں نے ملتوی بلکہ منسوخ کر دی۔

خصوصی نمبر کے مدیرہ کی تقریر جاری تھی۔ جب تین نفر پنڈال میں داخل ہوئے۔ ایک سُوٹ بُوٹ میں۔ دوراجستھانی پگڑ۔ مارواڑی انگرکھے دھوتی پوش (ایک بوڑھا ایک جوان) ان میں سے ایک نے ایک بڑا سا فوٹوگراف کوئی ۳×۲½ سائز کا بادامی کاغذ میں لپٹا اٹھا رکھا تھا۔ وہ تینوں تصویر سمیت اسٹیج کے سامنے پہونچے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا راجستھانی فوک آرٹسٹ۔ شام کے کلچرل پروگرام میں گائیں گے۔ کسی نے دوبارہ سرگوشی کی نہیں کوئی فوٹوگرافر مصنّفہ کی تصویر پیش کرنے حاضر ہوا ہے۔
وہ تینوں مع تصویر کھٹ کھٹ کرتے اسٹیج پر چڑھ گئے۔ اڈیٹر صاحب نے مائیک

پھر کہا ـــ" خواتین و حضرات ـــ یہ ہمارے مشہور آرٹسٹ ـــ آپکا اسم گرامی ـــ؟"

" محمد شرف الدین۔ اور یہ دونوں شری کنوڑیا اینڈ سن ـــ جے پور!" کوٹ پتلون والے نے جواب دیا۔ اور تصویر کو میز پر کھڑا کر کے اس کا بادامی کاغذ اتارا۔ اندر سے وہ رنگین پورٹریٹ برآمد ہوا جس کے مختصر کیمبو کا بلاک بعنوان " ہر ہائی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف بردھان پور" نگار خانم نمبر میں شائع ہوا تھا۔

بڑی شاندار تصویر تھی۔ ایک حسین مہ جبین بیگم صاحبہ مغلیہ لباس اور زیورات میں سجی تمکنت سے جلوہ افروز۔ حاضرین جلسہ نے بے ساختہ کلمات تحسین ادا کئے اور اپنے اپنے خصوصی نمبر کا وہ ورق کھولا جس میں اس کا کیمبو شائع ہوا تھا۔ سارے شامیانے میں ایک ساتھ ورق گردانی کی آواز بلند ہوئی۔

اڈیٹر صاحب نے مائیک پر آکر کہا" جناب صدر۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ یہ میرے دو معزز راجستھانی دوست ہیں۔ جے پور میں انکے یہاں محترمہ نگار صاحبہ کی گرینڈ مدر کی یہ تصویر موجود تھی جو چندر نگر کے ایک فرنچ فوٹوگرافر موسیو آندرے ربنال نے ۱۹۱۱ء میں کھینچی تھی بڑا نادر فوٹوگراف ہے اسے ہمارے مترشری گووردھن داس رنچھوڑ مل کنوڑیا اس مبارک موقع پر مصنفہ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے جے پور سے تشریف لاتے ہیں۔"

دونوں بہنیں متحیر اور کنفیوزڈ نظر آئیں۔ لیکن نگار خانم نے فوراً کھڑے ہو کر جواب دیا "میں آپکی مشکور ہوں۔ ہم کو خود عرصے سے اس کیمبو کے اوریجنل کی تلاش تھی۔ آپکو علیا حضرت دادی جان مرحومہ کے اس پورٹریٹ کی منھ مانگی قیمت دی جائیگی ـــ"

" منھ مانگی قیمت؟" بوڑھے مارواڑی نے آنکھیں پھاڑ کر دہرایا۔ اسکی باچھیں کھل گئیں ـــ

"سیٹھ جی۔ یہ پرانے رؤسا ہیں۔ آپ تو خود جے پور والے ہیں۔ آپکو معلوم ہوگا ریاستیں ختم ہوگئیں مگر ان کے وارثوں کی دریا دلی اور آن بان تو باقی ہے ـــ" مدیر رسالہ ارشاد کیا۔

اب نورما ڈیرہ۔ مجھے دو مختلف ردِعمل نظر آتے۔ نگار خانم کے دونوں بھائی ڈائس پر موجود ہکا بکا کبھی اس تصویر کو دیکھتے کبھی اپنی بہنوں کو اور کبھی بہنوئی اجنبیوں کو۔
ادھر میرے نزدیک بیٹھی مسز بیگ یعنی ڈاکٹر عنبر بیگ کی والدہ مبہوت و مسحور اس پورٹریٹ کو تکے جا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے سرگوشی میں ڈاکٹر کا شغری اور عنبریں کو مخاطب کیا۔ "آج میں نے مدتوں بعد کسی اور کی زبان سے آندرے رینال کا نام سُنا ہے۔"

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس اثناء میں اسٹیج پر ہنگامہ بپا ہو چکا تھا۔ ہوا یوں کہ نگار خانم نے شیریں اور ممنون آواز میں نوجوان مارواڑی سے دریافت کیا "آپکو یہ فوٹوگراف کہاں سے ملا ــــ؟"
اس نے جواب دیا۔ "تمہاری دادی نواب بائی جب جے پور میں تھیں تب ہی کھینچا تھا۔ ٹھاکر مہیشور سنگھ کی گڑھی پہ۔ یہ ہمارے بیکنٹھ باشی دادا جی کے پاس رکھوا دیا تھا یہ تو ہمیں اس اردو پتریکا میں چھپی اس کی کاپی سے جان پڑا کہ نواب بائی ــــ"
"کون نواب بائی؟ کیسی نواب بائی؟ کیا بکتا ہے پاجی۔ مردود ــــ بدمعاش ــــ"
نگار خانم کے بڑے بھائی نے اچانک آگ بگولہ ہو کر مارواڑی کو ایک زوردار جھانپڑ رسید کیا۔ ظاہر تھا کہ انھوں نے اپنے عزیزہ بہن کے بارے میں نہ وہ خصوصی نمبر پڑھا تھا نہ اس میں چھپی تصویر ملاحظہ کی تھی۔ حاضرین جلسہ کو سانپ سونگھ گیا۔ سب دم بخود اسٹیج کو تک رہے تھے کہ دیکھئے اب غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔
جوان مارواڑی تھپڑ کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ پگڑی سنبھال کر بولا۔ "اجی مہارے کو مارے کیوں چھو۔ چلو نواس کے اندر چل کر بات کر لو۔ یا کارن تو آتے ہیں جے پور سے ــــ"
شرف الدین صاحب نے فرمایا۔ "حضرت یہاں تماشہ نہ بنائیے اندر چلتے ہیں۔"

دونوں بھائیوں نے اپنی بہنوں کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اگر وہ حیادار ہوتیں پٹ سے گر کر جاں بحق تسلیم ہو جاتیں۔ انکے رنگ فق بہٹی گم۔ شرف الدین صاحب نے تصویر اٹھائی۔

اسٹیج سے اُترے۔ دونوں مارواڑی اترنے لگے ــــ تو ایک کا پاؤں مائیک کے تاروں سے الجھ گیا۔ منسٹر صاحب بھی اپنے حواریوں موالیوں کیساتھ فی الفور پھاٹک کی طرف سرک لیے۔ مدیر رسالہ نے مائیک پر آکر آواز دی: "بطلیموس صاحب پفنانوس صاحب اسٹیج پر تشریف لائیں۔"

ایک مسخرے سے کیریکٹر نے جنکا شاید قلمی نام بطلیموس یا پفنانوس تھا فوراً مائیک پر پہونچ کر اناؤنس کیا: "خواتین وحضرات۔ ایسا لگتا ہے کہ محترمہ نگار خانم کی مقبولیت اور سماجی حیثیت کی وجہ سے انکو بلیک میل کرنا بہت آسان ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا اس وقت بھی نہایت کریہہ قسم کی افترا پردازی اور بلیک میل کی کوشش کی جارہی ہے۔ موجودہ صورت حال میں جلسہ جاری رکھنا ممکن نہیں۔ کل شب مشاعرہ اور پرسوں شام افسانہ پروگرام کے مطابق منعقد کی جائیگی۔ لیکن ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ افتتاحی جلسہ برخاست کرنا پڑرہا ہے۔ آج رات ساڑھے نو بجے کلارکس اودھ میں پروگرام کے مطابق ڈنر ہوگا وہاں تشریف لائیے۔ شکریہ ــــ"

اب پفنانوس (یا بطلیموس) صاحب اُچک کر ڈائس پر آئے اور اناؤنس کیا: "ڈنر بھی کینسل۔ نگار صاحبہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر منصور ــــ ڈاکٹر منصور کاشغری ــــ جہاں ہوں مہربانی فرما کر آبشار والے کمرے میں تشریف لے جائیں ــــ"

ڈاکٹر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آہستہ سے مجھ سے کہا "صاحبزادہ صاحب۔ میں سمجھتا ہوں آپ بھی میرے ساتھ اندر تشریف لے چلیں آپ بخوبی فوراً پہچان لیں گے۔ آیا یہ بلیک میل ہے یا اصلیت۔"

مسز بیگ چپکے سے بولیں "ارے بیٹا مگر تم کو تو پورا قصہ معلوم ہے"

ڈاکٹر نے نرمی سے جواب دیا "بیگم صاحبہ آپ دونوں اب گھر جائیے۔"

"توبہ ہے۔ آج یہاں ڈنر پر بلایا گیا تھا۔ گھر پہ کھانا بھی نہیں پکوایا" دونوں ماں بیٹیاں اُٹھ کر مجمع میں کھو گئیں۔

جلسہ درہم برہم۔ لوگ باگ اُٹھ اُٹھ کہ چہ میگوئیاں کرتے باہر جا رہے تھے۔ بہت سے نتیجے کے انتظار میں ادھر ادھر قناتوں میں ٹھٹھکے کھڑے تھے۔ اس کنفیوژن میں خوفناک اضافہ یوں ہوا کہ ایک سبز پوش مجہول سا آدمی کہیں سے نمودار ہو کر شامیانے کا چکر کاٹنے لگا۔ وہ زور زور سے الاپ رہا تھا۔ جو تم توڑو پیا میں نہیں جوڑوں رے ــــ جو تم توڑو پیا ــــ کبھی وہ نعرہ لگاتا ــــ ہیرا جنم اَمول تھا ــــ کوڑی بدلے جائے ــــ کوڑی بدلے۔

یکبارگی وہ اسٹیج پر جا چڑھا اور کتھک شروع کر دیا۔ ماہر رقاص تھا اور استاد گائیک۔ گلدان اور ہار پھول سدرشن چکر کی طرح گھما کر چوگرد پھینکتا گیا۔ ڈاکٹر کاشغری اور میں مبہوت۔ وہ بادل کی طرح گرجا "مبارک ہو بنّو یہ جشن سعید" اور بجلی کے مانند رقصاں ــــ مبارک ہو بنّو ــــ دھمکٹ دھا دِھن تاکتا گھڑ گھن نگ دھیت تا ــــ ہمیشہ مطرب در نصیب یاراں باشد ــــ جوشش گل نغماں بہار رقصاں باد ــــ ہمیشہ دلبر سجان ــــ تھئی تھئی تت تت ترکٹ دھئی ــــ ترکٹ دھا ــــ ترکٹ دھا ــــ ترکٹ دھئی تت تھا ــــ مائی نیم مِس نواب بائی اف جے پور ــ تانا نا تا نا نا تا نا نا دردیم توم نانا دادا بابا آبا سب گول غارت غول ــــ دھمکٹ تک تک ٹکٹ ترکا کٹ کٹ گئی ناک کٹ گئی تت تت تھئی۔

میرا دماغ چکرا گیا۔ وہ چھلانگ لگا کر ڈائس سے اترا۔ اور اسٹول اٹھا اٹھا کر چاروں طرف پھینکنے لگا ــــ حاضرین جلسہ اپنے اپنے سروں کی خیر مناتے باہر بھاگے ہڑبونگ مچ گئی۔ رضا کار اسے پکڑنے کے لئے دوڑ رہے تھے اور وہ چھلاوے کی طرح ایک صوفے سے زقند بھر کر دوسرے پر جا پہنچتا ــــ اسکے سر کے بال کھڑے ہو گئے تھے داڑھی چنگاریوں طرح اڑ رہی تھی۔

اب تانڈو نرتیہ ــ گویا وہ شونٹ راج تھا۔ اور تخریب کائینات کے رقص میں محو۔ بالآخر چند رضا کاروں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسکی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں منہ سے کف جاری تھا۔ ایک ملازم زنجیریں اٹھائے دوڑا آیا۔ اسے بیڑیاں پہنا کر باہر لے گئے۔

ہماری پرانی کوٹھی کا محض موٹر خانہ اور شاگرد پیشہ باقی ہے۔ وہ پابجولاں دیوانہ رقاص اسطرف جاتا نظر آیا۔ شامیانے میں بڑا ہیبتناک سناٹا طاری تھا۔ ڈاکٹر کاشغری اور میں مکان کی سمت روانہ ہوئے۔ کچھ دیر قبل پری محل میں جشن منایا جارہا تھا اب یہاں موت کی ایسی خاموشی طاری تھی۔ سب بھونچکے۔ حیران پریشان۔ بہت سے زیرلب متبسم۔ کچھ رنجیدہ اور شرمسار۔ عجیب وغریب منظر تھا۔

ڈاکٹر کاشغری کی قیادت میں گیلری سے گذرتا ایک والٹ ڈزنی کی فینسی نمائش میں داخل ہوا۔ سامنے کی دیوار سے مصنوعی جھرنا گر رہا تھا۔ وسط میں رنگین فوارہ ایک کونے میں مصنوعی درخت پر مکینکل چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ میں اس مجنوں ڈانسر کو بھول کر اس نئے عجوبے کی سیر میں محو ہوگیا ـــــــ ڈزنی لینڈ غلط کہا۔ یہ تھان متی کا بڑا سا پٹارا تھا جس کے اندر میں نے دفعتاً اپنے آپ کو موجود پایا۔

العجب! پرانے شہری روساء اور قصباتی زمیندار اپنی نفاست اور خوش ذوقی کے لیے مشہور تھے۔ ہم دھاں پور والے بہت زیادہ دولتمند نہ تھے لیکن جاپلنگ روڈ پر بڑے ابا کی کوٹھی کس خوش ذوقی کی آیئنہ دار تھی۔ مگر ان سابق جاگیرداروں نے تو بیہودہ ٹیسٹ کی حد کر رکھی تھی۔

پہاڑی نما مینٹل پیس پر قبلہ دادی جان کا کیمیو رکھا نظر آیا۔ سامنے ساٹن بروکیڈ کے صوفوں پر مسٹر شرف الدین، دونوں مارواڑی، صاحبانِ خانہ اور انکی دونوں مسائل خیز بہنیں فردکش تھیں۔ ہمارے پہونچنے کے بعد دروازے اندر سے بند کر دئے گئے۔ بہنوں نے چونک کر مجھے دیکھا گویا کہتی ہوں یک نہ شُد دو شُد۔ میں نے برجستگی سے کہا:" میں لندن میں بیرسٹر ہوں۔ اس وجہ سے ڈاکٹر صاحب مجھے بھی ساتھ لیتے آئے۔ اب بتائیے پورا معاملہ ـــ آپکو اس طرح یہاں پہنچ کر اس معزز خاندان کی بے عزتی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے محسوس کیا کہ نگار و شہوار

نے اطمنان کا سانس لیا۔ گویا جو وہ مجھے سمجھیں تھیں وہ میں نہیں تھا
"بے اجتی ؟ بالسٹر صاحب ؟" چھوٹے کنوڑیا نے جواب دیا۔ ہم نے کوئی بُری بات نہیں کہی۔ بڑے بڑے بادشاہوں مہاراجوں نوابوں نے رنڈیوں سے بیاہ کیئے۔ اگر سُو شری نگار کھا نم کے پُوجیہ داداجی نے بھی نواب بائی جے پور والی کو اپنی بیگم بنالیا تھا تو اس میں بے اجتی کیا ہوئی ؟ ہم تو ایک اور کام سے آتے تھے اور اسکی چرچا پنڈال میں تھوڑا ہی کرتے۔ وہاں تو ہم کیول یہ پھوٹو پرسنٹ کرنے آئے تھے۔ وکیل صاحب اب آپ بولو ——"

شرف الدین صاحب نے بریف کیس سے دو عدد قانونی دستاویزیں برآمد کیں۔ انکو کافی ٹیبل پر پھیلایا۔ میں نے نگاہ ڈالی۔ پرانی جے پور اسٹیٹ کے اسٹامپ پیپر —— اردو خط شکست میں مرقوم :——
منکہ مسمّاۃ نواب بیگم جے پور والی، قوم کنچنی۔ عمر چونتیس ۳۴ برس۔ بالغ، اقرار کرتی ہوں کہ مبلغ —— آگے پڑھا نہ گیا۔ خط شکست پڑھنا آسان نہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ لوگ باہر کان لگائے کھڑے ہیں۔ وکیل صاحب سگار سلگا کر بولے —— "دیکھئے صاحبان۔ شری گووردھن داس رنچھوڑ مل کنوڑیا اور انکے پُتر شری جے رام داس کنوڑیا میرے مؤکل ہیں۔ انکا کیس مختصراً یہ ہے کہ شری گووردھن داس کے والد سورگباشی گردھاری لال کنوڑیا جوہری بازار جے پور کے مہاجن اور نواب بائی چاند پول بازار جے پور کی نامی گائیکہ اور رنڈی تھیں جنکا لین دین شری کنوڑیا سے رہتا تھا۔ نواب بیگم عرف نواب بائی بہت خراچ تھیں۔ اسوجہ سے مقروض رہتی تھیں رام گنج بازار میں ایک حویلی سنگِ سُرخ کی کاٹھیاواڑ کے کسی دربار صاحب نے انکو عنایت کی تھی۔ اس کے علاوہ کثیر زیورات طلائی اور جڑاؤ کی مالک تھیں۔ مگر زرِ نقد کی ہمیشہ کمی رہتی تھی۔ جس زمانے میں وہ ایک تباہ حال جاگیردار ٹھاکر مہیشور سنگھ جی کی ملازم تھیں انہوں نے سنہ ۱۹۱۲ اور سنہ ۱۹۱۳ میں پچاس اور چالیس ہزار روپے میں حویلی رہن رکھی۔ دوسری بار جب وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھیں —— شرائط

میں یہ بھی مرقوم تھا کہ مدّت معیّنہ کے اندر رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں انکی موت کے بعد اصل مع سود در سود انکے وارثان ادا کرینگے۔

"اس دوسرے اسٹامپ پیپر پر وکیل اور گواہوں کے دستخط کے بعد نواب بیگم نے سیٹھ گردھاری لال سے کہا کہ وہ ان کے فوٹوگراف کو بھی جو ایک یوروپین فوٹوگرافر نے کھینچا تھا۔ ساتھ لے جاویں اور اسکے شایان شان فریم بنوا دیں۔ سیٹھ جی وہ تصویر اپنے ساتھ گھر لے آئے۔"

"اب بالسٹر صاحب۔ ہن مہاری سُنو ——" بوڑھے مارواڑی نے بات کاٹی۔ "مہارے باپوجی جو تھے وہ اپنے سارے کاگج پتر اپنی تجوری میں رکھیں تھے۔ وہ دن گھر آکر وہ تجوری کھولنے سے پہلے انکی طبیعت کھراب ہوگئی۔ دونوں اسٹامپ پیپر پچھلا والا اور یہ دوسرا والا اکھٹے ایک لفافے میں رکھے تھے۔ سوچا ہوگا ابھی یہ لفافہ پھوٹو کے اندر کھسکا دو۔ بھوجن کر کے آرام سے تہہ کھانے میں جائے پاچھے تجوری کھول لینڈی۔

"تو مہارا سُنو —— انہوں نے پھوٹوگراپھ کا ٹمپر داری فریم کھول کر کاگج اسکی دفتی کے اندر سرکا دینیئے اور رکھو کھے واپس جڑ کر چوکے میں جا براجے۔ پیٹ میں اُٹھا جور کا درد۔ وہیں چٹ پٹ ہو گئے۔"

"کیا ہو گئے ——؟" شہوار خانم نے پوچھا۔

"اجی مر گئے۔ دیہانت ہو گیو۔ بیکنٹھ سدھارے مہارے باپوجی۔ واسمے میں انکا اکلوتا چھورا چھہ مہینے کا تھا۔ میرے چاچا مُرلی دھر جی نے بیکانیر سے آکر گادی سنبھالی۔ وا فوٹو کسی چاکر نے اٹھا لینڈی۔ اور گودام میں رکھ دینڈی۔ پاچھے گھر کے لوگ روراکے کریاکرم میں لگ گئے۔ اب مہارے کو بتا دَ۔ چاچا جی تو کچھ نہ جانیں۔ نواب بیگم سے کس پر کا تکاجا کرتے؟"

"واکو ڑے چھی؟" بیٹے نے ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

"جی ——؟" میں نے پوچھا۔

"انکا مطلب ہے وہ تھیں کہاں — ؟" شرف الدین صاحب نے ترجمانی کی۔
"ہاں ہاں وہ تھی کہاں۔ راتوں رات اُڑنچھو ہوگئی۔"
"کہاں —— ؟" میں نے پوچھا۔
"بھگوان جانیں کہاں — ادھر مہارے چاچاجی کو جب منیم جی اور وکیل صاحب سے رہن کی بات معلوم پڑی۔ سارا گھر چھان ڈالا وہ کاغج پتّر نہ ملے۔ ملتے کیسے وہ تو فوٹو کے پاچھے راکھے تھے اور فوٹو ہماری چاچی جی نے گودام میں ڈال دی تھی۔ گودام کے سامان پر وہ کبجا کرنا چاہیں تھیں۔ وامیں قلف ڈال کر تالی اپنی موٹی کمر میں لٹکائے پھرتی تھیں۔"
بوڑھے مارواڑی نے جواب دیا۔" ادھر صاحب نواب بائی بھاگ گئی۔ اپنا سامان بیچ باچ کرستان آیا اور چھوکری کو لیکر نو دو گیارہ۔ حویلی چھانڑ گئی۔ اسکو بولی نیلام کراکے رکم وصول لیتے پن وہ کاغج کہاں تھے؟ انکی نکل باپوجی محافظ کھانے میں جمع نہیں کروائے تھے۔ کس برتے پر وارنٹ نکلواتے؟ مہارے پاس تو ثبوت ہی کونٹری چھا؟ بھاگ پھوٹ گئے مہارے۔ ایک لاکھ روپیہ واجانے کا اور بیاج داکا بیاج —— سوچو کتنی تگڑی رکم تھی ——"

"نواب بائی کا کچھ پتہ نہیں چلا؟" میں نے دریافت کیا۔
"صاحب وہ راجپوتانہ کو نہ آئی۔ ماپھر ماتیے نواب صاحب آپکی پوجیہ دادی جی لوٹ ہی کے نہ آئیں۔"
"خاموش مردود۔ اگر کسی گانے والی کو میری دادی جان کہا زبان گُدّی سے کھینچ لونگا۔" نگار کے بڑے بھائی نے پھر بھنّا کر جواب دیا۔
"سرکار غلطی آپ کے داداجی کی ہے۔ ڈانٹ آپ مجھے رہے ہو۔ پھر یہ کہ جو بندھ گیا سو موتی۔ اب کا ہے کا گسّہ۔ پرانی بات ہوگئی۔ آخر کو آپکی دادی تھی۔ آپ انکی سنتان ہو — انکے نام کا پھاتحہ درُود کرواتے ہوگے ——"
بڑے بھیّا اٹھکر بوڑھے مارواڑی کی ٹھکائی کرنا چاہتے تھے میں نے اور ڈاکٹر

منصور نے پکڑ کر واپس بٹھایا۔ بڈھا مارواڑی بولتا رہا ——"مہارے کو ستر سال بعد—— وکیل صاحب —— اَب آ گئے تم بولو ——"

"دیکھئے ایسا ہے" شرف الدین صاحب نے دوبارہ بات شروع کی "چند روز قبل کا ذکر ہے میں راجستھان اردو اکیڈمی کے ریڈنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ تازہ پر محترمہ نگار خانم صاحبہ کے بارے میں خاص نمبر میز پر پڑا دیکھا۔ اٹھا کر ورق گردانی شروع کی۔ میں کنوڑیا اینڈ سنز کا قانونی مشیر ہوں۔ نواب بائی کا فرار اور اسٹامپ پیپر کی گمشدگی انکے ہاں ایک فیملی لیجنڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان بے چاروں کا المیہ یہ ہے کہ روائتی پونجی پتی مارواڑیوں کے برعکس یہ لوگ خاصے مفلوک الحال ہیں۔ انکے گھرانے کا زوال انکے والد گردھاری لال کے اچانک موت کے بعد ہی شروع ہو گیا۔ انکے چچا بھی انکو چونا لگا گئے۔ بہرحال تو IRONY یہ ہوئی کہ آج سے کوئی پندرہ سال قبل جے رام داس جی نے اپنے چچازاد بھائیوں سے مقدمہ بازی کے بعد وہ کنجی حاصل کی اور گودام کھولا تو سارا قیمتی سامان تو انکی چچی غائب کر چکی تھیں۔ کاٹ کباڑ کے علاوہ یہ فوٹوگراف برآمد ہوا۔ فریم اور پچھلی دفتی سڑ گل گئی تھی تصویر شیشے اور دوسری دفتی کے درمیان محفوظ تھی۔ جب انھوں نے اسے اٹھایا تو بوسیدہ دفتی کھٹ سے گر پڑی اور یہ اسٹامپ پیپر برآمد ہوتے نواب بیگم والے جو پیش خدمت ہیں —— جب سے یہ لوگ سرگرداں ہیں کہ نواب بائی کے وارثوں کو تلاش کریں۔ انکی حویلی پر قبضہ مخالفانہ ہو چکا تھا۔ اسمیں عرصے سے بندھنی کی چھپائی کا ایک کارخانہ قائم ہے۔ بہرحال تو یہ لوگ صبر کر کے بیٹھ رہے —— اب جو میں نے ریڈنگ روم میں اس رسالے کے ورق اُلٹے تو یہ تصویر مختصر کیپیو کی صورت میں اس کے اندر موجود مع اس CAPTION کے —— ملاحظہ کیجئے —— ہر ہائی نس دی نواب بیگم صاحبہ آف پردھان پور —— میں فوراً کنوڑیا اینڈ سنز کے ہاں جوہری بازار پہونچا۔"

"وکیل صاحب بھاگے ہوتے آئے بولے سیٹھ جی جیت لی بازی —— نواب بائی

گئیں ـــــ اجی وکیل صاحب کیسے مل گئیں ۱۹۱۲ء میں چونتیس۳۴ سال کی تھیں تو یا ایک سو چار۱۰۴ سالہ بڑھیا کوڑے جھپی تھی؟ انہوں نے پتریکا دکھلائی۔ بولے یا جو یہاں سے بھاگی سو اس نے سی۔ پی کی کسی ریاست پر دھان پور کے نواب سے بیاہ کرلیا۔ نواب یا بات صاپھ ہوگئی۔ نواب سے بیاہ رچانے کے بعد پردے میں بیٹھ گئی ہوگی ہر ہائی نس بیگم صاحبہ بن کے۔ اب واکو پتو کیسے چلے پھیر مر گئی ہوگی ـــ اس پتریکا سے جان پڑا کہ اُس کی پوتی ـــ ماپھ کرنا ـــــ انکی پوتی مہان لیکھکا ہیں ـــ وِچیتر اُپنیاس لکھتی ہیں ـــ پھلاں پھلان دیوس کو لکھنؤ میں انکے پچاسویں اپنیاس کا ادگھاٹن ہونے جا رہا ہے۔ انکے بھائی بڑے بھاری پونجی پتی ہیں ـــ وکیل صاحب بولے ـــــ چلو سیٹھ جی یہ پھوٹو پھریم کرواکے لکھنؤ لے چلیں۔ انکو پرتیجنٹ کرینگے ـــ ایک ہجار روپیہ ہم نے لگایا۔ نیا پھریم۔ جے پور سے لکھنؤ لاریل کا بھاڑا۔ یہاں ہوٹل کا کھرچا سو الگ۔ اب آپ انصاپھ کرو۔ آپ سب شریمان جی کماری جی۔ ۱۹۱۲ سنہ سے لیکر آج تلک آپکی دادی جی کے کارن ہم گھاٹے ہی گھاٹے میں رہے ہیں کہ نہیں؟ پھر آج سب کے سامنے مار بھی کھائی۔ قصور تھارو دادی جی کا چھوکہ مہارو؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ منصور بھی مسکراہٹ ضبط کرکے مصنوعی چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دونوں بھائی غصے سے لال پیلے بیٹھے کھولا کیے۔

"تو اب آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

مسٹر شرف الدین بولے ـــــ "صاحب آپ لندن میں بار ایٹ لا پریکٹس کرتے ہیں (میں زیرلب مسکرایا۔ منصور نے بھی سر اٹھا کر چھت کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اب یہ اچھا خاصہ FARCE ہو رہا تھا) میں ٹھہرا محض جے پور کا ایڈوکیٹ۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہونگے کہ اس معاملے کے قانونی پہلو کے علاوہ ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔"

"نواب بائی کا اخلاقیات سے کیا تعلق تھا ـــــ؟" میں نے سوال کیا۔

"نواب بائی کے پوتے پوتیوں کا تو ہے۔ اصل رقم مع سود در سود ستر سال میں کتنی بنتی ہے؟ وہ کمپیوٹر بتا دیگا۔ مگر اخلاقی طور پر ——"

اب دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے بھائی نے پتے کی طرح لرزتے ہوئے گرج کر کہا۔ "آپ سب کان کھول کر سُن لیجئے —— یہ سارا قصّہ جو رسالے میں چھپا ہے شروع سے آخیر تک سراسر سفید جھوٹ اور میری مخبوط الحواس بہنوں کے فالتو زرخیز تخیّل کی پیداوار بکواس ہے غور سے سُن لیجئے۔ ہم کسی نواب پردھان پور کی اولاد نہیں ہیں۔ اس نام کی کوئی ریاست موجود نہیں تھی۔ نہ کسی نواب بائی نے کسی نواب پردھان پور سے شادی کی تھی۔ یا اگر کوئی پردھان پور ہندوستان کے نقشے پر موجود تھا یا ہے تو ہم اس سے واقف نہیں۔ ہم معمولی مڈل کلاس شریف لوگ جھانسی سے یہاں آئے۔ بزنس شروع کی اس میں فائدہ ہوا۔ ہماری عزیز بہنوں کو ارسٹوکریٹ کہلانے کا شوق چرّایا۔ نام کیساتھ صاحبزادی لکھنا شروع کیا۔ یہاں اونچے طبقے کے نئے حلقۂ احباب میں مشہور کیا کہ ہم بڑے زمیندار تھے۔ جاگیروں کی ضبطی کے بعد یہاں آ گئے۔ میں خاموش رہا رئیس زادی بننا چاہتی ہیں۔ اونچے وثیقہ داروں اور سابق تعلقداروں کے اس سوشل فریم ورک میں شامل ہونا چاہتی ہیں —— ٹھیک ہے۔ اگر وہ اس فرضی جاگیرداری کے پس منظر کو مبہم رکھتیں تو خیریت رہتی۔ ہم تینوں بھائی اپنی بزنس میں حد سے زیادہ مصروف۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان گدھیوں نے کیا کھچڑی پکائی۔ خیالی پلاؤ دم کئے۔ خاص نمبر چھپنے لگا تو کیا ہوائی قلعے بناتے۔ کیوں ری شہوار —— شیخ چلّی کی بچی۔ یہ تصویر کہاں سے آئی؟ اس کا یہ قصّہ کیوں گھڑا؟ ایک جھانپڑ دونگا۔ طبیعت صاف ہو جائیگی ساری دنیا کے سامنے میرے چہرے پہ کالک پوت دی۔"

شہوار تھر تھر کانپ رہی تھی۔ گلا خشک۔ رنگ فق۔ بولی "بھیا میں اور بجیا پچھلے دنوں ڈیکوریشن کیلئے CURIOS خریدنے نخّاس گئے تھے —— یہ کیمو نظر پڑا تو اُٹھوا دینے

ہیں خرید لیا۔ اس کے پیچھے صرف "نواب بیگم لکھا تھا۔ تفر بحاً اسے "ہرہائی نس دی نواب بیگم ——"

"پردھان پور کیسے خیال شریف میں آیا ؟"

"ڈاکٹر منصور نے کسی صاحبزادہ دلشاد علی اف دھان پور کا تذکرہ کیا تھا ——"

"جنکو آپ نے اپنا کزن ظاہر کیا ——" شہوار نے چونک کر مجھے دیکھا مزید سٹی گم۔ ذرا الکنت سے کہا "بس میں نے دھان پور کے وزن پہ پردھان پور —— ایجاد کر لیا۔ رسالے والے آئے تو انٹرویو میں بالکل ON THE SPUR OF THE MOMENT سی۔ پی کے جنگلوں میں چھپا پردھان پور بہلیں۔"

"کیوں —؟" بڑے بھیا دہاڑے۔

"JUST FOR THE HECK OF IT میں نے سوچا مدھیہ پردیش ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے گھنے جنگلوں سے پُر۔ آزادی سے قبل وہاں سینکڑوں چھوٹی چھوٹی ریاستیں رجواڑے تھے کون تحقیق کرنے جائیگا۔ علاوہ ازیں ——"

ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ گویا کٹہرے میں کھڑی ملزمہ کا بیان جاری رہا ——

"علاوہ ازیں میں نے سوچا نخاس میں یہ تصویر بکنے آئی ہوگی کم از کم دو سو سال پرانی کسی مغل شہزادی کی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ نواب بیگم اتنی RECENT تھیں اور طوائف تھیں۔ میں تو اُسے ایک فرضی کیمیو سمجھی تھی۔ بلکہ میں نے دوکاندار سے پوچھا بھی کس کی تصویر ہے۔ بولا معلوم نہیں۔ پرانے زمانے کی کسی بیگم کی ہے ——"

"لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام ——" میں نے کہا۔

اب ڈاکٹر منصور کی باری تھی۔ انہوں نے شہوار کو مخاطب کیا "سب سے پہلے جب میں نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ یہ تصویر آپکے پاس کہاں سے آئی تو آپ نے بڑی بے پروائی سے کہا —— آئی کہاں سے ہماری دادی جان کی تصویر ہے۔"

"وہ بھی میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا اس کا مقدمہ کھڑا ہو جائیگا۔"

"جتنی بے عزتی اور بدنامی ہونی تھی وہ تو ہو گئی۔ کل یہ خبر سارے اخباروں میں ہو گی خاص طور پر اردو اخباروں میں۔ مع ان مارواڑی حضرات کے سُود در سود کے قصّے کے۔ العظمتہ اللہ ——" بڑے بھیّا نے ماتھے پر ہاتھ رکھکر سر جُھکا لیا۔

"اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے" چھوٹے بھائی نے (جو ابتک سر نہوڑائے فرش کو تاک رہا تھا) دریافت کیا۔ "اگر ہم پریس میں یہ بیان دیتے ہیں کہ سارا قصّہ جھوٹا ہے یہ لوگ ہمیں بلیک میل کرنے آئے تھے ——"

"رام دہائی —— رام دہائی —— ہم بلیک میل —— ؟ بابو ہم انصاپھ مانگنے آئے تھے۔" بوڑھے مارواڑی نے لجاجت سے ہاتھ جوڑ کر احتجاج کیا ——

چھوٹے بھیّا نے بات جاری رکھی —— "تو یہ معاملہ اتنا شفاف ہے اور فُول پرُوف کہ اسے کوئی جھوٹ مانے گا نہیں۔ اور ایک بار نواب بائی کی کہانی عام ہوئی تو جس طرح یہ سیٹھ صاحبان انکے واقف نکل آئے۔ اسی طرح چند اور بُڈّھے ٹھڈّے نواب ٹائپ لوگ ریٹائرڈ عیّاش تماشبین یا سنگیت کے رسیا اپنی اپنی عمر رفتہ کو آواز دینگے اخباروں میں انکے خط چھپیں گے —— فلاں سنہ میں —— فلاں مجرے میں نواب بیگم سے قدر پیا کی ایک ٹھمری جیسی سُنی تھی پھر کبھی نہ سُنی —— چنانچہ ایک بیک گراؤنڈ حاصل کرنے کے چکر میں میری خواہر ان عزیز نے ہم نجیب الطرفین لوگوں کو دلالطوائف بنا دیا۔ شاباش —— اجس لیڈی ڈاکٹر سے میں شادی کرنا چاہتا تھا میری بہنیں اسکو کنجنی کی جنی کہتی تھیں۔ خود اپنے ہاتھوں طوائف زادی بن گئیں۔"

دریچے کے باہر ایک سایہ سا ڈولا۔ ایک آدمی شیشے سے ناک چپکائے جھانک رہا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ شکل صاف نظر نہیں آرہی تھی۔

ڈاکٹر منصور نے قہقہہ لگایا اور بے رحم آواز میں بولے:

"گمنام نواب کا اسٹیج کے ونگ میں داخلہ!"

"یہ کون صاحب ؟ اللہ رحم کرے ـــ" بڑے بھائی نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔
"آپکی باجی جان نے" ڈاکٹر جوشیلی غضبناک آواز میں گرجا ـــ "انکا نادر موروثی کتب خانہ ـــ کوڑیوں کے مول خریدا۔ انکا واقعہ بھی سنیئے گا ؟" اٹھ کر کمرے کا ایک چکر کاٹا۔ مصنوعی پرندوں کی چہکار کا سوئچ بند کر کے فوارے کے قریب گیا۔ پلٹ کر بولا۔
"صاحبان ـــ پچھلے سال کا ماجرا ہے ـــ ایک ثقہ، افلاس زدہ غیور بزرگ سے بیلی گارڈ کے باغ میں ملاقات ہوئی۔" میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر بھی ہم سب کی طرح زندگی کے تھیٹر کا دلدادہ ہے۔ اسوقت وہ خود اسٹیج کے سنٹر میں موجود تھا اور ایک FIGURE OF TRAGEDY کو متعارف کر رہا تھا۔ "وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں غیرت کی وجہ سے اپنا نام پتہ نہیں بتلایا۔ گذشتہ لکھنؤ کے بارے میں عالمانہ گفتگو کیا کیے۔ پھر اپنی راہ لی۔"
ڈاکٹر اب بیحد مضطرب تھا۔ مجھ سے پوچھا" وہ ـــ کیا ہے یاد ہے آپکو آمنتُ باللہِ ـــ وہ اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لانے والی بات ـــ ؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اپنے اضطرابی کیفیت کی وجہ سے کاشغری کو یاد نہ رہا تھا کہ دین اسلام سے متعلق یہ سوال مجھ سے نہ کرنا چاہیئے۔
کیونکہ میں اسوقت "چودھری دھیان سنگھ" تھا

اسے دفعتاً دھیان آگیا۔ بولا" سوری ـــ ! بہر حال۔ کہنے کے مطلب یہ کہ میں انسانوں کی اچھی اور بری تقدیر کا قائل ہو چکا ہوں۔ کسطرح ـــ ؟ سماعت فرمائیے اس روز سیاسی اور ادبی بحث مباحثے کی رو میں میں نے نواب صاحب کو اپنا نام محض مرزا منصور احمد بتایا۔ ڈاکٹر بیگ بھی میرے ساتھ موجود تھیں۔ لیکن اس بدقسمت شخص کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ دو ڈاکٹروں سے ہمکلام ہیں۔ ورنہ یقیناً اپنے لڑکے کی علالت کا ذکر کرتے اور ہم لوگ فوراً اسے اپنے نرسنگ ہوم لیجاتے۔

"بیلی گارڈ کی اس ملاقات کے بعد اگلے ہفتے ہی وہ آپکے دولت کدے پر تشریف لائے"
"میں بھی اسیوقت یہاں پہنچا تھا — آپکے دربان نے اندر آکر اطلاع دی کہ وہ کتابوں والے بڑے میاں آئے بیٹھے ہیں۔ انکا لڑکا بہت بیمار ہے کچھ پیسے چاہئیں۔ میں نے پوچھا کون ہے؟ انسان دوست ناولسٹ نگار خانم نے فرمایا ایک جلد ساز ہے — قدیم مخطوطات کی جلد بندی اس سے کروائی ہے۔ میں فوراً اٹھ کر باہر جانا چاہتا تھا کہ لڑکا اگر زیادہ بیمار ہے ماشاءاللہ میں اسکے مفت علاج معالجے کا بندوبست کر دوں۔ نگار باجی نے زبردستی روک لیا۔"
"کیا یہ بھی امر تقدیری تھا؟ نگار خانم کی ممانعت کے باوجود آپ بآسانی یہ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے برساتی تک پہنچ سکتے تھے —" میں نے کہا۔

منصور کاشغری نے اپنا بیان جاری رکھا: "ابھی گذشتہ منگل میں کسی کام سے بلرام پور ہسپتال گیا۔ وہاں پھاٹک پر نواب صاحب مل گئے۔ حزن و یاس کی تصویر۔ زبان گنگ۔ چند سکنڈ تک مجھے دیکھا کئے پھر پہچان کر بولے۔ "مرزا صاحب میرے جوان بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اسکے بیڈ کے آگے اسکرین لگا دی گئی ہے۔ صبح سے میں تجہیز و تکفین کے انتظام کے لیے سرگرداں ہوں۔ تب انھوں نے سارا قصہ سنایا۔ والد کی عیاشی کی بدولت انکا گھر تباہ ہو چکا۔ وثیقے کی رقم گھٹتے گھٹتے قلیل رہ گئی۔ اکلوتا لڑکا آوارہ نکل گیا تھا۔ سگھڑ بیٹیاں چکن کاڑھ کر گھر چلا رہی تھیں۔ کسی ذریعے سے انکو پتہ چلا کہ نگار خانم قیمتی کتابیں خرید رہی ہیں۔ پشتینی کتب خانہ ابھی انکے پاس موجود تھا۔ لیکن اب نواب صاحب کو لڑکیوں کے بیاہ کرنے تھے۔ تاریخیں طے ہو چکی تھیں۔ لیکن پیسہ —؟ پیسہ کہاں تھا؟ چنانچہ ان بیش بہا کتابوں کو دو گٹھڑوں میں باندھ کر اس عشرتکدے پر پہنچے۔ انھوں نے جو چند قلمی نسخوں کے نام بتائے میں دنگ رہ گیا۔ ایک ایک نسخہ حاصل کرنے کے لیے برٹش میوزیم یا امریکہ والے پاؤنڈز اور ڈالرز کے دریا بہا دیتے۔ نگار خانم نے پورا اسٹاک صرف دس ہزار روپے میں اسطرح خریدا گویا نواب صاحب پر احسان کر رہی ہوں۔

"مزید سنیے۔ اس قسمت کے ہیٹے انسان کے لکھے ہوئے سارے تنقیدی مضامین بھی انہی پلندوں میں چلے گئے ہماری نگار باجی اب انہیں اپنے نام سے چھپوا رہی ہیں۔

" لڑکیوں کو رخصت کرنے کے بعد نواب صاحب پھر کھکھ ہو گئے۔ لڑکا بیمار پڑا۔ ڈاکٹروں نے کہا اسکی کڈنی بدلوائیے"۔

"کڈنی کیا ——— گردہ ——— ؟" نگار خانم کے سوالات لاجواب ہوتے ہیں۔

"جی"۔

" اب مجھے کیا معلوم کیسے گردہ بدلوانا ہے کسے کلیجی۔ وہ بڑے میاں تو جب بھی آئے میں نے ہمیشہ تنوپچانش ———"

"جی۔ ان جیسا خوددار آدمی بیٹے کی بیماری سے مجبور ہو کر بار بار یہاں آیا کہ وہ ذخیرہ ایک حاجتمند سے آپ نے اتنا سستا خریدا اب کچھ اور رقم بطور قیمت ہی عنایت کریں۔ یا کم از کم لڑکے کے علاج کا انتظام کروا دیں۔ جب کہ آپ کے ہاں ایک ڈنر پارٹی پر ایک شام میں ہزاروں روپیہ ———"

"تو صاحب یہ تو کمیونسٹوں والی تقریر کرنے لگے ——— ہماری ڈنر پارٹیوں میں تو آپ بھی شامل ہوتے ہیں آپ کون سی پارٹی میں ہیں۔ سی۔ پی۔ ایم یا سی۔ پی۔ آئی ——— ؟" نگار خانم نے ہنس کر دریافت کیا۔

"خاموش"۔ بڑے بھیا گرجے۔

"نواب صاحب نے یہ بھی بتلایا کہ آپ نے انکو خبردار کر رکھا ہے۔ موروثی کتب خانے کے اس لین دین کا راز افشا کیا نہیں اور یہ تنوپچانش بھی القط ———"

خاموشی۔

یکلخت نگار خانم کی رعونت واپس آگئی۔ انہوں نے پانی پیتے ہوتے کہا " دیکھیے جناب۔ آپ کا خیال ہے یہ سب ٹٹ پونجیے مل کر مجھے پرسیکیوٹ کریں گے یا بلیک میل ——— تو آپ غلطی پر ہیں"۔

"اب چونکہ نواب جان منظرِ عام پہ آچکی ہیں یہ نواب صاحب بھی کسی اردو اخبار میں محض ایک خط چھپوا سکتے ہیں ان تنقیدی مضامین کے متعلق ـــــ اور کتب خانہ تو ظاہر ہے انکا بھی ٹرمپ کارڈ ـــــ اگر وہ چاہیں ـــــ" میں نے کہا۔ "ٹرمپ کارڈ" پر دونوں بہنیں تقریباً اچھل پڑیں۔ پھر نگار خانم نے حواس مجتمع کر کے بڑے بھائی کو مخاطب کیا۔

"بھیّا مجھے بھی بولنے دو۔ یہ ساری اسکیم سوچی سمجھی میرے دشمنوں کی ہے۔ وہ RIVAL ناولسٹ فرح خانم ـــــ"

"فرح خانم تو دراصل مرد ہے۔" چھوٹے بھائی نے جواب دیا ـــــ "اسکا اصل نام لچھّی رام چوپڑہ ہے۔"

"جبھی تو ـــــ اسکی بزنس چوپٹ ہوگئی میرے ناول گرم کیک کی طرح بک رہے ہیں۔"

"مگر فرح خانم تو جاسوسی لکھتا ہے۔ تم رومانی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کوئی فرق نہیں البتہ ـــ کوئی فرق نہیں البتہ ـــ" دریچے کے باہر سے آواز آئی وہ گمنام نواب صاحب نہیں تھے۔ کلاونت دیوانہ تھا جو بیڑیوں سمیت شاگرد پیشے سے نکل بھاگا تھا۔ کیونکہ بار بار انہیں گھنگرو کی طرح بجا رہا تھا گویا اپنی کمنٹری شروع کر چکا تھا۔

"سردست لچھّی رام چوپڑہ ہمارا مسئلہ نہیں ـــــ سوال یہ ہے کہ اب پبلک کو کیا منہ دکھائیں۔ اگر نواب بائی کی کہانی کی تردید نہیں کرتے تو اپنی نجابت اپنے ہاتھوں برباد کی کنجنی کی اولاد کہلائے۔ بروزِ حشر اپنے بزرگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"اماں روزِ حشر تو دور کی بات ہے۔ تم اپنے بزرگوں کو سردست کیا منہ دکھا رہے ہو ـــــ تمہاری آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور گلابی ہوگئی ہیں۔ سر پر نوکیلے کان اُگ آئے ہیں۔ اور چہروں پر تھوتھنیاں اور پیچھے مڑی ہوئی دُمیں۔ یہ آئینہ دیکھو ـــــ" سبز پوش

نے زور سے کھڑکی کا پٹ کھول دیا جس کے پلیٹ گلاس میں کمرے کا منظر منعکس ہو گیا۔ اس نے اس ہولناک انداز میں یہ بات کہی کہ گو اس نے مجھے مخاطب نہ کیا تھا، گھبرا کر غیر ارادی طور پر میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ خیر نورِ ماتم تو ہمیشہ ہی پیار سے مجھے "سُور" پکارتی ہو۔

میں اٹھ کر دریچے میں گیا۔ وہ نیچے گملوں میں کھڑا بڑی معصوم سی ہنسی ہنس رہا تھا۔ اسوقت وہ بالکل نارمل تھا۔ بشرے سے نہایت صحیح الدماغ دکھلائی پڑتا تھا — اپنے غیض و غضب پر قابو پا چکا تھا۔ اور شیکسپیر کے PUCK کی طرح کمرے کے اندرونی منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اچک کر دریچے کے اندر سر ڈالا نگار کے بھائیوں کی جانب اشارہ کر کے ایک انگلش نرسری رائیم بچوں کے انداز میں سنانے لگا

THESE LITTLE PIGS WENT TO MARKET

THIS LITTLE PIG STAYED HOME — پھر اپنی طرف اشارہ

THIS LITTLE PIG HAD ROAST BEEF,

THIS LITTLE PIG HAD NONE
AND THIS LITTLE PIG CRIED
WEE-WEE-WEE-WEE-WEE
I CAN'T FIND MY WAY HOME

سر باہر کر لیا۔

میں اپنی کرسی پر واپس آیا۔

بوڑھے مارواڑی نے آہستہ سے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔ "رام بھجو — رام بھجو — یاما ملو بڑے جبر معلو دیپڑے۔ بیٹیا یا گھر تو بھانے اندر جال ساما لوم پڑے۔ یا پاگل یا میں سے نکل بھاگا چھے —"

تعجب کی بات یہ تھی کہ کسی بہن بھائی نے اُٹھ کر نہ کھڑکی بند کی نہ اسے دوبارہ پکڑنے کے لیے آدمی بلاتے۔ ایسا لگتا تھا کہ شام کے ان تابڑ توڑ سانحات سے انکے ہاتھ پاؤں بھول گئے تھے۔

پاگل کو نظر انداز کر کے چند منٹ کے سکوت کے بعد بڑے بھائی نے پھر اپنی دردناک گفتگو کا آغاز کیا — "اور اگر ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ریاست پر دھان پور من گھڑت ہے تو غور فرمایئے ہم لوگ کسقدر کُترے، واہیات اور ناقابل اعتبار معلوم ہونگے —— یعنی ایسے لوگ جنھوں نے حصول دولت کے بعد اپنے لئے ایک فرضی نوابی ابجا دکی فرضی تصویریں چھپوائیں۔ ایک فرضی پیلس —— "

"اور موروثی کتب خانہ — " ڈاکٹر منصور نے لقمہ دیا۔

دونوں بھائیوں نے سر جھکا لیا۔ بہنوں نے شعلہ بار نگاہوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ اگر ان شعلوں میں اثر ہوتا ڈاکٹر وہیں بھسم ہو جاتا۔

میں نے تپائی پہ رکھا میوزیکل سگریٹ باکس کھولا۔ AULD LANG SYNE کی دُھن بجنے لگی۔ باہر کھڑے "دیوانے" نے فوراً بڑی دلدوز آواز میں دُھن کے ساتھ

SHOULD AULD ACQUAINTANCE BE

FORGOT AND NEVER BROUGHT TO MIND

الاپنا شروع کر دیا۔ میں نے سگریٹ باکس کا پٹ بند کیا۔ ادھر جھٹ سے وہ بھی خاموش۔ کتھک۔ بھرت ناٹیم۔ پکا گانا۔ اسکاٹش گیت —— کیا صاحب کمال شخص تھا۔

نگار خانم کا چھوٹا بھائی بھنّا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "باجی سوچ کر کل تک جواب دیجئے پریس کو کیا بتلایا جائے؟ آپ نواب بائی کی پوتی ہیں یا پر دھان پور پیلس ہوائی قلعہ تھا؟"

"پھنس گئے —— خود ہی چوہے دان بنایا اسمیں گئے پھنس بیٹا" پراسرار سبز پوش نے نعرہ لگایا اور باغ کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ چند لمحوں بعد دور سے اسکا دوسرا نعرہ سنائی دیا — تن من دھن سب راکھ بھبو
لگ گئی آگ بھنبھور میں

"راکھ بھبو" اس نے اس جگر پاش انداز میں کھینچا کہ میں نے اپنے منہ اور حلق میں

بیت سی بھرتی محسوس کی۔ راکھ اور ریت راکھ اور ریت ـــــ میں نے سر جھٹک کر چاروں
طرف دیکھا۔ آبشار والا کمرہ اسیطرح جگمگا رہا تھا۔ ایک طرحدار مہری اس بانکپن اور ٹھسّے
سے کافی کی ٹرالی دھکیلتی اندر آرہی تھی گویا کنگ نصیرالدین حیدر والی دھنیا مہری کی
جانشین وہی ہو ـــ اہل ثروت کی زندگیوں کے تمام نشیب و فراز سے واقف۔

دوسری صبح اخباروں میں تو کچھ نہ نکلا۔ بطلیموس وغیرہ صاحبان نے اس کا انتظام
کرلیا ہوگا۔ مگر خصوصی نمبر والے اخبار کا مخالف روزنامہ اس اسکینڈل کو لے اڑا۔ سارے
شہر میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ آبشار والے کمرے کی میٹنگ کی اطلاع بھی باہر پہنچ گئی
ہے۔ اب پچھلے چند روز سے "گمشدہ تصویر کا راز" کے عنوان سے انگریزی اردو اور ہندی
پریس میں جستہ جستہ چھپنا شروع ہوگیا ہے۔ گو خاندان کا نام دینے سے احتراز کیا گیا ہے۔
یہ مقتدر لوگ ہیں۔ بڑے بھائی نیتا گیری بھی کر رہے ہیں۔ اس خبر سے انکی نیتا گیری کو سخت
دھکّا پہونچ سکتا ہے۔

چنانچہ پیاری نورماہ خانم میں نے پلان ملتوی کر دیا۔ میرے اندر بھی کوئی خوابیدہ
پرانی خاندانی شرافت نجابت وغیرہ جاگ اٹھی۔ سوچا یہ دونوں بھائی اس قدر شرمندہ
اور پریشان ہیں۔ آگ پر تیل چھڑکنے کی کیا ضرورت ہے۔

اس شام جب انکے اطاقِ آبشار سے ہوٹل لوٹا رات کو خواب میں دیکھتا ہوں نگار
خانم کے بڑے بھیا کہہ رہے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب مجھ سے پچاس ہزار پاونڈ بھی لے
لیجئے میں آپکی ایسکورٹ سروس کا ڈائریکٹر بھی بنا جاتا ہوں۔ آپکے اور نورماڈریک کیلئے
ایک پرائیویٹ یاٹ بھی خرید دونگا۔ بطور جہیز باجی کے حصّے کا روپیہ ایک سوئس بینک میں
منتقل کر دونگا۔ بس آپ اتنا کیجئے ان سے عقد فرما کر اپنے ہمراہ لے جائیے آپ سے اتنی
سی التجا ہے۔ وہ اس مارواڑی بُڈھے کی طرح ہاتھ جوڑے ایک ٹانگ پر میرے سامنے
کھڑے تھے۔ گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔

آج یہ خط بالآخر پوسٹ کرنے والا تھا کہ نورمن کا کارڈ ملا۔ اس نے صورت حال کو

بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے (تم کو بھی علم ہو چکا ہوگا) کہ وہ اور پری بیگم "بہ...
بہترین دوستوں کے" ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو گئے ہیں۔ پری بیگم ایک ستو تیندُ...
دوست کے PAD میں منتقل ہو چکی ہیں۔ لہٰذا وہ پچاس ہزار پاؤنڈ کی اسکیم غت ربود۔ یہ برا
اخلاقیات والے لوگ حصول زر کیلئے جدید ترین غیر اخلاقی تکنیک استعمال کرتے ہیں
مجھے تفصیلات معلوم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ مساجد بھی تعمیر کروا رہے ہیں اور سیاسی لیڈ...
بھی ہیں۔ یعنی جہانِ سوئم کے اعلیٰ کرپشن کی کلاسیکل تصویر۔ اور انکی طرح ان گنت ہند
مسلمان اس ملک میں پھل پھول رہے ہیں۔ انکے معاملات کے مقابلے میں میری
کارڈ شارپنگ اور دھوکہ دہی تو بچوں کا کھیل ہے۔

ہاں تو حصول زر کیلئے غیر اخلاقی کارروائیاں جائز سمجھتے ہیں مگر اپنی خواتین ...
سلسلے میں قدامت پسند ہیں۔ پری بیگم کو ایک امریکن اسکول میں پڑھایا مگر اس کے مو...
طرز حیات سے انکو شدید صدمہ پہونچیگا۔

یہ لوگ نگار شہوار حماقت کی وجہ سے ایکسپوز ہو گئے محض سوشل سطح پر گو سب...
کی حد تک۔ انکی ایمپائیر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ ہائی فائی بنیس ان باتوں سے
ماورا ہے۔

انکے اس واقعے کو تم ایک قسم کی جدید اخلاقی حکایت سمجھو یعنی MODERN PARABLE جس طرح میں اپنے نیک نہاد خاندان میں ایک کالی بھیڑ نکل گیا۔ اور نصیح...
آموز ثابت ہوا۔

پری خانم کے متعلق ابھی یہ لاعلم ہیں اور جب جانیں گے تو انکے سامنے بھی
سوال کھڑا ہوگا کہ لڑکیوں کو کس حد تک۔ آزادی دینی چاہیئے مشرق و مغرب کا ابن الو...
تو ہمارے ہاں دو سو سال سے جاری ہے اس میں اب مغرب کو کس حد تک غا...
آنے دیا جاتے بہت ممکن ہے شہوار اور پری بیگم کے واقعات کے شدید ردِ عمل کے
پر یہ تینوں بھائی اسلامی بنیاد پرست بن جائیں۔ داڑھیاں رکھ لیں اور تبلیغی جماع...

شامل ہو جائیں EXTREME SITUATIONS کے ردِّعمل اتنے ہی شدید ہوتے ہیں۔
مگر سوال یہ ہے کہ پری بیگم ہندوستان کے نئے دولتمند طبقے کے نوجوانوں کی "ڈسکو کلچر"
پر وردہ تھی۔ لندن پہونچکر اگر وہ PERMISSIVE سوسائٹی میں شامل ہو گئی تو اُسے کیوں
ور دار ٹھیرایا جائے؟ اخلاقیات کی اقدار ہر عہد اور ہر طبقے کی اور فرداً فرداً مختلف
تی جاتی ہیں۔ تمہارے پاپا نے تم بہنوں کو آرام دہ زندگی اور دولت کی خاطر
آبی بی بنانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا حالانکہ تم بتاتی ہو کہ عادی مجرم نہیں تھے۔ پابندی
ے چرچ بھی جاتے تھے۔

اب میں بھی اپنے بناتے ہوتے ایک چوہے دان میں پھنس گیا ہوں۔ جیسے وہ پاگل
ں رات نیکار رہا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ نگار خانم تمہارے اس دیرینہ خادم کی گرویدہ ہو چکی
ں۔ آبشار والے کمرے میں انکشافات کی اس خوفناک رات وہ بھی تاڑ گئیں تھیں کہ
ہ وہی شخص ہے جس نے انکو وہ ایک قسم کا محبت نامہ ارسال کیا تھا۔ دراصل یہاں
کر پچھلے چند روز میں میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس بے چاری خشک مزاج عورت سے
ک کسی خدا کے بندے نے فلرٹ تک نہیں کیا۔ میں پہلا شخص ہوں جس نے انکو یہ احساس
یا کہ انہیں بھی پسند کیا جا سکتا ہے —— نہایت مشتبہ قسم کی ادبی حیثیت۔ بے تحاشا
ت۔ معمولی شکل و صورت۔ خوشامدیوں کا ہجوم۔ جو سب انکو بیوقوف بنانا چاہتے ہیں اور
جانتی ہیں کہ لوگ انکو بیوقوف بنا رہے ہیں۔ سب ایک سے ایک چوپٹ قسم کے بطلیموس
انتوس ٹائیپ لوگ۔ نواب بیگم کے غیر متوقع DISASTER سے پہلے تک بھائیوں کو اطمنان
ناول نویسی کے بے ضرر مشغلے میں مصروف ہیں۔ ورنہ سوشل ورک یا نیتا گیری شروع
اور انکے لئے شاید کچھ پرابلمز پیدا کرتیں۔

چنانچہ خاکسار جیسا کلرفل شخص کلارک گیبل کا ہم شکل، لندن سے وارد ہوتا ہے۔ بلیک
کی ایک اسکیم جیب میں ڈالے۔ ساتھ ہی بڑی شائستگی کیساتھ ان سے فلرٹ بھی کرتا ہے

اور وہ اپنے راہوارِ تخیّل کو جو ابتک اصطبل میں کھڑا گھاس کھا رہا تھا سرپٹ دوڑا دیتی ہیں
اب وہ طرح طرح سے چارہ ڈال رہی ہیں۔ کلارکس اودھ میں ابتک انکا مہمان ہوا
کل کہہ رہی تھیں۔ ایک سوئس بنک میں انکے بھائی انکے نمبر کا گمنام اکاؤنٹ کھول چکے ہیں۔
عبرت کجاست وبمنزلِ درائے جرین گریز۔ پس چہ باید کرد اقوام اناث۔ یعنی وہ ایک
جرائم پیشہ سے بھی شادی کرنے کیلئے تیار ہیں۔ (اس میں یہ رومانٹک نصب العین بھی مضمر ہے
کہ لیطورِ نیک پروین ایک بگڑے ہوئے رئیس زادے کی اصلاح کرینگی)۔
تم کو پکا یقین دلا دوں میرا قطعی کوئی ارادہ نگار خانم سے مناکحت کا نہیں ہے۔
اور تم اپنی پچیس ۲۵ سالہ بزنس پارٹنرشپ میں اس نوع کے متعدد مراحل سے گزر چکے ہیں اور ہمیشہ
نفع میں رہے۔

تمہارا دلشاد

پس نوشت

شہوار خانم SULK کر رہی ہیں کیونکہ ڈاکٹر منصور ڈاکٹر عنبر کی طرف پھر متوجہ ہو گئے۔ کل بتلا رہے
تھے عنبر آجکل شدید ڈپریشن میں مبتلا ہے۔ جو ایک قسم کی نفسیاتی بیماری ہے۔ کل انکی عیادت
کیلئے جاؤنگا۔ میں جلد واپس آنے والا ہوں ۱۹۸۳ء کا لکھنؤ کافی دیکھ لیا۔ شہر نگار — ہا ہا
آج صبح ہوٹل کے پھاٹک سے نکلا تو چند بھکمنگے اور انکے ساتھ دو بچے گلّا بونشا بو لیے فٹ پاتھ
پر اکڑوں بیٹھے دکھلائی دیے۔ مجھے بڑی پُر امید نظروں سے دیکھا۔ شاید صبح سے کوئی راہگیر
انکا بے بضاعت تماشہ دیکھنے کیلئے تیار نہ ہوا تھا۔ میں ٹھٹھک گیا تو دونوں کٹھ پتلیاں نچا
کر یکسانیت سے دہرانے لگے — چُنیاں لال ملوں گی — مُنیاں لال ملونگی — !!
غریب بچوں نے بھی مجھے اداس کیا — خدا حافظ!
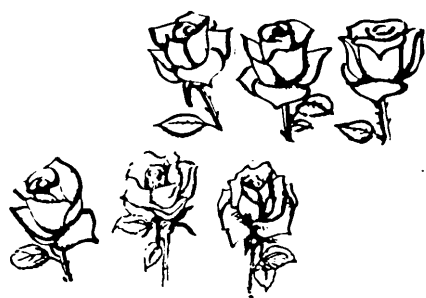
MASHA NURSING HOME
&
HEALTH CLUB

(۳۰)

ہیلتھ کلب

"کامریڈ لن یوُنانگ۔"

"بولو۔ شمامتہ العنبر۔۔۔"

"وہ چینی شاعر کیا کہہ گیا ہے کہ میں نے آدمیوں کی بستی میں گھر بنایا ہے؟ تو اسکا کوئی نام بھی تو ہونا چاہیئے۔"

"رکھ لو گلِ عندلیب۔ یا THINKER'S DEN ۔ امبرنیا۔ کدم کی چھاؤں۔ دریا نما۔"

"قطب نُما بھی ہوسکتا ہے۔ آیئے۔ آیئے تشریف لایئے۔۔۔"

"ڈاکٹر کھنّہ۔۔۔ ؟" ایک بیحد فربہ چُندیا بطخ نما خاتون نے اندر داخل ہوکر پوچھا۔

"جی وہ ابھی آتی ہونگی۔ تشریف رکھیے۔۔"

خاتون نے طشتریوں جیسی گول عینک پہن رکھی تھی جسکی وجہ انکی شکل پر الّو کی گول آنکھوں کی جھلک آگئی تھی۔

"میں نے کل فون پر ان سے اپوائنٹمینٹ لیا تھا۔ میں کلکتے سے آئی ہوں ۔۔۔ مسز ہیری مایا بھٹناگر۔"

"ہاؤ ڈو یو ڈو مسز بھٹناگر۔ تشریف رکھیے۔"

خاتون صوفے پر فروکش ہوئیں۔ "آپ ڈاکٹر کھنّہ کے مسٹر ہیں؟"

"نہیں صاحب۔ پارٹنر۔"

"یہ ۔۔۔ یہ آپکی مسز ہیں؟"

"نہیں صاحب۔ پارٹنر۔"

"اوہ—"

"ہاں بھئی۔ دریا نُما ہی ٹھیک رہے گا۔"

"اُلّو نُما—" عنبریں نے ونک کیا۔

"درست۔ لیکن دریا نُما رکھ لو۔ بمبئی میں بھی چوپاٹی پر ایک عمارت کا یہی نام ہے۔"

"وہاں دریا کہاں ہے؟"

"فارسی میں دریا سمندر کو کہتے ہیں۔ بمبئی کے عوام بھی سمندر کو دریا—"

"وہ ایسی مفرّس زبان بولتے ہیں؟"

"ہاں۔ اور معرّب۔ انڈے کو بیدا کہتے ہیں قلی کو حمال—"

"ہائے آپ لوگ کتنی اچھی ہندی بولتے ہیں! میں نے سنا تھا لکھنؤ والے بڑی اچھی ہندی بولتے ہیں۔" مسز بھٹناگر نے داد دی۔

"جی ہم لوگ اردو بول رہے ہیں۔" منصور نے جل کر جواب دیا۔ "اور اہل لکھنؤ اردو بولتے ہیں۔"

"اردو—؟ ہائے اردو تو میں بھی تھوڑی سمجھ لیتی ہوں۔ بڑی سُوئیٹ لینگوئج ہے۔ میرے تا ؤ جی تو کیول اردو ہی جانتے تھے۔ ہم لوگ عرصے سے کلکتے میں رہے ہیں لکھنؤ ہمارا پرانا وطن تھا۔ میں نے یہاں آکر آپ کے ہیلتھ کلب کی بڑی دھوم سُنی۔ فوراً پہنچ گئی— ڈاکٹر کھنہ شادی شدہ ہیں؟"

"جی نہیں۔" منصور نے جواب دیا۔

"آپ—؟"

"جی نہیں—"

"آپ—؟" عنبر سے سوال۔

"جی نہیں۔"

"میری طبیعت لکھنؤ آکر خراب ہوگئی۔ آب وہوا کی تبدیلی۔" فوراً خیال آیا کہ مستقل اردو بول رہی ہیں۔ سامنے پڑے ہوئے FEMINA پر نظر ڈال کر کہا—

"یہ ۔ بیگم حسُبن کتنے وِجینز لیکھ لکھنی ہے ۔ ہیلتھ اینڈ بیوٹی یہ اس پرکار کی سمسّیائیں یہ مہلا کو ٹربل کرتی ہیں SKIN وگیرہ کی —— آپ لوگ سب فارن میں رہ کر آئے ہیں نا ؟ کسی نے یہی سُوجھا دی ۔ آپ کے ہیلتھ کلب میں دُبلا ہونے کا کورس کتنے سپتاہ کا ہے ؟"

"ڈاکٹر کھنّہ اسکی انچارج ہیں وہی آکر بتلائیں گی ۔"

مسز بھٹناگر نے انگریزی اردو اور ہندی کے ہفتہ وار رسالوں کی ورق گردانی شروع کی ۔ جو "گمشدہ تصویر کا راز" ، "نواب بیگم کون تھی ——؟" "ایک معزز خاندان کو بلیک میل کرنے کی ناکام کوشش" قسم کے عنوانات سے پُر تھے ۔

"آجکل اس اسکنڈل کی ہر جگہ چرچا ہے" مسز بھٹناگر نے کہا ۔

عنبرین نے ناشتے دان کھولا ۔ "نوش فرمائیے ۔" منصور نے اخلاقاً ان کو مدعو کیا ۔

"آپ کھائیں ۔ میں تو اپنی CALORIES گنتی ہوں ۔"

وہ اٹھ کر باہر باغ میں چلی گئیں ۔

"ہر شاخ پہ اُلّو بیٹھا ہے اب رنگ گلستاں کیا ہوگا ——" منصور نے بشاشت سے کہا ۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے ۔ مجھے پھر ڈپریشن شروع ہوگیا ۔"

"کیوں ؟"

"اُلّو نما نے نواب بیگم کا تذکرہ جو چھیڑ دیا ۔"

"تم سے مطلب ؟ تم اپنے پرابلم خود CREATE کر رہی ہو ۔ بردونّے سسٹرز کیلئے ڈوب مرنے کا مقام ہے ۔ تم تو خوشی کے شادیانے بجاؤ ۔"

"یعنی اگر اسیطرح ساری دنیا کو معلوم ہو جائے کہ نواب بیگم میری نانی تھیں تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا ؟"

"AMBER—I DIDN'T MEAN THAT—FOR GOD'S SAKE."

منصور نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

مسز بھٹناگر باغ کا ایک چکر لگا کر واپس آئیں۔

"امّی نے آج کونسا دقیانوسی ٹفن باکس نکال کر بھیجا ہے" عنبر نے چڑ کر کہا۔
"— کلکتے کے زمانے کا —"
"یہ ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا
حاضری کھاتے کلکتہ تو لندن میں ٹفن"
منصور نے پھر انشاء کا ایک شعر پڑھا۔
مسز بھٹناگر غور سے سُن رہی تھیں۔ بولیں "ہائے۔ مجھے تو شاعری بہت پسند ہے۔ میرے تاؤجی بھی مشہور شاعر تھے۔"
"اچھا — ؟" منصور نے نیپکین نکالتے ہوئے پوچھا "کیا تخلص فرماتے تھے؟"
"احقر — رائے بہادر راما پرشاد —" وہ اطمینان سے کہتی رہیں۔ "جب میں نے یہ نواب بیگم کی فوٹو والی خبر پڑھی تو مجھے بڑا غصّہ آیا۔ اسی ویشیا کی لڑکی نے میری تائی جی کی جان لی تھی —"
عنبر میز پر سے چمچہ اٹھا رہی تھی۔ ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ ہیبت زدہ سی ہو کر اجنبی خاتون کو تکنے لگی۔ منصور نے گھبرا کر انکو دیکھا — ملاگیری ٹمپل [illegible]ی۔ کلائیوں میں پلیٹنم کے عیار سے مزیّن درجنوں چوڑیاں۔ کانوں میں سچّے موتی۔ گلے میں سچّے موتی۔ کوئی ڈھائی من کا وزن۔ اسوقت یہ قصہ چھیڑتے ہوئے وہ دنیا کی مسرور ترین اور مطمئن ترین ہستی معلوم ہو رہی تھیں۔ منصور کو نگار خانم کے منجھلے بھائی کی پیش گوئی یاد آئی جو اس نے اس رات آبشار والے کمرے میں کی تھی۔ کہ جب یہ داستان پریس میں آئیگی نواب بائی کے واقف کار کہاں کہاں کے کونوں کھدروں سے نکل آئیں گے۔

اس مُٹلی کو یہ کتھا شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ کاش میں نے اسکے تاؤجی کا تخلص نہ پوچھا ہوتا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

مسز ہری مایا بھٹنا گر نے اپنے بیگ میں سے سونف برآمد کی۔ ایک پھنکا لگایا اور گویا ہوئیں ـــــ "تاؤجی کلکتہ کے بڑے شوقین مزاج رہیس تھے۔ نواب بیگم ویشیا کی لڑکی بُلبُل انکی رکھیل تھی۔ دو تین سال انکے پاس رہی پھر انکو خوب لوٹ کر ایک محمڈن ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی ـــــ ڈاکٹر کھنہ کب تک آئیں گی ؟ میں چاہتی ہوں وہ مجھے جلدی سے REDUCE کر دیں آپکو پتہ ہے میرے کزن بردر کی لڑکی مس انڈیا کے FEMINA والے CONTEST میں جا رہی ہے مس ڈار جلنگ بن چکی ہے اور CAN YOU BELIEVE IT میں بھی اپنے کالج میں بیوٹی کوئین رہ چکی ہوں بس میرج کے بعد مٹاپا چڑھ گیا ـــــ وہ مس بُلبُل کا قصہ مجھے میری ماتاجی بتاتی ہیں۔ میرا تو جنم نہیں ہوا تھا اس سمے۔ تاؤجی نے بُلبُل کو بہت سر چڑھا رکھا تھا۔ اینگلو انڈین چھوکری۔ فراک پہن، ہیٹ لگا تاؤجی کے ساتھ موٹر پر ڈلاہَیتی جِکے کے چکر لگاتی۔ کبھی گریٹ ایسٹرن کبھی گھوڑ دوڑ ـــــ تاؤجی نے اسے ہیروں سے لاد دیا۔ ہماری تائی جی اسی عورت کی ڈاہ میں بیمار پڑ گئیں۔ ٹی۔ بی۔ ہو گئی۔ اگلے زمانے کی پتی ورتا ستی ساوتری ـــــ کیا کرتیں۔ گھُلتی رہیں ـــــ گھُلتی رہیں ـــــ"

مسز بھٹنا گر نے ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کے لیے آہ بھری۔ عنبر دم بخود بیٹھی تھی۔

"پھر صاحب۔ بھگوان کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ خود ہی اپنے محمڈن ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی۔ مگر ڈاکٹر صاحب ـــــ" انھوں نے چاروں طرف دیکھ کر آواز نیچی کی۔ گویا اب گہرا راز افشا کرنے والی ہوں ـــــ "ہماری ماتاجی بتاتی ہیں کہ تاؤجی کو معلوم ہو گیا تھا کہ کیا بات ہے کیا نہیں ہے ـــــ اس لیے انھوں نے بڑی خوشی سے خود ہی بُلبُل جان کا بیاہ کروا دیا تاکہ سنتان اس ٹیچر کی سمجھی جاوے ـــــ"

عنبر کا رنگ سفید پڑ گیا۔

منصور نے جرح کی۔ "معلوم کیسے ہو گیا تھا؟ کیا خود بُلبُل نے بتلایا تھا؟"
مسز بھٹناگر نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا حالانکہ کمرے میں ان تینوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا۔ آہستہ سے بولیں —"آپ دونوں ڈاکٹر ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا۔ بُلبُل کی ایک اُڑیہ مہترانی تھی — بھنگن — وہ ہماری تائی جی کی جاسوس تھی۔ وہ ٹالی گنج والے بنگلے سے آکر رتی رتی بات انھیں بتلا جاتی تھی۔ اسی نے تائی جی کو تبلا دیا تھا کہ کیا معاملہ ہے کیا نہیں۔"

عنبرین اچانک میز پر سر جُھکا کر آگے کو گر سی گئی۔ منصور نے لپک کر اسے سنبھالا۔ بولی "ڈونٹ وری۔ چکر آ گیا۔ مجھے بھی ہائی بلڈ پریشر ہو گیا ہے — جی مسز بھٹناگر۔ سوری — پھر کیا ہوا —؟"
منصور نے میز کے نیچے سے ہاتھ بڑھا کر اسکا سرد ہاتھ تھام لیا۔ مسز بھٹناگر بولتی رہیں —"بس جی۔ پھر بُلبُل نے اس مسلمان ٹیوٹر کے ساتھ میرج کر لی۔ پھر کیا ہوا کیا نہیں ہوا۔ جانے ہماری بلا۔ تائی جی البتہ اچھی نہ ہوئیں۔ مرگئیں ٹی۔ بی سے —" انھوں نے اس لہجے میں کہا گویا تائی جی کے مرنے سے انھیں بڑی طمانیت حاصل ہوئی۔
"چار پانچ سال بعد تاؤ جی بھی مر گئے۔ انھی کی تو یہ پوتی ہے جو مسّ دار جلنگ بنی تھی۔ بڑی بڑھیا کتھک ڈانسر ہے۔ فارن میں جاکر بھی ڈانس کرتی ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے نا۔ ہماری نانی جی پردے میں رہتی تھیں۔ انکی پوتی کتھک ناچتی ہے جو پہلے بُلبُل جیسی ویشیاؤں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا —
" اچھا جناب WOULD YOU BELIEVE IT — میں نے بھی کالج میں منی پوری ڈانس سیکھا تھا۔ میں اتنی پتلی تھی — ڈاکٹر کھنہ ابنک نہیں آئیں۔ وہ مجھے کتنے دنوں میں ریڈیوس کر دینگی؟"
عنبر سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی رہی۔
"ایک بات بتایئے ڈاکٹر صاحب"، مسز بھٹناگر نے سونف کی شیشی منصور کو پیش کرتے

ہوئے دریافت کیا۔"آپ محمڈن لوگ ہیں پردہ سسٹم اتنا زیادہ تھا اور اب بھی کافی ہے۔
یہ کیا بات ہے۔ــ ولیشیا ئیں بھی محمڈن ہی ہوتی تھیں ـــ"
باہر کار آ کر رکی۔
"جی ہاں۔ یہ نکتہ قابل غور ہے ـــ" منصور نے جواب دیا۔" لیجئے ڈاکٹر کھنہ آ گئیں۔
آئیے آپکو انکے دفتر تک پہنچا دوں ـــ"

مسز ہری مایا بھٹناگر کو نتارا دا کھنہ کے کمرے میں چھوڑ کر واپس آنے کے بعد منصور نے دیکھا کہ عنبر اسی طرح بُت بنی بیٹھی تھی۔ خالی خالی نظروں سے اسے تک کر عجیب سی آواز میں پوچھا ـــ "منصور ـــ میں کون ہوں ـــ ؟"
"وَٹ ڈیویہن تم کون ہو ـــ ؟"
"منصور اتی نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا ـــ ؟ وہ تو تمہاری شہوار خانم سے سَو گنا جھوٹی نکلیں۔ ساری عمر میں نے انکو اتنا کھرا اتنا سچا سمجھا تھا۔
I HATE HER I HATE HER I HATE HER ."
اس نے میز پر زور کا مکّہ مارا۔ گرجدار قہقہہ لگا کر چند منٹ بعد وہ آہستہ آہستہ الاپنے لگی۔

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

FALLING DOWN, FALLING DOWN,

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

FALLING DOWN, FALLING DOWN,

LONDON BRIDGE IS FALLING DOWN,

MY CROOKED LADY

ڈاکٹر منصور کاشغری سناٹے میں آ گیا ـــ ڈاکٹر عنبرین بیگ پر جنون کا دورہ پڑ گیا تھا۔

(۳۱)

جھاڑو تارا

"کہو بھئی ملک عنبر ــــ"

"ہاں بھئی ملک کافور۔"

"کیا حال تے چال ہے۔"

"بُرا۔"

"آوازیں ــــ؟"

"ہاں مسلسل۔ جیسے کان کے اندر ریڈیو بج رہا ہو ــــ اور چیزیں نظر آتی ہیں۔"

"نگار خانم کے شاگرد بیٹھے ہیں داخلے کی تم بھی کینڈی ڈیٹ ہو۔ خوب گذرے گی بابا سبز پوش کے ساتھ۔"

"بھلیٹ جوک۔"

"جون آف آرک کو بھی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔"

"بھلیٹ۔"

"تم سے اتنا کہا نور منزل ہو آؤ۔"

"گئی۔"

"انکے ہاں امریکہ سے ایک بڑا ٹوپ سائیکٹرسٹ ــــ"

"میں بھی کچھ کم توپ ڈاکٹر نہیں ہوں۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔"

"کہنے لگیں آپ کو اوورورک کا اسٹرین ہے۔ اور کچھ ایموشنل ڈسٹربنس ــــ"

"میں بھی یہی کہتا ہوں۔ تمہاری اپنی تشخیص کیا ہے؟"

"مجھے ہفت نظری کی نظر لگ گئی ہے۔"

"ہفت نظری کون بلا ہے؟"

"بلا ہی تو ہے ـــــ جسطرح گجر آبائی کی لڑکیوں نے نانی کے خلاف کلو ابیر کے ذریعے ـــــ تمہارے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تم متحیر نظر آرہے ہو۔ تم سوچ رہے ہو مجھ پر جنون کا دورہ پڑا۔ ہسٹریا کی اگلی اسٹیج پاگل پن ـــــ کیوں ـــــ؟ اجی چھپ چھپ کے مت دیکھو جی بھنور جی ـــ ہم کو نجر لگ جائیگی ـــــ"

"میں یہ سب نہیں سوچونگا۔ ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔"

"دیکھو جی کنور جی ـــ تم نے ابھی سے میرے ساتھ نرمی کا وہ برتاؤ شروع کر دیا جو ہم ڈاکٹر لوگ اعصابی اور ذہنی مریضوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ستو جی کنور جی ـــ کیوں ہنسے ـ؟"

"ٹھاکر دلشاد علی خاں یاد آگئے۔"

"وہ انٹرنیشنل کروک؟"

"دلچسپ آدمی ہے۔ کل جب میں تم کو فون کر رہا تھا کلا ارکس اودھ سے ـــــ"

"ملک ارجن منصور وہاں کیوں گیا تھا؟"

"صاحبزادہ دلشاد علی سے ملنے۔"

"وہ ابتک یہاں براجتے ہیں؟"

"جب میں نے وہاں سے تم کو فون کیا اور ملک عنبر کہہ کر تم سے بات شروع کی اور بعد ں انکو بتایا کہ تم کو کبھی ملک عنبر کہتا ہوں تم مجھے ملک کا فوراً ملک آرجن منصور یا کا شعری) مناسبت سے کوئی انٹ سنٹ جینی نام ـــــ اور اسکاٹلینڈ کی مناسبت سے تم کو کبھی لیڈی آف ابیرڈین پکارتا ہوں۔ تو راجہ دلشاد علی نے تو اس نکتے کو بہت اینجوائے کیا مگر رخانم نے سنجیدگی سے پوچھا ـــ کیوں اسکی کیا ضرورت ہے؟ میں نے جواب دیا کیونکہ لوگ بہت چوشیلے ہیں۔ پوچھا چو کیلے کیا؟"

"ہاہاہا۔ نگار رخانم وہاں راجہ دلشاد کے چکر میں آئی ہونگی۔"

ظاہر ہے۔ وہ انکے مہمان ہیں۔"

"بہت خوش تھیں؟"

"شاد کام۔"

"اور شہوار؟"

"ناشاد۔"

"کیوں —؟"

"اسلیے کہ اب میں انکے یہاں نہیں جاتا۔"

"جھوٹ تو رُجی — تم بھی مجھ سے جھوٹ بولتے ہو۔"

"کیسا جھوٹ۔ کیسا سچ۔ سب ہری کی مایا ہے!"

"ہری کی مایا — ہری کی — ہری مایا بھٹناگر —

YOU LOW-DOWN SWINE. TRYING TO HIT BELOW THE BELT—

GET THE HELL OUT OF HERE—DROP DEAD."

"منصور — منصور — حضرت سلیمانؑ کی عصا میں —"

"دیمک لگ گئی۔"

"کمال ہے۔"

"ہاں خاتون جستوئی۔"

"کیا اس دن میں بالکل BONKERS —؟"

"ہاں۔ تم اسی طرح CALMPOSE پر جُٹی رہیں تو اسکا اڈکشن ہو جائے گا۔ خطرنا

"منصور دراصل مجھے IDENTITY CRISIS ہو گیا ہے۔"

"تم اس کرائسس میں تنہا نہیں ہو HONEY — تھرڈ ورلڈ کے بہت

انٹلکچوئیلز اور رائیٹرز بھی IDENTITY—CRISIS—WALLAHS بن چکے ہیں۔"

" تم میری ہر بات ہنسی میں اڑا دیتے ہو۔ میرا مسئلہ اب یہ ہے کہ میں کون ہوں —
شکور حسین یا مس امبا پرشاد —— "
" تمہارا تو بہت محدود ذاتی مسئلہ ہے لیڈی آیمبر۔ سموچی قومیں آجکل IDENTITY
CRIS میں مبتلا ہیں۔ کہ انکے اندر امبا پرشاد نے کس حد تک سرایت کیا ہے
ر کس حد تک شکور حسین —— وہاں امبا پرشاد کو بالکل مسترد کردیا گیا ہے۔ یہاں
ت سے لوگ شکور حسین کو نظرانداز کرنا چاہتے ہیں۔ مزید برآں — تمہارا معاملہ اردو
ے بھی ملتا جلتا ہے۔"
" پھلیٹ جوک۔"
" اور تم اس گھپلے کو بالکل بھول جاؤ تو کیسا رہے —— بغیر کامپوز کھاتے۔"
" نصیحت کرنا آسان ہے —— اب بتاؤ موجودہ صورت حال میں میری اصل
SETTI کیا ہے ؟"
" سنو امبر ینا —— جب سے انسان غار سے نکلا ہے۔ ایکدوسرے سے مل جل کر رہی
ں اور تہذیبیں بنتی گئی ہیں۔"
" ہاں مگر کتنے خون خرابے اور نفرتوں کے ساتھ۔"
' جو ہوا سو ہوا۔ اب تم اسکے متعلق کچھ کر نہیں سکتیں۔ تم ماضی کو کسطرح بدل سکتی ہو ؟ "
" بھوت کال کے بھوت تو موجود ہیں۔"

' اگر تم کماری امبا پرشاد ہی ہو تو کیا حرج ہے ؟ لیکن اس صورت میں مسز ہری مایا
جیسی احمقوں کی کمانڈر انچیف یو۔ کے۔ پی کی فرسٹ کزن البتہ ثابت ہو گی۔ افسوس۔
امبا پرشاد۔ تو انکے بارے میں جو کچھ ابتک سنا مجھے تو نہایت بھلے آدمی معلوم ہوتے۔"
بکواس۔ ایک سے ایک نامعقول لوگوں کی ناجائز اولاد ہونا میری قسمت میں لکھا
ندرے رینال — نانا — ایک چالو BIRD OF PASSAGE — ایک بیوقوف
تقلب ڈانسنگ گرل کو چونا لگا کر غائب ہو گئے۔ نانی ایک ہارڈ بوائیلڈ نائیکہ۔ والد

محترم امبا پرشاد جنہیں اپنی اولاد سویکار کرنے کی ہمت نہ ہوئی ـــــ یا والدہ ایک نمبر کی
منافق ۔ دروغ گو۔"

"اب میں آپ کے اس غیر معمولی، اور دلچسپ شجرے کو مثبت طور پر پیش کرتا ہوں ـــ
نانا ایک DASHING مہم جو آرٹسٹ فوٹوگرافر ـــ نانی ماہر فن مطرب ، اور باکمال رقا
ما تنڈا اور ٹھمری ایکسپرٹ ـــــ والد رائے بہادر امبا پرشاد احقر ایک وضعدار ا
نیک طینت رئیس جنھوں نے اپنی طرف سے تمہاری بہتری کی کوشش کی یعنی تم کو ایک
مسلم تشخص دینے کی خاطر سید شکور حسین سے تمہاری والدہ کی شادی کروادی ـــــ
مسز بھٹناگر والی روایت صحیح ہے ـ مگر راوی ضعیف ہے ـ مجھے یقین ہے کہ اس اُڑ
مہترانی اور مسز بھٹناگر کی تائی جی اور ماتاجی اور دوسری بیوقوف عورتوں کی بنائی ہو
GOSSIP ۔ مسز بھٹناگر جس قسم کی ذہنیت کی نمائندہ تھیں انھوں نے جو طومار باندھ
اسے سچ ماننے میں مجھے تامل ہوگا ۔
"لہٰذا اب UNUS آیا مسٹر شکور حسین پر ۔ وہ البتہ نہایت چڑ قنات ثابت ہوئے
مگر اس میں بھی اللہ میاں کی مصلحت مضمر تھی ۔ تم انکے گھر کے گھٹے ہوئے ماحول سے
نکلیں ۔ بہترین تعلیم و تربیت ہوئی ۔ وغیرہ ۔"
"لیکن میں انکی جائز اولاد تو ہوتی ۔ انکی بیٹی کی حیثیت سے پلتی بڑھتی ۔"
"ایل ۔ ایم ۔ سی ماحول اور شدید پردہ ـــ سب منظور ہوتا ؟"
"بیشک ۔ اس IDENTITY CRISIS کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا ۔ یاد ہے ایک روز ا
جب گوہر جان کے اوصاف بیان کرکے کہنے لگیں کہ یہ اسکے یورپین خون کا اثر تھا ۔ و
میں نے کہا تھا شکر ہے میں نہ ہوئی کسی قسم کی MIXED BREED اس ایک MPLEX
سے تو بچی رہی ۔"
"جو حالات شکور حسین صاحب کے گھر کے تم نے بتائے ان میں تمہارا وہاں
کر بڑا ہونا ناممکن تھا ۔ چلو ہو گیا قصہ ختم ۔"

"تم ہی بتلاتے ہو شکور صاحب کا ماحول پاکستان جا کر بالکل بدل گیا۔کایا پلٹ "
"ہاں۔کولوٹولہ سے کراچی جم خانہ۔ ۱۹۴۷ء میں انکے رویّے انکے طبقے کے معاشی اور سماجی حالات نے تخلیق کیے تھے۔لاکھوں لوگوں کی طرح پاکستان میں رفتہ رفتہ انکی کلاس بدل گئی۔اپ ورڈلی موبائیل۔اسکے ساتھ انکے سوشل روّیے۔
"تمہاری ماں کو انہوں نے طلاق نہ دی ہوتی اور تم دونوں انکے ساتھ ڈھاکہ چلی گئی ہوتیں تو ڈاکٹر صاحب تمہاری زندگی کے تین مختلف منظر نامے ممکن تھے۔تم جنگ بنگلہ دیش میں ماری گئی ہوتیں۔یا ریفیوجی بنکر دوبارہ کلکتہ آتیں۔یا براہ نیپال کراچی پہنچتیں اور آج بہرحال وہاں کی چمکدار کنزیومر سوسائیٹی کی ایک SMUG رکن ہوتیں۔ آؤ گنج چل کر کافی پی آئیں۔چلو اٹھو—"

"نہیں۔امی نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ساری عمر جھوٹ بولتی رہیں۔وہ اُڑنبہ بھنگن بجی تھی۔تم مجھ سے ہمدردی کر رہے ہو— سُوَرجی — STOP BEING SO BLOODY PATRONISING— GET LOST YOU TWO—TIMING RASCAL

ورنہ جوتا کھینچ کر ماروں گی۔بدمعاش—
"فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔شہوار خانم نے بلایا ہوگا۔جاؤ۔بھاگ جاؤ۔
"شام مجھے گومتی پر چھاڑ دوتارا نظر آیا تھا۔مجھے معلوم تھا کوئی منحوس بات ہونے والی ہے"

"منصور بیٹا اسے پھر دلّی لے جاؤ۔آل انڈیا میڈیکل انسٹیٹیوٹ— سنو وہ لوگ— — وہ کہیں رانچی وانچی تو تجویز نہیں کر رہے؟ تمہاری بے چاری بدنما بہن جی اسکی طرح ہر جمعرات کو شاہ مینا صاحب جاتی ہیں۔ترویتی کے مندر جانے کو کہہ رہی ہیں وہاں منّت مان لی ہے۔"

"کیا حماقت ہے۔ میں نے پدّما کو سختی سے منع کر رکھا ہے مگر وہ باز نہیں آتیں
ہیں نا؟ مگر منصور بیٹے عنبر جیسی ہوشمند پڑھی AH—WOMEN!! SILLY GEESE !!"
لڑکی کا یہ حال کیوں ہوا؟"

"نروس بریک ڈاؤن پڑھے لکھے لوگوں ہی کا ہوتا ہے۔"

"مگر عنبر ہی کیوں؟"

"یہ مجھے بھی تعجب ہے۔ بحیثیت ڈاکٹر اسے اس جائز ناجائز اولاد کے چکر کو اتنی اہمیہ
نہیں دینی چاہیئے تھی۔"

"یہ بات میں سمجھ سکتی ہوں۔ اسوجہ سے اس نے ہمیشہ SUFFER کیا ہے جب
سے بڑی ہوئی اسے خیال رہا ہے اسکی جو UNFORTUNATE بیک گراؤنڈ ہے اسکی و
سے کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا۔ کلکتہ میڈیکل کالج میں ایک ہم جماعت سیّد زاد۔
نے پیغام بھجوایا۔ دونوں ایکدوسرے کو پسند کرتے تھے۔ صاحبِ جائیداد اعلیٰ خاندان
نیک لڑکا تھا۔ میں نے بیاہ کی تیاریاں کریں تاریخ طے ہونے سے ذرا قبل ان لوگوں ۔
منگنی توڑ دی۔

"میں نے چھپانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر ان لوگوں کو معلوم ہو گیا —— لڑکے کی والد
ٹرین میں پٹنہ سے کلکتہ واپس آ رہی تھیں ایک شناسا بیوی ہمسفر تھیں۔ ان سے ذکر کیا۔ فلاں
لڑکی سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ ڈاکٹری پڑھ رہی ہے دلّی کے مغل لوگ ہیں۔ ان پنجابی بیوی
نے ناک پہ انگلی رکھ کر جواب دیا۔ اے بہن نہ مغل نہ وُغل —— آپ کس گندی موری
گرنے جا رہی ہیں وہ تو کنجڑیوں کی اولاد ہے —— لیجیے صاحب۔ انھوں نے کلکتہ پہنچتے
نسبت توڑ دی۔ ایک اور بیوی میری شناسا کمپارٹمنٹ میں موجود تھیں۔ انھوں نے یہ وا
مجھے سُنایا۔

"اسکے بعد ہی میں نے طے کیا لعنت بھیجو اس معاشرے پر۔ ہم یہاں رہیں گے ہی نہ
برطانیہ چلی گئی۔"

"پھر واپس کیوں آئیں؟ وہیں رہے جاتیں۔ وہاں تو یہ مسئلہ بیک گراؤنڈ کا پیدا نہ ہو

"یہ مسئلہ وہاں بھی توب پیدا ہوا وہاں ہندوستانیوں پاکستانیوں کا اپنا سماج بن چکا ہے۔ کچھ پرانے دلّی والے موجود تھے۔ کچھ کلکتے والے۔ جے پور والی گجرا بائی کی ایک نواسی بھی وہیں رہتی ہے۔ اس کمبخت نے سارے میں پھونک دیا۔"

"تعجب ہے۔ آجکل تو لوگ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ خصوصاً باہر رہنے والے۔"

"خوب کرتے ہیں۔ عنبر کو اپنے اس ہینڈی کیپ کا OBSESSION ہو چلا تھا —— لیبیا سے یہاں آئی۔ اسی سال نگار خانم کا منجھلا بھائی —— دونوں بہنیں ایسی اُول جُلول ہیں۔ وہ آدمی بہت سمجھدار ہے۔ اس نے پیام دیا۔ عنبر نے منظور کر لیا۔ مگر ان بہنوں نے بھی اسی بنا پر رشتہ نہ ہونے دیا۔ انھوں نے بھی کہیں سے پتہ چلا لیا تھا ——

"اسی وجہ سے جب میں نے محسوس کیا کہ تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو میں نے طے کیا اس سے قبل کہ تم کو کسی اور ذریعے سے پتہ چلے اور تم بھی بدک جاؤ اور عنبر غریب کو ایک اور زبردست دھکا پہنچے بہتر ہے کہ میں تم کو خود ہی بتلا دوں۔ بلا کم و کاست۔"

"لیکن مجھے حیرت یہ ہے کہ جب ایک عجیب و غریب QUIRK OF FATE کے ذریعے خیّاط فلک نے نواب بائی کی زرنگار ٹوپی نگار و شہوار کو اوڑھا دی۔ عنبر کی نانی ان دونوں کی دادی بن گئیں۔ جگ ہنسائی ان گھمنڈی بہنوں کی ہوئی۔

"تو میرا خیال تھا کہ BOTH OF YOU WILL HAVE THE LAST LAUGH مگر اسکے بجائے عنبر کی حالت روز بروز تیزی سے بگڑتی جا رہی ہے۔ کیا اسکے خاندان میں کسی پُشت میں دیوانگی تھی —— ؟" دفعتاً وہ چُپ ہو گیا۔ خاندان کون سا —— ؟ امبا پرشاد کا یا سیّد شکور حسین کا ؟

"مجھے کچھ معلوم نہیں" مسز بیگ نے جواب دیا۔

"اس پر پہلے ہسٹریا کے دورے پڑ چکے ہیں ؟"

"نیوروسس شاید اس نے نواب بیگم سے ورثے میں حاصل کیا ہے وہ بیحد اعصاب زدہ تھیں۔ بات بے بات رو پڑتی تھیں۔ انکے حالات زندگی ہی ایسے رہے تھے کلکتہ میں عنبر کی اس لڑکے سے منگنی ٹوٹی تب بھی اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو چلا تھا۔ فوراً ہی

ہم لوگ اڈنبرا چلے گئے۔ وہاں ماحول بدلا۔ ٹھیک ہوگئی۔ اب اس کو یہ وہم ہوگیا ہے کہ شہوار اسے جان سے مار ڈالنا چاہتی ہے۔"

"یہ تو ذہنی مریضوں کا عام خوف ہوتا ہے۔"

"وہ مجھے بھی اپنا دشمن تصور کرتی ہے۔ جب دورہ پڑتا ہے مجھے گالیاں دیتی ہے یقین نہیں آتا یہ عنبر ہے ــــ"

"آپ نے فرمایا تھا آپکو بھی اپنی والدہ نواب بیگم سے نفرت ہوگئی تھی۔ اسی وجہ سے۔ کہ آپ کو انکا کیریکٹر اور طرز زندگی ناپسند تھا لیکن، مسز بیگ، میں آپ کو ایک بات بتاؤں عنبر کی اس موجودہ حالت کی ذمہ دار آپ نہیں مَیں ہوں ــ جی نہیں ــ شہوار کی وجہ سے نہیں۔ محض اپنے زیادہ بولنے کی بدولت ــــ جب اس جنیابلغ مسز بھٹناگر نے کہا میرے تاؤجی مشہور شاعر تھے مجھے اسوقت انکا تخلص دریافت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہ وہ تخلص بتاتیں نہ پٹاری میں سے امبا پرشاد دوبارہ نکلتے بطور پتاجی ــ نہ عنبر کی یہ حالت ـــ!

"تمکس کو باغ میں جانے نہ دینا؟ نہیں بھئی۔ وہ مسز بھٹناگر تو رسالوں میں نواب بیگم کے فوٹو والی خبریں پڑھ کر خود ہی یہ قصہ چھیڑ چکی تھی۔ باقی تفصیلات بھی اسی طرح بیان کر دیتی ــ ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ مگر واقعی کاش یہ بات نہ نکلتی اور عنبر مجھے ریاکار اور دروغ گو نہ سمجھتی۔"

"اب آپ اسے باور نہیں کرا سکتیں کہ یہ قصہ غلط ہے؟"

"بیٹیا اگر کوئی نہ ماننا چاہے تو جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کسطرح ثابت کیا جاسکتا ہے؟ آجکل وہ رسّی تلاش کرتی پھرتی ہے ـ"

"خودکشی کی خواہش؟"

"وہ کہتی ہے تم اور شہوار ملکر اسے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ وہ ہیلوسی نیشن دیکھتی ہے ــ وہ کہتی ہے جسطرح شہوار نے اپنے سب سے بڑے بھائی کو پاگل کرکے تہ خانے میں بند کردیا اسیطرح وہ اسے بھی پاگل کرکے چھوڑیگی ــ"

"وہ شاگرد پیشے والا خبطی ان لوگوں کا بڑا بھائی ہے ؟"

"عنبر کو اسکی ایک مریضہ نے بتلایا جو ان لوگوں کی ہم وطن ہے۔ علاوہ ازیں انکی بسنتی مہری نگار خانم کی دوائیں لینے تمہارے کلنک آتی جاتی رہتی ہے۔ وہ دونوں طرف خبریں پہنچانے میں مصروف ہے۔"

"گڈ ہیونز ـــ!"

"اسی بسنتی مہری نے عنبر سے کہا کہ انکا بڑا بھائی گھر سے بھاگ کر سادھوؤں کی ٹولی سے جا ملا تھا۔ برسوں ہمالیہ کی گپھاؤں میں رہا۔ شمشانوں میں بیٹھ کر کپالیوں سے تنترک عملیات سیکھ رہا تھا جبھی اسکا دماغ چل گیا ـــ"

"مسز بیگ ـ مجھے اس بیان میں شہوار کی افسانہ طرازی نظر آرہی ہے چلیے ـ خیر ـ پھر ـــ؟"

"بیٹا یہ ممکن ہے۔ کلکتے میں قاضی نذرالاسلام کے لئے یہی مشہور تھا کہ وہ تنترک علم سیکھتے سیکھتے کوئی چیز الٹی کر بیٹھے اسوجہ سے انکا دماغ ماؤف ـــ"

"آپ بھی اس قسم کی NONSENSE پر یقین کر لیتی ہیں ؟"

"قطعی نہیں۔ لیکن یہ تو عین ممکن ہے کہ ایک آدمی روزانہ آدھی رات کو شمشان گھاٹ پر جا کے بیٹھے گا تو وہاں کے ہولناک ماحول کی دہشت سے دماغ آپ سے آپ ہی چل جائے گا۔"

"چلیے مان لیا ـــ پھر ـــ؟"

"بسنتی مہری راوی ہے کہ اس نے شہوار سے سنا کہ بڑے بھائی بنارس کے پہنچ گنگا گھاٹ پر مُردوں کی راکھ کے ڈھیر پہ برسوں بیٹھے رہے ـــ"

"شہوار خانم کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنا چاہیے برائے فکشن ـــ"

"چنانچہ عنبر کو اب یہ وہم ہو گیا ہے کہ شہوار خانم نے اسی تنترک بھائی کے ذریعے جو اب خبطی سبز پوش بابا جی کہلاتا ہے تم کو الو کا گوشت کھلوا دیا ہے۔"

"کیسے ـــ؟"

"تمہیں۔ یعنی ڈاکٹر منصور کا شغری کو ــــ مزید برآں شہو آر خانم موٗٹھ بان کے ذریعے اسکا یعنی ڈاکٹر عنبرین بیگ کا کام تمام کیا چاہتی ہے"

"موٗٹھ بان کیا شے ہے؟"

"بقول بسنتی مہری دیوالی سے ایک رات قبل اپنے اپنے دشمنوں کو ختم کرنے کے لئے ساحروں کے ذریعے موٗٹھ بان چلواتے جاتے ہیں۔ جادو کی ہنڈیاں اڑتی ہوئی آکر ــــ VICTIM کو لگتی ہیں اور وہ پٹ سے مر جاتا ہے۔ یعنی ایک قسم کا جادوئی فلائینگ بم۔ روکٹ ــــ"

"اللہ رحم کرے۔ یہ تو عجیب گورکھ دھندا ہو گیا۔ عنبر انڈیا کو کریزی کنٹری کہتی تھی خود CRAZY ہو گئی۔ میں اسے جلد از جلد یہاں سے لے جاتا ہوں بوسٹن۔ چند مہینوں میں اچھی ہو جائیگی ــــ بسنتی کے علاوہ وہ اور کن لوگوں سے ملتی ہے؟ پدما بہن جی کو تو میں نے منع کر دیا ہے کہ جھاڑ پھونک ٹونے ٹوٹکے کی بات اس سے نہ کریں۔ اور کون؟"

"تم لوگوں کے کلنک میں طرح طرح کی خواتین آتی ہیں ــ ایک سے ایک توہم پرست وہ اسے جانے کیا کیا بتلاتی رہتی ہیں۔"

"مگر میں نے اسے سختی سے منع کر رکھا ہے کہ کلنک نہ جائے۔ گھر پہ آرام کرے۔ اور میں نے تو اسے وہاں کبھی موجود نہیں پایا۔ نہ شاردا نے ــــ"

"دیوانہ بکار خویش ــ اسے معلوم ہے تم اور شاردا وہاں دس بجے صبح سے پہلے نہیں آتے۔ وہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ــــ"

"میں نے آپ سے کتنی بار کہا کہ کار کی کنجیاں چھپا کر رکھیں۔"

"چھپا دی ہیں بیٹا۔ وہ مجھ سے کہتی ہے ذرا چہل قدمی کر آؤں۔ تھوڑی دور جا کر رکشا لے لیتی ہے۔ کبھی کہتی ہے ذرا کا مپوز خرید لاؤں۔"

"کا مپوز ــــ؟ میں نے اسے کا مپوز کی بھی ممانعت ــــ"

"میں نے بختو رکشا والے کو منع کر دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کہیں نہ لے جائے۔"

"بختو کون ــ؟"

"وہی۔ رفعت آرا بیگم کی کنیز انار کلی کا بیٹا۔"

"MY GOD—WHAT A MESS. مگر یہ نسبتی مہری بھی بڑی نمک حرام عورت ہے۔ اپنی مالکن کے بتلائے راز جا کر باہر اُگل آئی ——"

"اسکی نمکحرامی ہمارے کام آگئی۔ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ عنبر کے ذہن پر کن واہموں کا خوف مسلّط ہے —"

"میں ابھی جا کر دو کام کرتا ہوں۔ نمبر ایک عنبر کو بوسٹن لے جانے کی تیاری۔ نمبر ۲۔ راجہ دلشاد علیخاں کو شہوار کے ہاں بھیجتا ہوں کہ وہ جا کر ان بابا جی سے انکی اصلیت معلوم کریں۔ اور یہ بھی کہ یہ پاکھنڈی بابا جی وہاں بیٹھے بیٹھے کیا فراڈ کر رہے ہیں۔ راجہ صاحب کروک آدمی ہیں اصلیت فوراً پہچان جائیں گے۔ علاوہ ازیں ان دنوں وہ خاندان بنگلور گیا ہوا ہے لائین کلیر ہے —"

"لیکن انکی کوٹھی پر تو گورکھے پہریدار بھی موجود ہیں اور کتا بھی اور بابا جی کو ہمیشہ مقفل رکھا جاتا ہے۔ راجہ صاحب ان تک پہنچ پائیں گے؟"

"صاحبزادہ دلشاد علی خان —؟ مسز بیگ — جو میرا شیر آج تک WEST کے سات ملکوں کی INTERPOL کی گرفت میں نہ آسکا وہ شہوار خانم کے سرونٹس کوارٹر تک نہیں پہنچ سکتا؟"

(۴۲)

جہانِ مستور

"السلام علیکم باباجی۔"

"وعلیکم السلام۔ ٹھاکر صاحب۔"

"آپ ناچیز سے واقف ہیں؟"

"آپکے نام نامی اور ذات گرامی سے کون واقف نہیں آپ مثل آفتاب کے ہیں جو دنیا کے تاریک ترین گوشوں کو منور کرتا ہے۔ کل شام ہی آپ سے پائیں باغ میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"پائیں باغ میں؟"

"تاریک سُرنگ کے دوسرے سرے پر ایک سہانا چمن ہے۔ گلاب کے پھولوں اور بُلبُل ہزار داستان کے نغموں سے معمور۔ اسی گلستان میں جہاں ع —— اڑتی ہے شراب پھُول بن کر —— ان دنوں بے چاری عنبرین چہل قدمی کرتی نظر آتی ہے ——"

"بہت خوب تو آپ معمّوں میں بات کرنے کے عادی ہیں لیکن۔ بندہ معمّے حل کر لینے کا عادی ہے۔ کوئی قفل ایسا نہیں جو کھولا نہ جا سکے۔"

"جناب والا۔ چند قفل ایسے ہیں جنہیں نہ آپ کھول سکتے ہیں نہ میں۔"

"مثلاً —— ؟"

"مرزا غالبؔ نے فرمایا تھا۔ سنو عالم دو ہیں! موصوف گنتی میں کمزور تھے —— عالم بے شمار ہیں۔ یہ سبز رنگ جو آپ میری پوشش کا دیکھتے ہیں فی الحال۔ ایک عالم اور ہے —— جھُٹ پٹے کا دیس۔ وہاں سورج نہ ڈوبتا ہے نہ نکلتا ہے۔ اسی سُرنگ سے اُدھر۔ سہانے باغ سے ملحق۔ جہانِ ممات۔ جی۔ ؟ آیا خیال شریف میں؟"

"جی ——"

"بڑا نفیس پائپ ہے۔"

"شکریہ۔"

"شلغے سے شوق فرمائیے گا؟"

"جی نہیں۔ شکریہ۔ میں شلغہ نہیں پیتا۔"

"میں بھی نہیں پیتا۔ تو وہ لوگ سبز فام ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد سب کی رنگت سبز۔ واجگانِ سبز رنگ۔ خواتینِ سبز فام۔ میں نے ایک ولایتی کتاب میں یوں پڑھا تھا کہ سترھویں صدی میں —— ریسٹوریشن پیریڈ —— جی؟"

"جی ——"

"آپکے لئے چاء بناؤں؟ کوٹھی میں تو آپکو نفیس چاء ملتی ہوگی۔"

"جی نہیں۔ عنایت۔ وہ قصہ سنائیے۔"

"کون سا —— ؟"

"وہی۔ ریسٹوریشن پیریڈ۔"

"OH I SEE. WELL, MY DEAR FRIEND, IT

HAPPENED LONG LONG AGO—IN THE SEVENTEENTH

CENTURY ANNO DOMINI.

دو بچے —— بہن بھائی —— سبز فام —— اس جھٹ پٹے کے دیس سے بھٹک کر عالم آب و گل میں آنکلے تھے۔ انھوں نے پرسان حال کو بتلایا کہ ایک سیاہ ندی ہے۔ اسمیں ایک کشتی پڑی ہوئی ہے۔ بے پتوار کی ناؤ۔ اس پر غلطی سے بیٹھ کر وہ اس کنارے آپہنچے۔ وہ کھیتوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ ایک کسان انکو اپنے گھر لے آیا —— عالم آب و گل کا وہ خطہ انگلینڈ کہلاتا تھا۔ اس کسان نے دونوں بچوں کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا۔ وہ ان بے چاروں سے بہت مشقت کرواتا۔ اور وہ محض سیم کے بیج کھاتے تھے —— وہ کھیتوں میں محنت کرتے کرتے گھل گھل کر مر گئے۔ یعنی دوبارہ مر گئے۔ اور اس کتاب میں یوں مرقوم تھا کہ عیسائیوں کے ہاں مرنے والے کی فاتحہ وغیرہ کی رسوم کے لئے بھی چرچ میں BEANS ہی پکائی جاتی ہیں۔

اور وہ سبز فام بچے بھی محض BEANS کھاتے تھے۔ ہے نالرزہ خیز بات؟

"جبھی تو ولیم صاحب کہہ گیا ہے کہ زمین اور آسمان پر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنکے متعلق تم بالکل نہیں جانتے۔ تم نے انگلش لٹریچر پڑھا ہے ہوریشو —؟"

"تھوڑا سا۔"

YOURS TRULY IS M.A. IN ENGLISH BRACKET FIRST CLASS GOLD MEDALLIST BRACKET CLOSED.

"پھر آپ اس لائین میں کیوں کر آتے؟"

"آجا مورے بالما لائین کلیر ہے — کون سی لائین —؟"

"یہی — قلندری — باباگیری۔ وغیرہ۔"

"آپ اپنی لائین میں کیسے آتے؟"

"میری لائین؟"

"وہی جو آپ نے انیکر لائین پہ شروع کی تھی — لائین مارنے والی — بچہ۔ خبردار۔ — دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے۔ تاک تاک تھی —"

"آپ تو گانے اور کتھک کے بھی بلند پایہ استاد ہیں۔ کہاں سیکھا؟"

"بچہ۔ بیراگی کی ٹوہ لینے آیا ہے؟ بطلیموس اور پفنا توس کا بھائی چپڑ قناتوس۔ ارے وہ دونوں تو تم سے بہتر ہیں کہ لقمہ حلال کھاتے ہیں۔ ڈونٹ وری۔ بیراگی صاف بات کہنے کا عادی ہے۔ آج عرصہ ۲۴ ماہ کا ہونا ہے کہ ایک رمتے جوگی کو اس چاہ تاریک میں برادران یوسف نے قید کر رکھا ہے۔ اور خود چاہ زر میں پڑے ڈبکیاں لگا رہے ہیں۔"

"وجہ —؟"

"دنیا میں ہر چیز بلاوجہ ہے۔ بے مطلب۔ لایعنی۔ ہر مصیبت ناگہانی۔"

"کچھ آفات کی وجوہات تو بڑی صاف ہوتی ہیں۔ اسباب ونتائج۔ علت ومعلول۔"

"نہ۔ انھوں نے کن ہی کیوں کہا۔ ارے جب بنیاد ہی کج ہے تو اب جو حال ہوا سو ہوا۔"

"آپ تو باباجی کفر —"

"باخدا دیوانہ باشد ——"

"یہ دیواروں پر آپ نے کیا کیا سجا رکھا ہے ؟"

"چاہ یوسف کو چاہ بابل بنا دیا ہے — وہ قبالہ ہے یہود کا — وہ تنترک ہنود کا — وہ منڈل تبتی لاماؤں کا — اسطرف ہتھ یوگ کی پوتھیاں رکھی ہیں گی وہ کالی جلد والی پُنتک اندرجال —— پرانی ہندی میں لکھی ہوئی۔ بنارس میں ایک کباڑی سے خریدی تھی۔ نایاب کتاب ہے۔ کالے جادو کے متعلق ——"

"اچھا۔ باباجی یہ الو تنتر کیا چیز ہے ؟ اردو جنتریوں میں اسکا اشتہار بہت دیکھا ہے۔"

"وہ بھی ایک علم دریاؤ ہے —— وہ اس کونے میں علیؓ کا دُھونا سُلگ رہا ہے۔"

"آپ کی کنڈلنی شکتی جاگ گئی ہے ؟"

"قطعی نہیں۔ مگر اخی دلشاد۔ تم آدمی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو اب میں خاموش رہونگا۔"

"کیوں ؟"

"بعد مدت آپ پہلے شخص ہیں جو بندے کے پاس آن کر بیٹھے ہیں۔ بات چیت کرنے۔ اب میں خاموش رہونگا۔"

"لیکن کیوں ؟"

"میری مرضی۔"

"ابھی ابھی تو آپ بڑے اطمنان سے گفتگو کر رہے تھے —— خاصے نارمل۔"

"تو کیا تو ہمیں ABNORMAL سمجھتا ہے بے ؟ آؤٹ آؤٹ۔ بھاگ جا بے لفندرے۔ عیار۔ مچھندر۔ الو کہے بے۔"

"اچھا یہ علیؑ کا دھونا کیا شے ہے ؟"

"من کنت مولاہ فعلی مولاہ —— درتوم تانانانانا درتوم تانانانے —— اِلالی آلالی —— اَلِّی اللہ یالئے اِلالی اِلالی یالئے من کنت مولا فعلی مولاہ ——"

(۳۳)

علیؑ کا دُھونا

" السّلام علیکم شاہ جی!"

" وعلیکم السّلام! کیوں بھائی۔ کل بھی آئے آج پھر نازل۔ آج ڈُو ڈُو۔ منکر نکیر۔ کہیئے حضت آپکو کیا تکلیف ہے؟"

" باباجی۔ یہ ڈاکٹر کاشغری ہے"

" محتاج تعارف نہیں۔"

" ایسا ہے کہ کل یہاں سے جاکر میں نے ان کو بتلایا قول ترانہ علیؑ مولا من کنتُ مولا آپ نے یوں الاپا کہ میں نے کسی بڑے سے بڑے قوال سے ایسا نہیں سُنا یقین جانیئے مجھ پر تو لرزہ طاری ہوگیا۔"

" جھُوٹ مت بک"

" واللہ! ڈاکٹر صاحب بھی آپ سے کچھ سننے کے خواہشمند ہیں"

" اللہ کے تُرک امیر خسرو علیہ الرحمہ کا ترانہ سننے کی غرض سے آپ تشریف لائے ہیں! یا آپ صاحبان مجھے واقعی دیوانہ سمجھتے ہیں۔ یا پرلے درجے کا بیوقوف۔ فرمایئے۔ آپ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں ـــ؟ اور یاد رہے اگر دفعتاً مجھ پر جنون کا دورہ پڑ گیا تو آپ دونوں کی ہڈی پسلی ایک کردونگا۔"

" باباجی! ہمیں اپنا پرخلوص دوست سمجھیئے۔ ہم آپکی مدد کے خواہاں ہیں"

" پُرخلوص ـــ ہاہا ـــ واٹ اے جوک۔ اور ڈاکٹر صاحب اپنے حساب آپ ذہنوں کو کریدتے ہیں مگر ہمارے حساب آپ بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں۔ اصلیت آپ بھی نہیں جانتے۔"

"آپ جان گئے ہیں بابا جی؟"

"نہ۔"

"تو پھر ہم پہ کیوں رعب ڈال رہے ہیں۔ خواہ مخواہ۔ کل آپ نے ٹھاکر صاحب کو آدھ گھنٹے ہی میں بھگا دیا۔ میں ڈاکٹر ہوں اور آپ سے مدد لینے آیا ہوں لڑنے نہیں۔"

"ہم اپنی مدد ہی نہیں کر سکتے تمہاری کیا۔۔۔"

"پامال جملہ ہے۔ بابا جی۔۔۔ کام کی بات ہو جائے۔"

"پامال تو سارا کارخانۂ قدرت ہی ہے۔"

"بابا جی۔۔۔ کام کی بات۔۔۔ ہم مانتے ہیں کہ آپ بالکل صحیح الدماغ ہیں۔ بن رہے ہیں۔ مستقل بن رہے ہیں۔"

"صاحب۔ بنایا گیا ہوں۔"

"یہی سہی۔ مگر کیوں بنائے گئے ہیں؟ وجہ؟"

"کوئی حسب حال شعر پڑھوں یا با موقع گیت چلے گا؟"

"کاش آپ کے بھائی بہنوں میں اتنا سنس اف ہیومر ہوتا۔"

"تو آج ہم یہاں نہ ہوتے۔ وہاں ہوتے۔۔۔"

"مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟"

"بدنفسی، خود غرضی، اور حالات اور ناگہانی حادثات کا مجموعۂ آفات۔"

"کچھ ہمیں بھی بتلایئے تاکہ ہم لوگ عبرت اور نصیحت پکڑیں۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ تو شاید پکڑیں نصیحت مگر صاحبزادہ صاحب چکنا گھڑا ہیں۔ یہ بتایئے آپ کو وہ لوگ ادھر آنے ہی کیسے دیتے ہیں؟"

"آپکو تو معلوم ہے وہ سب بنگلور گئے ہوئے ہیں۔ ہم نے موقع غنیمت جانا۔"

"اور پھاٹک کے پہریدار۔۔۔ اور قبلائی؟"

"بسنتی مہری زندہ باد۔۔۔!"

بسنتی مہری۔ وہ پیر بخارا کی شہدن[۱]۔!"

"جب میں اسطرف آیا۔ تو خوش قسمتی سے منشی جی سامنے ہی نظر پڑ گئے۔ پہچان گئے۔ پہلے پہل آپکے دولتخانے پر حاضر ہوا۔ ان سے ہی ملاقات ہوئی تھی۔ امرود توڑ کر دیا تھا۔"

"اچھا۔ اّبا جی سے آپکی بھینٹ ہو چکی ہے؟"

"آپکے اّبا جی؟"

"ٹھہریئے — ذرا وہ فوٹو گراف اتار دیجئے گا۔ بہت اُوپر لگا ہوا ہے۔ اس الماری پر چڑھ جائیے۔ اور اوپر — جی ہاں — جسطرح آپ نے اس روز امرود توڑا تھا — جی — چڑھ جا بیٹا سُولی پر — رام بھلی کریں گے — شاباش۔ تھینک یُو۔ اب اپنے نفیس رومال سے اسکی گرد صاف کیجئے۔ گُڈ۔ تھینک یُو — اب دیکھئے آپکو اسمیں کیا نظر آتا ہے؟"

"کھپریل کا ایک برآمدہ ہے۔ اسکے سامنے کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہیں — شاید میاں بیوی اور انکی اولاد۔"

"جی اور بتایئے۔"

"ایک جوان لڑکی ہے۔ ایک کمسن۔ تین کمسن لڑکے اور ایک کوئی پچیس[۲۵] سالہ نوجوان۔ کوٹ کے کالر پر گولڈ میڈل لگائے۔"

"کرسیاں کیسی ہیں؟"

"معمولی۔ جیسی کرسیاں ہوتی ہیں۔"

"گھر کیسا ہے؟"

"اوسط۔ جیسے شرفا کے گھر ہوتے ہیں۔"

"کرسیوں کے نیچے ایرانی قالین بچھا ہے؟"

"نہیں باباجی۔ دھاری دار دری۔"

---

[۱] پیر بخارا لکھنؤ کا ایک محلّہ ہے جہاں کی عورتیں اپنی تیز زبانی اور طرّاری کے لیے مشہور ہیں۔

"حضرات! یہ تصویر بے بی براؤن سے کھینچی گئی تھی۔ آج سے بتیس سال قبل جب میں نے ناگپور کی ایک میوزک کانفرنس میں سونے کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ یہ میرے والدین ہیں۔ دونوں چھوٹی بہنیں اور تینوں چھوٹے بھائی۔ مقام للت پور۔ وقت۔ سنہ ۱۹۵۱ء۔ دیگر احوال: والد اوسط درجے کے سرکاری ملازم تھے۔ بیحد ایماندار اور متشرع۔ چند ایکڑ زمین پر کاشت ہوتی تھی۔ اولاد مقامی اسکولوں میں زیر تعلیم۔

"میری والدہ ابّاجی کی پہلی بیوی ہیں دوسری سے یہ پانچوں ہیں۔ یہ لوگ بڑے ہو چکے تھے جب انکی ماں کا انتقال ہو گیا۔ انکو انکے ننہالیوں نے یہ پٹی پڑھائی کہ میں نے ابّاجی اور اپنی والدہ کے ساتھ سازش کر کے انکی ماں کی دوا میں زہر ملا دیا تھا۔

"اس بہتان نے والد کو دل شکستہ کر دیا۔ میں نے پرواہ نہیں کی۔ نہ ان پانچوں کی محبّت میرے دل میں کم ہوئی۔

"ہم اپنی میڈیوکر قانع زندگیاں گزارے جاتے اگر ملک میں REVOLUTION OF RISING EXPECTATIONS نہ آیا ہوتا اور مجھے پکّا گانا سیکھنے کا شوق نہ ہوتا میں کالج میں پڑھتا تھا اور شام کو گانا سیکھنے ایک گوالیاری استاد کے پاس جاتا تھا۔ وہ استاد ایک بندیلکھنڈی نواب زادی کو ستار سکھلاتے تھے۔ اس طرح اُس نیک بخت سے اِس بد بخت کی ملاقات ہوئی۔ عشق صادق دونوں طرف پیدا ہوا۔ باپ کے خلاف مرضی شادی پر تیار ہوئی۔ سُن رہے ہیں؟"

"ہمہ تن گوش۔"

"ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ مجبوراً بندے کے عقد میں اسے دیدیا۔ وہ کثیر زیورات اور جہیز لیکر غریب خانے پر آئی۔ بہت جلد میری بہنوں نے اس غریب کی زندگی اجیرن کر دی۔ والد صاحب کی پنشن ہو گئی۔ مہنگائی تیزی سے بڑھی۔ میں مقامی کالج میں انگریزی کا لیکچرر ہو گیا۔ شام کو ٹیوشن کرتا۔ تاکہ بھائی بہنوں کی تعلیم مکمل کرا سکوں۔ تمنّا تھی کہ ایک روز سنگیت سمراٹ کہلاؤں۔ سارے عالم پر اپنے فن کی دھاک بٹھاؤں۔

" سنیئے کیا آپ حضرات کو واقعی میرا گانا پسند آیا؟ عرصہ گزر گیا مجھ سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میاں تم ایسے ماہر فن ہو۔ کسی نے مجھ سے گانے کی فرمائش نہیں کی۔ آپ جو کہیے سناؤں گا۔ مگر وہ لوگ نہ آجائیں۔"

" ڈریئے مت باباجی۔ ہم لوگ آپکے ساتھ ہیں اپنا قصہ پورا کر دیجئے۔"

" ہمشیرگان نے یہ ضد کی کہ میرانڈ ہاؤس دہلی میں پڑھیں گی۔ بیوی کے چند زیور فروخت کر کے انکی یہ فرمائش پوری کی۔ ایک بار ابّا جی ان سے ملنے دلّی گئے۔ ہوسٹل کے پھاٹک پر تانگے سے اترے۔ معمولی شیروانی پہنے مسکین سے آدمی۔ بہنوں نے کالج میں بڑ ہانک رکھی تھی کہ بندیلکھنڈ کے جاگیردار کی بیٹیاں ہیں۔ والد کو دیکھ کر دوسری لڑکیوں سے کہا ہماری ریاست کے منشی جی آئے ہیں۔ ابّا جی نے یہ بات سن لی۔ اس دن سے انکا جی دنیا سے اچاٹ ہوا۔ رفتہ رفتہ SENILE ہو گئے۔

" ابھی میرا دل دنیا سے اچاٹ ہونا باقی تھا۔ اب باقی کل۔"

" یہ غضب نہ کیجئے باباجی ــــ کیا پتہ وہ لوگ آج شام کی فلائیٹ سے ہی لوٹ آئیں۔"

" پھر کہاں ہم کہاں آپ دونوں؟ بہت خوب سنیئے۔ نیک بخت کے ہاں پہلوٹھی کے بچّے کی ولادت کی ساعت آئی۔ میں ضروری کام سے جھانسی گیا ہوا تھا۔ والدہ نے بہو کے لیئے ڈاکٹرنی بلانا چاہی۔ بہنیں دلّی سے آئی ہوئی تھیں بولیں لیڈی ڈاکٹر فضول خرچی ہے۔ محلّے کی قابلہ بلوائی گئی جو کیس سنبھال نہ پائی۔ جب میں گھر پہنچا ماں اور نوزائیدہ بچّہ کھپریل کے نیچے کھرّی چارپائی پر مردہ پائے۔

" بیوی اور بچّے کی موت کے صدمے سے، بہن بھائیوں کی بےحسی اور بے رحمی سے میرا کلیجہ الٹ گیا۔ قلب لوٹ گیا۔ آپ جانتے ہیں کس طرح لوٹتا ہے قلب؟ نہیں جانتے ــــ؟ حضت دیوانہ ہو گیا۔ سچ مچ کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل گیا۔ قبرستان کے نزدیک ایک درگاہ میں جا بیٹھا۔

" اس خطے میں بھی اولیاء کے مزارات کی کثرت تھی۔ میں نے ان بزرگوں سے گفتگو شروع کی۔ یک طرفہ سُن رکھا تھا آدھی رات کو اولیاء ایکدوسرے سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ رات رات بھر سرگرداں رہا کہ انوار کی جھلک مجھے نظر آ جائے۔ مگر نہیں صاحب۔ پردے اتنی آسانی سے تھوڑا ہی اٹھتے ہیں ورنہ سبھی واقفِ اسرار ہو جائیں۔

" بیابانوں میں مارا مارا پھرا۔ ایک سنسان گھنے جنگل کے وسط میں الاؤ جلتا دکھلائی دیا۔ چند ملنگ اسکے گرد بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ وہ الاؤ علیؑ کا دُھونا کہلاتا ہے۔ اور قلندر اسے چوبیس گھنٹے سلگائے رکھتے ہیں۔ وہ ملنگ اپنے دستور کے مطابق لوہے کے کڑے اور زنجیریں پہنے رہتے تھے۔ میں بھی ان کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ انکے ساتھ ایک بڑے جہان مستور کی سیر کی۔ ایک درویش ایسا دیکھا جو اچانک اُڑ کر اونچے درخت کی پھننگ پر جا بیٹھتا تھا۔ پھر واپس آ جاتا تھا اور بالکل خاموش رہتا تھا۔

" مسکرائیے نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اسی وجہ سے میں آپ لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ خیر تو اب میں دن دن رات رات بھر بھوکا رہتا۔ طرح طرح کی ریاضتیں کرتا۔ چلّے کھینچتا۔ اس عالم میں مجھے HELLUCINATION نظر آنے لگے۔ چاروں قسم کے۔ بصری۔ سمعی۔ حسّی۔ لمسی۔ خوشبوؤں کی لپٹیں آنے لگیں۔ درگاہوں میں جب قوّال ترانہ شروع کرتے ___ علیؑ مولا من کنتُ مولا ___ میں وجد میں آ کر رقص کرتا ___ خواجگانِ چشت کی پیروی میں۔

" گھومتے پھرتے بندیلکھنڈ سے روہیلکھنڈ پہنچا۔ وہاں بھی درگاہوں کی افراط پائی۔ گاؤں میں رات کے وقت روہیلے پٹھان دف پر چہار بیت کے مقابلے کرتے۔ انکی ٹولیوں میں شامل ہو جاتا۔ جہاں کہیں کسی طرح کی موسیقی کی آواز سنائی دیتی میں اس طرف لپکتا۔ چند ماہ ایک قوال پارٹی کے ساتھ بھی گھوما "

" مگر آپ ایک ماہر گویئے ہیں کہیں کسی میوزک کالج میں ملازمت کر لیتے۔ اس طرح کوچہ گردی سے کیا حاصل ہوا ؟ "

"کوچہ گردی اور صحرا نوردی کا لطف عاشقانِ پاک طینت سے پوچھوے

تن من دھن سب راکھ بھیو
لگ گئی آگ بھنبھور میں"

"باباجی آپ ڈرامہ بھی اچھا کھیل سکتے ہیں۔ افسوس ایک فرسٹ ریٹ پرفورمنگ آرٹسٹ کی زندگی اس قید خانے میں رائیگاں جارہی ہے۔"

"اور شجاعت کے جنگل کے شیر علیؑ کا کوئی نام لیوا مجھے چھڑانے نہیں آتا۔ سُنیے۔ ایک بار میرا گزر رامپور کے ایک گاؤں سے ہوا۔ جہاں لوگ رات کے وقت الاؤ کے گرد جمع ایک قسم کی آلہا گا رہے تھے۔ ہمارے بندیلکھنڈ کی آلہا اودل جیسی سناؤں ——؟ افسوس میرے پاس کوئی ساز نہیں وہ تھالی اٹھا دیجئے۔ دف کا کام دیتی ہے۔ حضرت میں اردو ہندی بھوجپوری پنجابی رقم رقم کے گانے گاسکتا ہوں۔ بنارس کے ایک گرو سے کتھک سیکھا ہے۔ جب للت پور کالج میں پڑھتا تھا جھانسی ریلوے کولونی کے اینگلو انڈین چھوکروں چھوکریوں کے ساتھ انگریزی گانے گاتا تھا۔ اسوقت آپکی خدمت میں ایک روہیلکھنڈی آلہا پیش کرتا ہوں —— سنیئے گا —— محمد بن حنفیہ پسر علیؑ دیوؤں سے کس طرح لڑے تھے۔ ایک غلام بادشاہِ توران سے جاکر عرض کرتا ہے ؎

اک لڑکا مسلم کا شاہا گھُس گیا شاہی باغ میں آئے
ڈرا ورنا کچھ خوف تھا اسکو پسر علیؑ کا ہے بتلائے

"تو شاہ اپنے سپہ سالار سے بولا۔ کیا بولا ——؟

لشکر لے جا ساتھ تو اپنے پسر حیدرؑ کا ہیں بتلائے
بیٹا ہے گر شیر علیؑ کا اکِلے سے مارا نہ جائے
غضبی ہے اور بڑا کھلاڑی بتلائیں حیدرؑ کا لال
باپ نے اس کے دنیا بھر سے دیوی دیوتا دیئے نکال
بولا آگے بڑھ کر حاکم سُن رے لونڈے کان لگائے
کیوں توڑے ہے خدا ہمارے سانچی ہمکو دو بتلائے

"باباجی ۔ بات سنیئے ——"

"اب سنیئے صاحبزادہ صاحب ۔عمروعیار شہزادی ماہ پروین کو بیاہنے کی مہم پر چلے —"

باباجی — ایک بات سنیئے ۔ وقت ہمارے پاس کم ہے ——"

" پہلے مسجد نبویؐ میں پہنچے — وہاں کیا دیکھا —؟ ہ

ابوبکرؓ ڈ ہنے کو بیٹھے دھورے انکے عمر فاروقؓ

پاس انکے عثمان غنیؓ ہیں اور بھی بیٹھے شاہ ملوک

حسنؑ حسینؑ آئے گئے ہیں شیر علیؑ کے دونوں لال ——"

"باباجی —"

"اے کیا باباجی کی رٹ لگا رکھی ہے ۔ بڑے آپ طرّم جنگ بنتے ہیں ۔ ہے آپ میں اتنا بُوتا کہ ایک بیگناہ بے قصور آدمی کو ان مُوذیوں ان دیووَں کی قید سے چھڑوالیں؟ نہیں ہے نا —؟ اب آگے بات کیجیئے ۔ کہنے لگے ہم آپ کے پرخلوص دوست ہیں ۔

" صاحبان ذی شان مہربان پاندان خاصدان ۔ اب آگے کا سنیں احوال ۔ عمر عیّار کا شاہِ توران کے سامنے رسولِ خداؐ کی چھٹّی پیش کرنا ہ

آ آ ۔ سرخ ہوا غصّے میں کافر سنکر اس چھٹی کا حال

پھاڑ دیا خط احمدؐ جی کا ٹکڑے ٹکڑے کیے فی الحال

بکھرے پھر تو ایسے عمرو ایک ہاتھ میں لیے تلوار

لات کسی کے ڈھال کسی کے مارن لاگے عمر عیّار —"

" ارے رے رے باباجی یہ کیا ۔ ارے آپ تو ہمیں کو مارنے لگے —"

" گڈ گوڈ — ارے بھئی بس کیجیئے —"

" دیوہوں میں اور بھُنگا ہے تو مجھ سے کیوں لڑنے کو آئے

بھیج تو لڑنے نبیؐ علیؑ کو تو کیا جانے رن کی سار

— زندہ ہے جب تک یہ لونڈا نبیؐ علیؑ کیوں لڑنے آئیں —"

"باباجی — باباجی صاحب — بس کیجئے — دیکھئے آپکی ڈاڑھی کا احترام ہے ورنہ ہم بھی آپکو ٹھیک کر دیتے ۔"

"ابے جا سالے ۔ مجھے بھی تیری کھچڑی مونچھوں پر ترس آگیا۔ایک گھونسے میں ہانپنے لگا۔بڑا عمرو عیار کا جانشین بنتا ہے۔آیا تھا اپنے حسابوں انگلینڈ سے چل کر میری احمق الذی بہن کو ٹھگنے — ابے بڑھئو گلفام — تیرے تو میں دھوئیں اڑا دوں — گاجر کے حلوے گل خیرو کے پھول —"

"آپکو غلط فہمی ہوئی ہے۔اس پیرِ بخارا کی شہدن نے آپکو یہ اطلاع صحیح نہیں پہنچائی۔"

"چپ بدمعاش۔اور تو ڈاکٹر بوگس کا شعزی۔ میں شاہ توراآن ہوں تجھ تورانی طبیب کا بھی حلیہ ٹایٹ کر دوں —۔ اُدھر بے چاری ڈاکٹرنی کو سبز باغ دکھلاتا ہے اِدھر میری چھوٹی بہن — اس بھولی بیوقوف لڑکی پر ڈورے — ایک ٹکٹ میں دو تماشے — کیوں ؟ اچھا جاؤ بچہ ۔ تمہیں بھی معاف کیا۔ بیٹھ جاؤ۔ سالے نقلی امریکن — آئے تھے ۔ ہماری مدد کرنے ۔ارے آپ کیا مدد کریں گے ہماری —"

"پھر وہی اچھا اچھا تشریف رکھیئے۔صراحی کہاں ہے ؟ پانی پیجیئے —"

"معاف کرنا مسٹر۔ میں نے تم لوگوں کو پہلے خبردار کر دیا تھا اگر یکبارگی مجھ پر پڑ گیا دورہ پھر تمہاری خیر نہیں ۔"

"باباجی اگر دوبارہ ہماری ٹھکائی نہ کرنے کا وعدہ کیجئے تو عرض کروں آپ بہترین اداکار بھی ہیں ۔ واقعی کاش آپکا اتنا ورسٹائیل ٹیلنٹ اسطرح برباد نہ ہوتا —"

"اچھا اب باقی قصہ سنو گے ؟"

"بالکل لیکن بیچ بیچ میں کچھ گا بیٹے بجائیے گا نہیں۔ یہ عادت آپکی خطرناک ہے"

"ٹھیک ہے ۔ جاؤ معاف کیا ۔علیؑ کے دھونے کے دھورے بیٹھ جاؤ۔

"اچھا صاحب ۔ تو میں حضرت سلطان العارفینؒ کی سرزمین روہیلکھنڈ سے نکلا۔

لکھ جگاتے جوگیوں کا ساتھ ہو گیا۔ گنگا پار کی حضرت سلطان الاولیاء نظام المشائخ کے وَدّھی یاروں کے ملک میں داخل ہوا چندے زرد پوش وارثی فقراء کی صحبت اٹھائی۔ وہاں سے پُورب کا رخ کیا۔ بنارس جا پہنچا——"

" جہاں آپ نے پنچ گنگا گھاٹ پر اگھوڑیوں اور کپالیوں سے تنترک یوگ سیکھا۔"

" بالکل غلط۔ جھوٹ سراسر جھوٹ سفید جھوٹ۔ تنترک سیکھنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ یہ ہوائی بھی میری گدھیا بہن شہوار نے اڑائی ہو گی۔"

" سُنا ہے آپ لوگوں کو اُلّو کا گوشت کھلا دیتے ہیں۔"

" جو لوگ پیدائشی چُغد ہیں انکو مزید لحمِ چُغد کھلانے کی کیا ضرورت ہے۔ گو تحاشس کے چڑیماروں کے ہاں ایک اچھا اُلّو واجبی قیمت پر مل سکتا ہے۔ آپ کو چاہیئے؟"

" باباجی۔ ہم نے یہ سنا ہے کہ——"

" جی صاحب سمجھ گیا۔ کچھ بعید نہیں شہوار نے پیر بخارا کی اس شُہدن کو پٹی پڑھا دی ہو کہ جا کر ڈاکٹر عنبرین کو اسطرح کی لغو باتوں سے ڈرا تی رہے۔"

" مگر آخر کیوں——؟"

" عورات کے ذہنوں کے بھید کون جان سکتا ہے؟ عورت عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ نہیں صاحب۔ خاطر جمع رکھیئے۔ OCCULT کا شوق بہت تھا۔ ہاتھ کچھ نہ آیا بس مارا مارا پھرا۔ قوالیوں اور کیرتنوں میں بے تکان گایا۔ نوٹنکیوں میں سوانگ بھرے۔

" مرزاپور میں ایک نوٹنکی لیلےٰ مجنوں دکھا رہی تھی۔ اسمیں شامل ہو گیا۔ مجنوں کا پارٹ کرنے لگا۔ ذکیہ جنتی کی یاد سے دل میں ہُوک اٹھی۔ مجنوں کے بھیس میں ایسے نعرے لگائے کہ منڈوے کی چھت اڑ گئی۔

" وہیں پر میرے بھائیوں کے کسی شناسا نے مجھے پہچان لیا۔ فوراً انھیں اطلاع دی۔ وہ لوگ للت پور سے آئے۔ پکڑ کر گھر لے گئے۔"

"یہاں تو انھوں نے سوتیلا پن نہیں دکھایا۔خون کی محبّت نے جوش مارا۔۔۔"

"حضرات! اسوقت مَیں بھی یہی سمجھا تھا۔۔۔ مگر دراصل یہ میری مرحومہ بیوی کے زیوروں کی محبّت کا جوش تھا جنکے لاکر کی کنجی اس غریب کی جوانمرگی کے بعد جوش جنوں میں مَیں نے کہیں پھینک دی تھی۔ اور وہ میری عدم موجوگی میں تلاش بسیار کے باوجود انکو نہ ملی تھی۔ ملتی بھی تو لاکر میرے نام کا تھا۔ قصّہ کوتاہ قلب پہلے ہی گداز ہو چکا تھا۔ والدین اور بھائی بہنوں کی محبّت میں روتا پیٹتا وطن پہنچا۔ گھر کی حالت ناگفتہ بہ نظر آئی۔ سات آٹھ سال غائب رہا تھا۔ بڑے اور چھوٹے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ انکی خالہ کی لڑکیوں سے۔ دونوں کو معمولی سی ملازمتیں مل گئی تھیں۔ گرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرانڈا ہاؤس بیحد مہنگا کالج تھا۔ دونوں بہنیں کوئی ڈگری لیے بغیر واپس آگئی تھیں۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے انکے بیاہ نہیں ہو پائے تھے۔ جس قسم کے عالی مقام شوہر وہ چاہتی تھیں۔ ہم کم حیثیت لوگوں کو اسوقت دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ دونوں ایک مقامی گرلز اسکول میں پڑھانے لگی تھیں۔ ذکیہ مرحومہ کے جہیز کی بیش قیمت اشیاء فروخت کر کے انھوں نے دونوں بھیّوں کی شادیاں رچائی تھیں۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ میری تلاش ان لوگوں کو بنک والے زیورات کی وجہ سے تھی پھر بھی، میں خوش ہوا کہ انھیں میری یاد آئی۔ گھر واپس بُلایا۔

" بڑی بہن کا اصل نام خوشنودی ہے۔ چھوٹی کا آبادی۔ بڑی لکھنے کی خداداد صلاحیت رکھتی تھی۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے اس نے رومانی ناول لکھ کر دو دو سو روپئے میں نگار خانم کے فرضی نام سے دلّی کے ایک پبلشر کے ہاتھ فروخت کیئے۔ میں یہ ضرور کہوں گا ان دونوں نے بڑی بہادری اور محنت سے اتنے دنوں گھر کی گاڑی چلائی۔ تینوں بھائی اسی وجہ سے انکے بہت ممنون تھے۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کی تعلیم انھوں ہی نے پوری کروائی۔ میں نیم دیوانہ کسی نوکری چاکری کے لائق نہ رہا تھا۔ گھر والے بھی مجھے مجذوب سمجھنے لگے تھے۔

"ایک رات، رمضان شریف کی گیارہویں تاریخ میں نے خواب میں ایک ہرا بھرا
جنگل دیکھا۔ برف پوش پہاڑ اور لکڑی کی ٹالیں۔
"صبح اٹھ کر بھائیوں سے کہا۔ ہلدوانی جاؤ اور لکڑی کی تجارت کرو۔ اللہ برکت دے
۔اسی روز صندوقچہ زیورات بنک سے نکال کر انکے حوالے کیا اور کہا اسے فروخت کر کے ٹمبر
کام شروع کرو۔ وہ تینوں ہلدوانی پہنچے۔ لکڑی کا بیوپار کیا۔ جنگلات کے ٹھیکے لینے لگے۔

"حضور علیگڑھ اورنیٹڈ مڈل کلاس کو باجماعت پاکستان سدھارے مگر بیت
گئے۔ دیوبند بریلی اورنیٹڈ چھوٹے بڑے سرمایہ دار نے اسکی جگہ لی۔ جنگلات۔ ٹرانسپورٹ۔
صنعتیں جنکی فنکاری مغل انکے اجداد کو سکھلا گئے تھے۔ خورجہ فیروزآباد۔ بیدر۔ مرزاپور۔
علم گڈھ۔ مرادآباد۔ نگینہ۔ اور صاحب سارا کوسٹل ساؤتھ۔ اور کانپور کا پنجابی سوداگر
بمبئی کا خوجہ بوہرہ ٹائیکون۔ گجرات کے چھیپی۔ یو۔ پی کا جولاہا۔
"ڈاکٹر صاحب۔ زمیندار اور پروفیشنل کلاس کی جگہ ایک باہمت بارِیش الحاج
کارخانے دار ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ بھیانک فساد ہوتے ہیں۔ وہ انہیں بہادری
سے جھیل لے جاتا ہے۔ وہ نئی مساجد تعمیر کرواتا ہے سیاسی اور سماجی اعتبار سے زیادہ تر
دائیں بازو کا حامی۔ عموماً دیانت دار۔ اوسط درجے کے زمیندار جو ابولیشن کی زد میں
میں آ گئے انہوں نے اپنی زمینوں پر بھٹے، کولڈ اسٹوریج چھوٹے کارخانے لگا لیے ہیں۔
"شاہ جی مسلم انٹیلیجنسیا اور پروفیشنل کلاس میں بھی تو تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے"
"شیور۔ شیور۔ اور رکشا والوں کی تعداد میں بھی۔ ڈاکٹر صاحب"

"آبادی بے پناہ بڑھ رہی ہے شاہ جی"
"ڈاکٹر صاحب ہم اس سیمنار کو مختصر کر کے باباجی کی داستان پر واپس آئیں؟"
"شاہ جی ـــ کاش آپ ـــ"
"جی ہاں حضور۔ اے کاش ـــ کبھی میں بھی تصور کرتا ہوں یونیسکو پیرس کے
موسیقی میں بیٹھا خیال کے اور ریجن پر ریسرچ میں منہمک ہوں ـــ"

"خیال کے ادریجن پر ریسرچ - لطیف نکتہ ہے!"
"شکریہ - کبھی سوچتا ہوں اڈنبرا یمنٹول میں تانیں اُڑا رہا ہوں - اور البرٹ ہال لندن —— دنیا ان مواقع سے انہی لوگوں کو ہمیشہ محروم رکھتی ہے جنکے وہ سب سے زیادہ اہل اور مستحق ہیں۔"
"باباجی ممکن ہے اس شک کی وجہ سے بھی آپ کے بھائیوں نے آپ کو اور خود اپنے باپ کو ایسی کڑی سزا دے رکھی ہے۔"
"کون سا شک؟ حضت دنیا شکوک ہی پر قائم ہے۔"
"وہی کہ انکی ماں کو خدانخواستہ آپ نے —— یعنی! —— YOU DID HER IN!"
"ممکن ہے - ایک شرّی رشتے دار میرے نانا سے ایک مقدمہ ہار گیا تھا اسکا بدلہ اس نے یوں لیا کہ ہمارے خلاف ان پانچوں کے کان بھرے اور خود کراچی نکل گیا۔

"بھائی اسمگلر وغیرہ نہیں لیکن سرمایہ داری کے اندرجال کے ماہر جادوگر۔ میری شدید ایمانداری انکے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی - انھوں نے مجھے رانچی بھجوا دیا - اپنے ذاتی ڈاکٹر کے ساتھ اسٹیشن روانہ کرتے وقت مجھ سے بولے بھائی جان پوری سوسائٹی اوپر سے نیچے تک بے ایمان اور کرپٹ ہو چکی ہے آپ ہمیں ہی ایمانداری کی تلقین کیوا کرتے ہیں - وہی کلیشے جو آجکل ہر شخص دہرا رہا ہے - تو صاحب - مجھے پاگل خانے بھیج کر خود یہاں آ گئے۔
"سال بھر رانچی میں بند رہا - اس صدمے نے والدہ کو قریب المرگ کر دیا - انھوں نے ان لوگوں سے التجا کی کہ مجھے واپس بلوا لیں - چاہے بیڑیاں پہنا کر رکھیں۔
"میری دیوانگی اور رانچی جانے کی خبر اِن برادرانِ یوسف کے لیے بھی ایک پرابلم تھی - اگر یہ مشہور ہو گیا کہ بڑا بھائی سڑی فاتر العقل ہے تو پاگل پن موروثی سمجھا جائیگا - بہنوں منجھلے بھائی اور آگے چل کر پرتی بیگم اور دوسرے بچوں کی شادی بیاہ میں کھنڈت پڑے گی - لہٰذا مجھے واپس بُلا لیا گیا - لیکن والد انکی مفروضہ سابق جاگیر کے

ورمیں انکا بیٹا بتلایا گیا۔ یہ جاگیر والی بات بہنوں نے مشہور کی تھی۔ بھائیوں کا اس من گھڑت میں کوئی دخل نہیں۔ لیکن اسے نبھانا پڑا۔ ارے سرِ راہ آج اشتہار ایک دیکھا کہ ناچیں گی شب کو مس اقبال پُتلی۔

" چنانچہ جیسا کہ آپ نے اس جشن اجراء کی شام مِس اقبال پُتلی ــــ سوری ــــ مِس نواب بائی کی تصویر کے فراڈ کے انکشاف کے موقعے پر ملاحظہ فرمایا ــــ دیوانہ میں نہیں میری بے چاری بہنیں ہیں۔ اللہ انکا محافظ ہو۔ اللہ میرے بھائیوں کا بھی محافظ ہو ــ میں اس اندھیری سُرنگ کے آگے جو باغ ہے اسمیں اپنا وقت گزارتا ہوں۔ شاید کوئی خدا ہے ــ شاید کوئی عالم روحانی ہے۔ ورنہ سب ذہن کے الجھٹے ــــ گتھیوں کی گتھیاں ــــ امید پرست دماغ جو سبز باغ دکھلاتا ہے ــــ ورنہ سب سبز فام مُردوں سے آباد جہان مِمات ــ"

" مگر یہ آپ کے بھائی ــــ"

" یہ اخوان الشیاطین ــــ؟"

" مطلب یہ کہ کیا وہ واقعی اتنے بدنفس اور بے رحم ہیں؟ آپکے بھائی بہن تو اس داستان کی روشنی میں بدی کے پُتلے معلوم ہوتے ہیں۔"

" گویا ابتلائے مسیحؑ کے ایلزبتھن ڈرامے میں شیطان اور اسکی ذُرّیات ــ ؟ بیشک وہ ایسے ہی ہیں۔ انکی شخصیتوں کا وہ پہلو جس سے میرا سابقہ پڑا ایسا ہی ہے۔ خود غرضی انسان کو پیٹ بھر کر بد اور احسان فراموش بنا دیتی ہے۔

" صاحبزادہ صاحب۔ آپکو ایک نہایت خوش اطوار خوش مزاج دلکش اور دلچسپ آدمی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اندر سے آپکی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی ہے ــــ"

" جی ــــ؟"

" جب وہ انگریز لونڈا یہاں آیا تھا وہ شاعر چھوکرا اور اس کے ڈنر کے موقعے پر ڈاکٹر صاحب آپ نے میری چھوٹی بہن کے سامنے ذکر فرمایا کہ صاحبزادہ دلشاد علی خاں

کو مافیہا دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے عالم بالا کی طرف چلتا کر چکی ہے۔"

"آپ کو کیسے معلوم ـــ؟ کیا مسلسل قید تنہائی انسانوں کو واقعی PSYCHIC بنا دیتی ہے؟"

"نہ سائیکلک نہ پائیکلک۔ بندے کی عادت ہے کہ کن سُوئیاں لیتا ہے۔"

"ـــ؟؟"

"جب کوٹھی میں کوئی اہم ڈنر پارٹی ہوتی ہے خاکسار چپکے سے جا کر اُس کھڑکی کے نیچے جھاڑیوں میں چھپ جاتا ہے۔ حضور والا آپ بھی مجھے وہاں دو بار دیکھ چکے ہیں اسی طرح راجہ صاحب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میرے بھائیوں نے آپکے مخفی احوال کے متعلق اپنے کھوجیوں کے ذریعے ساری انکوائیری مکمل کروالی ہے۔"

"جی ـــ؟"

"جی ہاں ـــ مگر فکر مت۔ وہ آپکو کوئی گزند نہ پہنچائیں گے کیونکہ اس صورت میں انکی مزید بدنامی کا خدشہ ہے۔"

"بابا جی ایک بات بتائیے۔ جب آپ اکثر اس قید خانے سے نکل بھاگتے ہیں تو یہاں سے فرار کیوں نہیں ہو جاتے ـــ؟"

"ڈاکٹر صاحب۔ پھاٹک کے گورکھوں سے بچ کر اگر نکل بھاگوں تو جاؤں کہاں ـــ پھر در بدر بھٹکوں۔ بھیک مانگوں۔ اب اس عمر میں مزید آوارہ گردی کی ہمت نہیں بُجھ گیا ہوں اور تنہائی کے عفریتوں سے بیٹھا لڑا کرتا ہوں۔"

"بابا جی ـــ چلیئے آپکو مغرب میں انٹروڈیوس کر دیں JET—AGE سوامیوں کے سرکٹ میں۔ میں آپکا مینیجر بن جاؤں گا۔ واقعی اس تجویز پر غور کیجیئے۔"

"راجہ صاحب۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بنوائیے میرا پاسپورٹ اور لے چلیئے سا سوامی تو نہیں ایک استاد گوئیے کی حیثیت سے۔ مگر مجھے نکلنے کون دیگا ـــ؟ میں ان لوگو کے معاملات کے بہت سے راز جانتا ہوں۔ اور باہر کی دنیا میں جا کر اب کروں گا بھی میری ہمت شل ہو چکی ہے۔ مجھے اپنی ہولناک تنہائیوں، تاریکیوں اور اندرونی آوازو

اور سنسناتے سناٹوں کی عادت ہو گئی ہے۔ میں موسیقی کی خاموش آندھیوں کی زد میں زندہ ہوں۔ میں ایک دھوئیں کی لکیر یا ہیو لے کی طرح ایک سوراخ میں رہتا ہوں۔ جب اس سوراخ پر گندگی انڈیلی جاتی ہے۔ تو برافروختہ ہو کر جن کی طرح نمودار ہو جاتا ہوں۔ جیسے اس شام نکلا تھا جب نواب بائی کی تصویر کے وسیلے سے میرے خاندان کے ناموس پر میری جاہ پرست ہمشیرگان نے کیچڑ انڈیلی تھی۔

" چوبیس گھنٹے یہ اس کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل رہتا ہے۔ میں کھڑکی میں سے جھانکتا رہتا ہوں۔ بسنتی یا دوسرے ملازم کھانا اور چائے لیکر آتے ہیں تب یہ دروازہ کھلتا ہے۔ یہ غریب لوگ مجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور باہر کی رتی رتی خبریں مجھے پہنچاتے رہتے ہیں۔ الامان والحفیظ۔

" مگر خدا نہ کرے جو ڈاکٹر عنبرین کی یہ حالت ہو۔ وہ مجھے ایک روز شرنگ کے اس پار باغ میں ٹہلتی نظر آئی تھی۔"

" بابا جی۔ آپ بالکل صاف باتیں کرتے کرتے پھر اپنے استعاروں میں چلے جاتے ہیں۔"

" جی ہاں کیوں نہیں۔"

" کیوں ــــ ؟ "

" کیا آپ سب نارمل صحیح الدماغ لوگ اکثر و بیشتر ایسا نہیں کرتے؟ پوری طرح صاف بات کون کرتا ہے ــــ سوائے پاگلوں کے ــــ ؟ "

" بابا جی ــ کیا عنبرین اس باغ سے لوٹ آئیگی ؟ "

" یقیناً ــــ اسکا مرض لاعلاج نہیں۔ کیونکہ اس سے محبت کرنے والی دو ہستیاں ہیں۔ اسکی ماں اور آپ ــــ ڈاکٹر کاشغری۔ آپ دونوں مضبوط ہستیاں ہیں۔ مجھ سے محبت کرنے والا کوئی نہیں۔ سوائے میری کمزور اور لاچار ماں کے۔ باپ خود ــــــ "

" بابا جی ــــ آپ رو رہے ہیں۔"

" اب آپ صاحبان تشریف لے جائیں۔ آوٹ۔ آوٹ ــ گیٹ آوٹ۔ بھاگ جایئے۔

بھاگ بے لمڑو ـــ جلدی جھٹ پٹ ـــ وہ خواجگان سبز فام تمہاری گھات میں ہیں۔ کالی ندی پر کالی ناؤ بندھ گئی ہے۔ تمہاری منتظر۔ راجہ دلشاد علیخاں آپ بھی بے نیل ومرام یہاں سے لوٹ رہے ہیں۔ میرے بھائیوں نے آپکے متعلق اپنی انکوائری مکمل کروالی ہے۔ اور خوشنود ی عرف نگار خانم پر آپ سے ملنے کی پابندی لگادی ہے اس وجہ سے وہ اسے اپنے ساتھ بنگلور لے گئے ہیں۔ تاکہ اس دوران میں انکا جنرل منیجر یا کوئی سکریٹری آپکو نہایت عزّت وتکریم کے ساتھ دلی یجاکر لندن والے ہوائی جہاز پر بٹھال دے ـــ

"اب نوٹنکی ـــ قاصد آیا لیکے پاتی جس میں مطبل سارا۔ بانچے کون اب چل دیا ج آپ ہی باچن ہار ـــ خبر آئی ہے واں سے، ہوگئی ہے یاں خبر پہلے ـــ اجی یاں خبر سوچ سوچ کے بن ناحق کو مورکھ تو ہے روتا ـ تجھے لازم تھا۔ اب تجھے لازم تھا اپنا کام کرنا سوچ کر پہلے۔

" آپ یہاں سے ناکام لوٹ رہے ہیں۔ ٹھاکر صاحب ۔ اور جب آپ کا ہوائی جہاز یہاں اوپر سے گزرے گا میں اس کھڑکی میں سے رومال ہلاکر آپکو ٹاٹا گڈ بائی کہوں گا۔

بھاگ جا بے THE PITY OF IT, IAGO, THE PITY OF IT.

ـــ ذرا اس کھونٹی پر سے میری ترکی ٹوپی اتار کر دیتے جایئے۔ اب میں دی ڈانسنگ درویش آف قونیہ بنتا ہوں ـــ بشنو ـــ بشنو ـ از نے چوں حکایت می کند ـ چوں ـــ"

(۴۳)

بَن دیوی

" ــــ ہے عشق اور جنوں بھی ــ کہیں آہ سرد ــــ کہیں دل میں درد ــــ ۔
کہیں رنگ زرد ــــ ہے یوں بھی اور ــ "

" پناہ بخدا ــــ یہاں بھی نوٹنکی ہو رہی ہے ۔ جدھر جاؤ ادھر نوٹنکی "

" ہے یوں بھی اور یوں بھی ۔"

" عنبر ــــ یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے ؟ "

" اک مہ جبیں نے پہنے پھولوں کے زرد گہنے ــــ ! "

" کیا تم خبطی لوگ گائے بغیر بات نہیں کر سکتے ؟ "

" ــ ہے مگر اداس ــــ نہیں پی کے پاس ۔"

" عنبر تم پھر گھر سے نکل بھاگیں ــــ یہ کیا ریکٹ ــ "

" نہیں پی کے پاس ــ غم و رنج و یاس دل کو پڑے ہیں سہنے ۔ "

" STOP SHOUTING AMBER YOU CAN'T SING FOR NUTS "

" پھولوں کے زرد گہنے ــ اک مہ جبیں نے پہنے ۔"

"AMBER, HONEY, I'M SORRY, BUT YOU CAN'T DANCE EITHER"

" پائیپ ڈاؤن ۔ میں نواب بیگم اور بلبل دی ڈانسر کی اولاد ہوں ۔ ان سے بہتر ناچ سکتی ہوں "

" عنبر ۔ پلیز ۔ بات سنو ۔ تمہاری امی بیحد پریشان ہیں ۔ تم کار لے کر پھر نکل بھاگیں "۔

" تم لوگ مجھے بابا سبز پوش کی طرح قید میں رکھنا چاہتے ہو ۔ میں تمہاری سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گی ــــ لو پھر بسنت آئی ۔ "

"بیٹھ جاؤ۔ اس صوفے پر ـــــ آرام سے۔ شاباش۔"

"مجھے زنجیروں سے تو نہیں باندھو گے؟"

"ہرگز نہیں ـــــ"

"تھینک یو ـــــ"

"یہاں کیسے پہنچیں ـــــ؟"

"لوگ کہیں سے کہیں کیسے پہنچ جاتے ہیں۔ طیور آوارہ۔ سائبیریا کے پرندے ـــــ"

"ناٹک بند کرو عنبر۔"

"امّی جان کار کی کنجیاں چھپا دیتی ہیں۔ گملوں میں ـــــ گملے بدلتی رہتی ہیں۔ میں بھی جنگلی چوہیا کی طرح لگی رہتی ہوں۔ سارے گملے میں نے کھود ڈالے۔ نکال لیں کنجیاں ـــــ"

"تم کو پتہ ہے تمہاری والدہ کس قدر پریشان ـــــ"

"اوہ FORGET HER اچھا تم نے مجھے کیسے ڈھونڈ نکالا؟"

"جیسے تم نے کنجیاں تلاش کر لیں۔ لیڈی واٹسن ـــــ"

"یہ اس پاجی چوکیدار نے فون کیا ہوگا ـــــ"

"رائٹ۔ اس نے کہا نکھلتو والی ڈاکٹر صاحب یہاں بیٹھی ہیں ڈاک بنگلے میں۔ ضلع سیتاپور میں ـــــ محمود آباد جانے والی سڑک پر ـــــ"

"اور کیا بتایا؟"

"اور یہ کہ کمرہ اندر سے بند کر رکھا ہے اور باجہ لگا کر ناچ رہی ہیں ـــــ عنبر کتنے افسوس کی بات ہے۔ سارے یو۔ پی میں تمہاری احمقانہ حرکتوں کے چرچے ہو جائیں گے ـــــ"

"اور ماتشا نرسنگ ہوم کی بدنامی ہوگی۔ جب اس کی ڈاکٹرنی ہی سٹرن ہے تو وہاں علاج کروانے کون جائے۔ اور تمہاری آمدنی کم ہو جائے گی ـــــ HEY DOC!

GET BACK TO BOSTON—GET BACK TO WHERE YOU BELONG".

"میں تم کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔"

" NO WAY —— میں تو سیتا پور کے جنگل میں رہوں گی سیتاجی کی طرح ——
—— اور گمشدہ الفاظ کے معانی تلاش —— ارے حسنؑ حسینؑ بڑے اولیا —— جنگل ما
بلہ لاگے —— رے دیّا —— ہمرے اللہ —— میں دکھے رو رہی ہوں —— تم میرے
پیچھے پیچھے یہاں کیوں پہنچے ۔؟ یاد رکھو یہ جنگلی بطخ کا تعاقب ہے ۔ "
" تمہیں زوُولوجی سے کافی دلچسپی معلوم ہوتی ہے ۔ جنگلی چوہیا —— جنگلی بطخ —— اچھا
تو صبح کا اخبار دیکھا ؟"
" موضوع گفتگو تبدیل مت کرو ۔ بتاؤ میں اصلیت میں کون ہوں ؟"
" سنو تو عنبر ۔ آج صبح کے اخباروں میں چھپا ہے کہ نامور برطانوی شاعر نورمن ڈریک نے
لندن میں پرّی بیگم سے سول میرج کر لی اور پرّی بیگم کے والد نے اسے عاق کر دیا ۔
اس اناؤنسمنٹ کے ساتھ اخبار والوں نے ایک فٹ نوٹ بھی چھاپا ہے کہ نورمن ڈریک
آزادی سے قبل کے لکھنؤ کی مشہور اینگلو انڈین رقاصہ نورما ڈریک عرف نرملا دیوی کا بیٹا ہے
اور کچھ عرصہ قبل یہاں آیا تھا —— یہ اطلاع ان بےچاروں کی بدنامی کے تابوت میں
آخری کیل —— سن رہی ہو —— بے چارے بیوقوف لوگ —— دنیا کو خریدنے چلے تھے ۔
یہ نازوردار آج کی تازہ خبر ۔ "
" ذرا وہ بن دیوی والی نظم سنا دو نا —— "
" عنبر تم حد سے زیادہ خود غرض ہو گئی ہو —— خود پرست ۔ "
" ہاں میں تو ہوں ہی بُری ۔ کسی کو میری پرواہ نہیں ۔ میری اتنی سی خواہش کوئی پوری نہیں
کرتا ۔ سب چاہتے ہیں انکی مرضی پر ہمیشہ انکی مرضی پر چلتی رہوں ۔ کیا میں اپنی آزادی سے کہیں
دم بھر نہیں سکتی جو تم پولس کانسٹبل کی طرح مجھے گرفتار کرنے آن پہنچے ؟ —— کیا میں تنہا ڈرائیو
کے لئے جنگلوں میں نہیں جا سکتی —— کسی خاموش ڈاک بنگلے میں بیٹھ کر ملکہ پکھراج کے
گانے نہیں سن سکتی ۔ بالوں میں زرد پھول اُڑس کے —— تم سب منافق چار سو بیس
لوگوں سے دور —— مجھ سے تو کل کی چھوکری پرّی بیگم ہی اچھی ۔ اپنی مرضی سے جو چاہتی
کر رہی ہے ۔ "

"تم کو ساری زندگی مکمل آزادی مل رہی اس کا فائدہ کیوں نہ اٹھایا — ؟"
"اپنی ماں کے ماضی کے ری ایکشن میں :"
"او۔کے ۔ تو وہ تمہارا اپنا انتخاب تھا۔اب اس سے آزاد ہو جاؤ ـ"
" NOW IT IS TOO LATE. ساری عمر دوسروں کی خدمت ۔ہسپتال نرسنگ ہوم آپریشن تھیٹر۔ اڈ نبرا۔لندن۔ اصفہان۔بن غازی ہر جگہ زیادہ سے زیادہ پاؤنڈ، تومان پیٹرو ڈالر کمانے کی مشین - کیا اب میں ذرا جنگلوں میں نہیں گھوم سکتی —؟
اس چوکیدار نے تم کو فون کس طرح کیا ؟"
" .I.A.S کا کوئی چھوکرا یہاں موجود تھا۔احمد۔وہ ہم لوگوں سے واقف ہے —چلو اب گھر چلیں۔یا ریورمنٹ کرد۔بہت ہو لیا۔تم اپنی ماں کو پرسیکیوٹ کر کے کس قسم کی سزا دینا چاہتی ہو ؟ اور اپنے آپ کو کیوں پرسیکیوٹ کر رہی ہو یار ۔"
"میں اپنے مکان کی صحیح SETTING بنانا چاہتی تھی۔خود میری SETTING میں گڑبڑ ہو گئی ۔میں امبیکا دیوی ہوں یا شاکرہ خاتون ؟"
"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ ۔عنبر تم امبیکا دیوی ہو نہ شاکرہ خاتون
"تم ایک نہایت TROUBLESOME اڑیل ٹٹو خاتون ہو جو اب دوسروں کو تنگ کر کے خوش ہو رہی ہے ۔ٹھیک ہے ۔تم نے بیس بائیس برس ایک بے چہرہ ہستی کی طرح دوسروں کا علاج معالجہ کیا انکے COMPLEXES کو جھیلا ہے۔ —اب تم خود سنٹر اف اٹنشن بننا چاہتی ہو—عنبرین تم دنیا کی واحد مخلوط النسل اولاد نہیں جو تم نے یہ آفت جوت رکھی ہے ۔سچ ہے ۔عورتیں بعض دفعہ اگر چاہیں تو منطق بالکل استعمال نہیں کرتیں ۔"
"تم SEXIST ہو۔ MALE CHAUVINIST PIG"
"تمہاری والدہ کے شدید FEMINIST رویے نے تمہارا یہ کباڑا کیا۔ بھئی تم تو واقعی جھاڑ کا کانٹا بن گئیں"
"جھڑک کر بات مت کرو۔کیسے ڈاکٹر ہو ؟"

"دماغ کے ڈاکٹروں کی رائے میں تمہارے ذہن کے کل پرزے ٹھیک ہیں تم نے اگر اپنی یہ ایکٹنگ نہ چھوڑی تو تمہاری امی تو تم سے دستبردار نہیں ہو سکتیں۔ میں ہو سکتا ہوں۔"

"تم —— تم بھاگ جاؤ گے؟"

"قطعی۔ رات کو بار بار فون کر کے جگاتی ہو۔ فلاں دوا کام نہیں کر رہی فلاں گولی بے اثر ہے۔ فلاں دوا لے کر اسی وقت پہونچو۔ جو دوائیں میں نے منع کر رکھی ہیں وہی ٹھونستی رہتی ہو ہر وقت۔ تم کو پتہ ہے جب تم کار لے کر آدھی رات کو مال ایونیو پہنچ جاتی ہو اور میری کھڑکی کے نیچے مسلسل ہارن بجاتی ہو تو سارا ایریا جاگ اٹھتا ہے اور مجھے کس قدر شدید کوفت ہوتی ہے۔ اس وقت۔ پہلے سب کو تم سے ہمدردی تھی اب لوگ تنگ آ گئے ہیں۔ پدما بہن جی بے چاری سب کو سمجھاتی پھرتی ہیں۔ پہلے لوگوں کو نواب بیگم کی تصویر ایک موضوع گفتگو مل گیا تھا اب GOSSIP یہ ہے کہ ڈاکٹر بیگ کا دماغ چل گیا —— اور اس کی طرح طرح کی وجوہات بیان کی جا رہی ہیں —— یاد رکھو عنبرین۔ تم علاج کے لیے میرے ساتھ چلو نہ چلو اگر تم اسی طرح پریشان کرتی رہیں تو میں ماشا میں اپنا حصہ فروخت کر کے جلد از جلد امریکہ چلا جاؤں گا واپس ——"

"نہیں —— نہیں —— تم ایسا نہیں کر سکتے۔ منصور تم مجھے چھوڑ دو گے؟ —— پلیز —— اچھا بس ایک دفعہ وہ بن دیوی والی ——"

"تم بن دیوی چھوڑ مہا بن دیوی ہو۔ تم کال بن کی دیوی ہو۔ تم سارے گوریلاؤں کی جدّہ ہو —— تم بور سے لدے آم کے درختوں سے گذرتی ہو تم خود بور ہو۔ دوسروں کو بور کر رہی ہو۔"

"ہُرّے —— جولی گڈ —— چلو باہر چلو —— میں آم کے جھرمٹ میں سے گذروں گی تم مجھے دور سے دیکھ کر بتانا کیسی لگتی ہوں ——"

"تم ہمیشہ ہر جگہ اچھی لگتی ہو۔ تم ایک دلکش خاتون ہو۔"

"میرا دل رکھنے کے لئے کہہ رہے ہو نا —— میں ایک ضعیف العمر کم رُو ڈاکٹرنی

ہوں جیسے اکیس سال کی عمر سے لے کر آج تک برابر ریجیکٹ کیا گیا ہے۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ چلو لکھنؤ واپس چلیں۔"

"نہ۔ اب میں بنوں میں رہوں گی۔ انسانوں کی بستی سے دور۔ میں نے انسانوں کی بستی میں غلط گھر بنایا۔ وہ تمہارا چینی شاعر——"

"چینی شاعر کو مارو گولی —"

"وہ تو ڈھائی ہزار سال پہلے ہی مر گیا۔ جانے کس طرح مرا ہوگا غریب۔ تمہیں پتہ ہے برٹش ڈاکٹر مصری ممیوں کو ایکزامن کر رہے ہیں یہ معلوم کرنے کیلئے وہ کن امراض سے مریں —"

"امریکن ڈاکٹر بھی کر رہے ہیں۔"

"ہینہ — امریکن ڈاکٹروں کو کچھ نہیں آتا جاتا۔ ہمارے برٹش ڈاکٹروں نے یہ تک معلوم کر لیا ہے کہ توت عنخ آمن کو پیچش رہتی تھی بیشتر ممیاں کس طرح مریں ان کو معلوم ہو گیا ہے۔"

"ممیاں مریں اور مرے۔ اور پہلی بات تو یہ کہ وہ مرنے کے بعد ممیاں بنے۔

"یاد ہے ایک بار تم نے کہا تھا ہر حسین عورت دو بار مرتی ہے۔"

"تمہاری والدہ نے تو یہ مفروضہ غلط ثابت کیا۔"

"ہینہ۔ پھر میری والدہ۔ ساری عمر انھوں نے مجھے بیک گراؤنڈ میں رکھا۔ ہر جگہ ہر ملک میں ہر سوسائیٹی میں لوگ انہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔"

"کمال ہے یار۔ بعض ماؤں کو اپنی جوان لڑکیوں کی وجہ سے COMPLEX ہو جاتا ہے یہاں الٹا حساب۔"

"ظاہر ہے تم تو یہ کہو گے ہی۔ تم بھی امّی ہی کو ایڈ مائیر کرتے ہو — مسز بیگ مسز بیگ — میں تو یونہی ایک فالتو سکنڈری چیز رہی ہوں ہمیشہ میں کسی میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ اسی لئے اب میں بن باسی بن جاؤں گی۔ میں بن دیوی اور بن پر واپس جانا چاہتی ہوں —"

"جزاک اللہ ۔ جاکر درخت پر الٹی لٹک جاؤ۔ شاباش ۔"

"بیں ALOMA OF THE SOUTH SEAS ہوں ۔"

"اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہوائین گٹار بجانا سیکھ لو۔ پھر گراس اسکرٹ پہنو کان کے پیچھے بڑا سا پھول اڑسو ۔ ہونولولو ایرپورٹ کی گراؤنڈ ہوسٹسوں میں بھرتی ہو جاؤ۔ ہوائی کے ہوائی اڈے پر ــــــ عنبر ڈیبر تم کو بھی شہوار کی طرح FANTASY کا شوق ہے ہر عورت کو ہوتا ہے اسی لیے وہ طرح طرح کے لباس اور زیور پہن کر سجا کرتی ہے ۔ نت نئے فیشن اپناتی ہے ۔"

"عورتوں کی فینٹی تو بالکل بے ضرر ہے ــ مردوں کی فینٹسی ساری دنیا کو تباہ کر دیتی ہے گریٹ لیڈر ۔ رہبر قوم ۔ فاتح عالم ــــ سنو ۔ کیا مجھے بھی نگار و شہوار کی طرح DELUSION OF GRANDEUR ہوتا جا رہا ہے ؟"

"تم ان بوگس خواتین سے دس ہزار گناہ زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہو تمہیں ڈلوژن اف گرینجر کبھی نہیں ہوسکتا۔ تم بس اپنی ذات کو نہلکہ خیز بنانا چاہتی ہو ــــ شاید تمہیں بھی پرفورمنگ آرٹسٹ ہونا چاہیئے تھا۔ ڈاکٹری غلط پیشہ اختیار کیا۔"

"اپنی ماں اور نانی کی طرح ۔ ہیں نا ؟ بدمعاش کمینے ۔ جوتا ماروں گی گِٹ آؤٹ ۔"

"ان دونوں خبطیوں کے ہاتھوں پٹنا ہی ہماری قسمت میں لکھا ہے آجکل ــ اچھا اب ذرا چُپکی بیٹھی رہو ــ رو ؤمت ہنی ــ ڈیٹس اے گڈ گرل ــ ارے بھئی ــ چوکیدار ــ ڈاکٹر صاحب کا سامان کار میں رکھ دو۔ کم آون عنبر بی اے اسپورٹ ــ کم ایلونگ ۔"

"تم ــ تم کون ہو ــ ؟"

"نیور مائینڈ ــ چلو لکھنؤ چلیں ۔"

"لکھنؤ کیا ہوتا ہے ؟"

"چلو گنج چلکر کافی پیئیں گے ۔"

"کافی کیا ہوتی ہے؟"
"عنبر تم نے باقی کیسٹ کہیں راستے میں پھینک تو نہیں دیے؟"
"کیسٹ کیا؟"

"اب اس نے ایک اور ریکٹ شروع کر رکھا ہے۔ وہ چیزوں کو پہچاننے سے منکر ہے۔ مثلاً میں نے پوچھا عنبر تم نے آج کا ٹائیمز آف انڈیا پڑھا؟۔
" بولی ٹائیمز آف انڈیا کیا؟
" کہا فریدہ خانم کے ٹیپ منگوائے ہیں۔ بولی فریدہ خانم کیا ہوتی ہے؟ اس سے میں تاڑ گیا اس نے فریدہ خانم کیا ہوتا ہے نہیں کہا۔ بن رہی ہے۔ نشارد انے کہا لیں عنبر جی یہ پورج کھالیں۔ بولی پورج کیا ہوتا ہے؟
" میں نے کہا تمہاری ساس کا سر ہوتا ہے۔ کھاؤ سیدھی طرح ورنہ ایک جھانپڑ دوں گا۔ بولی تمہارے اندر عورت کو DOMINATE کرنے کی خواہش موجود ہے میں نے نشارد اسے کہا اسے اس کی والدہ کے ویمنزلب نے برباد کر دیا۔ فوراً گرج کر بولی میری ماں کو برا نہ کہو وہ دنیا کی بہترین ماں ہیں۔ نشارد انے خوش ہو کر مجھ سے کہا اب عنبر اچھی ہو جائے گی۔

" مسز بیگ ——اس وقت میں بے حد فکرمند ہوں۔ اب وہ بعض لوگوں کو واقعی نہیں پہچانتی اور الفاظ کے ہجے بھولتی جا رہی ہے۔ کل صبح میں اپنے کلینک میں بیٹھا تھا۔ نرس اس کے کمرے سے اس کا پرچہ لائی۔ یہ دیکھئے' ڈیر منور۔ تم کو یہ معلوم کر کے خشی ہو گی کہ آج میں بے ہتر ہوں۔ اردو افسانوں کی کوئی کتاب بھجوا دو۔ پڑھنے کے لئے۔'
"اب وہ انگریزی بھی اسی طرح لکھتی ہے۔ چھوٹے بچوں کی طرح۔ ذہن کے بند بیچ

ماؤف ہونے کی یہ پہلی علامت ہے۔ ٹھاکر دلشاد علی عیادت کے لئے نرسنگ ہوم تشریف لائے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے بوسٹن لے جانے سے پہلے لندن آجایئے ہارلے اسٹریٹ کے ڈاکٹر روزن بام بڑے نامور سائیکٹرسٹ ہیں۔۔۔ راجہ صاحب تین چار دن بعد انگلستان واپس جارہے ہیں۔ وعدہ کر گئے ہیں پہنچتے ہی روزن بام سے اپوائنٹمنٹ لے کر مجھے لکھیں گے۔ ہاں اور یہ بھی کہا کہ آپ لوگ قیام و طعام کے متعلق فکر نہ کریں۔ ساؤتھ ہمپٹن میں غریب خانہ موجود ہے۔ جتنے عرصے چاہیں وہاں رہیے۔ بہت بڑا مکان ہے۔ نورما آپ لوگوں کی بہت خاطریں کرے گی۔ بے حد بھلی عورت ہے ۔۔۔"

"چلو مکان کا مسئلہ تو یوں حل ہوا۔ لندن کی مہنگائی سے ڈر لگ رہا تھا۔"

"جی ہاں خدا کا شکر ہے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔"

"خدا ۔۔ !! بیٹا یہ اتفاقات کا ایک اندھا دھند سلسلہ ہے۔ سارا معاملہ الل ٹپ ہے۔"

"یوں ہی سہی۔ مگر بہر حال۔ واقعی جن لوگوں کے متعلق ہم اتنے بدگمان ہوتے ہیں آڑے وقت میں وہی کام آتے ہیں۔ اب بتایئے۔ دلشاد علی خاں اور نورماہ خانم۔ ان سے زیادہ ردّ خلایق ہستیاں اور کون ہوں گی۔ اور وہی اس وقت ۔۔۔"

"ذرا نرسنگ ہوم فون کرو۔ عنبر کیا کر رہی ہے ۔۔۔"

"جب میں وہاں سے چلا تھا تو ٹوئنگی میں مصروف تھی۔ متواتر بیٹھی رٹ رہی تھی کوئی ایسی سکھی چاتر نہ ملی۔ ہلو ۔۔ ہلو ۔۔ لیجئے ۔۔ عنبر ۔۔ ہلو ۔۔ لیجئے سن لیجئے اب بھی وہی رٹ ۔۔ کوئی ایسی سکھی چاتر نہ ملی جو پی کا دوار بتا دیتی ۔۔۔"

(۳۵)

مارٹین کوٹھی

خواجہ سبز پوش کے آخری الفاظ تھے —— راجہ صاحب آپ یہاں سے بے نیل ومرام واپس جا رہے ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر سخت ڈپریشن طاری تھا۔ گذشتہ ہفتے نورما کو مطلع کیا تھا لندن روانہ ہو رہا ہوں۔ مگر اس اثنا میں ایسا واقعہ ہوا جسکے متعلق کاش میں اپنے انٹلکچوئیل لڑکے نورمن سے کچھ ڈسکس کر سکتا۔ گو وہ میرے اس ذہنی ورثے سے قطعی ناواقف ہے جو میرے تایا ٹھاکر جواد علیخاں کے کتب خانے میں بھی محفوظ تھا لیکن میں جسے مسترد کر کے پچھم کے چکوروں کی دنیا جا پہنچا تھا۔ زوال کے بعد اس فردوس گمشدہ کی بازیافت کا خیال بھولے سے بھی نہ آیا۔

نورما کو خط پوسٹ کر کے لوٹا۔ کلارکس اودھ کے پھاٹک پر دو ننھے منے نٹوں کو کٹھ پتلیاں نچاتے دیکھا۔ لکھنؤ کی زنگا رنگ دلفریب دنیا سے یکلخت اکتا کر ہوٹل کے اندر گیا۔ بابا سبز پوش کا الوداعی جملہ کانوں میں گونجا۔ راجہ صاحب آپ یہاں سے بے نیل ومرام ——

نگار شہوار اینڈ کو ہنوز بنگلور میں ہیں۔ ٹیلی فون پر ڈاکٹر کاشغری سے ڈاکٹر بیگ کی خیریت دریافت کی۔ خدا حافظ کہا۔ لفٹ کی طرف بڑھا تا کہ اپنے کمرے میں جا کر پیکنگ شروع کروں۔ خیال آیا پہلے ہوائی جہاز کا وقت دریافت کر لوں۔

سامنے حضرت محل پارک پر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ریسپشن کاؤنٹر کے پیچھے اپنی تصویر کے BLOW-UP میں بیگم حضرت محل قلیان کی نے ہاتھ میں تھامے جہان گذراں کا نظارہ کر رہی تھیں۔

میں انڈین ایرلائنز کے متعلق کلرک سے بات کرنے ہی والا تھا کہ بلو اپ کے مقابل میں ایک جانی پہچانی سی بارعب وجیہہ صورت دکھلائی پڑی۔ کنپٹیوں پر گرے بال۔ بڑی

بڑی نوکیلی موچھیں۔ کھلے کالر کے اندر سبز رنگ کا اسکارف منہ میں پایپ۔ ذرا سا گنجا اور فربہ
پُرانا HUNTIN' SHOOTIN' FISHIN' ٹایپ

وہ بھی ٹھٹھک کر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ارے وہ تو اپنا پرانا یار نکلا۔ لڑکپن کا ساتھی۔
لا مارٹینیئر کا ہم سبق —— کنور ستینڈری اِسندریش نرائن سنگھ!! اپنے باپ دادا کی طرح اردو فارسی
اسکی بھی گھُٹی میں پڑی تھی—— "بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے" کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔

جب ۱۹۴۸ء میں پاکستان گیا تھا اسی بے چارے نے ویزا پاسپورٹ وغیرہ کی دوڑ
دھوپ کی تھی۔ گالیاں دیں "بدمعاش کہاں غایب ہوگیا تھا۔ پاکستان جاکر ایک پوسٹ کارڈ
تک نہ لکھا۔ پھر ہم نے سنا کہ ولایت میں جا بسا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

دادا نانا بن چکا ہے۔ تعلقہ داری کے خاتمے کے بعد علاقے پر فارمنگ کرتا ہے۔
میں نے اسے مبہم سا بتلایا کہ لندن میں اپنی بزنس ہے۔

ہم لوگ ہوٹل کے گلفام ریسٹوراں میں جا بیٹھے۔ میں نے کہا بار پہ چلو۔ بولا شراب
چھوڑ دی ہے۔ تعجب ہوا۔ ہم پرانے احباب کا تذکرہ کرنے میں ایسے محو ہوئے کہ کنور نے مجھ
سے مزید ذاتی سوالات نہیں کیے۔ محض اتنا کہا۔ یار تم نے تو ولایت میں کسی میم صاحب سے
بیاہ رچالیا ہوگا۔ میں نے پھر ہُوں ہاں کردی۔

"کتنے لڑکے ہیں؟"

"ایک" یاد آیا اودھ والے اولاد کے لیے محض لڑکے استعمال کرتے ہیں۔ لڑکیاں قابل
ذکر نہیں۔ مختصراً جواب دیا "ایک لڑکا ہے۔ لندن میں اخبار نویس ہے۔"

کنور نہایت مسرور و مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ تعلقہ داری کے خاتمے کا اس پر ذرا جو
اثر ہوا ہو—— لنچ کے بعد کہنے لگا۔ چلو ذرا اپنا کالج گھوم آویں۔ مارٹ -

تیسرے پہر کو ہم لوگ اس سنٹی منٹل جرنی پر نکلے۔ ہوٹل کے پھاٹک سے برآمد ہوکر
سامنے اشارہ کرتے ہوئے کنور نے کہا "واجد علیشاہ قیصر باغ کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ بنانا
چاہتے تھے اب یہ بدمذاقی کا آٹھواں عجوبہ ہے —— "

"اس معاملے میں تم عنبرین بیگ کو اپنا ہم خیال پاؤ گے!"

"ماآنشا والی ڈاکٹر صاحب ہ قطعی ——" وہ سکندر باغ کی طرف مڑ گیا۔ وہاں اسے جانِ عالم کی چہیتی نواب سکندر محل کا سمر ہاؤس یاد آیا۔ ایک آہ بھری: "یہاں بھی تو گھمسان کا رن پڑا تھا۔ ۵۷ء میں ——"

"وہ تو اب بھی پڑ رہا ہے!" نئی کور ذوقی سے آراستہ بنارسی باغ میں شہریوں کے جم غفیر دیکھ کر میں نے جواب دیا۔ گویا مغرب سے آئے ہوئے ایک یو۔ این ایکسپرٹ کی نظر سے OVER-POPULATED جہانِ سوئم کو دیکھ رہا ہوں۔ بہت جلد اپنے نفیس و حسین جہانِ اوّل واپس چلا جاؤں گا۔ دل ہی دل میں اپنی خوش نصیبی پر خدا کا شکر ادا کیا کہ ان بھیانک مسائل سے بچ کر کیا بر وقت یہاں سے نکل بھاگا تھا۔

بنارسی باغ سے روانہ ہو کر ہم لوگ نواب سعادت علیخاں کی HUNTING LODGE پہنچے —— وہ شکار گاہ تو کب کی غائب ہوئی۔ نواب قدسیہ محل کے ٹوٹے پھوٹے ولائتی کاسل کے نزدیک فوجی افسروں کے بنگلے دکھلائی پڑے۔ اچانک یاد آیا۔ اسی دلکشا باغ کے اندر ۱۹۴۲ء میں، ادریس لوئیس لائیڈ لکھنؤ کے انگریز ڈپٹی کمشنر کی دعوت پر بڑے ابا مرحوم فوجی دلخوش سبھا کے جلسے میں تشریف لے گئے تھے۔ اسٹیج پر نورما ڈریک کو بطور "نرملا دیوی" ناچتے دیکھ کر ان پر یہ ہیبتناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ لال باغ کی ایک "لال بی بی" ہیں!

دلکشا کے احاطے کے باہر نئے سرکاری اپارٹمنٹ بلاکس کے آگے سے گذرتے ہوئے دُور سبز وادی میں اچانک لامارٹینیر کا اونچا مینار نظر آیا کنور نے اپنی مرسڈیز موڑی۔ چھاؤنی کی طرف واپس آئے۔ ایک نکڑ پر HODSON'S HORSE کے دو نوجوان افسروں کی مرمریں قبروں نے متوجہ کیا۔ یہ نوجوان غدر ۱۸۵۷ء میں مارے گئے تھے۔ ارے کیا ہم خود اپنے اپنے غدر میں اندرونی طور پر نہیں مارے گئے؟

قبروں کے نزدیک ایک لپا پُتا مقبرہ استادہ تھا۔ کس کا ہے؟ —— قریب کی ایک کوٹھی کے باغیچے میں کسی فوجی افسر کی بیوی، ہاؤس کوٹ میں ملبوس، مالی سے پودے لگوا رہی تھی۔ اس سے پوچھا۔ کہنے لگی۔ کسی بیگم کی TOMB ہے۔

گوری بی بی معاً کسی پرانی گرل فرینڈ کی طرح یاد آگئیں۔ سنیڈی نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یورپین اقوام واقعی ہم سے بہتر ہیں؟ اس عیسائی کالج کا ٹرسٹ جنرل مارٹن کی اس، مسلمان وارث کے مقبرے کی کیسی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اسی شہر کے دوسرے مقابر کی شکستہ حالی دیکھو۔ ٹرسٹ انکے بھی موجود ہیں۔"

"لکھنؤ میں بیگمات یا مقابر میں مدفون ہیں یا برقعوں میں ملفوف ——"، میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

کنور یکلخت ذرا جوش سے بولا —— "اور یہ جو سینکڑوں بے پردہ مسلم لڑکیاں کالجوں میں پڑھ رہی ہیں تم کو دکھلائی نہیں دیں؟ تم لوگ دراصل چند مفروضات لیکر واپس آتے ہو اور انکو بدلنا نہیں چاہتے۔ ہاکی چیمپین، بیڈمنٹن کی انڈیا نمبر وَن سوئمنگ کی انڈیا نمبر وَن سب تو مسلم لڑکیاں بن چکی ہیں۔ ہائی سوسائیٹی بھی پہلے کی طرح بیگمات سے جگمگا رہی ہے۔ کیا تم ان سے کسی کلب یا پارٹی وغیرہ میں نہیں ملے؟"

"یار۔ یہاں کی نئی ہائی سوسائیٹی کی دو ممتاز خواتین سے سابقہ پڑا۔ اب مزید سے ملنے کی تمنا نہیں۔"

کہنے لگا۔ "دلن بھائی۔ تم بڑے CYNICAL ہو گئے ہو۔ کیا معاملہ ہے؟"

مدتوں بعد کسی نے دلن کہہ کر پکارا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہی آنسوؤں میں جھلملاتی کنگ غازی الدین حیدر کی نہر سامنے نمودار ہوئی جو گورنمنٹ ہاؤس کے پیچھے سے نکل کر سبزہ زاروں سے گذرتی عالم باغ کی سمت رواں تھی۔ جنرل مارٹن کا یا وڈر میگزین۔ سعادت علیخاں کی حیات بخش۔ یو۔ پی کے لاٹ صاحب کی کوٹھی۔ اب اترپردیش کا راج بھون —— ! لاریب اس آبجو کا بہت پانی اب تک بہہ چکا ہے۔

صوفیاء پانی بہنے کی آواز اپنے اندر سُن لیتے ہیں۔

چاروں طرف دلکش کے پرسکون سبزہ زار پھیلے ہوئے تھے۔ محمد باغ اس برصغیر کی حسین ترین اور انگریزوں کی چھائی ہوئی قدیم ترین چھاؤنیوں میں سے ایک ہے۔ شکر ہے

اس نئی تعمیراتی بیہودگی کا شکار نہیں ہوا۔ ان حسین راستوں پر سے گذرتے ہوئے میرا ذہن سامنے بہتی بادشاہی نہر کی طرح بہتا ہوا دور نکل گیا —— اگر میں دو ماہ قبل نگار خانم کو بلیک میل کرنے کے ارادے سے یہاں نہ آتا —— سینڈی یعنی سندر لیشور نرائن سنگھ، اس ہمدم دیرینہ سے ملاقات کیونکر ہوتی۔

مال روڈ پر واپس آکر دوبارہ گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے سے گذرے تو کہنے لگا ——
"نواب آصف الدولہ کرنل مارٹن کو روہیلوں سے لڑنے کے لئے بھیجتے ہیں! آصف الدولہ کی فاونڈری میں یہ یوروپین افسر ایک خوفناک توپ ڈھالتا ہے اسے انگریز ٹیپو کے خلاف میدان جنگ میں لیجاتے ہیں۔ افسوس۔"
"جنگ ایران و عراق میں بھیانک خونریزی بمباری سے متعدد شہر تباہ ——" مرسیڈیز کے ریڈیو پر خبریں آرہی تھیں۔ کنور نے سوئچ بند کیا۔
"یار تم مسلمانوں نے ہمیشہ ایکدوسرے کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔ کبھی ایکدوسرے کا ساتھ نہ دیا۔" پھر خود ہی فوراً موضوع تبدیل کیا —— "یہ حیات بخش کوٹھی پہلے برٹش گورنروں کے لئے حیات بخش ثابت ہوئی تھی اب سودیشی راجیہ پالوں کے لئے ——!" اس نے قہقہہ لگایا۔

سنہری روشنی میں خاموش خوشگوار راستوں پر سے گذرتے رہے۔ غازی الدین حیدر کنال نے عالم باغ کی سمت اپنا سفر جاری رکھا۔
عالم آرا بیگم۔ کیسا انکا محل بنوایا تھا جانعالم نے کہ دریچہ ایک نہیں اور ہوادار۔
"وہ کیسے لوگ تھے بھئی۔" میں نے بآواز بلند کہا۔
"کالج میگزین میں تم خاصی مضمون نگاری کیا کرتے تھے۔ انگلستان واپس جاکر ایک آرٹیکل لکھنا — CAMELOT REVISITED"
"اب وہ کہاں ہے۔"
"کیملوٹ کی خصوصیت یہی تھی کہ چند روزہ تھا۔"

جنرل کلاڈ مارٹین کا اطالوی محل CONSTANTIA پھاٹک پردہ مانوس تختی

LA MARTINIER COLLEGE 1840

کنور مصنوعی جھیل کے فلک بوس مینار کو تکنے لگا" یاد ہے وہ ایک بوڑھا انگریز ہسٹری کا
ستاد ہم سے کہتا تھا — آپ لوگ BARONS OF OUDE کی اولاد ہیں آپکے پرکھوں نے
بی گم حضرات محل کا ساتھ دیا تھا مگر ہارنے کے بعد سمجھداری سے کام لیکر برٹش کراؤن
ے وفادار بن گئے تھے۔ اب آپ لوگ بھی وفادار رہیے۔"

"یہ لیکچر کیوں دیا تھا اس نے ہ مجھے بالکل یاد نہیں۔"

"ہم پہاڑ سے لوٹ کر آئے تھے اور وہ جو چٹان تھی نانی تال میں جسکے لیے مشہور تھا کہ جس
رسات میں یہ ٹوٹ کر جھیل میں گری اس سال راج کا خاتمہ ہو جائیگا — کلاس میں اسکا
صّہ سنا رہے تھے۔" وہ ہنس پڑا۔

کالج کے گولف کورس اور زوُ کا چکر لگایا۔ کارنوالس اور ہوڈسن ہاؤس کے
سیلور ٹس یاد کیے اور وہ ہاتھی جو بنارسی باغ سے چرایا تھا۔

مادر درسگاہ! ——— کنور بولا: "جب ہم یہاں کھیلا کودا کرتے تھے ہمیں
طعی احساس نہ تھا کہ فرانس کے ایک جولاہے کا بیٹا اپنی ساری دولت یورپین لڑکوں کی تعلیم
کے لیے کیوں چھوڑ گیا۔ وہ اس نئے یوروپ کا نمائندہ تھا ——— مہم جو۔ موُجد۔ باکمال انجینئر۔"

"یہ دولت تو اس نے یہیں سمیٹی تھی" میں نے یاد دلایا۔ "مارٹین کوٹھی بھی اس نے
آصف الدولہ کو چوُنا لگانے کے لیے بنائی تھی۔"

کنور نے سر ہلایا۔" ایک روز آصف الدولہ سے کہنے لگا آپکے لیے ایک کروڑ کی مالیت
کی کوئی چیز ابتک نہیں بنائی اب ایسی عجوبہ روزگار عمارت تعمیر کرونگا جس میں ہر طرف سے
رتے موسموں کا نظارہ کیا جا سکے۔ بجلی۔ بارش۔ طوفان۔ سیلاب۔ چاروں کھونٹ کی
ہوائیں۔ سردی۔ گرمی۔" "چلو دیکھ آویں وہ موسموں کی گردش کسطرح جھیلتا ہے۔ چاروں
کھونٹ کی ہوائیں اسکے اوپر سے کس طور سے گذر رہی ہیں۔"

— سر جھکائے پائپ پیتا ایک روش پر ہو لیا۔ اسکے ساتھ ساتھ قدم رکھتے ہوئے

مجھے خیال آیا کیا ہم سب چلتی پھرتی مارٹین کوٹھیاں نہیں کہ ہواؤں اور بدلتے موسموں
طوفانوں کو سہتے چلے جاتے ہیں۔ گجی میں شہزادہ سلیمان شکوہ والی ٹبرڑھی کوٹھی بھی نو
—— اگر انسانوں کی شخصیتوں کو طرز تعمیر سے تشبیہ دی جائے —— کلاسیکل —— گو
باروک۔ روکوکو —— اپنا کنور مغل راجپوت کا آخری نمونہ ہے۔

ہم دونوں نے مارٹین کوٹھی کے زنان خانے کا رخ کیا۔ اسکے سامنے ایک فرنگی
کرسی پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ سینڈی کو پہچان کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھ
"کنور سندریش نراین سنگھ!"
"یہ بھی میری طرح یہاں کے پُرانے اسٹوڈنٹ ہیں ——" کنور بولا۔ "راجہ دلشا
ہندوستان کی اضطراب انگیز تاریخ کے تین فریق —— جو کبھی ایک دوسر
کے ساتھی بنے کبھی دشمن —— اسوقت اس سیاہی مایل رومینٹک طرز تعمیر کی عمار
کے سامنے ایک بدلے ہوئے رنگ آسمان کے نیچے کھڑے تھے۔
اندر "زنان خانے" کے اطالوی اور ہسپانوی نقش و نگار اسیطرح چمک ر
تھے۔ رائل اکیڈمی کے مصوّر کا بنایا ہوا گوری بی بی کا پورٹریٹ ڈرائنگ روم کے آتشدا
ہنوز موجود۔ ایک اونچے سرسبز درخت کے نیچے سرو قد غرارہ پوش حسین و جمیل گوری ب
ساتھ ایک کمسن لڑکا —— جنرل کا متبنّیٰ جیمز ذوالفقار مارٹن ——
کافی پیتے ہوئے کنور نے ایک بحث طلب موضوع چھیڑ دیا۔ "گوری بی بی اور سلی
جنرل کی حرم تھیں یا لے پالک بیٹیاں؟ مسلمان اور انگریز مورخ تو انہیں حرم ہی بتاتے
"بالکل غلط۔" میزبان نے تیکھے پن سے جواب دیا۔ "جب اودھ میں قحط پڑا ان فاقہ
موزلم لڑکیوں کو بیٹیاں بنا لیا تھا۔ انہیں عیسائی نہیں کیا۔ انکے لیے ٹرسٹ چھوڑے
"میں نے تو کہیں پڑھا ہے کہ سلی بیگم بیوہ جنرل مارٹن نے شہزادہ سلیمان شکوہ
ایک بیٹے سے عقد کیا۔ سلی بیگم کا مقبرہ گولہ گنج میں موجود ہے۔"
"غلط۔ اچھا میں آپکے لیے کنجی لے آؤں۔"

میزبان کے جانے کے بعد کنور نے آہستہ سے کہا "مطلب یہ کہ وہ اولڈ بیچلر اتنا پاکباز تھا اور برتر یورپین بھلا وہ نیٹو لڑکیوں کا حرم کیوں رکھتا۔"

"مگر وہ تو اس زمانے کے ہندوستان میں یورپینوں کا عام دستور تھا اور فرانسیسی آج تک نسل پرست نہیں۔" میں نے کہا۔ فرنگی کنجی لیکر واپس آیا۔ ہم لوگ تہ خانے کا زینہ اترے۔ سیڑھیوں پر "سیف الملک جنرل مارٹن صاحب" کے نام کی مرمریں تختی کا ایک ٹکڑا دھرا ہوا تھا یہ سیڑھیاں زندوں کی دنیا کو مُردوں کے جہان مستور سے ملاتی ہیں میرے جسم میں سنسنی سے دوڑی۔ پھر موت کے خوف نے آن دبوچا۔ یہ عمر کا تقاضہ ہے۔

نیچے اتر کر ہم جنرل کے قایم کیے ہوئے بنک کے وسیع مرمریں والٹ میں داخل ہوئے۔ "ایشیا کا پہلا بنک اس نے اس ہال میں کھولا تھا" فرنگی مجبر کا دروازہ کھولنے آگے بڑھ گیا۔

"ملٹی نیشنل نہیں قایم کی؟" بینڈی نے دانتوں میں پائپ دبا کر بڑی مٹھاس سے پوچھا پھر کہا —— "دلّن بھائی۔ جب اودھ میں قحط پڑا ہے اس چالو چکر آدمی کے دیا تو آقا آصف بطور ریلیف بڑا امام باڑہ تیار کرواتے ہیں اور رات کے وقت اسے تعمیر کیا جاتا ہے کہ فاقہ زدہ شرفاء کو مزدوری کرتے شرم نہ آتے۔ یہ شخص اسی زمانے میں ذخیرہ اندوزوں کے لیے بنک کھولتا ہے۔ یہ آہنی دروازہ دیکھو —— جب سے اب تک ٹس سے مس نہیں ہوا ——"

"یار اب تم ہندوستانی نسل پرست تاریخ داں بن رہے ہو —— مارٹن صاحب کا بنک تو بڑا پروگریسو اسٹیپ تھا۔ فیوڈل ازم سے سرمایہ داری کی طرف پہلا قدم —— ایشیا میں پہلا گیس کا غبارہ بھی اس نے اڑایا —— اسی مارٹن کوٹھی کے باغ سے —— نہ بھولو کہ اس کے محض دو سو سال بعد آدمی چاند پر پہنچ گیا۔"

"چالو چکر۔" کنور نے آہستہ سے دہرایا۔ "پہلے آصف الدولہ کی خاطر یہ محل بنوایا۔ مرتے وقت سوچا نواب وزیر کے جانشین اس پر قبضہ نہ کریں۔ وہ اس میں یورپین بچّوں کے لئے اسکول قایم کرنا چاہتا تھا۔ خود کو یہیں دفن کروا گیا۔ تاکہ عمارت مقبرہ بن جاتے۔"

"ہاں سعادت علیخاں مقبرے میں تو آکر رہیں گے نہیں ——" میں نے کہا۔

ہم بنک کے ہال سے ملحق مرمریں کوٹھری میں گئے۔ عرصہ دراز بعد وہ کتبہ پڑھا

HERE LIES GENERAL CLAUD MARTIN,
BORN IN LYONS
THE FIRST DAY OF JANUARY, 1735,
ARRIVED IN INDIA
AS A COMMON SOLDIER,
DIED AT LUCKNOW
THE THIRTEENTH SEPTEMBER 1800
A MAJOR GENERAL.
PRAY FOR HIS SOUL

مارٹین صاحب اٹھارہویں صدی کا مثالی سولجر اف فورچوُن نام کر گیا۔ میں بیسویں صدی کا ایک حقیر چلتا پرزہ —— اٹھائی گیرا۔ ہیری چِگ۔ اودھ کے دریا دل فرمانروا جنرل مارٹن کے مربّی تھے۔ مافیا کے بے رحم سرغنہ میری پشت پناہی پر ہیں۔ مغرب کے کسی سرد، کہر آلود شہر میں جب مجھے موت آئیگی تو کیا میرے لوحِ مزار پر یوں لکھا جائے گا ——

HERE LIES DILSHAD ALI KHAN,
BORN IN DHANPUR, 1919,
ARRIVED IN ENGLAND AS A MODERN
FREEBOOTER
DIED AT ________ A COMMON CROOK
PRAY FOR HIS SOUL.

لرزہ ساطاری ہوا۔ دیکھتے دیکھتے زندگی کی آخری اسٹیج آگئی۔ اب اجل کتنی دور ہے۔

سینڈی دوسری طرف کھڑا تھا اسے میری کیفیت کا اندازہ نہ ہوا۔ ہم لوگ باہر نکلے۔ مشرقی پھاٹک پر رکھی "لارڈ کارنوالس" کو چھوا۔ سلطان ٹیپو کی آنکھوں نے اسے دیکھا تھا۔ کانوں نے اسکی گرج سُنی تھی۔ شیردل نے اسکے گولوں کا سامنا کیا تھا۔ فتح سری رنگا پٹنم کی یادگار۔ لکھنؤ واپس لاکر اس توپ کو اسکے خالق کلاڈ مارٹن کے دروازے پر نصب کر دیا گیا تھا۔ اللہ اللہ۔ میں نے اپنی پلکوں پر نمی سی محسوس کی۔ یہ لکھنؤ آکر مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس مرتبہ کنور نے مجھے غور سے دیکھا۔ چند لحظے خاموش رہنے کے بعد بولا" چلو کل ذرا بارہ بنکی تک ہو آویں۔ تم دھان پور نہ جاؤ گے۔؟"

"دھان پور۔۔۔؟ وہاں جانے کی ہمت ہے نہ رشتہ داروں سے ملنے کی۔ میں کل صبح کے پلین سے دلّی جا رہا ہوں۔ بذنایٹ فلایٹ سے لندن روانہ براہ ٹوکیو۔"

ڈوبتے سورج کے مقابل میں سرمئی آسمان کے نیچے CONSTANTIA ایک سیاہ پہاڑی ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ اور اسکی چھت پر نصب اونچے کلاسیکل مجسّمے سیاہ ممیاں۔

ہم عمارت کی طرف لوٹے۔ سامنے ایک دیوار پر نشانات لگے ہوئے تھے۔ فلاں سنہ میں گومتی کا سیلاب اس نشان تک۔ فلاں سنہ میں اس نشان تک ۔۔۔۔ فلاں میں ۔۔۔۔

" نسلیں پانی کی طرح بہتی جاتی ہیں کبھی ان میں طغیانی بھی آجاتی ہے۔ تب بڑی تباہی مچتی ہے۔" میں نے کہا:" آخری طوفان کب آئے گا ۔؟"

"یار تم بڑی منفی باتیں کرنے لگے ہو۔" کنور نے جواب دیا۔

ہم دونوں ایک سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ لامارٹینیر کی موجودہ نسل سامنے سڑک پر سے گذر رہی تھی۔ طلباء کی ایک لہر کے بعد دوسری گومتی کے مانند بہتی گئی ہے۔ اسوقت بورڈنگ ہاؤس کے ہندو مسلم سکھ بچے اُچھلتے کودتے کھیل کے میدان سے واپس آرہے تھے۔ ایک

لڑکے نے دور سے آواز دی ـــــ رکی ـــــ وکی ـــــ عمران ـــــ سینڈی ـــــ

کنور سینڈی مسکرایا۔ "سول اور ملٹری کے اعلیٰ عہدے ان لڑکوں کے منتظر ہیں۔ انہیں بخشو کی کیا پہچان؟" میں نے کہا۔

"بخشو کون ـــــ؟" کنور نے پوچھا۔

"ہے ایک۔ میرا نیا دوست۔ ہوٹل کے پھاٹک پر رکشا کھڑی کرتا ہے۔ سابق غلام زادہ۔ ہم تم BARONS OF OUDH کے غلاموں کی اولاد۔"

"یار کیا تم ولایت میں رہ کر LEFTIST ہو گئے ہو ـــــ؟" کنور نے دریافت کیا۔

"میں اور لفٹسٹ ـــــ؟" میں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ دل میں عجیب قسم کی شدید بے چینی موجزن تھی۔ سورج دُور ندی میں غروب ہو رہا تھا۔

رائیگاں۔ رائیگاں۔

کنور پر بھی اداسی طاری ہو گئی۔ سنجھا بتی کا وقت ہی ایسا ہوتا ہے۔

ایک گورا پیارا سا بچہ سامنے سے بھاگا جا رہا تھا۔ "ادھر آنا بیٹا ـــــ" کنور نے اسے آواز دی۔ "یہ میرے پوتے کا کلاس فیلو ہے۔ خوب گاتا ہے۔ عمران زیدی۔ یہاں آؤ بیٹا۔ یہ تمہارے گریٹ انکل لندن سے آئے ہیں ـــــ انکو ذرا کوئی گیت سُنا دو جھٹ پٹ۔ شاباش۔"

بچے نے فوراً اٹنشن کھڑے ہو کر انگلش اسٹائل سے منہ اوپر اٹھایا اور گانا شروع کر دیا۔ عہد نامہ قدیم کا ایکسو سینتیسواں لحن BY THE RIVERS OF BABYLON

THERE WE SAT DOWN, YEA, WE WEPT.

جھیل کا پانی شفق رنگ ہو گیا۔ عبرانیوں کی قید بابل ڈھائی ہزار سال قبل کی ـــــ بہت دُور کی بات تھی۔ بہت دُور کے سُر ـــــ گومتی کا پانی بھی بہت فاصلے سے بہتا ہوا آ رہا تھا۔ بچے نے بونی ایم کا گیت ختم کیا اور بھاگ گیا۔ ہم دونوں چُپ بیٹھے رہے۔

میں نے آہستہ سے کہا ـــــ BY THE WATERS OF LUCKNOW

THERE WE SAT DOWN, YEA, WE WEPT

"ہاں۔ ابتک کی زندگی تواکارت گئی۔ جوسوچا تھا وہ نہ ہوا۔ نہ تمہارے ہاں۔ نہ ہمارے۔"
اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔"لیکن ——" ادھ جلا سگریٹ دور پھینک کر اس نے
دیا ——"بقیہ زندگی تو سوارت کی جاسکتی ہے۔"
کلاڈ مارتین نے CONSTANTIA کے نیچے ایک سرنگ بنوائی تھی جو امام باڑہ آصفی
ول بھلیاں سے جاملتی ہے۔ ایک خیال دوسرے خیال سے، ایک شے دوسری شے
ایک وجود دوسرے وجود سے کن ان دیکھی پراسرار سرنگوں کے ذریعے منسلک ہے؟

شفق کی روشنی میں کنوریانی کے کنارے کھڑا تھا۔ کالر کے اندر اپنا سبز اسکارف
ت کرتے ہوئے دوبارہ بولا "چلو کل ذرا بارہ بنکی کا چکر لگا آویں۔" میں جھنجھلا گیا۔ یہاں
ز جلد پیرس پہنچ کر اپنی ایسکورٹ سروس کا برانچ آفس کھولنا ہے۔ اسکے لیئے پٹاخہ
ریاں بھرتی کرنی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں چلو بارہ بنکی —" یار رہے تم کنویں کے مینڈک
پیرس جانا ہے آپ نے بارہ بنکی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ارے اتنا پیسہ ہے ذرا ولایت کی
ر آؤ۔" ہماری ایسکورٹ سروس تم جیسے روساء کے لیے ہی تو قائم کی گئی ہے۔ میں نے
یں اضافہ کیا۔ ہم لوگ پھاٹک کی طرف واپس آئے۔
میرا دوست کار میں بیٹھتے ہوئے بولا "کل تیسرے پہر روانہ ہو جائیں گے۔ بس
ٹوتھ برش اور سلیپنگ سوٹ پیک کر لینا۔"
لڑکپن میں ہم دونوں اسیطرح اچانک اپنی اپنی بنسیاں اور بندوقیں اٹھا کر
ں بیٹھتے اور مچھلی اور تیتر اور مرغابی کے شکار کے لیئے چنہٹ، لکریل اور بخشی کے
ب کا رخ کرتے۔ یا لکھنؤ سے روانہ ہوتے۔ راستے میں عہد شاہی کی کربلائیں۔ آصفی
پر مہاراجہ ٹکیٹ رائے کی تعمیر کردہ مسجدیں اور شاہان اودھ کے کنٹری ہاؤس
چھوڑتے دور جنگلوں کی سمت نکل جاتے۔ میں نے طے کیا۔ ٹھیک ہے۔ لکھنؤ ۸۳ء
اکر لیا۔ اب ذرا اضلاع و قصبات کی ایک جھلک بھی دیکھ لیں۔ پرسوں ٹوکیو

(۳۶)

بن ساگر کے باسی

دوسری صبح ہوٹل آکر کنور مجھے اپنی نئی کوٹھی پر علی گنج لے گیا۔ اسکی بیوی اور بہو تیر
نینی تال گئی ہوئی تھیں۔ نرکے علاقے پر تھے۔

تیسرے پہر ہم لوگ روانہ ہوئے۔

ازابیلا تھوبرن کالج۔ فیض آباد روڈ۔ نیا اودر برج۔ کرامت حسین گرلز کالج ــــ "یہ
تک چل رہا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ کنور پھر کبیدہ خاطر ہوا ــــ "اور تمہارا کیا خیال
بند ہو گیا ہونا ــــ؟"
لڑکیوں کے غول کے غول کالج کے وسیع کیمپس سے نکل کر آرہے تھے۔ آگے نشاط گ
نیا بازار ــــ پھر اندرا نگر۔ حد نظر تک نئے رہائشی اپارٹمنٹ بلاک۔ پولکلینکس کے ایونیو۔ شہر نوا
چکا۔ ہم ہندوستان ایرنوٹیکل فیکٹری کے سامنے سے گذر رہے تھے جب کنور بولا۔ "خاصہ طویل
ہے پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی۔"
"بارہ بنکی تو صرف پندرہ میل دور ہے۔"
"ہم ذرا اور آگے جا رہے ہیں۔"
ہم لوگ باتوں میں اسقدر مصروف تھے میں نے ابتک پوچھا ہی نہ تھا کہ کہاں کا
ہے۔ اب دریافت کیا تو بولا ــــ "ہم جہاں جا رہے ہیں وہ اپنے مہمانوں کو جلدی واپس
آنے دیتے۔ شاید کل بھی ٹھہرنا پڑے۔"
میں جھنجھلا گیا۔ "تم رہے ہندوستانی چیپڑقنات۔ وقت کی پابندی تمہارے لئے کوئی

نہیں۔ علاوہ ازیں۔ میں کسی اجنبی کے ہاں ایک دن سے زیادہ ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔"

"تم نقلی انگریز بن چکے ہو۔ لندن میں رہتے ہو۔ مگر ہمارے پیر مہمانوں کو بڑے اصرار سے روکتے ہیں۔"

"پیر ــــ کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا "جہاں تک مجھے یاد ہے تم تو نامی گرامی پلے بوائے ہوا کرتے تھے۔"

"تمہارے اسٹائل سے لگتا ہے کہ تم اب تک پلے بوائے چلے جا رہے ہو۔ مگر ہمارا راستہ بدل گیا۔ ہم مدھوشالا سے چلے تو مدھوبن میں جا نکلے۔"

ویسٹ میں کسی گرو یا سوامی کا چیلا بننا ایک FAD ہے۔ ہمارے زمانے میں یہاں بے شمار اہل ہنود مسلمان درویشوں وغیرہ کے معتقد ہوا کرتے تھے۔ مگر آجکل بھی ایسا ہو رہا ہے۔ العجب!

ہرے بھرے جینٹ سے گذرتے آگے بڑھے۔ دونوں طرف بے پناہ سبزہ۔ شادابی۔ جھیلیں۔ آم کے باغات۔ "مجھے یاد ہی نہ رہا تھا کہ انڈین کنٹری سائیڈ اتنی خوبصورت ہے"، میں نے اظہار خیال کیا۔

"دلن بھائی۔ تم تئیس برس ولایت میں رہ کر بالکل یو۔ کے۔ پی بن گئے۔"

"یو۔ کے۔ پی؟"

"لکھنؤ میں ڈاکٹر منصور کاشغری سے ملنے کا اتفاق ہوا؟ ماشا نرسنگ ہوم والے ــــ"

میں چونک پڑا۔ میں نے اسے بتلایا تھا کہ آجکل سہارنپور کا فرنیچر امریکہ ایکسپورٹ کیا جا رہا ہے۔ میں اسے برطانیہ امپورٹ کرنے کے ارادے سے یہاں آیا ہوں۔ اور لکھنؤ کا چکن یا دلہ درک وغیرہ۔ نواب بیگم کی تصویر والے قصے کا لکھنؤ میں عام چرچا تھا لیکن کنور نے اب تک اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔ اپنے آپ میں مگن تھا۔ کہنے لگا "میری بیوی اور بہوئیں ماشا ہیلتھ کلب جاتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر کاشغری کو بھی ہم جانتے ہیں۔ باغ و بہار آدمی ہیں۔ انھوں نے بڑے دلچسپ مخفف اختراع کر رکھے ہیں۔ یو کے۔ پی یعنی الو کے پٹھے۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔

چند منٹ بعد ہم بارہ بنکی پہنچ گئے۔ ایک بس اسٹاپ پر غرارہ پوش مسلمان عورتیں

دکھلائی پڑیں۔ پھر وہی خیال آیا جب تک غرارہ باقی ہے کلچر باقی رہیگی۔ بارہ بنکی سے نکل کر پھر شاہراہ پر آ تے۔ ایک جگہ ایک بس سے اتر کر سیاہ برقعے اوڑھے کالج کی لڑکیاں کتابیں سنبھالے ایک کھیت کی پگڈنڈی پر ہولیں۔ اور دور ایک گاؤں کی طرف روانہ ہوگئیں جسکی سفید مسجدوں کے مینارے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ دیر تک ان لڑکیوں کے رنگ برنگے غرارے ان کے برقعوں کے نیچے سے نظر آیا کیے۔ اب مجھے غرارہ کو مپلیکس ہوتا جا رہا ہے۔

سات میل بعد دیوہ شریف۔ ہائے دیوہ شریف۔ بچپن میں بڑے آبا مرحوم کے ساتھ عرس کی نمائش میں آیا کرتا تھا۔ ایک ماموں بھی وارثی فقیر ہو گئے تھے۔ کنور بولا۔ ذرا اور چند روز ٹھہر جاؤ تو میلے اور مشاعرے میں شریک ہولینا۔ کرواچوتھ کا چاند میری بیوی اور بہوئیں یہیں آکر دیکھتی ہیں ——"

نمائش گاہ کے راجہ اعزاز رسول گیٹ اور بارہ دریوں کے سامنے سے گذرتے ہوتے ایک مستعد گائیڈ کی طرح اطلاع دی "اس میدان میں دور دور تک مویشی —— ادھر نمائش حاجی صاحب کا مرمریں مقبرہ رنگینیوں سے بقعہ نور۔ پونم کے چاند ایسا —— اور —— اور رات کے سمندر میں پچاس ہزار ہندو مسلمان یاتریوں کا جوار بھاٹا۔"

کنور پہ اب شاید کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ میں خاموش رہا۔ سینٹ پال کے DOME کی عادی آنکھوں کو دور سے روضے کا گنبد دکھلائی دیا۔ سامنے سے ایک جلوس جا رہا تھا۔ ہار پھول اور چادریں لیے مزید غرارہ پوش بے پردہ عورتیں۔

ہر طرف لوکل کلر کی افراط۔ دیوے شریف سے نکلے۔ اب ذرا اکتا کر کنور سے پوچھا "تمہارے پیر صاحب کسی جنگل بیابان میں رہتے ہیں؟"

وہ خاموش رہا۔ گویا اپنے پیر کا بلا وجہ سرسری تذکرہ کرنا بے ادبی تھی —— شاہراہ چھوڑ کر ایک کچّی سڑک پر کار موڑی۔

"تم کو راجہ صاحب محمود آباد یاد ہیں؟ راجہ امیر احمد خان مرحوم" چند منٹ تک ہچکولے کھانے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"بالکل یاد ہیں۔ بیچارے نیک انسان تھے۔"

"ہاں۔ ایک زمانے میں جب ان پر مذہب انتہا سے زیادہ طاری ہو گیا تھا انہوں نے کیا کہ باری باری ہر پیغمبر کے طرزِ حیات کی پیروی کرینگے۔"

"ہمیشہ جَو کی روٹی کھاتے تھے راجہ صاحب۔ سادھو سنت آدمی تھے۔"

"ہاں۔ انبیاء بھیڑیں بھی چرایا کرتے تھے چنانچہ راجہ صاحب نے آسٹریلیا سے بہترین بھیڑیں منگوائیں۔ انکو ندی کنارے چھوڑا گیا۔ اب روز صبح راجہ محمود آباد اپنی رولز پر چراگاہ تشریف لے جاتے۔ چوبدار بھیڑوں کو گھیر گھار کر انکی خدمت میں پیش کرتے۔ آپ ایک عصا سنبھال کر چند منٹ تک بھیڑوں کو ہُر۔ ہُر کرتے پھر کار میں بیٹھ کر قلعے واپس چلے جاتے۔"

"تو ــــــ؟"

"تم بھی یہی کر رہے ہو۔ اپنی مرسیڈیز پر بیٹھ کر کچّے راستوں کے دھکّے کھاتے کسی کوردہ ں طرف رواں ہو جہاں کسی پیر صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی آتما کو فائدہ پہنچانے کی وشش کروگے۔"

"بکومت۔"

"آجکل پاکستان میں بھی یہ فیشن چل پڑا ہے۔ بالخصوص دولتمند بیگمات ایک ایک پیر صاحب کی معتقد ہیں۔ وہاں کی طرح یہاں بھی تصوّف کا تذکرہ نیا انٹلکچوئل فیشن معلوم ہوتا ہے۔ ایک سے ایک پرانا مارکسسٹ صوفیاء کی بات کرتا ہے بسلسلہ انسان دوستی۔"

"ذہنی فیشن بدلتے رہتے ہیں" کنور نے اطمنان سے جواب دیا۔" ایک نامی گرامی مارکس وادی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ دنیا خدا نے پیدا کی۔ انسان خدا نے بنایا۔ بچپن کے نماز روزے کا اثر انسان کی سائیکی میں باقی رہتا ہے ـــــ وغیرہ وغیرہ۔"

"واٹ اباؤٹ یو؟ تمہاری سائیکی کا بھی یہی احوال ہے؟ یار تم تو اگنوسٹک ہوا کرتے تھے۔"

"ہم محض اپنے مرشد کو مانتے ہیں۔"

"ہمارے خیال میں تم سَنک گئے ہو۔ بڑھاپے میں کوئی نہ کوئی سَنک پیدا ہو جاتی ہے۔ تم سٹھیا گئے ہو یار سینڈی۔ پتہ ہے تمہاری اس روحانیت کے چکّر میں میرا انجر پنجر ڈھیلا ہو چلا۔

اس ناممکن سڑک پر اور کتنے میل جانا ہے ؟"

"چپ چاپ چلے چلو ـــــ مگر تم ظاہری مذہب پرستی اور سچی دینداری میں آج تک تمیز نہیں کر پائے ؟ ساری دنیا کا تجربہ تو رکھتے ہو۔"

میں نے کہا: "یہ سب بڑی اضافی اصطلاحات ہیں۔ سچی دینداری وغیرہ۔"

" RELIGIOUS GENUINELY لوگ ہی MYSTYCISM کی طرف چلے جاتے ہیں۔" کنور نے جواب دیا۔

مجھے طیش آگیا: "ارے یار۔ صوفی شاعروں کی سرزمین میں آجکل کیا دیوانِ حافظ سے فال نکالی جاتی ہے کہ آج کتنے دانشوروں کو پھانسی دی جائے کتنی حاملہ عورتوں کو گولی ماری جائے ؟ وہ لوگ بھی تو خود کو سچے دیندار سمجھتے ہیں جو یہ سب کر رہے ہیں وہاں۔"

" کامیاب بزنس مین کے علاوہ تم ایک باشعور سیاسی مبصر بھی بن چکے ہو! "

" جس لائن میں ہم ہیں اسمیں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے ضروری ہیں۔"

" کون لائن ــــــ ؟ اچھا وہ ایکسپورٹ امپورٹ ؟ " کنور نے بھولپن سے پوچھا۔ پھر بولا۔

"ہاں۔ ہم تم سے متفق ہیں۔ مذہب ہمارے ہاں تو BIG BUSINESS بھی بن چکا ہے۔ بہت سے نیتا لوگ ایک دوسرے کے خلاف یگیہ اور ہون کرواتے ہیں جیوتشی اور سوامی سیاسی مشیر بنے ہوتے ہیں۔ عجیب ہڑبونگ مچی ہے۔ لہٰذا ـــــ جو چند ایک سچے فقرا اور یوگی موجود ہیں ان کی طرف سے بھی لوگ بدظن۔"

"تصوف تو دو ڈھائی سو سال سے آلودہ ہو چکا ہے اسی کرپشن اور توہم پرستی کے خلاف ہمارے ہاں شاہ ولی اللہؒ نے ـــــ"

"معلوم ہے۔"

"کم از کم ایک بات تو ہے۔ اپنے مرشد کے اثر سے تم نہایت لائق فائق ہو گئے!"

"شکریہ۔ شکریہ!" کنور نے ہنسکر کہا اور کار کو ایک گڑھے کے کنارے سے نکالنے میں منہمک ہو گیا۔ یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد پھر بولا ـــــ "تم کو معلوم ہے کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیراکؔ نے کچھ عرصہ قبل ایک مضمون لکھا کہ نظریاتی فزکس میں جو کچھ ہو سکنے کی چیزیں

تھیں وہ تو اب تک ہو چکیں ۔ جو پرابلم باقی ہیں وہ عرصہ دراز تک حل نہیں ہو سکتے۔

"فرانس میں ـــــ" اس نے کار کو پھر ایک ہچکولے کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "فرانس میں بہت سی ریاضی داں ایسے ہیں جو اپنے کام کے ذریعے متھمیٹکس میں زبردست انقلاب لائے۔ اپنی PRIME پر پہنچکر وہ دفعتاً MYSTYCISM کی طرف چلے گئے ۔ انتہائی انٹلکچوئیل سرگرمیوں کے بعد انسان کہیں اور ـــ آگے دیکھنے لگتا ہے TRANSCENDTAL POWERS کی طرف۔"

"کیا دانشوروں کا دماغ خراب نہیں ہو سکتا؟" میں نے کہا "بڑے بڑے سائنسداں ایک وقت آتا ہے کہ SENILE بھی ہو جاتے ہیں۔"

"فرانس کے ان جواں سال MATHMETICIANS کی بات کر رہا ہوں یار جو اپنے PRIME میں کیتھولک ـــ تصوّف کی طرف چلے گئے۔"

"انکی سائیکی میں جو انکے رومن کیتھولک ورثے کا اثر تھا وہ عود کر آیا ـــ" میں نے جواب دیا۔ کنور چپ ہو گیا۔ میں باہر دیکھنے لگا۔ دونوں طرف دھان کے کھیت۔ طراوٹ۔ آم کے باغ۔ جھیلیں۔ درمیان سے گذرتی شکستہ کچّی بل کھاتی سڑک ـــ چارسُو ہریالی۔ پر اپنا جادہ حیات بھی تو اسی طرح اُوبڑ کھابڑ ہے۔ ٹیڑھا میڑھا۔ میرا باطنی لینڈ اسکیپ۔

کنور جانے کیا سوچ رہا تھا، کچھ دیر بعد بولا: "دلّن بھائی۔ ہر درخت، ہر ندی، ہر پھول پتہ دھرتی کا ایک اسٹیٹمنٹ ہے۔"

بانس کے ایک جھنڈ میں چھپّر تلے غرارہ پوش لڑکیاں سہاگ گا رہی تھیں۔ جی بیٹھ گیا۔ کنور سے کہا ذرا رُکنا۔ کان لگا کر سُنا۔ ایسا لگا یہ آوازیں دھان پور سے آرہی ہیں ـــ پنڈت جو آویں راجہ راس گنانے ـــ پنڈت کا نیگ میرے ابّا کو دیجیو۔ سہاگ مانگن گئی حضرت بی بیؑ کے انگنا ـــ حضرت بی بیؑ کے انگنا ـــ

کنور نے کار آگے بڑھائی۔ راستے کے کنارے چند مضبوط اونچے درخت جڑ سے اکھڑے پڑے تھے: "پچھلی آندھی میں بڑی تباہی آئی۔ اس سال بہیا کا بھی خطرہ ہے۔ یو۔پی اور بہار میں بہت گڑبڑ جھالا چل رہا ہے دلّن بھائی۔ کرپشن اتنا ہے کہ ٹھیکیدار کمزور بندھ

باندھتے ہیں۔ جو ہر برسات میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہمالیہ پر درخت بے تحاشا کاٹے جا رہے ہیں۔ چنانچہ پہاڑوں کی مٹی گر گر کر ندیوں کو اتھلا کیے دے رہی ہے۔ سیلابوں کا زور بڑھ گیا۔

"یار تم تو خوش نصیب ہو کہ اپنی جگہ کھڑے ہو جڑوں سمیت۔" میں نے کہا "تمہیں اپنے آپ کو انگلینڈ وغیرہ ٹرانس پلانٹ کرنے کا خیال نہ آیا۔"

"ضرورت نہیں پڑی۔ کوئی بہت بڑھیا موقعہ ملتا تو چلے جاتے۔"

"مزید کچے جھونپڑے۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "راستے میں اتنی نئی فیکٹریاں ملیں اور ساتھ ساتھ ایسے پسماندہ گاؤں۔"

"انہی پسماندہ گاؤں سے نکل کر لڑکیاں لڑکے الیکٹرونک انجینیر بن رہے ہیں۔"

کنور بڑا قوم پرست آدمی ہے۔

پھر زور سے دھکا لگا۔ اس جگہ راستہ بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ "بڑی الٹکل پچو ترقی ہے یار۔ ایسی بڑھیا شاہراہیں اور ایسے کچے راستے۔"

"ترقی ہو تو رہی ہے۔ الٹکل پچو ہی سہی۔ میرا ایک سالا نیو جرزی کے ایک حسین گاؤں میں سیٹل ہو گیا ہے ایک بار آیا تو اپنے شاندار مکان کی تصویریں دکھلا رہا تھا۔ بات بات پر میرے ویلیج میں، یہ اور میرے ویلیج میں وہ۔ میں نے کہا تم ان کچے جھونپڑوں والے غلیظ گاؤں کو مسترد ضرور کر سکتے ہو انکے مچھروں اور مکھیوں کی وجہ سے جھینپ بھی سکتے ہو مگر کیا یہ امریکی قریہ واقعی تمہارا گاؤں ہے؟ تمہاری اولاد کا شاید ہو جائے ——— دلّن بھائی کیا وہاں رہتے ہوتے تمہیں بھی اپنے ایشیائی اوریجن سے شرم آتی ہے؟" اس نے مسکرا کر ذرا غور سے مجھے دیکھا۔ "قطع سے تو تم بآسانی اٹیلین سمجھے جا سکتے ہو۔"

میں خاموش رہا۔

"نام بھی بدل سکتے ہو ——— DELL SHAW ELI KAHN" وہ مذاق کر رہا تھا لیکن مجھے اپنے کالر کے پیچھے گرمی محسوس ہوئی۔

کہنے لگا۔ "تم درختوں کی بات کر رہے تھے۔ ہم جس جگہ جا رہے ہیں وہ گھرانہ ساڑھے پانچ سو سال سے اسی دقیانوسی گاؤں میں رہ رہا ہے۔ وہی درگاہ۔ وہی کچے مکان۔ وہ

کھیت کھلیان۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے سے لیکر آج پرائم منسٹر اندرا گاندھی کے دور تلک۔ افق پر ایک گھنا WOODLAND دیکھتے ہو؟ اسمیں محبت کے جنگل کا تسیر رہتا ہے۔"
میں نے اس لٹریری جملے کی داد دی۔

دھان کے لہریں مارتے ہرے سمندر کے کنارے ایک مسجد نظر آئی۔ نیلے آسمان میں ایک چمکیلا سفید کٹ آؤٹ۔ سیاہی مائل سبز درختوں کا جزیرہ جو ہرے سمندر سے گھرا ہوا تھا۔
"بن ساگر کے بن باسی۔"
"کون چیز؟"
"ہمارے شیخ کے جدِ امجد بہت بڑے بزرگ تھے۔ سنٹرل ایشیا سے آتے تھے۔ سارے دیس میں گھومتے پھرتے مالوہ پہنچے۔ وہاں کا سوریہ ونشی راجہ انکا مرید ہوگیا۔ مالوہ سے چلنے لگے تو بہت دکھی ہوا کہنے لگا آپ کے جانے سے میرا جل ساگر بے رنگ ہو جائے گا۔ اپنا بالک یہیں چھوڑ دیجیے ـــــ جل ساگر سارنگ ہو جائے۔"
"ساگر تو ہوتا ہی جل کا ہے بھئی ـــ" میں نے کہا۔
"فقرائے ہنود کی بول چال میں عالمِ علوی بن ساگر کہلاتا تھا اسکا مشاہدہ کرنے والے بن باسی۔ عالمِ سفلی جل ساگر ـــ ہم تم سب جل باسی ہیں۔"
"ویری انٹرسٹنگ۔" میں نے اخلاقاً کہا۔
"مرشد زادے کو راجہ نے بیٹا بنا لیا۔ اسکے مرنے کے بعد راجکمار سارنگ جو تھے وہ گدّی نشین ہوئے۔ شہر سارنگ پور انہوں نے ہی تو بسایا تھا ریاست دیواس میں۔"
"ای۔ ایم۔ فورسٹر والا دیواس؟"
"وہی۔ اچھا تو سورگیہ راجہ کی جو بیٹی تھی۔ وہ مخدومؒ ـــــ آئی مین ـــــ راجکمار سارنگ کی گویا بہن ہوئی نا؟ اسکا بیاہ فیروز شاہ تغلق کے بیٹے شہزادہ محمود سے ہوا۔ تو اس رشتے سے شہزادہ راجہ سارنگ کا بہنوئی بن گیا۔ بادشاہ نے انہیں دلّی بلا کر اونچا منصب دار مقرر کیا۔" کنور نے گاڑی کی رفتار دھیمی کی۔" ایک مرتبہ کیا ہوا کہ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سندھ سے دلّی تشریف لائے۔

یار یہ بڑے FASCINATING بزرگ رہے ہونگے۔ایک روز فیروز شاہ نے خانقاہ میں انہیں ماحضر بھجوایا۔ملک سارنگ ساتھ گئے۔سوچو کیا منظر رہا ہوگا۔غلاموں کا جلوس سر پر خوان پوش اٹھائے۔خلعت پہنے ملک سارنگ آگے آگے گھوڑے پر۔

"اچھا۔تو کوٹلہ فیروز شاہ سے روانہ ہو کر اس خانقاہ کے پھاٹک پر پہنچتے ہیں۔مخدوم جہانیاںؒ نے لکھا ہے سلطان نے انہیں دلی کی چالیس خانقاہوں کا انچارج مقرر کیا تھا۔تو جناب ملک سارنگ اسپ تازی سے اتر کر اندر پہنچتے ہیں۔دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔

"مخدوم درباری امیر سے انکا حال احوال دریافت کرتے ہیں۔تب ملک سارنگ کو پتہ چلتا ہے کہ وہ تو مخدوم جہانیاںؒ کے فرسٹ کزن ہیں۔

"خود مخدوم زادے تھے۔جہانیاں جہاں گشتؒ کے اثر سے سنیاس لے لیا۔حج کرنے کیلئے پیدل روانہ ہوگئے۔وہاں سے لوٹے گھومتے پھرتے دلی سے سینکڑوں میل دور اس بن بھوم میں آپہنچے۔گیان دھیان کرنے۔"

سینڈی تصوّف اور یوگ کی اصطلاحات بے تکان استعمال کر رہا تھا۔

کچھ فاصلے پر ایک گاؤں نظر آیا۔"سامنے جو جنگل ہے یہی انکا تپ وَن تھا۔وہ دیکھو مسجد کے نزدیک ہرا گنبد دکھلائی پڑ رہا ہے۔انکا مزار شریف۔لکھنؤ کے شاہ میناؒ صاحب انکے خلیفہ تھے۔"

"بہت خوب۔"

"عُرس انکا کل ہی ختم ہوا ہے۔انکے وصال کے پانچ سو سال بعد اس خاندان میں میاں کے والد پہلے ولی پیدا ہوئے۔میاں دوسرے۔"

گاؤں میں داخل ہو کر کنور نے مرسیڈیز ایک برگد کے نیچے روک لی۔

(۳۷)

دَریائے نورُ

میلہ اٹھ چکا تھا۔ دوکانیں بڑھائی جارہی تھیں کچی سڑک پر چرّ چرّ چوں کرتا ایک چھکڑا
ن کررکا۔ گوگلز لگائے سفید ساری میں ملبوس ایک گوری چِٹی خاتون اس پر سے اتریں۔ کنور کو
پہچان کر نمسکار کیا۔ درگاہ کی سمت چلی گئیں۔ پھاٹک پر ایک صاحب کھڑے تھے۔ انہوں نے
نور کو آواز دی۔ وہ ان سے ملنے کے لیے دوڑا گیا۔ مَیں مرسیڈیز سے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مکانوں میں چراغ جل رہے تھے۔ تینتیس برس مغرب کی چکا چوند میں
گزارنے کے بعد میں وطن کے ایک نیم تاریک خانقاہی گاؤں میں موجود تھا۔ اپنے دوست کی
باتوں پر غور کیا۔ شرک۔ بدعت۔ توہمات۔ ری ایکشن اور غیر سائنسی ذہنیت کو فروغ دینے
والے یہ پیر فقیر، خواص وعوام کے لیے اتنی بڑی افیم تھے۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ اس ادہام
پرست ملک میں یہ آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں۔ گھڑی دیکھی۔ کنور کے بچے نے اس کو رد ہ میں
اڈالا۔ یہاں ساری شام کسطرح کٹے گی۔ اور رات مچھر بھی ضرور ہونگے۔ اسوقت طیارے
کے انتظار میں آرام سے پالم کی لاؤنج میں بیٹھا شیواس ریگال سے شغل کررہا ہوتا۔

سامنے دوپلی ٹوپیوں اور تہمد پوش مسلمان کسانوں اور دھوتی پوش ہندو کسانوں کا ہجوم
بڑھتا جارہا تھا۔ ایک شامیانے کے نیچے کرسیاں اور کھاٹ بچھے تھے۔ وہاں بھی لوگ جمع
تھے۔ چند قدم پر سرکنڈوں سے گھرا تالاب۔ درگاہ کے نزدیک ایک وسیع کچا مکان۔

پھاٹک پر ایک سرخ پوش فقیر نے نعرہ لگایا —— حق —— حق —— حق ——

اسیوقت بند دروازوں اور سبز پردوں والی ایک جیپ تیزی سے آن کر مکان کے صدر
دروازے پر رکی۔ بڑھیا گوگلز لگائے ایک خوشرو نوجوان ڈرائیو کررہا تھا۔ دوسرے لمبے سفید
ون اور آبی رنگ کی جرزی میں ملبوس گھنگریالے بالوں والا اتھلیٹک قسم کا دہ کشیدہ قامت

شخص دروازہ کھول کر جیپ سے اترا۔ ہمارے کنور سینڈی کی طرح کا ایک اور فیشن ایبل رئیس زاد
جو اپنے پیر سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔

لیکن جوں ہی وہ گاڑی سے نمودار ہوا بھیڑ اسکی سمت لپکی۔ اس نے مسکرا کر سب کو اشیرواد
دی اور شاہانہ وقار کے ساتھ مکان کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔

اب میں چکرایا۔ ممکن ہے یہ پیر صاحب کا بھانجا بھتیجا ہو جو MOD ہو گیا ہے اور پیر
صاحب کے معتقدین اسکے بھی دست بوسی قدم بوسی کرتے ہیں۔

گلیمرس نوجوان ڈیوڑھی کی کچی سیڑھیوں پر پہنچا ہی تھا کہ کنور بھاگتا ہوا آیا اور جھک کر
اسکے پیروں پر سر رکھدیا۔ نوجوان نے شفقت سے مسکرا کر کنور کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

میں حیران پریشان کار کے پاس کھڑا تھا۔ کنور نے مجھے آواز دی۔ میں وہیں ٹھٹھکا رہا۔
نوجوان اندر چلا گیا۔

چھکڑا کھڑکھڑاتا ہوا برگد کی چھاؤں میں پہنچا۔ اس پر سے اتر کر برساتی پوش خاتون کچھ
دیر قبل درگاہ میں گئی تھیں۔ گاڑی بان مریل گھوڑے کو چارہ کھلانے میں مشغول ہوا۔ میں وہاں
کھڑا کھڑا ذرا عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ مجھ جیسا دنیا دار آدمی۔ کنور صاحب کے مرشد سے کیا
بات کرونگا۔ یہ میرا دائرۂ عمل ہی نہیں۔ انکا جو یہ MOD بھانجا بھتیجا آیا ہے اس سے البتہ
دوستی ہو سکتی ہے۔

میں نے گاڑی بان کو ایک سگریٹ دیا۔ اس نے بتایا کہ قیصر باغ بس ڈپو سے جو بس
خاص طور پر یہاں آنے کے لئے چلائی جاتی ہے وہ شام کو یہاں پہنچ کر دوسری صبح سویرے
لکھنؤ واپس چلی جاتی ہے۔ اسوجہ سے بہت سے لوگ دوسری بسوں پر قصبے تک آکر کھڑکھڑا
کرانے پر لیتے ہیں اور سات کلومیٹر طویل کچی سڑک پر ہچکولے کھاتے یہاں پہنچتے ہیں کیونکہ لوگ
میاں کو بے انتہا چاہتے ہیں۔ دور دور سے آتے ہیں۔ میاں کھدمتِ کھلک کے لیے جیادہ
تر دورے پر رہتے ہیں انکے انتجار میں یہاں ہفتوں مہینوں پڑے رہت ہیں۔ بڑے بڑے
لوگ۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ بیگمیں اور رانیاں۔ بوڑھے۔ جوان۔ امیر۔ گریب۔

گاڑی بان بڑا دلچسپ آدمی نکلا۔ میں نے پوچھا کب سے یہ کھڑکھڑا چلا رہے ہو۔

"صاحب۔ تین چار سال سے۔"

"پہلے کیا کرتے تھے؟"

ذرا جھینپ کر جواب دیا۔"حجور۔ برا کام کرت رہے۔ پتریں کے پیچھے طبلہ ہارمونیم بجاوت
رہے۔" اس نے کسی گاؤں کا نام لیا۔"ہواں اب بھی چالیس ڈیرے ہیں۔ گاتی بجاتی گاؤں
ں گھومتی ہیں۔"

میں نصف صدی قبل کے اودھ میں پہنچ گیا۔ وقت یہاں جیٹ کے بجائے کھڑکھڑے
سوار اپنا سفر طے کر رہا ہے۔

"صاحب۔ آپکو میاں یاد فرما رہے ہیں۔" ایک آدمی نے آکر کہا۔ با دلِ ناخواستہ پیر صاحب
کے آستانے کی سمت روانہ ہوا۔ سورج کی آخری کرنوں میں جھیل سنہری ہوگئی۔ سارنگ ــ
نک کی روشنی کا تالاب۔

کچے مکان کے بیرونی طویل کمرے سے گذر کر خادم کے ساتھ اندر پہنچا۔ کچے فرش کے
ند صاف ستھرے آنگن میں چاروں طرف خوشرنگ پھولوں کے گملے۔ ایک کونے میں ہینڈ
پپ۔ سامنے کچا سہ درہ۔ خدام اور ارادتمندوں کا ہجوم۔ دالان کی بسترچھبوں پر درجنوں مسلمان
ر ہندو لڑکیاں سر ڈھانپے مؤدبانہ بیٹھی تھیں صحن میں کرسیاں اور کیمپ کوٹ۔ وسط میں
ب کیمپ کوٹ پر وہی ہنس مکھ نوجوان گاؤتکیے کے سہارے نیم دراز پیچوان کے کش لگا رہا تھا۔
ر صاحب غالباً ابھی حجرے میں تھے یا مسجد سے نہ لوٹے تھے۔ کنور نے میرا تعارف کرایا۔
رکار۔ یہ ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ راجہ دلشاد علی خان۔ اب مدتوں سے ولایت
رہت ہیں۔"

نوجوان نے شفقت سے مسکرا کر "السلام علیکم" کہا۔ میں نے برطانوی انداز میں "ہاؤ
یو ڈو۔" ایک پریشان صورت غریب عورت بچہ گود میں لیے آکر نوجوان سے بات کرنے لگی۔
نے چپکے سے کنور سے پوچھا۔"تمہارے پیر صاحب کہاں ہیں؟"

"ارے یہی تو ہیں ــــ" کنور نے جواب دیا۔

میں بھونچکا۔ آنکھیں پھاڑ کر گلیمرس نوجوان کو دیکھا۔

میاں میرے استعجاب سے بہت محظوظ نظر آتے۔ اجنبیوں کے اس ردّ عمل کے عا
معلوم ہوتے تھے۔ مجھے AT EASE کرنے کے لئے لندن کے متعلق باتیں کرنے لگے۔
مسکرا کر مجھ پر نظر ڈالی۔

اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ گوز پمپلز۔ محسوس ہوا میرے ماضی اور حال
رتّی رتّی بات اس روشن ضمیر انسان پر عیاں ہے۔ اسیوقت وہ کھڑکھڑے والی خاتون
زنانہ مکان سے برآمد ہوئیں۔ نمسکار اور قدمبوسی کے بعد ہاتھ جوڑ کر پائینتی کھڑی ہوگئیں میا
کے اشارے پر ایک کرسی پر ٹکیں۔ بہت نروس معلوم ہوتی تھیں۔ میاں بے پناہ سنس اف
کے مالک نکلے۔ کہنے لگے "ہم آپکے پیچھے پیچھے یہاں پہنچے۔ آپ تو اسطرح کھڑکھڑے پر بیٹھ
تھیں برساتی اوڑھے گوگلز لگائے جیسے فلم کی شوٹنگ کے لئے جا رہی ہوں۔ غضب کے تیور
میں کنور کے ساتھ ذرا فاصلے پر جا بیٹھا۔ "میاں اتنی کم عمری میں اتنے بڑے ولی کیسے
ہوگئے؟" میں نے طنزاً دریافت کیا۔

"پیدائشی۔" ایک سرخ داڑھی والے بوڑھے پٹھان نے جواب دیا۔ "پانچ سال کی
میں دستار بندی کی گئی تھی۔"

"میاں کے والد علیہ الرحمہ بھی صاحب وقت تھے۔ میاں اس دور کے قطب ہیں۔
— بلکہ قطب الاقطاب۔" شلوار قمیص میں ملبوس ایک دبلی لڑکی گفتگو میں شامل ہوئی۔ کنور
اسکا تعارف کرایا۔ وہ عربی میں ایم اے تھی اور شمالی افریقہ کی کسی یونیورسٹی میں پڑھا چکی تھی

"نہایت MOD قطب ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

دفعتاً لڑکی نے مجھے مخاطب کیا۔ "راجہ صاحب۔ آپ حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی م
کے اسم گرامی سے واقف ہیں؟"

میں نے ذرا مبہم سا سر ہلایا۔ سوچ رہا تھا کہ واقعی بڑے پھنسے۔ لڑکی کہنے لگی "ا
سے نواب عبدالباسط خاں نے قطب وقت سے ملنے کی تمنا ظاہر کی۔ حضرت مولانا
فرمایا تم نے شاہ میناؒ صاحب کی درگاہ میں کل کسی سے جوتا ٹکوایا تھا؟ انہوں نے جواب

، ہاں میں نے انکو کافی سخت سُست بھی کہا تھا۔ مولانا نے فرمایا۔ اچھّا خیر ــــ نواب بولے حضرت
طرح قطب سے ملنے سے کیا فائدہ۔ ہم چاہتے ہیں ملیں اور پہچانیں۔
"ایک روز نواب صاحب معالی خاں کی سرائے جارہے تھے۔ راہ میں گول دروازے
ایک بانکے ملے۔ انہوں نے کہا السلام علیکم۔ انہوں نے جواب دیا۔ وعلیکم السلام۔ اور آگے
ں دیے۔ جب مولانا عبدالرزاق صاحب سے ملے۔ انہوں نے فرمایا کل تم سے قطب ملے
تھے اور سلام بھی کیا تھا۔
"اسکے بعد جناب عالی ایک بھشتی کی وضع میں قطب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے
ب کو پہچنوایا۔ نواب نے سلطنت اودھ کی واپسی کی خواہش کی۔ انہوں نے جواب دیا مقدراؔت
ں کسی کو دخل نہیں ہم تو مقدراؔت کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ عرض کرنے والے دوسرے
ضرات ہیں۔ تمہارے پیر اگر چاہیں تو ہوسکتا ہے۔"
"نا جانے کس بھیس میں نارائن مل جائیں"، کنور نے کہا۔
"ایک قصّہ تو ہمارے دادا آبا سناتے تھے"، عربی داں لڑکی نے بات جاری رکھی۔
انکے ایک دوست تھے۔ بہرائچ میں۔ احمداللہ شاہ۔ انکے ہاں ڈنر پر ایک انگریز آیا تھا
ہ انہوں نے بعد میں بتایا کہ فلاں جگہ کا قطب ہے ــــ"
"CURIOUSER AND CURIOUSER ــــ" میں نے ایلس اِن ونڈرلینڈ
طرح کہا۔ سرخ ریش مولوی صاحب رسان سے بولے ــ" ان معاملات کا مذاق نہیں
ڑانا چاہیے۔ جن باتوں کو آپ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے انکے بارے میں خاموشی بہتر ہے"!
سُرخپوش فقیر نے ڈیوڑھی میں داخل ہو کر حق ــــ حق ــــ حق ــــ کا نعرہ لگایا۔ صحن
چکرؔ کاٹا اور میاں کو ڈنڈوت کر کے باہر نکل گیا۔
"یہ شخص" ــــ کنور نے کہا "نراؔئی کے علاقے کے ایک بڑے مندر کا پجاری تھا۔ فقیری لیکر
ں آن پڑا ہے۔"
میاں اٹھ کر حجرے کی سمت گئے۔ کچھ دیر بعد لنگی کرتا اور دوپلی ٹوپی پہنے واپس آکر پلنگ پر
ے ٹ پیچوان کی نے منہ سے لگالی۔

ہم لوگ پھر انکے قریب جا بیٹھے۔ میں نے ایک عجیب بات نوٹس کی۔ مسلسل حقہ پیتے ر
تھے مگر دھواں غائب۔ سُن رکھا تھا کہ صوفیا اور یوگی ایسی چیزوں پر قابو پا لیتے ہیں جو ——
اتنا سوچا ہی تھا کہ میاں نے پیچوان کا دھواں اُڑانا شروع کر دیا۔
دالان میں خاصہ چُنا گیا۔ عورتوں کا گروہ کھانے کے لیے زنانخانے کی سمت روانہ ہو
بیس پچیس لوگ میاں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے۔" باقی دوسری شفٹ میں کھائیں گے۔"
نے ہینڈ پمپ پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔" سال کے بارہ مہینے صبح شام دعوتی کھانے کی یہ فراو
بھی کرامت ہے۔ لوگ بسوں میں بھر کر آدھی رات کو یہاں پہنچتے ہیں انکے لئے دیگوں کھانا
میں خاموش رہا۔
"سرکار کی ہمشیرگان اور برادرِ خورد بھی بڑا درجہ رکھتے ہیں۔"
اندر دالان میں میاں بحیداخلاق سے پلیٹوں میں کھانا نکال نکال کر سب کو پیش کر رہے
تھے۔" میاں اسوہ حسنہ کی مثالیں پیش کرنے پر مامور ہیں۔" عربی داں لڑکی نے کہا۔
" خلق اللہ کو اپنے دسترخوان پر کھانا کھلانا صوفیائے اکرام کی روایت ہے۔
—— اس دسترخوان پر۔" کنور نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا۔" میاں کے مخالفین بھی موجود ہ
ہیں میاں انکو بھی اسی محبت سے کھلاتے ہیں۔"
" مخالفین کون ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔
" بہت ہیں۔ کہتے ہیں۔ میاں داڑھی کیوں منڈاتے ہیں انگریزی لباس کیوں پہنتے ہیں
باغ میں دس پندرہ کُتے کیوں پال رکھے ہیں کبھی کبھی جماعتیں گاؤں کی مسجدوں میں آدھی
رات کو گرتی ہیں۔ وہ انکو بدعتی کہتے ہیں۔" سرخ ریش نے جواب دیا۔" میاں ملامتی فقرا کے
سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لوگ جتنی انکی غیبت اور ملامت کرتے ہیں انکے مدارج بڑھتے
جاتے ہیں۔"
دسترخوان پر بھانت بھانت کے اشخاص موجود تھے۔ چند صوفی ٹائپ بوڑھے۔ دو۔
برہمن۔ کئی نوجوان۔ میں نے پوچھا میاں اپنے مخالفین کی سرزنش نہیں کرتے۔
" طریقت میں انتقام نہیں ہے" مولوی صاحب نے جواب دیا۔

"بے شمار ہندو شیوجی یا کرشن کا اوتار مان کر میاں کی پرستش کرتا ہے۔" کنور نے
" گوانہوں نے آجتک اپنے متعلق کسی قسم کا دعویٰ نہیں کیا — دوست کے بھید ظاہر
نہیں کرتے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بتلانا مشکل ہے۔" کنور پر پھر کیفیت طاری ہوئی۔
ذرا تامل سے جواب دیا "بس یوں سمجھ لو کہ میاں میں ہمیں بھگوان کا سروپ نظر آتا ہے۔
ورنہ ہم جیسے چالو چکر آدمی اور ایسی بھگتی ؟"

"نرالی شان۔ جمالی شان —" سرخ ریش نے کہا۔
"میاں ہر انسان کو فرداً فرداً اس کے ظرف کے مطابق مختلف رنگوں میں نظر آتے ہیں۔
یہ MYSTICISM کا ایک نکتہ ہے۔" کنور بولا۔

" CHARISMATIC توہیں۔" میں نے اظہار خیال کیا۔

" CHARISMA تو بعض سیاسی لیڈروں اور فلم اسٹارز میں بھی ہوتا ہے۔ یہ جمال
ولایت ہے۔" عربی باجی نے جوش سے کہا۔

اب گاؤں کے لوگ بھی آ گئے تھے۔ صحن کھچا کھچ بھر گیا۔
"خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا ہے۔" عربی باجی نے مجھے مخاطب کیا۔ "ولی کی پہچان یہ ہے
کہ اسکی پیشانی پر نور چمکتا ہے اور چہرے پر رعب داب۔ لقائے الٰہی کو دیکھنے والوں کا چہرہ منور
ہوتا ہے —"

"آپکا کیا مشغلہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم خواجگان چشت کے اودھی سلسلے پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔"
میں نے پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔

"رت جگا یہاں کا معمول ہے۔ آپکو نیند آ رہی ہے ؟"
"جی نہیں۔ جی نہیں۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

طعام کے بعد ہم لوگ صحن میں واپس آگئے۔ کنور نے ایک سانولی پستہ قد خاتون کو تپاک سے آداب عرض کیا۔ ایک کرسی سرکاتے ہوتے بیساختہ خاتون کے منہ سے نکلا "بی تے شن ——! ابلیز! میں چونکا۔ "تم عربی باجی سے ملے۔ یہ ہماری جرمن آپا ہیں۔ زیادہ تر ویسٹ جرمنی میں رہتی ہیں۔ انکا بھی تمہاری طرح یورپ میں کاروبار ہے" کنور نے کہا۔

"ماشاءاللہ!" میں نے جلدی سے کھڑ کھڑے والی بی بی کو کرسی پیش کی۔ انہیں یہاں دیدی پکارا جارہا تھا۔ گفتگو سے اخذ کیا کہ ددھو اٹھکرائین ہیں۔ سوتیلے دیور جیٹھ نے پچاس لاکھ کی جائیداد ہڑپ کرلی — میں سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔ بےچاری بے انتہا عاجز اور پریشان معلوم ہوتی تھیں۔ باری باری ہم سب کی شکلیں دیکھ رہی تھیں۔ اسوقت مجھے خیال آیا اگر میری گوناں گوں جعلسازیوں کا کوئی شکار دیار مغرب سے یہاں آن پہنچے تو کیا ہو —— ! مگر یہ امر محال تھا۔ بیجئے ابھی سے مجھے واہموں نے آن گھیرا!

پتہ چلا دیدی خورشید منزل یعنی لامارٹینیئر گرلز اسکول کی تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک مشترکہ موضوع سخن ہاتھ لگا۔ طریقت اور معرفت وغیرہ کی گفتگو سے بور ہو چکا تھا۔

کنور نے پوچھا "آپ نے میاں کے درشن آج ہی کیے ہیں؟"

"جی نہیں۔ دس بارہ دن ہوتے۔ لکھنؤ میں پہلی بار۔ اپنا دکھڑا ر دیا تو بولے درگاہ پر آجایئے گا۔ یہاں آکر دیکھا یہ تو بڑا دچیتر سا آشرم ہے! لیکن ہم جب چل رہے تھے تو ایک لیڈی جانے کیا کیا کہنے لگیں۔" جرمن باجی بولیں "دیدی۔ آپکو ایک بات بتائیں۔ میاں کے مخالفین کی برائی کبھی نہ کیجئے گا۔ میاں لوگوں کی احمقانہ حرکتوں کو نظرانداز کرتے رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں ان میں اتنی ہی سمجھ ہے۔ اتنی ہی سکت ہے۔ ہر ایک تمہاری طرح دانشمند تو نہیں ہو سکتا۔ ایک روز لکھنؤ میں چند لوگوں پر اعتراض کر رہی تھی اچانک گلا بیٹھ گیا۔ حلق سے آواز ہی نہ نکلے۔ دہشت زدہ ہو کر بھاگی یہاں پہنچی۔ میاں سے معافی مانگی۔ آواز کھل گئی۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے فرمایا تھا خلق خدا کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا تصوف ہے۔"

"عربی باجی" کی طرح یہ "جرمن آپا" بھی نہایت بقراط نکلیں۔

میاں صحن میں آکر پلنگ پر نیم دراز ہوتے۔ ایک قوال نے بغیر ساز کے فارسی کلام سنانا

شروع کیا۔ اس کے پیچھے دوسری کرسی پر بیٹھا اسکا مسکین سا ساتھی تال دیتا جاتا تھا۔
"کفرش ہمہ ایماں شد ــــ تا وعدہ چنین وعدہ ــــ"
سینڈی آنکھیں بند کرکے جھوما کیا۔
"ہم خانہ و مہماں شد ــــ تا وعدہ چنین وعدہ
از بسکہ در آمیزی
تبریز خراساں شد ــــ تا وعدہ چنین وعدہ۔"
"تبریز خراساں شد ــــ سبحان اللہ ــــ سبحان اللہ ــــ" میاں نے داد دی۔
مُرلی قوال عُرس کے لئے شاہجہاں پور سے آیا تھا۔ صبح چھ بجے کی بس سے واپس جانے والا تھا۔ اب صبح کا دو بج رہا تھا۔ میں باتھ روم سے واپس آیا تو ایک بچّے کی سُریلی پاٹ دار آواز سُنی۔ وہ میاں کے پاس کھڑا غزل گا رہا تھا۔ ٹھکرائن دیدی نزدیک کی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ میاں نے ان سے کہا "یہ مچھلی کا بچّہ ہے۔"
"مچھلی کا بچّہ ــــ؟" انہوں نے دہرایا۔

قوال بچّے نے ٹھمری شروع کی۔
جھومت آویں نند کے لالہ گلین ہیں۔ نینن کجرا پاگ بسنتی
گلے موتین کا ہار رے۔ مکھ پر انکے نور براجت
چتوت ہیں چنچل چال رے۔

سرخپوش فقیر دوبارہ نمودار ہوا۔ ڈیوڑھی کے پاس کھڑے ہو کر ناچنے لگا۔ پھر غائب ہو گیا۔ دو اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین ایک برہمن ایک ٹھکرائن میاں کو پنکھا جھلنے میں مشغول تھیں۔ یہ دونوں میاں کو کرشن اوتار سمجھتی تھیں اور انکی آرتی اتارے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ دونوں کے شوہر دیوار کے پاس دست بستہ کھڑے تھے۔ یہ دونوں جوڑے دور دراز کے شہروں سے آئے تھے۔

"میاں بعد نماز فجر حجرے میں تشریف لے جائیں گے"۔ عربی باجی نے کہا۔

ہم بہت کنفیوزڈ ہیں۔ پچھلے تین دن اور تین راتوں میں اپنی روح کے کھڑ کھڑے پر سوار ایک انوکھی اجنبی دنیا میں نکل آئے۔ یہ جملہ بوگس معلوم ہوتا ہے۔ میں کنور کی گفتگو کو بھی PHONEY سمجھ رہا تھا۔ برین واش سا ہو رہا ہوں۔ کیا چکر ہے۔ ابھی دالان کی جاجم پر لیٹا ہوا کنور کہہ رہا تھا۔ دلن بھائی بڑی سہانی بھور ہے چلو ذرا میاں کے کھیتوں تلک گھوم آویں۔ تو میں نے ایک عجیب و غریب بیحد آؤٹ آف کریکٹر جواب اسے دیا۔ میں نے کہا۔ نہیں۔ صاحب۔ ہم تو نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ باجماعت۔

ہم نے نماز عرصے سے پڑھی ہی نہیں ——— آخری بار جو جماعت کے ساتھ ادا کی تھی وہ بڑے ابا مرحوم کی نماز جنازہ تھی۔ اسوقت ایک مولوی صاحب نے بتلایا تھا کہ اس نماز میں مرحوم امامت کرتا ہے کہ جماعت کے آگے ہوتا ہے۔ مردوں کی یہی واحد نماز ہے جس میں عورت بھی امامت کرتی ہے یعنی اسکا جنازہ امام ہوتا ہے۔ عیش باغ کے چمن خاص میں گلفشاں درخت کے نیچے کھڑے مولوی صاحب جب یہ سب کہہ رہے تھے بڑا ڈر سا لگا تھا ——— ہمیں یاد ہے بارش کی پھوار پڑنے لگی تھی اور سر سبز قبرستان میں دُور دو سفید گھوڑے دوڑتے جارہے جارہے تھے۔

تو کیا آج ہم اپنا جنازہ اپنے سامنے رکھ کر نماز پڑھیں گے؟ فجر کی دودھیا روشنی آسمان پر پھیلتی جارہی ہے عرش تا فرش نور کا دریا سا بہہ رہا ہے۔ ہم نے نوٹس کیا ہے کہ اب ہم بھی کنور کی طرح معرفتی جملے استعمال کر رہے ہیں۔

نکتہ: برسہا برس کھڑی بولی والوں سے میل جول کی وجہ سے پڑی بولی کے ہم کے بجائے میں کہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اب رفتہ رفتہ ہم بھی واپس آرہا ہے۔ ویلکم ہوم دلن اولڈ چیپ۔

(۳۸)

روم وتبریز

وسے ٹی کن کا ایک پکچر پوسٹ کارڈ نورمن نے لکھنؤ ہمارے ہوٹل کے پتے پر بھیجا تھا۔ وہ پری بیگم کے ساتھ ہنی مون منانے روم گیا ہوا ہے۔ جب وہ لندن میں پیدا ہوا نورما نے ہمیں امریکہ اطلاع بھیجی تھی۔ لکھا تھا چرچ میں بپتسمہ دلواتے ہوئے اپنے باپ جارج نورمن ڈریک کے نام پر اسکا نام نورمن رکھا ہے۔ کیونکہ ہماری شادی نہیں ہوئی لہٰذا وہ اپنے نانا کا SURNAME ڈریک اختیار کرے گا۔

پڑھ کر ہم دہل سے گئے تھے۔ سوچا تھا ہمارے بھولے، نیک نفس، دین اسلام، خاندانی آن اپر جان دینے والے راجہ جواد علیخان جب اس روز ۱۹۴۲ء کے کرسمس ویک میں اپنی غلط فہمی کی بدولت نورما ڈریک کے بنگلے پر جا پہنچے تھے اور اس اینگلو انڈین رقاصہ کے بدقوارہ باپ نے انہیں خوش آمدید کہا تھا، محکمہ قضا و قدر کے منیجروں نے قہقہہ لگایا ہوگا — ٹھاکر صاحب جلد وہ وقت آنے والا ہے جب آپکا پوتا اس ہاف کاسٹ دلال کا نواسا ہوگا۔ اور اس آپکے پوتے کا نام اسکے بیہودہ نانا کے نام پر رکھا جائیگا۔

عبرت کا یہ تازیانہ ہمارے لئے کافی تھا۔ بہت پیچ و تاب کھایا مگر کچھ کر نہ سکتے تھے۔ ہم جس قسم کی لاقانونی زندگی گذار رہے تھے نورما ہم سے بیاہ کر کے خطرہ مول نہ لینا چاہتی تھی نہ اپنی آزادی کھونے پر آمادہ تھی۔

بہرحال اسکے دادا کنور بہزاد علیخان مرحوم برادر خورد راجہ جواد علیخان مرحوم کے اسم گرامی پر نورچشم کا نام ہم نے اپنی طرف سے بہزاد علی رکھ لیا۔ اور سوچے دل میں اسے اسی نام سے یاد کرینگے۔ اس غریب کا نہ عقیقہ ہوا۔ نہ میراثنیں گائیں نہ ڈومیناں ناچیں۔ نیویارک کی ایک بار میں اشک بہاتے، شراب پیتے، آنسوؤں سے میز کی سطح پر لکھا راجکمار بہزاد علیخان آف دھان پور۔

نورمّن کو اپنے اس دوسرے "انڈرگراؤنڈ" نام کی معنویت کا علم نہیں۔ دادا کون تھے۔ یا بہزاؔد کون تھا۔ علیؑ کون تھے۔

ایک روز یہاں میاں کے ہاں کوئی شخص ایک مصرع بار بار پڑھ کر سر دُھن رہا تھا ع

اک کربلا میں اک مرا ساقی نجف میں ہے۔

مکّہ مدینہ نجف کربلا سب سے بے نیاز کنور بہزاد علیخاں مرحوم کا پوتا تو روم نکل گیا۔

مگر ہمیں اسکا اتنا غم کیوں؟ ان راہوں کا انتخاب ہمارا اپنا نہ تھا؟ کل بینڈی کہہ رہا تھا کہ ازل میں ساری روحیں، ایک تھیں۔ بعد میں الگ الگ ہو گئیں۔ تو کیا میری اور سند ریشور نراین سنگھ اور پوپ آف روم کی روح ایک ہے؟

نہیں صاحب۔ یہ باریکیاں اپنی سمجھ میں نہیں آتیں۔ مگر میاں کی شخصیت ایسی مقناطیسی ہے کہ یہاں سے جانے کو کبھی جی نہیں چاہتا۔ جب آئے تھے تو ہمارا ارادہ تھا کہ رات گذار کر صبح سویرے لکھنؤ چلے جائیں گے۔ انتنے اصرار اور اخلاق سے میاں نے روکا کہ کچھ کہتے نہ بنا۔ لکھنؤ آدمی بھیج کر ہمارا سوٹ کیس بھی ہوٹل سے منگوا لیا۔

کنفیوژن دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لکھا جائے۔ کاش ہم ایک ٹھگ کے بجائے ادیب ہوتے۔ لیکن اسکی کیا گارنٹی ہے کہ ادیب بن کر بھی ہمارا کرُوک پن نہ جاتا۔ اسوقت روپئے پیسے کا گھپلا کرتے ہیں تب اردو زبان و ادب کے معاملات میں گول مال کرتے۔

میاں نے ایک بار بھی ہم سے کوئی ذاتی سوال نہیں کیا۔ نہ اشارۃً کسی قسم کی سرزنش۔ وہ لوگوں کو کسی بات کی ممانعت نہیں کرتے۔ یہ کرو وہ نہ کرو ـــــ البتہ ایک رات جب صحن میں محفل شعر و سخن برپا تھی ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے اور چپکے سے کہا ؎

بڑے بھولے بھالے بڑے سیدھے سادے
ریاضؔ آپکو کچھ ہمیں جانتے ہیں!

ان کو بے شمار اردو فارسی اشعار یاد ہیں۔ اور رامائن کی چوپائیاں اور کبیر کے دوہے۔

ایک سہ پہر حجرے میں فرش پر لیٹے رومیؒ کے اشعار سُنا رہے تھے ہم نے پوچھا آپ نے فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کہنے لگے "ارے ہم نے اردو کے کون سی پڑھی ہے جو فارسی پڑھتے"۔ یقین نہ آیا۔ بعد میں عربی باجی سے پوچھا وہ بولیں "راجہ صاحب اسے علم لدنی کہتے ہیں"

ایک دیہاتی مسلمان حجرے میں داخل ہوا۔ میاں کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی داستان الم بیان کرنے لگا ـــــ سر جھکائے سنا کیے پھر آہستہ سے بولے۔ دیکھو۔ بندر کے بچے کی طرح جو اپنی ماں کو پکڑے رہتا ہے اپنے رب کو پکڑے رہو ـــــ بلی کا بچہ دیکھا ہے نا کسطرح اپنے آپ کو اپنی ماں کے سپرد کر دیتا ہے؟ وہ اسے اپنے دانتوں میں دبوچے پھرتی ہے بچہ اتھن سے منہ لگاتا ہے اسے فوراً ماں کا دودھ مل جاتا ہے"۔ میاں اس دیہاتی سے اسی کی ایجری میں بات کر رہے تھے بہر حال زبردست ماہر نفسیات ہیں۔ یہ صوفیاء صدیوں سے عوام کیلئے سائیکٹرسٹ کا فریضہ تو انجام دیتے ہی رہے ہیں۔ باقی روحانیت وغیرہ اپنے پلے نہیں پڑتی۔

حجرے میں مجمع لگ چکا تھا۔ ایک شخص نے عرض کیا "میاں ہم نماز پڑھنے کھڑے ہوتے ہیں دنیا بھر کی باتیں دماغ میں آتی ہیں"۔

"ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے"۔ ایک بیگم صاحبہ نے کہا۔

"جب آپ پر تیز روشنی پڑ رہی ہو تو آپکے دماغ کے اندر جو سامان بھرا ہوا ہے روشنی کی زد میں وہی تو دکھائی دے گا"۔ میاں نے جواب دیا۔

"میاں یہ تعویز بن گیا ہے"۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔

"اس پر بارہ اماموں کی نیاز دلوا کر پہن لیجئے"۔ میاں نے فرمایا۔

دو میاں بی بی دروازے میں نمودار ہوتے۔ میاں اخبار پڑھنے میں مصروف رہے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر آرتی اتاری۔ مٹھائی کا ڈبہ پیش کیا۔ اسکو ہاتھ لگا کر پھر اخبار میں منہمک۔ مسز تیواری نے حاضرین میں گویا پرشاد تقسیم کیا۔

ہم اخلاقاً برفی کا ایک ٹکڑا لیکر ہاتھ میں تھامے رہے۔ وہ دونوں پالاگن کر کے باہر گئے۔ ایک نوجوان آیا۔ میاں اس سے ٹسٹ میچ کے تازہ اسکور پر تبادلہ خیالات کرنے لگے۔ مولانا تاتاری

داخل ہوتے۔ یہاں ہمیں ترائی کے مسلمان بہت ملے۔ ہمالیہ کے دامن میں دینی عربی مدارس کی کثرت ہے۔ چگی باریک داڑھی والے مولانا بھی شکلاً منگول معلوم ہوتے تھے۔ میاں انکو بہت چھیڑتے ــــ ہمیں مخاطب کیا " دیکھئے پچھلے ساڑھے تین ہزار سال سے ایسے خدوخال کا کوئی انسان پیدا نہیں ہوا۔"

مولانا دلی سے شائع ہونے والے دینی رسائل اور اردو بلٹنز اور دوسرے اردو ہفتہ وار اخبارات کے مضامین میاں کو سناتے ــــ اور جاسوسی ناول۔ وہ دراصل ایک قسم کی بیک گراؤنڈ میوزک ہیں۔ میاں لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ خود اخبار پڑھنے میں مصروف ہیں یا مولانا کوننگ کرنے کے لئے خود اخبار کی سرخیاں پڑھ کر سناتے جا رہے ہیں یا آنکھیں بند کیے غنودگی کے عالم میں ہیں۔ اور مولانا ہیں کہ محمود غزنوی کے معرکوں کی داستان بے تکان پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ادھر انہوں نے کوئی لفظ غلط پڑھا میاں نے ٹوکا۔ اور لغت منگوائی۔ مولانا اپنی بات پر مصر۔ دونوں میں بیحد دلچسپ تکرار رہتی۔ کنور نے ہم سے کہا " وہ بنیادی طور پر غالباً بہت تنہا ہیں۔ جس ناقابل تشریح بلندی پر وہ موجود ہیں وہاں عام انسان کا گذر نہیں۔

" عاشق حسینؑ ہیں ۔ محرم میں تعزیہ داری کرتے ہیں ۔ ایک روز حضرت علیؑ کے متعلق فرما رہے تھے ارے ہمیں جو کچھ سامان ملنا ہے شاہ ولایتؑ ہی سے تو ملتا ہے۔ 'سامان' میاں کا مخصوص لفظ ہے۔ انکی مراد انکی اپنی ولایت سے تھی۔"

یہ کچا مکان جتنا MODEST ہے درگاہ اتنی ہی وسیع اور شاندار۔ پختہ فرش۔ چاروں طرف برآمدے۔ وسط میں مخدومؒ کا روضہ۔ ایک طرف میاں کے والد کا مزار۔ سرے پر خوبصورت مسجد۔ ایک طرف شاہ مینا صاحبؒ کا چلہ۔ روضے کے دیوار میں ایک پتھر نصب تھا اس پر ہاتھ کا گہرا نشان۔

"یہ مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا نشان ہے ــــ" سیاہ رنگ کی BERET پہنے ہوئے میاں کے شوفر نے نہایت وثوق سے اطلاع دی۔" واقعہ یوں ہے کہ جب اسی جگہ پر حضرت مخدومؒ کا وصال ہوا انکے صاحبزادے گھر پہ موجود نہ تھے۔ انکے

مرید شاہ میناؒ صاحب تنہا تھے۔ بہت پریشان ہوئے کہ اکیلے کسطرح تجہیز و تکفین کریں۔ کیا دیکھتے ہیں ایک نقاب پوش بزرگ سبز عمامے سبز عبا میں ملبوس گھوڑے پر سوار جنگل میں سے نمودار ہوتے وہ مشکلکشا علیؑ شیر خدا تھے۔ حضرت مخدومؒ کی تجہیز و تدفین میں شاہ میناؒ صاحب کی مدد کی اور واپس تشریف لے گئے۔"

میں خاموش رہا۔ کنور سر پر رومال باندھے ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے روضے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کواڈرینگل کے برآمدوں میں کینٹے مقیم تھے۔ مجاور اور بھکاری مفقود۔ رات ہو چکی تھی۔ درگاہ کے باہر درختوں میں بھیگی ہوئی ہوا سرسرانے لگی عربی باجی نے کہا ـــ "عین اسی جگہ ان اولیاء کے کچے جھونپڑے موجود تھے۔ صدیاں ہمارے سروں پر سے سنسناتی ہوئی گذر رہی ہیں۔"

"حق ـــ حق ـــ حق ـــ" سرچپوش برہمن پجاری نے احاطے میں نعرہ بلند کیا۔

"میاں جس کچے مکان میں رہتے ہیں وہ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا ہر سال برسات میں اسکا کچھ حصہ گر جاتا ہے اسے پھر لیپ پوت کر ٹھیک کر لیا جاتا ہے۔ صدیاں بھی تو خام اینٹیں ہیں ڈھے جاتی ہیں تو مٹی سے نئی گھڑ لی جاتی ہیں۔" عربی باجی نے کہا۔

مجھے نیویارک کی اسکائی لائین یاد آئی اور شکاگو کا پلے بوائے کلب۔ زین تنق کیوں نہ ہوئی۔

"چرچ کی رسومات کو MYSTERIES کہا جاتا ہے۔" کنور بولا۔ درگاہ سے باہر آکر ہم لوگ دھان کے کھیت میں سے گذر رہے تھے۔ میاں بڑی جھیل کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ غروب آفتاب کی سرخی پانی پر منعکس تھی دوسرے کنارے پر گھنا جنگل سرسرا رہا تھا۔

"ہولی کمیونین۔" کنور نے جھیل اور آسمان کے گھُلے ملے ارغوانی رنگ کا نظارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہی تو ہمارا بندرابن ہے۔ وہ ہمارے بن راج کھڑے ہیں۔ پانی کے کنارے۔ تنہا۔ کنہیا کی مُرلی اور پیر رومیؒ کی نے سب ہم سُن لیتے ہیں۔ جبرئیل نے بھی تو کہا تھا اے رو جو میرے ساتھ ناچو میں تمہارے لیے بانسری بجاؤں گا ـــ حضرت علیؑ نے ناقوس کی آواز سنکر فرمایا تم

سمجھتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے ——؟ سبحان اللہ۔ حقاً حقاً ان المولیٰ قد یبغیٰ ——"

ہم کنور کو دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ اپنا پرانا لوفر سینڈی تو نہیں تھا۔ جانے کون تھا۔

"دلّن بھائی۔ روم میں ہم نے ہزاروں ہزار یورپین اور امریکن زائرین کو دیکھا ہے جو عیسائی اولیاء کے تبرکات کو چومنے کے لیے جوق در جوق گرجاؤں میں جاتے ہیں۔ تم انکو نہ جاہل کہتے ہو نہ توہم پرست جیمز دیٹ فادرز سے زیادہ پڑھا لکھا کون ہوگا؟"

"سائیکولوجی آف ریلیجن ایک کتاب ہے۔ ہم تم کو پڑھنے کے لیے بھیجیں گے لندن سے۔"

"وہ بھی ہم نے پڑھ رکھی ہے۔ مدھوبن میں پہنچنے سے پہلے۔"

کھیت کی منڈیر پھلانگ کر ہم دوسری روش پر آ گئے جو آم کے باغ میں سے گذرتی درگاہ کی سمت جاتی تھی۔ سیاہ درختوں میں سے جھلکتا جھیل کا پانی چغتائی کی واش معلوم ہو رہا تھا۔

ایک درخت کے نیچے میاں کا پالتو منڈھا بندھا ہوا تھا۔

سائبان میں چری کاٹنے کی مشین رکھی تھی۔ ایک سفید ریش بنچ پر بیٹھے تھے۔

دور گاؤں کے ایک مکان میں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔ عبداللہ کے انگنوا میں حوریں ناچیں چھما چھم —— حوریں ناچیں۔ جھیل پر بہتی پروائی نے عورتوں کا گیت لہروں کی طرح پھیلا دیا ——

"LIVING WATERS بائبل میں اسی کو کہا گیا ہے۔" کنور تیز تیز چلتا ساحل پر پہنچا۔ میاں سے کچھ فاصلے پر مؤدبانہ جا کھڑا ہوا۔

(۳۹)

جنگل میں جگنو

—— نورتما کو خط لکھنے کے لیے بریف کیس کھول کر قلم اور پیڈ نکالا۔ وہ حیران ہوگی اب
ت کیوں نہ پہنچا۔ اس تاخیر سے پیرس والے معاملے میں جو نقصان ہوگا سو الگ۔ کنور کو اپنی
رف آتے دیکھ کر پیڈ ایک طرف رکھدیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

" رانی صاحب کو اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دی ؟" اس نے ڈانٹا۔ " ہر بی بی کا قاعدہ
ہے اپنے شوہر کے پرانے دوستوں سے جلتی ہے۔ رانی صاحب بھی سوچیں گی ——"

—— الجھ کر بات کاٹی۔ "نہیں یار۔ خط تو ہم لکھ چکے ہیں" پھر جھوٹ بولا۔ میاں کے
مدمت میں لوگ با وضو حاضر ہوتے ہیں ہم کم از کم اپنی دروغ گوئی ہی سے باز آئیں۔

ہم لوگ شامیانے کے نیچے بیٹھے تھے۔ کنور نے اچانک ہمیں مخاطب کیا۔ "لکھو۔
لکھو —— آں خطاط ——"

"۔ آں خطاط ——"

" سہ گونہ خط نوشتی۔ یکے او خواندی، لاغیر! یکے راہم او خواندی ہم غیر،
یکے نہ او خواندی، نہ غیر او۔ آں خط سوم منم۔ اب ویدانت کا ایک نکتہ ——"

اسیوقت شامیانے میں چند ڈکیت نما صاحبان اطمنان سے آکر ایک کھاٹ پر ڈٹ
گئے میں نے کنور کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میاں کے ہاں محض تمہارے لیے انٹلکچوئیل ہی نہیں آتے۔"

مجھ جیسا انٹلکچوئیل! ارے سندریش نرائن سنگھ کو کیا معلوم ایک انٹرنیشنل ڈکیت سے
بات کر رہا ہے۔

" شروع شروع میں" کنور کہتا رہا، "میاں کے ساتھ چند نامعقول سے آدمیوں کو دیکھ کر

ہم نے پوچھا تھا آپ کیسے بے تکے لوگوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں فرمایا ٹوٹی پھوٹی موٹریں
تو کارخانے میں مرمت کے لئے آتی ہیں۔ میاں جہاں جاتے ہیں بھانت بھانت کے انسا
کا ہجوم انکے ہمراہ ہوتا ہے۔ گویا شیوجی کی بارات۔ پھر کہا تو انہوں نے محض جواب یہ دیا ار
جو ان دیکھے لوگ ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں تم کو نظر آجائیں تو تمہارا کلیجہ شق ہو جائے
مولوی صاحب ٹھکرائن دیدی، عربی اور جرمن باجیاں اور ایک نو وارد خاتون آ
پہنچیں۔ میاں کے انوکھے فضائل کا تذکرہ چھڑا۔ وہ خاتون بولیں: "جب مجھے لوگو
نے بتایا کہ وہ میاں کو بیک وقت کئی مسجدوں میں نماز پڑھتے دیکھ چکے ہیں تو میں۔
زور کا قہقہہ لگایا۔ پہلی بار آئی سرکار بس اسٹاپ تک چھوڑنے قصبے تشریف لے گئے
کوئی میلہ چل رہا تھا۔ بھیڑ کی وجہ سے جیپ بس اسٹاپ سے بہت دور رکی۔ میں اتر کر بمشکل
ہجوم سے نکلتی بس میں پہنچی وہ کھچا کھچ بھری ہوئی۔ دھکا پیل میں بیحد گھبرائی۔ پلٹ کر دیکھ
سرکار دور اپنی جیپ میں موجود تھے ــــ کیا دیکھتی ہوں بس کے اندر کھڑے مسکرار
ہیں۔ مجھے جگہ دلوائی اور خدا حافظ کہہ کر اتر گئے۔"

"اولیاء" ــ عربی باجی بولیں۔ "زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔ رات کو جہاں
ڈیوٹی لگائی جاتی ہے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اکثر صبح گیارہ بارہ بجے تک حجرے کے
دروازے نہیں کھلتے۔ اسوقت وہ نجانے کہاں کہاں "ASTRAL TRAVELS"

"میرا پاکستانی بھانجا ــــ" نو وارد خاتون نے کہنا شروع کیا۔ "امریکہ میں تھا۔ ک
کے حادثے میں بری طرح زخمی ہوا۔ ہسپتال لے جایا گیا وہاں سے ٹرنک کال آئی بچنے
امید کم تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر میاں کو بتلایا۔ وہ لکھنؤ پہنچے۔ ایک ہسپتال میں جا کر ایک پلنگ
پر لیٹ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کر رہے ہیں۔ چند روز بعد امریکہ سے اطلاع آئی کہ
بالکل ٹھیک ہے۔ اور پاکستان آ رہا ہے۔ آپا جان یہاں آئی ہوئی تھیں۔ فوراً واپس
جب وہ روانہ ہو رہی تھیں میاں نے ان سے فرمایا خواجہ فرید گنج شکرؒ کے روضے پر جا
ہمارا سلام کہیے گا۔ ہم مطمئین ہو گئے کہ میاں نے اس بچے کو خواجہ فریدؒ کے سپرد کر دیا
مولوی صاحب بولے: "راجہ صاحب ان لوگوں کا اپنا ایڈمنسٹریشن ہے۔ رات کو ا

کی کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ وہاں سب معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں سب سے بڑی کانفرنس اجمیر شریف میں سلطان الہندؒ کے آستانے پر ہوتی ہے۔ اور دنیا میں سب سے بڑی مدینہ شریف میں۔ دربار نبوی ﷺ سے احکام جاری ہوتے ہیں "

"ایک بار،" کنور نے کہا "میاں نے ہم سے محض یہ فرمایا تھا کہ ساری دنیا میں ساڑھے تین سو قطب موجود ہیں۔ وہ سارا نظام چلا رہے ہیں۔"

ہمیں وہ پہلے روز کا انگریز قطب والا قصہ یاد آیا۔ پوچھا "چینی قطب بھی ہوتے ہونگے امریکن اور فرنچ بھی۔ لیکن سوویٹ یونین میں شاید کوئی قطب موجود نہیں۔ اچھا یہ بتایئے ان اقطاب نے ہائیڈروجن بم وغیرہ کیوں بننے دیے ؟"

"دنیا دار المکافات ہے۔" سرخ ریش نے جواب دیا۔

"میاں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ قطبیہ بھی موجود ہیں۔ خاتون قطب۔ اور رجال الغیب میں عورتیں بھی شامل ہیں۔" عربی باجی نے کہا "لیکن کٹھ مُلّا عورتوں کو ناقص العقل ــــــ"

"چائے نوش کیجیے ــــ" میں نے عرض کی۔

"ہمارے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ بعض اولیاء عالم طیر رکھتے تھے۔"

"آپ پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں بھی سب پریوں کی کہانیاں لکھ رہی ہیں ؟" میں نے باستعجاب دریافت کیا۔ "یہ سائنس اور تعقّل کا زمانہ ہے۔ چار سو سال سے مغرب پریوں کی کہانیاں مسترد کر چکا ہے۔ ہمارے ہاں سر سید احمد خان وغیرہ نے زندگیاں اسی جدوجہد میں صرف کر دیں کہ ہم اپنے توہمات سے خود کو آزاد کریں۔ آپ لوگ ہم دیکھتے ہیں کہ ازسرنو اپنے ذہنوں پر میڈیول تصورات طاری کر رہے ہیں کیا واقعی یہ ایک عالمگیر سازش ہے کہ تھرڈ ورلڈ کو پھر مذہب پرستی اور اوہام کے جال میں گرفتار کر دیا جاوے ــ جب سے ہم یہاں آئے ہیں میاں کی گوناگوں کرامات کی حکایتیں سُن رہے ہیں۔"

چند لمحوں بعد ایک خادم ڈیوڑھی سے نمودار ہوا۔ "راجہ صاحب۔ کنور صاحب۔ میاں آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

" یہ بہت معمولی بات ہے۔ تم میاں کے متعلق جن شک وشبہات کا اظہار کروگے میاں کسی فاصلے پر ہوں انہیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔" سینڈی نے قہقہہ لگایا۔
" اسے TELEPATHY کہتے ہیں جس چیز کو تم میاں کی روحانی طاقت گردانتے ہو محض E. S. P. ہے۔ دراصل سائنس نے ابھی تک انسانی ذہن کی بہت سی UNTAPPED قوتوں کو ڈسکور نہیں کیا ہے۔ اگلے سو پچاس سال میں ساری حقیقت کھل جائیگی۔ وہ کیا ہے بایو انرجی ——"
" بایو انرجی !" —— کنور نے دہرایا۔" یہ اصطلاح روسیوں نے اسلیے اختراع کی ہے کیونکہ وہ روح کے منکر ہیں۔ اور کسی حالت میں اسکے وجود کا اقرار نہیں کرسکتے۔"
" روحانیت اور مادیت کے متعلق یہ بڑے متنازعہ مباحثے ہیں۔" میں نے اکتا کر جواب د

ڈیوڑھی، صحن اور دالان عبور کر کے میاں کے کمرے میں پہنچے۔ مسکرا کر بولے۔" آئیے۔ آئیے۔ تشریف رکھیے۔" چاء بنا کر پیش کی۔ حجرے میں اسوقت ہم لوگوں کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا —— ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں مگا کہنے لگے —— " یہ سائنس اور تعقل کا زمانہ ہے۔ نہ کہ ادھام پرستی کا۔"
ہم ہڑبڑا گئے۔ میاں ہمارے الفاظ دہرا رہے تھے اسکے بعد انہوں نے گویا ایک بالکل غیر متعلق موضوع چھیڑا۔ کہنے لگے۔ صوفی کو پہلے غوطے میں کرامات حاصل ہوتی ہیں۔ اسکے بعد ایک ہزار مقامات ایسے ہیں کہ اگر صوفی کرامات کی طرف نظر کرتا ہے تو وہ ایک ہزار مقامات اس پر منکشف نہیں ہو پاتے۔ حجاب حائل ہو جاتا ہے۔ راجہ صاحب اور چاء —— ؟ لیجیے یہ سموسے نوش کیجیے ——" انہوں نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور کہا" عبادت بغیر توبہ کے تشنہ ہے۔ عاصی اپنے عصیاں سے۔ زاہد اپنے زہد سے۔ خدا کا دوست اپنے مقامات و کرامات سے توبہ کرتا ہے —— توبہ زیست تا مردن ہے۔"
" میاں صوفی اپنے مقامات سے بھی توبہ کرتا ہے ؟" جرمن باجی نے سوال کیا۔
" اوہو! جرمن باجی! آج تو آپ نے بڑا اسمارٹ لباس پہنا ہے۔ بالکل بوائے اسکاؤٹ

جی ہاں۔ مقامات صوفی کے لئے حجاب بن جاتے ہیں۔ توبہ کے بعد وہ صفات کے بجائے ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ نبی کے لیے معجزے کا اظہار ضروری ہے۔ ولی کے لیے کرامت کا اخفا لازم ہے۔ کیونکہ جب ولی کرامت کا اظہار کرتا ہے اتنی دیر کے لیے اسکی توجہ خدا سے ہٹ جاتی ہے۔ اس دوران میں وہ سو مقامات نیچے اتر آتا ہے۔ اسی لیے وہ کرامت کا اظہار بدرجہ مجبوری کرتا ہے ——"

صحن میں کوئی شخص روتا چلا آتا داخل ہوا۔ میاں نے کہا۔"ہم ابھی آتے ہیں۔"

انکے باہر جانے کے بعد کنور نے کہا۔"شاید کوئی پاگل لایا گیا ہے۔ دلن بھائی۔ جو کام میاں کرتے ہیں وہ فیض ہے کرامت نہیں ہے —— سمندر میں جاؤ تو موتی ملیں گے۔ وہ سمندر کی خاصیت ہے۔ اسی طرح میاں کے فیوض جگنو از خود روشنی کر کے اڑتا ہے۔ میاں کے فیوض برکات عوام انکو کرامت سمجھتے ہیں۔ ایک بزرگ جب باہر نکلتا ہے اسکی خوشبو آپ سے آپ پھیل جاتی ہے۔ کرامت وہ ہے جس کے لیے CONCENTRATE کیا جائے۔ فیض خدا کے دوستوں کا وصف ہے۔ دوسروں کو خود بخود پہنچتا ہے۔"

خانقہی روایت کا مابعد الطبیعاتی تسلسل ——

شام میاں حسب معمول مکان کے کچے آنگن کے اندر پلنگ پر بیٹھے پیچوان نوش کرتے تھے۔ پیچھے ایک مرید کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ ہمیں بار بار اس اس خیال نے ستایا کہ گو ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں مگر یہ منظر مانوس سا ہے۔ کچھ دیر سوچا۔ ایکدم یاد آ گیا۔

اٹھارویں صدی کا نگڑہ قلم کی ایک تصویر۔ میناتوڑی۔ بالکل یہی سین۔ برآمدے کے سامنے آنگن میں بچھا پلنگ۔ اس پر مچھر دانی۔ آدھی اُلٹی ہوئی۔ گاؤ تکیہ۔ مہتابی چہرے والا ایک نوعمر صوفی۔ ذرا بھاری جسم۔ سر پر گول ٹوپی —— سفید لباس۔ آلتی پالتی مارے بیٹھا۔ حقہ کی نَے ہاتھ میں۔ ذرا سنجیدہ۔ بالکل میاں والا انداز۔ وہی شکل اور جثّہ اور لباس۔ مسہری کے پیچھے مورچھل سنبھالے ایک سیاہ فام خادم۔ حیرت انگیز۔

تصویر کی تفصیل اس وجہ سے یاد ہے کہ ہم نے اسے ڈبلن کے ایک میوزیم سے اُڑا لیا تھا۔

جھٹ پٹے وقت کنور کے ساتھ جھیل کے کنارے ٹہلنے چلے گئے۔ ایک کنج میں ٹھٹھکے۔ مکمل خاموشی۔ ہوا ساکت۔ افق پر طلوع ماہ کی روشنی پھیل رہی تھی۔ چنبیلی کی جھاڑی میں جنبش ہوئی۔ "LITTLE PEOPLE" میرے منہ سے نکلا۔

"جہاں پھول ہیں وہاں پریاں بھی ضرور ہونگی"، کنور نے سادگی سے کہا۔

ہم لوگ دو بچے تھے جو صحن چمن میں کھیلنے اور تتلیوں کے پیچھے دوڑنے نکل آئے تھے۔ فطرت کے قریب پہنچ کر انسان اپنی بدی فراموش کر دیتا ہے۔ میں نے یکلخت اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

"لٹل پیپل ——!" کنور نے دہرایا وہ بھی اپنی نرسری میں پہنچا ہوا تھا —— ایک آئرش گورنس نے اسکی پرورش کی تھی —— "کہتے ہیں۔ یہ ننھے منّے لوگ مرغزاروں میں جمع ہو کر چاند کے نیچے بانسریاں بجاتے اور گاتے ہیں —— NATURE SPIRITS —— انکی آوازیں ہمارے کانوں میں نہیں پہنچتیں —— MYSTIC انکو سُن لیتے ہیں :"

"شاعر تو ہزارہا برس سے یہی سب الاپ رہا ہے۔ تم نے اسے LITERAL سمجھ لیا!"

"حقیقت کو شاعری تو تم گردانتے ہو —— مس سیلون بتاتی تھیں انکی کاؤنٹی کورک کے کسانوں کو چاندنی راتوں میں مشروم پر بیٹھے ELVES نظر آجاتے تھے!"

"آئرلینڈ غریب اگریکلچرل ملک ہے۔ لہٰذا تخیّل پرست۔ انڈسٹریل ریوولیوشن سے قبل۔" میں نے جواب دیا۔ "جہان غرب کے سارے مرغزار پریوں سے آباد تھے۔ دماغی الجھنوں سے آزاد سادہ لوح کسانوں کو فطرت سے ہمکنار رہتے ہوئے پریاں تو آپ ہی نظر آویں گی۔ معصومیت معصومیت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دیکھو بچے اور جانور ایک دوسرے کو کتنا پیار کرتے ہیں۔ تمہارے بھارت ورش میں جہالت اور غربت کی فراوانی ہے چنانچہ اتنا ہی تخیّل بے مہار چھُٹا ہوا ہے ہر درخت پر تو تمہارے کے ہاں کوئی نہ کوئی دیوی دیوتا براجمان ہیں۔"

کنور نے قہقہہ لگایا۔ جامنوں پر اترنے والوں کی چہکار پیٹ ٹیاؤں پر تتلیاں۔ گھاس پہ بیر بہوٹیاں۔ سب سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے سارس۔ لہروں پر راج ہنس ہرے درختوں کے نیچے گلہریاں۔

"مائی گوڈ۔" میں نے بیساختہ کہا" یہ کنج تو بالکل AS YOU LIKE IT کا سیٹ معلوم ہوتا ہے۔ یاد ہے۔ ہم نے مارٹ میں جس سال اسٹیج کیا تھا اور اسکا گیت میں نے ہی گایا تھا۔۔۔"

میں نے گنگنا نا شروع کیا UNDER THE GREENWOOD TREE

کنور نے آواز ملائی WHO LOVES TO LIE WITH ME

دونوں نے ایک ساتھ ملکر اٹھایا AND TURN HIS MERRY THROAT

UNTO THE SWEET BIRD'S NOTE

COME HITHER, COME HITHER, COME HITHER.

HERE SHALL HE SEE NO ENEMY,

BUT WINTER AND ROUGH WEATHER

دفعتاً میں نے نوٹس کیا کہ جسطرح اس روز شام لا مارٹینیر میں عمران زیدی نے منہ اٹھا انگلش اسکول بوائے انداز میں گایا تھا ہم دونوں بھی اسیطرح اٹنشن کھڑے الاپ رہے تھے یا پل کی پل میں نصف صدی قبل کے لا مارٹینیر کے دو کمسن طالبعلم بن چکے تھے۔ مالی جھونپڑے سے نکل آیا تھا تعجب سے منہ کھولے ہمیں تک رہا تھا۔ میاں کی خدمت میں بھانت بھانت کے مہمان آتے ہیں مگر یہ ادھیڑ عمر کے دو ٹھو صاحب لوگ تو ایک اندھیرے کنج میں اٹنشن کھڑے انگریزی گانا گا رہے ہیں!

میں نے چمپا کی ایک ٹہنی سامنے سے ہٹائی۔

چونک کر چاروں طرف دیکھا۔۔۔ کنور ایک نوکیلے کانوں والے آئرش پریزاد کی طرح متبسم اور شاداں۔

"شاہراہ خود آگاہی!" اس نے کہا۔

"خود آگہی یا خواب گری؟" میں نے دریافت کیا۔

پتوں میں چھپی ایک چڑیا چہچہائی۔

میاں پگڈنڈی پر مل گئے کہنے لگے چلیے کل آپ لوگوں کو ذرا باہر گھما لادیں۔

آج جب ہم پیپل اور بیل کے جھرمٹوں کے درمیان سے گذرتی شاہراہ پر پہنچے شام ہو چکی تھی۔ میاں فراٹے سے ڈرائیو کرنے میں مصروف حسب معمول زیرلب وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ہیڈلائیٹس کی زد میں آکر سفید سنگ میل چمک اٹھتے۔ گھاگھرا گھاٹ — فیض آباد — ایودھیا —

"ایودھیا سے نکل کر —" دیدی بولیں "بھگوان رام مہارانی سیتا اور لچھمن جی انہی بارہ بنوں میں تو گھوما کیے —" وہ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھیں۔

"بدھی سیتا۔ من راون۔ گیان رام" پیچھے سے کنور نے گویا کمنٹری کی۔ پھر بولا "دلن بھائی۔ حضرت عبدالرزاق رحمۃ کا نام نہیں کیا یاد ہوگا۔"

"وہی جنکا قصہ اس روز عربی باجی نے سنایا تھا؟"

"جی نہیں۔ وہ تو حضرت مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی تھے۔ یہ سید عبدالرزاق بانسوی بارہویں صدی۔ مُلّا نظام الدین فرنگی محلی کے پیرومرشد" عربی باجی نے جواب دیا۔ وہ اور جرمن باجی جیپ کے پچھلی نشستوں پر فروکش تھیں "آسیب زدہ لوگ انکے روضے پر جاتے ہیں۔ شفایاب ہونے۔ بانسہ شریف — حضرت کلیانی ندی کے کنارے برگد تلے عبادت فرماتے تھے۔ ایک رات ہُو کا عالم پاپیادہ لکھنؤ تشریف لے جارہے تھے۔ جنگلوں میں پہنچ کر راستہ بھول گئے — دو نوجوان ملے۔ تیر کمان لیے۔ ایک گورا ایک سانولا۔

"انہوں نے کہا آج رات ہمارے مہمان رہیے۔ حضرت کو کُٹی میں لے گئے موہن بھوگ کرایا۔ کُٹی میں دو شیر موجود تھے۔ لڑکے بولے آپکی حفاظت کے لئے منگوائے ہیں۔ حضرت نے رات وہیں گذاری۔

"حضرت عبدالرزاق بانسوی کے ہاں کرشن مراری کی ایمجری بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس خطّے کے دوسرے صوفیوں کے ہاں بھی۔ یہ بزرگ اودھی میں شعر کہتے تھے

اور کرشن اور رادھا اور گوپیوں اور برج باسیوں کی تلمیحات کو تصوف کی علامتوں اور استعارات کے طور پر استعمال کرتے تھے،" میں عربی باجی کے تبحر پر متحیر رہا۔

جگنوؤں کی بارات اڑتی ہوئی سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔

"ایک اور حکایت ہے،" کنور کی آواز آئی: "حضرت کے ایک مرید بانسہ شریف جا رہے تھے۔ رات پڑے ایک چوپال میں رُکے۔ وہاں ناچ گانا ہو رہا تھا۔ وہیں پر ایک سانولا خوبصورت نوجوان موجود تھا۔ اس نے کہا آپ جہاں جا رہے ہیں انکو ہمارا اسلام کہیے گا۔ مرید جب بانسہ شریف پہنچے۔ حضرت کو سلام نہیں پہنچایا۔ انہوں نے فرمایا ایک سانولے خوش جمال نوجوان تمہیں راہ میں ملے تھے؟ انہوں نے ہمیں سلام کہلوایا تھا۔ وہ کرشن جی تھے —"

عقائد کی دنیا عجیب و غریب ہے۔ رامچندر جی اور کرشن جی مغلیہ اودھ میں! بی بی مریمؑ پرتگال میں اسلامی عہد کے فاطمہؓ نامی شہر میں چند گڈریہ بچوں کو دکھلائی دیں۔ اب ساری دنیا کے کیتھولک OUR LADY OF FATIMA کے نام سے انکے بُت کی پرستش میں جٹے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے مدینۃ الفاطمہ اور مدینۃ الزہرا جیسے شہروں والے اسپین کو مسلمانوں نے کیوں کھویا۔ کوئی معجزہ ہو جاتا۔

میاں نے وظیفہ پڑھتے پڑھتے مجھ پر نظر ڈالی۔

میں سوچا کیا۔ اس برصغیر میں کہیں قدم رسولؐ پایا جاتا ہے۔ کہیں حضرت علیؑ کا پنجہ کسی مقام پر امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ گھوڑے پر سوار نمودار ہوئے۔ چودہویں صدی بارہ بنکی کے اس جنگل میں حضرت علیؑ تشریف لے آئے۔ حضرت مخدومؒ کی تجہیز و تکفین میں مدد کے لئے۔

مغامیاں نے میری طرف جھک کر کہا "ہوں" اور خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے۔

میٹا فزکس کو فزکس سے الجھانا نہیں چاہیے۔

بدّو سرائے سے کئی میل آگے نکل کر ایک سنسان مقام پر فروزاں درگاہ کے سامنے

جیپ روکی: "ملامت شاہؒ کا مزار،" دروازہ کھول کر اترتے ہوئے ہم سے کہا۔ "ملامتی بزرگ۔"
گھُپ اندھیری رات۔ ان گنت جگنو۔ قبریں۔ چاروں طرف گھنا جنگل۔ مور چلا رہے تھے
جینز میں ملبوس مُرشد نے سگریٹ سلگایا۔ اور لوگوں سے باتیں کرتے پھاٹک
میں چلے گئے۔ کنور نے کہا "لگتا ہے کوئی یوروپین ٹورسٹ ادھر سیر کرنے آنکلا ہے۔
میاں کے والد علیہ الرحمہ بھی ملامتی تھے۔ برجس پہنکر شہسواری کرتے تھے۔ وہ بھی نہایت وجیہہ تھے۔
اور میاں کی طرح پروگریسو۔"
ہم لوگ نئے مسافر خانے کی منڈیر پر جا بیٹھے دونوں باجیاں لگاتار بولا کیں:

"سیّد احمد بخشی:"
"انکے جد تھے۔ کہاں نخیش۔ ایران۔ کہاں بارہ بنکی کا یہ جنگل۔ حیرتناک معاملات
حضرت عبدالرزاق بانسویؒ، ملامت شاہؒ اور سنت جگجیون داس ۔ یہ تین دوست تھے۔
تین چار فقراء اور ایک جوگی کسی درخت کے نیچے اسوقت بھی اکڑوں بیٹھے ہیں ——
فیتوں سے گھٹنے باندھے ۔ ہاتھ میں دوتارہ۔"
"کہاں؟"
"مغل تصویروں میں۔"
"نورمن ڈریک — انگریزوں کے قبرستانوں ہی کی خاک چھانتا پھرا روزایک
آرٹیکل اسکا کسی نہ کسی کھوسٹ فرنگی کی قبر کے بارے میں اخبار میں موجود۔"
"انگریز قوم ہندوستان کو کیسطرح بھول نہیں سکی ہے۔"
"تغلق شہزادہ مخدوم سارنگ کو جنگل جنگل ڈھونڈا کیا اس جگہ پہنچا جہاں فتحپور۔"
"معلوم ہے۔ ایک بزرگ ملے انہوں نے فرمایا اس جگہ کو بسا دو نو شیخ کا اتہ پتہ
بتادیں اس نے پانچ گھر آباد کروائے۔"
"محلہ پنج گھرا —" میں نے بے اختیار پلٹ کر سوال کیا۔ "کیا اب بھی آباد ہے؟"
"بالکل —"

"وہیں ہمارے ایک ماموں رہتے تھے۔" میں نے یاد کیا۔

جگنو بے نیازی سے اڑتے پھر رہے تھے۔ "یہاں بھی عرس ہوتا ہوگا" میں نے کہا۔
"زبردست" کنور نے جواب دیا۔ "سنت جگ جیون داس کی سمادھی پر بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ کوتوادھام میں ——"
"عرسوں اور میلوں کے علاوہ سیاسی اور معاشی حقائق کیا ہیں" میں نے چڑ کر پوچھا وہ عربی باجی سے مخاطب ہو چکا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اس تاریک جنگل میں اجنبی جگہ پر —— اجنبی تو نہیں۔ صدیوں سے یہاں موجود رہا ہوں۔ خلجیوں کے زمانے سے آباد علمائے ظاہر و باطن کی اس سرزمین نے مجھ جیسے ناکارہ لوگ بھی پیدا کیے۔

آزادی سے پہلے اس صوبے کی زمین کا پانچواں حصّہ مسلمان زمینداروں کی ملکیت تھا۔ گو آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۱۲ فیصدی تھا۔ محض اودھ میں ۷ے مسلمان تعلقدار تھے۔ میں یہاں سے کیوں بھاگا۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد اپنی بدلی ہوئی کمتر حیثیت منظور نہ تھی۔ میں نے کیا غلط کیا۔ ہر شخص اپنی بہتری چاہتا ہے۔ برطانوی تسلّط کے بعد مسلم اشرافیہ خوار و خجل ہوا تھا۔ انکے پاس جدید تعلیم نہ تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہم تو بہت بہتر رہے کہ سرسیدؒ انگریزی پڑھا گئے تھے۔ لیکن آج پھر وہی حالت ہے۔ اردو اخبارات میں ہندوستان کے سینکڑوں مسلم کالجوں اور ہائی اسکولوں کے کمزور نتائج پر اظہار افسوس کیا جاتا ہے۔ مسلم کاریگر اور تاجر اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے بجائے انہیں کاروبار میں لگا رہے ہیں۔ ہندی مسلمان بلحاظ تعلیم ایک بار پھر بقیہ آبادی سے دس گنا پیچھے رہ گیا ہے۔
میں جو عرصہ دراز سے مغرب کو اپنا وطن بنا چکا ہوں ان معاملات پر اسقدر مضطرب ہوں؟ میں نے تبدیل شدہ حالات کا مقابلہ کیوں نہ کیا؟ میں تو دھانپور تی کے غریب مسلمانوں کو بے سہارا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ چنانچہ اب مجھے ان سب سے اظہار ہمدردی کا کیا حق پہنچتا ہے؟ میں اور ان بہادر باہمت لوگوں کے لیے سرپرستانہ ترحم کا روّیہ رکھوں؟

سر اٹھا کر عربی باجی کو دیکھا جو کسی دور افتادہ پوربی ضلع میں اپنی موروثی باغبانہ آراضی پر خود کاشت کروا رہی تھیں۔ جرمن باجی قالین بافی کی کاروباری ہیں۔ انکے قصبے میں دنیا کے ہر بڑے بنک کی شاخ کھل چکی ہے۔ ایک بیگم صاحبہ مشرق کی ہیلینا رُبن اسٹائن کہلا رہی ہیں۔ حوصلہ مند اور کامیاب لوگوں کی اب یہاں کمی نہیں 1950's میں ہم سب کتنے پست ہمت ہو گئے تھے۔ جبھی تو میں یہاں سے رفو چکر ہوا۔ غدر کے بعد تو کتنے مغل شہزادے بیراگ لے کر جنگلوں میں جا بسے تھے۔ باغیوں سے انگریزوں نے جھاڑو دینے تک دلوائیں۔ ہر طرح سے تحقیر کی۔

تاریخ کا جوار بھاٹا ثابت و سالم اشیاء کو کھلے سمندر میں پہنچا دیتا ہے۔ خستہ اور بیکار چیزیں ساحل کی ریت میں معدوم ہونے کے لیے پڑی رہ جاتی ہیں۔

اتہاس کی تلچھٹ۔ ایک روز نگار خانم اصرار سے چکن کے کرتے خریدنے چوک لے گئیں تھیں۔ بہت کہا ولایت کے موسم کے لیے یہ کرتے بالکل بیکار ہیں۔ ہرگز نہ مانیں۔ واپسی میں پرانے شہر کی سیر کرائی۔ فرنگی محل لے گئیں۔ وہاں تنگ و تاریک گلیوں میں بے شمار مرد اور عورتیں کھٹولوں پر بیٹھے نظر آئے مرد کرتے سی رہے تھے۔ عورتیں پھولوں کے ہار گوندھ کر بیچتی تھیں۔ یہ لوگ ان مغلوں کی اولاد تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں جان بچانے کیلئے گاؤوں میں پناہ لی تھی۔ ہنگامہ فرد ہونے کے بعد انکی عورتیں فرنگی محل پہنچیں۔ مولویوں کے ہاں نوکری کرنے۔ تاکہ انکی عزت برقرار رہے۔ پارچے والی گلی سے نکل کر مرزا قدرت اللہ بیگ عرف کدّی کے چائے خانے سے سگریٹ خریدا اور فرانسیسی جھلک والے ان خستہ مکانات پر نظر دوڑائی ــــ کیسا مدّوجزر اپنے پیچھے ساحل پر یہ نشانات چھوڑ گیا ــــ

لیکن کنور نے کچھ دیر قبل کسی بات پر مجھ سے کہا تھا دلہن بھائی تمہارا پروبلم یہ ہے کہ تم محض تاریکی پر نگاہ جمائے ہو۔ اندھکار میں چمکتے جگنوؤں کو نہیں دیکھتے۔

میاں جیپ کی طرف جا چکے تھے ہم منڈیر سے اٹھے۔

بن تاؤں میں پریوں کے جلسہ گھر جگمگایا کیے۔

(۴۰)

قطب ستارہ

بھادوں کی کالی رات میں تارے بھی بڑی تیزی سے چمکتے ہیں۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ روشن کن کھجورے کی ایسی ٹرین دور غایب ہوتی نظر آئی۔ ملامت شاہ کی درگاہ سے روانہ ہو کر جنگل کی معطر فضا میں پاکیزہ ہوا کے جھونکے کے مانند گذرتے ہوتے میاں نے تئیس میل کا فاصلہ طے کیا اور ایک کچی سڑک پر مڑ گئے۔ حد نظر تلک ویرانہ اور تاریکی۔ رفقائے سالار مسعود غازیؒ کی ان گنت قبریں۔ ہم لوگ جیپ سے اترے۔

"اس گنج شہیداں میں،" سرخ ریش مولانا نے کہا "ایسے ایسے مرقد ہیں جو کھلے پڑے ہیں۔ اور انکے اندر سات سات فٹ لمبے غازیوں کے جسد مبارک صحیح و سالم رکھے نظر آجاتے ہیں۔ لوگ ڈر کے مارے دن میں بھی اسطرف سے نہیں گذرتے۔ میاں آدھی رات کو چلے آتے ہیں۔" وہ مزے سے آگے آگے جا رہے تھے۔ دیدی اور دونوں باجیاں سر ڈھانپے ہم لوگوں کے ہمراہ قبروں کے درمیان سے گذریں—— برسات کی رات۔ ایک ہزار سالہ پرانی قبروں سے پُر ویرانہ۔ سانپوں اور بچھوؤں کا مسکن بیہڑ۔ اونچی اونچی گھاس۔ خاردار پودے۔ ناگ پھنی کی جھاڑیاں۔ گڑھے ٹیلے۔ "تعجب ہے یہ بیبیاں اس بےخوفی سے چلی جا رہی ہیں گویا سکندر باغ میں ٹہلتی ہوں۔" ہم نے اظہار خیال کیا۔

"میاں ساتھ ہوں تو کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔" مولوی صاحب نے کہا۔

چلتے چلتے کسی قبر کے پاس رُک کر میاں "السلام علیکم" کہتے گویا وہ شخص سامنے موجود ہے اور اس سے مخاطب ہیں۔

چند مقابر کے نزدیک پہنچے۔ گلریز درختوں کی پیچدار شاخوں کے نیچے سے گذرتے ایک گھیر کے دروازے پر گئے۔ اندر جھانک کر آہستہ سے آواز دی "السلام علیکم۔" آگے بڑھے۔

ایک ہزار سال قبل سالار مسعودؒ غازی نے اس مقام پر کوئی جنگ لڑی تھی۔ یہ قدیم گورستان کتبوں سے بیگانہ تھا۔ لیکن میاں نتھے کہ یکایک کسی گمنام قبر پر ٹھٹھک کر السلام علیکم کہتے اور آگے بڑھ جاتے ٹیلے پھلانگتا میں ان ادھ کھلے مزاروں کی طرف نکل گیا جنکے لیے کہا جاتا ہے کہ ان میں رکھے دیو قامت غازیوں کے جنازے اب بھی دکھلائی دے جاتے ہیں۔ سرخ ریش نے دور سے پکارا —— راجہ صاحب۔ ادھر نہ جائیے۔

شکستہ نیچی دیوار بل کھاتی دور تک چلی گئی تھی۔ گویا مختصر سی دیوارِ چین جو ظاہری دنیا کو اس پراسرار کائنات سے علیحدہ کرتی تھی۔ دُور افق پر چند روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔

"وہ دیکھئے" میاں نے مجھے مخاطب کیا" وہ جو روشنیاں نظر آرہی ہیں وہ قصبہ کنتور ہے۔ اسے ارجن کی ماں مہارانی کنتی نے بسایا تھا۔ بہت قدیم ہے"

یہاں ہر چیز قدیم ہے۔ نئی کون سی ہے۔ ہم نے سوچا۔ کیا خود میاں بہت قدیم نہیں ہیں۔ نجانے یہ کیا معاملات ہیں۔

"مہابھارت والی مہارانی کنتی۔ پانچوں پانڈوؤں کی ماں"، کنور مجھے ایجوکیٹ کرنے پر کمربستہ تھا۔" وہ لوگ اپنی جلاوطنی کے زمانے میں یہاں آن کر رہے تھے"

"کنتور" عربی باجی بولیں " سالار مسعودؒ نے فتح کیا۔ ۱۰۳۰ء میں صدیوں سے یہ علماء اور مجتہدین کا مرکز رہا ہے۔ علامہ کنتوری کا نام یاد ہے آپکو —— ؟"

"جی نہیں"

مولانا جسٹس کرامت حسین بھی کنتور کے خاندان اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے"

"اچھا وہ کرامت حسین گرلز کالج ——" ہم نے ذرا بے دھیانی سے کہا۔

"اور آیت اللہ خمینی بھی ——" سرخ ریش بولے" انکے اجداد کو شاہان اودھ نے ایران سے بلا کر یہاں آباد کیا تھا۔ غدر کے بعد وہ لوگ ایران واپس گئے"

"آیت اللہ خمینی نے اس بات کی تردید کر دی ہے۔" ایک اور صاحب نے جواب د

جرمن باجی گورستان کی دیوار پر بیٹھی آسمان کا مطالعہ کر رہی تھیں ''بعض تارے اتنے روشن۔ باقی مدھم۔ اور پھر اندھیرا۔ نور اور تاریکی کا یہ کیسا سلسلہ ہے ـــــ لامتناہی''۔ انھوں نے حیرت سے کہا۔ ہم دیدی کی طرف مڑے۔ وہ بولیں ـــــ

''تارے دیکھت ہیں چاچا۔ وہ دیکھیے ـــــ وہ رہا سپت رشی منڈل ـــــ''

دیدی کو تو رشی ہی نظر آئینگے۔ لیکن مجھے اورن دھتی اور ارو شی کا خیال آیا۔ دیدی کہ وھان پور کے ایک پڑوسی راجہ کی بیٹی نکلیں میکے کے رشتے سے ہمیں چاچا پکارنے لگی تھیں۔ افسوس کہ ہم پلے بوا آئے کے بجائے چاچا بن گئے۔

''وہ رہا دھرو تارا ـــــ'' دیدی نے اطلاع دی۔

''قطب ستارہ'' عربی باجی بولیں ''اُدھر ـــــ''

''گورستانوں کے سلسلے بھی نورستان کی طرح لامتناہی ہیں'' جیپ کی سمت واپس جاتے ہوئے جرمن باجی نے اظہار خیال کیا ''تارا منڈل کے مانند انت ـــــ''

ہائی وے سنسان پڑی تھی جیپ اُڑی جا رہی تھی۔ اچانک ایک جسیم سیاہ پرند سامنے آن کر ادھ کھلے شیشے سے ٹکرانے ہی کو تھا کہ میاں نے بریک لگائی۔ پرند پل بھر کے لیے ہوا میں معلّق رہ کر انجن پر پٹ سے گرا اور زخمی ہو کر اُڑ گیا۔

''یُو۔ کے۔ پی!'' میاں نے مسکرا کر مجھ سے فرمایا۔

دیدی متوحش نظر آئیں۔ دریافت کیا ''میرے لیے بھیجا گیا تھا؟''

''واپس گیا'' میاں نے شگفتگی سے جواب دیا۔

رات بھیگ چلی تھی مگر آستانے پر حسب معمول بے انتہا چہل پہل۔ گیس کی روشنیاں۔ مہمانوں کی آمد و رفت۔ میاں مکان کے اندر تشریف لے گئے۔ طعام شب کے بعد تینوں خواتین اور سرخ ریش کے ساتھ ہم باہر شامیانے میں جا بیٹھے

''اُلّو کا پٹھا بُری چیز ہے'' دیدی بار بار کہہ رہی تھیں ''میاں نے بچا لیا۔ میاں نے''

"اُلّو کا چھٹّیا کیا شے ہے؟" ہمیں ہنسی آ گئی۔

"چاچا۔ ہمارے دشمنوں کو معلوم ہو گیا کہ ہمارے خلاف انہوں نے جو منتر کا کام کروائے تھے انکا یہاں اتار کیا جا رہا ہے۔ اسی مارے آج انہوں نے اس سمے اُلّو بھیجا۔ چاچا۔ اماوس کی گھور کالی راتوں میں ندی کنارے عمل کروا کے ہماری جٹھانی ہمارے خلاف پریتوں کی چوکیاں بھجواتی رہی ہیں۔ ایک عامل صاحب نے ہمیں بتایا کہ ہمارے اوپر چودہ تختیوں کا اثر ہے۔ چودہ بُری آتماؤں کا۔ اٹھارہ سال تک ہمیں بیماریوں نے گھیرے رکھا۔ رام رے۔ کیا دھجا تھی ہماری انتنے دنوں میں ہیرا پھیری کر کے ہمارے جیٹھ جٹھانی نے ہماری پچاس لاکھ کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ ہمارا یہ حال کہ سونے کو ہاتھ لگاویں تو مٹی بن جائے۔ کوئی سادھو عامل کھاؤ پیر ایسا نہیں جسے ٹرائی نہ کیا ہو۔ چاچا ایک بڑے میاں ایسے ہمارے پاس آتے اُتار کرنے جنکے پاس ایک کتاب تھی۔ شبد تو اسمیں عربی فارسی جیسے تھے مگر سب اُلٹے لکھے ہوتے۔ سب ملا کر تین لاکھ روپیہ ان لوگوں پر برباد کیا۔"

ہم بحیثیت انکے "میکے والے" ہمدردی سے سُنا کیے۔ وہ ہماری "بٹیا" تھیں۔

"پچھلے مہینے الہ آباد اپنے بیرسٹر سے ملنے گئے تھے۔ وہاں کسی نے میاں کا ذکر کیا ہم نے دھیان نہ دیا۔ طے کر لیا تھا اب کسی کے پھیر میں نہ پڑیں گے — بلکہ نُور منزل جا کر اپنے دماغ کا علاج کروائیں گے۔ شاید مصیبتوں نے ہم ہی کو وہمی بنا دیا ہے۔

"لیکن جب ان صاحب نے بہت سارے قصّے ہم جیسے دُکھیاروں پر میاں کی کرپا کے سُناتے تو ہم ان کی شرن میں پہنچے لکھنؤ — ان کو اپنا ماجرا سنانا شروع کیا بیس سال لمبی کہانی تھی۔ مگر میاں نے دس منٹ بعد ہی بڑی مدھرتا سے کہا "اب کچھ نہیں ہو گا!"

جب ہم اس روز یہاں آئے تو میاں نے ان دونوں میں سے ایک سجن کو بلوایا وہی جو میاں کے انسٹرکشن پر لوگوں کو تعویز وغیرہ دیتے ہیں۔ چینی کی پلیٹوں پر زعفران سے نقش لکھ کر دیتے ہیں پینے کے لیے۔ میاں نے ان سے خالی اتنا کہا — دیدی کے اوپر سے چار ہانڈیاں اتار دو۔

"پرسوں سے آج سویرے تلک تین ہانڈیاں اتاری جا چکی ہیں۔ کل سویرے سے چوتھی

ہانڈی اتاری جاوے گی تو دیکھئے آج ہی بیریوں نے اُلّو بھجوا دیا ——"

ذیدی کی ہانڈیوں نے واللہ ہمیں چکرا دیا۔ پوچھا: "وہی جن میں کھانا پکتا ہے؟"
بولیں: "جی ہاں چاچا مٹّی کی کوری خالی ہانڈیاں۔ ایک کے اوپر خادم نے ہمارا اور
ہماری ماں کا نام پوچھ کر لکھے اردو میں۔ اور عربی میں کچھ کچھ اور لکھا۔ پھر اسے ڈھکن سے
بند کر کے آٹے کا کڑا لگا دیا۔ پھر چالیس بار ہمارے اوپر سے اتارا۔ اب جو ہم نے دیکھا
چاچا تو آٹا خون سے لال خادم کہنے لگے ہانڈی بہت بھاری ہو گئی ہے۔ پرماتما کی
شان ہے۔ کتنی بڑی بلاؤں نے ہمارے اندر گھر کر رکھا تھا۔ اٹھارہ بتیّس برس سے۔ وہ صاحب
ہانڈی لیکر باہر چلے تو ہم نے پوچھا کہاں جاتے ہیں بولے اب اسکو من بھر لکڑی کے الاؤ پر رکھ دیا
جائے گا دن بھر کھد بد پکتی رہے گی۔ ساری بلائیں اندر ہی اندر بھسم ہو جاویں گی۔
" آج سویرے دوسرے ہانڈی اتاری گئی تو دیکھئے دشمنوں نے الّو بھجوایا۔ اسے میاں
نے فوراً واپس لوٹا دیا ادھ مُوا کر کے۔ آپکے سامنے کی بات ہے۔ اب ہمیں کوئی چنتا نہیں۔"

ہم کرسی سے سر ٹکا کر سامنے تالاب کو دیکھا کیے۔ ہم میاں کی پاکیزگی، منفرد شخصیت اور
حُسنِ اخلاق کے گرویدہ ہو چکے تھے مگر یہ جادو ٹونے کا آثار، جنّات اور بیدار داح کے قصّے ——

THIS WAS A BIT TOO MUCH

" اس تال کے کنارے ——" کنور نے کہنا شروع کیا: "بے شمار ہانڈیاں دفن ہیں۔ میاں
کے والد علیہ الرحمہ کے پاس بھی اسی طرح پریشان حال لوگ آتے تھے۔ بانسہ شریف اور کچھوچھہ
شریف سے آسیب زدہ لوگ پاگل دیوانے یہاں لائے جاتے ہیں وہ میاں کی توجہ سے
اچھے ہو جاتے ہیں۔"

" کچھوچھہ شریف میں ابھی ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا،" عربی باجی شگفتگی سے بولیں: "وہ ایک
نامور ماہر اسلامیات ہیں نا —— ڈاکٹر شمّل۔ وہ کچھوچھہ شریف تشریف لے گئی تھیں۔ شاید وہ
بھی راجہ صاحب آپکی طرح کی SCEPTIC ہیں۔ مغربی دانشور۔ وہاں پر حسب معمول آسیب
زدہ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ انہوں نے غالباً جنّات وغیرہ کے متعلق عدم یقین کا اظہار کیا۔ اسکے بعد

نہوں نے آسیب زدہ ہجوم کی تصویریں کھینچیں۔ ڈیویلپ کرنے کو دیا تو سارا رول بلینک

"کیمرے میں کوئی خرابی رہی ہوگی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے —" میں نے کہا۔

"ارے تصویر پریاد آیا" جرمن باجی بولیں "میں نے ٹنگٹن یونیورسٹی کے میوزیم۔

ایک مغل پینٹنگ دیکھی تھی۔ ۱۶۰۰ء کی بنی ہوئی۔ کہ حضرت سلیمانؑ جو ہیں وہ مغل بادشاہوں

لباس پہنے تخت پر بیٹھے ہیں۔ چاروں طرف پریاں۔ جنات اور قسم قسم کے جانور۔ ایک خو

موٹی سی پری انکے سامنے کھڑی ہے۔

"دیو اور جن شکلوں سے بڑے سوئیٹ لگ رہے تھے۔ اس مغل مصور کا تخیل زوردا

ہوگا۔ بڑی WIERD عجیب الخلقت صورتیں بنائی تھیں۔ داڑھیاں۔ جانوروں کے ا

بڑے بڑے کان۔ پر۔ ایک صاحب کے سر پہ ایک سینگ۔ سب ایک سے ایک کیوٹ"

"اسوقت آپکو ایک نہایت کیوٹ اور سوئیٹ جن نظر آجائے تو کیا ہو" میں نے مخ

ہو کر پوچھا۔

"میاں کی موجودگی میں ہمیں کون ڈرا سکتا ہے" جرمن باجی نے اطمنان سے جواب د

ایک ساؤتھ امریکن مصنف نے اپنی کتاب میں)BLINS, GENII AND

OTHER IMAGINARY BEINGS شاید اسکا عنوان ہے —— اس نے دنیا

کے کم فہم لوگوں اور جنگلی قبائل اور قدیم تہذیبوں میں رچے ہوئے نسلی واہموں کی عم

اور نفسیاتی وجوہات کا تجزیہ کیا تھا لیکن یہ خواتین و حضرات نہ قبایلی تھے نہ کم عقل۔ تعجب

سُرخ ریش کہنے لگے "راجہ صاحب۔ آپ یقین نہیں کرسکتے۔ آپ لوگوں کے س

مسلہ یہ ہے کہ مسلمان ہیں تو فرشتوں کے وجود کو مان لیں گے کہ وحی حضرت جبرئیل علیہ

ہی لیکر آئے تھے۔ مگر اجنہ کو واہمہ سمجھیں گے۔ قرآن حکیم میں انکے متواتر تذکرے کے

"صبح عاشور زعفر جن امام حسینؑ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی

حکم دیجیے تو میں پل کی پل میں اپنے لشکر کو بلا کر فوج یزید تہس نہس کر دوں۔ مولا نے

نہیں تم واپس جاؤ۔ مجھے اپنا فریضہ پورا کرنا ہے —"

"مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کا ایک اور واقعہ آپکو سناویں؟" عربی باجی نے دریافت کیا۔
"انکے مدرسہ نظامیہ میں ایک جن بصورت انسان پڑھنے آیا کرتا تھا۔ مولانا نے ایک روز اس سے دریافت کیا اس وقت قوم اجنہ میں سے کوئی صحابہ بھی حیات ہیں؟ اس نے کہا میرے ایک چچا ہیں۔ حضورؐ کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ترک دنیا کر کے ایک صحرا میں مقیم ہیں۔ مولانا پتہ نشان معلوم کر کے اس صحرا میں گئے اور اس سے ملے۔ اس نے بتایا کہ حضورؐ کی خدمت میں رہ چکا ہوں حضورؐ کے ہمراہ اکثر غزوات میں بھی شریک ہوا۔"
"مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں تو جنوں کے بچے اکثر پڑھنے آتے تھے۔" سرخ ریش نے صاد کیا۔ "بٹیا یہ تو ہماری یاد کی بات ہے۔ حضرت مولانا عبدالباری مرحوم کے مکان کے تہ خانے میں جن رہتے تھے۔ انکے بچے مدرسے میں پڑھتے تھے۔ پھر جانے کیا بات ہوئی مولانا نے ان سے درخواست کی کہ وہاں سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ وہ مان گئے رات کو کسی نے دیکھا کہ بے چارے سروں پر کھانے کے طباق رکھے ہوئے تہ خانے سے نکلے صحن میں سے گذرتے ڈیوڑھی سے باہر چلے گئے ــــ"

دفعتاً سب خاموش ہو گئے۔ برگدوں کے ادھر کسی گھر میں رت جگا منایا جا رہا تھا۔
ولادت رسولؐ کے اسی گیت کی آواز بلند ہوئی۔ عبداللہ کے آنگنوا میں حوریں ناچیں چھما چھم
"HARK THE HERALD ANGLES SING!" کنور رتی آہستہ سے کہا۔ "سارا ویسٹ کرسمس ہیزن میں الاپتا ہے تو سوچتے ہو فرنگی بھی فرشتوں کو مانتا ہے تو چلو فرشتوں پر یقین رکھنے سے تم کو جاہل اور توہم پرست نہیں سمجھا جائیگا۔ لیکن جن بھوت ــــ ؟ خرافات!"
"یار" میں نے زچ ہو کر جواب دیا۔ "یہ جو اتنے راکٹ خلا میں چھوڑے جا رہے ہیں انہیں تو راہ میں کوئی آسمانی مخلوقات نہیں ملیں۔ سوویٹ یونین میں جنات کیوں نہیں پائے جاتے؟ جن کو مانوں تو بھوت پریت چڑیل مسان سب کو مانتا چلا جاؤں۔"
"نہ مانو کون کہتا ہے کہ مانو۔ اتنے دنوں میں تم نے نوٹس کیا ہوگا کہ میاں کبھی اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ــــ میاں کے ساتھ جو انکے

یہ بشاش اور خوش اخلاق خدام تم مستعد دیکھتے ہو انکے علاوہ چند جنات بھی ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ جنات متبعنہ محض ایک بار انہوں نے وہ بات کہی تھی کہ اگر وہ ان دیکھے لوگ تم کو نظر آجائیں جو ہمارے ہمراہ رہتے ہیں تو ہیبت سے تمہارا کلیجہ شق ہو جاوے۔"

"اور ایک اور مرتبہ کا واقعہ ہمیں کسی نے بتایا تھا" عربی باجی نے کہا "میاں کہیں سے تشریف لا رہے تھے۔ انکے خیر مقدم کے لیے کچھ لوگ ایک کار لیکر کسی جگہ پہنچے —— باقی لوگ دوسرے راستے سے آئے۔ دیر ہو چکی تھی۔ جب وہ لوگ اس خالی کار کے پاس گئے جسے لے کر میاں کے پاس جانا تھا اسمیں دو سفید پوش پچھلی سیٹ پر بیٹھے نظر آئے۔ یہ صاحبان قریب پہنچے تو وہ دونوں دروازہ کھول کر اترے اور فوراً غائب ہو گئے۔ جب انکے میزبان میاں کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا آپ نے دیر لگا کر ڈیوٹی کے لوگوں کو پریشان کیا۔"

میں چپ چاپ بیٹھا دال موٹھ کھاتا رہا "مگر مولوی صاحب جھٹیا کیا شے ہے؟"

سرخ ریش نے مجھے بغور دیکھا۔ "راجہ صاحب جن چیزوں سے آپ واقف نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ انکا وجود ہی نہیں۔"

"آپ نیوکلیر فزکس سے واقف ہیں؟" عربی باجی بولیں۔

"افوہ بھائی عربی باجی آپ ذرا چپکی رہیے۔ جی مولوی صاحب ——"

"راجہ صاحب۔ ایسا ہے کہ اللہ تعالے نے اجنہ کو آگ سے پیدا کیا۔ اور احکامات نازل کیے کہ بندوں کو گزند نہ پہنچانا۔ وہ اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ ہر جگہ بے چارے نیک جنات بعض اوقات اپنی غفلت اور اپنے حجم کی وجہ سے انسان کو نادانستہ نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ آگ کی خاصیت جلانا ہے۔ آپ اسکی زد میں آئیے جھلس کر رہ جائیں گے۔ رہیں بدارواح "

"اور الو کا جھٹیا ——؟"

"سفلی عمل والے الو سدھ کرتے ہیں۔ انکو یہاں سزا مل جاتی ہے۔"

"اس جگہ پر محض نیک جنات رہتے ہیں کل بڑا لطف آیا۔" جرمن باجی بولیں "میا

کے ایک خادم دور جو بیل کا جنگل ہے نا رات کے وقت وہاں چلے گئے تھے۔ وہاں جنوں نے انکی خوب ٹھکائی کر دی۔ نمودار ہو کر بولے یہاں ہماری مسجد ہے تم کیا کر رہے ہو۔ اس نے بحث کی مسجد تو وہ سامنے درگاہ میں موجود ہے۔ دوسری مسجد کہاں ہے دکھلاؤ۔ وہ بولے ہم میاں سے ڈرتے ہیں ورنہ تم کو ٹھیک کر دیتے۔"

پاکستان میں بھی ضعیف الاعتقاد لوگوں کی کمی نہیں۔ کراچی میں ہمارے ایک دوست کی بیوی نے ایک بار بتایا تھا کہ انکا بیٹا کسی بددعا کے اثر سے ناگہانی مصائب میں گرفتار ہو گیا۔ ایک انٹرنیشنل ایرلائینز کے ایک سینیئر پاکستانی پائیلٹ بھی انہوں نے کہا پوشیدہ بزرگ ہیں۔ انہوں نے ایک چھڑی پڑھ کر لڑکے کو دی۔ چند روز میں ادھر بددعا کا اثر زائل ہوا ادھر وہ چھڑی غائب!

میں ان معقول سنجیدہ انسانوں کی سمجھ بوجھ پر متحیر بیٹھا رہا۔ سامنے تالاب میں تارے منعکس تھے، سپت رشی۔ دھرو تارا ـــــ ساری آکاش گنگا۔
صدر دروازے پر گیس کی لالٹینیں جنگل میں بھیگی ہوئی ہوائیں سنسنا رہی تھیں۔ اندر صحن سے بشاش قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ چلو اندر چلیں۔ میں نے کنور سے کہا۔

ڈیوڑھی میں پہنچے تو حاضرین کے قہقہوں کے درمیان ایک باریک غیر انسانی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ باریک، منمنی، خنخنی سی ہنسی۔ ایسی UNCANNY, NASAL آواز آج تک نہ سُنی تھی۔ پھر ایک کڑک دار مردانہ آواز۔ صحن میں پہنچے تو دیکھا میاں حسب معمول پلنگ پر نیم دراز فلیان نوشی میں مصروف۔ ایک خوش پوش چھریری سی لڑکی پیشانی پر سرخ بندی۔ پائینتی زمین پر بیٹھی وہ غیر انسانی ہنسی ہنس رہی ہے۔ موٹی سُوتی ساری پہنے ایک مسلمان دیہاتن میاں کے سرہانے کھڑی نہایت گرجدار مردانہ آوازمیں بنکار رہی تھی۔
ادھر وہ شہری ہندو لڑکی ناک میں بولتی اور بھیانک ہنسی ہنستی ادھر وہ مسلمان دیہاتن زور زور سے تقریر کرنے میں مصروف "ہم بج رُگ ہیں۔ ہم کامت سناؤ۔ ہم معمولی جن بھوت

نہیں ہیں۔ بُج رُگ ہیں "۔ پھر اس نے لمبا قصہ کسی عورت سے اپنے جھگڑے کا شروع کر دیا۔ حاضرینِ محفل کے لیے یہ یہاں کے روزمرّہ کے واقعات تھے۔ وہ محظوظ ہیں متحیر۔

"یہ دونوں دو مخالف سمتوں سے ابھی ابھی یہاں پہنچی ہیں۔ ایک پُورب سے آئی ہے ایک پچھّم سے "۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔

دیہاتن بڑی مزیدار تقریر کر رہی تھی۔ مجمع بار بار قہقہے لگا رہا تھا۔ میاں بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ نیلی ساری والی لڑکی پھر زور سے خنخنا کر ہنسی۔

"یہ بے چاری کالج میں پڑھتی تھی کوئی چڑیل اس پر مسلّط ہو گئی۔ ابھی ابھی شام کی بس سے اسکا بھائی اسے یہاں لایا ہے۔ فیض آباد سے۔ کل صبح تک ٹھیک ہو جائے گی "۔ ایک خادم نے میاں کا حقّہ تازہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ کچھ دیر بعد "چڑیل" والی لڑکی رخصت ہوئی۔

وہ دیہاتن اسیطرح بھاشن دیتی رہی۔ پھر اس نے بیدکرار السلام علیکم کہہ کر میاں سے مصافحہ کیا اور باہر گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی۔ اب وہ بالکل نارمل تھی۔

"جن باہر ڈیوڑھی میں کھڑا رہ گیا ہے۔ میاں نے حصار کر دیا "۔ کنور چپکے سے بولا۔

دفعتاً وہ پھر مردانی آواز میں ہنکارنے لگی اور اسیطرح گرجتی ہوئی جا کر ڈیوڑھی کے اندھیرے میں غایب ہو گئی۔

گاؤ تکیوں کے سہارے نیم دراز میاں بڑی بشاشت کے ساتھ سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں سے آہستہ آہستہ گویا کسی کو جانے کا اشارہ کرنے لگے۔ اور شریر متبسم نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ باہر سے عورت کی نارمل آواز آئی۔ چند لمحوں بعد میاں نے پھر اشارہ کیا۔ مکان کے باہر سے عورت نے دوبارہ دہاڑنا شروع کیا۔ اسیطرح چیختی چلّاتی آواز دور ہوتی چلی گئی۔

"یہ بھی صبح تک ٹھیک ہو جائے گی "۔ کنور نے کہا۔

(۴۱)

مَدھُوبن

ہمالیہ کے دامن میں سدا بہار جنگلات ہمارے ساتھ رواں تھے۔
پُرشکوہ درختوں کے کیتھڈرل! ہوائیں آرگن بجاتی ہیں۔ پرندکوائر گا رہے ہیں!! سارا
ہندوستان — "کنور نے گونجتی ہوئی سی آواز میں کہا "کیا ایک اوپن ایر ویسٹ منسٹر ایبے
نہیں؟" وہ آولڈوِک کی اسٹیج پر طامس بیکٹ کا رول ادا کرنے والے سر ڈونلڈ وولفٹ
کی طرح بول رہا تھا۔" زائرین کے جلوس بیکٹ کی قبر پر جاتے تھے تو انگلش لٹریچر نے اسے
زندہ جاوید کر دیا۔ محض تھیٹر اور کتابوں میں — ہم اپنے فوک ہیرو ،موسموں کی پُشپ مالا
اور لوک گیتوں سے سے بے بریٹ کرتے ہیں۔ یہ سارا ایریا سالار مسعودؒ کنٹری ہے۔ جیٹھ مہینہ
بالےمیاں کی 'شادی'، پلنگ پیڑھیاں جھنڈے اٹھائے ہندو مسلم پاپیادہ زائرین کے
قافلے —"

اس نے کار کی رفتار دھیمی کی۔ ایک قدیم درگاہ کی بنسواری میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھا
ایک سیاہ پوش بوڑھا بانسری تراشنے میں منہمک تھا۔
طویل گلہ ٹن ٹن کرتا سڑک پر سے گذر رہا تھا۔ گوری رنگت کے گڈریے نے مسکرا کر
ہمیں دیکھا۔ گاڑی روکنی پڑی۔ بھینسوں کی آہستہ خرامی اور ایشیائی زندگی کی رفتار مجھے
ایک سی معلوم ہوئی۔ "گڈ لِکنگ چیپ" کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔
"مسلمان گدّی سنتے ہیں انکے اجداد گاجی میاں کے لشکر کو دودھ سپلائی کرتے
تھے۔ سالا ولیم دی کونکر رسالار مسعودؒ کا تقریباً کن ٹمپریری تھا جنوبی انگلینڈ کے مِلک مین
یہ تو کہتے نہ ہونگے کہ انکے فورفادر نورمن فوج کے لیے —"
"یار یہ سب یاد رکھنے کے بجائے انہیں اور بہت سے کام بھی ہیں۔ علاوہ ازیں انگلستان

میں کاسٹ سسٹم نہیں ہے۔ بنارس کے ملاح کہتے ہیں انکے پرکھوں نے رامچندر جی کو بن باس کے لیے کاشی کے اسی گھاٹ سے گنگا پار کرائی تھی۔"

"عین ممکن ہے۔"

"سو وُوٹ ــــ؟ تمہارا پرو بلم یہ ہو گیا ہے کہ تم کو متھرا کی ہر گوالن میں ایک گوپی نظر آتی ہے۔ یہ مسٹری کا OVERKILL ہے سینڈی۔"

پرائم منسٹر صاحبہ جب کسی بیرونی سفر پہ روانہ ہوتی ہیں اودھ کے ایک سابق تعلقے کے ایک صاحب کے پاس ٹرنک کال آتا ہے وہ فوراً دہلی پہنچتے ہیں ساتھ ریاستی لباس میں نائی ــــ چاندی کی تھالی میں امام ضامن رکھے۔ وہ میڈم کے بازو پر باندھا جاتا ہے۔ آتے دان وہ مندروں میں جاتی رہتی ہیں۔ باپ اتنے سائنٹفک ذہن کے لادین آدمی تھے۔ اپنا اپنا مزاج ہے۔ خواتین بہرحال زیادہ مذہبی ہوتی ہیں۔ سوشلسٹ سماج کی عورتوں کو تو عرصے سے اس جذباتی سہارے کی حاجت نہیں رہی ــــ تیسری دنیا میں مذہب پرستی ہے کہ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ لیکن جن چیزوں کو میں توہم کہتا ہوں کنور اسے خوش عقیدگی بتائے گا۔ الفاظ اور تصوّرات کا کمیونی کیشن بریک ڈاؤن۔

"گھوڑوا شہید کا چلہ ــــ" ایک کائی آلود گنبد کے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے اناؤنس کیا۔ امرتوں میں کوئل کوک رہی تھی۔

"ان باغوں میں چھپے کسی پراچین آشرم یا درگاہ کی جھلک دیکھ کر عجب سا محسوس ہوتا ہے۔ اس فیلنگ کو میں پن پوائنٹ نہیں کرسکتا۔"

"تم ایک رومینٹک آدمی ہو سینڈی۔"

"کسی موڈرن ہندی پوئیٹ کی یہ ایک لائن پچھلے دنوں مجھے اچھی لگی ــــ 'ایک سمجھدار پتّہ گرنے کی تیاری کر رہا ہے' ــــ سنو۔ دلّن بھائی تمہارا کبھی یہ جی نہ چاہا کہ کسی ہرے بھرے وُوڈلینڈ میں بہتے دریا کے کنارے جا بسو؟ شاردا۔ موہن ندی۔ گومتی۔ سرجو۔ بس ایک ندی اور ایک عمیق جنگل۔ تمہارا کبھی جی نہ چاہا ــــ؟"

"نہ جُوگیم کہ خوکنم بہ برگ کو کنا رہا۔"

"ہاہا ———"

اب ہم ایک پُل پر سے گذر رہے تھے۔

"میاں کی خانقاہ اب زیادہ دور نہیں" کنور نے کہا۔

خانقاہ! ایک وقت یونان میں راہب کا بھیس بدل کر فدوی ایک نا درویش بہا بازنطینی آئیکن پر ہاتھ صاف کرنے کی غرض سے ایک گریک اورتھوڈکس ری ٹریٹ میں گیا تو کیا پُراسرار جگہ پائی تھی۔ نیم تاریک راہداریاں۔ سرد اندھیرے زینے۔ سلاخوں دار روزن۔ اونچی شمعیں عود ولوبان کے مرغولے۔ لباس تیرہ سر سراتے گھنی طویل داڑھیوں والے راہب۔ باہر زیتون کے پیڑوں پر دمکتا تنہا چاند ——— اور قرون وسطیٰ کے اسلامی رباط۔ تغلق اور لودھی قسم کی نیچی محرابیں۔ ٹھوس عمارت۔ عود ولوبان سے معطر۔ نقش چغتائی کے ایسے لبادے پہنے غلافی آنکھوں اور باریک ستواں ناکوں والے درویش۔ آہو چشم کد و بدست گداگر۔

ناچیز اپنے والٹر مٹی جیسے زورِ تخیل سے عاجز ہے۔ گو اسی کی بدولت اپنے ناگفتہ بہ ارادوں کی پلاننگ میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ اسوقت میاں کی خانقاہ کے پُراسرار ماحول اور رہ ورسم خانقہی کا تصور کیا سینڈی پھر بولا "ہم تو ہفتوں وہاں جا کر رہتے ہیں"۔

"چھوڑ رباط کہن کو صوفی"۔

"ٹک ٹکو تم بھی ———"

"ٹکٹ ٹوکیو کا نہ کٹائیں ———؟"

"ٹالو"

"ٹریڈ میں ٹوٹا ٹا ٹا ٹا بھی نہیں پسند کرتا"۔

"ٹائیں ٹائیں مت کر اے بیوقوف طوطے۔"

"ہمیں طوطا مقرر کیا ہے؟ ہم ایک مصروف تاجر ہیں"۔

"ٹھاکر صاحب اف ٹوٹنہم کورٹ روڈ۔ یو۔ کے۔ پی"۔

میں نے قہقہہ لگایا "اسکول میں ہم لوگ پہروں اس قسم کی نون سنس ———"

"سنس تو آپکے اندراب بھی بہت زیادہ معلوم نہیں ہوتا ــــ"
کسی گاؤں کی ٹمٹماتی ہنر ریا۔ دوکانوں میں بیٹھے لوگ گویا میڈیول تصویریں۔
بغداد اسکول جو سالار مسعود غازی کا ہم عصر تھا ــــ! اسکا ایک نادر البم ہم نے ایک باری ڈنمارک کے ایک میوزیم سے پار کیا تھا۔ ترائی کے اس بازار میں بالکل اسی طرح کے باریش دوکاندار ترازو سامنے رکھے، برقعہ پوش عورتیں۔ گول ٹوپیاں اوڑھے بچے۔
یہ سندریش نرائن سنگھ ابھی مابعد الطبیعاتی تسلسل کی کیا بات کر رہا تھا۔
اور حلوائی کی دوکان کے نیچے بیٹھا ایک پر امید کتا ــــ ایک پر امید ــــ
اُمید کرتا ہوں کہ نورما کی وہ ٹوکیو سان فرانسسکو والی اسکیم نہایت بارآور رہے گی۔
ہمارا پلان یہ ہے اور کیا سود مند پلان ہے کہ سیاحوں میں ایسی ہستیاں جو نہ ہیوں میں ہیں نہ شیوں میں ــــ انکی میزبانی کی خاطر پیرس ٹوکیو لاس اینجلیز سے ایسی ہستیاں جو نہ ــــ معًا ڈر سا لگا۔ فاسد و قبیح ارادوں کے غول بیابانی ہیں کہ اپنی لالٹین چمکائے جا رہے ہیں۔ چوروں کی طرح سینڈی کی طرف دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے جمال ہمنشیں نے اسے بھی پوتر، شدھ کر رکھا ہے۔ میاں بہت آگے آگے جا رہے تھے۔ انکی ایمبیسڈر کی سرخ روشنی تاریکی میں قندیل رہبانی کے مانند جھلملاتی ــــ
ایک شہر ہماری سمت بڑھا۔ پیچھے ہٹا۔ افق پر روشنیاں نمودار ہوئیں۔ "جنگل میں منگل ــــ جو میرے بن مالی نے لگایا ہے۔" سندریش نرائن سنگھ خدا اسے خوش رکھے، اپنے ممدوح کو کبھی بن مالی کہتا ہے کبھی بن راج، اور بنواری کہ یہ سری کرشن کے القاب ہیں۔ یوسف ثانی پکارتا ہے کبھی شہر یار ملک عرفاں۔ میں دلشاد علی کنظاہر بینوں میں سے ہوں میں نے اپنے اس قدیمی یار کو پھر ڈاؤن ٹو ارتھ واپس لانا چاہا۔ "ان جنگلوں اور ندیوں میں ہم نے کتنے شیر مارے کتنے ماہ نیر! اب وائلڈ لائف کے لیے ساری دنیا میں پناہ گاہیں بنا دی گئی ہیں۔ انسانوں کا شکار بلا لائسنس ــــ"
"ہاں۔ مچان بھی ایسے باندھے گئے ہیں کہ نشانہ خطا نہ ہو۔ اور کنکریٹ کے مہابنوں کے اندر کمین گاہیں۔"

"گیم رینج یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"میاں کے ساتھ موقع ملے تو ضرور جانا۔ میرے وینوگوپال اس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ ہرن قلانچیں بھرتے آکر ان انکے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں اور انکو تکا کرتے ہیں۔ رمضان شریف میں اگر وہ خانقاہ میں موجود ہوں انکے ساتھ افطار کے لیے آدم جانے کہاں کہاں سے امنڈ آتا ہے، مدھوبن ——— شہد کا جنگل! کبھی مدھیہ پردیش میں حسینؑ ٹیکری گئے ہو ——؟ امام حسینؑ کی زیارت گاہ ——؟ نہیں ——؟ اسکے گرد جو فورسٹ ہے اکثر صبح صبح اسکے پتوں پر شکر جمی ملتی ہے۔"

"چلو شکر کا مسئلہ تو یوں حل ہوا۔"

"ہاتھ کنگن کو —— جا کر دیکھ آؤ۔ تمہیں جُل دینے کے لیے ٹیکری کے منتظمین راتوں رات —— لاکھوں پتیوں پر چینی تو چھڑکنے سے رہے —— دلّن بھیا ہو ——" وہ خالص اودھی انداز میں بولا "تم لوگوں کا پرابلم یہ ہے کہ خرد کی عاجزی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے۔ ورنہ —— پچھم کے لال بجھکڑوں نے جو وگیان بھون تین سو سال میں تمہارے لیے تیار کیا ہے وہ پل بھر میں۔"

ایک نیلگوں پھاٹک سامنے آیا۔ اندر جا کر سایہ دار راستے پر سے گذرتے ہوئے وہ کہنے لگا "یہ سامنے جو عمارت دیکھتے ہو —— اسکی تعمیر کا تمہاری عقلی توجیہہ سے کوئی علاقہ نہیں یہ ویرانہ تھا —— ایک کہنہ قلعے کے آثار اور بابے میاںؒ کے ایک ساتھی کا مرقد —— دس بارہ برس قبل کا ماجرا ہے میاں اچانک یہاں وارد ہوتے اس بلڈنگ کا نقشہ بنایا۔ لہ رٹریٹ اوف دی آرٹسٹ ایز اے ینگ سینٹ۔ جیمز جوائس نہ لکھ پاتے۔ البتہ گراہم گرین۔"

گاڑی باغ کے صدر دروازے پر رکی۔ مرشد بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ سامنے ایک خوبصورت گلابی بنگلہ اور اسکا گلشن برقی قمقموں سے فروزاں تھا۔ سبحان اللہ کیا مقام ہے۔ ہر برگِ گل چوں شب چراغے۔ اس کوشک لعل اور چمن کی چہل پہل دیکھتے آگے بڑھے۔

نصف شب سے زائد گذر چکی تھی۔ اشجار میں پوشیدہ تیز روشنیوں کی زد میں ایک بیگم صاحبہ وسطی روش پر ٹہلتی نظر آئیں۔ میاں پھاٹک پر گروہ مشتاقاں میں گھرے کھڑے تھے۔

قریب آئیں بعد خاکبوسی یوں گویا ہوئیں: "میاں کل رات ہم پچھلے برآمدے میں تہجد پڑھ کر اٹھے ہی تھے کہ ایک بیحد لانبے سفید پوش دکھلائی پڑے۔ گورے چٹے۔ نہایت خوبصورت اور کمسن۔ پورے دس منٹ تک نظر آیا کیے۔"

"وہ سب نوجوان لڑکے تھے۔ مختلف ملکوں سے آئے تھے۔" مرشد نے اطمنان سے فرمایا اور بنگلے کی سمت روانہ ہو گئے۔

"مگر اتنے لانبے؟" محترمہ نے دہرایا۔

"آج کے کینیڈین بھی تو بے تحاشا لمبے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ دور دور سے آتے تھے۔" —— ایک صاحب چاء کی کیتلی اٹھائے پاس سے گذر رہے تھے۔ ٹھٹھک کر گفتگو میں شامل ہو گئے —— "قفقاز —— اور اسکا نام لیجئے مازندران —— جرجس —— سرخس ——"

مجھ دلشاد علی نے پھر آنکھیں ملیں اور کانوں پر ہاتھ پھیرا۔ رات کے دو بجے اس بقعۂ نور جانفزا گلزار میں جمع یہ افراد کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں —— ؟ سپید پوست بالا قد نوعمر —— —— پراسرار بندے —— ؟ ان میں سے چند کے ادھ کھلے طویل مزار تو ہم کنتور کے نزدیک بھی آدھی رات کے وقت دیکھ کر آ رہے ہیں۔ یہ سالار مسعود کنٹری ہے۔ اس ماحول کا اثر ان بی بی کے دماغ پر ہو رہا ہے۔ قطع سے یونیورسٹی لیکچرر معلوم ہوئیں (کیمسٹری کی ریڈر نکلیں) ہمارے ویسٹ میں کیتھولک راہب خانے LAY اہل دانش کے لیے عارضی ری ٹریٹ کا کام دیتے ہیں۔ میاں کی اس انوکھی سی "ری ٹریٹ" میں مقیم ان صاحبہ کو غالباً اپنے ذاتی مسائل کے بوجھ تلے میلوسی نیشن دکھلائی دے رہے ہیں۔ موصوفہ کی اصل منزل نور منزل ہے۔ لال باغ، لکھنؤ میں کرسچین مشنریوں کا مشہور شفاخانہ جس کے غیر ملکی ڈاکٹر مدتوں سے میڈیکل سائنس کی جدید ترین دریافتوں کی روشنی میں ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کا علاج کر رہے ہیں۔

نور منزل پر عنبریں بیگ یاد آئیں۔ کہ گذشتہ ماہ میاں کے ہمراہ چند روز کے لیے بندہ لکھنؤ گیا تو اہل پری محل اور ڈاکٹر منصور کاشغری سے نہ ملا لیکن بینڈی کی کوٹھی پر کنور رانی صاحبہ سے معلوم ہوا ڈاکٹر بیگ بے چاری کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور وہ نور منزل میں زیرِ علاج ہیں۔ غالباً ڈاکٹر کاشغری کے چکر میں —— افسوس۔

رباط گلگوں کی جانب بڑھے۔ سُبک مخروطی ستونوں والے طویل برآمدے میں کرسیاں اور مونڈھے پڑے ہوتے تھے۔ خلقت کی آمد و رفت آدھی رات کو بھری دوپہر کی ایسی گہما گہمی۔ سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ عارف کامل کے آگے رات دن یکساں ہیں۔ عربی باجی نے کہا تھا۔ گُڈ اولڈ عربی باجی۔ وہ تینوں بارہ بنکی سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں تھیں۔

عریض زینہ طے کر کے کنور کے ساتھ اوپر گئے۔ بُرجی نما کمرہ —— چوتھی تاریخ کا چاند سنہرے غزال کی طرح متحرک بادلوں میں چوکڑیاں سی بھرتا معلوم ہوا، بنگلے کے نشیب میں تر و تازہ تیز ہرے شبنم آلود کھیت۔ جس سے جگر لالہ میں —— جب سب سوتے ہیں خدا مریمؑ کیساتھ خنک کشت زاروں میں ٹہلتا ہے۔ ایک یوروپین کیتھولک مسٹک کا جملہ۔ افوہ۔ مارے مسٹی سیزم کے حالت خراب۔ سندریش نرائن اپنے ذہنی اور کلچرل فریم ورک میں بدھُو شودن کے مدھوبن کی بات کرتا ہے۔ مسلم گدی گلّہ بان نورمن کو شاید بیت لحم کے چرواہوں کی یاد دلائیں۔ نیچے کیلے کے جھنڈ میں ایک بوسیدہ کنواں دکھلائی پڑا۔ تین بعید قدیم مسجدوں کے آثار۔ جھیل کے نزدیک ایک غازی کا مزار۔ بالے میاں کا دیس!

واپس اترے۔ مرشد بڑے ہال میں فرش پر بچھے بستر پر جلوہ افروز۔ چائے کا دور۔ عوام کی بھیڑ۔ آدھی رات کو یہ سب شہر سے یہاں کسطرح آئے۔ بسیں بند۔ رکشائیں مفقود۔ پاپیادہ آئے۔ میاں جب کسی جگہ پہنچتے ہیں جنتا کو آپ سے آپ کسطرح اطلاع ہو جاتی ہے۔

صبح چار بجے کے قریب باہر ایک ریذیڈنٹ قلندر کا نعرہ حیدری سنائی دیا پھر وہ چلّایا "لافتیٰ الّا علیؑ، لاسیف الّا ذوالفقار —— لافتیٰ ——" دیوداروں میں کوئی صاحب خوش لحنی سے مناجات کر رہے تھے۔ باغ سے آواز آئی۔ مرحبا سیّد مکی مدنی العربیؐ۔

ناشتے کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فاضل ایک نوجوان مولوی صاحب نے مثنوی مولانا رومؒ شروع کی —— باغ اور میدان کے اس پار کسی مغل بادشاہ کی بنوائی ہوئی تین گنبدوں والی مسجد دھوپ میں چمکی۔ اس سے ملحق میاں کے قائم کردہ جونیر ہائی اسکول میں پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ کنور کے ساتھ ٹہلتے وہاں پہنچے "بھوگول" کی ایک کلاس میں جھانکا۔

"اس بستی کے ایک اسکول میں رتن ناتھ سرشار اردو پڑھاتے تھے۔ ہمارے والد کی

جزیشن تک ایسے کائستھ بزرگ موجود تھے جو پوجا کرتے وقت کہتے تھے ___ یک فلوس یک بادکش ویک صراحی بشری کرشن ارپن میدہم ___! ہمارے پوتے دروازے کو درواجا اور زمین کو جمین کہتے ہیں۔ جمیلہ کو زمیلہ ___"

ہم دونوں پائپ کے کش لگاتے سر جھکائے اسکول گراؤنڈ طے کرتے رہے۔ چند منٹ بعد کنور جوش سے بولا ___ "لیکن اردو زندہ رہے گی!" مجھے ہنسی آگئی۔ ایونیو پر پہنچے۔ ایک فیٹ باغ کے پھاٹک پر آن رکی۔ ایک خوش پوش سرخ و سپید، خوبرو نوجوان اسمیں سے نکلا۔

"لکھنؤ میں آج صبح سویرے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ ہمارا کمرہ اچانک میاں کے پیچوان کی خوشبو سے بھر گیا ہم سمجھ گئے سرکار یاد فرما رہے ہیں۔ فوراً دوڑے۔"

تہجد گذار بی بی کے بصری ہیلوسی نیشن۔ اس غیر مسلم نوجوان کے حسّی۔ ہم بھی ان واہموں میں گرفتار نہ ہو جاویں۔ سوچے اب یہیں سے گھر کی سیدھ بھریں۔ چند گھنٹے کے ارادے سے کنور سینڈی کے ہمراہ بارہ بنکی پہنچے تھے۔ اتنے دن گذر گئے۔ رجعت قہقہری۔ اس سے قبل کہ ہم اپنی نانی دادی کے دور میں واپس چلے جائیں ہم کو بھاگ نکلنا چاہیے۔ یہ بہت بوڑھا تمدن اپنے سیکنڈ چائلڈ ہڈ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ یہ کلچر سینائل ہو چکی ہے۔ ذہنی صحت بڑی نعمت ہے جو ہم کو ابتک مغرب میں میسّر رہی۔ وہ سرد، بے پرواہ، خود پسند، مغرور دیار غیر سہی۔ لیکن ایک نہایت منظم، سائنٹیفک حقیقت پسند معاشرہ ہے ___ جسکے اندر ہمارا پرسنل کمپیوٹر ہمارا منتظر ہے۔ بیشک میرالاڈلا نور تن چند سال بعد مجھے نورماداو سیلی سمیت کسی بوڑھوں کے گھر میں ڈال آئے گا۔ لیکن وہ بھی کیا فرسٹ کلاس "ہوم" ہوگا یہاں تو ممکن ہے کسی سڑک کے کنارے ہم ٹیں ہو جائیں اور راہگیر پلٹ کر نہ دیکھیں۔ تشدد خود غرضی بے حسی اور لالچ ان پر ختم ہے مگر اپنی "روحانیت" کی ڈفلی بجائے جا رہے ہیں۔ ویسٹ جیسی اعلیٰ ترین کمیونٹی سروسیز اور سوک سنس انکے ہاں اگلے سو سال میں بھی نہیں ہوگا شرم انکو مگر نہیں آتی۔ ارے ان سب کو سیاہ پوش گریک کورس کی طرح اپنے حال زار

ماتم کرنا چاہیئے۔ یہ اہلِ مشرق کس منہ سے مغربی مادّیت کو بُرا کہتے ہیں۔ دراصل ہندوستان کے متعلق کنور کی مسلسل لیکچر بازی نے مجھے جھنجھلا دیا تھا۔

جس مختصر سے فرقے سے نووارد تعلق رکھتا ہے وہ اپنی بے پناہ انگریزیت کے لیے مشہور ہے لیکن اسکا کنبہ عرصے سے شمالی ہند میں آباد ہے لب ولہجہ کے اعتبار سے اس میں اور کنور میں کوئی فرق نہیں۔ اور نفیس اردو پر اسکی زبان جاری ہے۔

دوسری شام وہ ہمارے ساتھ پہلو کے لان پر آن بیٹھا۔ کنورا ور رنجن وہاں بید کی کرسیوں پر پہلے سے موجود تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ میاں کو کتنے عرصے سے جانتا ہے۔
"پچھلی جنوری میں ہم لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ ایک دوست نے کہا میاں تشریف لائے ہیں اور تم کو بلاتے ہیں۔
"کون میاں اور ہمیں کہاں سے جانتے ہیں۔ ہمیں ان سے کیا سروکار — ہمارے رشتے دار نامور لوگ ہیں لیکن ہم نے اپنے آپ کو ہمیشہ بیک گراؤنڈ میں رکھا۔ ہمیں مذہب اور روحانیت سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ دوست نے پھر کہا بڑی شان اور مرتبے کے بزرگ ہیں اور اپنے طریق میں یگانہ۔ اور وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔
"ہم کچھ عرصے سے شدید قسم کی نجی پریشانیوں میں مبتلا تھے لیکن انکا حل ڈھونڈنے کے لیے پیروں اور سوامیوں کے پاس دوڑنا ہمارے لائف اسٹائل میں شامل نہیں۔
دوست مصر رہا۔ دوسرے روز حضرت گنج کی ایک دومنزلہ کوٹھی پر لے گیا۔ اوپر پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ ایک بڑی نشست گاہ میں چاء کی پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ ایک طرف ویڈیو چل رہا تھا۔ تخت پر بیٹھے مہمان خصوصی چند نوجوانوں سے جُوڈو کراٹے پر گفتگو کر رہے تھے اور حاضرین کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ بڑے جمال وجلال والی شخصیت رکھتے تھے لیکن اب انہوں نے کرکٹ کا ذکر چھیڑا۔ ساتھی چپکے سے بولا — "انہوں نے اسکول تو آٹھویں کلاس سے چھوڑ دیا تھا کہ یہ کتابیں ہمیں کیا بتائیں گی۔ والی بال اور شہسواری کے البتہ چیمپین رہے ہیں"
"تم ہمیں کسی اسپورٹسمین سے ملوانے لائے ہو؟ ہم نے پھر چاروں طرف دیکھا۔

"چند منٹ بعد ان صاحب نے ہم پر نگاہ ڈالی اور بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ آہستگی سے کہا آپکی حاضری تو لگتی رہی مگر ملاقات آج ہوئی۔

"ہم اور چکرائے۔ یہ کون ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ دوسری باتوں میں لگ گئے اور ہم حیران بیٹھے رہے۔ ہماری حاضری اسکول اور کالج میں تو لگتی تھی اور کہاں لگی —؟

"سوچا کیے۔ معاً سمجھ میں آیا۔

"دریائے گنگا کے کنارے جہاں ہم رہتے ہیں سول لائینز کے نزدیک برگد تلے چند مزار ہیں۔ ہم چار ساڑھے چار سال کے رہے ہونگے تب سے ایک انوکھی سی کشش ہر جمعرات کو ہمیں وہاں لے جاتی تھی۔ مغرب کے وقت کھیل کو چھوڑ کر ہم وہاں پہنچ جاتے۔ وہاں چراغ جلتے۔ لوگ آکر چلے جاتے۔ ہم ایک طرف چپ چاپ کھڑے رہتے۔ ممی ہمیں ڈھونڈنے کے لیے ملازم دوڑاتیں۔ جو ہمیں کبھی تلاش نہ کر پاتے۔ کچھ دیر بعد ہم خود ہی گھر پہنچ جاتے۔ بڑے ہو گئے لیکن یہ معمول جاری رہا۔ شہر میں جہاں بھی ہوتے کسی پارٹی یا دعوت یا کسی اہم سے اہم کام کو چھوڑ کر ہم چند منٹ کے لیے وہاں پہنچ جاتے۔ آج تک ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ہم اس جگہ کیوں جاتے ہیں۔ ہم کو مزاروں اور ان سے وابستہ عقائد کا کچھ علم نہ تھا۔ لیکن اس مرتبہ لکھنؤ آنے سے قبل تک ہم وہاں اسیطرح حاضری دیا کیے اور ہم نے آجتک کسی سے اپنے اس وطیرے کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ کیسے جانے اور ہمیں کیوں بلایا اور یہ کیا فرماتے ہیں کہ حاضری برابر لگا کی لیکن ملاقات آج —

"دل پر ہیبت سی طاری ہوئی۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔ بعد میں میاں نے نہ کبھی وہ بات دہرائی نہ اسکا مطلب بتلایا۔"

"پرسوں رات" رخشی نے کہا "میاں فرما رہے تھے کہ ملفوظات اولیاء میں جو کچھ لکھا ہے وہ محض حاشیے کی گفتگو ہے۔ راز کی باتیں بتانے کا کسی کو حکم نہیں۔"

یہ شششیہ پہلی نظر میں وہ آرٹی قسم لگتا ہے جو اس ملک کی پکچر گیلریوں اور فلم کلبوں میں پائی جاتی ہے۔ اصلیت میں ایک مہذب اودھی برہمن زادہ ———— مریدین میں اور ٹھوڈوکس برہمنوں کی ہم نے بہتات دیکھی۔ "بھید ہم تم کیا سمجھ پادیں گے —" وہ کہہ رہا تھا۔

ڈھال پر جھلکتے تالاب کا آدھا حصہ آبی درختوں میں پنہاں ہے پرلے کنارے پر
سنا دہ بستی کے سفید مکانات ڈوبتے سورج کی روشنی میں گلابی ہو گئے۔
گویا گویا یا ایل گریکو کا کوئی منظر۔ ہوا چلی۔ باغ میں یوکلپٹس سرسرائے۔
"گلشن راز——!" کنور نے سر اٹھا کر کہا۔
"کون چیز——؟" ہم چونکے۔
"ایک ایرانی صوفی کی کتاب ——اور فیہا ما فیہا۔ یعنی اسمیں ہے جو کچھ ہے ——
ملفوظات رومیؒ۔"
"معاف کرنا ہم جب سے یہاں آئے ہیں بہت کوشش سے یہ محسوس کرنا چاہ رہے ہیں
یہ قلعہ اسرار و رموز کا گڑھ ہے ——لیکن ہمیں کوئی مسٹری نظر نہ آئی۔ ایک بات نے ضرور
تعجب کیا کہ تمہارے شیخ ہر وقت اسقدر بشاش اور شگفتہ نظر آتے ہیں۔"
"سچا صوفی مسرور و مطمئن رہتا ہے کہ خوف و رجا سے آزاد ہے۔" سینڈی نے عربی باجی
ں طرح کسے بڑے دلی کو کوٹ کیا۔
"ایک بار ارتقاء کا تذکرہ کرتے ہوئے جرمن باجی کو مخاطب کیا۔ آپ بھی ذرا پیچھے چلیے۔
علوم ہوا ڈال پہ بیٹھی ہیں۔ پھر ایک صاحب کے متعلق بولے۔ انکو پیچھے جانے کی ضرورت نہیں۔
اب بھی ڈال پہ ہیں۔
"ایک روز ہم سرکار کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ کہنے لگے سامنے سے جو کار آویگی اسکا
بر نوٹ کرنا۔ ہم چکرائے جانے کیا سیریس بات ہے۔ چند منٹ بعد جو گاڑی پاس سے گذری
کی نمبر پلیٹ کے آخری عدد ۲۰۴ تھے!" رجن نے کہا۔
ہم سب نے قہقہہ لگایا۔
"لیجئے رانی صاحب آگئیں۔" کنور بولا۔
سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ جو معمر خاتون معمولی سوتی ساری اور گرد آلود چپل پہنے خفیف
- لنگ کے ساتھ تیز تیز چلتی ہماری طرف پہنچیں وہ قطع سے رانی کے بجائے ایک مڈل
اس بنددو گرہستن لگ رہی تھیں۔

"السلام علیکم" وہ گرجیں۔ ہم اور حیران۔

"نمسکار رانی صاحب" رنجن نے پرنام کیا۔

"کہاں ہیں ہمارے باپ؟ سو رہے ہیں؟ یا کہیں گئے ——؟ ہمیں انہوں نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ یہ دیکھو اسٹیشن سے نہ رکشا ملی نہ بس دو کوس چلے پیدل" وہ بڑبڑاتی ہوئی بنگلے کی طرف چلی گئیں۔

"یہ کہیں کی رانی صاحب تھیں؟ سابق؟"

"بیحد۔ ایکدم بلو بلڈ"

"خبطی ہیں؟"

"قطعی نہیں ماں کے برابر ہیں مگر انکو اپنا باپ کہتی ہیں۔ وہ ہم سب کے باپ تو ہیں پر اتنے کم عمر انسان کو اس لقب سے پکارنا ذرا فنی لگتا ہے۔ اتا یشودھا کی طرح ڈانٹتی ہیں ممتا بھگتی۔ یشودھا میّا والی" سینڈی نے کہا۔ "مگر بھرت منی کے نورس اکثر رل مل جاتے ہیں"

"مشاہدہ حق کے بادہ و ساغر میں کوک ٹیل"

"آسمانی باپ۔ دوست آقا کرسچین۔ مسٹک۔ اسلامی۔ ایک روز مرشد نے ایک قصہ سنایا۔ محمود نے ملازموں کو حکم دیا محل کے سارے قیمتی ظروف توڑ ڈالیں انہوں نے تعمیل کی۔ تب اس نے ایاز کو خوب جھاڑا۔ بولے۔ جہاں پناہ آپ ہی نے تو کہا تھا۔ ایاز کو ڈانٹا۔ اس نے دست بستہ عرض کی۔ غلام سے تقصیر ہوئی۔ یہ داس بھگتی ہے۔ سداما کی اپنے متر کرشن کے لیے سکھا بھگتی۔ رادھا اور میرا کی پریم بھگتی۔ دشمنی کے مضبوط بندھن والی بیر بھگتی سے آج کی دنیا سب سے زیادہ مانوس ہے۔ راون رام کے ہاتھوں ہلاک ہونا چاہتا تھا۔ سب سے بڑا وبھتس بھگت وہی تھا۔ ہمارے دلن بھائی کی شردھا کج بھگتی ——"

سب ہنسے۔

"ہم اسوقت بابسیہ رس میں ہیں۔ چار سُو سبزہ نورس۔ نورس زیرِ بحث۔ اورآپ

موش۔ کچھ فرمائیے صاحب ــــ" میں نے فیٹ والے نووارد کو مخاطب کیا۔

" ان مہاپنڈتوں کے درمیان؟ اور آپ بھی گنوان نکلے۔"

" تھوڑی سی شد بد ہے۔ پچھم کے تصویر خانوں کی بدولت۔"

" آپ آرٹ ڈیلر ہیں؟"

" جی۔" سبجکٹ بدلا" یار کنور۔ تمہارے اس بندرابن میں سب رس ملے الاّ شر نگار
ں۔ راس لیلا بھی نظر نہ آئی۔"

" کتھک یا منی پوری لباس مجازیں؟ اور شر نگار رس یہاں ملے گا؟ گھاس تو
ہیں کھا گئے؟"

" حقیقی راس لیلا کی سمبلزم میں" رنجن گویا ہوا۔" نوائے سرمدی پر رقصاں نسانی
وحوں کا ٹوٹل سرنڈر ــــ کہ چاندنی راتوں میں ہر رقصاں گوپی کو ایک ایک کرشن اپنے
ساتھ ناچتا نظر آتا تھا۔ من تو شدم۔"

کنور بولا۔" رنگ اور سُر اور رس۔ حرکت۔ اور تال۔ اور لے ساری کائنات۔ اور لفظ
ابتدا میں تھا مگر یہ حرف شیریں ــــ"

میں نے احتجاجاً ہاتھ پھیلائے۔" اتنی آفاقیت کے بجائے محض دھانپوری رہس
ھاریوں کی ,امشگری پر ہم ایک پوری کتاب تصنیف کر سکتے تھے۔ بھائی ہم کو مکروہات زمانہ
ے فرصت نہ دی ورنہ ہم بھی یہ مابعد الطبیعاتی موشگافیاں کرتے۔ نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ یکساں
ٹک اصطلاحات تلمیحات کے باوجود کرشن اور رادھا اور گوپیاں اور برائیڈز اف کرائسٹ۔
۔ اولیاء کا وصال اور عرس اور گوری سوئے سیج پر مکھ پہ ڈالے کیس۔ اور یہ کہ مولانا حسرت
ہانی سری کرشن کو اونچا عارف سمجھتے تھے۔ اور یہ کہ صوفیا کا محبّت کا باغ مدھیہ کال اودھ
پریم مارگی صوفیوں کا پریم بن اور مرگا وتی اور مدھو مالتی ــــ دی ورکس ــــ قوموں
بالکل اندرونی سائیکی پر زیادہ فرق نہیں پڑا۔ ذرا سا کرید دو تو ..... ایک آخری امید
ہیومنزم سے تھی وہ ہو گئی فیل ــــ ساری دنیا میں۔"

چند خدام گھاس پہ آن بیٹھے۔ ان میں سے ایک منحنو صاحب۔ نام اور انداز سے نوابزادے

اب سراپا عجز و انکسار۔ ہمہ وقت نماز روزے اور خدمت میں مصروف۔ خاصے گندھرو
بغیر محنت کی مستقل آمدنی رکھنے والوں نے تین چار کام اس جہان فانی میں کیے۔ عیاشی
ستم گری۔ تہذیب کی آبیاری اور پرداخت۔ اور علم دوستی۔ منجو صاحب کے متعلق معلوم نہ
پہلے ستم پیشہ یا رنگیلے تھے یا نہیں۔ البتہ اعلیٰ نفاست انہی جیسوں کے ہاں پروان چڑھ
بڑے ابا مرحوم آخری زمرے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسکالرشپ۔ اکثر الفاظ کی ٹوہ میں لگ
رہتے۔ لال بی بی نے انہیں پریشان رکھا۔ ایک روز کہنے لگے بھیا۔ کرشن بن راج بیا
کے گیتوں میں بنرا اور بنا بنے۔ سیدھی سادی پُرامن پروسس تھی۔ مگر اب الفاظ
علائم کے اصل معنی پرخون خرابہ۔ معنی بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اور جو جان گئے ہیں ان میں
سے کچھ چپ سادھ لیتے ہیں یا تارک الدنیا ہو جاتے ہیں۔
منجو صاحب موضوع کی مناسبت سے گنگنانے لگے۔ مدھوبن میں رادھیکا ناچے رے

"گردھر کی مرلیا باجے رے۔" سینڈی نے سر دُھنا "یہ ہے اصل حقیقت۔ حقیقت
مرکزی نقطہ۔ سمجھنے والے کی موت۔ ہائے۔ ہائے۔ نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم

جھیل کے کنارے ایک طاؤس رقصاں تھا۔ باغ پر جیسے کسی نے گلاب کے شیشے
انڈیل دیے۔ پکھیرو چہچہا رہے تھے اور عنبریں ہوا چل رہی تھی۔ ع۔ اے اودھ کی نسیم عقدہ کشا
وہ ملیں تو پیام یہ کہنا ذرا۔۔۔ کیا کہنا۔۔۔؟ ابکے ساون گھر آجا۔۔۔! دھیتہ ہو نگار جانم
آئے تمہارے کارن۔ یاں بن میں دھن پایا۔
"آپ ینگ کی طرح مسکرا رہے ہیں!" نو وارد نوجوان نے کہا۔
پہلے مینفسٹو۔ اب ینگ! دھینہ ہو سارنگ نگری کے مدھوسودن!
آسمان پر ابر چھا رہا تھا۔ منجو صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا پھر بولے "بادلوں کا سواں
کرنی، کنچن تنو، لوچن کمل، گلرخ، زعفرانی ساری، ہاتھ میں شہد کا پیالہ۔ جلو میں طاؤس
کنہیا جی کی مدھو مادھوی راگنی۔ چاندنی راتوں میں جب وہ بنسی بجاتے ہیں، نمودار ہوتی

مارے ریذیڈنٹ استاد بتایا کرتے تھے فلاں گھرانے کے فلاں خانصاحب نے کون کونسی
راگنیاں بس میں کرلی تھیں۔ جب ان میں سے کسی کو چھیڑتے وہ ظاہر ہو جاتی۔ یعنی اس کی
آتما اپنا مخصوص روپ دھار لیتی۔

"ہمارے دادا عرش آشیانی نے علم موسیقی پر نہایت مکمل قسم کی کتاب لکھی تھی۔
شی نولکشور نے چھاپی۔ ہم تو محض روایات ہی سنا سکتے ہیں۔ واللہ علم بالصواب۔ کہتے ہیں
بعضے راگ راگنیوں کی خاص بندشیں اگر صاحب کمال گائے وہ چند امراض سے شفا دیتی
یں۔ بڑے بوڑھوں سے سنا ہے دتی والی دلنواز راگ سے علاج کرتی تھیں۔ ہمارے
ردادا کی شادی میں انکا مجرا ہوا۔ سوہنی ایک نہایت خواب آور راگنی ہے۔ انہیں نے
ائی تو حاضرین جلسہ گہری نیند سو گئے۔"

"تکان اور بوریت بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"یہ آپکی عادت ہے۔ اچھی بھلی بات میں بھُس ملا دیتے ہیں۔" کنور بڑبڑایا۔

"—— قاعدے کے مطابق علاج کے لیے بغیر طبلے کے گاتی تھیں۔ جھنجھوٹی اور پہاڑی
رائے دردِ سر۔ اختلاج قلب اور صفراوی عارضوں کے لیے سندھی بھیروی میں ع عشق
رب فقیر ہو ترک کیا جو ہو سو ہو —— پھر سنا ہے خود بھی بیراگ لے لیا۔ سات حج کیے۔
وُرن بجنے لگیں۔ اتفاقیہ آتش زدگی سے جھُلس گئی تھیں۔ جب یہ خبر آگ کی طرح پھیلی
واص و عوام نے بیساختہ کہا بی دلنواز نے دیپک چھیڑا ہوگا جو شعلہ لپکا۔

"ہمارے استاد مرحوم کا ارشاد تھا دوپہر کو کلیان میں گائے ع آئی بہار رباغ
بن بُلبُل قفس میں ہے —— تو غصّہ دھیما ہو۔ سکون ملے۔"

"یہ تو بہت غصّہ دلانے والی بات ہے۔ سکون کیسے ملے گا۔" میں نے کہا۔

"—— استاد سے یہ بھی سنا کہ لکھنؤ کی حیدر جان کے مانند جے پور والی نواب بائی
نے بھی ایک بار ملہار سے مینہہ برسا دیا تھا۔ راجہ کوڑیا کھولو —— ان بے چاری کو کسی دشمن
نے پان میں سِندور کھلا دیا۔

"راجہ کوڑیا کھولو رس کی بوندیں گریں۔ آئی گھٹا گھنگور رس کی بوندیں ۔۔۔
کہتے ہیں اگر تیز بارش میں زور زور سے گائے تو ملہار کو قابو میں کرے۔ بجلی کا دھڑکا
کڑک کا خوف دل سے جائے۔

"ایک روز سماع پر بات ہو رہی تھی۔ میاں نے فرمایا انسان تو اشرف المخلوقات
ہے اونٹ سے بحث کیجئے کہ وہ عربی نغمے پر کیوں مستانہ وار دوڑتا چلا جاتا ہے ۔۔۔"
بوندا باندی شروع ہوئی۔ ہم لوگ برساتی میں جا بیٹھے۔ منجو صاحب اب "بھری گگری
موری ڈھرکائی شام" الاپ رہے تھے۔

ہماری بھری گاگر بھی تو اب ڈھلکنے ہی والی ہے۔ نجانے کس گھڑی شام کنکری مار دیں
اور ہم اس ساربان سرائے بے بنیاد سے نذائے۔ معاً موت کے خوف نے پھر آن دبوچا۔

بادل چھٹے۔
شام رنگ آسمان پر دھنک نکلی ۔۔۔ اندر دھنش۔ بادلوں کے راجہ اندر کی کمان۔
اسکے رنگ باغ کے پھولوں میں اتر آئے۔ طرح طرح کے نایاب پھول پودے۔ میں نے
ہاتھ بڑھا کر ایک تیز سرخ گلاب کو چھوا۔
گلاب صوفیاء کے نزدیک حسن ازل کی ایک علامت ہے۔

ہم لوگ اٹھ کر ہال میں پہنچے۔ رانی صاحبہ نند کشور کو ڈانٹنے میں مصروف
تھیں۔ "ہم دو مہینے سے آنا آنا کر رہے ہیں تم نے راستے میں اتنی اڑچنیں ڈالیں آنے بھی
نہ دیا۔ اب دیکھو تم نے ہمیں لنگڑا بھی کر دیا۔"
ایک ماہر نفسیات کے تحمل کے ساتھ متبسم۔

عربی اور جرمن باجیاں مع اپنے اپنے رشتے داروں کے آن پہنچیں۔

ایک روز علی الصبح دیدی کی آواز آئی "السلام علیکم چا چا ــــــ!"

"اب تو آپ کو بلائیں نہیں ستاتیں؟" سہ پہر کو باغ میں ٹہلتے ہوئے ہم نے مسکرا کر پوچھا۔
"توبہ اب انکا نام نہ لیجئے ــ چا چا ہو! یاد ہے دھان پورا اور ہمارے علاقے کے بیچ میں ایک جھیل پڑتی ہے؟"
"جی ہاں۔ یاد کیوں نہیں۔"
"اسمیں سے کبھی کبھی ایک ٹھو بھیروی نکلا کرتی تھی آدھی رات کو۔ اماوس میں۔"
"چڑیلیں بھیروی بھی الاپتی ہیں؟ ــــــ یا وہ عورت جو تنترک سدھوں کی میڈیم بنتی ہے؟"
"چا چا" دیدی نے صبر سے گویا ایک کم فہم بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "جس یوگنی کی تپسیا سپھل نہیں ہوتی وہ مر کر بھیروی بن جاتی ہے۔ بھرشٹ یوگنی۔"
"اوہ ــــ وہ بھیروی۔ والدہ کلوا بیر ــــــ!" یاد آیا ہماری کہاریں کچھ بے سر و پا قصے سنایا کرتی تھیں دیدی سے انکی فوک لور سنتے باورچیخانے کی طرف نکل گئے۔ اندر جھاڑ پھونس کے اس عریض جھونپڑے میں عربی باجی اور چند لڑکیاں نذر کی کھیر تیار کرنے میں مشغول تھیں عربی باجی نے پرس میں سے میسوری اگربتیوں کا بنڈل نکالا۔
"بھئی آپ تو اس شعبے میں بہت درک رکھتی ہیں۔ یہ خوشبوؤں کا کیا سلسلہ ہے؟"
"نادانستہ آپ نے کہا خوب۔ خوشبوؤں کا سلسلہ۔ بات یہ ہے کہ روحیں خوشبو پسند کرتی ہیں۔"
"کھانا وانا بھی کھاتی ہیں؟"
"حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ نے تو ایک جگہ حضرت ابن عباسؓ کو کوٹ کیا ہے کہ روحیں کھانا بھی کھاتی ہیں اور صوفیاء ایک دوسرے سے ملنے بھی جاتے ہیں ــــــ۔"
"نو کڈنگ ــــــ؟"
"حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ فیروز شاہ تغلق انکے لئے خوان

لے کر آیا تھا۔ خانقاہ میں۔ اسیوقت شیخ محی الدین العربیؒ ـــــ جانتے ہیں نا آپ؟ وہی اسپین والے ـــــ وہ اسیوقت ان پر کال کرنے آگئے۔ مخدومؒ نے اسوقت ملنے سے معذرت چاہی۔ جب وہ چلے گئے انہوں نے ماحضر تناول فرمایا۔ بہت بے مزہ لگا۔ انہیں بڑا افسوس ہوا۔ کہ ممکن ہے ابن العربی بھوکے رہے ہوں۔ آئے تھے تو کھانا کھا کر جاتے"۔ نذر کی سینی اٹھاتے ہوئے کہنے لگیں ـــ "مگر ہم نے میاں سے کبھی اس مسئلے کے بارے میں استفسار نہیں کیا۔ چلیے آج پوچھیں گے ـــــ"

ہال کے اندر میاں اپنی مسرت پاش آواز میں کوئی حکایت بیان کر رہے تھے۔" ایک سینٹ جنت کے دروازے پر پہنچے۔ وہاں ایک بلی اور ایک چوہا پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے مارے سینٹ پنے کے ـــــ"

مارے سینٹ پنے کے ـــــ! مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ حکایت ادھوری چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوئے۔ دو فورسٹ آفیسر انکے فرشی بستر کے نزدیک دوزانو بیٹھے تھے میاں نے مجھے مخاطب کیا ـــــ "چلیے کل رات آپکو نیشنل پارک لے چلیں"۔

وہ ہمیشہ رات کو سفر کرتے ہیں۔ دوسری شب وقت مقررہ پر ہم نے تیاری پکڑی اور گاڑیوں کے پاس جا کھڑے ہوتے۔ بہت دیر انتظار کیا۔ دوسرے "پابہ رکاب" اصحاب و خواتین مطمئن معلوم ہوتی تھیں ہم جھنجھلا کر خانقاہ کی طرف لوٹے۔ باغ کے مصفّا راستے پر تہجد گذار بی بی مل گئیں۔ ان سے پوچھا۔

"وہ تو آرام سے لیٹے سوویت دیس میں ایک افسانہ پڑھ رہے ہیں"۔

فوراً اندر پہنچے۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے انہوں نے ہم سے کہا "عجیب گنجلک کہانی ہے یہ"۔

"میاں ـــ وہ کیم رنزرو ـــ"

"کل رات!"

"پروگرام تو آپ نے آج کا بنایا تھا۔ کل بھی چلیں گے یا نہیں؟"

کنور دروازے میں کھڑا تھا۔ اشارے سے ہمیں باہر بلایا: "فقیر سے کبھی اسکا ارادہ نہیں پوچھنا چاہیئے۔"

"تم لوگ انکے اس قسم کے معمول کے عادی ہو۔ ہمیں بہت کھل رہا ہے۔ بھلا کوئی بات ہے بتائے بغیر پروگرام ملتوی۔"

صبح کو چار کے بعد سینڈی کے ساتھ باغ میں ہوا خوری کرتے رہے۔ طبیعت میں چڑچڑاہٹ باقی تھی۔ ہم ورلڈ ٹریولر آدمی۔ سفر حضر کے لئے منٹ منٹ کا حساب رکھنے والے طے کرلیا تھا کہ وائلڈ لائف کی سیر کے بعد بذریعہ ٹرین دلی نکل جاویں گے۔ وہاں سے سیدھے ٹوکیو۔

محمدی باجی بڑی سادگی سے ایک پوربی سلام گنگناتی باورچیخانے کی سمت چلی گئیں۔
"اتنی عرض ہے روضے پہ تمہرے آئے کے ہم ہو پڑھتے سلام اے پیارے نبیؐ"

محمدی باجی انہیں بیک واٹرز کی رہنے والی۔ برسوں سے ان گنت مہمانوں کا کھانا صبح شام بڑے آرام سے پکا رہی تھیں۔ ساری کا پلو دیہاتی انداز سے آگے ڈالے ہمیشہ متبسم۔
اے نفس مطمئینہ!

مگر جہانِ سوم کے تمام غرباء و مساکین مذہب کے سہارے اسیطرح مطمئین رہتے ہیں۔ یہی سارا پرولم ہے۔ لیٹن امریکہ اور میکزیکو کے گرجا اور سینٹس کے مزارات پسماندہ اور نادار کیتھولک آبادی سے پُر۔ سال کے بارہ مہینے مذہب مذہب۔ بے دین پروٹسٹنٹ شمال بلا وجہ ترقی یافتہ اور دولتمند نہیں ہوگیا۔

یکلخت خیال آیا نورا ہماری روپوشی کی عادی ہے مگر اس بار سوچتی ہوگی انجام کار انڈیا میں دھرے گئے۔ وہاں ہمارا کاروبار چوپٹ ہو رہا ہوگا۔ ہم دین کی طرف مائل ہوئے بیوپار ذہن سے نکل گیا۔ وہ بیچاری ہمیں لکھنؤ ہوٹل کے پتے پر خط پہ خط لکھ رہی ہوگی۔ چرچ میں ہماری سلامتی کے لیے شمعیں جلاتی ہوگی۔ بیشتر اہل دنیا کی طرح پارٹ ٹائم ایمان رکھتی ہے۔ ہم ہول ٹائمر بننے کے چکر میں پڑ گئے۔ ہم ہو —

"آئے کے ہم ہو پڑھتے سلام اے پیارے نبیؐ —" محمدی باجی باورچیخانے کے سامنے

گھاس پر بیٹھی آلو چھیلتی ہوئی گنگنایا کیں۔ اے پیارے نبیؐ ـــــ تارے گگن میں تمہارا نام ـــ

تسلیم و رضا۔ یعنی سرنڈر۔ مگر کا ہے کے لیے ؟

ایک ہفتے سے متواتر یہی ہو رہا ہے۔ ہم آدھی رات کو رختِ سفر باندھے کھڑے ہیں اور سویرا ہو جاتا ہے۔

آج رات مرشد سفاری کے لیے تیار ملے۔ رنجن ہمیں دیکھ کر ہنس پڑا۔ "پچھلے تین چار روز سے آپ نے ان سے جرح نہیں کی تھی نا سرنڈر کر دیا۔ شاید اسلیے۔"

صبح کا تین بجا تھا۔ صبا رفتار میاں حسب معمول خاموشی سے اوراد میں مشغول۔ ہم پچھلی سیٹ پر۔ باقی ساتھی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن مجھ پر اب سفر سوار ہے۔ گیم ریزرو کے قریب کوئی ریلوے اسٹیشن ضرور ہوگا۔ چھوٹی لائن ہی سہی۔

کیوں نہ ـــــ ایسکورٹ سروس کی ایک شاخ ینیر دبی میں کھولی جاوے۔ پٹاخہ لڑکیاں اور طرحدار چھوکرے سیاحوں کو سفاری پر لایا کریں۔ کینیا سے گرنار۔ پریار۔ کوربٹ ۔ دودھوا۔

دفعتًا میاں نے کار موڑلی۔ سب چپ رہے۔ ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ دل نے کہا دلشاد علی۔ تمہارا نام خطا کاروں کے دیوان کے اندر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے ـــــ تمہارے غول بیابانی نے لالٹین چمکائی اور تم پھر ادھر لپکے۔

شاید ہم اپنی سفاری پر کچھ کچھ تو چل پڑے ہیں۔

"آج کہیں اور گھوم آدیں ـــ" اس روشن ضمیر رواں شناس نے مسکرا کر کہا۔ دوسری گاڑیوں کا کارواں پیچھے پیچھے لوٹا۔

ان ہی سنرا ہم جیسے بگ گیم ہنٹر کو اپنی سابق شکار گاہ دیکھنے کا بے انتہا شوق تھا! اسکے

بجائے، دورافتادہ دیہات! کسانوں کے جھونپڑوں میں شب باشی۔

ایک رات ایک برہمن گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اگلی سیٹ پر شیخ کے ساتھ براجمان سامنے دیکھتے جہاں پٹرول کی سوئی صفر کے نشان پر ٹکی ہوئی تھی۔ ارادتمندان خوارق کے عادی ہو چکے ہیں انکا تذکرہ نہیں کرتے۔ ہم بھی اب چپ رہتے ہیں۔

او۔ کے۔ سائیکولوجی اینڈ سوسیولوجی اوف ریلیجن کے بجائے پیرا سائیکولوجی اور پیرا سائینس ـــــ

سارے برہمن گاؤں میں دیوالی کا سا چراغاں۔ عورتوں کی ٹولیوں نے آرتی اتاری۔ بھجن گائے۔ کنور نے کہا تھا صاحب وِقت کی ایک پہچان یہ ہے کہ بلاتفریق ہر مذہب و ملت کے انسان اسے بے انتہا چاہیں۔

صاحب وقت دراصل دو ہیں۔ ایک پورب والا۔ ایک پچھم۔

وہ اپنے آپ کو طرح طرح سے پہچنواتے رہتے ہیں۔ ایک موسم سرما میں سموری ٹوپی اور پوستین پہنتا ہے۔ اور درخشاں قرمزی کوکب والے حصار میں اسکا آستانہ ہے۔ دوسرا ایک بیت الابیض میں مقیم ہے۔ درجۂ قطبیت حاصل کرنے سے قبل تماشا گر تھا۔

ان دونوں کی نوائے سرمدی پر انسانی روحیں مشرقین و مغربین میں رقصاں ہیں مگر نا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رایں ذوقے کہ پیش یار می رقصم۔ وہی دونوں رومیؒ کے نَے بھی اپنے پاس رکھتے ہیں گر دھر کی مرلیا بھی۔ یہی ہے اصل حقیقت۔ ساری حقیقت کا مرکزی نقطہ۔ بھائی میں تو سنڈی مین بھی ہنسی کی سمبلزم ہی میں بات کر رہا ہوں۔ سمجھنے والے کی موت ہے۔
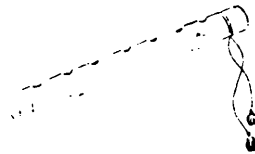
(۴۲)

کلیانی ندی

ایک نازک پُل پر سے گذرے۔ ذراسی آب جُو۔ سرارنسٹ واٹرلو کی "لونیگ کے کنارے" کا ایسا پکچریسک منظر۔ (برسوں مصوری کا پروفیشنل مطالعہ کیا تاکہ اصل اور نقل میں امتیاز کرسکوں اور پھر ان شاہکاروں کو چراؤں۔)

دھانی دوپٹے پر ٹکے روپہلے لچکے کے مانند چمکتی کلیانی۔ حضرت عبدالرزاق بانسوی کی ندی کہ اسکے کنارے مراقبہ کرنے والوں کو کلیان ملتا تھا۔

کلیان کیا شے ہے؟ جنگل جنگل الفاظ کے معانی تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ وہ جگنوؤں کی طرح چمک کر پھر اندھیرے میں بجھ جاتے ہیں۔

گنگ وجمن اور چناب وراوی ان لوگوں کے خون میں بہتی تھیں جنکو اب ڈارٹ اور موسل اور ٹرینیٹ اور کینیٹ کے کنارے کلیان

حضرت عبدالرزاق بانسوی رح کی ایک بیرہ زادی سوربون میں تعلیم یافتہ اپنی اولاد کے ساتھ نیویارک میں رہتی ہیں، گھر آئی ہوئی تھیں۔ دالان میں منتظر۔ اور بہت سے لوگ سب چشم براہ۔ ایک تہمد پوش چوگوشیہ ٹوپی والے باریش جواں سال نفر ایک در کے نیچے مونڈھے پر بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب، چائے ــــ؟" چھینٹ کی شلوار قمیص میں ملبوس ایک گوری چھریری سی لڑکی نے پاس آکر ان سے دریافت کیا۔ یہ صاحب غالباً ہومیوپیتھ یا بی۔یو۔ایم۔ ایس حکیم بھی تھے۔ اپنا سفری بیگ فرش پر رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ راستے بھر چھینکیں آیا کیں۔ ڈاکٹر صاحب نزلے کی دوا عنایت ہو،

"سوری! میں دوسری قسم کا ڈاکٹر ہوں۔"

"اسلامیات؟ علیگڈھ؟"

"فنومنولوجی۔ سوربون۔"

چھریری لڑکی چاء کی ٹرے کشمیری اخروٹ کی میز پر رکھ کر واپس گئی۔ میں لوگوں کو چند سکنڈ میں بھانپ جانے کا ایکسپرٹ ہوں ابھی ابھی دھوکا کھا چکا تھا —— لیکن اس کے بارے میں قیاس آرائی ضروری نہ سمجھی۔ اس وضع قطع اور رنگ روپ اور انداز کی بچیاں یہاں یو۔ پی میں ہر طرف نظر آتی ہیں —— شرمیلی، مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ مودّب، سگھڑ، دیندار۔ (یہ لڑکی برابر زیر لب درود شریف پڑھ رہی تھی۔ ذرا زیادہ ہی دیندار تھی) اس قسم کی کرامت حسین یا علیگڈھ میں پڑھنے والی سیدھی سادی بھارتی مسلم لڑکیوں کی پاکستان کی میرج مارکیٹ میں بہت مانگ ہے۔

ڈاکٹر اف فلاسفی نے تسبیح جیب میں ڈالی۔ نقرئی انگشتریوں سے لدی انگلیاں چہرے پر پھیریں۔ میزبان بیگم صاحبہ نے مہری کو پکارا، انکی اولاد کلیانی سے ہڈسن۔ یہ موفی جی سوربون کو مع فنومنولوجی مسترد کر کے سین سے کلیانی —— اٹھارویں صدی میں واپس؟

اب انھوں نے جیب سے انگریزی کا قرآن شریف نکالا میرا استعجاب دیکھ کر ہنس پڑے "آپکو مزید پریشان رکھنا نہیں چاہتا۔ دراصل —— میں نے جس کلچر میں جنم لیا اسمیں سنیاس کی پرم پرا بہت قدیم ہے۔ ایک آسٹریلین یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا۔ اچانک جی اچاٹ ہو گیا۔ مذاہب کی اسٹڈی شروع کی اسطرف بہت کشش معلوم ہوئی۔ سوا دھر آ گیا۔ چند سال مدھیہ پردیش کی درگاہوں میں بتائے۔ حسینؑ ٹیکری پر بشارت ہوئی کہ میاں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ انکا نام نہیں بتلایا گیا، صرف شبیہ نظر آئی۔ کئی بار۔ وہ ذہن سے نکل گئی۔ پھر بھٹکا پھرا۔ ابھی پچھلے مہینے کسی نے انکا نام پتہ بتلایا۔ اتر پردیش آیا۔ خانقاہ پر پہنچا معلوم ہوا سفر پر گئے ہیں۔

فلاں تاریخ کو شاید اس قصبے میں پہنچیں، اس کوٹھی میں آکر اتریں گے۔ آپ لوگوں کی آمد سے کچھ دیر قبل ہی بس کے ذریعے یہاں آیا ——— سب ہدایت اللہ کی طرف سے ہے حضور گایئڈ کر رہے ہیں" فنومنولوجی کے ڈاکٹر نے بڑی سادگی سے بات ختم کی۔ ان حضرت نے دور حاضر کے دماغ کو چھٹی دیدی اور سترھویں اٹھارہویں صدی کے خوابیدہ ذہن کو جگا کر شانتی پا گئے۔ وہ مشرقی ذہن جو سوال کرنا نہیں جانتا تھا۔

رات۔ وسیع پختہ صحن میں کسی میڈیول کارواں سرائے کی ایسی چہل پہل۔ دیوار کے نیچے چولہے سلگائے جا رہے تھے۔ محمدی باجی کی آواز آئی ——لوچیا—— اے لوچیا بیٹا——

"مومنتو ——ابھی آتے"

دوبارہ دھوکا کھایا۔ وہ لڑکی ایک چولہے کے پاس بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھی۔ سگریٹ کے لئے ماچس لینے کے بہانے قریب جا کھڑا ہوا۔ بیوقوفوں کی طرح سر کھجایا ——— اس نے پوچھا۔ راجہ صاحب خاگینہ پسند کرینگے یا چاندتارا ؟ مجھے حیران پریشان دیکھ کر صوفی جی کی طرح وہ بھی مسکرائی "راجہ صاحب۔ تشریف رکھیے۔ وہ مونڈھا لے لیجئے۔ آپکو قلعے پر دیکھ چکے ہیں۔ جس روز آپ لوگ دڈھوا جا رہے تھے ہم اسی شام لکھنؤ سے پہنچے۔

"—— قلعے میں بھی ہم زیادہ تر باور چیخانے ہی میں رہتے ہیں۔ آج دوپہر کی بس سے یہاں آئے۔ تاکہ آپ لوگوں کو جوائن کریں"

"صاحب ہم بروکن ہوم کی اولاد قطعی نہیں ہیں۔ ہمارے ماں باپ دونوں میلان میں یونیورسٹی پروفیسر ہیں۔ دونوں ایکدوسرے کے ساتھ بہت خوش۔

" والدہ یہودی ہیں۔ نہیں ہم ہپی بھی کبھی نہیں بنے۔ اسکی ہمارے مزاج میں گنجائش نہیں تھی۔ ہمارے ایک چچا جیزوئیٹ فادر ہیں۔ کسی افریقی مشن میں۔ ہم بھی بہت پکے کیتھولک تھے۔ ہندوستان سیر کرنے آئے۔ گھومتے پھرتے ترائی پہنچے۔ اور بالکل اتفاقیہ قلعے ،،

"خوب جست بھری!"

"جست؟ جی نہیں۔ رفتہ رفتہ۔ اٹلی سے ہر سال آنے لگے۔ مہینوں رہے ——"

"اتنی سلیس بامحاورہ اردو ——"

"آپ سات آٹھ برس اٹلی میں قیام فرمادیں تو اسی روانی سے اٹیلین نہیں بولنے لگیے گا؟"

"آپکی تو شخصیت ہی بدل گئی!"

"میاں کی بہنوں کا اثر اور انکے ہاں کا پاکیزہ ماحول۔ ہمیں یہ طرز معاشرت پسند ہے ہر لحاظ سے محفوظ سا بھی ہے —— اور صاحب رہی شخصیت کی تبدیلی —— تو اگر آپکو اردو میں گفتگو کرتے نہ سنا ہوتا تو الٹے ہم آپکو اٹیلین سمجھتے!"

میری کھوکھلی ہنسی۔ بیشک دنیا خربوزے کا کھیت ہے مگر مافیا کے سسیلین نژاد افراد کا رنگ اتنا واضح؟

"آپ کے دوست سینڈی صاحب دکھلائی نہیں دے رہے۔"

"لکھنؤ گئے۔ کل آجاویں گے —— سینورا —— ؟ سینورینا —— ؟ ایک بات نے مجھے اور اکثر متعجب کیا۔"

"آپ بہت حیران ہونے والی روح معلوم ہوتے ہیں!"

"سو تو ہے! لیکن حیرانی یہ کہ ویسٹ میں گوری جوگنیں ہزارہا نظر آرہی ہیں آپکی ایسی خواتین اکا دکا ——"

"اسلام کا نیگیٹو ایمیج ——" لوچیا نے لوچیوں کے لیے بھرتی سے پیڑے کاٹنے شروع کیے۔

"اور یہ مذہب جوڈیو کرسچین ٹریڈیشن کے کافی نزدیک ہے۔ اور کلرفل نہیں۔ اور سخت گیر —— یو نو وٹ آئی مین ——"

"علاوہ ازیں —— انڈک مذاہب ویسٹرن ورلڈ ویو سے اسقدر فاصلے پر ہیں اور بالکل مختلف۔ متضاد عناصر ہمیشہ ایکدوسرے کو اٹریکٹ کرتے ہیں۔ اور انکے فلسفوں میں لوچ بہت ہے۔

"علاوہ ازیں۔ انڈک مذاہب کے فارن مشن اسقدر کے ویل اورگنائیزڈ ہیں انکا لٹریچر اتنے سلیقے سے شائع ہوتا ہے دنیا کی ہر زبان میں۔ آپ لوگوں کو اپنے آپس کے سیکیٹرین جھگڑوں ہی سے فرصت نہیں۔ شروع شروع میں" اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا " مجھے لکھنؤ کے شیعہ سُنّی تعصّب اور ربلووں نے بیحد بددل کر دیا تھا۔ مجھے لگا جیسے اسلام از اے سِک ریلی جن۔"

—— سر اٹھا کر مجھ پر نظر ڈالی۔"آپ لوگ موڈرن ویسٹ کی زبان میں —— ویسٹ کی متجسّس روح سے کمیونی کیٹ کرنا نہیں چاہتے۔ اور رباہر بھی۔ کٹڑپنھتیوں کے ہاتھ میں ——"

چولہے کی دوسری طرف پرچھائیوں میں چھپے نواب منجو حقّے کے لیے کوئیلے دہکا رہے تھے۔ فسانۂ عجائب کا ایک پراسرار سا کردار۔ ویسٹ کی متجسّس روح سے یہ صاحب کمیونی کیٹ کر سکتے ہیں؟ میں نے سوچا۔ افسوس کہ دارالاسلام کے لوگ باقی دنیا کو باربیرین ہی سمجھا کیے۔"اتنی تمبا کو نوشی پیر کھُجا کر میں نے اظہار خیال کیا۔" صحت کیلیے مضر ہے —— اتنے سگریٹ۔ دن بھر میں چالیس پچاس چلمیں ——"

"جی ہاں۔ کوئی شخص اتنی چلمیں نہیں پی سکتا۔ لیکن حقہ نوشی سرکار کا ایک نوع کا ذکر ہے۔" کوئلوں پر پنکھا جھلتے جھلتے انہوں نے معًا مجھے مخاطب کیا "جُناب والا ہم بھی سیدھے ہو گئے۔ فرعون بے ساماں بنے گھُوما کرتے تھے۔ بد دماغ۔ خود پسند۔ جتنا بڑا یہ مکان ہے اتنا بڑا ہمارا ایگو تھا۔ اگر آپ انگلش ایکسپریشن استعمال کرنے کی اجازت دیں۔ ہم جیسے لارڈ آدمی —— اب چلمیں بھرنا اپنے لیے باعثِ فخر جانتے ہیں۔"

"ربائی یوزرے کا ارشاد ہے ——

"لارڈشپ آدمی کو دفن کر دیتی ہے۔ رابلٹی کی خاک بھی مہلک ہے۔ امارت کا مطلب ہے اقتدار سے محبّت۔ لیکن جو شخص علم حاصل کرنے میں کوشاں ہو اسے کبھی نہ رد کو امیروں اور حکّام وقت سے ہمیشہ احتراز کرو۔" لوچیا نے کہا۔

لارڈ آدمی — لارڈ — کچھ یاد آیا۔
"نواب صاحب سنا ہے آپکا نام موسیو سے بگڑ کر منجو ہو گیا بقول ڈاکٹر کاشغری"

"ربائی یوزے نے ربائی یوحنان بن زکائی سے سنا۔ ربائی یوحنان نے ربائی خلیل
ے۔ اس نے —" لوچیا گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے دہرا رہی تھی" نام — الفاظ —
ہورات انکے ایسوسی ایشن — سب رفتہ رفتہ بدل جاتے ہیں"

ڈاکٹر صاحب اس قسم کی تحقیقات بہت کرتے ہیں۔ لکھنؤ پر یورپین کلچر کا اثر —
بیو سے منجو۔ کوئینز سے کلّن۔ لارڈ سے لڈّن —

نواب منجو صاحب چلم لیکر گنگناتے ہوتے روشن دالان کی طرف لپک گئے۔

واپس آکر ایک کرسی پر فـرد کش ہوئے۔
اوپر تاروں پر نظر ڈالی۔
کرسی کا ہتھا بجانے لگے۔ جمائی لی" ملاحظہ کیجئے۔ اصل چیپن ڈیل۔ صاحب آج
سلم آرائش بھنڈی بازار یا کرخندار اسٹائل کہلاتی ہے تو خون کے آنسو روتا ہوں"
"نئی ہندو KITSCH بھی یہاں گھوم کر کافی دیکھی" میں نے جواب دیا" ملال ہوا

آنگن میں ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ قوالوں کی ایک پارٹی دالان کے ایک گوشے میں
ی پر جا بیٹھی۔ یہ ملّت ملّت پیر مغاں ہے۔ یہ ملّت —
" دیکھیے کسقدر محنت کش عوام یہاں جمع ہو گئے" نواب منجو نے کہا۔
" صوفیوں نے اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ کب دیا تھا؟" لوچیا نے پوچھا۔
" پچھلی بار جو یہاں بہیا آئی تھی پورے پورے ضلعے پانی میں ڈوب گئے۔ بڑی ہاہا"

ممی" نواب منجو بولے "ایک روز ایک اردو اخبار میں ایک عجیب خبر چھپی۔ اخبار کا نمائندہ کسی گاؤں میں پہنچا گذشتہ شب لوگ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے۔ ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں میاں بچائیے بچائیے ــــ ایک عورت چھتیس گھنٹے سے اپنے بچے کو گود میں لیے ایک درخت پر چڑھی اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ ایک سانپ اپنی جان بچانے کے لیے اسکے پاؤں سے لپٹا ہوا تھا۔ تب ہی چند نوجوان موٹروں کے ٹائروں پر بیٹھے اس گاؤں تک پہنچے اور عجیب و غریب طریقے سے لوگوں کی جانیں بچا کر غائب ہو گئے۔ اور یہ لوگ کسی سرکاری ٹیم کے افراد نہیں تھے۔ اسی زمانے میں راجہ صاحب عجیب اتفاق ہے کہ سرکار کے حجرے کے دروازے رات بھر بند رہتے اور صبح کو میاں بخار کھانسی میں مبتلا ملتے۔"

میں قرون وسطیٰ کی ایک کارواں سرائے میں بیٹھا فسانہ عجائب سن رہا ہوں۔

"لکھنؤ ریذیڈنسی کے میوزیم میں ایک موڈل ڈاکٹر جوڈا کی کوٹھی کا بھی رکھا ہے ــــ تو جناب۔ گھسیاری منڈی میں ایک کوٹھی تھی اسکی مالکہ ایک اینگلو انڈین لیڈی مسز جوڈا تھیں۔ ان ڈاکٹر جوڈا نے لکھنؤ میں شادی کر لی تھی وہ بھی شاید انہی کے خاندان کی تھیں۔ تو اس کوٹھی میں ایک اسکول تھا۔ بنارس اڈمشن ہائی اسکول۔ اس میں ہماری ایک خالہ پڑھتی تھیں۔ یہ صاحب بہت عرصہ گذرا۔ جب کا واقعہ ہے۔

"تو ایک روز وہ اسکول سے گھر آرہی تھیں۔ تانگہ والے نے ان سے کہا بیٹا چربا جھیل پر فلاں بیگم صاحبہ رہتی ہیں انکا آخری وقت ہے وہ آپکو بلا رہی ہیں خالہ نے ان بیگم صاحبہ کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ دہل گئیں۔ تانگے والا انکو سکندر باغ کی سمت لے چلا انکی گھگھی بندھ گئی جاڑے کا زمانہ سورج ڈوب چکا تھا اتنے میں اس نے تانگہ روکا اور سنسان سڑک کے کنارے کھڑی ایک انگریز بڑھیا کو آواز دی اسکا چہرہ بجو کا ایسا۔"

سامعین داستان گو کے گرد جمع ہو گئے۔ میں وہاں سے اٹھا۔

سارا وقت ایک ہے۔ قرآنی وقت۔ آن واحد۔ خدا کے نزدیک سب "آج" ہے۔
زا و سزا جاری ہے روز قیامت بھی ہے۔ آنے والا نہیں۔ موجود ہے۔ پھریری سی آئی۔ لوچیا
ن تالمودی ربائیوں کے نام لے رہی تھی وہ کہیں گئے نہیں۔ ابن العربیؒ مخدوم جہانیاںؒ
ے ساتھ کھانا کھاتے ہیں ـــــ ایک مرید بتا رہا تھا اکثر جب میاں رات کو اپنے جد کے
قبرے کے اندر تشریف لے جاتے ہیں دوسرے اولیاء بھی وہاں آتے ہیں ـــ آج کی
شاک میں ملبوس، ایک دو کلین شیو۔ دماغ چکرا جائے گا۔ زیادہ کرید نہ کرو۔ خاموش

صاحب معاملہ خود پرداز کرتا ہے۔ وہ فصل پہلے کاٹ چکا ہے۔ پھر اسے بوتا ہے۔
لق کی مردودیت سے نہ مردودیت ہے نہ خلق کی مقبولیت سے مقبولیت۔ اور کیا کہا تھا۔

کوٹھی کے پچاس کمروں میں سے بیشتر بند پڑے ہیں۔ نچلی منزل میں لوگ جمع ہیں۔
وپہر کا سناٹا۔ میں ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم میں جا نکلتا ہوں۔
حاجی وارث علیشاہؒ کا پورٹریٹ۔ پرانی وضع کے بریکٹوں سے آویزاں پردے۔
شدان پر پرانی خاندانی تصاویر۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل اوکسفرڈ میں زیر تعلیم ایک جوانمرگ۔
وار پر ایک گروپ فوٹوگراف میں سائے اور سفید ٹوپ پہنے میمیں اور چھوٹی چھوٹی
نچھوں والے انگریز ۱۹۰۱ء ماڈل "ڈبل فٹن" موٹر کار کے سامنے استادہ شکاری

تصویر دہلی دربار ۱۹۱۱ء کی۔
جاپلنگ روڈ لکھنؤ کا ڈرائنگ روم آنکھوں میں گھوم گیا اور دل بے چین ہوا۔ کیوں؟
اہ مخواہ۔ مجھے اس دقیانوسی بوسیدہ کوٹھی سے بہتر مکانات اور اس پرانے دھرانے
سے بہتر اور کہیں زیادہ بیش قیمت ساز و سامان بعد میں میسر آیا۔ محض پرانی چیزوں
چمٹے رہنا کس قسم کی مریضانہ نفسیات ہے؟ پھر بھی آنکھیں بھر سی آئیں۔

باہر جانے کے لیے پلٹا تو ایک معمر بی بی کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے شفقت سے پوچھا "بھیّا آپ ـــ دھانپور کی خیر النسا بیگم کے عزیز تو نہیں ـــ؟ چھوٹی ٹھکرائین صاحب ـــ"

"ہماری والدہ تھیں۔"

عرصہ دراز بعد کسی نے مجھ سے میری ماں کی بات کی تھی۔ انکا نام لیا تھا۔ یہ اجنبی بی بی مجھے ایک بیحد نادر اور قابل قدر ہستی معلوم ہوئیں۔ یہ میری ماں سے واقف تھیں۔

"آپکو تو یاد نہ ہونگی۔"

"یاد ہیں۔"

انہوں نے دردمندی سے مسکرا کر سر ہلایا پھر دو چار باتیں کر کے باہر چلی گئیں۔

میری ماں۔ نازک نازک گوری سی۔ بادامی سلک کا غرارہ۔ سفید لیس کی قمیص۔ بالیوں میں چنبیلی کے پھول۔ آبِ رواں کا دھانی دوپٹہ۔ لپکا ٹکا۔ کلیانی ندی۔ رنگین پایوں والی پلنگڑی پر بیٹھی ہیں۔ چاندی کی پٹاری کا بڑا سا گنبد نما ڈھکن کھلا رکھا ہے۔

ابا کی گرجدار آواز ـــ سنتی ہیں۔ آپکے صاحبزادے پھر پتے کھیلتے پائے گئے۔

امّاں امّاں آپکے نام کا کیا مطلب ہے؟

حضرت بی بیؑ کا لقب ہے بھیّا۔ ارے ہماری بالی کہاں گئی ـــ؟

دیکھیے دیکھیے بالوں میں تو نہیں الجھ گئی۔

نہیں بالوں میں بھی نہیں ـــ ابھی ابھی تو ـــ

یہ لیجئے۔ امّاں۔ ہم تو اپنے ہاتھ کی صفائی دکھلا رہے تھے۔

بھیّا تم نے کب اتار لی ہمیں پتہ بھی نہ چلا۔ ـ

آنکھیں زور سے میچیں۔ پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ خالی کمرے سے باہر نکلے۔

تیسرے پہر تک قریبی اضلاع کے مزید کنبے خانوادوں کے افراد۔ یہ ایک عجیب نٹ ورک تھا۔ اور پہلے کی طرح آج بھی جوں کا توں موجود۔ فرق محض اتنا تھا کہ انکی برقعہ پوش یا بے پردہ لڑکیاں اکثر پی۔ ایچ۔ ڈی بوُچیا انکے ساتھ گھُلی ملی نظر آرہی تھی۔

"سدا سہاگن ابھی بتا رہے تھے حضرت اکمل شاہ کہنے لگیں ——" لوُچیا کسی سے مخاطب ہوئی۔

"سینور ینا اردو اتنی سلیس بولتی ہے مگر تذکیر تانیث میں اب بھی گڑبڑا جاتی ہے۔" میں نے ڈاکٹر اف فنومنولوجی سے کہا۔

"سدا سہاگن کو آپ ابھی دیکھ لیجئے گا اکمل شاہ صاحب ایک احرام پوش وارثی فقیر ہیں۔ بیحد خوش شکل۔ مرید بناتی ہیں۔"

"خاتون پیر ——!"

"جی ہاں۔ لیکن عورتوں کے لیے بیعت لینا جائز نہیں۔ وارثی فقراء نے بھی انکو احرام باندھنے کی اجازت نہیں دی تھی ایک نے دی۔ بڑا زبردست کیمپ انکا یہاں لگتا ہے۔ —— موٹروں کی قطاریں۔ اپنے آپ کو شاہ صاحب کہلواتی ہیں۔"

"ویمنز لب والیوں کو خوش ہونا چاہیے۔"

"کیوں خوش ہونا چاہیئے؟" لوُچیا نے بحث کی "کسی بھی لائن میں اپنی شخصیت منوانے کے لیے مرد کا استعارہ اختیار کرنا ضروری ہے؟ جارج ایلیٹ اور جارج سینڈ سے لیکر آجتک؟"

پائل کی جھنکار۔ ایک طویل القامت فرد سرخ لہنگا۔ ہری اوڑھنی۔ چھم چھم کرتے الان میں داخل ہوتے۔ دری پر بیٹھ گئے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

"یہ وہ نہیں ہیں جو تم شاید سمجھ رہے ہو۔" سینڈی نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر اف فنومنولوجی کو حکیم صاحب سمجھا۔ اطالوی لوُچیا کو قصباتی مسلمان بیٹا۔ اب تیسری بار دھوکا کھانے کو تیار نہیں۔

"یہ ایک قابلِ تعظیم بزرگ ہیں۔ حسینؑ ٹیکری سے ہر سال یہاں آتے ہیں" سینڈی نے مزید اطلاع دی "حضرت موسیٰ سہاگ کا سلسلہ"

"ویمنز لب والیوں کو مسرور ہونا چاہئے کہ ایک گروہ نے عورت کا استعارہ اختیار کر لیا کیوں صاحب؟" میں نے لوچیا کو ناتحانہ انداز سے مخاطب کیا۔ وہ ہنس پڑی۔

ماتھے پر سونے کا ٹیکہ۔ ناک میں بھاری بلاق اور نتھ۔ کلائیوں میں سبز کانچ کی چوڑیاں سونے کے ٹھوس کڑے۔ گلے میں ٹھُسّہ۔ چمپا کلی۔ چندن ہار۔ سر پر گوٹے لچکے کا دوپٹہ۔ چہرے پر داڑھی۔ درمیانی عمر۔ خوش خلق۔ سدا سہاگن آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گئیں۔"

"شاہ صاحب۔ حافظ پیاری کا کلام سُنائیے" بینڈی نے فرمائش کی۔

"اچھا ذرا تلک پہن آؤں۔ ابھی آتی ہوں"

اٹھ کر چھم چھم کرتی زینے کی سمت چلی گئیں۔

"تلک لگاتے ہیں یا پہنتے ہیں؟" میں نے سینڈی سے پوچھا۔

"پشواز کی ایک قسم۔ جو زیور ناک میں پہنا جاتا ہے اسے چھاپ کہتے ہیں"

چھاپ ___ تلک ___ چھاپ ___ تلک ___ میں نے کچھ یاد کیا ___ "یار یہ تو امیر خسروؒ والی وہ مشہور قوالی ہے۔ چھاپ تلک سب چھینی مو سے نیہا لگائے کے۔ یہ سلسلہ جب سے چلا آرہا ہے؟"

"کہتے ہیں امیر خسروؒ کے زمانے میں ایک صاحب نے جمنا کے کنارے ایک بزرگ حسینہ ستی ہوتے دیکھی تو انکو خیال آیا کہ ایک کمزور عورت ارضی خاوند کی خاطر بھسم ہوسکتی ہے تو ___ ایک روایت ہے کہ حضرت موسیٰ سہاگ عورتوں کی مزاروں پر حاضری کے مخالف تھے جب تنبیہہ ہوئی بطور پرائیشچت خود زنانہ پوشاک پہننے لگے"

اس قسم کے معاملات کے لیے یہاں کتنی فرصت لوگوں کے پاس ہے ___

ذہن کہیں اور نکل گیا۔ دلواڑا جین مندر کوہ آبو کی مرمریں فریسکو۔ اجنتا او

باغ کی دیواری تصاویر- قدیم اور میڈیول ہندوستان رتھ- بیل گاڑیوں میں سوار تاجر- گھوڑے کی نعل نما محرابوں کے نیچے سے گذرتے بڑے پنکھے سنبھالے جلوس جھروکوں سے جھانکتی عورتیں- رنگین گول ستون- سیڑھیاں- گج راج- ہر چیز جامد- بھاری- شانت- ناک میں موٹے زیور پہنے دکن اور گجراتی میناتوروں کی بڑی بڑی آنکھوں والی عورتیں- وسط ہند کی ان "سدا سہاگن" کو دیکھ کر مجھے وہ میناتورکیوں یاد آرہے ہیں- مصوری اور سنگتراشی کا "پروفیشنل مطالعہ" کبھی اس نظریے سے نہ کیا تھا کہ ۱۹۸۲ء کے ہندوستان میں انکے اوریجنل دکھلائی دے جائینگے-

"یہ بہت بڑی آزمائش ہے" کنور کہہ رہا تھا "چالیس سال سے یہ شاہ صاحب سدا سہاگن بنے ہوئے ہیں یہ مسلک اختیار کرنے سے پہلے دو بیویاں رکھتے تھے دونوں کو طلاق دیکر انکی شادیاں کرادیں- بہت بڑی آزمائش ہے- تمام عمر خلق خدا کی ہنسی مذاق کا نشانہ بننا- ملامت کے تیر سہنا آسان بات نہیں"

"مگر کیوں — ؟ آخر کیوں ؟ اسکی ضرورت کیا ہے ؟"

"انسان اپنے انتخابات میں خود مختار ہے"

"بھئی- کیتھولک راہبات 'برائیڈز آف کرائیسٹ' کہلاتی ہیں نن بننے کے لیے سفید ویل پہن کر باقاعدہ مع انگشتری چرچ میں انکی 'شادی' جیزس سے کی جاتی ہے- وہ خود عورتیں ہیں یار- بٹ دس از ویرڈ"

مجھے لگا میں ہیون سانگ یا ابن بطوطہ ہوں اور اسی پرانے ہندوستان کے عجائب و غرائب کے مشاہدے میں مصروف-

سدا سہاگن زرد تلک پہن کر واپس آئیں- ڈھولک سامنے رکھی گانا شروع کیا- ایک قبا پوش لڑکے نے آنگن میں کھڑے ہو کر زور کا نعرہ لگایا — حق اللہ- حق حق حق- پھر اس نے اڑنگ بڑنگ تقریر شروع کر دی-

"اس لڑکے کو دیکھ کر ہمیں شاہ دولہ کے چوہے یاد آتے ہیں" میں نے ایک نئی مہمان سے کہا-

"جی ہاں۔ شکلاً۔ لیکن یہ بڑا ذہین لڑکا ہے۔ کہتے ہیں اسے بھیڑیوں نے پالا ہے۔ میاں کے یہاں آیا بول نہیں سکتا تھا اب انٹ سنٹ تقریریں کرتا ہے —— لوگ اسے ہولی فوُل سمجھتے ہیں۔" نواب منجُو نے بتلایا۔ "اگر آپ غور کریں تو اسکی بظاہر نوَن سنس کے اندر ایک بنیادی ربط ضرور رہتا ہے۔"

"واقعی ؟ میرا تو خیال ہے وولف بوائے ایک کامیاب موڈرن کرٹِک بن سکتا ہے۔" ئوچیا نے کہا۔ "راجہ صاحب اسے اپنے ساتھ امریکہ لے جائیے۔ ہٹ گرُو بھی ثابت ہوگا۔"

"ہم تو پھر کہتے ہیں اکتوبر نومبر تک رک جاؤ۔ دیوے شریف کا عرس کر کے جانا۔ میوزک کانفرنس۔ مشاعرہ۔ روز روز اسطرف کب آتے ہو۔ تیس سال بعد ایکے سے آئے اب مزید تیس سال بعد کی گنجائش ہی باقی نہیں ہے۔" کنور نے کہا۔

دیوہ شریف کی میوزک کانفرنس کا ذکر چھڑا تو منجو صاحب نے اپنے ریذیڈنٹ استاد سے سُنی ہوئی چند حکایات گوش گذار کیں۔ صوفی منش سہگل کو جموّں کے ایک شاہ صاحب کی اشیر واد حاصل تھی۔ اُستاد اللہ دیے خاں نرت میں ایک آنکھ سے روتے۔ دوسری سے اظہار مسرّت۔ ممتاز علی صرف ایک گھنگرو بجاتے۔ بندُو کہ چاندی کے جھولے پر بیٹھی رہتیں، باہر مسلّح سوار کا پہرہ، سنگیت کی بڑی پنڈتا تھیں۔ "پنجاب گھرانے کی بانی بھی ایک گنئی عورت تھی —— گورکھی بائی۔ بہار کی ڈھیلا بائی یوریشین تھیں اصل نام میری۔ ڈسٹرکٹ کلب میں انگریز افسروں کے ساتھ ٹینس کھیلتیں۔

جرمن باجی بولیں —— "ہماری میراثنیں بھی اپنے گوّیے اور مرثیہ خواں مردوں سے کم گنئی نہیں۔ گو وہ کسی میوزک کانفرنس میں نہیں گا سکتیں۔ بیگمات کی محفل.. ساز بجاتی عورتوں کی مغل راجپوت تصاویر جیسے مناظر ہمارے زنانخانوں میں ابتک

"گھونگٹ کا ناچ ——" مجھے یاد آیا۔

"جی ہاں۔ اے وُدُئی اللہ میں کاہے کو بازار گئی تھی۔ اور رخصتی کے وقت ہمار نوروزی میراثن۔ اندر بابل چھیڑتی ہے عین اسی لمحے باہر ہیتیں کا پردہ تھامے اُسکا..."

وہی بابل شروع کرتا ہے۔ صدیوں کی پریکٹس کا پرفیکشن۔ لیکن نوروزی کا پوتا مکینک بن گیا ہے خود کو میراثی کہلوانا پسند نہیں کرتا۔

"شادی بیاہ عید بقرعید موسمی پرندوں کے مانند نمودار ہو کر چڑیوں کا صدقہ اتارنے والی ہندو چڑیمار عورتیں۔ بسنت پنچمی پر گیہوں کی تازہ بالیاں سنبھالے ہمیشہ دلبر سجان الاپتی میراثنیں۔ نویں محرم کو دیے روتی بنجارنیں۔ اس قصباتی تمدن کو بھی سیاست اور ٹیلی ویژن عنقریب ہڑپ کر جائیگا۔"

"لیکن صاحب ہم خوش ہوئے کہ ہمارے کے ہاں کی ایک میراثن آپکے ہاں مشہور ٹی وی اسٹار بن گئیں۔" نواب منجو نے سرحد پار سے آئے مہمان کو مخاطب کیا۔ پھر مجھے "اُستاد کبیر کو سُننے کا شرف حاصل ہوا۔ حال ہی میں۔ میری پت راکھ لیجئے شیخ سلیم چشتی اور — توڑ پہاڑ خیبر اُکھاڑا" نواب صاحب دھرپد گنگنائے — "رٹت، من رٹت حیدرؑ کو نام — اور ایک گذشتہ مہاراجہ بنارس کا بنایا ہوا دھرپد بھیرویں۔ پیارے ہو اللہ کے — نواسے نبیؐ کے۔ علیؑ کے جگر بند۔ کاشی کے راجہ کے کاٹو پھند۔ ایک سابق راجہ صاحب اُستاد کی سنگت پکھاوج پر کر رہے تھے۔ تب ہم سوچے کاش ساری دُنیا کی حکومتوں کی پالیسی فنکار بنایا کرتے تو یہ خون خرابہ نہ ہوتا!"

میں نے عرض کی "حضور رنگیلے پیا اور اختر پیا دونوں کی حکومتوں کا انجام آپکو معلوم ہے اور جان عالم نے تو ساری عمر ایکو نماز فجر قضا نہیں کی۔"

ایک اجنبی بڑھیا ولایتی سوٹ — قطع سے اعلیٰ ایکزیکٹو — دکھ سے بولے۔

"تو سنگیت اور رام نام میں کوئی شکتی نہیں؟" گولے بارود سے زیادہ؟ میں نے سوال کیا۔

"عربی باجی کہنے لگیں۔ "آپکو کیا پتہ منجو صاحب کہ اقتدار حاصل کرتے ہی فنکار لوگ کیا کریں گے؟ فلاں بائی اور فلاں کنور نے تو ایک پوری سلطنت اکھیڑ پھینکی۔ ہم تو جانتے ہیں کہ زیادہ تر کلاکاروں کے دماغوں میں واٹر ٹایٹ خانے ہیں۔ ایک میں انکا ٹیلنٹ۔ باقی خانے عام انسانوں جیسے۔ یا خالی۔ اور راجہ صاحب ہم نے آپکے ویسٹ میں

بھی اکثر مصوّر غبی پائے۔ اور لبور۔ رہے ہمارے ادیب اور شاعر لوگ۔ پہلے بھی حکمرانوں کے قصیدے اور ایک دوسرے کے خلاف ہجو لکھتے تھے اور آج بھی ......"

"سب نہیں —— سب نہیں" اجنبی، بُرا مان کر۔ جوش سے۔

"تیس برس بعد" میں نے منجو صاحب سے کہا "واپس آکر آل انڈیا ریڈیو سنا تو تعجب ہوا۔ بے شمار پاکستانیوں کے فرمایشی ریکارڈ روزانہ ..... ادھر سارا ہندوستان ہم نے دیکھا کہ پاکستانی موسیقاروں پر لٹّو۔ اسکے باوجود کیا دونوں طرف ایک دوسرے کے لیے شدید بدگمانی اور تلخیاں برقرار نہیں؟ نواب صاحب۔ محض فنونِ لطیفہ اور ادب قومی روّیے اور حالات بدلنے کے لیے کوئی کیمیائی اثر نہیں رکھتے۔"

لُوچیا جگ اُٹھائے گویا "لاڈونا ء موبیلے"، کی دُھن پہ رواں سامنے سے گذری۔

"سرکار کے لیے تازہ پانی۔" میں اُٹھ کر صحن کے پچھواڑے کنویں پر پہنچا۔

یہ بڑی پرفضا جگہ تھی۔ شہتوت، انجیر اور فالسے کے پیڑ۔ گلہائے زنگارنگ۔ کسی مغربی شاعر نے کہا ہے کہ راگوں جیسے متنا سب پھولوں کے اصل نام باغ جنت میں محفوظ ہیں۔ پرند خیالات کے مانند کبھی آسمان کی سمت اُڑتے۔ کبھی نیچے آجاتے ایک ڈالی سے دوسری۔ یا چکر کاٹتے۔ انجیر کی چھاؤں میں ہرے پتوں کے گویا ول بادل کے نیچے ایک راگ دھاری جھینگر کی تانیں سُنائی دیں۔

لُوچیا جگ منڈیر پر رکھتے ہوئے بیترس کی تصویر نظر آئی۔ کہنے لگی "بہن جھینگر سینٹ فرانسِس کو گیت سُنا کر ابھی لوٹی ہیں۔ ایک روز انجیر کی شاخ پر بیٹھی الاپتی تھیں سینٹ فرانسِس نے کہا شاباش جھینگر باجی۔ سبحان اللہ۔ پھُدک کر اُنکے ہاتھ پر آن بیٹھیں اور طبیعت سے گایا۔ انھوں نے کہا اب چُپ ہو جاؤ۔ چُپکی ہوگئیں۔ انکے حجرے کے ایک کونے میں جا بیٹھیں۔ آٹھ دن تک متواتر گایا کیں۔ تب سینٹ فرانسس نے فرمایا جھینگر باجی تم نے اپنے گیتوں سے ہمیں بہت شاد کیا۔ اب جا سکتی ہو۔ پھُدک کر غایب۔" سینوریناخود اس جھینگر کی طرح آزاد اور مسرور معلوم ہوتی تھی۔

"لوُچیا بی بی کیا تمہارے سارے مسئلے حل ہو چکے ہیں ؟"

"ایک ننھے پوش بچے نے ابھی لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ اسکے ماں باپ چل بسے۔ اسے دُعاؤں کی ایک بہت بھاری کتاب ترکے میں ملی تھی — وہ اسے اٹھا کر سنے گوگ میں لے گیا اور پریئر ڈیسک پر دھر کے پکارا — خدایا۔ مجھے دعا مانگنا نہیں آتا۔ یہ پوری کتاب ہی تجھے دیے دیتا ہوں۔"

جگ بھر کے وہ واپس چلی۔

ہر جگہ میاں کا کیمپ ایک نوع کا روحانی ہائیڈ پارک کورنر بن جاتا ہے۔ اب آنگن میں ایک ٹاٹ پوش کھڑے بھاشن دے رہے تھے۔ دوبارہ دیکھا تو وہی ایکزیکٹو۔ انکا سوٹ تہہ کیا ہوا کرسی پر رکھا تھا۔

"چہ خوش یہ کون مہاشے ہیں ؟"

"سادھوؤں کی ایک ایسی ٹولی سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی دُنیاوی پوشاک کے نیچے ٹاٹ پہنتی ہے۔" لوُچیا نے جواب دیا۔

وہ فرما رہے تھے : "حقیقتِ محمدیؐ کیا ہے ؟ پرماتما کی اِچھّا شکتی۔ شیش آسن ؟ صلوٰۃ معکوس۔ خواجہ فرید شکر گنج چودہ برس تلک —"

سینوریتا سمیت ان فرار پسند اہلِ درد کو انکے حال و قال پر چھوڑ کر ہوا خوری کے لیے باہر نکلا۔

پھر سینڈی کی بات یاد آئی۔ تینتیس سال بعد آئے — اب اگلے تینتیس برس کی گنجایش ہی باقی نہیں۔

"صاحبِ وقت وقت کو گردش دیتا ہے۔ دن اور رات اور مہینہ اور سال اسکے سامنے آ کر کھڑے ہوتے ہیں اور اسے حساب دیتے ہیں۔"

وقت کے حساب کتاب کے آئینہ دار کتنے پرانے مکانات پچھلے چند ماہ میں ان

قصبات میں دیکھے۔ کوٹھی سے ملحقہ زنانخانے کے کھنڈر پر نظر دوڑائیں۔
ان بیرن لوگوں نے مسجد کے ایک گوشے میں گھنٹہ گھر تعمیر کروا رکھا تھا۔ گجر بجا۔
اور آگے بڑھا۔ بارش کی پھوار پڑی۔ ایک جامن کے نیچے ہو لیا۔ میرے دل کے اندر تو بن موسم برکھا ہوتی ہے۔ گرم اور سرد ہوائیں چلتی ہیں۔ دل کی ندی میں باڑھ آتی ہے تو بیروں میں کوڑیالے سانپ لپٹ جاتے ہیں۔ برف گرتی ہے۔ یہ ذرا سی پھوار کیا چیز ہے۔

شام ہو گئی مطلع صاف ہوا حاجی صاحبؒ کے گنبد کے عقب سے بدر کامل نے جھانکا۔
جھڑبیری کے نیچے چند قدیم قبریں دکھلائی پڑیں۔ یا ایک مختصر وُڈکٹ۔ چاندنی رات میں انگلینڈ کا ایک سنسان، پُرانا گورستان۔ ٹیڑھے ترچھے زمین میں دھنسے سنگ مزار۔ ایک کتبے کی عبارت یاد کرنے کے لیے ذہن پر زور ڈالتا مکان کی جانب لوٹا۔

ڈیوڑھی میں نواب منجو ذرا پریشان اور محظوظ سے کھڑے تھے۔ "میاں فرما رہے ہیں یہاں سے کیوں نہ دتی ہوتے آدیں!"

اچانک وہ تحریر یاد آ گئی۔
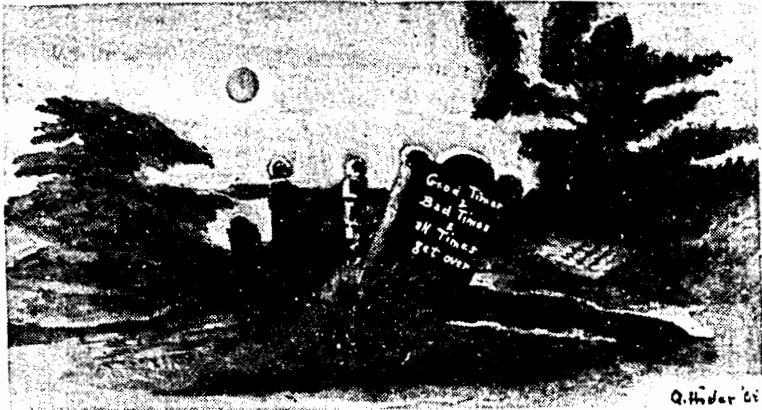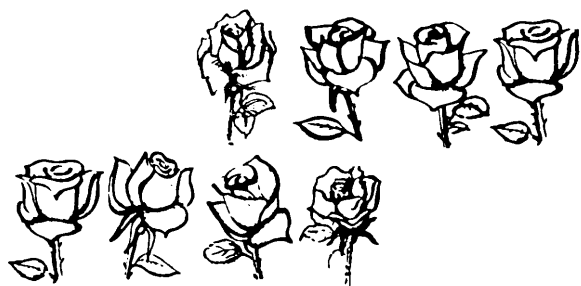
(۴۳)

بیلے میں میلہ

روشنیوں اور دھندلکوں اور پرچھائیوں میں سے چھنتے ہندوستان کو اب فنِ مصّوری کے پارکھ کی نگاہ دیکھ رہا ہوں۔
اصل نام مہرؔوِلی۔ اب عرصے سے مہرؔولی "زیر بحث جانے سے کیا فرق پڑا۔ ولی تو موجود ہیں" نواب منجُو نے کہا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا کومپلیکس مجھے عبدالرحمٰن چغتائی کے نازک ماورائی نقوش کا موڈل معلوم ہوا۔ ایک کے بعد ایک اونچی سپید محرابیں اور صحن اور مرمریں غلام گردش اور دروازوں کے اندر دروازوں کا سلسلہ وار تناظر۔ مرمریں جالیاں۔ اچانک قرمزی گلاب۔ اور زمرّدیں بیلیں سپید مزارات۔ ایک اونچے گنبد کے نیچے بالکل داستانی ماحول میں بیٹھے چند درویش۔
طلوعِ آفتاب سے بہت قبل ہم وہاں پہنچے تھے جیسے معاً ایک بے آواز بیکراں خواب میں داخل ہو گئے ہوں۔
وقت مقرّرہ پر ایک خرقہ پوش گروہ نے ایک قدیم دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر حمد و نعت پڑھی۔ بعد ازاں انکے قاید نے کواڑ پر دستک دی اور دروازہ کھولا۔
"روز صبح دستک اسلیے دی جاتی ہے کہ خواجہ صاحب اکثر رات کو باہر تشریف رکھتے ہیں انکو اطلاع ہو جائے کہ اب لوگ روضے میں آنے والے ہیں۔ چنانچہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔" دروازے کے اندر جاتے ہوئے منجُو صاحب نے مجھے اطلاع دی۔ میں نے سر ہلایا۔ اور خاموش رہا۔ یہ سارے اولیائے کرام اگر اسوقت بھی موجود ہیں کم از کم اسی راجدھانی میں ہونے والی بے انصافیوں اور مظالم کا تدارک فرما دیں۔ یہ کیا مہرِ ولی ہے۔ ان سرکش باغیانہ خیالات کے ساتھ بندہ اس رَفتۃالصفا

میں داخل ہوا۔ روشوں پر سے گذرتے ہوئے سوچا مسجد۔ روضہ۔ مدرسہ۔ یہ تثلیث جو دارالاسلام کی روحانی، ذہنی، فقہی تہذیب کا مرکز رہی ہے ڈینبوب ووالگا سے لیکر برہمپترا اور کاویری تلک اسکے تعمیراتی اور مجموعی تاثر کی وحدت یقیناً حیرت انگیز ہے مگر یہ ہمہ گیر تمدن آج تنگ نظر اینٹی انٹلکچوئیل، اینٹی انکوائری، عیاش، خون ریز خونخوار کن اندرونی اور بیرونی وجوہات کی بنا پر سمجھا جا رہا ہے ؟

مزار شریف کے باہر آویزاں پنکھا۔ اگلی پھول والوں کی سیر پر نیا لگایا جائے گا۔

نواب منجو نزدیک آئے۔ "شہزادہ جہانگیر" انہوں نے لکھنؤ کی آنکھوں سے پنکھا ملاحظہ فرمایا اور انکے لکھنوی حافظے نے کچھ یاد کیا۔

"شہزادہ جہانگیر" میں نے دہرایا۔ تاریخ ہند کے سب سے کربناک باب کا ایک ذیلی کردار۔ "اینٹی برٹش تھے۔ اور کچھ بس نہیں چلتا تھا ریذیڈنٹ کو لُو لُو ہے بے کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔ دارالسلطنت سے الہ آباد جلاوطن کیے گئے۔ ماں نے پنکھا چڑھانے کی منت ــــ"

"لُو لُو ہے بے" میاں نے اس فقرے کی داد دی۔ بہت محظوظ ہوئے۔

"اجی وہ کیا سلطنت تھی از دلی تا پالم ایرپورٹ۔ اور کیا اس سے جلاوطنی۔ سب نوٹنکی تھی" منجو صاحب بولے "لکھنؤ پہنچے تو کس قدر کی ہڑبونگ مچائی شراب پی کر راہگیروں کو اپنے گھوڑے کی ٹاپوں تلے روندتے چلے جاتے تھے نہ داد نہ فریاد۔ وزیر ہند جیپ کہ صاحب عالم ہیں۔ اور مہمان۔ وہ ایک طوائف کو لے بھاگے"

"ہم لوگ خواجہ صاحبؒ کے مزار کے پاس کھڑے ایک مرحوم شہزادے کی عیب جوئی کر رہے ہیں۔ اچھا نہیں لگتا" ایک ساتھی نے کہا "ہم سب اپنے اپنے دور کی پیداوار ہیں"

"بیشک اس اعتبار سے شہزادے کو اوکسفورڈ میں پڑھنا چاہیے تھا۔ اسی دور میں محمد علی خدیو مصر اپنے نوجوانوں کو بغرض تعلیم یوروپ بھیج رہا تھا" میں نے جواب دیا۔

"خواجہ صاحبؒ ہی کا ارشاد ہے قینچی سے کاٹتا نہیں سوئی دھاگے سے جوڑتا ہوں۔ انگریزوں نے پھول والوں کی سیر بند کروادی تھی۔ پنڈت نہرو نے پھر سے شروع کروائی۔" ایک خادم نے مطلع کیا۔

"جی ہاں۔ اور نیتاؤں کو قومی اتحاد پر کھو کھلے بھاشن دینے کے لیے ایک اور پلیٹ فارم مل گیا۔" منجو صاحب تلخی سے بولے۔

روضے سے باہر نکلے تو اچانک افق۔ زمین کا کنارا اور پھر آسمان۔ گویا ہم کرۂ ارض کے چھور پر پہنچ گئے ہوں۔ پو پھٹ رہی تھی ع یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیلؑ۔ احاطے کی دیوار سے ملحق ایک قصر شکستہ کہ بے چارے فتح کے باپ، دین کے چراغ مع فیملی اسمیں قیام کر کے ساون مناتے تھے۔ آہا — قطب صاحب۔ شمسی کا تالاب۔ جھرنا۔ اندھیری باغ — باگ اندھیری تال کنارے — جھولا کن نے ڈالو ری امریاں۔

تخت و تاج اور تاخت و تاراج میں بھی فرق محض تین حروف کا ہے۔

پچھلے پہر اور طلوع سحر کی اس ناقابل بیان کیفیت، تیسرے پہر کے سلطان جی کی چہل پہل اور رحم غفیر کے بعد حضرت نصیر الدین چراغؒ دہلی کی ایسی خاموش شام جس میں فرشتوں کی پرواز سنائی دے جاتے۔

"حضرت کو سکون پسند تھا۔ آج تک وہی عالم۔" منجو صاحب نے کہا۔ میاں آگے آگے جا رہے تھے۔ "اپنے شاہانہ انداز میں خراماں ایسا لگتا ہے گویا اپنے لوگوں سے ملنے جاتے ہوں۔" میں نے اظہار خیال کیا۔

"حقیقت تو یہی ہے۔" منجو صاحب نے فرمایا۔

ایک پویلین میں حضرت نصیر الدینؒ کا نقشیں تخت۔ ایک تختے سے ترشا۔ کاریگری کا نادر نمونہ۔ اس پر دایاں ہاتھ ٹکایا۔ پھر اپنی انگلیوں پر نظر ڈالی سات سو

سال اس لکڑی میں پنہاں ہیں۔ جیسے میری ساری "فنکاری" میری انگلیوں کی پوروں میں۔

"نور پوروں میں ہوتا ہے۔ اور یہاں۔ پیشانی میں ــــ" میاں نے دفعتاً مجھے مخاطب کیا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں وہیں ٹھٹھکا رہا۔ "جدید سائنسدانوں نے انگلیوں میں پوشیدہ روشنی کی عکاسی بھی کرلی ہے۔" سینڈی نے کہا۔ "گو میاں نے وہ انگریزی رسالے پڑھے ہیں نہ کتابیں۔"

میں نے کنور کی بات پر دھیان نہ دیا۔ اس لمحے اس گویا طلسماتی تخت کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا۔ میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟ اپنے نارمل حالات میں دلّی آتا تو اس وقت کسی اعلیٰ درجے کی بار پر موجود ہوتا۔

حضرت چراغ دہلیؒ کی شام۔ سندھیا کال کا اندرونی دھیان ـــ بے نام بے آواز راگنی۔

قدسیہ باغ کے نزدیک جائے قیام پر ایک بیڈ روم میں حسب معمول فرش پر مرشد کا بستر بچھا دیا گیا تھا۔ ایک رات دیکھا کہ آپ ایک اور بچھونا بچھاتے بیٹھے ہیں۔ لیکن پہلا بستر اسی جگہ موجود۔ ہم اسے پھلانگ کر دوسری جانب جانے لگے فرمایا اسے نہ پھلانگیے گا۔ ادھر سے چلے جائیے۔

"ــــ؟" بعد میں منجو صاحب سے دریافت کیا۔

"معلوم نہیں۔ یہ بائیس خواجہؒ کی چوکھٹ ہے۔ بزرگان دین رٹرن کال کیلیے اس مکان میں بھی آرہے ہونگے۔ کیا جانیے کیا معاملہ ہے۔ کرید نہ کیجئے۔"

دوسرے روز ایک متشکک دانشور جو پہلی بار پیر سے ملے تھے پوچھنے لگے۔

"ڈرائینگ روم میں کل شام کوئی صاحب چنبیلی کا عطر یا تیل لگائے ہوئے تھے؟"

"نہیں تو۔"

"عجیب بات ہے۔ مجھے برابر چنبیلی کی خوشبو آیا کی۔ شام کو رِج پر ٹہلنے نکلا تب بھی اسی خوشبو نے پیچھا کیا لیجئے — اسوقت پھر — میرا واہمہ ہے۔"

"عین ممکن ہے۔"

"کجی یک خط مسطر چہ توہم چہ یقین ؟"

"جی۔"

"آپکے مرشد سے ملنے کے بعد یہ خیال ستا رہا ہے کہ ہماری عقل و دانش علم اور تبحّر، علمیت، اور نظریات کسقدر منحنی اور ناکافی اور حقیر ہیں۔"

"جی ہاں یہ خیال تو ہمیں بھی برابر آتا رہتا ہے۔"

"اب کیا کیا جائے ؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"مگر یہ تو ازحد پریشان کُن بات ہے۔" وہ ذرا بےچینی سے پایپ سلگا کر برآمدے میں ٹہلنے لگے۔ انکے جانے کے بعد میں باغ میں جا بیٹھا اور بہت دھیان کیا آنکھیں میچیں تصورِ شیخ۔ ایک خیالی نقطے پر توجہ۔ سب ناکام۔ ایک بار پھر اس افسوسناک نتیجے پر پہنچا کہ اس حقیر پر تقصیر کے اندر روحانیت کی ذراسی رمق موجود نہیں۔

اگلی صبح حضرت اپنا ٹریک سوٗٹ پہن کر جوگنگ کے لیے نکلے۔ ساتھ ساتھ دوڑنے کی سعی کر رہا تھا۔ میرے خیال سے انہوں نے رفتار دھیمی کر دی۔ قدسیہ باغ کا چکّر لگایا بیلہ روڈ پہنچے۔ جمنا کے مانند بہتا ذہن پھر کہیں اور نکل گیا۔ بیلے میں میلہ۔ غدر کی ماری شہزادیاں۔ ست ونتی۔ کم ٹوٗموتے۔

فوٹوگرافک یادداشت کی بدولت وہ الماری سامنے آئی جس میں والدہ خیرالنساٗ بیگم کی کتابیں رکھی رہتی تھیں اور جنکو وہ بڑے چاؤ سے پڑھا کرتی تھیں۔ نانی عشو۔ ولایتی نتھی۔ نظامی بنسری۔

بیلے میں میلہ۔ منازل السائرہ۔ شامِ زندگی۔

شام کو مرشد نے کہا چلیے کناٹ پلیس گھوم آویں۔

"اگر اجازت دیجیے تو گھر پہ ہی رہوں۔ چند خط لکھنے ہیں۔" انکے جانے کے بعد پھر بیلہ روڈ پر ہوا خوری کے لیے نکلا۔ کیا عجیب بات تھی۔ لڑکپن میں پڑھی کتابوں کے عنوان ایک بار پھر پیچھا کرنے لگے۔ مونا وانا۔ تین پیسے کی چھوکری۔ سیب کا درخت۔ کم ٹو موت

اگر میاں میرے دل سے موت کا خوف نکال دیں تو بالآخر انکو مان جاؤں۔ سُوریہ یمُونا پر استہو رہا تھا۔ سن سیٹ اینڈ ایوننگ اسٹار۔ الفریڈ لارڈ ٹینی سن۔ ہو بہو لا مارٹ کا وہ بڈھا انگریز ماسٹر جو ایمی ننٹ وکٹورین قسم کے گل مچھے رکھتا تھا اور اس معصوم بچپن میں ہمیں موت کا راگ سُناتا تھا۔ جو سمجھ میں نہ آتا تھا۔ سن سیٹ اینڈ ایوننگ اسٹار۔

معصوم ــــ؟ تاش اور جُوا یہ فقیر کھیلتا تھا۔ ماں کے زیور بندہ چُراتا تھا۔ چُھپ کر سگریٹ احقر نے پیئے۔ میری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی ــــ مگر وہ تو ساری تاریخ انسانیت کی تعمیر میں مضمر ہے ــــ صورت خرابی کی۔

دوسری جنگ عظیم جاری تھی، میڈنز ہوٹل کے سامنے سے گذرتے ہوئے خیال آیا، جب سینڈی اور میں ایڈونچر کی تلاش میں گھر والوں سے چُھپ کر دلّی بھاگ آئے۔ اس ہوٹل میں ٹھیرے۔ ارادہ یہ تھا کہ رائل انڈین ایر فورس میں بھرتی ہو جاویں اور ذرا "ایکشن" دیکھیں۔ مگر ہماری "گمشدگی" سے ہمارے گھروں میں کہرام مچ گیا تھا۔ بڑے ابّا اور کنور کے باپ آنجہانی راجہ صاحب نے آدمی دوڑائے۔ دونوں کو پکڑوا کر واپس بلوایا۔

اب میں مدتوں سے کھو چکا ہوں مجھے ڈھونڈنے کے لیے کارندے دوڑانے والا کوئی نہیں۔

لیکن اُن چند دنوں میں ہم نے یہاں کیا عیش کیے اُفّوہ۔ دونوں لارڈ بنے کناٹ پلیس میں گھوما کرتے۔ گوری اور سانولی ویک آئی چھوکریوں کو ڈیٹ دی کو لے جاتے۔ انگلش فلم دیکھتے۔

سر جھکائے ایک بوڑھا جعلساز ان انگریزی پکچروں کے نام یاد کرتا آہستہ

آہستہ چلتا بیلہ روڈ پہنچ جاتا ہے۔ اُدھر خربوزے کے کھیت اور ریتی جہاں سنا ہے ایک زمانے میں دلّی کے سیلانی جیوڑے چاندنی راتوں میں سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔ بیلے میں میلہ۔

کون کون سی فلمیں اُس بار دلّی میں دیکھی تھیں؟ گیس لائیٹ۔ اینا کرینینا اور جان گریفٹن کی وہ کون سی فلم تھی بیٹی ڈیوِس کے ساتھ ــــ؟

جان گریفٹن ــــ؟ وہ تو ہالی ووڈ اسٹار نہیں کسی پرانی جان ڈرنک واٹر کی ایک نظم کا کردار تھا۔

جان گریفٹن ــــ

میاں دلشاد علی تم گڑبڑا چلے۔ نہیں وہ پوری نظم یاد کر کے چھوڑیں گے اسکے حاشیوں پر بل فلاور بنے تھے۔ اور اٹھارویں صدی کے لباس میں بوڑھا جان گریفٹن اور لندن ٹاؤن کا ہجوم اور ــــ سب لوٹ آیا۔ ٹوٹل ری کال۔ جان گریفٹن سات دن اور سات رات انگلستان کی خاموش معطّر سڑکوں پر چلا گیا تاکہ لندن پہنچ کر جشن تاجپوشی میں شامل ہو سکے۔ ہمیشہ خواب دیکھنے والا جان گریفٹن ڈارک کے ہرے کنجوں سے نکل کر لندن ٹاؤن میں وارد ہوا۔ اسکے پاس داخلے کے لیے ایک سلور شلنگ تھا مگر لوگوں نے اسے ویسٹ منسٹر ایبے میں نہ جانے دیا۔ تب وہ ہنسا اور اس نے سیٹی بجائی اور سنسان راستوں پر سے گذرتا ڈارک کے ہرے کنجوں میں واپس آیا۔ شفق کے رنگ وادیوں اور ٹیلوں پر پھیل گئے۔ اسکا آوارہ گرد دل مضطر نہ تھا ــــ ندیوں اور پہاڑیوں پر سے اتر کر قوسِ قزح میں ملبوس قہقہے لگاتی منوّر ہستیاں اسکے سامنے نمودار ہوتیں۔ بوڑھے جان نے انکو دیکھا اور پھر ہنسا۔ وہ ان سب کو جانتا تھا۔ درختوں اور سبزہ زاروں

اور پھولوں اور آبشاروں اور کوہساروں اور پرچھائیوں اور سنہری دھوپ

اور روپہلی بارش کے نورانی پیکر۔

وہ ان سب سے واقف تھا۔ انکے وجود میں نغمے چھپے ہوئے تھے۔ اور موسیقی۔ اور لونگ اور تیتیا گھاس کی خوشبو۔ ہمیشہ خواب دیکھنے والا بوڑھا جان گریفٹن اکیلا سفر

کرتا موسم گرمائی اس معطّر شام واپس آگیا اور اس نے سر پر اپنا تاج خود پہنا۔

میرے پاس بھی ایک سلور شلنگ تھا۔ جسے میں نے خود گنوا دیا۔ جوئے میں ہار گیا۔ اب وہ مجھے شاید واپس مل گیا ہے اور شاید مجھے بھی ویسٹ منسٹر ایبے میں داخلے کی اجازت مل جاوے۔

میں ایک جذبات زدہ بوڑھی میم بنتا جا رہا ہوں جو راکنگ چیر پہ بیٹھی کشیدہ کاری کے اڈّے پہ برنٹ روز اور سوئیٹ برائیر کاڑھتی ہے اور جان ڈرنک واٹر کی نظموں پر آہیں بھرتی ہے۔

جائے قیام پر واپس پہنچا۔ میاں اور انکے ساتھی میزبان سمیت ابھی نئی دلّی سے نہیں لوٹے تھے۔ ڈرائینگ روم میں جا کر میاں فرما رہے تھے سرمد شہید کے مزار پر بھی جاویں گے ایک روکنگ چیئر پہ بیٹھ گیا۔ بوڑھی مسز بیرل گرانٹ نانا ابّا کی روکنگ چیئر پہ بیٹھی فخرآ کو انگریزی پڑھاتی ملیں۔ کشیدہ کاری کا اڈّا سنبھالے۔ نانا ابّا کے جوانی کے زمانے کی روغنی تصویر کے نیچے بیٹھی فخرآ نے مجھے دیکھ کر فوراً دوپٹے سے سر ڈھانپا اور کتاب پر جھک گئی۔ لوچیا کی ایسی دبی دبائی۔ سلونی۔ لوچیا مجھے اسی لیے اتنی اچھی لگی کہ اسمیں فخرآ کی جھلک۔ مسز گرانٹ کے لیے ہفتے میں دو بار ضلع ہیڈ کوارٹرز کے مشن اسکول نانا ابّا کی پرانی شیوّ بھیجی جاتی ہے اور وہ دھان پور آکر فخرآ کو انگلش، حساب، ولائتی دستکاری۔ امّاں کتنا بوڑھا نام ہے فخر النساء بیگم بدل ڈالیے۔ نہیں چندا ایسا نہیں کہتے۔ یہ حضرت بی بیؑ کا لقب ہے۔ رسول اللہؐ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، امام حسینؑ، بڑے پیر صاحبؓ جسکا نام آوے امّاں فوراً مزید سلیقے سے بطور ادب سر ڈھانپ لیتی ہیں۔ ہمیشہ سے کرید کی عادت۔ اور امّاں حضرت فاطمہؑ کے نام کا مطلب کیا ہے؟ امّاں کے بجائے عالم فاضل نانا ابّا روکنگ چیئر پر سے جواب دیتے ہیں۔ بھیّا۔ خاتون جنّتؑ کے اسم مبارک

فاطمہ کے معنی ہیں امن لانے والی۔ دوزخ کی آگ بجھانے والی۔
آنسوؤں کی چند بوندیں انگلیوں کی پوروں پر گریں۔ چار ماہ سے مینی کیور ہی نہیں کروا سکا۔

دقیانوسی مسز گرانٹ فخرا کو لیزی ڈیزی کے ٹانکے میری خالہ کی لڑکی ٹھیکرے کی مانگ نہایت تندہی اور بھولپن سے کشیدہ کاری میں مشغول

ٹینس کھیل کر جا پلنگ روڈ گھر واپس گیا تو بڑے ابا کو اپنے کمرے میں آنسو بہاتے پایا۔ دل دھک سے۔ اب تلک اماں ابا نانا ابا تینوں ختم ہو چکے۔ اب کس کی باری ہے۔
دھان پور سے سناؤنی آئی تھی۔ خالہ زاد سترہ سالہ فخر النساء میری حسین منگیتر بعارضہ ٹائیفائیڈ ـــ اس رات اپنے ایک انگریز دوست کے ہاں جا کر غم غلط کرنے کیلئے اسکے اصرار پر پہلی بار شراب

سول لائینز دہلی کی ایک پرسکون کوٹھی میں مرشد کے ایک معتقد کی روکنگ چیئر پر بیٹھا دلشاد علی جذبات زدہ دقیانوسی انگریز مسز گرانٹ ہوں۔ جیسے ایک بارِش قوی ہیکل پیر مرد "سدا سہاگن" ـــ ایک اطالوی سینور ینا قصباتی پابند صوم و صلوٰۃ دوشیزہ منکہ دلشاد علی، ہندوستانی مسلم، سابق زمیندار۔ بلے بوائے اف دی ویسٹرن ورلڈ بیک وقت۔ یہاں سے لوٹ کر نورمن نے کہا تھا ڈیڈی۔ انڈیا جا کر انکشاف ہوا۔ ہر شخصیت ہر شہر ہر نظارے کے کتنے پرت ہیں۔ پیاز کے چھلکوں جیسے۔
تری مورتی کے تین رخ ہیں۔ متعدد جلوے۔ دس ہاتھ۔ کثرت ہی کثرت۔ اور وہ اردھ ناری بھی کہلاتا ہے۔
اٹھ کر دریچے سے باہر جھانکا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ پڑوسیوں کی روشن کھڑکی میں دو سر نظر آئے۔ ایک خاتون۔ ایک کمسن لڑکا۔

امّاں اماں کیا کر رہی ہو؟
بھیّا ہم نے فجے میاں کی دلہن کو رونمائی میں دینے کے لیے صندوقچے سے ایک اشرفی نکالی تھی۔ غائب ہو گئی۔ یا بی بی سیّدہؑ۔ میری اشرفی کیجیے پیدا۔ سلام کرونگی چودہ۔ یا بی بی سیّدہؑ ——
اماں یہ رہی اشرفی۔ مسہری کے نیچے پڑی تھی۔
سر اچھی طرح ڈھانپ کر فوراً درود شریف پڑھنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ قبلے کے رُخ جُھک جُھک کر چودہ مرتبہ سلام —— اب وہ سوا تیرہ آنے کی شیرینی منگوا کر بی بیؑ کی نذر دلوائیں گی۔ میں اپنی فنکاری پر نازاں کھڑا مسکرا رہا ہوں۔ اس رات ان دونوں کے سردھا پنور کی کوٹھی کے ایک روشن دریچے سے کس کو نظر آئے ہونگے؟ ایک بھولی نیک سیرت دیندار ماں۔ اور ایک مستقبل کا نامی گرامی بدمعاش۔

خاتون جنتؑ امّت کی شفاعت کی سفارش فرمادیں گی۔ بی بی فاطمہؑ امن لانے والی۔ دوزخ کی آگ بجھانے والی ——
دریچے میں کھڑا رومال سے اپنی نم آنکھیں خشک کر رہا ہوں۔ پھاٹک پر کاروں کی روشنیاں۔ فوراً برآمدے میں جاتا ہوں۔ میاں گاڑی سے اترتے ہوئے مُسکرا کر فرماتے ہیں "کہیے جناب۔ آپ بیلہ روڈ پر بہت دور تلک ہو آئے"

آدھی رات کو جمنا پار کر کے ہمارا قافلہ گنگا گھاٹی جانے والی پرفضا شاہراہ پر آگیا۔ دورویہ کیکر کے جھنڈ اور یوکلپٹس کے سرسبز پلانٹیشن۔ اوپر تاروں بھرا آسمان۔ میں پوربی ترائی کی سمت اس خوشی اور طمانیت کے ساتھ واپس جا رہا ہوں گویا وہیں میرا گھر ہے۔ میں جان گریفتھ۔

(۴۴)

گُلِ عجائب

یہ سُبک سانہاں چمن کہ انوکھے گل کھلاتا ہے، لاطینی نام نامعلوم۔ لیکن اسکے گھڑی گھڑی رنگ بدلنے والے پھول اردو میں گل عجائب کہلاتے ہیں۔ پہلی بار ڈاکٹر عنبریں بیگ کے باغ میں دیکھا۔ اسکی ہری ٹہنی پر ایک مرغِ عشق چہچہا رہا تھا جس سے تعارف عنبریں کی طیور آشنا مادر محترم نے کرایا۔ میں کہ خود ایک خاص الخاص قسم کا "برڈ واچر" رہا ہوں اسوقت یہ سوچ رہا تھا سینیئر بیگ خاتون کے لب و لہجے انداز اور بشرے سے خفیف سا مترشح ہے کہ ایک ماضی رکھتی ہیں۔ ان خاصی مالدار ماد ام سے راہ ورسم بڑھائی جاوے تو کس حد تک فایدہ رہے گا۔ نگار خانم کے معاملے میں مایوس ہو کر اور خواجہ سبز پوش سے آخری ملاقات کے بعد ہوٹل آیا تھا اور اپنے پرانے خدمتگار حُسین بخش اور بیگ ماں بیٹیوں کو خدا حافظ کہنے ٹہلتا ہوا رِور بنک روڈ چلا گیا تھا۔
وہاں سے لوٹ کر اس لب دریا مہمان سرائے کے ایوان پذیرائی میں سینڈی سے اتفاقاً مڈبھیڑ ہوئی۔ اسکے بعد سے آج تلک کے احوال غریب رقم کر چکا ہوں۔ اور اب کہ طایروں، پھولوں، موسموں اور ندیوں سے روابط بڑھنے جا رہے ہیں۔ گل عجائب کو آج گلستانِ شبنم میں دیکھا اور پہچانا۔ اسکے نزدیک جو شجر کھڑا ہے اسے دن کا راجہ کہتے ہیں۔ پیچھے پیچیدہ شاخوں والا نخلستان۔ وہاں روز روشن میں بھی اندھیرا رہتا ہے۔

یہ اُجالا کہاں سے آیا؟ کنج بالکل تاریک تھا۔ چھوں اور پیڑوں کا اندھیرا۔ گھٹا ٹوپ بادل۔ کلر فلم ڈیولپ کرنے کے لیے لکھنؤ بھیج رہا تھا کہ مرشد مزار کے دروازے میں کھڑے نظر آئے۔ رول ختم کرنے کے لیے قریب جا کر کیمرہ کلک کر دیا۔ نہ فلیش گن پاس تھی نہ آسمان

پہ بجلی چمکی۔ لیکن آج تصویریں بن کر آئی ہیں تو آخری فوٹو گراف میں بیک گراؤنڈ روشن اور عیاں۔ صبح سے اسے بار بار دیکھ رہا ہوں پیکیٹ سرکار کو پیش کیا انہوں نے پیچوان پیتے ہوئے سرسری نظر ڈال کر واپس کر دیا۔

"کیلی فورنیا میں ایک سائنسداں ہے ڈاکٹر کرینر" سینڈی نے حسب عادت اپنے حوالے دینے شروع کیے۔

"بھائی میں اس تصویر کی بات کر رہا ہوں"

"ڈاکٹر کرینر۔ اپنے دارالعمل میں اس نے ایک شخص کی انگلیوں کا عکس لیا ہے۔ پوروں میں سے شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اپنے اپنے AURA کی بات ہے۔ کثیف یا لطیف یا منوّر ہالے۔ اگلی صدی تک سائنسداں شاید گذشتہ آوازیں بھی ریکارڈ کر لیں۔ اور اندرونی بھی ——"

"مگر اس اورا کا عکس میرے کیمرے میں کیسے آ گیا ——؟"

میں ہری دُوب پر حیران پریشان پلتھی مارے بیٹھا ہوں۔ سینڈی گویا سر پہ زیتون کا غیر مرئی تاج پہنے ورجل کی طرح استادہ۔ اوج فلک پہ چاند کی رقاصہ نغمہ سرا۔

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را

"سیّد عبداللہ رومیؒ کو مالوہ کے راجہ نے سارنگ بتایا۔ روشن" مرید ہندی کہہ رہا ہے۔ "روم سے ——"

روم —— کون سا؟ میں چونکتا ہوں۔ نورمن ڈریک والا —— روم اولے سینٹ پیٹر کا۔ روم ثانی قسطنطین کا —— یا روم ثالث پیٹر دی گریٹ کا۔ ماسکو فی الحقیقت آج بھی روم سوم ہے ہمارے ان اہل کتاب کا جنکا پیشوا پیغمبر نہ تھا لیکن بغل میں کتاب رکھتا تھا۔ ہالہ نہ دارد۔

اور پیکنگ؟ روم چہارم!!

ہاہاہا۔ یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

روم روم سے حق حق حق ——

پلا چھے پا چھے ہر پھریں کہت کبیر کبیر ——

"یار سینڈی یہ تصویر ——"

"ہر منظر ایک تصویر ہے۔ دھندلی یا منوّر۔ گذشتہ رجب، سلطان الہندؒ کے آستانے پر —
رس کی ایک شام ——"

"وہاں کیا ہوا؟"

"ہوا کچھ بھی نہیں۔ ہم ایک منظر یاد کر رہے ہیں۔ آستانے کے اندر شہنائیاں بج رہی تھیں
نوں گلاب کے انبار۔ قوال بچوں کی تانیں۔ جم غفیر۔ سبز مخملیں چادروں کے رواں شامیانے
زائرین کے جلوس۔ تیز روشنیاں۔ رات بھیگی اور ہجوم چھٹا ہم باہر آئے۔"

"پھر؟"

"پھر کچھ نہیں۔ ساڑھے گیارہ بجے رات کا عمل۔ تب ہم نے وہ منظر دیکھا۔ دلی دروازے
لی ڈھال میرے پیر تین فقرا سے ہم سخن۔ اودھ کے دو عدد زرد پوش نوجوان وارثی درویش۔
ننگے پاؤں۔ دونوں بالکل کرائسٹ کے ہم شکل۔ فلینی انکو دیکھ پاتا مسیح ناصری کا رول ان میں
سے ایک کو دیتا۔ بھائی دلشاد علی پیلے لباس والے موڈرن تعلیم یافتہ وارثی فقیروں کے رومانس
کی تم شناخت رکھتے ہو؟" وہ چپ ہو جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔ "تیسرے ان میں سے براؤن رنگ
کا خرقہ پہنے ایک طویل القامت سجادہ نشین تھے برہان پور کے۔"

"برہان پور ——؟"

"ہاں۔ وندھیا چل کے اس پار۔ برہان پور۔ بیجاپور۔ کرنول۔ گلبرگہ شریف۔ ورنگل۔ اہل
معاملہ اور اہلِ مشاہدہ کی ایک اور دنیا آباد ہے۔ ساوتھ ہیرو کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

"اس سُوجھا کے لیے دھنیہ واد۔"

"میرے شیخ ان سے بڑی مسرت آگیں باتیں کر رہے تھے۔ انکو بلیس کیا اور وہ تینوں
دلّی دروازے کی سمت لوٹ گئے۔ ننگے پاؤں۔"

"ع مہار ناقہ کو پشت ناقہ پہ ڈال کر پاپیادہ ہو جا ——!"

"بخارا سے روم ـــ یعنی سلجوقیوں کا اناطولیہ ۔قونیہ سے ایران و ہند و سندھ ۔یہ لوگ کتنا سفر کرتے تھے ۔میاں کو دیکھو ۔ہر وقت پا بہ موٹر کار ۔مسلسل دورے ۔ہسٹری کا OVERKILL کہ مجھے گدّیوں میں سالار مسعودؒ کے گھوسی اور میاں کی ایمبسیڈر میں مخدوم جہانیاںؒ کا ناقہ نظر آتا ہے ۔کیا کیا جائے ۔اپنی آنکھ ہی ایسی ہے ۔"

"تیسری؟"

"نہیں بھئی ۔ہماری ایسی قسمت کہاں ۔"

"یہ ڈاکٹر کرپینر کون ہے ۔نام سے یہودی لگتا ہے ۔"

"سولہ آنے ۔"

"قوم جہود کے افراد بھی چشم سوّم رکھتے ہیں؟ مارکس اور اینگلز لو ۔فرائیڈ لو ۔آئین اسٹائن ا

"تیسری آنکھ ہی جو ٹھہری ۔جس سمت بھی کھل جائے ۔"

اب غنچوں کو نیند آرہی ہے ۔تالاب کے کنارے جگنو اڑ رہے ہیں ۔سندر لیشور نرائن گویا ہے ۔

"ـــ پھر اس نے کہا اے موسےٰ ؑ تم نے میرا گھوڑا موڑ دیا ۔اب ہم ساتویں آسمان پر ہیں اس مقام پر نہیں جہاں تم ملے تھے ۔ہمیں پتہ نہیں ہم نے تم سے کیا کہا تھا ۔"

"کیا ـــ ؟" میں پھر چونک کر پوچھتا ہوں ۔

"کل شام سرکار حضرت موسےٰ ؑ اور گڈریے کی حکایت بیان کر رہے تھے ۔وہ رمزاً نصیحتیں فرماتے ہیں تم سمجھ ہی نہیں پاتے ۔"

گلاب باڑی کے ادھر دونوں باجیاں مصروف گفتگو ہیں ـــ اپنے ذہن کا انتشار بھلانے کے لیے انکی جانب متوجہ ہوتا ہوں ۔

خوابیدہ پھولوں کے درمیان باجیوں کا مکالمہ :۔۔

"ـــ اجمیر شریف جاتے ہوئے آدھی رات کو میاں نے جے پور میں ایک مسجد کے سامنے کار روکی ۔پھاٹک پر ایک کمسن لڑکا تندہی سے جھاڑو دے رہا تھا ۔نصف شب

موش، روشن مسجد۔ تھوڑے سے تہجد گذار۔ اور یہ نوعمر لڑکا اس انہماک سے جاروب کشی
میں مشغول۔ میں بھی یہ منظر نہیں بھول سکتی۔

"اجمیر شریف سے واپسی پر وہاں پہنچے تو پو پھٹنے والی تھی۔ شاہراہ کے کنارے شہر کی
گلابی فصیل پر سفید کبوتر آبیٹھے۔ سنگ سرخ کی مسجد کے اندر رنگ برنگی پگڑیوں والے نمازی۔
رنگریز، چُندریگر۔ میناکار۔ میناتوری مصوّر ——— گلابی دھند لکے میں لپٹے۔ صحرا کی سہانی صبح۔"

خنک نم ہوا ہمالیہ سے ٹکرا کر ترّیا پر سے بہتی آرہی ہے۔

"آہا۔ جنّت کی کھڑکی کھُل گئی"۔ باجیوں کی بات چیت جاری ہے۔

"باغ ارم کی خنکی کا تھوڑا سا آئیڈیا تو ہمیں ہوچکا ہے۔"

"رانی کھیت ؟ کشمیر ؟"

"ملک عنبر کی مسجد۔ اورنگ آباد۔ پن چکّی سے ایر کنڈیشنڈ۔ ایسی ٹھنڈی۔ راحت انگیز۔
سایہ دار۔ فرش کے نیچے بہتی نہریں۔ تین ۳ سو سال سے وہ پن چکّی متواتر چل رہی ہے۔ کوئی
فرنگی انجینئر اسکا راز نہ جان سکا۔ اتنی دور پتھریلے پہاڑوں سے نکال وہ پانی کسطرح لائے جو
آجتک جاری ہے۔"

وہ کیسے لوگ تھے بھئی۔ میں دل میں دہراتا ہوں۔

"پچھلے مہینے ایک سیمنار کے لیے پھر گئی تھی جے پور۔ یونیورسٹی۔ لوٹتے میں مڈوے ہاؤس
کے ایک پیڑ کے نیچے مسز عندلیب بیگ بیٹھی نظر آئیں۔ دوسرے کے نیچے پون کماری مصرا ——"

"اوہ ——— پون مصرا۔ جرنلسٹ۔"

"عندلیب بیگ ڈاکٹر سالم علی کے چیلوں کے ہمراہ برڈ واچنگ کے لیے پرند آباد بھرت پور
جارہی تھیں۔ انکے ساتھی چڑیوں سے مشابہہ تھے۔ ایک سارس نما امریکن۔ ایک کاکاتوا
ایسا پارسی۔ ایک شلوار پوش یا موز مرغابی۔"

"جس چیز میں انسان کو شدید دلچسپی ہو ویسا ہی لگنے لگتا ہے۔ ریس کے جوکی دیکھو۔
اور سارنگی نواز۔ خود گھوڑے اور سارنگی معلوم ہوتے ہیں۔"

"من تو شدم۔"

"عندلیب بیگ نے اپنی ڈار کے ساتھ طائرستان کا رُخ کیا۔ پُون مصرا نے بتلایا کہ انکے اخبار نے انہیں نواب بیگم کے متعلق کھوج لگانے جے پور بھیجا تھا۔ ناکام لوٹ رہی ہیں۔ اتنا بتلا کر پُون بھی ہوا ہوگئیں۔ ان سے پوچھ نہ سکی کہ انکی طلاق کے مقدمے کا کیا ہوا۔ یا یہ کہ جھرنا آجکل کہاں ہیں"

"تعجّب ہے نواب بائی اف جے پور کی مسٹری ابتک سولو نہ ہو پائی"

"مسٹری کس کی سولو ہوتی ہے۔ ہماری تمہاری اور سب کی ہوگئی؟"

"بارش آنے والی ہے"

"ابر کیا چیز ہے۔ ہوا کیا ہے"

"مرزا غالب جغرافیہ میں بالکل کورے تھے۔"

"یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں"

"پری چہرہ نواب بیگم کون تھیں۔ پری محل والوں کی دادی تھیں یا نہیں"

"ہم تم کون ہیں — ؟ — تھے۔ ہیں — اور نہیں ہیں"

"اللہ کسقدر میٹا فزیکل گفتگو فرما رہی ہیں آپ"

"آداب عرض کرتی ہوں"

"پُون کماری کی سنا ہے دونوں بہنوں کی طلاق ہوگئی"

"ابھی محض کا تن کی ہوئی ہے۔ یہ پانچ بہنیں ہیں بجیا۔ کانن۔ کندن۔ چندن۔ پُون۔ پانچویں پیدا ہوئیں تو سنا ہے ایک بگڑے دل نے انکے باپ سے کہا انکا نام متوناتھ بھنجن رکھ لیجیے انہوں نے تجویز اجھرنا"

"اب وہ بن گئیں ماتیشوری جھرنا دیوی"

"بجیا جب یہ گرُوجی کے پھیر میں پڑیں — یہ بھُبنیشور سے گئے تھے شکاگو۔ بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھنے۔ پھر مڈویسٹ میں ایک فاسٹ فوڈ چین اسٹور کے منیجر ہوگئے۔ جب یہ "گوڈمین" بنے جھرنا بطور انکی گرُوپی ساری دنیا میں گھومیں۔ باجی ہو۔ مقبول فدا حسین تو کمپیوٹر کے ذریعے پینٹ ہی کرنے لگے ہیں۔ اُن گروجی نے اپنی روحانیت کمپیوٹرائز کر ڈالی۔ یُون میں انکا فیوچرسٹک آشرم

ے ضلع اعظم گڈھ میں نور بافی کا بڑا مرکز

ہم نے دیکھا ہے۔ جھرنا اسکی منتظم تھیں۔ وہیں جرمنی میں انکے اوپر آکاش بانی آئی کہ گروجی سے
انکی روحانی شادی ہو گئی ہے۔ ایک دن مجھے بازار میں ملیں مانگ میں سندور۔ پاؤں میں بچھوے
کڑوا چوتھ کا برت رکھے —— گروجی قدامت پرست نیک اڑیہ آدمی۔ پکے برہمچاری۔ بیحد خفا ہوئے
چیلوں نے جھرنا دیبی کو دوڑا دیا۔ آشرم میں روز جھگڑے رہنے لگے۔ گروجی نے غصے میں آکر منیجر
کے منصب کے لیے ایک عدد روبو خرید لیا۔ اب بہن جھرنا روز صبح اسکی آہنی پیشانی پر صندل کا
قشقہ کھینچتیں وہ انہیں پرنام کرکے اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہوتا۔ ایک دن شاید انھوں نے اسے غلط
پروگرام کر دیا تھا نمسکارم کے بجائے اس نے انکی پٹائی کر دی۔ کس کس کے فولادی جھانپڑ۔ یہ آشرم
سے بھاگ کر فرانس پہنچیں وہاں خود ماتاجی بن گئیں۔ اب ایک فرنچ کاؤنٹ انکا منیجر ہے۔
اسکا نام انہوں نے بادل سوامی رکھا ہے۔ جھرنا اور بادل۔ آدمی وہ بھی صورتدار ہے۔"

"خدا کی پناہ۔ آپ کسقدر کی گوسپ کرتی ہیں"۔ کنور پکارا۔

"مردوں سے زیادہ نہیں۔ بہت سے دانشور۔ اہل قلم یونیورسٹی پروفیسر کو ہم نے سنا ہے۔ اپنے
معاصرین خصوصاً لیڈیز کی غیبت کرتے —— موقع پڑنے پر بھانجی وہ ماریں۔ شراب پی کر ایک
دوسرے سے لپاڈگی وہ کریں۔ میری کتاب خواجگان چشت کے ادھی سلسلے پر چھپ جائے۔
میں بھی مصنفین کے زمرے میں شمار کی جاؤں گی۔ پھر دیکھئے گا۔ منہ پر تعریفیں۔ پیٹھ پیچھے برائی
اور تضحیک —— گروہِ منافقین ——!"

"یہاں اردو کی ادبی دنیا کا یہ حال ——؟" میں کنور سے پوچھتا ہوں۔

"خال خال —— ہے تو کچھ ایسا ہی"۔

"ساؤتھ ہیرو سے آگے جہاں اور بھی ہیں!" میں چوٹ کرتا ہوں۔ وہ منہ لٹکا لیتا ہے
پھر آہستہ سے کہتا ہے "دیار یہ مکتی سینا والیاں بھی تو ہیں مہار ناقہ کو پشت ناقہ پہ ڈال کر بے مہار"۔

ہر سے کنج حمد و نعت کی صداؤں سے گونج اُٹھے۔ خدام چاء کی سینیاں اٹھائے روش پر

نمودار ہوتے۔ دور سڑک پر سے گذرتے گدّیوں کے گلّوں کی ٹنٹناہٹ۔ پرندوں کی چہکار پھولوں کی مہک۔ پروائی کے جھونکے۔ عنقریب میں یہاں سے جانے والا ہوں۔ پھر سے کے شہر واپس۔ پچھلے تینتیس۳۳ سال سے دیس میں روزانہ اسیطرح سویرا ہوتا ہے۔ اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

میرے غریب دل تجھے بھائی مسافرت کی شام

ایک وقت آئمہؑ کا ذکر نکلا۔ مرشد کہ عاشق حسینؑ ہیں، ہال میں تشریف فرما، ایک صاحب سے "آں امامؑ عاشقاں پورِ بتولؑ" والے اشعار سُن رہے تھے بعدازاں ایک شخص نے حاضرین میں سے کہا ـــ "خواجہ حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ اہل بیت اطہار معانی کی ایسی نازک کشتیاں ہیں جو گہرے پانیوں پر رواں ہیں"۔ تلازمہ خیال کی بدولت ہمیں شب برات کی شام گومتی پر چلنے بارھویں امامؑ کے نام کے وہ منوّر بجرے یاد آئے جو لکھنؤ میں پکے پُل سے روانہ ہوتے ہیں اور عوام پیرتے ہوئے ان تک پہنچ کر اپنے حصے حاصل کرتے ہیں۔ اسوقت ہم نے سوچا کچھ ابھاگے ایسے بھی ہیں جو ایک ناؤ کی طرف جاتے ہیں مگر اپنا بھاگ حاصل کرنے سے قبل ہی موجوں کا تھپیڑا انکو مخالف سمت بہالے جاتا ہے۔ دراصل ہمیں پھر اپنے بیوپار اور اپنی بزنس پارٹنر کی فکر ستا رہی ہے۔ ہم بہت بڑی بلائیں ڈالے گئے ہیں۔

ہال سے بیچاں نکلے۔ باہر گھاس پر بقول جرمن باجی وہ اننا کیوٹ قلندر بیٹھا ہوا تھا۔ نہایت شانت چہرہ۔ ہلکی چھدری داڑھی بسز کوٹ۔ چند خدام اسکے قریب براجمان۔ وہ بڑے ہی شیریں لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "مجنوں سے انکا نام پوچھت رہے ـــ کہن لیلےٰ ـــ"

یہ جملہ نوٹنکی یا تھیٹر کی اسٹیج پر CORNY معلوم ہو۔ اسوقت معنویت سے بھرپور! سارا

فرق سٹینگ پیدا کرتی ہے۔ ہم قلندر کی پرسکون شکل دیکھا کیے۔

اے نفسِ مطمئنہ ——!

اے نفسِ مطمئنہ ——؟

کنور سینڈی یوکلپٹس کے جھنڈ میں سے نمودار ہوا۔ قریب آ کر بیٹھ گیا۔ قلندر اب تالاب کی طرف نگاہ کیے رسانیت سے پڑھ رہا تھا —— "جب لگ تن جرت —— اور من نہیں مرجات۔ تب لگ مورت شام کی دجہن کہاں دکھات۔ ساہن سے کچھ پریچے نہیں اور چورن سے بیوہار ——"

او۔ کے۔ میاں کا طریقہ ہے جو کچھ خود نہیں کہنا چاہتے گویا ریموٹ کنٹرول کے ذریعے دوسروں سے کہلوا دیتے ہیں اب یہ قلندر سنائے جا رہا ہے اور ہم سُن رہے ہیں: "ساہن سے پریچے نہیں —— چورن سے بیوہار —— دجہن جگ میں آئے کے۔ جا میں ہو کچھ گیان۔ نبیؐ نام کی سمرن کیجئے اور علیؑ پہ رکھیے دھیان ۔"

"یہ کوئی پریم مارگی صوفی رہے ہونگے ——" میں نے کنور کو مخاطب کیا۔

"ہلو۔ تم تو بڑے ہوشمند ہوتے جا رہے ہو "

"یار — اب ایسے ہُوش بھی نہیں ہیں۔ مرحوم بڑے باپ یہ سب ملک محمد جائسی، قطبن، ڈطبن نہیں پڑھا کرتے تھے؟"

قلندر: —— "بیر نگر کو پہنچ کے نبیؐ نگر کو جائے —— تب دجہن گھٹ ہی اندر سر کا گانوں پائے —— بنت بنت بن جئی ہے ایسا —— کوئی دن منصور یا جیسا ——"

"منصور یا جیسا —— ! ہاؤ ڈُو وائی اِٹ" جرمن باجی نے پیچھے سے آ کر داد دی۔

"ملامت می کند خلقے و من بر داری رقصم ——" کنور نے الاپنا شروع کیا۔ قلندر نے دہرایا: "تب دجہن گھٹ ہی اندر سر کا گانوں پائے۔"

(۴۵)

خطِ سوم

اودھی زبان کے چشتیہ صوفی شاعر وجہن کی پانچویں پیڑھی کے دو جواں سال بھائیوں نے اپنے پھاٹک پر میاں کا خیر مقدم کیا۔ وہ دونوں بھائی لامارٹینیر کالج کے تعلیم یافتہ تھے لیکن انکا مکان بہت قدیم تھا۔ اور جس قصبے میں وہ رہتے تھے وہ اور بھی زیادہ پُرانا تھا اور ایک وقت مدینۃ الاولیاء کہلاتا تھا۔ خیر آبادی کے لحاظ سے اب بھی بہت بارونق تھا مگر جگہ جگہ ان مشہور مدارس اور حویلیوں کے کھنڈر نظر آتے تھے جن میں سے بہت سی انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کھُدوا ڈالی تھیں۔

جس وقت ہم وہاں پہنچے ہیں وسیع مردانے مکان کے سرے پر بنی مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی اندر جماعت کھڑی ہوئی اور ہمارے ساتھ آئی ہوئی مسلم خواتین نے بیرونی چبوترے پر مصلّے بچھائے۔

نماز کے بعد میں مسجد کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔

حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی نسل کے ایک بزرگ کا مکان شہر لاہور میں اس جگہ پر تھا جسے شاہجہاں نے جامع مسجد کی تعمیر کے لیے منتخب کیا۔ ان صاحب سے کہا گیا آپ بطور معاوضہ سلطنت میں جہاں چاہیے جاکر آباد ہو جائیے۔ انہوں نے ایک دور دراز مقام کا نام لیا۔ کہ انکا ایک دوست وہاں رہتا تھا۔ چنانچہ وہ پنجاب سے چل کر اودھ میں آن بسے ـــ حضرت وجہن شاہ مجذوبؒ کے جدامجد ـــ یہ قصّہ بھی سینڈی نے یہاں آتے ہوئے گوش گذار کیا تھا۔

لکھوری اینٹوں کی سیڑھی پر بیٹھے بیٹھے میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ برطانیہ میں

خالی گرجا گھر مساجد میں تبدیل کیے جا چکے ہیں۔ یعنی یورپ کے کلیساؤں میں دوبارہ اذانیں۔ تو کیا تیئسویں صدی مغرب میں اردو پریس اس قسم کے اعلانات شایع کریگا۔

عرس حضرت برمنگھوی پیر

تین سو سال قبل حضرت کے جد اکبر ۱۹۵۸ء میں راولپنڈی سے برمنگھم ——

———

صندل مبارک حضرت —— شاہ خطب ٹورانٹوی حضرت کے بزرگ ۱۹۶۲ء میں حیدرآباد دکن سے تشریف لائے تھے اور ——

والٹر مٹی کا تخیل پھر کارفرما ہو چلا تھا کہ ایک آہٹ نے چونکایا۔

ایک صاحب، سر پہ آسٹرین ہیٹ جس میں نیلا پَر لہرا رہا تھا، بڑھیا ولایتی برساتی۔ سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ہیٹ اتار کر آداب عرض کیا۔ اجازت چاہ کر سیڑھی پر بیٹھ گئے۔ سامنے کا منظر بغور ملاحظہ کرنے لگے۔

احاطے میں ایک کوچ کھڑی تھی۔ چند کاریں، رکشائیں، سائیکلیں، پَو پھٹ رہی تھی اور گرد و نواح سے ایک ہجوم میاں سے ملنے کے لیے آن پہنچا تھا۔ امیر غریب ہندوؤں کا ایک گروہ مردانے مکان کی سمت جاتا نظر آیا۔

"یہ سب مرید بننے کے لیے آئے ہیں۔ عجیب فنومنن ہے۔ یا بھگتی۔ یا بیعت —— جناب بخوبی واقف ہونگے۔ غیر مسلمین کو مرید کرنا چشتیہ مسلک ہے —— محبت۔ جمال۔ نغمہ۔ جو بی گڈ۔ وٹ ؟"

سگار سلگا کر چند منٹ خاموش رہنے کے بعد اچانک وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوتے۔ "جناب آپکو معلوم ہی ہوگا۔ نظام کائنات کے سارے سیّارے اور آفتاب پہلے محض گیس اور ہیلیم کے روشن بادل تھے۔"

"جی ہاں۔"

ایک اور سنکی۔

"اور کرۂ ارض پر پہلے لاکھوں برس تلک موسلا دھار بارش ہوا کی۔"

"جی۔"

"اور پُش بٹن کے آخری دھماکے کے بعد آئندہ لاکھوں برسوں تک پھر جھڑی لگی رہے گی۔"

"عین ممکن ہے۔"

"تو اس کروڑوں اربوں برس کے گیس اور بادلوں اور بارشوں کے سلسلے کے درمیانی وقفے میں فقط دس بارہ ہزار سال کی انسانی تہذیب اور اسکے تخلیق کردہ معبود اور ادیان اور فلسفے اور روحانیت وغیرہ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ جبکہ طرّہ یہ کہ سارا کائنات مسلسل پیچھے کھسک رہی ہے۔ آپ وہ سامنے والی سرخ کوٹھی دیکھتے ہیں"

"سرخ —— ؟ مجھے تو زرد رنگ کی نظر آرہی ہے۔"

"جی نہیں۔ سرخ۔ وہ پھاٹک کے دائیں جانب۔"

"وہاں ایک جنگل کھڑا ہے۔"

"وہی پہلے آپکے ان میزبانوں کی وسیع کوٹھی تھی۔ گذشتہ تیس برس کی برساتوں میں درودیوار پر سبزہ اُگ آیا تو یہ اپنی دوسری سالم کوٹھی میں اُٹھ آئے۔ اسم شریف"

"دھان پور۔"

"اوہ —— ان لوگوں کے —— ہم لوگوں کے مانند سابق بیرن اکیوں صاحب۔ دھان پور کو کتنا ثبات رہا؟"

ہم نے یہ سنکر تبسم کیا۔

"اسیطرح سارے کرۂ ارض کو بارش اور جنگل ہڑپ کرلیں گے آپ ہیں کس خیال میں؟ جناب والا۔ اربوں برس کی متحرک گیس اور چھٹتے ہوتے آتشیں سیار

ور گھٹا ٹوپ برف اور لگاتار برسات اور جب ذرا کی ذرا مطلع صاف ہوا تو آپکا یہ انٹرویل۔
ور لامحدود کائنات کے مقابلے میں گویا بحرالکاہل پر تیرتے مٹر کے دانے جیسی حقیر دنیا
—ایسی سچوئیشن میں روحانیت اور الٰہیات اور مابعدالطبیعات کی کوئی حقیقت ہے؟
" مزید برآں۔ان ناگفتہ بہ حالات میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھیے کہ
شہرت عام اور بقائے دوام کی تمنا میں ہلکان ہوئے جاتے ہیں" انہوں نے برساتی
کی جیب سے ایک پلندہ نکالا۔

" ملاحظہ ہو۔ایک بے انتہا نامور شاعر یونیورسٹی میں میرے استاد تھے۔وقتاً فوقتاً
پنی تعریف میں خود مضامین لکھ کر بھیجتے رہتے ہیں کہ میں انکو اپنے نام سے چھپوا دوں"

"اور آپ چھپواتے ہیں؟"

"جی استاد کا حکم"

"آپ صبح صبح یہ فائل لیکر گھر سے نکلے!"

" سرکار کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں۔انکو اپنا تازہ کلام سنانے۔سرکار
بہت شفقت فرماتے ہیں"

اپنی تجریدی نظم سنانے لگے۔

مجمع بڑھتا گیا۔

ایک مسکین سا آوارہ کتا پھاٹک پر کھڑا تھا۔کسی بچے نے اسے کھینچ کر پتھر مارا۔
کتا چیں چیں کرتا بھاگا۔

" کیوں مارتے ہو۔وہ بھی خدا کی مخلوق ہے" مسجد کی سیڑھیاں اترتے ہوئے
۔ں نے تنبیہ کی۔اور کوٹھی کی طرف چلے گئے۔

برلگی ہیٹ والے شاعر میری طرف متوجہ ہوئے "جناب کو تو علم ہوگا صوفیاء کے
ں کتا بھی ایک مقام رکھتا ہے"

"جی"

" میاں کا ارشاد ہے کہ بقول خواجہ حسن بصریؒ مخلصین، صادقین، متوکلین، راضئین اور شاکرین کی اکیس صفات ایسی ہیں جو کتّے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ شب زندہ دار ہے صابر۔ محبّت شعار۔ یہ تمام خصوصیات ایک عام انسان میں ہوں تو وہ ولی ہو جائے۔ محبّت، توکّل، عجز۔۔۔"

بات ادھوری چھوڑ کر وہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔

دیدی چاء کی کشتی اٹھائے نزدیک آئیں۔

"چاچا ہو۔۔۔ چا۔۔۔!" انہوں نے پیالیاں چبوترے پر رکھ کر مجھ سے کہا۔

آسٹرین ٹوپی والے صاحب "ایلس ان ونڈرلینڈ" کے MAD HATTER کی طرح چاء کی پیالی ہاتھ میں سنبھالے، میاں کے تعاقب میں چل دیے۔

زرد رنگ کی کوٹھی میں ناشتے کے بعد کنور بولا۔۔۔ "میاں کا فیورٹ اخبار ابھی نہیں پہنچا۔ چلو لپک کر شہر سے لے آویں۔"

راستے بھر وہ سُور داس کا ایک دلآویز پد گنگناتا آیا۔۔۔ کو ہے جنک، جننی کو کہیئے کوناری۔ کو داسی۔ کیسو ورن۔ بھیش ہے کیسو۔ کَے ہی رس میں ابھیلاشی۔۔۔ شہر پہنچ کر اس نے اپنی مرمّت طلب گاڑی ورکشاپ میں چھوڑی۔ سائیکل رکشا پر کتب فروش ہاں پہنچے۔ چند منٹ بعد ایک اسٹیشن ویگن آکر رکی۔ ایک نسوانی آواز آواز نے چونکایا "کیوں صاحب آپکے پاس تازہ ہُدی ہے؟"

"۔جی۔۔۔؟"

"ہُدی۔۔۔ ہُدی۔۔۔ وہ رِیلی جس میگزین دلّی سے نکلتا ہے شاید۔"

کیا دیکھتے ہیں کہ ایک " اسٹڈی اِن بلو"۔ نیلے سلیکس کا بیش قیمت جوڑا۔ چوبی ایڑی کے بڑھیا جوتے۔ طویل روپہلی زنجیر سے آویزاں اطالوی پرس۔ لطیف و نفیس میک اپ مصنوعی طور پر سنہرے کیے ہوئے بال۔ گورا رنگ۔ سبحان اللہ۔ غالباً ملیح آباد کی ایک صبیح پٹھان زادی باغات انبہ کی آمدنی سے مالامال۔ خدا کی پناہ۔ دولت کا خیال کسی طرح دل سے نکلتا ہی نہیں۔

"یُومین ٹُو سے بڑی میڈم ـــــ؟" انکی وضع قطع دیکھ کر دوکاندار انگریزی پہ اترا۔

"ہاں۔ ہاں۔ وہی"

"آخری پرچہ بچا تھا میڈم وہ ان صاحبان نے خرید لیا"

"اوہ ـــــ میرے ماموں جان نے تاکید کی تھی تازہ پرچہ لیتی آؤں۔ شاہجہاں پور میں بھی نہیں ملا"

"اگر مناسب سمجھیں تو پتہ بتلا دیجئے چند روز بعد اسے پوسٹ کر دیں گے" کنور نے اخبارِ ہاپلندہ اٹھاتے ہوئے عرض کی۔ "یہ پرچہ اپنے مرشد کے لیے خریدا ہے"

"مرشد؟ وِچ کلٹ؟"

"نو کلٹ"

"انڈونیشیا کا ایک صوفی سنٹر بھی کور کر چکی ہوں۔ اِسکا ایڈریس بتائیے"

"نو سنٹر۔ نو آفس۔ نو رجسٹررز"

"آپ تو نو نو ہی کیے جا رہے ہیں"

"ابھی نفی کے مقام پہ ہیں" کتب فروش نے مسکرا کر کہا۔

"جی ـــــ ؟ سنیے حضرات۔ میں فری لانس جرنلسٹ ہوں۔ ویسٹ کے ایک سے ایک اسٹریم لائینڈ یوگا آشرموں سے واقف۔ آپ کی کون سی ایسی انوکھی جماعت ہے؟"

"نو جماعت!"

"آپکے گرو کا انٹرویو کرتے چلتی ہوں"

"انٹرویو ـــــ ہاہا"

انہوں نے بڑی شان سے اپنا سنہرا کارڈ پرس میں سے نکالا ـــــ اسٹاک ہولم کا پتہ.
او- لا -لا ـــ لا ـــــ میں نے دل ہی دل میں سیٹی بجائی. اس نوع کے خوش آئند این کاؤنٹر تو ہم بھول ہی چلے تھے۔
بوجوہ میں نے اپنا تعارف مختصر رکھا. علی اینڈ سنگھ ـــــ
"گویا اسمتھ اینڈ اسمتھ۔" وہ مسکرائیں. مغربی یورپ کی ایک گھاگ اخبار نویس. اب چوکنّے رہنا چاہیے۔
"اپنی بہن سے ملنے شاہجہاں پور آئی ہوئی ہوں. کل معلوم ہوا اس شہر میں ایک عدد برائیڈ برننگ ہوگئی ہے. صبح صبح موقع واردات پر پہنچی. پتہ چلا اطلاع غلط تھی یا معاملہ ہش اپ کر دیا گیا. مگر جیسے باوَلے گاؤں میں اونٹ. پل کی پل میں بھیڑ لگ گئی. میں ہڑبڑا کر کار کی طرف بڑھی. ایک اُچکّا میرا کیمرہ چھین کر بھاگا. حُلیے سے مسلمان لگتا تھا. شکر ہے کیمرہ خالی تھا۔"
"افسوس. تھانے میں رپٹ درج نہ کی؟"
"نیور مائنڈ. میرے پاس ان گنت کیمرے ہیں. ایک سے ایک بڑھیا. چلیے اس مفلس ملک کے ایک مفلس مسلمان کو اسی بہانے ایک جرمن کیمرہ تو مل گیا۔"
کنور نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا. کتب فروش مسکرایا. وہ کہتی رہیں۔ "صبح آپا جان کے گھر سے چلتے وقت جلدی میں ناشتہ بھی نہیں کیا. یہاں قریب کوئی سلاد بار ہوگی؟"
"سلاد بار ـــــ ؟ بیگم صاحبہ. یہ امریکہ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا. کتب فروش کے مشورے پران کو نزدیک کے شانِ اسلام محمّدی ہوٹل لے گئے. ایک وسطی میز پر جا بیٹھے. چھوکرے نے لپک کر جھاڑن سے پھولدار پلاسٹک کا میز پوش صاف کیا. سامنے تنور پر مرغن کھانے تیار ہو رہے تھے. ایک تہمد پوش نوجوان نہایت فن کاری سے رومالی چپاتیاں ہوا میں اچھالنے میں مصروف تھا۔
"اسی قسم کے ریسٹورانوں کے چھوکرے ہمارے لڑکپن میں وہ فلسفیانہ آواز لگایا کرتے تھے کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا چار آنے ـــــ" کنور بولا۔
ٹیلی ویژن پر کرکٹ میچ دکھلایا جا رہا تھا. آبی اور سفید ٹائلوں والی دیواروں پر

سنہرے فریم میں آیاتِ قرآنی، گنبدِ خضرا۔ طغرے۔ مالک طعام خانہ کا فوٹوگراف دو پہلوانوں کی تصویریں بڑے بڑے آئینوں پر منقش اشعار۔ گڈ اولڈ مسلم سوسائٹی۔ لذیذ کھانے اور اردو شاعری ـــــ

چند حضرات اردو اور ہندی اخباروں میں منہمک تھے۔ کعبے شریف اور مسجد نبویؐ کی تصاویر والے بڑے بڑے کیلنڈروں پر انکی مسلمان کمپنیوں کے نام ہندی رسم الخط میں۔

نیا ہندوستانی مسلم معاشرہ۔

صحافی خاتون نے طعام خانے کا جایزہ لیکر آہستہ سے کہا ـــ "کلچر شوک پہ کلچر شوک"۔

"بیشک۔ بیشک"۔ کنور نے متانت سے سر ہلایا۔ اور کاونٹر کی طرف چلا گیا۔

"میرے شوہر شپنگ میں ہیں۔ ہم سویڈن میں رہتے ہیں۔ پہلے نورتھ امریکا میں تھے۔ جرنلزم میں نے یونیورسٹی اف سسکاچیون سے کی"۔

"خاکسار نے رِسنسا ٹی سے"۔ بہت دنوں بعد اپنے فورم پہ تھا۔

"خوب! تو گویا آپ میرے کولیگ ہیں۔ مسٹر اسمتھ۔ آئی مین ـــ مسٹر علی۔ تھرڈ ورلڈ میں آپ بھی کسی پروجیکٹ پر آئے ہوئے ہیں۔؟"

"جی نہیں یوں ہی"۔

"آپکو یہ ملک بیک ورڈ نہیں لگتا۔؟"

"کیا کیا جائے مائیں بھی تو دقیانوسی ہوتی ہیں اور اکثر ایبزرڈ ـــ"

"سنٹی منٹل مَش۔ یہاں منسٹروں سے لیکر دانشوروں تک سب کلیشے رٹ رہے ہیں"۔

"حتیٰ کہ کلیشے کی شکایت بھی کلیشے بن چکی ہے۔ میم!"

"سکنڈ ریٹ لٹریچر۔ تھرڈ ریٹ ٹی۔ وی۔ فورتھ ریٹ ہیومر ـــ ڈیم ـــ میں اپنی بھانجی کی شادی اٹنڈ کرنے آرہی تھی۔ ایک سویڈش میگزین نے فوٹو فیچر کا اسائن منٹ بھی دیدیا ـــ کمیونل رائیٹس ـــ برائیڈ برننگ۔ قحط ـــ بھکاری ـــ یونوا وُل دیٹ۔ بے شمار رول تویں نے ٹرینوں کی چھتوں پر لدے مسافروں پر ہی ختم کر دیے۔ ایسٹرن یو۔ پی۔ بہار ـــ ناقابلِ یقین"۔

کنور واپس آیا۔ ساتھ ساتھ پُرتکلّف ناشتہ اور چاے۔

"بس یہی ایک چیز یہاں دل کو گرماتی ہے۔ لوگوں کی مہمان نوازی اور خلوص ——"

وہ ہنسنے لگا۔ "آپ تو واقعی بہت ہی زیادہ مشفق فورنرز کی طرح بات کر رہی ہیں۔ آپ خود کہاں کی رہنے والی ہیں —— بلیا —— بستی؟"

"شاہجہاں پور ——" ذرا جھینپ کر جواب دیا —— "لیکن اٹھارہ برس کی عمر میں بیاہ ہوا۔ اسکے چند سال بعد ہم لوگ باہر چلے گئے۔ پچیس[۲۵] سال سے وہیں ہیں۔ بیچ میں محض ایک مرتبہ آئی تھی جب —— جب میرے اُبّو کا انتقال ہوا تھا۔"

چند روز کے لیے وطن آنے والے "غیر ملکیوں" کا وہی پامال منظر نامہ گھسے پٹے مکالمے۔ وہی مانوس ردِّ عمل اور ترحّم آمیز سرپرستانہ انداز۔

"آپ لوگ اسی شہر میں رہتے ہیں؟"

"لکھنؤ۔" کنور نے جواب دیا۔

وہ چونک پڑیں۔ "کرامت حسین کی پرنسپل سے واقف ہیں؟"

"ہماری بی بی جانتی ہیں شاید۔"

"میں اپنی لڑکیوں کا داخلہ کروانا چاہتی ہوں —— مسز سنگھ سفارش کر دینگی؟ سنا ہے انڈیا میں داخلے بڑی مشکل سے ——"

"لڑکیوں کا داخلہ ——؟ مگر آپ تو سویڈن ——"

"کرامت حسین۔ ورنہ علیگڈھ۔ جب ہم یہاں تھے ہماری شدید تمنّا تھی کہ اس قابل ہوں کہ اولاد کو ویسٹ میں پڑھا سکیں۔ اب وہیں کے دولتمند باشندے ہیں اور چاہتے ہیں کہ —— آپ بور تو نہیں ہو رہے ہیں؟"

"بالکل نہیں مادام۔"

"آج سے دس سال قبل، جس روز ہمارے ساؤتھ انڈین اور تھوڈوکس برہمن پڑوسیوں کی بیٹی کمر تک لمبے سرخ بالوں والا ایک خوفناک، تھرڈ ریٹ پوپ سنگر اپنے ماں باپ کے ہاں لے آئی یہ فیصلہ ہمیں جبھی کر لینا چاہیے تھا۔ مگر جب ہماری بڑی بیٹی بھی

فریک آؤٹ کر گئی تب ہمیں ہوش آیا چلو خیر لڑکا جو چاہے کرے مرد ذات مگر بیٹیاں؟ بڑی لڑکی یہاں سے پانچ سال کی گئی تھی چھوٹی دونوں وہیں پیدا ہوئیں۔ انہیں یہاں بھیجدونگی۔"

"یہاں وہ مِس فِٹ نہ ہونگی؟"

ظاہر ہے ــــ بیحد ــــ لیکن آپ ہی بتائیے کیا کیا جائے؟ میں اتنی پریشان ہوں کہ انالسِس میں بھی جا چکی ہوں ــــ فایدہ ہوا خاک دھول ــــ جب ہم دونوں یہاں سے مائیگریٹ کر رہے تھے اس پرولبم کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ فیوچر اسوقت بہت دور تھا۔ لو صاحب پلک جھپکتے میں وہ سامنے آگیا۔"

"فیوچر شوک ــــ!" کنور بولا۔" مادام۔ ہم اور ہمارے دوست ــــ مسٹر علی، ہم دونوں کی جنریشن تو سمجھیے حد سے حد دس سال اور کھینچ لے جائیگی لہٰذا ــــ یہ خود غرضی کی بات ہے ــــ لیکن ہم کو اتنی فکر ہے نہیں۔ آپکی مڈل جنریشن کو البتہ ابھی کوارٹر سنچری اور زندہ رہنا ہے ــــ"

"اماں کیوں ایسی ہَولانے والی بات کرتے ہو۔" میں نے اعتراض کیا۔

'لہٰذا مسز خان۔ آپ لوگوں کو ابھی بہت کچھ اور دیکھنا باقی ہے اسکے لیے ابھی سے جی کڑا کر لیجیے۔"

"ہماری بڑی لڑکی نے جو لایف اسٹائل اختیار کیا ہے ــــ وہ فیشن ڈیزائنر ہے۔ الگ فلیٹ لیکر رہتی ہے۔ اب کم از کم چھوٹی دونوں ــــ"

کنور آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔" سیارے سیاروں سے ٹکرا رہے ہیں ــــ پہاڑ روئی کے گالے کے مانند اڑیں گے ــــ اور ــــ"

"جی ــــ سُنیے۔ آپکا کیا پروگرام ہے۔؟ اسوقت لکھنؤ جا رہے ہیں ــــ؟"

"بیگم صاحبہ۔ ہم کارخانے سے کار لے آویں اس کار خیر کے لیے آپکو فوراً لکھنؤ لے چلیں گے اور اپنی بی بی سے آپکو ملوا کر فوراً لوٹ آوینگے۔ آپ کہاں مقیم ہیں؟"

"بتلایا تو۔ شاہجہاں پور۔ اپنی بڑی بہن کے ہاں۔ فوٹو فیچر کا کام مکمل ہو گیا مائینس برائیڈ برننگ جسکا افسوس ہے۔ اب کالجوں کے متعلق معلوم کر کے اتوار کو یوروپ واپس۔"

ہم تینوں ہوٹل سے نکلے۔

کارخانے کے مالک حاجی صاحب نے کہا گاڑی تیسرے پہر تک ——
"مجال ہے جو اس ملک میں کوئی کام وقت پر ہو جائے" مسز خان بڑبڑاتی ہوئی اسٹیشن ویگن سے اتریں۔
"بیگم صاحب۔ ہم ابھی آتے ہیں پانچ منٹ میں" انکے ڈرائیور نے کہا اور غائب ہو گیا۔
"سنیے۔ ایسا کرتے ہیں" کنور سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "آپ کے شوفر کو پتہ بتلائے دیتے ہیں۔ غریب خانے پہ تشریف لے جائیے۔ پر تبھا گھر پہ ہونگی انکو یہاں سے بھی فون کیے دیتے ہیں۔ ہم لوگ بس پکڑ کر حضرت کی خدمت میں واپس جائیں۔ بہت دیر ہو گئی"
"مجھے شیک اُوف مت کیجیے" انہوں نے نروس انداز میں سگریٹ جلایا۔ "میں بیحد فکرمند ہوں۔ چلیے آپکو آپکے صوفی سنٹر پہنچائے دیتی ہوں مجّن خاں ——"
"کھانصاحب شاید چاء پینے چلے گئے" ایک مستری نے جواب دیا۔
"میرے رشتے داروں کی کار ہے۔ میرا شوفر ہوتا اسیوقت نکال باہر کرتی" وہ جھنجھلا کر ایک کرسی پر ٹِک گئیں۔ بینڈی اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ حاجی صاحب چاء اور ناشتے کی کشتی اٹھوائے پہنچے۔ انہوں نے اصرار کیا "غیر ملکی" مہمان نے انکار۔ انکے جانے کے بعد بولیں "یہاں لوگ خاطروں کے مارے بھی ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ ایسی بھی کیا گرمجوشی"
اب ایک ملازم دیسی کوک لیکر حاضر ہوا۔ انہوں نے پھر ناک بھوں چڑھائی بیں خجل ہو کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ جوہری کی دوکان کے سامنے ایک کار آ کر رکی۔ نفیس غراروں میں ملبوس بیگمات اتر کر اندر گئیں۔ پھر ایک جنرل اسٹور کے سین نے متوجّہ کیا۔ شیروانی میں ملبوس ایک باریش نوجوان صابن خریدنے میں مصروف تھا۔ منّا سا سرخ غرارہ پہنے ایک بچّی نے ہاتھ اونچا کر کے کاؤنٹر سے پلاسٹک کا کوئی کھلونا اٹھایا الٹ پلٹ کر اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسکے ہاتھ سے گر گیا۔ "ابوّ ——" اس نے چہرہ اٹھا کر باپ کو ملتجی نظروں سے دیکھا۔

"کیا قیمت ہے؟" نوجوان نے دریافت کیا۔

"چھ روپئے۔" دوکاندار نے جواب دیا۔

"بیٹا ــــ" شخص مذکور نے جھک کر بڑی نرمی سے کہا "اس مہینے ہم نے تمہارے لیے نیا فراک بنوادیا ہے یہ کھلونہ اگلے مہینے خرید دینگے۔"

وہ بہت چھوٹی بچی تھی پانچ یا چھ برس کی۔ لیکن اس نے ضد نہیں کی۔ چپ رہی دوپٹہ سنبھالتی باپ کی انگلی تھامے آگے چلی گئی ــــ رضا و تسلیم ــــ؟ باپ رے۔

"سوئیڈش" لیڈی بھی محویت کے عالم میں یہ دلدوز منظر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر مسکرا سے آلو وہ نم پلکوں پر جھپکیاں بھیری۔ کچھ توقف کے بعد بولیں: "میرے ابو ــــ اسیطرح میں انکی انگلی تھامے بازار جاتی تھی۔ للچائی نظروں سے کھلونے دیکھتی ــــ وہ خرید نہیں پاتے تھے۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھے۔ میں بھی بالکل ہٹ نہیں کرتی تھی۔ اماں نے اس کمسنی میں سمجھا رکھا تھا۔ پتہ مارنا سیکھو۔ بیٹیوں کے لیے پتہ مارنا بہت ضروری ہے۔

"اب میرے پاس برن آوٹ لیوں کی اتنی دولت ہے کہ مجھے کسی چیز کے لیے پتہ مارنے کی ضرورت نہیں۔ میری لڑکیاں تو اس تصور ہی سے نا آشنا ہیں۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"میرے شوہر اچیومنٹ کی اس اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں کہ اب اپنی بورڈم کو صبح سے شام تک شراب میں غرق کرتے رہتے ہیں۔ ہماری بڑی بچی شروع شروع میں بالکل فریک آوٹ کر گئی تھی۔ میرے شوہر اس صدمے سے تقریباً الکحلک ہو گئے۔ وہ بار بار مجھ سے کہتے ہیں میں نے دن رات جدّوجہد کر کے یہ دولت اسلیے کمائی تھی کہ میری بیٹی ــــ اوہ ــــ گوڈ ــــ مسٹر علی ابھی مسٹر سنگھ نے وہ کیا بتایا تھا ــــ؟ کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا چار آنے ــــ مسٹر علی ہم واقعی اپنے ہیرے جواہرات، منک کوٹ، سوئس اکاؤنٹ چبا کر نگل تو نہیں سکتے۔ اور ہماری بچی گلاس کی طرح ریزہ ــــ ریزہ ــــ"

"آپ اس جملے کی ذرا زیادہ ہی فلسفیانہ تاویل کر رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے حالات اتنے نہیں بگڑے۔"

"آپ حیران ہونگے کہ ــــ سرراہے، اتفاقیہ پہلی ملاقات میں ذاتی مسائل بیان کرنے بیٹھ گئی۔ لیکن شاید اس ایتھنِک کلچر کا اثر ہے فیملی اورینٹیڈ سوسائٹی جہاں لوگ چھوٹتے ہی ایک دوسرے کو باجی دیدی بھیّا، چچا پکارنے لگتے ہیں۔"

بالکل حیران نہیں۔ عاصی اس قسم کی متموّل پریشان حال مِکسڈ اپ بیویوں کے اچانک کنفشن کا عادی رہا ہے۔

"یا آپ کے اندر کوئی ایسی بات ہے جو کونفی ڈنس انسپائر کرتی ہے۔"

بندہ اسی کوالٹی کی وجہ سے ہمیشہ کامران رہا۔

"میں ابھی اپنی ایکس ٹنڈڈ فیملی کے خلوص کا تجربہ کر کے آرہی ہوں ــــ"

"جبکہ آپ کو اپنی نیوکلیر فیملی کی عادت ہو چکی ہے۔"

"نیوکلیر ــــ کا کیا ذکر تھا بھئی ــــ؟" کنور نے واپس آتے ہوئے پوچھا "جب پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑیں گے ــــ؟ اور ــــ"

"ــــ میں آپ دو اجنبیوں سے خود کو ریلیٹ کرتے پا رہی ہوں۔ مسٹر سنگھ میں آپ کو ہر سال یوروپ سے راکھی بھیجا کرونگی۔ آپکی چال ڈھال اور نوکیلی مونچھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ راجپوت ہیں ــــ ایم آئی رائیٹ؟ راجپوت بھائی کی پٹھان بہن ــــ واؤ ــــ! رکھشا بندھن کا تہوار کس مہینے میں پڑتا ہے؟" انہوں نے پرس سے نوٹ بک نکالی۔

مسز خان اب ہندوستان کے رومینٹک ٹرِپ پر چلی گئی تھیں۔

راہگیروں کے ہجوم میں سے انکا ڈرائیور نمودار ہوا۔

قصبے کی طرف واپسی کے دوران وہ بالکل خاموش رہیں۔ کنور نے پھر سُور داس گنگنانا شروع کیا ــــ کو ہے جنک، جننی کو کہیت۔ کو ناری کو داسی ــــ کیسو ورن ــــ بھیش ہے کیسو ــــ کے ہی رس میں ابھیلاشی ــــ کون دیس کے باسی رے اودھو

اسٹیشن ویگن میزبانوں کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔

تیسرے پہر ایک درگاہ پر گئے۔

"اسکا کچھ بیک گراؤنڈ دیجئے —"

"شاہ میناؔ صاحب کے خلیفہ — کیلف نہیں۔ بیگم صاحبہ۔ لکھیے۔ خلیفہ" — کنور بولا۔

"او۔کے۔ نیور مائینڈ" انہوں نے نوٹ بک بند کر دی۔

خواص و عوام نے میاں کو گھیر رکھا تھا۔ دو پلّی ٹوپیوں اور نرم چہروں والے ثقہ عمر رسیدہ شرفائے قصبہ کو دیکھ کر میرے حلق میں کوئی چیز آن اٹکی۔

"کلچر شوک — ؟" کنور نے مجھے اداس پا کر آہستہ سے دریافت کیا۔

"بکومت۔ بڑے آبا یاد آگئے۔"

"بھائی۔ جس اوڈیسی پہ تم نکلے ہو اسمیں بڑے بڑے مقام آوینگے — جان لیوا۔"

"اوڈیسی — ؟ ڈانس — ؟ آپ ڈانسر بھی ہیں ؟" غیر ملکی مہمان۔ قوّالی کے شور کی وجہ سے بات صاف نہیں سنائی دے رہی تھی۔

"ہم ہیں وابستگان زلف دراز۔ دور تک سلسلہ تمہارا ہے — دور تک —"

"یہ مقبرہ فیضی نے آگرے سے معمار بھیج کر بنوایا تھا" کنور سینڈی۔

"آگرے سے ؟ سُنا ہے وہ خود تو بیردت میں رہتے ہیں۔"

"شوُ — شوُ — قوّالی سننے دیجئے بھئی" پیچھے سے ایک خاتون۔ انکے گروہ میں کھسر پھسر "یہ کون بی بی ہیں ؟"

"انگرڈ برگماں از سوئیڈن۔"

"ڈونٹ بی کیٹی نگہت —"

"شوُ — شوُ —"

"ایسے بلم کی دھوم مچی ہے۔ لاگی ہے پریم بجریا۔ مورے بانکے انوکھے سانوریا۔ مورے گنیشاں — ہم ہیں وابستگان زلف دراز — لاگی ہے پریم بجریا —"

مسز خان نے درگاہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے مایوس ٹورسٹ کی آواز میں کہا —

"کسی کو حال تو آیا ہی نہیں۔"

"میاں کا روحانی کنٹرول —"

"آپ لوگ کس دنیا میں رہتے ہیں؟"

کنور انکے ڈرائیور محسن خاں سے مخاطب ہوا "دیکھو بھئی ایسا کرو کہ اب سیدھے لکھنؤ جاؤ اور علی گنج پہنچ کر ——"

"سب ہندوستانی شترمرغ ہیں۔ سنیے ہیں کل تک یہاں ٹھہر سکتی ہوں؟"

دوسری شام۔ میزبانوں کا مردانہ مکان۔ محمود آباد کے قوال۔ مسز خان کنور سے:

"وہی سنوائیے —— لاگی ہے پریم بزریا ——"

رات۔ ایک قدیم درگاہ سے ملحق ایک خوش منظر قریہ۔ میزبان ایک نوجوان حاجی۔ میاں کے آنر میں روپہلی بروکیڈ کی صدری پہنے۔ دوسری منزل پر ٹی وی چل رہا تھا۔ ایک لڑکے نے جاپانی کیمرہ نکال کر تصاویر لینی شروع کیں۔ کنور نے ذرا کمینے پن سے مسکرا کر مسز خان کو دیکھا۔ وہ ہاتھی کی یادداشت رکھتا ہے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" انہوں نے ذرا جھینپ کر پوچھا۔

"نئے KULAK ——"

میاں بی بی سی کی خبریں سننے میں منہمک تھے۔ سارے مہمان انہیں تکے جا رہے تھے۔ ہم لوگ ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ بروکیڈ کے غرارے پہنے چار پانچ عورتیں کمرے میں آئیں۔ بعد دست بوسی فوراً واپس گئیں۔

"قصبوں میں پردے کی بڑی شدت ہوا کرتی تھی۔" مسز خان۔

"اب بھی ہے مگر پردہ لیڈیز کو میاں کی زیارت کے لیے مجمع عام میں آنے کا سوشل سینکشن حاصل ہے۔ یہ قدامت پسند معاشرہ اپنے ولی پہچانتا ہے۔"

"کیا وہ ہجوم کی ذہنیت کو پیوری فائی کر دیتے ہیں؟"

"حقیقت تو یہی ہے۔"

"یُو نوسم تھنگ مسٹر علی! آپ مجھے ایک بیحد کلرفُل آدمی معلوم ہوئے۔ نجانے یہاں کیا کر رہے ہیں۔"

"میاں نے میرے ذہن کو بھی پیوری فائی کر دیا ہے۔"

"اِن ڈِیڈ — !"

"ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ فیض آباد کی خاتون ڈاکوامر آوتی پکڑی گئیں۔ ترنت جاکرانکی گرفتاری کور کیجئے اپنے فوٹو فیچر کے لیے۔" جرمن باجی کا مشورہ۔

"آپ مجھے یہاں سے بھگانا چاہتی ہیں؟ کیونکہ شاید پہلی مرتبہ آپ کے اس چارمڈ سرکل میں ایک فرد ایسا آیا ہے جو —"

"مہاراج کی خلافت بہت جنے کرتے ہیں۔"

"خلافت؟"

"سرلا دیدی کا مطلب ہے مخالفت۔ کل آپ جن بزرگ کے روضے پر گئی تھیں انکو اکبر نے آگرے بلایا۔ فیضی نے بطور آزمائش بلّی اور چیل کا قورمہ دسترخوان پر پیش کیا۔ آپ نے فرمایا جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ۔ بلّی قاب سے نکل کر بھاگ گئی۔ چیل اڑ گئی۔ فیضی آپکے قدموں پر گر پڑا۔ آپ نے فرمایا ہم پانی کا حکم رکھتے ہیں جو ہم پر پڑا گذر گیا ہمیں کدورت سے مطلب نہیں"

"کوک اینڈ بُل کے بجائے کیٹ اینڈ کائیٹ اسٹوری —" مسز خان نے کہا۔

"ادب سے بات کیجئے۔" کنور غرّایا۔

تیسرے روز — ایک خان صاحب کے اونچی دیواروں والے ترکی قسم کے خانہ باغ میں چائے۔ چمن کے ایک گوشے میں ایک صاحب قصّہ سنا رہے تھے۔ "تو جناب والا حضرت امام حسین علیہ السلام نے تو کر دیا منع۔ مگر آپ کی شہادت کے بعد زعفر جن کا لشکر تا قیامت نوحہ گر رہنے کے لیے دشتِ کربلا میں خیمہ زن ہو گیا ابتک وہیں موجود ہے اور روز حشر تک گریہ کرتا رہے گا۔"

"ہاؤ سوئیٹ۔ آؤ ٹو وی اِی ایٹ —" جرمن باجی۔

"دشت کربلا میں تو اب بازار ہیں اور ایک عدد فائیو اسٹار ہوٹل۔" مسز خان ہنس پڑیں۔ روش پر آگے بڑھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "مگر تعجب ہے اتنے اور تھوڈوکس ماحول میں ایسی ری لیکسڈ قسم کی مِکسڈ سوسائیٹی۔ شاید اسوجہ سے کہ سب کی توجّہ فرد واحد پر مرکوز۔"

"درست۔"

"گویہ جرمن باجی کافی LOW I.Q. رکھتی ہیں بے چاری۔"

جرمن باجی کی انکے متعلق یہی رائے تھی۔

چوتھی رات۔ بعد نماز عشاء مسز خان بوکھلائی ہوئی چبوترے پر آئیں۔ "مسٹر علی۔ ابھی ایک صاحب کسی شخص سے سرگوشی کر رہے تھے میں میاں کے پاس ایک پرولبم لیکر آیا تھا۔ جائداد کے مقدمے کے متعلق چند نکات کا محض میرے والد مرحوم کو علم تھا وہ موجود نہیں۔ سرکار نے فرمایا تو ان سے پوچھ کیوں نہیں لیتے۔ میں نے عرض کی حضور آپکو تو معلوم ہے والد کی وفات کو چھ مہینے گذر چکے۔ آپ نے میری آنکھوں پہ ہاتھ رکھا۔ ہٹایا تو ابّا جان سامنے موجود۔ میں ہڑ بڑا گیا۔ ان سے مقدمے کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا: آپ نے دوبارہ میری آنکھوں پر دست مبارک رکھا۔ ہٹایا تو کمرے میں کوئی نہیں ——

"صاحب میں اس فنیٹسی سے ری لیٹ نہیں کر سکتی افسوس کہ میرا فیڈ بیک آپکو مایوس کریگا۔ میرا ڈیلیما ہر موڈرن مائنڈ کا ڈیلیما ہے —— مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"پھر انالیسس میں جائیے۔"

پانچویں رات۔ وہ کارواں میں شامل ہونے کے لیے گیٹ ہاؤس کی محراب میں کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں "آل راؤنڈ کمیونی کیشن گیپ۔ ابھی جب میں نے دہلی سے لکھنؤ کے لیے ٹیک اوف کیا ایر ہوسٹس کی آواز آئی یاتریوں سے نویدن ہے کر پیہ دھومرپان نہ کریں —— میں سمجھی وہ کہہ رہی ہے —— مسافر پان کھا کر دھوم نہ مچائیں۔"

"آپ بھی کرپیہ ——" جرمن باجی۔

"کیوں —— ؟ اور یہ مسٹر راجا علی جو ہر وقت جمنی کی طرح ——"

"لیکن خواتین مشرق ——"

"ڈیم خواتین مشرق۔ آپ کبھی مڈل ایسٹ گئی ہیں؟"

"جی اور سال میں چھ مہینے ویسٹ جرمنی میں رہتی ہوں۔"

"آپ ویسٹ جرمنی میں رہتی ہیں اس سے مجھ پہ کسطرح لازم آیا کہ میں ڈھوم رپان نہ کروں؟" مسٹر علی۔ میاں اسقدر دلچسپ کن ٹم پریری گفتگو کرتے کرتے ــــ کوئی پوائینٹ نکال کر اچانک کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں جسکے متعلق سوچنا پڑتا ہے۔ شام فرما رہے تھے۔ ہم نے ایسے دیوانوں کو دیکھا صحرا میں گھومتے ہوئے انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں۔ اسکا کیا مطلب ہے ــــ؟ اور فرمایا مکاں اور لامکاں میں ڈھونڈا ہے مگر انہوں نے اپنا پتہ بتلا رکھا ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہتے ہیں۔ مگر میں پوچھتی ہوں یہ اچھی دل لگی ہے کہ پہلے خود ہی ایسے اسباب پیدا کرو کہ دل ٹوٹے پھر اسمیں آکر رہنے لگو۔

"میں نے پوچھا۔ سیلاب۔ زلزلے۔ جنگیں۔ فساد۔ لاکھوں بے گناہ مارے جاتے ہیں ــــ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میاں نے فرمایا۔ آپ کے پاس باغ ہے؟ جب آپکا جی چاہتا ہے اسکے درخت کٹوا دیتی ہیں ــــ مسٹر علی اسکا کیا جواب ہے؟"

شہر۔ ایک اور معتقد کا "اوپن ہاؤس" ہم صحن میں انار کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ اہل ہنود کی آمد و رفت جاری تھی۔

"یہ بھگتی کا چکر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا دو ایسے مذہب جنکے درمیان ــــ جنکے درمیان"

"بعد القطبین ہے" عربی باجی نے مسز خان کی بات پوری کی۔" لیکن ایک قطب ــــ"

"آسان اردو پلیز"

"او۔ کے۔ سنیے۔ داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں ــــ شیخ ابوطاہر حرمینی ایک روز اپنے مرید کے ساتھ بازار میں سے گذر رہے تھے ایک شخص نے ان پر زبان ملامت دراز کی۔ مرید اور بازار کے لوگ جوش میں آگئے۔ مرید نے اس شخص کی ٹھکائی کر دی اور خود زخمی ہوا۔ شیخ نے اس سے کہا اگر تو چپ رہے تو تجھے ایک ایسی بات بتاؤں گا کہ تیرا رنج جاتا رہے گا۔ جب اپنے مکان پر پہنچے شیخ نے صندوق کھولا جس میں خط بھرے ہوئے تھے۔ فرمایا۔ دیکھ۔ کسی نے مجھے شیخ الاسلام لکھا ہے۔ کسی نے شیخ زکی۔ کسی نے شیخ زاہد۔ کسی نے شیخ الحرمین۔ اسی

طرح کے القاب ہیں نام کسی نے نہیں لکھا۔ ہر ایک نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے ایک لقب دیدیا تو کیا ہوا۔ یہ جھگڑا کیوں اٹھاتا ہے؟"

"گرُو وی سین۔ لیکن میں کوپ نہیں کرسکتی۔" دوسری صبح شاہجہاں پور لوٹ گئیں۔ اسی مکان میں تیسری شام ایک بیرونی کمرے میں دیوار پر آویزاں کعبہ شریف کے بڑے کٹ آوٹ کے نیچے ٹیلی وژن چل رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں پانچ سَو کینڈل پاور کا بلب روشن دونوں کمروں کی چاندنیوں پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اچانک بجلی بیحد مدھم پڑگئی۔ میاں نے لیٹ کر دلائی اوڑھ لی۔

"پاور کٹ" میں نے کہا۔

"عام طور پر ہوتا نہیں" میزبان بولے۔

"میاں۔ اے میاں۔ ہمرے لڑکے کو نیک ہدایت۔ اے میاں ــــ" ایک برقعے والی عورت بار بار کہے جا رہی تھی۔

"آرام کرنے دو اماں" لڑکی نے کہا۔

"ہمرے لڑکے کو ــــ"

زیادہ تر ہندوستانی مسلمان مائیں شاکی ملیں کہ لڑکے پڑھائی کے شوقین نہیں لڑکیاں کالجوں میں پہنچ گئیں۔ ہم یہ سب باتیں نوٹ کرتے جا رہے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے بیٹے کی طرح اخبار نویس ہونا چاہیئے تھا۔ اے کاش زندگی از سرِ نو شروع کرسکتے۔

شور مچ رہا ہے۔ ٹی وی اسکرین پر روشنی کی لکیر باقی رہ گئی ہے۔

ٹھیک نو بجے روشنی تیز ہوئی۔ میاں دلائی چہرے سے ہٹا کر اٹھ بیٹھے پیچوان تازہ کیا گیا۔ دستر خوان بچھا۔ صبح ساڑھے تین بجے لکھنؤ روانہ ہوتے۔

کمترین نے بے آواز رولز رائیس پر بھی سواری کی ہے مگر میاں کی ایمبیسڈر بغیر آواز و جنبش اسطرح رواں تھی محسوس ہوا طیارے میں بیٹھا ہوں۔ دو گھنٹے کا راستہ ۲ تیس منٹ میں طے کرکے داخل حضرت گنج ہوئے۔ معتقدین کی کوٹھی پر پہنچے۔ دن نکلا۔ انگلستا

واپس جانے کی اجازت لی۔ کلاکرس اودھ گئے۔ ڈاک طلب کی۔ افسوس کہ نورمن یا نوریما کا ایک بھی خط موجود نہ تھا۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں انہیں ہماری یاد نہ آئی۔ افسوس۔

پھاٹک پر نکلے بختو پہچان گیا۔ دوڑا ہوا آیا۔ "عیش باغ لے چلو بھائی بختو" پچھلی بار دو ماہ نگار خانم کے چکر میں رہے ایک روز وہاں جانے کی توفیق نہ ہوئی۔ ارادہ تھا چلتے وقت فاتحہ۔ "راستے میں گلاب اور اگربتیاں دلواتے چلنا" عربی باجی نے بتلایا تھا روحیں خوشبو پسند کرتی ہیں۔

قبرستان کے نزدیک گنجان بستی آباد ہو چکی۔ ایک مکان کے آگے چند انصاری صاحبان کرگھے لگائے بیٹھے تھے جھینی جھینی بینی چدریا——؟ ایک طرف ایک کھڈے پر سرخ رنگ کی ریشمی ساری تنی ہوئی تھی ایک نوجوان نہایت چابکدستی سے زردوزی میں منہمک تھا۔ رکشا سے اتر کر ہم دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ پل کی پل میں اس نے چند گل بوٹے بنائے۔ نفی میں سر ہلایا۔ ایک طرف سے سنہرا تار کھینچ کر سب ادھیڑ ڈالے۔ دوسری بیل شروع کر دی۔

ڈھال پر اتر کر نئے پھاٹک کے اندر گئے۔ تعجب ہوا۔ چمن خاص اتنا پر فضا بنا دیا گیا۔ شاداب درخت پھولوں کی جھاڑیاں۔ سبزہ۔ طویل پختہ روش پر چلتے اس طرف پہنچے جہاں بڑے ابا کو سپرد خاک کیا گیا تھا۔ تلاش کرتے پھرے۔ حد نظر تک پرانی اور نئی قبریں بالآخر ایک ہرے بھرے درخت کے نیچے انکا مزار نظر آیا۔ دوڑے۔ کتبے پر جمی گرد رومال سے صاف کی۔ راجہ جوّاد علی خان مرحوم و مغفور۔ ۱۶ استمبر ۱۹۴۹ء۔

تینتیس ۳۳ سال سے یہ مزار بے چراغ پڑا ہے۔ اپنے پیاروں کی تربتوں پر آنے والے تمام اہل القبور کے لیے جو جنرل فاتحہ پڑھتے ہیں بے چارے بڑے ابا اسی میں شامل رہے جب کہ نالائق مردود بھتیجا سارے کرۂ ارض پر بدمعاشیاں اور بے ایمانیاں کرتا پھر رہا تھا۔ گلاب کے پھول بکھیرے اگربتیاں سلگائیں۔ فاتحہ پڑھی۔ قلب گداز ہو چکا ہے۔ زاروقطار روئے کوئی گورکن پاس سے گذرا ایک سن رسیدہ صاحب بہادر کو بچوں کی طرح بلکتے

دیکھ کر ٹھٹھکا۔ آگے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک بوڑھا آدمی پانی کی بالٹی اٹھائے آیا۔

"بھیّا—سلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ ہمیں پہچانتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ آپ پاکستان جاتے وقت آخری بار یہاں تشریف لائے تھے۔"

ہڑبڑا کر بالٹی اسکے ہاتھ سے لی۔ بَر دھوئی۔ اسکے ساتھ ملکر جھاڑ جھنکاڑ صاف کیے۔ سُوٹ پر گوکھرو چپک گئے۔ ہاتھوں میں کانٹے چبھے۔ میں دلشاد علی کہ ابلیس سے معاملہ رکھتا تھا۔ خوفِ الٰہی سے تھر تھر کانپا۔ کہ اب خود میرے اور گور گڑھے کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا ہے۔ میاں ایک روز ادھی کے چند اشعار پڑھ رہے تھے وہ یاد آئے — احمدؐ سنگ جو چاروں یارا۔ چاروں سدھ میت کرتارا۔ پہلے ابوبکرؓ جو سانچے۔ پہلے پریم پنتھ وہ راچے۔ دوسرے عمرؓ دین کی کھامبا۔ کین عدل جگت تین تھامبا۔ تیسرے عثمانؓ پنڈت بلہاری۔ لکھ سوپران دین سنساری۔ چوتھے علیؑ سُور جگ بھانا۔ کفر بھنج سب لوگ بکھانا۔ انت گھڑی آوے جبی کون باندھے دھیر— احمدؐ چاروں یار سنگ، کھیں لگادیں تیر—

روش پر واپس آئے۔ ایک بار پلٹ کر دور سے بڑے ابا کو خدا حافظ کہا۔

بڑے ابا جو بھید میں بلا لیے گئے۔

دھوپ ہوا میں اُڑ رہی تھی۔ وسیع قبرستان پر آخری نظر ڈالی۔ پیڑ سرسرائے۔

بھید کا اُپ بن۔

باہر مرنجاں مرنج بخشو رکشا پر نیم دراز اس ٹھاٹھ سے آرام فرما تھے گویا صوفے پر لیٹے ہوں۔ ایک نابینا پیر مرد لاٹھی ٹیکتے، دھوپ میں چمکتی سفید مسجد کے سامنے سے گذرے خیال آیا شاید یہ ان حافظ جی کو جانتے ہوں جنکو ہم نے بڑے باپ کے مزار پر قرآن خوانی کے لیے مقرر کیا تھا۔ دوڑ کر انکے نزدیک پہنچے — "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ بھائی۔"

"حضرت یہاں ایک حافظ جی۔ سنہ انچاس میں ہم نے انکو اپنے بڑے باپ۔

"آپکے بڑے باپ —— راجہ صاحب دھانپور ——؟"

"آپ کیسے پہچانے ——؟"

"آپکی آوازسے پہچان گئے —— ہمیں آوازیں یاد رہتی ہیں۔ آپ عبدالقیوم کو پوچھتے ہیں؟"

"جی —— شاید یہی نام تھا۔ لڑکے سے تھے۔"

"ہم ہی ہیں۔"

"آپ ——؟" دل کٹ کے رہ گیا۔

"جب سے یہیں ہیں۔"

ہم دنیا بھر کے عیب کرنے کے بعد ویسے ہی ٹانٹے، چھیلا بنے گھوم رہے ہیں۔ وہ نوجوان نادار حافظ جی اسوقت ایک بوڑھے نادار حافظ جی۔ یہ سارا عرصہ انہوں نے اسی عیش باغ میں گذارا۔ وہی مسجد۔ وہی جنازے۔ وہی قبریں۔ قرآن خوانی —— اور وہی پرسکون صوت قناعت، رضا و تسلیم کی تصویر۔

ہدیہ پیش کیا کہ بڑے ابا کے مزار پر تلاوتِ کلام مجید پھر شروع کر دیں۔

لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوئی۔ بجنّو بھاگے ہوئے آئے۔ ہم تینوں اوپر گئے۔ وضو کیا۔ بجنّو ہمارے برابر کھڑے ہو گئے۔ دوسری طرف حافظ عبدالقیوم۔ ہم نے نیت باندھی۔

جمعہ پڑھ کر واپس چلے۔ جی تھا کہ امنڈا آرہا تھا۔ قلب کچھ زیادہ ہی گداز ہو چلا ہے۔ رکشا شارعِ عام پر آگئی۔ کچھ فاصلے پر ایک پنج منزلہ، نئی نویلی، چمکتی دمکتی پچی کاری سے مزین گلابی رنگ کی بلڈنگ دکھلائی پڑی۔ اسکی پیشانی پہ لکھا تھا ہٰذا من فضلِ ربّی۔

اہلِ پری محل کو فون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کنور کے گھر جا کر لنچ کھایا۔ انڈین ایرلائینز کے دفتر سے ٹکٹ بنوا کر شام کے چھ بجے حضرت گنج والی کوٹھی پر پہنچے تو وہاں میلہ سا لگا تھا۔ ایک کار قریب آکر رکی، فرخندہ بیگم اور انکے شوہر برآمد ہوئے ان دونوں سے پہلے کئی بار مل چکے تھے۔

"میاں کل سے لکھنؤ میں ہیں ہم ابتک حاضر نہ ہو سکے"۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔

"ہم لوگ تو آج صبح چار بجے یہاں پہنچے۔ کل تو میاں سیتا پور میں تھے"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آٹھ سے نو بجے رات تک تو وہ کل شاہ میناؒ صاحب میں موجود تھے بہت سے لوگوں نے انہیں وہاں دیکھا اور ان سے ملے۔

"انہوں نے ہم پہ بڑا کرم فرمایا۔ ہم آج تیسرے پہر کے میلاد شریف کے لیے بلاوے بھیج چکے تھے۔ عین وقت پر معلوم ہوا جن مولوی صاحب کو مدعو کیا تھا وہ نہیں آسکتے دیکھا ایک مولانا چلے آرہے ہیں کہنے لگے میاں کل شام شاہ میناؒ صاحب میں ملے انہوں نے فرمایا کل میلاد شریف پڑھنے فرخندہ بیگم کے ہاں ضرور چلے جائیے گا ——"

"نہیں صاحب۔ ناممکن کل شام تو ——" میں نے دہرانا چاہا۔ دفعتاً زبان گنگ سی ہو گئی۔ کل رات آٹھ سے نو بجے رات تک سیتا پور کے ان کمروں میں بجلی مدھم پڑ گئی تھی اور میاں دلائی میں منہ ڈھانپ کر استراحت فرما رہے تھے۔ ہڑ بڑا کر زینے پر چڑھا۔ عربی باجی دروازے میں مل گئیں۔ ان سے کہا "لوگ کل شام شاہ میناؒ صاحب میں ——"

"اچانک آنا پڑا ہو گا۔"

وہ کسی کام میں مصروف آگے چلی گئیں۔ میاں ڈرائینگ روم میں مسجد نبویؐ کے رنگین فوٹوگراف کے نیچے دیوان پر تشریف رکھتے تھے۔ لکھنوی لباس حسب معمول سر پہ مانگ۔ کہ یہ خواجگان چشت کا مسلک ہے۔ ہاتھ میں پیچوان کی نے۔ ہم بوکھلائے ہوئے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ رنجن دروازے میں نمودار ہوا۔ یہ سوچ کر فوراً اٹھے کہ اسکو یہ حیرتناک واقعہ بتاویں میاں نے ذرا ڈانٹ کر کہا: "بیٹھے رہیے۔ کہاں جا رہے ہیں"۔

کچھ دیر بعد کھانے کمرے میں پہنچے۔ عربی باجی میزبان بہنوں کا ہاتھ بٹانے میں مشغول تھیں۔ انکو بتلایا۔ وہ سلاد بناتے بناتے بولیں "حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے کہ امت کی کرامتیں جناب رسالت پناہؐ کا معجزہ ہیں آپ کیوں حیران ہوتے ہیں"۔

"حیران؟ ارے صاحب اکیسویں صدی آیا ہی چاہتی ہے"۔

"تو کیا اکیسویں صدی میں ہمارے نبیؐ کی دلیلیں نعوذ باللہ معدوم ہو جائیں گی؟ آپ

ابتک تشکیک کی وادی میں سرگرداں ہیں"۔

"میرا ڈیلیما ہر موڈرن مائینڈ کا ڈیلیما ہے ـــــ" میں نے بیساختہ "سوئیڈش" لیڈی کے الفاظ دہرائے۔ دیوار پر لگے گھڑیال پر نگاہ گئی ـــــ میں ابتک، اتنے مافوق العادت واقعات بچشم خود دیکھنے کے باوجود اس پنڈولم کی طرح یقین اور بے یقینی کے درمیان جھول رہا ہوں، کیونکہ واقعی میرا موڈرن مائینڈ اپنی ہار کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ جنیا ہے رومی ہارا ہے رازی۔ وغیرہ ـــــ ؟

دوسرے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک ضیعف العمر کشمیری پنڈت تشریف فرما تھے۔ ملک کے مقتدر سیاسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن سیاست سے بیگانہ اور رمز آشنائے روم و تبریز معلوم ہوتے تھے۔ وہ میاں کے نفضائل و مناقب بالکل ملفوضات کی زبان میں بیان کر رہے تھے ـــــ " ہمارے شیخ کو ترک و قناعت و فراغت تینوں چیزیں حاصل ہیں جو اولیائے کرام نے مردِ کامل کے لیے ضروری بتائی ہیں۔ دنیا کے اندر رہ کر بے رغبتی۔

" عارفوں کے چاند خواجہ معین الدّین چشتیؒ کا ارشاد ہے کہ ولی کی شناخت یہ ہے اسمیں آفتاب جیسی شفقت ہو۔ زمین جیسی نرمی۔ اور دریا جیسی فیاضی: جمع نہ کرے منع نہ کرے طمع نہ کرے۔" قطب صاحبؒ سے خواجہ غریب نوازؒ نے نصیحت فرمائی تھی کہ ایسی درویشی کرو جس سے تونگری ظاہر ہو"۔

میں دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ میں خود کون ہوں۔ روح کی تاریکی میں اپنے آپ سے جنگ کرتا ہوا ایک جدید انسان ـــــ ہو بہو۔ کسقدر پامال جملہ۔

یَس فیقی بحر پیما۔ یَس ٹائی رِسیس۔ یَس مسز بیرل گرانٹ۔

کمرے میں اسٹائلش بیگمات کی آمد و رفت جاری ہے۔ گو وہ مائیکل اینجلو کا تذکرہ نہیں کر رہیں تخیت رواں کے سین سے سب سے زیادہ لطف اندوز ہونے والے خود میاں ہیں۔ سارے اتھاہ ماضی سے جانے کس قسم کا گہرا پراسرار رابطہ رکھتے ہیں اور حال میں پوری طرح سے شامل ـــــ ایک موڈرن مائینڈ رکھتے ہیں۔ اور قدرت نے ان کو ناقابلِ یقین

روحانی طاقتیں عطا کر رکھی ہیں۔" ناقابلِ یقین ——" میں نے باآوازِ بلند دہرایا۔ کنور دریچے میں آکر بولا —" یار تم ایک شدید قسم کے ذہنی اور روحانی کرائسس سے گذر رہے ہو۔"

"اِس اطلاع کا شکریہ۔"

"تم ہوم سِک ہو۔ گھر جاؤ۔"

ہم دونوں باغ میں اتر گئے۔

" ایک بات بتاؤ۔ تم اور رنجن اور وہ کشمیری پنڈت جی اور وہ ٹاٹ پوش وغیرہ اس قسم کے لوگ اس دیس میں کتنے ہونگے؟"

"تھوڑے سے۔ لیکن ہیں تو سہی۔"

" DYING BREED؟"

"شاید یہ روایت ——" کنور نے ایک برڈ باتھ کے نزدیک بنچ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا، "ختم ہونے والی نہیں۔ ان گنت غیر مسلم میاں کے حلقۂ ذکر میں شامل ہوتے ہیں۔"

ہم اپنی بات پر اڑے رہے ——" ایک ہزار سال تو یہاں صوفیوں اور سنتوں نے اپنی سی کر ڈالی لیکن آسام میں آج بھی قتلِ عام ہوتا ہے۔"

"جیزس کرائیسٹ کی اُمّت دو ہزار سال سے ساری دنیا میں خون کی ندیاں بہا رہی ہے۔ بدھسٹ چینی جاپانی زبردست مارکاٹ میں ہمیشہ سے جُٹا ہوا ہے۔ گوتم کی اہنسا کا اس پر کوئی اثر تو ہوا نہیں۔ ٹھیک ہے۔ یہاں بھی بے شمار صوفی اور سنت آشتی کا پرچار کرتا رہا ہے۔ لیکن تشدد اور منافرت ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ لہٰذا اہل اللہ کو چاہیئے کہ اپنی کوششیں ترک کر دیں۔"

"اسقدر کریشن۔ تم خود ہی بتا رہے تھے اس روز ——"

"کردار کا کرائسِس ساری تھرڈ ورلڈ کا مسلہ ہے۔ چنانچہ —— اگر میاں کے ایسے نیک بندوں کے اثر سے فرداً فرداً لوگ بہتر انسان بن جائیں تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟ بہت سے ضمیر فروش میاں کے ہاں پہنچ کر سُدھر گئے۔ ارے ہم خود دیکھتے ہیں اکثر نیتا لوگ آکر میاں سے درخواست کرتے ہیں دعا فرمایئے کہ ہم منسٹر ہو جائیں۔ یا کاروبار میں ایک کروڑ کا

فایدہ ہو جاتے۔ میاں انکو بہتر خیالات کی طرف مایل کر دیتے ہیں۔ تمہاری جو لندن میں ایکسپورٹ امپورٹ کی بزنس ہے ـــــ اگر اسمیں کچھ گھپلے بازی نہیں کرتے صحیح قسم کا بیوپار ہے میاں کے فیض سے ضرور تم کو فایدہ ہوگا تم اس روز بتلا رہے تھے کہ سہارنپوری فرنیچر برطانیہ میں امپورٹ کرنا چاہتے ہو ـــــ"

ہم خاموش رہے۔ ایکسپورٹ امپورٹ۔ گوری پیلی سانولی کالی چھوکریوں کی درآمد برآمد۔ نہایت اسٹریم لائینڈ مہذب بردہ فروشی۔ ان لڑکیوں کی رضامندی کے ساتھ۔ بچپن میں ہم دھانپور میں دیکھا کرتے تھے ہماری فاقہ کش کسان عورتیں اپنی بچیوں کو سوا روپیہ اور ڈلیا بھر کودوں کے بدلے عمر بھر کی غلامی کے لئے بیچ جاتی تھیں۔ انکو کلمہ پڑھا کر شاعرانہ فارسی نام رکھے جاتے تھے۔

ساری عمر وہ ہمارے ہاں چکیاں پیستی تھیں گرمیوں کی طویل دوپہروں میں تپتے برآمدوں میں بیٹھ کر پنکھے کی ڈوری کھینچتی تھیں جب ننھی نو بہار باہر ڈور کھینچتے اونگھنے لگتی پنکھے کی رفتار دھیمی پڑ جاتی تھی ہمیں اچھی طرح یاد ہے ہم اپنے چھپر کھٹ پر لیٹے لیٹے ڈور کو پاؤں کے انگوٹھے میں پکڑ کر زور سے جھٹکا دیتے۔ پنکھے کی جنبش فوراً تیز ہو جاتی۔ سوا روپیہ اور ڈلیا بھر کودوں۔

اب ہم لوگ فینشن ایبل، چاتر، بھولی بھالی، ہر قسم کی لڑکیوں کی خرید فروخت ٹوکروں پٹرو ڈالرز ادر مارک اور فرینک اور ہر قسم کے سکہ رایج الوقت کے ذریعے کر رہے ہیں۔

بوسٹن میں ایک بار ڈاکٹر منصور کاشغری نے بتلایا تھا کہ بمبئی کے جنرل وارڈ میں کوئی مرنے والا ہوتا ہے وارڈبوائے ڈاکٹر کو جا کر اطلاع دیتے ہیں سہ انمبر خلاص ہونا مانگتا۔

ہم لوگ سوئیس بنکوں کے گمنام اکاؤنٹس کے خفیہ نمبروں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور شاید اب ہم بھی خلاص ہونا مانگتے ہیں۔

تیسری منزل کی کھلی چھت پر یہاں بھی رت جگا۔ سامنے کچھ فاصلے پر حضرت گنج میں وضع جدید کا رومن کیتھولک کیتھڈرل استادہ تھا۔ اسکے فلک بوس مخروطی SPIRE پر

سرخ صلیب جگمگاتی رہتی۔ سیاہ مخمل پر چمکتا یاقوت ——

اِمشب ایک جمبو جیٹ فراز کلیسا پر سے پرواز کرتا جہان اوّل کی سمت نکل گیا۔ تاریکی میں اسکی جلتی بجھتی سرخ بتیاں کچھ دیر تک نظر آیا کیں۔ اہلِ تثلیث، آلِ موسیٰؑ، اشتراکی ملاحدہ ہی جدید سائنس کے بانی اور ماہر۔ اب آنکھیں میری باقی انکا نہیں۔ میری آنکھیں بھی انہیں کی ہیں جن سے ہم ساری زندگی کو دیکھ رہے ہیں۔ جدید اہلِ ایمان کی یہ تہی دامنی کہ بنیاد پرست عنبر کو بھی برائے علاج ادھر ہی جانا ہے۔ ان ہی کے ایجاد کردہ طیّارے پر۔

حسب عادت اپنے آپ سے مباحثہ کرتے ہوئے وہیں مہتابی پر بیٹھے بیٹھے ایک اور نکتہ سوچا۔ سائنس میں بھی ایک فیکٹر ایکس ہوتا ہے۔ مخدوم کی دعا سے اپنے معذور لاعلاج بچّے کی حالیہ صحتیابی کا تذکرہ تو ایک خاتون کل ہی کر رہی تھیں۔

لہٰذا اپنے ذہنی تحفظّات کے باوجود نچلی منزل میں جاکر کاشغری کو فون کیا۔

"منصور عنبر کی حالت کیسی ہے ——؟"

"بُری"

"تم ایسا کرو —— کہ انہیں لیکر فوراً یہاں آجاؤ" کوٹھی کا پتہ بتایا۔

"کیا کوئی امریکن سائیکٹرسٹ وہاں آیا ہوا ہے؟"

"نہیں ایک بہت پائے کے صاحب تصرّف چشتیہ بزرگ ——"

"وَدَٹ —؟" منصور دوسرے سرے پر دہاڑا "حضور والا پہلے یہ بتائیے آپ اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے؟ ہوٹل میں آپکو ڈھونڈ ڈھونڈ انگار خانم بنگلور سے آگئی ہیں ان سے پوچھا۔"

"بس۔ ذرا ادھر ادھر گھوم رہے تھے عنبر کو لے کر فوراً پہنچو یہ ایک بہت بڑے ولی ہیں۔"

"بھائی دلشاد علی۔ آپ کے دماغ پر بھی اس CRAZY ملک کا اثر ہوگیا؟ آپ کو کس نے HYPNOTISE کیا؟"

"سنو تو ——"

"ہوکس پوکس۔ ممبو جمبو۔ وُوڈُو۔ چھومنتر؟ مجھے تو اب آپکے دماغی توازن کے متعلق بھی فکر ہوگئی۔ FAITH HEALERS اور WITCH DOCTORS"

محسوس کیا کہ میں اور وہ دو بالکل متضاد زبانوں میں گفتگو کر رہے ہیں۔

"آپکے مزاج میں شدت تو ہمیشہ سے تھی۔ جو لائین پکڑی اسمیں غلو فرمایا۔ اب اس لائین میں اگر کچھ سکون مل رہا ہے تو ٹھیک ہے۔ لگے رہیے۔ مگر خان صاحب۔ شرک اور بدعت سے بچیے۔"

تحمّل کے ساتھ جواب دیا "واقعی؟ لیکن بھائی ڈاکٹر اس روز پری محل میں تو تم شہوار کے سامنے لکھنؤ کے محرم کی مدح سرائی کر رہے تھے۔"

"محض اسکی تہذیبی اور تاریخی اہمیت کی حد تک۔ باقی یہ کہ ہولبن جولبن ہوکس پوکس — اچھا خیر۔ ایک بات بتائیے۔ میں عنبر کو باہر لے جا رہا ہوں۔ آپ ہی نے روزین باؤم کا ذکر کیا تھا۔ انہیں ذاتی طور پر جانتے ہیں؟"

"بچوں کے ذریعے۔ انکی لڑکی اخبار میں نورمن کے ساتھ کام کرتی ہے۔"

برطانوی سائیکٹرسٹ کا پتہ نوٹ کرواکے فون بند کیا۔

انکی قسمت میں نہیں ہے۔

آج شام تخت والے کمرے میں "سوئیڈش" لیڈی نظر آگئیں۔ غرارہ پہنے قرینے سے سر ڈھانپے عورتوں کے ایک گروہ میں قالین پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ارے آپ ابھی سوئیڈن نہیں گئیں؟"

"چلے جائیں گے۔"

"کابچوں کے متعلق کیا ہوا؟"

"وہ بھی ہو جائے گا۔ میں تو یہاں روز حاضر ہوتی ہوں۔ آپ نے بھیڑ میں دیکھا نہیں۔ ماموں جان بھی آتے ہیں۔"

"اچھا — وہ دُہری والے ماموں —؟"

جھینپ گئیں۔ "ہم لوگ ٹبلر گنج میں ٹھیرے ہیں۔ آپ۔؟ علی گنج؟ اچھا ایک بات بتائیے مجھے حیرت اس چیز پر ہے کہ اتنا اوتھنٹک جنیوین صوفی اور ویسٹ اس سے ناواقف:"

"آپکو تو ویسٹ کا سودا ہے۔ ایسٹ کے محض ایک خطّے کے لوگ جان گئے ہیں تو انکو پل بھر آرام نہیں۔"

کنور رانی پرتیبھا دیوی کمرے میں آئیں۔ ہمیں دیکھ کر ہلکا سا گونگھٹ کاڑھا۔ کہ "جیٹھ" سے کانا پردہ انکی سوسائٹی میں واجب ہے۔ بولیں: "میاں وزیر گنج گئے ہوئے ہیں وہاں سے سیدھے شاہ مینا" صاحب آئیں گے۔ یہ کہہ رہے ہیں وہیں چلے چلیے۔ باجی آپ بھی"

یہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ مسز خان نے کہا "کل ایک جگہ ڈنر پر ایک نک چڑھی بی بی سے ملاقات ہوئی۔ وہ نکلیں۔ آل انڈیا فیم کی ناولسٹ۔ نگار خانم ——"

کنور رانی بولیں —— "اوہ نگار خانم —— ! نواب بائی جے پور والی کی۔ ——"

"نواب بائی؟" مسز خان نے بیصبری سے بات کاٹی۔ "کون تھیں؟ اور بتائیے —— اور۔"

"تھیں ایک پرانے زمانے کی گراموفون سنگر —— پی —— یو نو وٹ آئی مین:"

"اوہ —— پی —— !!"

دونوں خوب ہنسیں۔ کنور نے ڈرائیو کرتے کرتے مڑ کر اپنی دھرم پتنی کو ڈانٹا ——

"تم عورتوں کی یہ کتنی بُری عادت ہے ——"

"ہم کوئی اپنی طرف سے تھوڑا ہی جوڑ رہے ہیں۔ سارا لکھنؤ جانتا ہے۔ بیپر زمیں نکل چکا ہے —— "

"آل رائٹ۔ شٹ اپ:"

"بیپر زمیں —— کب؟" مسز خان نے کہا: "جبھی —— جیسے ہی وہ گئیں انکی ایک سہیلی نے بتایا آجکل بے چاری بہت دُکھی ہیں —— انکا منگیتر اڑنچھو ہو گیا۔ بھتیجی بھاگ گئی۔ گننے کی آنکھیں کمزور ہو گئیں —— !"

"کتے کی آنکھیں کمزور ہوگئیں — ؟ جبھی منگیتر اور بھتیجی بھاگ نکلے" اپرنیمبا دیوی نے شگفتگی سے کہا۔

وہ دونوں اب کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ ہم دم بخود۔ اور تب، اس لمحے دل ہی دل میں میاں سے التجا کی — آپ نے ابتک میری عیب پوشی کی ہے اب عین میری روانگی کے وقت سینڈی کے آگے میرا بھانڈا نہ پھوٹے — ہم اس نیک نفس آدمی سے آنکھیں کسطرح چار کرسکیں گے۔ میاں — پلیز — اب آنکھوں کی سوئیاں باقی رہ گئی ہیں — پلیز —

یاد آیا، نورمن نے یہاں سے واپس جاکر بتایا تھا۔ ایک رات پری محل میں اتفاقیہ میرا ذکر نکل آیا تھا اور وہ تھرتھر کانپا تھا کہیں اسکا راز فاش نہ ہوجائے کہ وہ خالص انگریز نہیں۔ بازی گر باپ بیٹے اپنی اپنی جگہ دونوں تلوار کی دھار پر چلتے ہوتے۔

گو اسی اتفاقیہ تذکرے کی بدولت ہم ولائیت سے لکھنؤ نگار خانم کو بلیک میل کرنے پہنچے۔ محض چھ ماہ قبل آج وہ کسی اور زمانے کسی اور دنیا کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اب ؟

مسز خان کی گفتگو جاری تھی۔" نگار خانم نے جڑاؤ ساون جھڑی گلے میں پہن رکھی تھی۔ انکے جانے کے بعد انکی عزیز سہیلی نے یہ بھی بتایا کہ ایک خستہ حال وثیقہ دار بیگم سے کوڑیوں کے مول خریدی ہے۔ ایسی خوبصورت ساون جھڑی رانی صاحب کہ کیا بتاؤں میری ممانی جان اور آپا دونوں انکے ناول بہت پڑھتی ہیں اسی وجہ سے میں ان سے خصوصیت سے ملی۔ بلکہ میں تو سوچ رہی تھی اپنے فوٹو فیچر کے لیے بطور ایک پاپولر انڈین وومن ناولسٹ انکی ایک آدھ تصویر بھی لے لوں — ان سے کہا۔ ایکدم بھڑک گئیں۔ کیسی تصویر — ؟ آپ کون ہوتی ہیں میری تصویر کھینچنے والی۔ سوری۔ نو فوٹو۔ نو کمنٹ — باپ رے اتنی بد دماغی — اور ہیں دراصل ایک پی کی اولاد — توبہ —"

"مسز خان —!" کنور نے اب انہیں ڈانٹا — وہ واقعی سادھو آدمی بن چکا ہے۔

شاہ مینا رُوڈ پہنچے تو معلوم ہوا پاٹے نالے پر "سیہ سنی" ہوگیا۔ راستے بھر ہم دیواروں

پرچسپاں نفاق بین المسلمین کے جلسوں کے بڑے بڑے اردو پوسٹر دیکھنے آرہے تھے اب جالی دار ڈھالیں سنبھالے، بلوہ کنٹرول کرنے والی پولس کے دستے مارچ کرتے نظر آتے رہے۔
"خدا خیر کرے" کنور نے درگاہ کے پھاٹک پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ مجھے بڑی شرم آئی۔

میڈیکل کالج کمپاؤنڈ میں گہما گہمی۔ سلاطینِ شرقیہ کے لکھنؤ میں مدفون شاہ مینا رحؒ صاحب کے مزار پر عرس۔ اسی گومتی کے کنارے آباد "شیراز ہند" جونپور کو دلّی کے بہلول لودھی نے اجاڑا تھا۔ زوال لکھنؤ کے مرثیہ خواں ہر گلی کوچے میں موجود ہیں — سقوط جونپور کے نوحہ گروں کو ناپید ہوئے بھی پانچ سو برس گذر گئے۔
میلے کی بھیڑ چیرتے مخدوم کے شامیانے کا رخ کیا۔ وہ دور ہی سے دکھلائی دے گئے۔ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ ناپید۔ درمیانی گذرگاہ پر چلتے انکے نزدیک پہنچے۔ ایک کھمبے کے پاس منجو صاحب مل گئے۔ طبیعت سے "ٹریفک" کنٹرول کرنے میں مشغول۔ بولے۔ سیدھے ہال میں چلے جایئے۔
ہال کی بیرونی دیوار میں کوئی دروازہ نہیں تھا ایک سلاخوں دار بند کھڑکی کے نیچے مسند پر سرکار تشریف فرما۔ سلام عرض کرتا چار قدم آگے بڑھا۔ ہم چاروں صحن میں داخل ہوئے۔ ہال کے پہلے دروازے پر شہر کی برقعہ پوش عورتوں کا جمگھٹ۔ سب اندر جھانکنے کی کوشش میں مصروف۔ میاں تو ابھی باہر تشریف رکھتے ہیں ممکن ہے اس دریچے میں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن اسکے پٹ بھی بند ہیں۔ بدقت تمام اسی دروازے سے اندر پہنچے۔ تو میں ہیبت زدہ رہ گیا۔
میاں ہال میں اپنے تخت پر متمکن تھے۔

"سینڈی۔ سینڈی۔ میاں تو ابھی، ابھی چند سکنڈ قبل باہر شامیانے میں ——"
"باہر —؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔ بلکہ مجھے تعجب ہوا۔ کہ انکی خالی مسند کے پاس سے گذرتے ہوئے تم نے اتنے ادب سے سلام علیکم کسے کہا تھا؟"

اوڈیکل الوژن؟ پرسوں رات کا شعری ٹیلی فون پر ہی پہچان گیا تھا۔ عنبر کی طرح میرا بھی کریک اپ ہوتا جا رہا ہے۔ میں بھی ہیلوسی مینشن کا شکار ہو چکا ہوں۔ اب کس کے پاس جاؤں؟ اب میں بالکل تنہا ہوں۔

"آر یو آل رائٹ ــــ؟ تمہارے سر کے بال کھڑے ہو گئے ہیں۔ تمہارا رنگ فق ہے۔ اور تم لرز رہے ہو۔ تم ایسے دہشت زدہ نظر آتے ہو جیسے ارجن جب مہا بھارت کے میدان میں انکے الوہی رتھ بان نے انکو اپنی لیلا دکھلائی تھی۔ اپنا سروپ"

"سینڈی۔ سینڈی۔ دراصل یہ کون ہیں؟"

"قطب الاقطاب۔ تم ابتک نہ پہچانے۔ ری لیکس۔ ٹیک اِٹ ایزی یار۔"

چاروں طرف طایفہ محبّان کے مانوس چہرے۔ باجیاں۔ ڈیریاں۔ رانی صاحب فرخندہ بیگم۔ رنجن۔ لوچیا۔ فنومنولوجی کے پروفیسر۔ مسز خان۔ پرتیبھا۔ خانوادوں کی پی۔ ایچ۔ ڈی لڑکیاں۔ حضرت گنج کے میزبان۔ تہجد گذار بی بی۔ بوڑھا سنیاسی۔ نجانے کون کون۔

کیا یہ سب لوگ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں؟ یا محض اندھی عقیدت سے سرشار؟ وکٹورین انگلش بولنے والا یہ برہمن سادھو بہت دور سے پیدل چل کر حضرت گنج والی کوٹھی پر بھی آتا ہے کہ سواری استعمال کرنا شاید اسکے مسلک میں ممنوع ہے۔ اور چپ چاپ بیٹھا شیخ کو تکا کرتا ہے۔

انہوں نے اسے بلا کر اپنے پاس تخت پر بٹھالا۔ آبخورے میں دودھ منگوایا۔

تالیف قلوب۔ مروّت۔ خوش خلقی۔ مہمان نوازی۔ کامل بے نفسی۔ حکایت و تمثیل کے ذریعے پند و نصائح کہ اہل طریقت اعلانیہ نصیحت کو ملامت گردانتے ہیں۔ دوسروں کی دل شکنی سے احتراز۔ صوفیائے کرام کے طریق ــ مروّجہ ذہنی روّیوں فیصلوں اور اصولوں پر کار بند رہتے ہوئے اچانک ایسے طرزِ عمل سے واسطہ پڑے جو گذشتہ ادوار سے تعلق رکھتا ہے ــ عشق کی تقویم میں اور زمانے حاضرین اُس تقویم

سے بھی منسلک ہیں۔ اس لیے سکون سے بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ کچھ دیر قبل میں نے مخا
کو بیک وقت دو جگہ دیکھا اور یقیناً میں صحیح الدماغ بھی ہوں۔ وہ پنڈتائین دیوار
لگی بیٹھی تھیں جو آرتی اتارے بغیر اپنے برت نہیں توڑتی تھیں۔
" سندھیا کا وقت تو ہو گیا " میں نے نارمل بات چیت کی غرض سے انکو یاد دلا
" اب ہم انکی آرتی نہیں اتارتے "
"منع کر دیا ؟"
"منع وہ کسی چیز کو نہیں کرتے۔ ہم نے خود بخود چھوڑ دی "

طویل القامت "سدا سہاگن"، چھم چھم کرتی آن کر ایک دہلیز پر بیٹھ گئیں۔ ایک
قصباتی مسلمان گویا ڈفلی لیے اندر آیا۔ دیوہ شریف میں اس نے ایک چیز سنائی تھ
اسکے چند بول مجھے یاد رہ گئے تھے۔ بھاگ جاؤ۔ گھوم جاؤ۔ ویدراج لوٹ جاؤ
ویدہیں بنواری لال تم ہوانا ڑی۔ اب اس نے تخت کے سامنے جا کر ایک کبیر بانی چھیڑی
کمُدنی نکوڑی اندھریا میں ناچے۔
میں نے اس سے ویدراج والے گیت کی فرمائش کی۔ کہ وہ کاشغری اور روین با
دونوں کو کس اطمنان اور سادگی سے چلتا کر چکا تھا۔ اس نے دف اٹھا کر الاپنا شروع کیا
بھاگ جاؤ۔ گھوم جاؤ ــــ میاں کو مخاطب کیا " تم ہو اودھ بہاری۔ قاسم ہیر
اناڑی ــــ "
پچھلی بار یہ گانا سنکر سینڈی سے ہم نے کہا تھا برج اور اودھیا کی تلمیحات ایسے
زمانوں میں نظم کی گئیں جب ان شاعروں کو اپنی شناخت اور تشخص کھو دینے کا خدشہ
نہ تھا۔ اور زندگی اتنی گنجلک نہیں ہوئی تھی۔ اسی ہال میں ایک غریب دہقان مسلم
اکڑوں بیٹھی نیچی آواز میں اودھی کے کبت دہرائے جا رہی تھی جن میں سالار مسعودؒ دو
اولیاء اور آخر میں میاں کے نام آتے تھے۔ وہ ان بقراطی سیمناروں سے ناآشنا تھی
اس کے بارے میں منعقد ہوتے ہیں اور جن کی موشگافیوں کے فوائد اس تک نہیں پ

ڈفالی کے بعد ایک جواں سال مسلمان سابق راجہ صاحب نے پیر کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر ترنم میں اپنی حقانی غزل پیش کی۔

آہ — ! ارزو تہذیب !! — اعلیٰ تمدن جتنے دقیع ہوتے ہیں اسی قدر دیرپا کیوں نہیں ہو پاتے۔ گومتی کے ساحل پر پانچ سو سال قبل شیراز ہند بھی تو جگمگاتا تھا۔

باہر شیخ کا لنگر تیار ہو رہا تھا۔ قلعے سے آئے ہوئے کپوٹ قلندر نے صحن میں نعرہ حیدری بلند کیا — لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار۔ وولف بوائے زور سے چلایا — حق حق حق — آل محمدؐ آل محمدؐ آل محمدؐ —

اس احاطے سے چند فرلانگ پر مسلم افتراق کا پیشن پلے بھی جا رہی ہے۔

لڑکے نے اندر آکر اپنی بے ربط تقریر شروع کر دی۔

ٹھیک ہے بھائی وولف بوائے۔ تمہاری طرح میں بھی بھیڑیوں کے بھٹ سے نکلا۔ اور اب ایک مخفی زبان سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ہمارا کیمبرج کا تعلیم یافتہ بیٹا بہزاد نور من BEATIFIC VISION کی بات کرتا ہے۔ اس سے پچھلی نسل کے نوجوان اسی چکر میں BEAT GENERATION کہلانے لگے تھے۔ وہ ایل۔ ایس۔ ڈی کھا کر ہیلوسی نیشن دیکھتے تھے۔ چنانچہ امریکہ میں ہم خفیہ فروشوں کی چاندی ہو گئی۔ گو ہم نے کسی قسم کا فیشن ایبل نشہ، بھنگ، چرس، ایل، ایس، ڈی وغیرہ کبھی نہ چکھا تھا۔ کہ یہ نوجوانوں کی لت ہے۔

ہماری نوٹ بک اب قریب الختم ہے۔ چند صفحات باقی رہ گئے ہیں۔ اعمالنامہ۔ اگر یہ انسٹرپول کے ہاتھ لگ جائے ؟

میاں حج کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں۔ انکو رخصت کرنے کے لیے آنے والوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ وسیع باغ میں خیمے نصب کیے گئے۔

کمرے مہمانوں سے بھر گئے۔ رات کو فرش پر بستر بچھائے جاتے ہیں۔ دوسرے شہروں

سے قافلے آآ کر اتر رہے ہیں۔ احاطے میں دیگیں گاڑدی گئیں۔ درگاہ شاہ مینأ صاحب سے باورچی آئے۔ لنگر جاری ہوگیا۔ اوپر کمروں میں خوبصورت امام ضامنوں اور گلاب کے بھاری ہاروں کا انبار لگا ہوا ہے۔ میاں کے رشتے دار اور لواحقین گاؤں سے لکھنؤ پہنچ چکے ہیں۔ صبح سویرے باغ میں وہ سرخپوش برہمن فقیر بانسری بجاتا ہے ماہرِفن نے نواز ہے تر و تازہ گھاس میں۔ چمکتی بارش کی ننھی منّی جھیلوں کے کنارے لوگ کرسیاں ڈالے گھنٹوں منتظر رہتے ہیں۔

اس آخری شام ہم نے اپنا BEATIFIC VISION دیکھا۔

دوسری منزل کے صحن میں حسب معمول بیحد ہجوم تھا۔ میاں کے ایک مرید کا آپریشن ہونے والا تھا۔ وہ اسے دیکھنے ہسپتال جا رہے تھے۔ نہانے کے بعد اپنے کمرے میں دروازے بند کیے عبادت میں مصروف تھے۔ پھر دروازہ کھلا وہ سفید براق کپڑے پہنے کمر میں سُرخ پٹکا باندھے دو پلّی ٹوپی اوڑھے شہزادے ایسے، تیزی کے ساتھ کمرے سے نمودار ہوئے۔ ہم سامنے کھڑے تھے۔ ایک اچٹتی سی نگاہ ہم پر ڈالی۔

اس لمحے ہم نے BEATIFIC VISION دیکھا۔

میاں بسرعت زینہ اتر کر نیچے گئے۔ کار میں بیٹھے۔ ہاتھ باہر نکال کر دو انگلیوں سے "وِکٹری" کا نشان بنایا اور مسکراتے ہوئے پھاٹک سے نکل گئے۔

کل صبح حج کے لئے روانہ ہوئے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اجتماعی ہسٹریا۔ اموسی جانے والوں کے لئے اسپیشل بسیں چلائی گئیں۔ ایرپورٹ اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ چند آدمی بیہوش ہوگئے۔ عورتیں زار و قطار آنسو بہا رہی تھیں۔ حیرت انگیز۔

مُرآری جب بندرابن سے جاتے تھے گوپیاں اسیطرح روتی تھیں۔ میاں کی وَیشنو بھگتنوں کو دیکھ کر ہم نے سوچا۔

آج صبح بالآخر اموسی کے لیے تیاری پکڑ رہا تھا گیسٹ روم کے دریچے سے

بختو دکھلائی دیے گئے ،ٹینڈی کی مرسیڈیز کے نزدیک اپنی چرّخ چوں رکشا کھڑی کیے صبر سے منتظر تھے ۔ فوراً باہر گیا۔

" سلام حضور "۔ کوری مارکین میں لپٹے دو عدد امام ضامن جیب سے نکالے ۔

"کل دوپہر ہم حضرت گنج گئے تھے ۔ معلوم ہوا آپ آج سدھارنے والے ہیں۔ حضور جانے سے چند روز قبل بھائی حسین بخش نے ہماری بی بی سے کہا تھا بھیّا ولایت لوٹ رہے ہیں انکے لیے امام ضامن سی دیجئے۔ ایک چمکتا روپیہ گومتی میں غوطہ دیکر پاک کرلائے تھے ۔ یہ دوسرا امام ضامن ہماری طرف سے باندھ لیجئے "۔

" شکریہ بختو۔ آپ لوگوں نے بڑی زحمت کی ۔ حسینی کہاں چل دیے ؟"

انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔" آپکو نہیں معلوم ؟ اسی امام ضامن کیلئے زر دوزی کا سامان خریدنے شہر گئے ۔ جمعرات کی شام ۔ پاٹے نالے پر شیعہ سُنّی شروع ہوگیا ۔ بھگدڑ مچی ۔ جان بچانے کے لیے یہ بھی دوڑے ۔ بوڑھے آدمی ۔ دھان پان ۔ گر پڑے ۔ سر میں چوٹ آئی ۔"

" پھر ـــــ؟"

" رات کا وخت ۔ کرفیو ۔ خود ہی گرتے پڑتے رکشا کرکے ماشا پہنچے ۔ سسٹر نے منصور بھیّا کے گھر ٹیلی فون کیا ۔ وہ پری محل گئے ہوئے تھے ۔ دعوت میں ۔ وہاں کا نمبر ملایا ۔ ان بے پرواہ لوگوں نے بہت دیر بعد ڈاکٹر صاحب کو خبر دی ۔ وہ فوراً دواخانے پہنچے ۔ خانساماں جی کو بچانے کی پوری کوشش کی ۔ مگر انکا ٹیم آچکا تھا ۔ کل انکا تیجا بھی ہوگیا ۔"

میں سنّاٹے میں کھڑا امام ضامنوں کا نفیس کارچوب دیکھا کیا۔

اب بختو نے سفید رومال میں بندھا کٹوردان رکشا میں سے برآمد کیا۔

" ابھی ایک روز اللہ بہشت میں جگہ دے وہ مرحوم ہم سے کہنے لگے جو آپکے من بھاتے کھانے وہ جا پلنگ روڈ پر پکایا کرتے تھے آپکے تشریف لے جانے سے قبل وہی خاصہ تیار کریں گے ۔ کہنے لگے ۔ عنبر بٹیا بیمار ۔ بیگم صاحب پریشان ۔ ورنہ بھیّا کو کوٹھی پر بلاتے ، اب

ٹفن باسکٹ سینڈی بھیّا کے بنگلے پر پہنچا دینگے۔ ہمیں انکی یہ بات یاد رہی۔ سرکار ہماری گھروالی نے وہی چیزیں پکادی ہیں راستے کے لیے"۔ چند سکنڈ بعد ذرا جھینپ کر بولے "ارے ہمیں پتہ ہے ہوائی جہاز میں ولائتی کھانا ملتا ہے مگر تھوڑا سا یہ بھی چکھ لیجئے گا۔ حسینی بھائی مرحوم کی روح خوش ہو جاوئیگی"۔ پھر سوچ کر کہا "مگر ولایت میں تو ہم نے سُنا ہے بھکاری ہوتے ہی نہیں۔ امام ضامن کے روپیے کس کو دیجئے گا"؟

سب سے زیادہ حاجتمند بھکاری ہم خود ہیں۔ بھائی بخشو۔ یہ دو مقدّس سکّے ہم اپنے آپ کو دینگے۔ جان گریفیٹن کو ابتک کئی سِلور شلنگ مِل چکے ہیں۔

مبتلائے بحث کو رازِ خدا کی کیا خبر۔ معنی بے لفظ و لفظ بے صدا کی کیا خبر (اکبر الٰہ آبادی)

مگر رازِ خدا سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ بخشو کے جانے کے بعد سُن سا اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ واہ صاحب واہ۔ کیا رازِ خدا ہے اور کیا قدرت کا انصاف۔ مسز بیگ سے آخری ملاقات کے لیے جب گیا تھا وہ تازہ اخبار میں کسی ضمنی الیکشن کی رپورٹ پڑھ رہی تھیں فرمایا۔ ایک مرتبہ حُسین بخش کہہ رہے تھے بیگم صاحب ہماری کیا اوقات کہ ان معاملوں میں زبان کھولیں۔ مگر ووٹ بھی تو ہمیں سے مانگنے آتے ہیں۔ ہم کس کو ووٹ دیں؟ ان لڑنے لڑوانے والوں کو؟ دنگوں میں غریب ہی مارے جاتے ہیں۔ پھر بولیں۔ 'لیکن ٹھاکر صاحب اگر آپ نے ہندوستان کو خیر باد نہ کہا ہوتا۔۔۔"

انکی بات کاٹی "یہ کوئی اہم یا تاریخی واقعہ نہیں مگر ۱۹۴۷ء میں اپنی پرانی جگہ سے حُسین بخش کو میرے ہاں آنا پڑا۔ میں بھی اپنے متوسلین کو بے آسرا چھوڑ کر چلا گیا"۔

"جی اگر نہ جاتے اور سیاسی اکھاڑے میں آپ بھی بقول منصور کودی مارتے تو یقیناً اپنے سابق علاقے اور ضلع کے بیشتر ووٹ آپ ہی کو ملتے۔ سابق والیان ریاست عام طور پر انتخاب جیت جاتے ہیں"۔

"شاید اسوجہ سے کہ اکثر نئے حکمراں بہتر ثابت نہیں ہوئے"۔

"مائی باپ سنڈروم! لہذا ثابت ہوا کہ وہ پرانا نظام بہتر تھا کیونکہ کبھی کبھی آپ لوگ

پنی رعیّت کے ساتھ پدرانہ شفقت بھی برتتے تھے! مینر ہاؤس اور کاٹیج والا غمخوار آقا ورد فادار رعایا کا رشتہ! یوں تو اب آپ اگر چاہیں تو ایک انگلش کنٹری اسکوائر بھی نظر سکتے ہیں۔"

۵۶ء میں وکٹوریہ جہاز پر وہ میرے نئے بہروپی "کریر" سے واقف ہو چکی تھیں۔ ڑی کہہ گئیں۔ بات ہمیشہ کڑوی کرتی ہیں۔ لیکن اکثر صحیح۔ جنوری میں جب حسین بخش مرحوم پہلی بار دوڑے دوڑے مجھ سے ملنے ہوٹل پہنچے دیر تک باہر کھڑے رہے۔ مجھے دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ آنکھوں میں آنسو۔ میں بھی ان سے اسی "پدرانہ سرپرستی" سے ملا تھا۔

مسز بیگ حسب معمول بحث کے موڈ میں تھیں۔ چنانچہ عرض کیا "اپنی تمام خرابیوں کے باوجود کردار سازی فیوڈلزم کا ایک وصف تھا۔ آج کردار کی تباہی — ہم اپنے نہیال کے پرانے خدمتگاروں کو ماموں پکارتے تھے۔"

"آں۔ ہاں۔ انکل ٹام —!"

"سن رسیدہ نوکروں اور ہندو مسلمان اہل محلہ اہلِ قریہ بڑے بوڑھوں کی عزّت۔ لوئی دادا۔ کوئی نانا۔ کوئی چاچا۔ مذہبی تعصبات مفقود۔ کردار کی پختگی۔ ادب لحاظ۔ تمیز۔ حفظ مراتب۔"

"حفظ مراتب! آج جمہوری عوام خصوصاً ہریجنوں کی نئی خودداری اور سیاسی شعور لو آپ جیسے صاحبان انکی بدتمیزی اور اکڑ سمجھتے ہیں!"

معلوم ہوتا ہے عندلیب بیگ پیدائشی طور پر حزب مخالف سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور بے پناہ ریڈیکل۔ مگر حسینی باورچی انکے سامنے بھی مودّب کھڑا رہتا تھا۔ انہوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو نہ کہا۔

اچھا صاحب۔ جنّتی حُسین بخش اور بھولے بھالے میاں بختو جو سائیکل رکشا لیے ہنوز دم کھینچ رہے ہیں۔ الوداع!

پالم انٹرنیشنل ایرپورٹ۔ شیواس ریگال کے بجائے میلی المونیم کا چھوٹا سا

ناشتے دان جو میرے بڑھیا اسباب کے ساتھ رکھا عجیب لگ رہا ہے۔ ہمسفر اچٹتی نظروں سے کبھی مجھے دیکھ لیتے ہیں کبھی اسے۔ ذرا لرزاں ہاتھوں سے ڈھکن کھولتا ہوں میری پسندیدہ چیزیں۔ جو حیثنی بخشو کو بتلا گئے تھے۔ کروندہ قیمہ۔ کمرخ آلو۔ نرگسی کوفتے۔ نہایت رغبت سے بطور تبرک کھانا شروع کرتا ہوں۔ اٹیچی کیس سے ضخیم نوٹ بک نکال کر ورق گردانی کرتا جاتا ہوں ——— تعجب ہوا۔ عہد وسطیٰ کے صوفیائے کرام کے ملفوظات انکے مریدوں نے اسی تفصیل سے قلمبند کئے تھے۔ وہ حکایات اور فوق العادت واقعات ناقابل یقین اور مریدوں کی والہانہ عقیدت کا کرشمہ اور میڈیول ذہن کی کارفرمائی معلوم ہوتے ہیں اس نوع کی متعدد تصانیف بڑے ابّا مرحوم کی الماریوں میں موجود تھیں۔ ——— ترک وطن کرتے وقت مرحوم کا کتب خانہ ایک کباڑی کے ہاتھ بیچنے گئے تھے۔

اس دنیا میں ہمارے ایسے شاطر بھی موجود ہیں اور بابا سبز پوش کے ایسے بدقسمت بھی۔ وہ میاں کے ٹوٹی پھوٹی موٹروں کے کارخانے میں کیوں نہ پہنچ سکے؟ ڈاکٹر عنبریں بیگ جیسی نیک لڑکی تنکے چننے لگی۔ اور ہمارا ایرانی لوفری کا ساتھی سندر ریش نرائن سنگھ تیس سال بعد ہمارے لیے خضر راہ ثابت ہوا۔ کیا مقسوم ازل نے ہم سب کے لئے یہ سب پہلے سے طے کر رکھا تھا؟ ہم نائٹ کلب اور CASINO سے نکلے تو ایک خانقاہ میں جا پہنچے کیا یہ بھی پہلے سے طے تھا؟

پھر میں نے سینڈی کو الوداعی خط لکھنا شروع کیا مگر اپنے الفاظ کے بجائے قلم سے بیساختہ چارلس لیمب ——— کھیل کود کے ساتھی، مسرور بچپن کے ہمدرس اور ندیم، سب گئے۔ غائب ہوئے وہ مانوس چہرے۔ آسیب کے مانند میں ان مقامات میں گھومتا پھرا جہاں لڑکپن گذارا تھا۔ زمین مجھے ایسا صحرا معلوم ہوئی مانوس شکلوں کی تلاش میں جسے عبور کرنا میرا مقدر تھا۔ میرے مونس، میرے بھائی۔ کاش ——— تم نے میرے باپ کے گھر میں جنم لیا ہوتا تاکہ ان ہستیوں کا ذکر کرتے۔ کیسے کچھ معدود

ہوئے۔ کچھ نے مجھے چھوڑ دیا۔ کچھ مجھ سے چھن گئے۔ سب رخصت ہوئے پرانے مانوس۔ ماں ۔ ابا ۔ نانا میاں ۔ جوانمرگ فخرالنساء ۔ بڑے باپ ۔ حسین بخش۔

فرسٹ کلاس، اکو نومی، ہر قوم اور ہر رنگت کے مسافروں کا تخت رواں سامنے سے گذرا کیا۔ چہار سمت جانے والے ہوا پیما — دنیا کے ہر بڑے ایرپورٹ کی یکساں گہما گہمی سے اکتائی آنکھیں پل بھر کے لیے بند کیں۔ پھر پلک جھپکی —
معاً مرشد کی جھلک — کشمیری ڈریسنگ گاؤن۔ سرو قد۔ متبسّم، روشن چہرہ۔ گاؤں کے آستانے پر اس پہلی شام ننّھا قوّال بچّہ جو معرفتی چیز الاپتا تھا — اسکا استعارہ بالآخر روشن ہوا۔ جھومت آویں نند کے لالہ گلبن ہیں۔ مُکھ پہ انکے نور براجت۔ چنچل ہیں چتوت چال رے — جھومت آویں نند کے لالہ گلبن ہیں۔
گلے موتین کا ہار رے —

نُور نُور نُور نُور
مُکھ پہ انکے نُور براجت۔
— نُور نُور نُور نُور۔ آگے مرشد۔ پیچھے مرشد۔ دائیں مرشد۔ بائیں مرشد۔ اندر مرشد۔ باہر مرشد۔ الااللہ
باہر تاریکی میں منتظر منوّر طیارے کی سمت کھُلنے والے دروازے کے حروف روشن ہو چکے —

(راجہ دلشاد علی خاں کی نوٹ بک یہاں تمام ہوئی)

(۴۶)
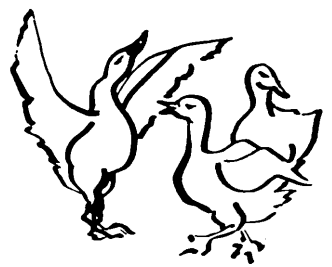
جنگلی بطخ

"گڈ ایوننگ مسز بیگ ـــــــ راجہ دلشاد علیخاں پھر غائب۔ مفقودالخبر ـــــــ آپ اسوقت اندھیرے اسٹوڈیو میں کیا کر رہی ہیں؟ روشنی جلا لیجئے ـــ"

"ہُوں۔ ہُوں ـــــ" معنبر بیگ کے سر اور ہاتھوں میں منصور نے نوٹس کیا خفیف سا رعشہ آگیا تھا۔ انھوں نے شراب کی الماری کے پٹ بھیڑے۔

تمہارے لیے ایک بلڈی میری بنا دوں؟ میرے پاس ووڈکا بھی موجود ہے۔"

"جی نہیں۔ شکریہ۔" انکے لرزاں ہاتھوں پر نظر ڈالی۔ انھوں نے دیکھ لیا۔

"یوروپ میں چند کیتھولک راہب اور راہبات کی ہتھیلیوں میں زخم نمودار ہو جاتے ہیں STIGMATA میری بلڈی ہوئی مماہیں گڑی میخیں میری ہتھیلیوں میں۔ ہاہا۔"

"عنبر کہاں ہے؟"

"سو رہی ہے۔ ماشا سے گھر آئے ایک ہفتہ ہونے آیا۔ زیادہ تر سویا ہی کرتی ہے۔ ـــ شام سے بجلی غائب ـــ ٹیلی فون خراب پڑا ہے۔ بنیا باورچی بھی رفو چکر۔ بطخیں تک تو خاموش ہیں۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔ چڑیوں کو بھی لگتا ہے سانپ سونگھ گیا۔ ـــــ ہاں وہ دلشاد علی کی کیا خبر سُنا رہے تھے؟"

"مسز بیگ ـــ راجہ صاحب نے لندن کو خیر باد کہا۔"

"بہروپیے ہیں۔ کوئی اور سوانگ رچا لیا ہوگا۔"

"نورمن کا خط آیا ہے وہ لکھتا ہے سعودی عرب تشریف لے گئے ہیں۔"

"کوئی شیخ پھانس لیا ہوگا۔ ٹھہرو۔ میں ذرا موم بتیاں جلا لوں۔ تم چپ چپاتے آگئے۔ موٹر سائیکل کی آواز تک نہ سُنی۔ میں ڈر گئی۔ بڑا ڈپریسنگ وقت ہے۔ تو یہ موم بتیوں کا بنڈل۔"

"میں ٹیکسی پہ آیا تھا۔ موٹر بائیک بھی خراب ہوگئی، اکبر علی کہاں ہیں ؟"

"آج دسویں محرم ہے۔ مجلس ——"

"ارے ہاں۔ آج شامِ غریباں کی مجلس ہوگی۔ امام باڑہ غفراں مآب۔"

"اجی ہماری اپنی ہی شامِ غریباں ہورہی ہے۔" وہ کسی تاریک گوتھک قلعے میں ڈولتے آسیب کی طرح کھانے کمرے میں گئیں —— شمعدان اٹھاکر ٹٹولتی ٹٹولتی واپس آئیں۔ کانپتے ہاتھوں سے شمعیں روشن کیں۔ ان کی لرزاں روشنی میں سن سیٹ بولوار کی گلوریا سوان سن ۔

"اچھا۔ راجہ دلشاد نے اب کس کو برباد کیا؟ بیٹھ جاؤ۔ JOHNNY WALKER

STILL GOING STRONG —— چلے گا —— ؟"

"جی نہیں شکریہ ——"

"DON'T BE VAGUE ASK FOR HAGUE"

"نو تھینکس۔"

منصور تردد سے انہیں دیکھتا رہا۔

"راجہ دلشاد علی خاں کا جامِ صحت —— ہاں اب بتاؤ۔ کیا ہوا۔ لندن کو خیرباد کہا۔"

"جی —— وہ —— نگار خانم کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد نجانے یہاں کن چکروں میں پڑ گئے تھے۔ چار ماہ لکھنؤ سے غائب رہے۔ پھر ایک روز مجھے فون کر کے کسی HOLY MAN کا تذکرہ کرنے لگے۔ چلتے وقت ان دونوں بہنوں کو فون تک نہیں کیا۔

"نورمن لکھتا ہے ڈیڈی جب لکھنؤ سے لندن لوٹے تو کچھ بدلے بدلے سے تھے۔ تین چار دن تک دروازے بند کیے اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ کھانے اور چائے کیلئے باہر آتے۔ تب بھی خاموش۔ یہ تینوں پارٹنر نورما ئیسلی اور دلشاد علی اپنے اپنے کام سے کام رکھنے کے نظریے کے پابند ہیں۔ ایکدوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں

دیتے۔ ہم تینوں پارٹنرز شارؔدا، عنبرؔیں اور خاکسار کے برعکس !"

"تھینک یو ـــ"۔ عندلیب نے طعنے کو محسوس کر کے جواب دیا۔ "اگر تمہاری ایک پارٹنر اِس طرح بیمار پڑ جائے تو تمہیں اسکا خیال نہیں کرنا چاہیے ؟"

"میں آپکے ددھیال کی بات کر رہا ہوں۔ مائینڈ یور اون بزنس والا یوربین رویہ۔ بہر حال۔ تو نورمن لکھتا ہے کہ نورما ڈریک نے مسٹر دلشاد علی کی بدلی ہوئی کیفیت کا زیادہ نوٹس نہ لیا۔ اسیطرح کمرے بند کیے بیٹھے رہے۔

"ـــ ایک شام کھانے کی میز پر کچھ محیر العقول واقعات کا تذکرہ کرنے لگے۔ سامعین کو مسکراتے دیکھ کر پھر چُپ سادھ لی۔ ایک دن نورما سے کہا اپنے کاروبار سے دستبردار ہو جائیں۔ مسجد میں چل کر ان سے نکاح پڑھوا لیں۔ نورما اور سیلی کو یقین ہو گیا کہ انکا دماغ خراب ہو چلا ہے انکو ایک مینٹل ہوم میں داخل کرنے کی فکر کی ـــ اسیطرح مسز بیگ جیسے باباسبز پوش کی نصیحتیں سُن کر انکے بھائیوں نے انکو پاگل مشہور کر دیا ہے ـــــ تب راجہ صاحب نے اپنی ساری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ نورما کے نام منتقل کر دی۔ یہ پندرہ دن کے اندر کے واقعات ہیں۔ ایک روز بنک جاکر فائنل کارروائی سے فارغ ہوئے ہی تھے اور کھڑے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں گے آئیندہ گذر اوقات کا کوئی ذریعہ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ نورؔما کے ہاں رہنے کو تیار نہ تھے۔ اتنے میں ایک عرب شیخ بُغ بُغ کرتا کاونٹر پر پہنچا۔"

"نورمؔن نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بُغ بُغ کرتا ـــ؟"

"وہ انگریزی سے ناواقف تھا۔ انہوں نے فوراً اسکی ترجمانی شروع کی۔"

"موصوف عربی بھی جانتے ہیں ؟"

"عربی؟ اٹیلین۔ اسپنش۔ سواحلی تک تو انکو آتی ہے۔ گورے چٹے آدمی۔ امریکہ میں تب تھے انٹرپول سے بچنے کے لیے کبھی گریک بن جاتے تھے۔ کبھی میکزیکین یا اسپینرڈ یہاں مسٹر ڈی۔ اے۔ چودھری بن کر وارد ہوئے تھے۔ چودھری دھیان سنگھ آزؔاد برطانوی مندوب ـــ! یاد ہے؟ بعد میں نگار خانم پر اصلیت ظاہر کر دی۔

"خیر تو عرب نے انکو بتایا کہ اپنے لڑکے کو اسکول میں ڈالنے آیا ہے ایک سیکرٹری
کا متلاشی ہے۔ نورمما کو گڈبائی کہہ کر عرب کے ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ اسنے طے شدہ
معاوضے سے چوگنی رقم عنایت کی۔ آپنے نورمن سے کہا یہ زندگی میں پہلی بار حلال کی
کمائی ہے۔ جدّے کا ٹکٹ خریدا۔ پہلے ہری چگ تھے حاجی قاز کی طرح اڑ گئے۔ عمرہ
کرنے۔ سب کام جھٹ پٹ ہو گیا۔"

"مجھے دلی والی دلنواز کا قصہ یاد آگیا جو مما بتاتی تھیں۔ وہ بھی عمر بھر کی حرام کی
کمائی بہن کے نام منتقل کر کے حج کرنے چلدی تھیں۔" عندلیب بانو نے قہقہہ لگایا۔

"آپ کو یہ واقعہ حیرت انگیز نہیں معلوم ہوا؟"

"تمہارے اللہ میاں نے میرے قلب پر مہر لگا رکھی ہے۔"

"نورمن لکھتا ہے کہ جاتے وقت انہوں نے کہا انڈیا کے ایک MAN OF GOD
کی نگاہ کرم نے قلب ماہیت کر دی۔ وہ لکھتا ہے یہ بھی ایسٹرن مسٹی سزم کا ایک کلیشے
ہے۔ کسی کی نگاہ کرم کیا ہوتی ہے اور اس سے کسی کی قلب ماہیت کسطرح ہو سکتی ہے؟"

"ٹھیک کہتا ہے۔ یہ جو اتنے بزرگوں اور GODMEN کی یہاں ریل پیل ہے اپنی
نگاہ کرم سے ملک کے حالات کیوں نہیں بدل دیتے؟ نہ شیعہ سُنی ہندو مسلم مارا ماری
ہو نہ ہریجن زندہ جلائے جائیں نہ دلہنیں۔ نہ لوگ بھوکوں مریں نہ کوئی بیمار پڑے۔
نہ حادثے ہوں۔ بس ایک ایک تعویز سب نے پہنا اور سارے دلدّر دور ——
روزین بائم کی بات کرو۔ نورمن نے کچھ لکھا ہے؟"

"راجہ صاحب نے پہنچتے ہی وعدے کے مطابق روزین بائم کو فون کیا تھا۔ وہ
انگلستان سے باہر گیا ہوا تھا۔ نورمن نے ۲۸ اکتوبر کا اپوائنٹمنٹ لے لیا ہے۔ میں یہی
بتانے اسوقت آیا ہوں۔ آپکا فون ڈیڈ تھا۔ عنبر کو جگا دیجئے۔ اور فوراً پیکنگ شروع کیجئے
آج ۱۷ اکتوبر ہے ——"

عندلیب بانو ایک شمع ہاتھ میں لیکر اسٹوڈیو سے غائب ہو گئیں۔
موم بتیوں کی روشنی میں تصویریں جھلملایا کیں۔ بلجیم کے مناظر۔ سائبیرین پرند

گومتی کی جل بہار۔ ایک مقامی بنجارن ایک اسپنش جپسی ڈانسر۔ بیلی گارڈ کے کھنڈر
ایک تاریک کونے میں عندلیب بانو کا وہ فوٹوگراف رکھا ہوا تھا جسے وہ "پورٹریٹ
اف اے ناچ گرل II" کہتی تھیں۔ اسکے آگے نواب فاطمہ کی سرخ پٹاری ایک اسٹول
پر موجود تھی۔ شاید ڈرائنگ روم کی صفائی کرتے ہوئے لاکر یہاں رکھدی ہوگی۔ یہ پٹاری
PANDORA'S BOX ثابت ہوئی تھی۔ اس نے ذرا ڈرتے ڈرتے دو تصویریں
اٹھائیں جو کینوس اور برشوں کے ڈھیر میں فرش پر اوندھی پڑی تھی کبوترین گاؤن میں
ایک دیسی میم پری پیکر۔ نیچے نام ——— ملکہ جان والدہ گوہر جان۔ پشت پر :

GARRICK'S STUDIO, 3, WATERLOO STREET,

CALCUTTA 1874

مزید اطلاع نیچے مرقوم تھی کہ مسز گرک ہندو اور مسلم لیڈیز کے فوٹو انکے مکانوں پر
لینے کے لئے دوگنی رقم چارج کرینگی۔ گلاس اور فریم سمیت پورٹریٹ ۱۶ روپیہ۔
آئیل کا فوٹو پچاس روپیہ۔ دوسرا فوٹوگراف۔ ایک خوش شکل تیز طرار سا یوروپین نوجوان۔
نیچے اسٹوڈیو کا نام — JACQUES CORBIN, CHANDRGORE, 1909.

منصور چند لمحوں تک موسیو آندرے رینال کو ملاحظہ کرتا رہا ——— پھر ملکہ جان
ارمنی اور آندرے رینال بلجین دونوں کو رنگوں اور کاغذوں کے انبار میں واپس
دفن کر دیا۔ اور دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ رام کلی کے ہاں تلسی میں دیا جل رہا تھا۔
تالاب کے کنارے بطخیں پروں میں چونچیں چھپاتے محو خواب تھیں قریب کی کوٹھی
سے مجلس کی آواز آرہی تھی ـــ کہیں بانو سیس نوادں کہاں مورا سیاں تو موسے بسار گیو۔

میں تو دودھن دھارے نہائے رہی۔ میں تو پوتن بھاگ سہائے رہی۔ میں تو لاکھ
سنگھار بنائے رہی مورا سیاں سنگار بگاڑ گیو۔ مورا اکبر لال جوان گیو۔ مورا اصغر بالک نادان
گیو۔ مورے لال سکھی انمول ہتے۔ آج شام نگر کی بجار گیو۔
منصور دروازہ کھول کر باغ میں اتر گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر نوحہ سننے لگا ———
میں تو ہاتھ پسار کے بھیکھ لیے۔ موری پونجی جنم کی دیو ندی۔ میں تو جنگل جنگل ڈھونڈ پھری

مورے لال کا پتہ نہ نشان ملو ــــــــ مسز بیگ جانے کہاں رہ گئیں۔ عنبر جاگنے کے بعد شاید باتھ روم میں ہو ــــ والدہ کچن کی طرف جاتی نظر آئیں۔ اس نے سوچا پکار کر کہے کہ کافی وغیرہ کا تکلف نہ کریں لیکن پڑوس میں ایک اور دلدوز نوحہ شروع ہو گیا ــ آج حسینؑ اکیلے ہیں لٹ گئی جو مایا تھی ــــ سنسان کربلا سے آواز آرہی ہے۔

کربلا کی دھرتی پہ تھک کے سو گئے ساتھی ــ لیکن یہ رن سے کیسی ــ

ــ ایک چیخ سُنائی دی ــ "منصور ــ منصور ــ عنبر پھر نکل بھاگی،" وہ لپک کر اندر گیا: "میں سرِ شام سے اسٹوڈیو کے دروازے بند کیے بیٹھی تھی۔ جانے کس وقت فرار ہو گئی ــ کچن۔ باغ سب دیکھ لیا ــ موٹر خانہ کھُلا پڑا ہے ــ" مسز بیگ پنٹیری میں حواس باختہ کھڑی تھیں "میٹر دیکھو ــ میٹر ــ"

"کیسا میٹر ــ ؟"

"ارے بجلی کا میٹر اور کیسا میٹر ــ سامنے کے برآمدے میں میں نے کار کی کنجیاں اسمیں چھپا رکھی تھیں ۔"

منصور باہر بھاگا۔ موٹر گیراج خالی پڑا تھا۔

وہ مالی کو آواز دیتا پھاٹک کی طرف دوڑا۔ عندلیب بیگ ہانپتی کانپتی اس کے پیچھے۔

رام سروپ مالی باغ کے نل پر بیٹھا انگوچھا چھانٹ رہا تھا۔ وہ تینوں رِوربنک روڈ پر پہنچے: "اس کمبخت شہر میں ٹیکسی بھی تو نہیں ملتی :" عندلیب بانو نے جھُرجھری آواز میں فریاد کی سٹرک پر ٹریفک کم ہو چلا تھا۔ روشنیاں مضمحل۔ راہگیر سیاہ پوش۔ برابر والی کوٹھی میں نوحہ خوانی جاری تھی۔ منصور نے مالی کو دوسری سمت دوڑایا خود بولوار پر سے گذرتی موٹروں کو دیکھنے لگا۔ ہر سبز ایمبیسیڈر کو تاکتا مگر وہ زن سے آگے نکل جاتی۔ پندرہ منٹ گذر گئے۔

"میں شارد ا کے ہاں جاتا ہوں ــــ ذرا کوئی خالی رکشا روکیے ــــ" سب بھری ہوئی جا رہی تھیں۔ چند منٹ بعد رات کی دُھند میں ایک رکشا نمودار ہوئی ایک خاتون شال سے سیاہ سر ڈھانپے اس پر بیٹھی تھیں بخشو کی صورت نظر آئی۔ اسکے بعد عنبر ــ

وہ حمرا ولی کالی چادر میں ہاتھ چھپائے پھٹی پھٹی متوحش نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ تیوری پر بل ڈالے گویا مایوپیا کی مریض خلا میں پوشیدہ الفاظ پڑھنے کی کوشش میں مصروف۔ ناک کی سیدھ میں ٹکٹکی باندھے ——— دایاں ہاتھ دائیں آنکھ پر رکھتی۔ پھر بایاں ہاتھ بائیں پر۔ گویا کوئی آنکھوں کا ڈاکٹر مختلف قسم کے شیشے لگا کر اسکی بینائی ٹسٹ کر رہا ہو۔

منصور اور مسز بیگ اسکی طرف دوڑے۔ عنبر نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ ساری میں چھپا لیے۔ شال کا ایک کونہ خون میں تربتر تھا۔ ہاتھ خون آلود۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ آنکھیں خون آلود۔ ہاتھوں میں زخم۔ ڈِرپ۔ ڈِرپ۔ ڈِرپ

اشکِ خونیں ہیں بھرے۔

اشکِ خونیں ہیں بھرے ——— دیدۂ خونبار میں ——— دفعتاً اس نے زور زور سے نوحہ و ماتم شروع کر دیا ——— آئے ہیں پُرسے کو ہم ——— آئے ہیں پُرسے کو ہم ——— آپکی سرکار میں رکشا پر بیٹھی بیٹھی ماتم کرتی وہ بڑی غضبناک معلوم ہوئی۔ گویا شیر پہ سوار دُرگا۔

اشکِ خونیں ہیں بھرے ——— دیدۂ خونبار میں ——— آئے ہیں پُرسے کو ہم ———
آپکی سرکار میں ——— حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ حسینؑ ———

بخشو کوٹھی کے پھاٹک میں مڑے۔ عنبر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر منصور نے اسے خاموش کرنا چاہا۔ عنبر نے زور سے اسکا بازو جھٹک دیا۔ اور ماتم میں مصروف رہی۔ دفعتاً وہ چپ ہو گئی ——— چند لمحوں بعد آہستہ سے بولی ——— نعُ مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

منصور رکشا کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ مسز بیگ ہانپتی کانپتی پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ برآمدے کے سامنے رک کر بخشو نے کہا "بٹیا ——— اتریے"

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بخشو منصور کو ایک طرف لے گئے۔ جلدی جلدی بولے ———
"بھیا ——— مولا نے کرم کر دیا۔ ورنہ غضب ہو جاتا ——— ہم گھر واپس جا رہے تھے دیکھا بٹیا وہ جو اسٹیڈیم کا نیلا پیلا پھاٹک ہے اس سے گاڑی ٹکرانے میں جٹی ہیں۔ ایک د

راہ گیر اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہم ترنت پہنچے۔ بیٹیا چلاتے جا رہی تھیں یہ پھاٹک یہاں قرت نہیں بیٹھتا۔ میں اسکو تہس نہس کر ڈالو نگی۔ تیسری بار دھکا مارا تو پھاٹک کیا ٹوٹتا گاڑی کے لیمپ چکنا چور۔ کھڑکی کا کانچ بھی ٹوٹ گیا بیٹیا کو زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ ہاتھوں میں شیشے چبھ گئے۔"

عندلیب بانو رکشا کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ اور وحشت زدہ نگاہوں سے کبھی ڈاکٹر کو دیکھتی تھیں کبھی بیٹی کو — انکا سر ہلنے لگا تھا۔ جیسے وہ — سفید بالوں والی ایک گڑیا ہوتی ہے ذرا سا ٹہوکا لگا دو یا پھونک مارو تو دیر تک اسکی منڈیا ہلتی رہتی ہے۔ — یک بیک وہ ایک سو سالہ ضعیفہ معلوم ہو رہی تھیں تنہا۔ لاچار۔ سحر زائیل ہونے کے بعد رائیڈر ہیگرڈ کی SHE — منصور بھاگ کر گیلری میں سے فرسٹ ایڈ کا بکس اٹھا لایا۔ نیا خانساماں اور رام سروپ پھاٹک میں داخل ہوئے۔ رام کلی رکشا کے پاس کھڑی عنبر کو اترنے کیلئے پچکار رہی تھی پھر اسنے کہا۔" دیا رے۔ بیٹیا تو جانو پتھر کی مورتی ہوئے گین۔"

"منصور" مسز بیگ نے فریاد کی "یہ تو ماشا سے بھلی چنگی ہو کر لوٹی تھی۔ نہیں؟ اب یہ کبھی اچھی نہیں ہوگی؟"

"ممی — ہم لوگ فوراً سے پیشتر لندن جا رہے ہیں نا۔ آپ سب ملکر اسے رکشا سے اتارنے کی ترکیب کیجئے۔ مجھے تو اس نے ابھی بڑے زور کا دھکا دیا۔" منصور نے ذرا تاسف سے اپنے بڑھیا امریکن کوٹ کی آستین پر نگاہ ڈالی جس پر عنبریں کے خون آلود پنجے کا نشان ثبت ہو گیا تھا۔

اکبر علی اور رام سروپ گھبرائے ہوئے پہنچے۔ رام کلی پانی کا جگ اور چلمچی لیکر حاضر ہوئی۔ عنبرین نے اپنے چاروں طرف لگے مجمع کو گھور کر دیکھا۔ پھر ریذیڈنسی پر نظریں جمائیں اور اپنی پوری طاقت سے چیخی — "ہے ہے"

(۴۷)
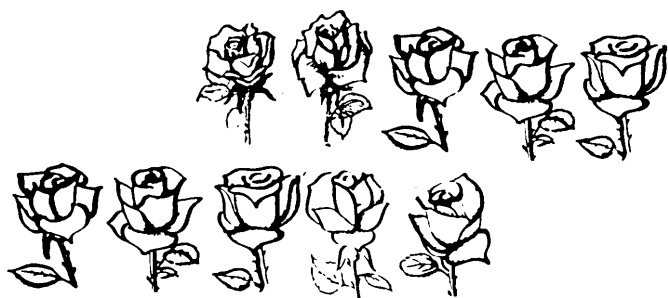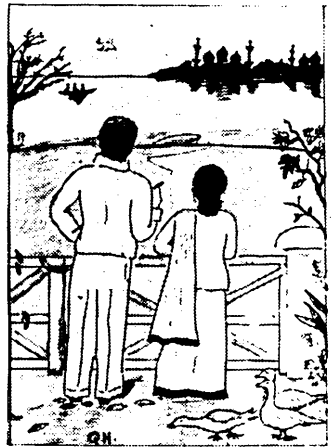
دریانُما

سنہرا اکتوبر گلِ عجائب کھلنے کا موسم ہے۔ اسکے شگوفے صبح سویرے گلابی، دوپہر کو سپید، شام کو ارغوانی ہوجاتے ہیں۔ گل عجائب۔

وہ دونوں پھاٹک پر کہنیاں ٹیکے ندی کی سیر کررہے تھے۔ آبی رنگ کی ساری میں ملبوس ایک خاتون بہت دور ڈھال پر سے آتی دکھلائی دیں۔

"مسز جورڈن ——— ایوننگ واک کے لئے آج دیر میں نکلیں۔"

"مسٹر جورڈن کا انتقال ہوگیا منصور۔ یہ تو امّی ہیں۔ بیلی گارڈ گئی ہونگی۔ ہاتھ کانپنے لگا ہے مگر اسکیچ بنانے میں جُٹی رہتی ہیں۔"

وہ ان کے نزدیک پہنچیں۔ منہ اٹھا کر مسکرائیں۔ جسطرح آسمان پر سے گذرتے پرندوں کو دیکھ کر مسرور ہوتی تھیں۔ آنکھیں چُندھیا کر بولیں "اوہو — لون رینجر اور گرل فرینڈ ——— گھوڑے کھونٹے سے باندھ کر ڈوبتے سورج کا نظارہ — آخری سین۔"

"جی ہاں آخری سین۔ لون رینجر ——— گٹار بجاتے ہوئے شفق میں غائب ———" منصور نے شگفتگی سے جواب دیا۔

عندلیب بانو چند قدم آگے جا کر آم کے درخت کے نیچے رک گئیں۔ ڈالی پر ایک زرد رنگ کی چڑیا بیٹھی تھی۔ سنہری زنجیر والی عینک لگا کر اسے دیکھا۔ "لَو برڈ۔ انگریزی میں ——— فارسی میں اسے مرغِ عشق کہتے ہیں۔ جب خوش ہوتا ہے خوب چہچہاتا ہے ورنہ چپ رہتا ہے۔" وہ سفید مُتحنی سر جھکائے تیز تیز قدم اٹھاتی کوٹھی کی طرف چلی گئیں۔

"امّی نے اس مرتبہ لندن میں بے شمار فلم دیکھے۔ کاؤبوائے پکچر تک نہیں چھوڑیں۔ یہ

سے نکلیں تو سنیما ہال میں جا بیٹھتیں۔ وہاں سے واپس آکر بھر پب میں — منصوراتی الکحلک ہوتی جا رہی ہیں۔"

"معلوم ہے۔ آؤ کچھ خوشگوار باتیں کریں۔ اس مکان کا نام سوچو۔ ابتک بے نام پڑا ہے۔"

"اُمبیکا بھون۔"

"خدا کی پناہ۔ پھر وہی وظیفہ شروع ہو گیا۔"

"الکحلک ماں۔ اور نیوروٹک بیٹی۔ کہاں تک جھیلو گے۔ عاجز آکر بھاگ جانا چاہتے ہو۔ لیکن اب تمہارا فرار بہادری سے برداشت کرلوں گی۔"

"نام تو سوچو یار جب بھاگوں گا دیکھا جائے گا۔ دریا نُما ہی رکھ لو۔ پہلے بھی کہا تھا۔"

"دریا نُما۔ قطب نُما — نہیں بھئی۔ چو لبے نا۔"

"اچھا — اور سوچتے ہیں۔"

"لندن برج از فالنک ڈاؤن۔ فالنگ ڈاؤن فالنگ ڈاؤن مائی فیر لیڈی —"

"یہ کیوں یاد آیا؟"

"ایک بار کہا نہیں تھا جھلکیاں بہت سی ہیں آدمی ایک۔ جھانکیاں۔ تختِ رواں۔ روشن چوکیاں۔ جل ترنگ بہار کے مجرے۔ سب پاسنگ شو۔ سب ایکدوسرے میں مدغم — جیسے —"

"یوجین ہیڑسن اور اندرا دیوی —!"

"ہاں۔ مرزا دلدار علی برلاس اور نواب فاطمہ اور آندرے رینال اور عندلیب بانو — ارے پتہ ہے — شمو کی بیٹی یعنی مہر و خالہ کی نواسی چھنو سنا ہے بمبئی میں موجود ہیں۔ بوڑھی پھوس سینائیل ہو گئی ہیں۔ اور بہری پٹ ایک پڑپوتے کے ساتھ رہتی ہیں جو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔"

"ریوالونگ اسٹیج — اچھا یا ناٹک!!"

"ٹھاکر مہیشور سنگھ۔ امبا پرشاد ڈسکور حسین۔ فلومینا۔ بابا سبز پوش — !"

"راجہ دلشاد علی خان آف دھان پور۔"

"جو لارڈ وند سے اتر کر نکل بھاگے!"

"کوئی شخص کلیتاً برا نہیں۔"

"ہاں۔ طوائفیں بھی تو کہا جاتا ہے ہارٹ آف گولڈ کی مالک ہوتی ہیں۔ نور آماڈریک کو دیکھو۔ سال بھر ہم لوگوں کی کیسی مہمانداری کی ——"

"دبا کر پیسے بھی تو وصول کیے تم سے۔ بطور لینڈ لیڈی۔"

"چلو خیر۔ امی نے ایک مرتبہ کہا تھا نا فیصلوں میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ کیا پتہ نگار آخانم کے اندر بھی کوئی پوشیدہ خوبیاں موجود ہوں۔"

"ہم ان خوبیوں کے نمود کا صبر سے انتظار کرینگے۔"

"وہ پنچ اینڈ جوڈی شو یاد ہے انگلینڈ کے دیہاتی میلے والا —— اور ڈاربی اور جون ——"

"ہاں۔ گلا آبوشتا آبو ——"

"مسز ہری آمایا بھٹناگر —— ؟"

"تم جن چیزوں کو بھولنا چاہتی ہو ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرو۔"

دس مہینے تک روز بین باؤم بھی یہی رٹا کیا۔ کوئی نیا نسخہ باندھو یار۔"

"نہیں کچھ بھی یاد —— یوں ہی بامراد —— یوں ہی شاد شاد —— گو یا رہے گی برسوں —— پھولی ہوئی ہے سرسوں —— گو یا رہے گی برسوں ——"

"یہی تو سارا مسئلہ ہے —— گو یا رہے گی برسوں —— کہاں ہے پچھلے برسوں کی برف —— ؟ اور پچھلی بسنت کی سرسوں ؟"

"عبدالرحمٰن کابلی۔ شیخ افتخار الرسول۔ گوہر جان اف کلکتہ ——"

"حسین و جمیل اینڈری رینال۔ مصنوعی دانتوں والی ایک رعشہ زدہ مضحکہ خیز سی اینگلو انڈین بڑھیا —— امی بہت لڑیں زندگی سے۔ اب تھک ہار گئیں۔"

"اسوقت تم بہت سیڈ ہو رہی ہو!"

"کیا —— ؟"

"ایک روز میں نگار خانم کے ہاں گیا۔ ایسے ہی؛ گودھولے کے وقت۔ وہ دریچے میں بڑا رومینٹک پوز بنائے کھڑی تھیں۔ کہنے لگیں اسوقت ہم بہت سیڈ ہو رہے ہیں۔"

"نگار و شہوار کا بار بار ذکر کر کے میرا نفسیاتی علاج جاری رکھنا چاہتے ہو ——"

منصور۔ ایک بات سنو۔ مُردہ خانوں میں رکھی لاشیں جیسے دھرنا دیدیں۔"

"لاشوں کا یہاں کیا ذکر ہے؟"

"منوں وزنی ہو جائیں۔ تاکہ انکو اٹھایا نہ جاسکے۔ یا سب کھڑے ہو کر زندگی کا مطالبہ کریں۔ کیونکہ میں حسین بخش سب سے آگے نواب فاطمہ۔ چہرہ کینسر سے مسخ اوکسیجن ٹنٹ کا گھونگٹ۔ ناک میں اوکسیجن کی نلکیوں کا بُلاق۔ پانی پانی ہوتی بے نور آنکھیں۔ بیہوشی میں باربار امّی کو پکارتی تھیں۔ یا ابّا۔ ابّا۔ چلاتی تھیں۔ لیکن امّی کھڑکی کے پاس کھڑی رہیں۔ فلومینا نے کہا اینڈی بابا۔ ماما کے پاس جاؤ۔ تب گئیں۔ آہستہ سے کہا مما۔ تب نانی کی بے نور پتلیوں میں اچانک جنبش آگئی تھی۔ پھر آنکھیں پتھرا گئیں۔ اتنے میں مولوی صاحب نازل ہوئے۔ امّی انکے پیچھے دوڑیں۔ اور گریہ ختم ——"

"عنبر —— اتنی پرانی بات ہے۔ رو کیوں رہی ہو۔ اب تو سب ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے؟ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ منصور۔"

"عنبر جیرایٔ۔ اسطرح دونوں وقت ملتے رویا نہیں کرتے۔ ہنسو۔ ہنسو بھی۔ شاباش —— اپنے باغ کو دیکھو اور آسمان کا نظّارہ کرو۔ موجِ گُل —— موجِ صبا —— موجِ شفق —— موجِ شراب ——"

"ٹائم جنٹلمین —— بھاگو۔ مجھے امّی کے ساتھ ایک اہم مشن پر جانا ہے۔"

"کہاں ——؟"

"کل بتاؤں گی۔ کلنک میں۔"

"کچھ اتہ پتہ ——"

"اس مشن کی وضاحت کے لیے لفظ معلوم نہیں۔ وہ کیا نظم تم نے ایک بار سنائی تھی؟"

"اوہ —— میں مشرقی جنگلے پر کھڑا کابلی سے گل داؤدی توڑتا ہوں ——؟

امن سے جنوبی پہاڑوں کو تکتا ہوں۔

ڈوبتی روشنی میں ہوا خوشگوار ہے۔

آوارہ پرندوں کے جوڑے اُڑتے جارہے ہیں۔

ان باتوں میں کچھ گہرے معنی موجود ہیں۔
میں اسکا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔
مگر اچانک وہ الفاظ بھول گیا۔"
منصور مجھے الفاظ واقعی یاد نہیں رہے تھے۔ اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ الفاظ دفعتاً غائب ہو جائیں یا انکے معانی بدل جائیں تو کیسا لگتا ہے ــــ یا دماغ اچانک کام کرنا چھوڑ دے۔"
"بڑے آدمیوں کے دماغ اتھل پتھل ہو جاتے ہیں تب بھی انکو نارمل سمجھا جاتا ہے وہ ملکوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔ دنیا کا بیڑا غرق کرتے ہیں۔"
"اب کس کا بیڑا غرق ہو رہا ہے بھئی ــــ" مسز بیگ نے باہر آ کر مرمت شدہ ہری ایمبیسڈر میں بیٹھتے ہوئے آواز دی۔ پھر اتر کر اندر چلی گئیں۔ شاید کوئی چیز بھول گئیں تھیں۔

"وہ ایک مرتبہ تم نے کیا کہا تھا۔ باغ میں آؤ عنبرین ــــ!"

COME INTO THE GARDEN MAUD."

"مغرب کے وقت باغ میں چڑیاں پکار رہی ہیں ــــ موڈ ــــ موڈ ــــ موڈ ــــ میں گیٹ پر تنہا ہوں۔ وُوڈ باین اور گلاب کی خوشبو ہوائیں اڑ رہی ہے ــــ وغیرہ وغیرہ۔"
"شکریہ!"
"اوہو۔ تم تو اچانک نہایت با اخلاق ہو گئیں! کیا بات ہے؟"
"اس نظم کا اگلا حصہ میں سناتی ہوں اخلاق کی وجہ: ــــ

MY LIFE HAS CREPT SO LONG ON A
BROKEN WING

THRO' CELLS OF MADNESS, HAUNTS
OF HORROR AND FEAR

THAT I COME TO BE GRATEFUL AT
LAST FOR A LITTLE THING

منصور خاموش رہا۔ افسردگی کے ساتھ سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم نے جب وہ نظم سنائی تھی میں نے امی کی کتابوں میں سے ٹینی سن نکال کر ساری پڑھ ڈالی ——"

"اوہ ——"

"اسے پڑھ کر مجھے کلکتے کے کسی اداس گارڈن ہاؤس میں تاڑوں کے نیچے بیٹھی جھالردار بلاؤز اور وکٹورین سایہ پہنے کسی اداس تنہا لڑکی کا خیال آیا — یو نو واٹ آئی مین —

منصور —— کیا میں اپنے آپ کو تمہیں سمجھا پائی ہوں ——؟"

"یس مائی ڈیر ——"

"اچھا۔" اس نے یکلخت بڑی طمانیت اور خوشی کے ساتھ کہا: "اب تم اپنی موبائیک پر بیٹھو۔ اور آگے آگے جاؤ بطور پائیلٹ ——"

"کہاں تلک ——؟"

"چھتر منزل۔"

مسز عندلیب بیگ باہر آ کر پھر کار میں بیٹھ گئیں۔ ہارن بجایا۔

"مشن خفیہ ہے۔ میں اور امی ایک ایسی جگہ کا قصد رکھتے ہیں جہاں جانے کو تم منع کرو گے۔"

اچھا تو میں کلب کی طرف نکل جاؤں گا۔"

"شیور۔ HAVE FUN۔ گڈ نائیٹ۔"

"گڈ نائیٹ عنبر۔ ہیو اے نائیس ٹائیم ——"

(۴۸)

پانیوں پہ بہتی موسیقی

ہلکے سبز غرارے کے جوڑا، زمرد کے گوشوارے شہوار خانم حسب معمول نہایت پُرکشش اور گلیمرس معلوم ہو رہی تھیں۔ سیٹرڈے نائٹ ــــ کلب جانے کے لئے برآمدے میں تیار کھڑی تھیں۔ برساتی میں بیگ ماں بیٹیوں کی کار آن کر رکی ــــــــ فوراً نوٹس کیا کہ دونوں نے پیرس کے تازہ ترین فیشن کے کوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ انہیں اپنے یہاں آتا دیکھ کر متعجب ہوئیں۔ لیکن خواتین کی ایکدوسرے کے خلاف کولڈ وار کے اصولوں کے تحت آگے بڑھ کر بڑے ہی خلیق لہجے میں بولیں: " اوہ ــــ ہلو ــــ آداب عرض۔ آپ کہاں۔ آئیے۔ آئیے۔ مزاج شریف۔"

عندلیب بانو اور عنبر اسی منافقانہ انداز سے مسکراتی برآمدے کی مرمریں سیڑھیاں چڑھیں۔ شہوار نے انکو اندر لے جاتے ہوئے کہا: "سنا تھا آپ لوگ باہر گئی ہوئی تھیں۔ آپکی ڈاکٹر صاحب طبیعت ناساز تھی۔ مجھے تو معلوم کر کر کے بڑی فکر ہوئی۔ باجی سے کہا بھی آپکی عیادت کر آئیں۔ پتہ چلا آپ لندن جا چکی ہیں۔ ہم لوگ بھی اس سال زیادہ تر باہر ہی رہے۔ کچھ عرصہ یوروپ میں گذارا باقی بنگلور۔ اب آپکی طبیعت کیسی ہے ڈاکٹر صاحب؟"

" بہتر ہوں۔ شکریہ۔ ڈاکٹر لوگ زیادہ عرصے تک صاحب فراش نہیں رہ پاتے۔ اپنے مریضوں کی خاطر انہیں دیر یا سویرا اچھا ہونا ہی پڑتا ہے۔ تین ماہ کے لئے گئی تھی وہاں علاج معالجے میں پورے دس مہینے لگ گئے۔"

" جی ــــ جی ــــ" شہوار نے سر ہلایا۔ ڈرائینگ روم کے دروازے پر قبلائی بہادر جھونکا۔

" فرینڈز کو بلائی کھان ــــ فرینڈز ــــ کیپ کوائیٹ ــــ آئیے۔ باجی نیچے ہی ہیں۔ انکی طبیعت بھی خراب ہی چلی جاتی ہے۔ منصور نے نئی دوائیں شروع کروادی ہیں۔" گیلری کے سرے

پر پہنچیں "لکھنؤ میں تو ابھی سردی نہیں پڑی آپ نے کوٹ پہن رکھے ہیں! یہ پیر کارڈین تو نہیں ہیں۔ بسنتی اندر جا کر دروازہ کھولو۔ پیر کارڈین تو علیحدہ پہچان لیے جاتے ہیں۔ میرے پاس تو ایوسینٹ لارنٹ کے بھی بے شمار کوٹ ہیں۔ اس سال پیرس سے کچھ نہیں خریدا۔ ایربیفور لاسٹ میں اور بجیا چند سینٹ لارنٹ اور کارڈین لے آئے تھے"

"ایوسس لورین اور پیئغ کاغدین ——" عنبر نے فوراً نہایت اخلاق سے تلفظ کی تصحیح کی "یہ لائیٹ کوٹ ہم نے اس لیے پہن رکھے ہیں کہ لکھنؤ میں گلابی جاڑے تو شروع ہو چکے اور ہم دونوں زکام میں مبتلا ہیں۔"

مہری نے دروازہ کھولا۔ وہ تینوں آبشار والے کمرے میں داخل ہوئیں۔ یہ کمرہ بیگم آں بیٹیوں نے پہلی بار دیکھا اور متحیر نظر آئیں —— شہوار نے انکے استعجاب کو رشک و تحسین پر محمول کیا۔

نگار خانم مصنوعی جھرنے کے سامنے بلوریں صوفے پر نیم دراز نئے ناول کے پروف دیکھ رہی تھیں۔ نگاہ اٹھائی۔ نو واردوں کو دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئیں۔

"آیئے —— آیئے —— آداب عرض۔ کیسے آنا ہوا۔ سنا ہے آپ کا تو ——"

"جی ہاں۔ دماغ چل گیا تھا۔ انگلستان گئی تھی پچھلے سال اکتوبر میں۔ بغرض علاج۔ ابھی واپس آئی ہوں چند روز قبل۔ بہتر ہوں۔"

"تشریف رکھیے۔ کیا پئیں گی؟ کافی —— چائے —— بسنتی —— ——"

وہ دونوں دوسرے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ سوشل گفتگو شروع ہوئی۔ نگار خانم نے عنبر کا ناقدانہ جائزہ لیکر بڑی رس بھری آواز میں کہا۔ "انگلستان کی آب و ہوا نے آپ کی صحت پر بہت اچھا اثر کیا۔ ماشاء اللہ۔ اپنی عمر سے دس سال کم لگ رہی ہیں۔ ہیر اسٹائیل بدلوا لیجیے۔ —— شہوار ایک بار وہاں میرے پیچھے پڑی کہ بال کٹوا لوں میں نے کہا بھیا اپنا اولڈ فیشن جوڑا ہی بھلا —— مگر آپ —— ایک بار آپ لندن جائیں تو ایک پتہ دونگی۔

"ایک ہیر ڈریسر ہے —— ایسا مہنگا بھی نہیں ہے مگر ایسے ہیر اسٹائیل بنانا ہے کہ ہر طرح کے چہرے کو سوٹ کرتے ہیں۔ اور ڈائی کے بجائے مہندی بہتر رہتی ہے۔"

"ضرور ــــ ضرور" عنبر نے جواب دیا اب اسکی باری تھی۔ نہایت گرمجوشی سے دریافت کیا" یہ آپ کا کون سا ناول ہے ؟"

"چھتیسواں ۳۶ ــــ"

"ماشا اللہ۔ عنوان کیا رکھا ہے ؟"

"ابھی کچھ سوچا نہیں"

"منزل کہاں ہے تیری' ــــ رکھ لیجئے یا ــ 'آئے بھی وہ گئے بھی وہ'"

"ہم لوگ آپ کے پاس ایک کام سے آئے ہیں" عندلیب بانو نے ونڈو سیٹ پر جا کر بیٹھتے ہوئے بات شروع کی" حالانکہ آپ ہم جیسوں سے ملنا پسند نہیں کرتیں۔ لیکن مجبوری"

"بھگو بھگو کے ــــ بھگو بھگو کے ــــ" دریچے کے باہر سے ایک باریک سی آواز آئی۔ حسب معمول خواجہ سبز پوش گملوں میں چھپے کن سوئیاں لے رہے تھے۔ منصور نے سال گذشتہ شاگرد پیشے میں اس عجیب و غریب ملاقات کے بعد عندلیب بیگ کو ان بے چارے کی اس المناک عادت کے متعلق بتایا تھا۔ آواز سے دھیان ہٹا کر عندلیب بانو نے ایوان نشست کا جائزہ لیا جسکا تذکرہ منصور سے اٹنائشن رکھا تھا۔

نیلگوں مصنوعی آبشار کے اوپر پہاڑی نما مینٹل پیس پر صندل اور تانبے کی چند مورتیاں رکھی تھیں جو ظاہر تھا کہ اس بار دونوں بہنیں میسور سے خرید لائی تھیں۔ سب سے اونچی چوٹی خالی پڑی تھی جس پر منصور نے بتایا تھا کہ نواب بیگم کا کیمیو سجا رہتا تھا

خالی جگہ دیکھ کر عندلیب بانو دھک سے رہ گئیں۔ نگار خانم کو مخاطب کیا ــــ "دیکھئے وہ ــــ ایسا ہے کہ ــــ وہ مختصر تصویر جسکی وجہ سے پچھلے سال وہ سارا غدر مچا اسے واپس کر دیں تو ممنون ہونگی ــــ"

"اس تصویر سے آپکا کیا تعلق تھا ؟"

" آپکا تجاہل عارفانہ قابل داد ہے۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ وہ کیمیو چرایا گیا تھا اور آپ مال مسروقہ کی خریدار تھیں۔ گو آپ لاعلم تھیں۔ ہم دنیا کے بہت سے معاملات کے متعلق غلط باتیں کرتے ہیں غلط امیج غلط نظریے قائم کرتے ہیں ــــ کیونکہ ہم بیخبر ہیں۔

اب تو آپ جان گئی ہیں۔ وہ تصویر واپس کر دیجئے۔ اور وہ بڑا پورٹریٹ بھی جو ماروا ڑی اپنے ساتھ جے پور سے لاکر آپکی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ــــ اور تفصیل بتاؤں ــــ ؟ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا ــــ

PORTRAIT OF A NAUTCH GIRL

—BY ANDRE RENAL-

CHANDRANA GORE-

1911

"اوہو ــــ آپکو خوب از بر ہے۔ وہ کسطرح ؟ تو عرض یہ ہے کہ وہ کیمیو تو منجھلے بھیّا نے اسی رات کوڑے میں ڈال دیا تھا۔ اور وہ بڑا فوٹو جو بلیک میلر مارواڑی لائے تھے اسکے تو بڑے بھیا نے پرخچے اڑا دیے ٹکڑے ٹکڑے کرکے باہر سڑک پر پھینکوا دیا۔ بلیک میلنگ کی یہی سزا ہے۔"

عندلیب بانو ششدر رہ گئیں "میری ماں کی تصویریں ردّی میں پھینکنے کا حق آپکو کس نے دیا ــــ ؟"

"لاعلمی نے ــــ"

"ڈھونڈیے۔ شاید وہ کیمیو مل جائے۔"

"اب کہاں ملے گا۔ ڈیڑھ سال پرانی بات ہے۔ ہمارے ہاں صبح شام صفائی ہوتی ہے۔ ویکیوم کلینر سے الگ اور جھاڑو سے الگ۔"

اتنے جوتے کھاکر بھی نگار خانم کے دماغ کا خنّاس نہیں گیا۔ بہت ہی بدعورت ہے ــــ عندلیب بانو نے کھولتے ہوئے سوچا۔ ترشی سے بولیں "مجھے معلوم ہے۔ جمعداروں کی پلٹن آپکے گھر کا کوڑا کرکٹ صاف کرتی ہے۔ اسکے علاوہ آپکے ہاں کا ڈرٹی لینن بھی پبلک میں دھلتا ہے۔"

"شاباش ــــ" دریچے کے نیچے سے آواز آئی۔

"شاید آپکو یاد ہو۔ آپکے مینٹل پیس پر وہ کیمیو سجا دیکھ کر اسوقت تو ڈاکٹر منصور چپ رہے۔

لیکن جب رسالے کے خاص نمبر میں اسکا بلاک چھپا تو انھوں نے آپ دونوں بہنوں سے کہا تھا کہ یہ ڈاکٹر بیگ کے ہاں کی تصویر ہے۔ انکے نیپالی ملازم نے چرا کر نخاس میں فروخت کی اور وہاں سے آپ خرید لائیں۔ آپ نے بیرخی سے دوبارہ وہی جواب دیا کہ یہ آپکی دادی حضرت کی شبیہ مبارک ہے۔ بطور ثبوت آپ نے اسکی پشت پر لکھے فرضی خطابات وغیرہ بھی دکھائے ۔۔۔ اسکے چند روز بعد ہی آپکے ہاں وہ ہنگامہ خیز تقریب منعقد ہوئی ۔۔۔"

"اسوقت آپ نے اسٹیج پر آکر کیوں نہ ثابت کیا کہ یہ آپکی ماں کی تصویر ہے؟"

"کیا ضرورت تھی؟ آپکے شاہی نوابی شجروں کے سلسلے میں ہم بولنے والے کون؟ ہم نے سوچا کیا پتہ نواب بیگم نے کچھ عرصے کے لیئے کسی رئیس پردھان پور سے نکاح یا متعہ کر لیا ہو یا یونہی انکے حرم میں داخل ہو گئی ہوں لیکن کوّے ہکنی نہ بننا چاہتی ہوں اور آپکے ابا جان کی ولادت کے بعد پھر بازار میں جا بیٹھی ہوں۔"

نگار و شہوار کے چہرے سرخ ہو گئے پیچ و تاب کھایا کیں۔ مگر بولنے کی گنجایش نہ تھی چپ رہیں۔ بسنتی جگمگاتی ٹرالی دھکیلتی داخل ہوئی۔

"وہ تاریخی تصویر آپ لوگوں نے غایب کر دی۔ یہ بڑی زیادتی اور بے انصافی کی بات ہے۔ اس کی ملکیت کی اصل حقدار یہ خاکسار ہے۔"

"اگر حقداروں کو انکی چیزیں واپس کرنی شروع کی جائیں تو دنیا میں بہت کم لوگ ایسے رہ پائیں گے جنکے پاس کچھ باقی بچے گا۔" نگار خانم نے بے نیازی سے بات کی۔

"آپ اس گھر سے ہی اس کارِ خیر کا آغاز کیجیے" عندلیب بانو نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اب یکلخت شہوار پر حق گوئی و بیباکی کا دورہ پڑ گیا۔ قہوے کی نقشیں MIESSEN پیالی ہاتھ میں لیے لیے اٹھیں اور فوّارے کی طرف جاتے ہوئے خطیبانہ انداز میں گویا ہوئیں ۔۔۔ "یہ گھر اور کار خیر ۔۔۔؟ اصل حقداروں کی فہرست تو بہت طویل ہے بُلبُل باجی ۔۔۔ اس دولتکدے کو تعمیر کرنے والے فاقہ کش مزدور ۔۔۔ ہمارے بھائیوں کے فیکٹریوں کا بھاری لیبر۔ ہمارے کتب خانے کے اصل مالک وہ وثیقہ دار نواب صاحب جنکا لڑکا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ بلرام پور ہسپتال کے خیراتی وارڈ میں۔ کیونکہ باجی نے کتابوں کی بقیہ قیمت۔ وہ حقیر رقم ادا نہ کی

بروقت ——محض بوجہ کاہلی و بے پروائی —— اور —— اور وہ مفلس نوجوان مرگیا کیونکہ اسکے لیے کوفتہ —— سوری —— نہ گردہ آسکا نہ کلیجی ——"

"شہوار ——" نگار نے گرج کر ڈانٹا "بڑکتو کی طرح یاوے پن کے راستے پر نہ چلو۔ ایں —— دیوانی ہی ہوئی جا رہی ہیں"۔

"امی —— اٹھیے۔ چلیں" عنبرین نے کہا۔

"ذری میرا بلڈ پریشر دیکھتی جائیے"۔

"میں آلہ نہیں لائی ہوں"۔

"میں نے آپکی کار میں رکھا دیکھا ہے۔ پچھلی سیٹ پر" شہوار بولیں "شیام سنگھ ڈاکٹر صاحب سے چابی لے جاؤ اور انکا آلہ نکال لاؤ گاڑی سے" نگار خانم نے تحکمانہ انداز میں آواز دی۔

ڈاکٹر کا فرض ہے۔ ڈگری لیتے وقت قسم کھاتا ہے کہ کسی قسم کے ذاتی غصے ذاتی توہین کی پرواہ کیے بغیر مریض کا علاج کرے گا۔ عنبر نے طیش ضبط کر کے پرس میں سے کار کی کنجیاں نکالیں اور لحظہ بھر کے لیے انہیں تکتی رہی۔ یہ کنجیاں پچھلے سال کہاں کہاں چھپائی جاتی تھیں۔

شیام سنگھ دربان اسی وقت اندر آیا تھا اور کنگ ایڈورڈ سلور پلیٹ میں شام کی ڈاک لیے کھڑا تھا۔ جو بھائیوں کے دفتر سے بھجوائی گئی تھی۔

عجیب گھر تھا۔ یہ لوگ ولایت سے MIESSEN پیالیاں بھی خرید لائے تھے۔ اور بیش قیمت کنگ ایڈورڈ سلور بھی۔ ساتھ ہی اس کمرے کو پلاسٹک کے الم غلم سے سجا رکھا تھا عنبر برافروختہ اور حیرت زدہ بیٹھی رہی۔

شہوار نے چونک کر شیام سنگھ کو دیکھا۔ اور فارن ایرمیل کا لفافہ پلیٹ سے اٹھا کر مسکرائیں۔

"میرے نام کا خط ہے؟" نگار خانم نے پُرامید آواز میں دریافت کیا۔

شہوار خانم کے دل میں اسوقت انقلابی خیالات موجزن تھے۔ باجی سے فرنٹ ہو رہی تھیں کمینے پن سے جواب دیا "جی نہیں۔ ایک رسالہ ہے اور حسب معمول چند چپڑقنات اڈیٹروں کے

لفافے۔ آپ سے افسانے منگوائے ہونگے اور کیا ——"

"اردو والوں کو ہمیشہ حیرت فنات کیوں کہتی ہو؟ تمہاری مادری زبان فرنچ ہے"؟ نگار نے جھلا کر پوچھا۔

"خیر مادری زبان فرنچ ہو نہ ہو اب تو فرنچ ہی ہونے جا رہی ہے۔ انشاء اللہ —— یہ ملاحظہ کیجئے موسیو الفونس دوُ وال کا مراسلہ"۔

"ایسے کتنے ہی موسیوز کے لیٹر میں نے پھاڑ کر پھینکدیے"۔ نگار نے ہونٹ پچکا کر کہا۔

"اچھا —— ؟ کب —— ؟" شہوار نے چونک کر سوال کیا۔

دونوں بہنوں کی سرد جنگ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ دونوں کو غنیم کا خیال نہیں رہا تھا یا ماں بیٹیوں کی موجودگی غیر اہم ہستیاں سمجھ کر نظر انداز کر دی تھی۔

"اے وہ بھول گئیں مرانڈا ہاؤس میں فرانسیسی پروفیسر کیمسٹری پڑھاتا تھا"۔

"فرانسیسی نہیں کچھ اور۔ پانڈیچری کا یوریشین تھا"۔

"اچھا خیر۔ ہوگا"۔

"اب صاحبزادہ دلشاد علیخاں خط نہیں لکھتے؟" عندلیب بانو نے وار کیا۔

"وہ آپکی لائن سے تعلق رکھتے ہیں آپکو لکھتے ہونگے"۔

"اب تو آپ بھی بفضل خدا اسی طبقے میں شامل ہو چکی ہیں"، عندلیب بانو نے بڑی مٹھاس سے جواب دیا۔ "نواب بائی کو تو آپ نے فرضی دادی ہی بنایا تھا۔ نور ماہ خانم اور جرائم پیشہ دلشاد علی آپ کے سچ مچ کے سمدھن سمدھی بن گئے۔ اور انکا حرامی بیٹا آپکا داماد"۔

نگار شہوار تلملا کر رہ گئیں۔ عنبر زور سے ہنسی۔

"آپکی اس خوفناک ہنسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنون کا اثر ابھی باقی ہے"، شہوار نے جوابی حملہ کیا۔

"اللہ نہ کرے —— اے بہن ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ مبارک ہو بھتیجی کی کتخدائی۔ ہمیشہ دلبر سبحان مبارک باشد —— آپکے گھر میں خدا خدا کر کے کسی عورت ذات کی شادی تو ہوئی"۔ عندلیب بانو نے ہاتھ نچا کر کہا۔ عنبر نے حیرت سے انکو تکا۔ اتنی مہذب نصف یوریشین ماں میں کوئی ڈومنی حلول کر گئی تھی یا انکے قالب میں نواب بیگم بول رہی تھیں۔

"ہمارے ہاں تو لڑکے لڑکیاں دونوں بیاہے جاتے ہیں آپکے گھرانے میں البتہ لڑکیوں کی شادی کا رواج نہیں"۔ نگار خانم نے سرد آواز میں جواب دیا۔

"میں تو آپکی نواسی بھی دیکھ آئی"۔ عندلیب بانو بولیں۔

"میری نواسی ــــ؟" نگار خانم نے چیں بجبیں ہو کر دہرایا۔

"آپکی بھتیجی کی لڑکی آپکی نواسی ہی تو ہوئی۔ بڑی خوبصورت ہے ماشا اللہ۔ اسکی دادی نے چرچ میں بپتسمہ دلوا کر اسکا نام بھی بڑا پیارا رکھا ہے نورا ــــ نورا آڈریک ــــ بروزن نورما آڈریک ــــ"

وارکاری تھا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد شہوار بیگم بولیں ــــ "انکا کیا ہوا ــــ ڈاکٹر قندھاری ــــ قاچاری ــــ کچھ عجیب سا نام ہے ــــ"

"کاشغری ــــ" عنبرین نے شیریں لہجے میں جواب دیا۔

"ہاں۔ ہاں ــــ وہی۔ سنا ہے وہی آپکو علاج کے لیے برطانیہ لے گئے تھے ــــ"

"آپ نے صحیح سنا۔ انھوں نے وہاں بڑی دوڑ بھاگ کی میرے علاج معالجے کے سلسلے میں۔ سال بھر ــــ"

"سال بھر تو وہ وہاں نہیں رہے ــــ اکثر یہاں ہمارے ہاں آیا کیے۔ حسب سابق"۔

"انکا نام کیسے بھول گئیں؟ اور وہ برابر کیسے رہ سکتے تھے۔ یہاں ماتشا کون چلاتا؟" عنبر نے اب ذرا الکنت سے جواب دیا۔

"باجی جان ــــ موسیو دُو وَال کا خط آیا ہے۔ معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب ذرا میں یہ خط پڑھ لوں"۔ شہوار نے ایرمیل کا طویل نیلا لفافہ چاک کرتے ہوئے کہا۔ ایک رنگین تصویر برآمد ہوئی۔ خط پڑھ کر بولیں "لکھتے ہیں اپنے داین یارڈ میں چاٹو ــــ نئی چاٹو بنوا رہے ہیں"۔

"وِن یارڈ میں شاطو ــــ" عندلیب بانو نے نرمی سے تصحیح کی۔

"ابھی جو ہم لوگ یوروپ گئے تھے وہیں ملاقات ہوئی۔ بھیا سے کچھ انکا بزنس کنکشن ہے۔ بے چارے نے بیحد خاطر مدارات کی بیرس میں۔ شپ اونر ہیں بہت بڑے۔ چھوٹے بھیا

نے انکو لکھ دیا تھا کہ یوروپ میں ہماری LOOK AFTERY کریں۔"

"لُک آفٹری ــــ؟" عندلیب بانو نے دہرایا۔

"جی ہاں۔ میرے پیچھے پڑ گئے کہ شادی کر لو ــــ کیوں باجی۔ کتنے مصر تھے؟"

باجی چپ رہیں۔ "میں نے شرط رکھی مسلمان ہو جاؤ۔ کہا چند مجبوریاں ہیں۔ جائداد اور کاروبار وغیرہ کی جنکی وجہ سے مذہب تبدیل کرنا ذرا مشکل ہے فی الحال ہمارے ساتھ لندن بھی گئے تھے۔ یہ تصویر ملاحظہ کیجئے۔ اسلامک کلچر سنٹر میں کھنچی تھی۔ بروز عید الفطر۔ یہ بالکل میرے پیچھے تیسری قطار میں کھڑے ہیں۔"

عنبر نے دلچسپی سے دیکھا۔ شہوار نے گروپ فوٹو میں ایک چھوٹے سے گول مٹول گلابی چہرے پر انگلی رکھی۔ "بہت ہینڈسم ہیں۔" شہوار نے کہا۔

"جی ہاں ضرور ہونگے۔ مگر تصویر اتنی چھوٹی ہے کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا۔" عنبر بولی۔

"کرسٹینا اوناسس بھی ان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر انکو اورینٹل لڑکیاں پسند ہیں۔ کہتے ہیں وہ بہت اچھی بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میرے چکر میں مسلمان بھی ہو جائیں گے۔ لندن میں برابر اسلامک کلچر سنٹر جایا کرتے تھے۔ مگر میں نے گھاس نہیں ڈالی۔"

تصویر دکھاتے ہوئے شہوار نے موسیو آلفونس دُووال کا خط تپائی پر ڈال دیا تھا۔ عنبر نے اس ٹائپ شدہ مختصر نوٹ پر دزدیدہ نظر ڈالی ــــ "ڈیر شہوار خانم۔ متوقع ہوں کہ آپ بخیر ہونگی۔ وہ تصویر جو آپکے فیسٹول کے روز لندن میں کھنچی گئی تھی حسب وعدہ ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ اپنے یوروپ کے سفر سے لطف اندوز ہوئی ہونگی ــــ مخلص الفونس دووال

شیام سنگھ بیگ لے کر حاضر ہوا۔

"ڈاکٹر بیگ کا بیگ ــــ" انگار خانم مصنوعی شگفتگی سے بولیں۔ بلڈ پریشر چیک کروانے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ نقاہت سے اپنا بازو پیش کیا۔

دربان نے باہر جانے سے قبل سارے سوئچ آن کر دیے۔ وسطی فوارہ ابلنے لگا۔ نقرئی قطب مینار، سوپ اسٹون کا تاج محل اور پلاسٹک کی ٹکلیوں والے گلوب روشن ہو گئے آبشار جاری ہوا اور مصنوعی درخت پر بیٹھی مکینکل چڑیاں چہچہانے لگیں۔ شہوار خانم نے

ہاتھ بڑھا کر میوزیکل سگریٹ باکس کھول دیا۔" اولڈ لینگ زائین" کی دھن بجنے لگی ـــــ نگار خانم نے دائیں ہاتھ سے شام کی ڈاک میں آیا ہوا ایک ادبی رسالہ کھولا اور اسمیں چھپا اپنا تازہ افسانہ پڑھنے میں منہمک ہوگئیں۔ منٹ بھر بعد اسے رکھ کر نئے ناول کے پروف اٹھا لیے۔

نگار خانم اپنے چھبیسویں[۲۶] ناول کی پروف ریڈنگ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر عنبریں بیگ انکا بلڈ پریشر چیک کرنے میں مصروف تھی۔ شہوار کسی یورپین شپ اونر کا خط دوبارہ پڑھتے ہوئے اپنی نئی فینٹسی کی تخلیق میں محو ہو چکی تھیں۔

دریچے کی نشست پر بیٹھے بیٹھے عندلیب بانو نے باہر اندھیرے آسمان کا جائزہ لیا۔ پرندے بسیرا لینے کیلئے اُڑتے جا رہے تھے۔

گویا وہ سب اپنے اپنے رول پر واپس موجود تھیں۔

"بینگ ٹوڈی پوبلین۔" دریچے کے نیچے چھپے خواجہ سبز پوش نے اُچک کر کمرے کے منظر پر نگاہ ڈالی اور گویا رواں تبصرہ کیا۔ انکو بالکل اپنے قریب موجود پا کر عندلیب بانو گھبرا گئیں۔ اور ونڈو سیٹ سے اٹھیں۔ جھاڑ جھنکار سر نے فوراً اندھیرے میں ڈبکی لگائی۔

ٹیلی ویژن پر خبریں شروع ہو چکی تھیں قبلائی بہادر کابلی سے چلتا اندر آ کر ایڈیٹ بوکس کے مقابل میں بیٹھ گیا۔ اسے سجھائی کم دیتا تھا۔

عنبریں نے مریضہ کو انکا بی۔ پی بتایا اور اٹھی۔

"کھانا کھا کر جائیے۔" شہوار نے اخلاق سے کہا۔

"جی نہیں، شکریہ۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ آپ بھی تو کہیں جانے والی تھیں۔ افسوس ہے کہ آپکا راستہ کھوٹا کیا۔"

"پھر ضرور آئیے گا ـــــ"

"ضرور۔" مسز بیگ نے چلتے چلتے ایک آخری گولہ داغنا مناسب جانا۔ نگار خانم سے مخاطب ہوئیں۔ "بر سبیل تذکرہ ـــــ آپکے سمدھی دلشاد علی خاں ـــــ انکے متعلق تو آپکو علم ہوگا۔

تائب ہو کر حج کرنے چلے گئے۔ مکے میں سٹل ہو گئے ہیں۔ وہاں اسکول میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔"
"میں نے سُنا ہے آپ پھر لندن جانے والی ہیں" نگار خانم نے اپنی مشین گن کا رخ عنبر کی طرف کیا۔

"درست" عنبریں بولی "مجھے ہر تین ماہ بعد وہاں جانا ہے برائے چیک اپ۔ کیونکہ میرا مرض ایسا ہے آپکو یہ معلوم کر کے خوشی ہو گی ـــــ کہ برطانیہ کے مشہور ماہر امراض دماغی روزین باوم نے کہا ہے کوئی گارنٹی نہیں کہ دوبارہ عود نہ کر آئے عین ممکن ہے میری یہ تندرستی عارضی ثابت ہو بحیثیت ڈاکٹر میں اس صورت حال کو بخوبی سمجھتی ہوں۔"

"خدا نہ کرے۔ بیری کے دیدوں میں رائی نون ـــــ بیماری عود کرے تمہارے دشمنوں کی" عندلیب بانو نے چمک کر بالکل اپنی ماں نواب بیگم کے انداز میں کہا۔ نانی کی یہ آواز مدتوں قبل کمسن عنبریں کلکتے میں سنا کرتی تھی۔

ہمیں اپنی پرچھائیوں سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ دلشاد علی خاں نجانے کسطرح بھاگ نکلے۔ اگر میں ان پرچھائیوں کو قطعاً قبول کر لوں تو شاید اچھی ہو جاؤں۔ عنبر نے اپنی ماں پر نگاہ کی۔ بہت دنوں بعد پہلی مرتبہ ـــــ محبت اور دردمندی کے ساتھ ـــــ انکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے پرانے دوستانہ لہجے میں بولی "COME ON OLD GIRL, LET'S GO."

دونوں بہنیں انکو خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھیں۔ عنبر انکی طرف مڑی ـــ "سمجھیں آپ ـــــ خواہران عزیز ـــــ میں دوبارہ پاگل ہو سکتی ہوں۔ کسی لمحے بھی کسی انسان کے دماغ کا پرزہ اچانک ٹوٹ سکتا ہے۔ آپکے صحیح الدماغ برادر معظم کے برعکس میں چند ماہ تک واقعی مخبوط الحواس رہ چکی ہوں۔ مطلب یہ کہ ـــــ مفر کسی صورت میں نہیں۔ نہ مجھے۔ نہ آپ کو۔ نہ دنیا کے کسی اور انسان کو ـــ کوئی محفوظ نہیں۔ چاہے وہ بھیانک واقعہ ایک بے ضرر سے گمنام کیمیو نے تخلیق کیا ہو۔ یا کسی جذباتی صدمے نے۔ کوئی حادثہ ہو۔ یا علالت ـ
"ـــــ یا آخری مہلک بیماری ـــــ یا کوئی اور ناگہانی مصیبت۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے ہسپتال اور یتیم خانے جیل خانے اور پاگل خانے اور قحبہ خانے بیکس و مجبور مخلوق سے

نہ بھرے ہوتے ——— اور دلی آگرے کی ایک نجیب الطرفین خاتون گلرُخ بانو بیگم عرف نواب فاطمہ کو اس رہن نامے میں —— جو پون صدی بعد اس خوفناک رات آپکے اسی خوفناک کمرے میں اس بلوّریں میز پر کھولا گیا تھا —— اس رہن نامے میں آج سے ستر برس قبل وہ اعلیٰ نسب مغل زادی خود کو "قوم کنچنی" لکھوانے پر مجبور نہ ہوئی ہوتی۔

"امّی جان —— آپکو پتہ ہے —— مارواڑیوں والے واقعے کے دوسرے روز جب منصور نے مجھے رہن نامے کی یہ عبارت سنائی اسکی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے اشکبار نہ دیکھا تھا۔ مرد آسانی سے نہیں روتے۔"

آبشار والے کمرے میں سکوت چھا گیا۔ چند لمحوں بعد ذرا الجھ کر شہوار نے میوزیکل باکس کو دوبارہ کھولا۔ "اولڈ لینگ زائن" بجنے لگا —— وہ محبوب جان لیوا اسکاٹش نغمہ ——

SHOULD OLD ACQUAINTANCE BE FORGOT

AND NEVER BROUGHT TO MIND

عندلیب بانو ٹھٹھک کر اسے سننے میں محو ہو گئیں۔

"امّی چلیے" عنبریں نے پکارا۔ اسوقت میوزیکل سگریٹ باکس کے قریب ایک اور مانوس چمکیلی شے پر اس کی نظر پڑی۔ منصور کا نقرئی سگریٹ کیس۔ لاجوردی میناکاری کے مونوگرام MK سے مزیّن۔ ہفتہ بھر قبل ان ماں بیٹیوں کی برطانیہ سے واپسی پر جب وہ انکے استقبال کے لیے اموسی ایرپورٹ آیا تھا یہ سگریٹ کیس اسکے ہاتھ میں تھا۔

ٹیلی ویژن کی خبریں سنتے سنتے قبلائی بخارا کارپٹ پر سو چکا تھا۔

منصور شاید پچھلی بار جب نگار خانم کو دیکھنے آیا ہو گا تو یہاں بھول گیا ہو گا۔ عندلیب بانو نے دل کڑا کر کے سوچا۔ وہ بھی اس سگریٹ کیس کو دیکھ رہی تھیں۔

SHOULD OLD ACQUAINTANCE BE FORGOT—

انہوں نے جھک کر نغمہ سرا ڈبے کا پٹ بند کر دیا۔

"آپ منصور سے شادی کب کر رہی ہیں" فوارے کے پاس کھڑی شہوار نے شکر گھولتی آواز میں عنبر سے دریافت کیا۔

"آپ کب کر رہی ہیں —؟" عنبرین نے سکون کے ساتھ پوچھا۔ "امی ابا چلیے بھی"
"بسنتی۔ ڈاکٹر صاحب کا بیگ اٹھاؤ —" نگار خانم نے حکم دیا۔

رنگ برنگی مچھلیوں کے ٹینک کے پاس رک کر عنبرین نے میزبان خواتین کو پھر مخاطب کیا
"چنانچہ۔ میری پیاری بہنو۔ ہرنا گہانی مصیبت سے ڈرتی رہیے۔ کوئی آزاد نہیں۔ کوئی مختار نہیں۔ سارا معاملہ اندھا دھند ہے — پانیوں پر بہتی موسیقی کے اس سُر پہ آپ دونوں سے اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ بیلی —"

مرمت شدہ ہری ایمبیسڈر فراٹے کے ساتھ پورٹیکو سے نکلی۔ ڈرائیو پر سے گذرتی بند پھاٹک سے جا ٹکرائی۔ ایک ہیڈ لیمپ چھن سے ٹوٹا۔ کار دھچکے سے پیچھے ہٹی۔ ایک پچھلا پہیہ پام کے گملے پر چڑھ گیا۔
عنبرین نے سر جھٹک کر سامنے دیکھا اور پوری طاقت سے چیخی — "باسٹرڈ —"

چوکیدار سڑک پر سے بھاگتا ہوا آیا۔ پھاٹک کھول کر حادثے کا جائزہ لیا — جھلّا کر بولا
— "بیگم صاحب۔ گالی کیوں دیتی ہیں؟ آپ تو گیٹ توڑے ڈال رہی ہیں — ہم سامنے گمٹی پر چلے گئے تھے۔ بیڑی لینے۔ ہارن بجا دیا ہوتا۔ اوپر سے ہم کو باسٹرڈ بولتی ہیں۔ چینی کا گملہ پھوڑ ڈالا۔ سویرے ہماری چھوٹی بڑی بٹیا دس جوتے لگا کر نکال باہر کرینگی۔"
شیام سنگھ لپکا — "واگدر صاحب کیا ہوا — چوٹ تو نہیں آئی —؟ تھوڑا سا بیک کر لیجیے — اِدھر — اور اِدھر — اب ٹھیک۔"
"تھینک یو شیام سنگھ —"
"واگدر صاحب سامنے کی ایک بتی ٹوٹ گئی —"

"ٹھیک ہے۔"
کار چینی کے شکستہ گملے اور پام کے پودے کو روندتی سڑک پر نکل آئی۔

مسز بیگ نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ مٹھیاں بھینچے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ انہوں نے چہرے سے ٹھنڈا پسینہ پونچھا۔

"سوری امی جان" سنسان سڑک پر کچھ دور جا کر گیر بدلتے ہوئے عنبرین نے کہا "اب میں بہت احتیاط سے چلایا کروں گی گاڑی ——"

عندلیب بیگ خاموش رہیں۔

"امی۔ پان کھائیں گی؟" ایک کھوکھے کے سامنے کار رکی۔ بانکی تنبولن نے مسکرا کر پوچھا "بیگم صاحب۔ بگھی بنا دیں؟"

"ہاں۔ د د۔ سادے۔"

دوکان میں ٹرانزسٹر بج رہا تھا۔ میرے انگنے میں تمہارا کیا کام ہے —— عنبرین چوبی دیوار پر سجے پرنٹ بے دھیانی سے دیکھا کی۔ امیتابھ بچن۔ پروین بابی۔ ریکھا —— شبنم اور جینداتی کی تصاویر پر صبح کے ڈالے ہوئے چنبیلی کے ہار مرجھا گئے تھے۔ نیچے مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ سڑک پر خاموشی طاری تھی۔ اسٹریٹ لیمپ کی زرد روشنی میں بیٹھے ایک سیاہ کتے نے منہ اوپر اٹھا کر دانت نکوسے۔ بھیرو کی سواری جیسا سگ تیرہ۔

"نوش کیجیے ——" تنبولن نے گلوریاں پیش کیں۔

عنبرین نے پیسے دے کر کار آگے بڑھائی۔

حضرت گنج کے ایک سینما ہال سے تماشائی باہر آ رہے تھے۔

عندلیب بانو نے پان منہ میں رکھا۔ گہری سانس بھر کر کہا "چلو کوئی پکچر دیکھ لیں سیکنڈ شو۔"

عنبرین نے گاڑی چھتر منزل کی سمت موڑتے جواب دیا —— "نہیں۔ اب سیدھے گھر چلتے ہیں —— دریا نما ——"

آبشار والے کمرے کی کھڑکی کے نیچے سے اٹھ کر "خواجہ سبز پوش" نے کپڑوں سے مٹی جھاڑی۔ سرد، بھیگی زمین پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سن ہو چکی تھیں۔ ایک چنڈول پھر سے اڑا۔ احاطے کے باہر آوارہ کتا مسلسل رو رہا تھا —— ایک گرگٹ رات کی رانی کی ٹہنی پر سے

اُچھل کر عشق پیچاں کی گھنی بیل میں غایب ہو گیا ــــ اکیلا جگنو گلاب کی شبنم آلود جھاڑی میں دمکے جا رہا تھا ــــ چاروں طرف تاکتے جھکے جھکے، شاگرد پیشے کی سمت بڑھے۔ اپنی اندھیری کوٹھری میں پہنچکر بجلی کا سوئچ اون کیا۔ بلب کا فیوز پھر اُڑ گیا۔ موم بتّی تلاش کی کواڑ بند کرکے چٹخنی لگائی۔ اپنی "چاہ بابل" کی سلاخوں والی کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ آسمان پر زہرہ اور مشتری تیزی سے چمک رہی تھیں۔ قطب ستارہ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ ہوا چلی۔ مینہہ برسنے لگا۔

کھڑکی سے ہٹ کر خواجہ سبز پوش کونے میں سُلگتے "علیؑ" کے دھوئیں کے قریب جا بیٹھے۔ گھٹنوں میں سر دے لیا۔

دُھوئیں کے باریک مرغولے طرح طرح کی شکلیں اور ہیولے بنایا کیے۔

تھوڑی سی خاک اٹھا کر ہتھیلی پر رکھی۔ اسے دھیان سے دیکھتے رہے۔

باہر بارش کا زور بڑھ گیا۔ کھڑکی کے پٹ کھڑکھڑانے لگے۔ خواجہ سبز پوش نے چٹکی بھر راکھ اپنے جھاڑ جھنکاڑ کھچڑی بالوں پر ڈالی۔ اور ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ جیسے کھوپڑیوں کی مالا پہنے، انگ بھبوت لگائے شمشان میں بیٹھا کال بھیرو ہنسے۔

کچھ دیر تک ساکت بیٹھے رہنے کے بعد بیرونی پھاٹک ٹوٹنے کی آواز پر وہ چونکے۔ انگلیوں سے پلکیں رگڑا کیے۔ ماچس تلاش کرکے بجھی ہوئی موم بتّی جلائی چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ ہتھیلی پہ لگی راکھ آستین سے پونچھی پاؤں کی بیڑیاں گھسیٹتے ــــ کھسکتے گھڑونچی تک پہنچے اسکے ایک شکستہ پائے کے نیچے رکھی اینٹ نکالی ــــ گھڑے کا پانی چھلک گیا۔ دوسرا دھکا لگا گھڑا نیچے آ رہا۔ پانی سے شرابور ہو گئے۔ لیکن انھوں نے پرواہ نہیں کی۔ اینٹ اٹھا کر اسے ہاتھ میں تولا بھرپوری طاقت کے ساتھ اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش میں منہمک ہو گئے۔

اختتامیہ

اس نیم دستاویزی ناول کے مندرجہ ذیل کردار قطعی فرضی ہیں ـــــ

ڈاکٹر عنبرین بیگ۔ عندلیب بانو۔ نواب فاطمہ عرف نواب بیگم۔ نلومینا۔ منورسی کشمیرن۔ دلنواز عرف حجن بی۔ مہرو۔ شمو۔ چھنو۔ راحت بائی۔ گجرابائی۔ نگار خانم۔ شہوار خانم۔ پری بیگم۔ نورماڈریک عرف نورماہ خانم۔ شیلی ڈریک عرف سرینا دیوی۔ ڈاکٹر شاردا کھنہ۔ کرن بھاٹیہ۔ ہری مایا بھٹناگر۔ پون کماری مصرا۔ جھرنا دیوی۔ پریتبھا دیوی۔ "سویڈش لیڈی" مسز خان۔

ڈاکٹر منصور کاشغری۔ گمنام نواب صاحب۔ مرزا عثمان بیگ۔ چودھری فتح محمد۔ شدو خاں۔ دلدار علی برلاس۔ مرزا اسبط احمد۔ شیخ عبدالباسط گوٹے والے۔ نواب سہراب نگر۔ راجہ نیلم گڈھ۔ پرانی دلی کے بیری والے شاہ جی۔
کیلاش نرائن ماتھر۔ خان بہادر برکت اللہ۔ کاٹھیا واڑی دربار صاحب۔ ٹھاکر مہیشور سنگھ جی۔ کرنل ڈالٹن۔ آندرے ریناں۔ چارلس کوربیں۔ راتے بہادر امبا پرشاد احقر۔ سید شکور حسین۔ ٹھاکر جواد علی آف دھانپور۔ راجہ دلشاد علی خان۔ سندریشور نرائن سنگھ عرف کنور سینڈی۔ جارج ڈریک۔ نورمن ڈریک۔ خواجہ سبز پوش اور انکے بھائی۔ نواب منجو صاحب بطلیموس۔ پفنا توس۔ زاغ دہلوی۔ جے پور کا کنوڑیا گھرانا۔ شرف الدین۔ جرمنی کے اڑیہ گروجی۔ آسٹرین ہیٹ والے شاعر۔
پری محل اور تعلقہ دھان پور بھی فرضی ہیں۔
جرمن اور عربی باجی لوچیا حسین بخش مرکب کردار ہیں۔